www.KitaboSunnat.com

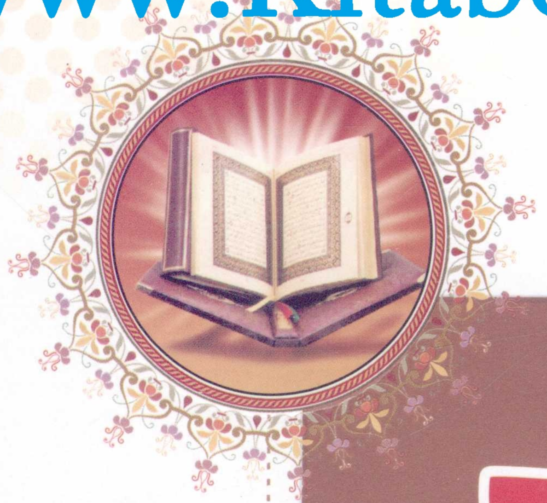

فتاویٰ اصحاب الحدیث

تالیف

فضیلۃ الشیخ ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد

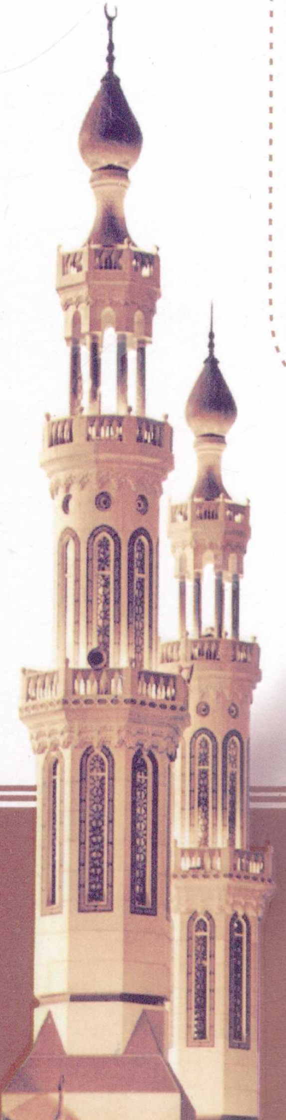

مکتبہ اسلامیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھر پور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

فہرست مضامین

s پیش لفظ 25

s رسول اللہ e کا اپنے رب ذوالجلال کو دیکھنا 32
s عورت میں نحوست 33
s قرآن مجید ہاتھ میں لے کر بات کرنا 34
s حضرت امام مہدی کی آمد 35
s دجال سے بچاؤ کا طریقہ 37
s قرآن حکیم کے سائے میں رخصتی 39
s قرآنی شفا کے آداب 40
s کسی بزرگ کے لیے کہنا کہ ''آپ کے چہرے سے برکت ٹپکتی ہے'' 40
s اہل بدعت کا نیا شوشہ 41
s ایک حدیث کی تحقیق 42
s کفار کے ساتھ مشابہت 43
s سلاسل اربعہ کی حقیقت 44
s شیطان کی حقیقت 45
s مقام محو وفنا 46
s کلمہ طیبہ کا ثبوت 47
s رسول اللہ e سے محبت اور اس کے تقاضے 49
s اصولِ ایمان اور اس کی شاخیں 50
s شیطانی وساوس اور برے خیالات 51

s ایک سوال کے مختلف جواب 53
s بھگوت گیتا کیا ہے؟ 54
s محمد رسول اللہ e کا مفہوم 55
s ستارے اور مستقبل 55
s پاؤں پکڑنے کے لیے جھکنا 56
s کفریہ کلمات 57
s ایصال ثواب کی صورتیں 57
s علی t مشکل کشا ہونے کا عقیدہ 59
s عیسیٰ u کو غائبانہ سلام 60
s صفات باری تعالیٰ 61
s حضرت آدم u کا وسیلہ 62
s تعویذات میں حروف ابجد کا استعمال 63
s مزاروں کے درودیوار کو چومنا 64
s بیعت تصوف کی حیثیت 65
s نزول عیسیٰ u 66

s عورت کے لیے تمام سر کا مسح 68
s بچوں کی صفائی کے بعد وضو کرنا 69
s ناک میں اُگے ہوئے بال 70
s اونٹ کا گوشت کھا کر وضو کرنا 70
s حائضہ عورت کا میت کو غسل دینا 71
s مہندی لگے سر پر مسح 73
s خون سے غسل کرنا 74
s دوران حمل آنے والا خون 74
s ایام میں کمی وبیشی 75
s وضوء کرتے وقت صرف بسم اللہ پڑھنا 76

s نماز باجماعت کی فضیلت 78
s زمانہ دجال میں نمازیں 79
s جوتے پہن کر نماز پڑھنا 80
s بے نماز والدین کی خدمت 81
s اذان کی فضیلت 82
s دوران جماعت سنت فجر پڑھنا 83
s سلام پھیرنے کے بعد امام کا وہیں نفل ادا کرنا 85
s دوران نماز انگلیاں چٹخانا 85
s نمازِ عشاء سے پہلے سو جانا 86
s جلسہ استراحت 87
s مرد، عورت کی نماز میں فرق 88
s اذان عصر کا وقت 89
s نماز قصر کی علت اور حکمت 90
s اذان مغرب بلا وجہ مؤخر کرنا 91
s عورت کی امامت 92
s سجدوں کے درمیان رفع الیدین کی تحقیق 93
s مسبوق کے لیے امام کی اقتداء 94
s باجماعت نماز چھوڑنے کا عذر 95
s گھر میں ایک کمرہ کو نماز کے لیے مخصوص کرنا 96
s مسجد نبوی میں نماز کا ثواب 97
s بیٹھ کر نماز پڑھنا 97
s نمازی جماعت کے لیے کب کھڑے ہوں؟ 98
s اذان کا جواب 99
s نماز باجماعت کی فضیلت 100

s اذانِ فجر کا وقت 102
s عصر کے بعد دو رکعت پڑھنا 104
s نماز میں مخصوص سورتوں کی تلاوت 105
s نماز میں صف بندی 106
s اقامت کے بعد نوافل پڑھنا 108
s صبح کی سنتوں کے بعد لیٹنا 108
s نماز کو پڑھائی کی وجہ سے لیٹ کرنا 110
s سجدے میں ایڑیاں ملانا 111
s گیس ہیٹر کے سامنے نماز پڑھنا 112
s دوران نماز قراءت میں سورتوں کی ترتیب 112
s دوران نماز قرآن دیکھ کر قراءت کرنا 113
s تین وتر پڑھنے کا طریقہ 113
s سجدہ میں جانے کی کیفیت 114
s نماز کے بعد اللہ اکبر کہنا 115
s حالت جنابت میں ادا کی گئی نماز 116
s مسافر امام کے پیچھے نماز 117
s قبل از وقت نماز ادا کرنا 117
s دورانِ نماز وساوس کا آنا 117
s نماز عشاء کے بعد سونے سے پہلے وتر پڑھنا 119
s فجر کی نماز سے پہلے تحیۃ المسجد پڑھنا 120
s مندر کی جگہ مسجد بنانا 120
s گرجا گھر میں نماز پڑھنا 121

s بچوں کا عیدگاہ جانا 124
s عیدین کا وقت 125

s چاندرات میں خصوصی عبادت کرنا 126
s عیدگاہ کی طرف پیدل جانا 126
s ''جمعۃ المبارک'' یا صرف ''جمعہ'' 127
s صدقہ فطر کی ادائیگی 129
s عید کھلے میدان میں 130
s خطبہ جمعہ کو غور سے سننا 130
s خطبہ عیدین کے دوران چندہ جمع کرنا 131
s عیدگاہ میں نوافل 132
s خواتین کو عیدگاہ لے جانا 133

s رات کے وقت میت کی تدفین 136
s جنازہ پڑھانے کا حق دار کون ہے؟ 136
s میت پر نوحہ کرنا 137
s قریب المرگ کو قبلہ رو لٹانا 138
s قبرستان میں مجاور بٹھانا 139
s قبر پر قرآن خوانی 139
s دعائے مأثور کے الفاظ 140
s عورتوں کا قبرستان جانا 141
s آخری آرام گاہ 142
s مسلمان کو عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کرنا 143
s مدفون آدمی کا دوسروں کو پہچاننا 144
s خواب میں فوت شدہ کو بری حالت میں دیکھنا 145
s مقروض کا جنازہ 146
s تعزیت اور اس کے آداب 146
s قبر پر پھول کی پتیاں بکھیرنا 147

s میت کو ایک ملک سے دوسرے ملک لانا.......... 148
s قبرستان میں مسجد بنانا.......... 150

s دنیاوی علوم سیکھنے والے کا مالی تعاون.......... 154
s مشینری پر زکوٰۃ.......... 154
s حق مہر کی زکوٰۃ.......... 155
s ڈیری فارم پر زکوٰۃ.......... 156
s ہبہ میں قبضہ کرنا.......... 156
s قرض کو زکوٰۃ کی مد سے منہا کرنا.......... 158
s صدقۃ الفطر کے لیے بیت المال.......... 159
s موت کے وقت تمام جائیداد وقف کر دینا.......... 160
s مال زکوٰۃ سے خود فائدہ اٹھانا.......... 161
s ساری جائیداد صدقہ کرنا.......... 162
s نشر واشاعت پر زکوٰۃ فنڈ خرچ کرنا.......... 164
s سودی رقم کو رفاہی کاموں میں خرچ کرنا.......... 165
s صاع کا وزن اور اس کا حجم.......... 166
s انسانی جسم کے جوڑوں کا صدقہ.......... 167
s مقامی مدرسہ کے لیے زکوٰۃ.......... 169

s عمرہ کے لیے طواف کعبہ کی حیثیت.......... 172
s عمرہ کرنے سے پہلے حیض آنا.......... 173
s حائضہ کے لیے احرام کی پابندی.......... 174
s دوران احرام خوشبودار کریم لگانا.......... 175
s سن رسیدہ عورت کا محرم کے بغیر عمرہ کرنا.......... 175
s مقام تنعیم سے عمرہ کرنا.......... 176

s مقروض کے لیے حج کی ادائیگی 177
s غلاف کعبہ کو چومنا 178
s استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا 179
s عمرہ کرنے کے لیے مکہ میں احرام کے بغیر آنا 180
s ذبیح کون تھا؟ 181
s احرام کی پابندیاں کب تک؟ 182
s احرام کی دو رکعت 183
s بلند آواز سے تلبیہ کہنا 183
s طواف افاضہ میں تاخیر 184
s عورتوں کے لیے رمل کا حکم 185
s حج کی اہمیت 186
s دوران احرام انڈر ویئر کا استعمال 187
s دوران احرام کمر پر بیلٹ باندھنا 188
s دوران احرام نکاح کرنا 190
s حائضہ عورت کے لیے طواف وداع 191
s طواف وداع کے بعد خریداری 191

s میت کی طرف سے روزے رکھنا 194
s طلوع فجر سے پہلے روزہ کی نیت 195
s اذانِ تہجد یا اذانِ سحر 196
s رمضان کا شیڈول 198
s سحری کی دعوت 200
s روزے کی حالت میں ٹوتھ پیسٹ کا استعمال 201
s بحالت روزہ دانتوں کی صفائی کروانا 201
s مسافر کے لیے روزہ 202

s بھول کر کھانے والے کو یاد دلانا 203
s کلی کرتے وقت پانی کا پیٹ میں چلے جانا 204
s احتلام اور روزہ 204
s ماہِ رمضان میں وفات پانے والا 205
s ماہانہ ایام میں روزے رکھنا 205
s بحالت روزہ سرمہ لگانا 206
s نماز کے بغیر روزہ رکھنا 206
s اذان فجر سن کر کھاتے رہنا 207
s روزہ کی حالت میں مسواک کرنا 208
s ماہِ رمضان کے علاوہ اعتکاف کرنا 209
s افطاری کا وقت 210
s بحالت روزہ بلغم نگلنا 211
s رکعات تراویح کی تعداد 211
s معتکف پر پابندیاں 212
s اعتکاف اور خواتین 213
s روزے کی نیت 215
s چاند دیکھنے کی شہادت 216
s افطاری کے احکام 217
s سحری کھانے کا صحیح وقت 218
s بیماری اور روزہ 219
s جنت کے دروازے کھلنے کا مفہوم 220
s چاند کو دیکھ کر روزہ رکھنا 221
s مشکوک دن کا روزہ 223
s ترک روزہ کے لیے بہانہ سازی 223
s روزے کی حفاظت 224
s افطاری میں جلدی کرنا 225

s رمضان کے آخری عشرہ میں تقاریر کا اہتمام 226
s اعتکاف کا آغاز 228
s اگر روزہ رکھنے کے بعد عید کا چاند نظر آجائے 229
s سحری دیر سے کھانی چاہیے 230
s نفلی روزے کے لیے خاوند کی اجازت 230
s متروکہ روزوں کی تلافی 232

s قیمت خرید سے زیادہ کا بل بنانا 234
s نگرانِ وقف کے اخراجات 235
s چوری کا مال خریدنا 236
s پاکستانی مصنوعات پر خود ساختہ جاپان لکھنا 237
s عورتوں کے بال فروخت کرنا 238
s ادھار خریدنے کی ایک ناجائز صورت 239
s گروی شدہ مکان میں رہائش رکھنا 240
s مکان گروی پر دینا 241
s کئی سال تک کے لیے باغ خریدنا 241
s مسئلہ وراثت 242
s منشیات کا کاروبار 243
s ایڈوانس بیلنس 244
s گروی مکان کا کرایہ 245
s نرخ مقرر کرنا 246
s سود پر قرض لینا 247
s لڑکیوں کے لیے گڑیاں فروخت کرنا 247
s اپنی رقم قومی بچت سکیم میں رکھنا 249
s اراضی کا حکومتی سکیم میں آنا 250

s اشیائے صرف کی خرید وفروخت پر پابندی 250
s پانی فروخت کرنا 251
s آلات الیکٹرونک میڈیا کی خرید وفروخت 252
s باپ کے ساتھ کاروبار کرنے والے بیٹے کا حصہ 253
s بیوٹی پارلر کا کاروبار 254
s ہاؤسنگ سکیم کا ایک غلط طرز عمل 255
s ٹھیکے پر زمین دینا 256
s مال پر قبضے کی ایک صورت 257
s رشوت خور کی دعوت قبول کرنا 258

s مسئلہ وراثت 260
s بیوہ کا حق 260
s زندگی میں جائیداد سے شرعی حق کا مطالبہ 261
s مسئلہ وراثت 262
s ماموں کے لیے وراثت 263
s شوہر کی وفات کے بعد بیوہ کی بے دخلی 264
s زندگی میں تمام جائیداد کسی کو دینا 265
s وراثت کا ایک مسئلہ 266
s کنواری فوت شدہ کا خاوند 267
s غلط وصیت کی اصلاح 267
s ترکہ کیا ہے؟ 269
s بھتیجی کی وراثت 269
s وراثت کا مسئلہ 270
s بیٹی کے لیے وصیت 271
s ذوی الارحام کی وراثت 272

s بچے کی زیادتی کی وجہ سے اسے عاق کرنا 273
s صاحب اولاد بیٹی کا حصہ 274
s باپ اور بیٹے کی حادثاتی موت 275
s ترکہ میں بھائی کا حصہ 276
s وراثتی حصہ اوراس کا نفع 277
s بھائی کی موجودگی میں بھانجے کا حصہ 278
s فضائی حادثہ میں ہلاکت 279
s ایک مسئلہ وراثت 280
s مسئلہ وراثت 280
s مسئلہ وراثت 281
s مرتدکووراثت دینا 282
s حادثہ میں مرنے والوں کی وراثت 282
s مسئلہ وراثت 283
s مسئلہ وصیت 284
s مطلقہ بیوی کی وراثت 285
s مسئلہ وراثت 286
s ایک مسئلہ وراثت 286
s زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے کا حکم 287
s مسئلہ وراثت 289
s دیت کی تقسیم 290
s حق دارفوت شدہ بیٹے کا حصہ 291
s مسئلہ وراثت 292
s زندگی میں وراثت کا مطالبہ 292
s جائز وصیت کا نفاذ 293
s زندگی میں جائیداد تقسیم کرنا 294
s ترکہ کیا ہے؟ 295

- ایک مسئلہ وراثت 296
- مسئلہ وراثت 297
- والد سے اپنا شرعی حصہ طلب کرنا 299
- بیٹیوں کو چھوڑ کر صرف بیٹوں کو کاروبار ہبہ کرنا 300

- نکاح شغار (نکاح وٹہ سٹہ) 304
- مطلقہ بیوی کی بہن سے نکاح کرنا 305
- بیویوں کے اخراجات 305
- گرین کارڈ کے لیے پیپر میرج 306
- ذاتی مفاد کے لیے نکاح کرنا 307
- طلاق اور خلع میں فرق 307
- ماضی خراب لڑکے سے شادی 308
- بیوی کا بلاوجہ اپنے والدین کے ہاں جانا 309
- نکاح کے وقت کوئی شرط رکھنا 309
- خاوند کی اطاعت 310
- بیٹے کی غیر مدخولہ بیوی سے نکاح 311
- حالت حمل میں طلاق 311
- مہر کا حق دار کون؟ 312
- عدت وفات کا آغاز 313
- غیر فطرتی دودھ سے رضاعت کا ثبوت 313
- منگیتر سے تصویر طلب کرنا 314
- رضاعی بھتیجی سے نکاح 315
- شادی سے پہلے منگیتر سے تعلقات 316
- عورت کا ولی کے بغیر نکاح نہیں 317
- شادی شدہ زانی کی سزا 318

s رضاعی بہن سے نکاح 319
s سگریٹ پینے والے خاوند سے طلاق کا مطالبہ 320
s باپ کا بیٹی کو نکاح پر مجبور کرنا 320
s مانع حمل گولیوں کا استعمال 321
s عدت وفات کے لوازمات 321
s حاملہ عورت کو طلاق دینا 322
s بیک وقت تین طلاقیں دینا 323
s منگنی کی شرعی حیثیت 325
s خلع کب لیا جائے؟ 326
s طلاق کے بعد بیوی کے حقوق 327
s نکاح کے موقع پر دیا گیا زیور 327
s عدالتی خلع کی حیثیت 329
s طلاق بذریعہ موبائل 330
s نابالغہ کا نکاح 331
s ولیمہ کی شرعی حیثیت 332
s کیا شادی غربت کا علاج ہے؟ 333
s شادی کے موقع پر چھوہارے پھینکنا 334
s عورت کا طلاق نامہ پھاڑ دینا 335
s مسئلہ طلاق 336
s شوہر کا بیوی کو چھوڑ جانا طلاق نہیں 337
s نکاح کے لیے ایجاب وقبول 338
s میسج کے ذریعے طلاق 338
s انٹرنیٹ کے ذریعے نکاح 339
s سہاگ رات دو رکعت پڑھنا 340
s طلاق کی مشروعیت اور اس کے اسباب 341
s طلاق دینے کا حق صرف مرد کو ہے 342

s سن رسیدہ کے لیے عدت وفات 343
s طلاق کے لیے غیر صریح الفاظ 343
s عقد نکاح کا خود بخود ختم ہونا 344
s نکاح کے وقت حقیقی نکاح کی نیت نہیں 346
s دو بہنوں کو نکاح میں لانا 347
s عیسائی لڑکی سے شادی کرنا 347
s دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا 348
s شادی پر عورت کے تحائف 349
s خاوند کا انتخاب 350
s مسلمان عورت کا عیسائی سے شادی کرنا 350
s طلاق کی نیت سے نکاح کرنا 351
s طلاق دینے کا طریقہ 352
s عدت وفات کا آغاز 353
s دوران عدت بیوی کو طلاق دینا 353
s موبائل فون کے ذریعے طلاق دینا 354
s مسئلہ رضاعت 355
s شرعی حق مہر 356
s زیادہ افراد پر مشتمل بارات اور پر تکلف ولیمہ 357
s وظیفہ زوجیت سے پہلے طلاق 358
s گونگے بہرے کا نکاح 359
s ولیمہ کیا ہے؟ 360
s سوتیلی والدہ کی بیٹی سے شادی کرنا 361
s بیوہ عورت کا ولی کے بغیر نکاح کرنا 362
s سالی سے اپنے بیٹے کی شادی کرنا 363
s بانجھ پن کی وجہ سے طلاق دینا 364
s مطلقہ بیوی کا جہیز کی واپسی کا دعویٰ 365

s بیوی کی رفاقت آخری خاوند سے 366
s مرد کے لیے ولی ہونے کی شرط 368
s غصے میں طلاق دینا 368
s لاپتہ خاوند کی بیوی کیا کرے؟ 370
s لڑکی کو ناپسندیدہ شخص سے شادی پر مجبور کرنا 371
s نکاح کی رجسٹریشن 373
s نکاح حلالہ 373
s حق مہر میں اسراف 375
s خاندان سے باہر شادی کرنا 376
s دوران حمل طلاق دینا 376
s ممانی سے نکاح 377
s شوہر دیدہ عورت کے لیے ولی کی ضرورت 378
s مسلمان خاتون کا عیسائی مرد سے نکاح 379
s نکاح مسیار کی حقیقت 380

s بندوق کا شکار 384
s جانور کو ذبح کر کے اس کے منکے کو توڑنا 384
s قربانی کی شرعی حیثیت 385
s مشترکہ قربانی کرنے والوں پر پابندی 386
s مخنث جانور کی قربانی 387
s قربانی کرنے والی عورت کے لیے کنگھی کرنا 387
s اگر قربانی کا جانور ضائع ہو جائے 387
s کیا قربانی ایک مالی ضیاع ہے؟ 389
s اونٹ میں حصوں کی تعداد 389
s حاملہ جانور کی قربانی 391

s میت کی طرف سے قربانی 391
s نومولود کا نام کب رکھا جائے؟ 393
s عقیقہ اور والدہ کی وفات 394
s غیر مسلم کو قربانی کا گوشت دینا 395
s رات کے وقت قربانی کرنا 395
s قربانی کا جانور تبدیل کرنا 396
s ذبح کا طریقہ 397
s مقروض شخص کا قربانی کرنا 398
s جانور کو ذبح کرنا 399
s کیا قربانی کرنا دولت کا ضیاع ہے؟ 400
s قربانی کے بجائے جانور کی قیمت صدقہ کرنا 402
s قربانی اور اس کے عیوب 404
s ذبح کرنے کا طریقہ 406

s قومی امانت 412
s خواتین کا دعوتی پروگرام 413
s عورتوں سے اختلاط 414
s عورت کا ملازمت کرنا 415
s غیر مسلم کو سلام کا جواب 416
s موبائل کا استعمال آداب مجلس کے منافی 416
s والدہ سے صلہ رحمی 417
s خاوند کے لیے وگ کا استعمال 417
s دورخا پن کی مذمت 418
s عورتوں کا مردوں کو دیکھنا 419
s گھر کی خاص باتیں دوسروں کو بتانا 420

s سابقہ خاوند کے باپ سے پردہ 421
s غیبت کی ایک جائز صورت 422
s ازدواجی راز افشا کرنا 423
s لڑکی والوں کی طرف سے رشتے کی پیشکش 424
s ولادت کے وقت بیوی کو تحفہ دینا 425
s عورتوں کی پہلی صف 425
s شادی کے بعد اپنی تعلیم مکمل کرنا 426
s اجنبی عورت سے بات کرنا 427
s بیوی کے معاملات میں غیر شوہر کی مداخلت 428
s لمبے ناخن رکھنا 429
s کھانے کے وقت تسمیہ 430
s تجارت کے بغیر کسی کے گھر سے کھانا 430
s ربیبہ کا محرم 431
s منہ بولے بھائی سے پردہ 432
s ایک معاشرتی برائی 433
s سالگرہ منانا اور کیک کاٹنا 434
s گھر میں ضرورت سے زیادہ بستر رکھنا 435
s کیا سابقہ سسر محرم ہے؟ 435
s منہ بولا بیٹا محرم بن سکتا ہے؟ 437
s سجدہ تلاوت کا حکم 437
s غیر مسلم کے تحفے قبول کرنا 438
s ابوعیسیٰ کنیت رکھنا 439
s بلاقصد قسم اٹھانا 440
s فحش فلمیں دیکھنے پر مجبور کرنا 441
s اعلیٰ تعلیم اور شادی 442
s نہار منہ پانی پینا 443

s سسرالی رشتے کا احترام 444
s راستہ تنگ کرنا 445
s نومولود کا اچھا نام رکھنا 446

s مسجد میں نکاح کرنا 450
s مساجد میں سماجی تقاریب کا انعقاد 450
s مسجد میں تھوکنا 452
s حوروں کا حق مہر 453
s مسجد میں گم شدہ حیوانات کا اعلان کرنا 454
s مسجد میں گم شدہ بچے کا اعلان 455
s مسجد میں نماز جنازہ 456
s عورتوں کا مسجد میں نماز ادا کرنا 457
s قسم کے لیے مسجد میں جانا 457
s مسجد میں محفل حمد ونعت 459
s مسجد میں دوسری جماعت کرانا 460
s اہل قبلہ کون ہیں؟ 461
s تمام مساجد میں ایک ہی وقت اذان 462
s عورتوں کا مسجد میں نماز عید ادا کرنا 464

s رنج والم اور پریشانی کا علاج 468
s بے وضو دعا کرنا 469
s دعا میں اضافہ 469
s سیدنا ابو ہریرہ t کے لیے دعا 470
s دفن کے بعد قبر پر اجتماعی دعا 471
s قبولیت دعا کے آداب 471

s فوت شدہ کو مرحوم ومغفور کہنا 472
s تیزیٔ نظر کے لیے ایک غلط وظیفہ 473
s میت کے لیے اجتماع اور اجتماعی دعا 474
s خارش کا دم اور علاج 476
s نماز اشراق اور اس کی فضیلت 477

s مردوں کے لیے مہندی کا استعمال 480
s چھوٹی بچیوں کو غیر شرعی لباس پہنانا 481
s عورتوں کے لیے سونا پہننا 481
s عورت کا اپنے بال کٹوانا 482
s عورت کا لباس 484
s سر کو کھلا رکھنے کا قانون 484
s شرعی حجاب 485
s سفید بالوں کو رنگنا 486

s حقوق اللہ اور حقوق العباد 490
s شوہر کے کہنے پر والدین سے قطع تعلقی 492
s صرف ایک بیٹے کو ہبہ دینا 493
s خاوند کی اطاعت اور اس کی حدود 494
s خدمت میں ماں کا حق 495
s قرض کی عدم ادائیگی 496
s بیوی کے والدین کی عزت 497
s حرام کمائی سے اخراجات پورے کرنا 498
s خطیب کا حاضرین کو سلام کہنا 499
s نمازی بیوی اور بے نماز خاوند 500

s ماں کا بیٹے کو گالیاں دینا 501
s میرا خاوند میری پرواہ نہیں کرتا 502
s بیوی کے اخراجات 504
s بیوی کے لیے رہائش کا بندوبست 505
s بیوی کا بلا اجازت گھر سے نکلنا 506
s نذر کی جہت تبدیل کرنا 506
s باپ پر خرچ کرنا 507
s بیوی بچوں پر خرچ کرنا 508
s لے پالک سے پردہ 509
s قسم اٹھاتے وقت ان شاء اللہ کہنا 510
s ''ان شاء اللہ'' کو ''انشاء اللہ'' لکھنا 510
s نذر کا پورا کرنا 511
s نابینا سے پردہ 512

s رات کی آخری تہائی کی فضیلت 516
s ابوالقاسم کنیت رکھنا 516
s سیر وتفریح کے لیے غیر مسلم ممالک کا سفر 517
s عورت کا رحم نکال دینا 518
s خواب کی حقیقت 518
s کیرم بورڈ اور لڈو کھیلنا 520
s کبوتر بازی اور تیتر بازی 520
s نبیذ کیا ہوتا ہے؟ 521
s لقب فاروق 522
s شراب کا اجازت نامہ 523
s بخار کے لیے ٹھنڈا پانی 523

s غیر مسلم ٹیچر سے تعلقات 524
s سر کے بال زمین میں دفن کرنا 525
s عورتوں کے لیے اللہ کا سایہ 526
s منہ کے بل لیٹنا 526
s استحقاق سے کم نمبر دینا 527
s فتنے سے بچاؤ کی تدابیر 528
s زلزلے کیوں آتے ہیں؟ 528
s زانی شخص کا توبہ کے بغیر مرنا 529
s سینگی کے ذریعے علاج 530
s مردہ مچھر اور مکھی کا حکم 531
s عمر رسیدہ عورت سے مصافحہ کرنا 532
s مصنوعی تنفس سے زندہ رکھنا 533
s نذر کا پورا کرنا 534
s محبت کا علاج 535
s لینز کا استعمال 536
s روحانی معالجوں کی حیثیت 537
s موبائل میں گھنٹی کے بجائے قرآنی آیات کی آواز 537
s گھٹی دینے والے کے کردار کا اثر 538
s ریشم کا استعمال 539
s امام کے پیچھے قرآن کھول کر کھڑے ہونا 540
s بھتہ وصول کرنا 540
s رسول اللہ e کا دیدار 541
s حافظ قرآن کی سفارش 542
s شادی سے پہلے اعلیٰ تعلیم کی تکمیل 543
s کیا امت کا اختلاف باعث رحمت ہے؟ 544
s بچے کو دودھ پلانے کی حیثیت 546

s جس کے باپ کا علم نہ ہو 547
s لے پالک کی نسبت 548
s اماں حلیمہ سعدیہ کا اسلام 549
s ٹخنوں کے نیچے کپڑا لٹکانا 549
s عاشوراء محرم اور توسیع طعام 551
s عورت کے لیے حلاوت ایمان 552
s قسم اور اس کا کفارہ 554
s ایک روایت کی تحقیق 555
s عشق کے متعلق ایک روایت 556
s پھانسی کی سزا 558
s بیوی کا الگ اکاؤنٹ 560
s ہر خواب قابل تعبیر نہیں ہوتا 561
s لے پالک بیٹے کی نسبت 562
s نا تمام بچے کا نام رکھنا 563
s گناہ دیکھ کر خاموش رہنا 564
s خوبصورتی کے لیے ابرو کے بال اتارنا 565
s مانع حیض ادویات کا استعمال 565
s رحم مادر میں جنین کی جنس کا پتہ چلانا 567
s ناجائز حمل کا اسقاط 569
s پراندے کی شرعی حیثیت 571
s اثر انگیز اشعار 573
s سانپوں کے متعلق ہدایات 574
s لفظ ''مولوی'' یا ''مولانا'' کا استعمال 576
s بھینس اور خنزیر کا ملاپ 578
s انسانی اعمال میں جنات کی مداخلت 580
s خچر کی پیدائش 582

پیش لفظ

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحاب اجمعین وبعد۔

دور حاضر میں ہم دنیوی لحاظ سے ترقی کی منازل طے کررہے ہیں اور روشن خیالی کے دعویدار ہیں لیکن دینی لحاظ سے تنزل وانحطاط کا شکار ہیں، غالباً انہی حالات کے متعلق رسول اللہ e نے بطور پیش گوئی فرمایا تھا:

''ایک وقت آنے والا ہے کہ حقیقی علم قبض کرلیا جائے گا اور جہالت کا ظہور ہوگا۔'' 1

ایک دوسری روایت میں ہے:

''جہالت چھا جائے گی اور حقیقی علم اٹھا لیا جائے گا۔'' 2

ایک حدیث کے الفاظ بایں طور ہیں:

''حقیقی علم زائل ہوجائے گا اور جہالت ہر سو پھیل جائے گی۔'' 3

ہمارے ہاں جس علم کا چرچا ہے اور جسے وجہ افتخار خیال کیا جاتا ہے، اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''لوگ دنیا کی زندگی کے متعلق صرف ظاہری علم رکھتے ہیں اور معاملاتِ آخرت سے وہ غفلت کا شکار ہیں۔'' 4

امام بخاری نے حقیقی علم کے اٹھ جانے کے متعلق ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''کیف یقبض العلم'' 5

''علم کیسے اٹھا لیا جائے گا؟''

پھر اس کی وضاحت کے لیے ایک حدیث پیش کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

''اللہ تعالیٰ دین کے علم کو ایسے نہیں اٹھائے گا کہ اسے بندوں کے سینوں سے نکال دے بلکہ اہل علم کو موت دے کر علم کو اٹھائے گا۔ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جہلاء کو پیشوا بنالیں گے، ان سے مسائل پوچھے جائیں گے تو وہ علم کے بغیر فتوے دے کر خود ہی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔'' 6

! بخاری، العلم:۸۵.
@ بخاری، الفتن:۷۰۶۲.
# بخاری، الفتن:۷۰۶۶.
$ الروم:۷.
% بخاری، العلم، باب نمبر۳۴.
^ بخاری، العلم:۱۰۰.

حافظ ابن حجر نے حضرت ابوامامہ سے مروی ایک حدیث بیان کی کہ رسول اللہ e نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:

''علم کو اٹھا لینے سے پہلے پہلے (اسے) حاصل کرو۔''

ایک دیہاتی نے یہ سن کر عرض کیا، یا رسول اللہ! علم کیسے اٹھا لیا جائے گا؟ تو آپ نے فرمایا:

''حاملین علم کے فوت ہونے کے ساتھ علم رخصت ہو جائے گا۔''

یہ بات آپ نے تین مرتبہ فرمائی۔ 1

اگر چہ اللہ تعالیٰ علوم وفنون کو سینوں سے محو کر دینے پر قادر ہے لیکن ان احادیث کے مطابق وہ ایسا نہیں کرے گا بلکہ قبض علم کی یہ صورت ہوگی کہ خود اہل علم ختم ہو جائیں گے اور آگے علماء پیدا نہیں ہوں گے پھر جہلاء ان علماء کی جگہ پر براجمان ہوں گے اور گمراہی پھیلائیں گے۔ ان احادیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علم حدیث کی بنیاد پر فتویٰ دینا ہی حقیقی ریاست وامارت ہے۔

بہر حال آج کل مختلف ٹی وی چینلز پر ''فتویٰ آن لائن'' کے نام سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ مذکورہ احادیث میں بیان کردہ پیش گوئی کا ہی پیش خیمہ ہے۔ علم کے بغیر فتویٰ دینا کس قدر سنگین جرم ہے، اس کا اندازہ رسول اللہ e کے عہد مبارک میں ایک ہونے والے واقعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت جابر t بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں نکلے تو ہمارے ایک ساتھی کو پتھر لگ گیا، جس کی وجہ سے اس کے سر میں زخم آ گیا، اتفاق سے اسے احتلام ہوا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا: آیا میرے لیے کوئی گنجائش ہے کہ میں غسل کرنے کے بجائے تیمم کر لوں؟ انہوں نے جواب دیا، ہم تیرے لیے کوئی رخصت نہیں پاتے جبکہ تجھے پانی کے استعمال پر قدرت حاصل ہے، چنانچہ اس نے غسل کر لیا پھر وہ فوت ہو گیا۔ حضرت جابر t بیان کرتے ہیں کہ جب ہم رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا:

''انہوں نے اسے قتل کر ڈالا، اللہ انہیں ہلاک کرے، انہوں نے اس مسئلہ کے متعلق پوچھ کیوں نہ لیا جبکہ انہیں علم نہیں تھا، بلاشبہ عاجز اور درماندہ انسان کی شفا؟؟ کر لینے میں ہے۔'' 2

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علم کے بغیر فتویٰ دینا بہت بڑی جہالت ہے، ایسے حالات میں اہل علم کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان سے راہنمائی لینی چاہیے، لیکن ہم بڑے قلق اور افسوس سے اس بات کا اظہار کر رہے ہیں کہ آج دین وشریعت کے نام پر نااہل اور اباحیت پسند مفتیوں کے خانہ ساز فتووں کے سہارے حدود اللہ کو پامال کیا جا رہا ہے، حلال کو حرام اور حرام کو حلال کہنے میں ذرا بھی شرم محسوس نہیں کی جاتی، حتیٰ کہ ''اس بازار'' کی رونقیں بھی جواز قسم کے مکروہ فتاویٰ کی وجہ سے قائم ہیں، اس کے علاوہ سودی معیشت کو فروغ دینے کے لیے سرکاری ملاؤں اور علماء سو کے فتوے بنکوں، تکافلی کمپنیوں اور دیگر سودی اداروں کا رأس المال ہیں۔

ویسے تو اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے لوگوں کو جس طرح ذلیل وخوار کیا ہے، وہ اپنی جگہ نشان عبرت ہے۔ ایسے لوگوں کے

! فتح الباری، ص: ۲۵۷ ج۱۔ @ابوداود، الطہارۃ: ۳۳۶۔

متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''کسی چیز کو اپنی زبان سے بطور جھوٹ نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تاکہ اللہ پر جھوٹ باندھنے لگو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والے کامیابی سے محروم ہی رہتے ہیں۔'' 1

بہرحال نااہل مفتیوں کے فتاویٰ سے جو علمی، دینی اور معاشرتی نقصانات ہوتے ہیں، انہیں ہم آئندہ کسی محفل میں بیان کریں گے سردست ایک حدیث پیش خدمت ہے۔

حضرت ابو ہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جس کسی مفتی نے علم کے بغیر فتویٰ دیا تو عمل کرنے والے کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا۔'' 2

بہرحال دینی اور شرعی مسائل میں غلط فتویٰ دینا یا راجح کے بجائے مرجوح بات بتانا بہت بڑی خیانت ہے، اس کی سنگینی کو رسول اللہ e نے درج بالا حدیث میں بیان فرمایا ہے۔

بلاشبہ فتویٰ پوچھنے اور فتویٰ دینے کا سلسلہ رسول اللہ e کے زمانہ مبارک سے شروع ہوتا ہے۔ پندرہ سو سال کے طویل عرصہ میں مفتیان کرام نے اس شعبے کی اہمیت کے پیش نظر اس کا خصوصی اہتمام کیا ہے، تمام اہل اسلام اکثر اپنے دینی اور دنیاوی امور میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں، ان امور کا تعلق خواہ عقائد وعبادات سے ہو یا معاملات واخلاق سے یا باہمی اختلافات ونزاعات سے، ہر حال میں وہ ان کے متعلق شریعت کا حکم معلوم کرنے کے لیے مفتیان امت سے مدد لیتے رہے اور ان حضرات نے افتاء کو اپنا فریضہ منصبی تصور کرتے ہوئے ہمیشہ ان کی صحیح راہنمائی کی ہے وللہ الحمد۔

منصب افتاء اور مفتی کی عظمت شان کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دو مقامات پر فتویٰ کی نسبت اپنی ذات اقدس کی طرف کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ﴾ 3

''اور لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیں کہ اللہ تمہیں ان کے متعلق فتویٰ دیتا ہے۔''

دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ﴾ 4

''لوگ آپ سے فتویٰ دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔''

رسول اللہ e، صحابہ کرام، تابعین عظام، ائمہ دین اور علمائے امت نے اس ذمہ داری کو بخیر وخوبی نبھایا اور یہ سلسلہ

! النحل: ۱۱۶۔ @ ابوداؤد، العلم: ۳۶۵۷۔
النساء : ۱۲۷۔ $ النساء: ۱۷۶۔

تاھنوز جاری ہے اور اللہ کی توفیق سے قیامت تک جاری رہے گا۔اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دور نبوت میں سوالات کی معمولی سی جھلک پیش کر دی جائے۔

حضرت عدی بن حاتم t بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ عرض کیا یا رسول اللہ! ہم میں سے کوئی شکار کرتا ہے لیکن اس کے پاس ذبح کرنے کے لیے چھری نہیں ہوتی تو کیا وہ اسے پتھر سے یا لکڑی کے تیز چھٹے سے ذبح کر لے؟ رسول اللہ e اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

''خون بہاؤ، جس سے بھی تم چاہو اور اللہ کا نام ذکر کرو۔'' 1

چنانچہ اس اجازت نبوی کے بعد حارثہ کے ایک آدمی نے لوہے کی میخ کے ساتھ اونٹنی کو نحر کیا تو رسول اللہ e نے اسے کھانے کی اجازت دی۔ 2

اسی طرح حضرت محمد بن صفوان t نے تیز دھاری دار پتھر سے دو خرگوش ذبح کیے پھر رسول اللہ e سے ان کے متعلق سوال کیا تو آپ نے انہیں تناول کرنے کے اجازت دی۔ 3

رسول اللہ e نے ایک مرتبہ فرمایا:

''ہر نبی کے لیے ایک دعا مقبول تھی جو اس نے دنیا میں کر لی، لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنی دعا کو آخرت میں اپنی امت کی سفارش کے لیے محفوظ رکھوں۔'' 4

ایک موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے حضرت ابو ہریرہ t نے سوال کر دیا:

''یا رسول اللہ! قیامت کے دن آپ کی سفارش کی سعادت سب سے زیادہ کون حاصل کرے گا؟ رسول اللہ e نے فرمایا:

ابو ہریرہ! میرا بھی یہی خیال تھا کہ یہ بات تم سے پہلے کوئی اور مجھ سے نہیں پوچھے گا کیونکہ حدیث کے سلسلہ میں، میں تجھے بہت زیادہ حریص پاتا ہوں۔ قیامت کے دن میری سفارش کی سعادت سب سے زیادہ اسے حاصل ہو گی جس نے کلمہ لا الٰہ الا اللہ ،خلوص دل سے پڑھا ہوگا۔'' 5

چونکہ فتویٰ کا موضوع اللہ کی طرف سے نازل شدہ احکام بیان کرنا ہے تاکہ اس کے مطابق عمل کیا جا سکے اس لیے مفتی کو اللہ تعالیٰ کا ترجمان قرار دیا جاتا ہے نیز مفتی کسی خاص امام کا نمائندہ نہیں ہوتا بلکہ وہ امام النّبیین رسول اللہ e کا جانشین ہوتا ہے جیسا کہ علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

! ابوداؤد، الضحایا:۲۸۲۴.
@ ابوداؤد، الضحایا:۲۸۲۳.
# ابوداؤد، الضحایا:۲۸۲۲.
$ بخاری،ا لدعوات:۶۳۰۴.
% بخاری،ا لرقاق:۶۵۷۰.

’’مفتی امت میں رسول اللہ e کا قائم مقام ہوتا ہے، کیونکہ علماء حضرات حضرات انبیاء o کے وارث ہیں اور انبیاء کرام اپنے ترکہ میں درہم و دینار نہیں بلکہ علم وحکمت چھوڑ کر جاتے ہیں۔‘‘ 1

حقیقت یہ ہے کہ ہر دور کے مفتی اپنے عہد کے ھادی اور راہنما ہوتے ہیں جو اقتدار کی جنگ میں الجھے بغیر امت کی تعلیم و تربیت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

فتویٰ کی اہمیت اور مفتی کے مقام و مرتبہ کے پیش نظر خلافت اسلامیہ کے کسی دور میں بھی فتویٰ کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا گیا اور نہ ہی مفتی کو غیر اہم خیال کیا گیا۔ ان کے حق کی تعیین کے لیے شاہی فرمان جاری ہوئے بغیر ہی ہمیشہ ان کا اور ان کے عالی شان منصب و مقام کا احترام کیا گیا۔ اقتدار کے نشہ میں مدہوش حکام و امراء نے بھی اپنی مرضی کے فتاویٰ حاصل کرنے یا اپنے ناپسندیدہ فتاویٰ کو غیر اہم اور نا قابل التفات قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا، اس سلسلہ میں امام مالک، امام احمد بن حنبل اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ S، جسے اساطین علم کا صبر وثبات اہل علم کے لیے عزم و استقلال اور استقامت کا روشن باب اور مدعیان علم و جہاد کے لے قابل عمل نمونہ نیز علم برداران فقہ واجتہاد کے لیے بہترین مثال ہے۔

ہم عرصہ دراز سے ان ائمہ حدیث کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اصلاح امت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں، چنانچہ فتاویٰ اصحاب الحدیث کی یہ پانچویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے جو دراصل ہفت روزہ اہل حدیث سال 2014، 2015، 2016ء میں احکام ومسائل کے عنوان سے شائع ہونے والے سوالات و جوابات کا مجموعہ ہے، جنہیں دخترم حامدہ حماد اور ان کے شوہر نامدار عزیزم کاشف نصیر نے بہت محنت اور عرق ریزی سے یکجا کیا پھر فقہی ترتیب وتبویب سے مرتب کر کے قارئین تک پہنچایا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس علمی جدوجہد کو قبول فرمائے اور ان کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے۔

قارئین کرام! ہمارا آئندہ پروگرام یہ ہے کہ ان پانچوں جلدوں کو یکجا کر دیا جائے، ان میں آنے والے متفرق مسائل کو ایک جگہ پر کر دیا جائے، مثلاً توحید وعقیدہ، طہارت و وضو، اذان ونماز اور جمعہ وعیدین وغیرہ کے مسائل جو متفرق طور پر پانچوں جلدوں میں ہیں انہیں ایک جلد میں جمع کر دیا جائے اس کے لیے حسب پروگرام کام شروع کر دیا گیا ہے، قارئین کرام سے اپیل ہے کہ وہ اس کی تکمیل کے لیے دعا جاری رکھیں۔

میرے عزیز جناب محمد سرور عاصم مدیر مکتبہ اسلامیہ لاہور/ فیصل آباد کے والد گرامی کا اس سال انتقال پر ملال ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون- اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور کروٹ کروٹ انہیں اپنے ہاں رحمت و برکت سے ہمکنار کرے، قبل ازیں ان کی والدہ محترمہ اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں، اللہ تعالیٰ انہیں بھی جوار رحمت میں رکھے، ان جانکاہ صدمات کے باوجود عزیزم نے اسے شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل اور خلوص بھری زندگی میں برکت دے اور ان کے بچوں کو دنیا وآخرت میں کامیابی سے ہمکنار کرے۔

---

1 الموافقات، ص : ۲۴۴-۴۹.

آخر میں پھر اللہ کے حضور دست بدعا ہوں کہ وہ مؤلف و مرتب، ناشر اور اس کی اشاعت میں کسی بھی طرح حصہ لینے والوں کو قیامت کے دن رسول اللہ e کے دست مبارک حوض کوثر کا پانی پینے کی سعادت بخشے۔ پھر آپ کی معیت میں جنت فردوس جانے کی توفیق دے۔ (آمین)

طالب الدعوات
ابو محمد عبد الستار الحماد
مرکز الدراسات الاسلامیہ
سلطان کالونی میاں چنوں

تاریخ تحریر:
یکم اگست ۲۰۱۷ بروز منگل
موبائل: ۰۳۰۰۔۴۱۷۸۶۲۶

رسول اللہ e کا اپنے رب ذوالجلال کو دیکھنا

] کیا یہ بات صحیح ہے کہ رسول اللہ e نے معراج کے موقع پر اپنے رب تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[معراج کے موقع پر رسول اللہ e نے اپنے رب تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔اس موقع پر جن آیات کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے، اس سے مراد حضرت جبریل u کو دیکھنا ہے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعود t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے حضرت جبرائیل u کو دیکھا تھا،ان کے چھ سو پر تھے۔ 1

حضرت مسروق فرماتے ہیں کہ میں نے سیدہ عائشہ صدیقہ r سے پوچھا: امی جان! کیا رسول اللہ e نے اپنے رب تعالیٰ کو دیکھا تھا؟

تو آپ نے فرمایا: تیری بات سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے ہیں، تین باتیں ایسی ہیں جو ان میں سے ایک بھی کہے گا وہ جھوٹ بولنے کا مرتکب ہوگا۔ان میں سے ایک یہ ہے: جو شخص یہ کہے کہ حضرت محمد e نے اپنے رب کو دیکھا تھا اس نے جھوٹ بولا۔ پھر آپ t نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝﴾ 2

’’اللہ کو کوئی آنکھ نہیں پاسکتی اور وہ سب نگاہوں کو پاسکتا ہے، وہ بہت باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔‘‘

پھر سیدہ عائشہ r نے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

’’﴿وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى﴾ سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ e نے حضرت جبرائیل u کو ان کی اصل شکل میں دیکھا تھا۔‘‘ 3

اس تفصیلی روایت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ e نے معراج کے موقع پر اپنے رب ذوالجلال کو کھلی آنکھ سے نہیں دیکھا

! بخاری، التفسیر: ۴۸۵۶۔ @ الانعام: ۱۰۳۔
بخاری، التفسیر: ۴۸۵۵۔

تھا۔(واللہ اعلم)

عورت میں نحوست

] کیا کسی حدیث میں آیا ہے کہ عورت کا وجود باعث نحوست ہے؟ حالانکہ عورت کے وجود سے دنیا کی رونق ہے۔ اگر حدیث میں اس طرح کا کوئی اشارہ یا صراحت ہے تو اس کا کیا مفہوم ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کر دیں۔

[دور جاہلیت میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ گھوڑے، مکان اور عورت میں ذاتی طور پر نحوست ہوتی ہے۔ ان کے ہاں یہ بات معروف تھی کہ اگر کسی کام کے لیے جاتے وقت عورت سامنے آ گئی تو اسے اپنے لیے منحوس خیال کرتے ہوئے اس کام سے واپس آ جاتے، تاہم اسلام نے اس طرح کی نحوست کو بے اصل اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔

البتہ بعض احادیث میں عورت کی نحوست کا ذکر ہے جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر W بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''نحوست عورت، مکان اور گھوڑے میں ہوتی ہے۔'' 1

ایک روایت میں مزید وضاحت ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ e کے پاس نحوست کا ذکر کیا تو آپ e نے فرمایا: ''اگر نحوست کسی چیز میں ہو تو مکان، عورت اور گھوڑے میں ہو سکتی ہے۔'' 2

دراصل رسول اللہ e کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ بدشگونی اور نحوست اگر ہو تو ان مذکورہ تین اشیاء میں ممکن ہے، لیکن یہ کوئی یقینی نہیں جیسا کہ دور جاہلیت میں لوگوں کا عقیدہ تھا۔ وہ بھی تمام میں نہیں بلکہ کچھ میں ہو سکتی ہے جیسا کہ امام بخاری a نے اس سلسلہ میں ایک آیت کا حوالہ دیا ہے:

﴿اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ وَ اَوۡلَادِكُمۡ عَدُوًّا لَّكُمۡ﴾ 3

''بے شک تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے کچھ تمہارے دشمن ہیں۔''

اگر یہ دونوں رشتے اللہ کے نافرمان ہیں تو انسان کے لیے دشمن اور منحوس ہیں، اس سے عورت کے منحوس ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس سے مراد اس کا نافرمان ہونا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

''اچھے سلوک والا باعث برکت اور برے اخلاق والا موجب نحوست ہے۔'' 4

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ e نے عورت کی نحوست کو بایں الفاظ بیان فرمایا ہے:

''نیک عورت، اچھا مکان اور بہترین سواری کا میسر آنا ابن آدم کی نیک بختی اور بری عورت، گندا مکان اور ناکارہ سواری کا ہونا ابن آدم کے لیے باعث نحوست اور بدبختی ہے۔'' 5

! بخاری، النکاح: ۵۰۹۳۔ @ بخاری، النکاح: ۵۰۹۴۔

التغابن: ۱۴۔ $ ابوداؤد، الادب: ۵۱۶۲۔

% مسند الامام احمد: ۱/ ۱۶۸۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ ''تین چیزیں منحوس ہیں: (ا) عورت جسے تو دیکھے تو تجھے بری لگے اور تجھ سے بدزبانی کرے۔ (۲) سست گھوڑا اگر تو اسے مارے تو تجھے مشقت اٹھانا پڑے اور اگر اسے کچھ نہ کہے تو تجھے ساتھیوں تک نہ پہنچا سکے۔ (۳) وہ مکان جو تنگ و تاریک ہو اور تجھے اس میں فائدہ بہت کم ہو۔'' 1

دراصل نحوست کے دو معنی ہیں: (ا) اس کا بے برکت ہونا (۲) طبیعت پر کسی چیز کا ناگوار ہونا۔

جن روایات میں نحوست کی نفی ہے، اس سے مراد پہلا معنی ہے اور جن میں اثبات ہے اس سے مراد دوسرا معنی ہے۔

بیوی، سواری اور گھر اگر دین و دنیا میں مفید ثابت نہ ہوں تو ان کے بدل لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بیوی جو بدمزاج، جھگڑالو اور خدمتگار نہ ہو اور نہ ہی دینی معاملات میں اس کی معاونت کرے تو ہر وقت حزن و ملال کو پالتے رہنا قرین مصلحت نہیں، اسے بدل لیا جائے۔ اسی طرح سواری اگر ناموافق اور اڑیل ہے تو دردسر بنائے رکھنا نیز وہ گھر جو تنگ و تاریک ہو اس کے ہمسائے اچھے نہ ہوں تو اسے بدل لینے میں چنداں حرج نہیں۔ بہرحال عورت ذاتی طور پر منحوس نہیں بلکہ اس کے اخلاق رذیلہ اسے منحوس بنا دیتے ہیں۔ واللہ اعلم

قرآن مجید ہاتھ میں لے کر بات کرنا

] ایک آدمی قرآن حکیم ہاتھ میں لے کر بات کرتا ہے کہ میں آپ کو اتنی رقم دوں گا، اگر وہ نہیں دیتا تو کیا اس پر قسم کا کفارہ پڑ جاتا ہے؟ اور اگر کفارہ ہے تو وہ کتنا ہے؟ کیا بات کرتے وقت یہ انداز اختیار کرنا شریعت کے مطابق درست ہے یا نہیں؟ وضاحت کریں۔

[قرآن مجید لوگوں کی رشد و ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے، جو اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں گے اللہ تعالیٰ انہیں اوج ثریا تک پہنچائے گا اور جو اس کی ہدایت سے روگردانی کریں گے انہیں قعر مذلت میں پھینک دے گا۔

جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے بہت سی قوموں کو بلند کر دیتا ہے اور اسی کتاب پر عمل نہ کرنے کی پاداش میں انہیں نیچے گرا دیتا ہے۔'' 2

ایک مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ قرآن کریم ہاتھ میں لے کر لوگوں میں اپنا اعتماد بحال کرے اور چھوٹی چھوٹی باتوں اور حقیر چیزوں پر قرآن اٹھائے اور نہ ہی قرآن اٹھانے سے قسم کا انعقاد ہوتا ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص ہاتھ میں قرآن لے کر قسم اٹھاتا ہے تو اس کا پورا کرنا ضروری ہے اور خلاف ورزی پر اس کا کفارہ دینا پڑتا ہے جو حسب ذیل ہے: ☆ دس مساکین کو پیٹ بھر کر کھانا کھلائے جو اوسط درجے کا ہو۔ ☆ دس مساکین کو لباس پہنائے۔ ☆ اگر ان دونوں میں سے کسی کی طاقت نہ رکھتا ہو تو صرف تین دن کے روزے رکھے۔ اس کفارۂ قسم کی وضاحت قرآن کریم کی سورۃ الحدید آیت ۸۹ میں ہے۔ واللہ اعلم

! مستدرک الحاکم: ۲/ ۱۶۲.

@ مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۸۱۷.

حضرت امام مہدی کی آمد

] ایک دوست نے ظہور مہدی کا انکار اس بنیاد پر کیا ہے کہ بہت سے جھوٹے دعویدار دنیا کو دھوکہ دیتے ہیں اور فساد کا باعث بنتے ہیں۔ کیا ہماری شریعت محمدی میں حضرت امام مہدی کی کوئی حقیقت ہے یا کوئی فرضی کردار ہے؟ وضاحت کریں۔

[ہمارے ہاں کچھ لوگ ظہور مہدی کے متعلق افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ کچھ حضرات نے ان کی شخصیت اور آمد کا ہی انکار کر دیا ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے۔ جبکہ کئی طبع آزما قسم کے لوگوں نے اپنی بابت مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہے جن میں ایک بدنصیب مرزا غلام قادیانی بھی تھا۔ شریعت اسلامیہ میں حضرت مہدی کا ظہور ایک اٹل حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ ان کے متعلق اتنی احادیث کتب حدیث میں مروی ہیں جو حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔ چنانچہ ہمارے استاد محترم شیخ عبدالمحسن عباد نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، انہوں نے ثابت کیا ہے کہ حضرت مہدی کی آمد سے متعلقہ احادیث متواتر ہیں اور وہ تقریباً چھبیس صحابہ کرام y سے مروی ہیں۔ نیز اڑتیس محدثین کرام s نے ان احادیث کا تذکرہ اپنی کتب میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی آمد کے متعلق رسول اللہ e نے پیش گوئی فرمائی ہے، لہٰذا اس پر ایمان لانا اور اس کی تصدیق کرنا ہمارے عقیدہ میں شامل ہے۔

امام مہدی کے متعلق مروی احادیث چار قسم کی ہیں:

j صحیح احادیث j حسن احادیث j ضعیف احادیث j جھوٹی احادیث

لیکن جن صحیح احادیث میں مہدی کا ذکر ہے اس سے مراد وہ فرضی مہدی نہیں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اب بھی موجود ہے، بس وہ لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہے اور وہ عراق میں ایک غار کے اندر چھپا ہوا ہے، حد یہ ہے کہ لوگ گھوڑے لے کر اس غار کے سامنے جا کر کہتے ہیں: ''اے ہمارے سرپرست! اب باہر نکل آؤ، اے ہمارے سردار! اب ظہور فرماؤ۔''

یہ عقیدہ رکھنا کہ حضرت مہدی اب موجود ہیں بالکل بے اصل اور خرافات میں سے ہے اور حقیقت کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ مہدی جن کا ذکر احادیث میں ہے وہ دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہوں گے جو اپنے وقت پر پیدا ہوں گے اور اپنے وقت پر ان کی آمد ہوگی، جیسا کہ درج ذیل احادیث سے ثابت ہوتا ہے:

j سیدنا ابوہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی جب سیدنا عیسیٰ بن مریم i تم میں اتریں گے اور تمہارا امام تم ہی میں سے ہوگا۔'' 1

j سیدنا جابر t کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ e کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''سیدنا عیسیٰ u جب اتریں گے تو مسلمانوں کے امیر ان سے کہیں گے: آئیں، نماز پڑھائیں تو وہ کہیں گے کہ نہیں، تمہارا امام بھی تم ہی میں سے ہوگا۔'' 2

! بخاری، احادیث الانبیاء: ۳۴۴۹. @ مسلم، الایمان: ۳۹۶.

بخاری و مسلم کی ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عیسیٰ u کے نزول کے وقت مسلمانوں کا ایک امیر ہوگا۔ غالب گمان یہی ہے کہ وہ امیر حضرت مہدی ہوں گے کیوں کہ حضرت مہدی کے ظہور سے پہلے مسلمانوں کے ایک امیر کے تحت جمع ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اس کی تائید درج ذیل احادیث سے ہوتی ہے:

j سیدہ ام سلمہ r کا بیان ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''مہدی میرے خاندان اور سیدہ فاطمہ r کی اولاد سے ہوں گے۔'' 1

امام ابن کثیر a نے حضرت مہدی کا نسب نامہ یوں بیان کیا ہے: ''محمد بن عبداللہ العلوی الفاطمی الحسنی۔'' 2

j سیدنا علی t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''مہدی ہم میں سے یعنی اہل بیت میں سے ہوگا، اللہ تعالیٰ اسے ایک رات میں درست فرما دے گا۔'' 3

اس کا مطلب یہ ہے کہ مہدی میں اچانک قائدانہ صلاحیتیں بیدار ہو جائیں گی اور وہ حکمرانی کے لائق ہو جائے گا۔ اس حدیث سے سینکڑوں سال امام مہدی کے زندہ رہنے کی نفی بھی ہوتی ہے۔

j سیدنا عبداللہ بن مسعود t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''اگر دنیا کا صرف ایک دن بھی باقی رہ جائے تب بھی اللہ تعالیٰ اس کو اتنا طویل کر دے گا کہ میرے خاندان یا میرے اہل بیت میں سے ایک شخص کو خلیفہ بنائے گا، اس کا نام میرے نام پر ہوگا اور اس کے باپ کا نام بھی میرے باپ کے نام پر ہوگا۔'' 4

j سیدنا ابوسعید خدری t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''مہدی، میری نسل سے ہوگا، اس کی پیشانی فراخ اور ناک بلند ہوگی، وہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا جیسے وہ ظلم و زیادتی سے بھری ہوگی اور وہ سات سال تک حکومت کرے گا۔'' 5

اس سلسلہ میں ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ سیدنا عیسیٰ u ہی مہدی ہیں۔ 6

اس حدیث سے کچھ لوگوں نے یہ موقف کشید کیا ہے کہ حضرت مہدی سے مراد سیدنا عیسیٰ u ہیں لیکن یہ حدیث صحیح نہیں کیوں کہ اس کی سند میں ایک راوی محمد بن خالد الجندی ضعیف ہے۔ 7

ان احادیث میں ہمارے لیے یہ پیغام ہے کہ جس طرح دجال کی آمد کے لیے سٹیج تیار کیا جا رہا ہے ہمیں چاہیے کہ امام مہدی کی آمد کے لیے محاذ گرم کریں اور پلیٹ فارم مہیا کریں کیوں کہ اس وقت اس امت کو غلبہ نصیب ہوگا۔

! ابوداوٗد، المہدی: ۴۲۸۴۔
@ النہایہ: ۱/ ۲۹۔
# ابن ماجہ، الفتن: ۴۰۸۵۔
$ ابوداود، المہدی: ۴۲۸۲۔
% مستدرک الحاکم: ۴/ ۵۵۷۔
^ ابن ماجہ، الفتن: ۴۰۳۹۔
& میزان الاعتدال: ۳/ ۳۵۔

دجال سے بچاؤ کا طریقہ

] ہم نے احادیث میں پڑھا ہے کہ دجال آخری زمانے میں ظاہر ہوگا، لیکن اس کے باوجود تمام انبیاء o نے اپنی امتوں کو دجال اور اس کے فتنے سے ڈرایا ہے، آخر ایسا کیوں ہے؟ نیز دجال سے بچاؤ کا کیا طریقہ ہے جس سے ہمیں آگاہ کیا گیا ہے؟

[لفظ دجال، دجل سے ماخوذ ہے، اس کا معنی دھوکہ دینا اور حقائق کو چھپانا ہے۔

دجال کا معنی یہ ہے کہ حقائق کو چھپا کر دھوکہ دینے والا، یقیناً وہ لوگوں کو سب سے زیادہ دھوکہ اور فریب دینے والا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ سیدنا آدم u کی پیدائش سے لے کر قیامت برپا ہونے تک روئے زمین پر سب سے بڑا فتنہ دجال کا ہوگا۔ یہ فتنہ انتہائی ہولناک ہوگا، یہی وجہ ہے کہ سیدنا نوح u سے لے کر آخر الزماں رسول حضرت محمد e نے اس سے خبردار کیا ہے تا کہ اس فتنے کی ہولناکی اور اس کا خطرہ واضح ہو جائے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''اگر میری موجودگی میں وہ آیا تو تمہاری بجائے میں خود اس سے نمٹ لوں گا اور اگر وہ میری عدم موجودگی میں رونما ہوا تو پھر ہر آدمی اپنی طرف سے خود اس سے نمٹے گا اور میرے بعد اللہ تعالیٰ ہی ہر مسلمان پر نگہبان ہے۔'' 1

رسول اللہ e ہر نماز میں فتنہ دجال سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ 2

رسول اللہ e نے دجال کا زمانہ پانے والے مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے کہ وہ اس کے سامنے آنے سے گریز کریں اور اس کا سامنا نہ کریں مبادا اس کے فتنے کا شکار ہو جائیں۔

آپ e نے فرمایا: ''جو شخص دجال کی خبر سنے وہ اس کے سامنے نہ آئے بلکہ اس سے دور رہے۔'' 3

قیامت کی بیشتر علامات کا ظہور ہو چکا ہے، اب دجال اکبر کا ظہور بھی ہونے والا ہے، ہمیں چاہیے کہ ان حفاظتی تدابیر کو اپنائیں جنہیں اختیار کرنے سے دجال اور اس کے فتنے سے محفوظ رہا جا سکتا ہے، وہ تدابیر حسب ذیل ہیں:

a...... اس کے فتنہ سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی جائے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''رسول اللہ e اپنی نمازوں میں دجال سے پناہ مانگا کرتے تھے۔'' 4 اور رسول اللہ e اپنے صحابہ کرام y کو بھی اس فتنے سے پناہ مانگنے کا حکم دیتے تھے۔

حدیث میں ہے: ''تم فتنہ دجال سے اللہ کی پناہ مانگو۔''

! مسلم، الفتن: ۲۹۳۷. @ بخاری، الاذان: ۱۳۷۷.

مسند امام احمد: ۴/ ۴۲۱. $ بخاری، الاذان: ۸۳۳.

یہ حکم سن کر صحابہ کرام y کہتے تھے: ''ہم فتنہ دجال سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔'' 1

S...... اگر دجال سے آمنا سامنا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اس کی تکذیب کی جائے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''جس نے دجال سے کہہ دیا تو میرا رب ہے تو وہ اس کے فتنہ میں مبتلا ہو گیا اور جس نے اللہ پر توکل کرتے ہوئے کہا کہ تو جھوٹا ہے تو اسے وہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔'' 2

d...... سورۃ الکہف کی ابتدائی دس آیات حفظ کی جائیں اور انہیں بکثرت پڑھا جائے۔

جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''جس نے سورۃ الکہف کی دس آیات یاد کر لیں اسے فتنہ دجال سے بچا لیا جائے گا۔'' 3 ابتدائی آیات کی وضاحت ایک دوسری حدیث میں ہے۔ 4 ایک روایت میں آخری آیات کا ذکر ہے۔ 5 لیکن ابتدائی دس آیات کی تائید ایک اور روایت سے ہوتی ہے۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ''تم میں سے جو بھی اس دجال کو پائے تو اس پر سورۃ کہف کی ابتدائی آیات پڑھے کیوں کہ یہ آیات اس کے فتنے سے بچاؤ کا ذریعہ ہوں گی۔ 6

f...... مکہ یا مدینہ میں رہائش رکھنے سے بھی اس کے فتنے سے محفوظ رہا جا سکتا ہے کیوں کہ ان علاقوں میں دجال داخل نہیں ہو سکے گا اور نہ ہی وہاں کے باشندوں کو اپنے فتنے میں مبتلا کر سکے گا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''دجال پوری روئے زمین کو روند ڈالے گا مگر مکہ اور مدینہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔'' 7

یاد رہے کہ فتنہ دجال سے بچاؤ کا اصل ذریعہ ایمان ہے، اگر ایمان نہیں تو حرمین کی رہائش بھی کچھ فائدہ نہیں دے گی۔ جیسا کہ حدیث میں اس کی وضاحت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

> ''دجال آئے گا اور مدینہ طیبہ کے نواح میں قیام کرے گا، پھر مدینہ تین مرتبہ زلزلے سے دوچار ہو گا تو وہاں رہنے والا ہر کافر اور منافق نکل کر اس کی طرف چلا جائے گا۔'' 8

g...... اس سے محفوظ رہنے کی نمایاں تدبیر یہ بھی ہے کہ اس سے بچنے والا اس جہادی سے دستے میں شریک ہو جائے جو اس کے خلاف برسرِ پیکار ہو گا۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''میری امت میں سے ایک جماعت حق کی خاطر ہمیشہ جہاد کرتی رہے گی اور اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی حتیٰ کہ ان کا آخری گروہ مسیح دجال کے خلاف جہاد کرے گا۔'' 9

اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ جہادی دستہ دجال سے بھی لڑے گا اور اس پر غالب آئے گا لہٰذا اس دستے میں شرکت کرنا

! مسند احمد: ۴/ ۲۸۔

@ مسند احمد: ۴/ ۲۸۔

مسند احمد: ۶/ ۴۹۹۔

$ مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۸۰۹۔

% ابوداود، الملاحم: ۴۳۲۳۔

^ ابوداود، الملاحم: ۴۳۲۱۔

& مسند احمد: ۳/ ۱۹۱۔

* بخاری، الفتن: ۷۱۲۴۔

) ابوداؤد، الجہاد: ۲۳۷۴۔

اس فتنہ دجال سے بچنے کا ایک موثر ذریعہ ہوگا۔

قرآن حکیم کے سائے میں رخصتی

] ہمارے ہاں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ شادی کے موقع پر بیٹی کو قرآن کے سائے میں رخصت کیا جاتا ہے تاکہ اس کی برکت سے آئندہ زندگی میں آنے والی مشکلات آسان ہو جائیں اور خطرات وغیرہ سے بھی امن مل جائے۔ ایسا کرنا درست ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کردیں۔

[قرآن مجید سے لاتعلق رہتے ہوئے محض اس کے سائے سے فائدہ کی امید رکھنا ایک احمقانہ فعل ہے، جس کی قرون اولیٰ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ رسول اللہ e کو اپنی زندگی میں کئی ایک مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن آپ نے قطعی طور پر قرآن مجید کا بایں طور سایہ نہیں کیا اور نہ ہی اس انداز سے کوئی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ قرآن کریم ان لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے جو اس پر ایمان اور یقین رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ 1

’’قرآن مجید اہل ایمان کے لیے باعث ہدایت اور سراپا رحمت ہے۔‘‘

قرآن مجید اس وقت باعث امن و عافیت ہوسکتا ہے جب ہم اس کے مقاصد کو پورا کریں، اس کے مطالعہ سے درج ذیل مقاصد کی نشاندہی ہوتی ہے:

☆ قرآن پر ایمان لایا جائے اور اس کے سراپا رحمت ہونے پر یقین رکھا جائے۔

☆ قرآن کو سیکھا جائے اور آگے دوسروں کو سکھایا جائے۔

☆ قرآن مجید اسی انداز سے پڑھا جائے جس طرح اس کا نزول ہوا ہے۔

☆ قرآن مجید پر غور وفکر کرکے اس سے نصیحت حاصل کی جائے۔

☆ اس کی تعلیمات پر عمل کرکے اپنی زندگی میں ایک انقلاب لایا جائے۔

☆ اپنے تنازعات میں اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے اور اپنے جھگڑوں کو ختم کیا جائے۔

جب ہم ان مقاصد کو پورا کریں گے تو اللہ تعالیٰ سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ہمیں خیر و برکت سے نوازے گا اور ہمیں امن و عافیت نصیب کرے گا۔ ہمارے نزدیک دلہن کو رخصت کرتے وقت اس کے سر پر قرآن کا سایہ کرنا بدعت ہے بلکہ قرآن کریم کی توہین ہے، ہمیں اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ بدعت کا ارتکاب کرکے اس سے برکت کی امید رکھنا چہ معنی دارد؟ اگر واقعی قرآن کی برکات کے خواہش مند ہیں تو اس کے اصول واحکام پر عمل کرنا ہوگا، بصورت دیگر دنیا وآخرت میں خسارے کا اندیشہ ہے۔ واللہ اعلم

! یونس: ۵۷.

قرآنی شفا کے آداب

] میری بہن کافی عرصہ سے بیمار ہے، ہم نے بہت سے روحانی عاملوں سے رابطہ کیا ہے، لیکن ان کے دم جھاڑ سے کوئی فائدہ نہیں ہوا جبکہ قرآن کریم سے دم کرنا تو سراسر شفا ہے، براہ کرم میری اس پریشانی کو دور کریں۔

[اس امر میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم سے روحانی اور جسمانی بیماریوں کا علاج کیا جا سکتا ہے اور اس میں مکمل شفا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴾ 1

''اور ہم نے قرآن کو لوگوں کے لیے شفاء اور رحمت بنایا ہے۔''

اسی طرح رسول اللہ e سے ثابت شدہ دم کے ذریعے علاج کرنا بھی مفید ترین طریقہ ہے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا بھی بہت نفع مند ذریعہ ہے جس سے پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں بشرطیکہ اس کی قبولیت میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اسی طرح قرآنی آیات اور دیگر دم جھاڑ سے اگر شفاء نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان میں اثر ختم ہو چکا ہے بلکہ اپنی کمزوریوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ ان میں شفاء اللہ کے حکم سے ہوتی ہے، اگر اللہ کا حکم نہ ہو تو شفاء کو مؤخر کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً آگ کا کام جلانا ہے لیکن آگ کا یہ عمل بھی اللہ کے حکم سے وابستہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا کہ تو نے سیدنا ابراہیم u کو نہیں جلانا تو اس نے نہیں جلایا، بلکہ اسے ٹھنڈی اور سلامتی والی بنا دیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ آگ جلاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے حکم سے ایسا ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآنی آیات سے دم کرنے والے کے لیے دو چیزوں کا حاصل کرنا ضروری ہے جو حسب ذیل ہیں:

☆ اس کا دل توحید، توکل اور یقین کامل سے لبریز ہو۔
☆ اس کی قوت نفس مضبوط اور توجہ الی اللہ کا ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح مریض کے لیے بھی دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے:

☆ اس کا پختہ عزم اور اعتماد ہو کہ قرآن کریم ایک کتاب شفاء اور اہل ایمان کے لیے باعث رحمت ہے۔
☆ مریض کی قوت نفس مضبوط اور اس میں توجہ الی اللہ کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔

بہر حال قرآنی آیات اور ماثور دم میں شفاء ضرور ہے لیکن اس سے شفاء کے لیے کچھ آداب ہیں، ان کا مریض اور معالج میں پایا جانا ضروری ہے، ان کی موجودگی میں یقینی شفاء کی امید کی جا سکتی ہے۔ واللہ اعلم

کسی بزرگ کے لیے کہنا کہ ''آپ کے چہرے سے برکت ٹپکتی ہے''

] بعض اوقات کسی بزرگ کو دیکھ کر عام لوگ کہہ دیتے ہیں کہ آپ مجسم برکت ہیں یا آپ کا آنا باعث برکت ہے

! الاسراء: ۸۲.

یا کہنا کہ آپ کے چہرے سے برکت ٹپکتی ہے، کیا اس قسم کے الفاظ کہنے کی شرعاً اجازت ہے؟

[برکت کا معنی بڑھوتری اور اضافہ ہے، اس کی دو اقسام ہیں:

☆ حسی:......زیادتی اور اضافہ نظر آئے۔

☆ معنوی:......ایسی بڑھوتری جو نظر نہ آئے۔

ان دونوں اقسام کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے، یعنی ہر قسم کی برکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے لیکن بعض اوقات اسے کسی انسان کی طرف بھی منسوب کر دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ سیدہ عائشہ r کا دوران سفر ہار گم ہونے پر تیمم کی آیات نازل ہوئیں تو سیدنا اسید بن حضیر t نے فرمایا: ''اے آل ابی بکر! یہ آپ کی کوئی پہلی برکت نہیں ہے۔'' 1

جو لوگ کہتے ہیں کہ آپ (بزرگوں) کا آنا ہمارے لیے باعث برکت ہے، ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ برکت، کسی بزرگ کے ہاتھ میں ہے اور وہ ذاتی طور پر برکت تقسیم کر رہا ہے، بلکہ ان الفاظ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ (بزرگوں) کے آنے کی وجہ سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی برکت حاصل ہو گی۔

البتہ آپ (بزرگ) مجسم برکت ہیں یا اس قسم کے دیگر الفاظ کا استعمال محل نظر ہے۔

عام طور پر طلب برکت کے تین ذرائع ہیں جن کی وضاحت درج ذیل ہے:

☆ کسی معلوم شرعی امر کے ساتھ برکت طلب کرنا۔ مثلاً قرآن کے ساتھ برکت طلب کرنا، یعنی اس پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ کی برکت حاصل کی جا سکتی ہے۔

☆ کسی معلوم حسی امر کے ساتھ برکت طلب کرنا۔ مثلاً کسی نیک پارسا بزرگ کی دعاؤں سے برکت حاصل کرنا، اللہ تعالیٰ بعض اوقات نیک لوگوں کی دعا سے امور خیر جاری کر دیتا ہے۔

☆ کسی موہوم امر کے ساتھ برکت حاصل کرنا۔ مثلاً کسی شعبدہ بازی کی حرکات سے متاثر ہو کر انسان ان سے برکت کا طلب گار ہوتا ہے، اس قسم سے برکت کا حصول باطل اور حرام ہے۔ باطل یا صحیح برکت کی پہچان یہ ہے کہ اگر کسی کا تعلق شرعی احکام سے ہے اور وہ سنت کا متبع نیز وہ حلال و حرام کی تمیز کرنے والا ہے تو اس کی دعاؤں سے برکت حاصل کی جا سکتی ہے اور اگر اس کے برعکس کوئی شخص کتاب و سنت کے مخالف ہے اور باطل امور کی دعوت دیتا ہے تو اس کی حرکات سے متاثر ہو کر برکت طلب کرنا غلط ہے۔ واللہ اعلم

اہل بدعت کا نیا شوشہ

] ہمارے ہاں اہل بدعت نے قرآن خوانی کی رسم کو جائز قرار دینے کے لیے ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے کہ جس

! بخاری، التیمم: ۳۳۴.

نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ ایجاد کیا اسے اس کا اور اس کے بعد اس کے مطابق عمل کرنے والوں کا اجر وثواب ملے گا، اس حدیث کی کیا حیثیت ہے؟

] اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ e کا یہ فرمان کتب حدیث میں موجود ہے لیکن اس کا مفہوم غلط بیان کر کے اس سے بدعت کا جواز کشید کیا گیا ہے۔ اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ e کے پاس خاندان مضر کے چند مفلوک الحال لوگ آئے جو انتہائی فاقے کی حالت میں تھے اور انہیں مالی تعاون کی شدید ضرورت تھی۔ آپ نے اس وقت لوگوں کو صدقہ وخیرات کرنے کی ترغیب دی تو ایک شخص چاندی کی تھیلی لے کر آیا اور اسے رسول اللہ e کے آگے رکھ دیا تو رسول اللہ e نے فرمایا:

''جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ شروع کیا اسے اس کا اور اس کے بعد اس کے مطابق عمل کرنے والوں کا اجر وثواب ملے گا۔'' 1

اس حدیث کے مفہوم کے مطابق طریقہ شروع کرنے سے مراد اللہ کے کسی حکم کے مطابق عمل کرنا ہے، اس کا معنی ایجاد کرنا نہیں۔ کیوں کہ کسی عمل کا حکم تو اللہ اور اس کے رسول e ہی کی طرف سے ہوسکتا ہے، لہٰذا اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جو شخص کسی سنت کے مطابق عمل کا آغاز کرے اور لوگ اس میں اس کی اقتداء کریں تو اسے امور سنت کے مطابق عمل کرنے کا اجر ملے گا اور ان لوگوں کے اجر وثواب کے برابر بھی اجر وثواب ملے گا جو اس کے مطابق عمل کریں گے۔ اس کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ انسان جو چاہے شریعت میں ایجاد کرسکتا ہے کیوں کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

((كل بدعة ضلالة)) ''ہر بدعت گمراہی ہے۔'' 2

نیز رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے کہ ''تم (دین میں) نئے نئے کاموں سے اجتناب کرو، کیوں کہ ہر نیا کام بدعت اور ہر بدعت گمراہی ہے۔'' 3

واضح رہے کہ مروّجہ قرآن خوانی محض ایک رسم ہے جس کا خیر القرون میں کوئی ثبوت نہیں ملتا، اگر خیر القرون نے یہ کام کیا ہوتا تو ضرور کتب حدیث میں اس کا ذکر ہوتا، جب اس کا کوئی ذکر نہیں تو اس کے بدعت ہونے میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ واللہ اعلم

ایک حدیث کی تحقیق

] اکثر خطباء یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''میں اللہ کی راہ میں دو ذبح ہونے والوں کا بیٹا ہوں۔'' اس حدیث کی حیثیت واضح کریں کہ صحیح ہے یا خودساختہ؟

! صحیح مسلم، الزکاۃ: ۱۰۱۷.   @ مسلم، الجمعۃ: ۸۶۷.

ابوداود، السنۃ: ۴۶۰۷.

[یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ بے اصل ہے، اس کی کوئی سند کتب حدیث میں نہیں پائی جاتی۔ علامہ البانی a نے اس کے متعلق لکھا ہے: ''لا اصل لہ بھذا اللفظ'' 1

یہ حدیث بالکل بے اصل ہے۔ اس سلسلہ میں ایک دوسری روایت بایں الفاظ مروی ہے: عبداللہ بن سعید صنابحی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم سیدنا امیر معاویہ بن ابوسفیان w کی مجلس میں تھے کہ حاضرین نے سیدنا ابراہیم u کے دونوں بیٹوں سیدنا اسماعیل u اور سیدنا اسحاق u کا تذکرہ کیا۔ کچھ کہنے لگے کہ ذبیح سیدنا اسماعیل u ہیں۔ جبکہ بعض کا اصرار تھا کہ ذبیح سیدنا اسحاق u ہیں۔ سیدنا امیر معاویہ t نے فرمایا کہ ''میرے پاس اس کے متعلق معلومات ہیں، ہم رسول اللہ e کے پاس موجود تھے، اس دوران ایک دیہاتی آیا اور عرض کرنے لگا، یا رسول اللہ! میں اپنے پیچھے بنجر زمین اور خشک پانی چھوڑ کر آیا ہوں، حیوانات خشک سالی کی وجہ سے ہلاک ہو چکے ہیں اور اہل وعیال بھی تباہ و برباد ہو رہے ہیں، اے اللہ کی راہ میں دو قربان ہونے والوں کے بیٹے! (ابن ذبیحین) مجھے کچھ مال دیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے۔ رسول اللہ e یہ سن کر مسکرا دیئے اور اس کی بات کا انکار نہیں کیا۔'' ہم نے یہ سن کر سیدنا امیر معاویہ t سے عرض کیا، اے امیر المومنین! ذبیحان سے کیا مراد ہے؟ آپ t نے فرمایا کہ رسول اللہ e کے دادا عبدالمطلب کو چاہ زمزم کھودنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے نذر مانی تھی کہ اگر یہ کام آسانی سے پورا ہو گیا تو میں اپنے ایک بیٹے کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ذبح کروں گا۔ جب کام مکمل ہو گیا تو قرعہ اندازی کی گئی کہ کس بیٹے کو اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کریں؟ چنانچہ رسول اللہ e کے والد عبداللہ کے نام قرعہ نکلا۔ انہوں نے اسے ذبح کرنے کا ارادہ کیا تو آپ کے ننھیال نے انہیں منع کیا اور کہا کہ آپ اس کا فدیہ دے کر اپنے رب کو راضی کر لیں۔ چنانچہ سردار عبدالمطلب نے ایک سو اونٹ بطور فدیہ ذبح کیے۔ ایک تو عبداللہ ذبیح اللہ اور دوسرے سیدنا اسماعیل u ہیں۔ 2

امام حاکم a نے اس حدیث پر سکوت کیا ہے جبکہ امام ذہبی a فرماتے ہیں: ''اس کی سند انتہائی کمزور ہے۔'' 3 نیز اس کی سند میں عبداللہ بن سعید صنابحی نامی راوی مجہول ہے۔ 4 حافظ ابن کثیر a نے بھی اس پر جرح کی ہے۔ 5 الغرض رسول اللہ e کے متعلق ابن ذبیحین ہونے کی روایت ثابت نہیں بلکہ انتہائی کمزور ہے، اس پر محدثین کرام نے جرح کی ہے۔ واللہ اعلم

کفار کے ساتھ مشابہت

] احادیث میں کفار کے ساتھ مشابہت کو حرام قرار دیا گیا ہے، اس مشابہت کی کیا حدود ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

! سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ: ۱/ ۵۰۰.　　@ مستدرک حاکم: ۲/ ۵۵۴.

تلخیص المستدرک: ۲/ ۵۵۴.　　$ میزان الاعتدال: ۴۲۸.

% تفسیر ابن کثیر: ۴/ ۱۸.

[رسول اللہ e کا ارشادِ گرامی ہے: ’’جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی تو وہ انہی میں سے ہوگا۔‘‘ 1

اس حدیث کے مطابق غیر مسلم اقوام کا مذہبی اور قومی شعار، ایک مسلمان کو اختیار کرنا حرام ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مخصوص عادات کا بھی یہی حکم ہے، جس میں ان کی تہذیب وثقافت، ان کی عیدوں اور تہواروں میں شرکت کرنا بھی شامل ہیں یا ان کا مخصوص لباس اختیار کرنا بھی اس حرمت میں شامل ہیں۔ علماء حدیث نے اس مشابہت کی درج ذیل حدود وقیود کی نشاندہی کی ہے:

☆ ایسی عبادات جن میں غیر مسلم اقوام سے مکمل مشابہت پائی جائے، رسول اللہ e نے نماز کی طرف بلانے کے لیے گھنٹیاں یا بگل بجانے کی بجائے اذان کا طریقہ رائج فرمایا ہے۔

☆ ایسی عادات جن میں غیر مسلم مبتلا ہیں اور وہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں مثلاً بلاوجہ بائیں ہاتھ سے کھانا پینا وغیرہ۔

☆ ایسے فیشن جو غیر مسلم اقوام کے ایجاد کردہ ہوں، مثلاً عورتوں کے لیے ایسا لباس استعمال کرنا جس سے بدن کی نمائش ہوتی ہو۔

اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ ملبوسات، چال ڈھال اور زیورات وغیرہ میں مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ اسی طرح دین سے دور محض دنیا دار اور بے دین لوگوں کی مشابہت سے بچنا بھی انتہائی ضروری ہے، اسی میں ہماری فلاح ونجات ہے۔ الغرض اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ کافروں، مشرکوں، منافقوں اور بدعتی حضرات کی مشابہت نہ کریں، وہ معاملہ دین کا ہو یا دنیا کا اِلّا یہ کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔ واللہ اعلم

سلاسل اربعہ کی حقیقت

] تصوف سلاسل اربعہ سے کیا مراد ہے؟ ان کی کیا حیثیت ہے؟ کیا ان کے ذریعے احسان وسلوک کی منازل طے کی جاسکتی ہیں؟

[اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے قرآن وحدیث میں بہت مواد موجود ہے، تعلق باللہ کے معاملے میں نئے نئے طریقے ایجاد کرنا یا دوسروں سے اخذ کرکے انہیں اختیار کرنا بنیادی طور پر غلط طریقہ کار ہے، اسی غلطی میں مبتلا ہو کر نصاریٰ نے رہبانیت اختیار کرلی تھی جس کی قرآن نے مذمت کی ہے۔ سلاسل اربعہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، ان کے تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ سلسلہ نقشبندیہ:...... یہ سلسلہ شیخ شہاب الدین محمد نقش بند سے شروع ہوتا ہے۔

☆ سلسلہ چشتیہ:......اس کا آغاز خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے ہوتا ہے۔

☆ سلسلہ سہروردیہ:......اس کے موجد شیخ شہاب الدین سہروردی ہیں۔

☆ سلسلہ قادریہ:...... یہ شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کی طرف منسوب ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق سلاسل اربعہ کی ابتداء ایسے بزرگوں سے ہوئی جو صلحاء امت سے تھے، ان کا مقصود بھی تزکیہ و

! ابوداؤد، اللباس: ۴۰۳۱.

اصلاح تھا لیکن جس طرح مسلمان دوسرے شعبوں میں انحطاط کا شکار ہوئے اور ان میں بدعات کی آمیزش ہوئی، اسی طرح یہ سلاسل اربعہ بھی ان سے محفوظ نہیں رہے۔ بہر حال ہمارے پاس قرآن وسنت موجود ہے اس میں تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کے لیے بہت کچھ ہے، اسی پر اکتفاء کیا جائے۔

شیطان کی حقیقت

] کیا شیطان اپنا مستقل وجود رکھتا ہے جو انسان کو بہکاتا اور پھسلاتا ہے؟ یا ایک تخیلاتی قوت ہے جو انسان کے سوچ وبچار پر غالب آجاتی ہے اور انسان کو غلط کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے؟ قرآن واحادیث سے وضاحت فرمادیں۔

[قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان محض تخیلاتی قوت کا نام نہیں بلکہ وہ جنوں میں سے ہے اور اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں اس کی صراحت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ﴾ 1

''اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، یہ جنوں میں سے تھا اور اس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی۔''

قرآن کریم نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ وہ آدم اور اولاد آدم کا دشمن ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝﴾ 2

''بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے لہٰذا تم بھی اسے دشمن سمجھو، وہ تو اپنے گروہ کو اس لیے بلاتا ہے کہ وہ سب جہنم واصل ہو جائیں۔''

اور وہ مختلف خیالات، ترغیبات اور وساوس کے ذریعے اولاد آدم کو بہکانے کی سرتوڑ کوشش کرتا ہے، اسے ہمارے جسم پر قبضہ کر کے ہم سے زبردستی کوئی برا کام کرا لینے کے اختیارات نہیں دیے گئے۔ اسے صرف ہمارے نفس کو گناہ پر اکسانے اور برے کاموں کی طرف مائل کرنے یا وساوس وشبہات ڈالنے کے اختیارات دیے گئے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝﴾ 3

''وہ شیطان لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔''

بلکہ اس نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ میں صرف دعوت پیش کر سکتا ہوں جیسا کہ قرآن مجید نے اس کی بات نقل کی ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ﴾ 4

! الکہف: ۵۰۔ @ فاطر: ۶۔

الناس: ۵۔ $ ابراہیم: ۲۲۔

”میرا تم پر کوئی دباؤ نہیں تھا، ہاں میں نے تمہیں پکارا تو تم نے میری پکار پر لبیک کہہ دیا۔“

بہر حال اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک محدود نوعیت کی آزادی اور خود مختاری دے کر اس دنیا میں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے اور شیطان کو خود اس کے مطالبے پر ایک محدود مدت کے لیے یہ آزادی عطا کی ہے کہ وہ انسان کو اس امتحان میں ناکام کرنے کے لیے جو کوشش کرنا چاہے، کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ کوشش صرف ترغیب وتحریص کی حد تک ہو۔ زبردستی اپنے راستے پر کھینچ لے جانے کے اختیارات اس کو نہیں دیے گئے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان اور شیطان کو آزادانہ کشتی لڑنے کا موقع فراہم کیا ہے، اگر آدمی اسے بچھاڑ دیتا ہے تو اسے جنت ملے گی اور اگر شیطان جیت جاتا ہے تو ہارنے والا اور اسے غلط راستے پر لگانے والا شیطان دونوں جہنم میں جائیں گے۔ بہر حال شیطان کوئی تخیلاتی قوت نہیں بلکہ اس کا اپنا ایک وجود ہے اور اس کا کام وساوس وخیالات کے ذریعے انسان کو راہ راست سے ہٹانا ہے۔ واللہ اعلم

مقام محو وفنا

] صوفیاء کی اصطلاح میں مقام محو وفنا سے کیا مراد ہے؟ شریعت میں اس کی کیا حیثیت ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

[دین اسلام کے دو شعبے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

☆ ایک شعبہ تعلق باللہ ہے، اس کا اصول یہ ہے کہ عبادات کے سلسلہ میں ہم صرف انہی طریقوں پر اکتفاء کریں جو اللہ اور اس کے رسول e نے ہمیں بتائے ہیں۔

☆ دوسرا شعبہ تعلق بالناس کا ہے، اس میں مباحات کا دروازہ کھلا ہے، اس کے متعلق جو شریعت نے ہمیں حکم دیا ہے اس کی اطاعت کی جائے اور جس سے منع کیا گیا ہے اس سے رک جانا چاہیے اور جس معاملے میں کرنے یا نہ کرنے کی کوئی صراحت نہیں اس کے متعلق غور وفکر سے کام لیا جا سکتا ہے۔

تعلق باللہ کے متعلق رسول اللہ e کا ارشاد ہے:

”احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔“ 1

اس حدیث کے مطابق احسان کی تعریف میں اخلاص کے دو درجے بیان ہوئے ہیں:

مشاہدہ: یہ اخلاص کا اعلیٰ درجہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی عبادت بایں طور کی جائے گویا باری تعالیٰ نگاہوں کے سامنے ہے۔ یعنی قلب ونظر اس طرف لگ جائیں۔

مراقبہ: عبادت گزار عبادت کرتے وقت یہ خیال کرے کہ اگر میں اللہ کو نہیں دیکھ سکتا تو اللہ تعالیٰ ہر آن مجھے دیکھ رہا ہے،

! بخاری، الایمان: ۵۰.

جس عابد کو یہ درجہ حاصل ہو جاتا ہے وہی پورے اخلاص کے ساتھ اپنا کام کرتا ہے۔

امام نووی a نے ان دونوں کا ایک ہی درجہ قرار دیا ہے، ان کے نزدیک دوسرے جملے کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم نہیں دیکھ رہے تو پھر بھی احسان پر قائم ہو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو دیکھ رہا ہے۔ گویا دوسرا جملہ پہلے جملے کی علت ہے۔ یعنی دارومدار تمہارے دیکھنے پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے دیکھنے پر ہے، وہ تو بہرحال دیکھ ہی رہا ہے تم دیکھو یا نہ دیکھو۔ لہٰذا عبادت کو ہمیشہ اچھے طریقے سے کرنا چاہیے۔

غالی قسم کے صوفیاء نے اپنے ذوق کے مطابق اس مقام پر ایک عجیب تاویل کی ہے کہ (فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ) میں ''کان'' تامہ ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم اپنی ہستی کو فنا کر کے ''لم تکن'' بن جاؤ تو اللہ کو دیکھ سکتے ہو۔ اسے وہ محو وفنا سے تعبیر کرتے ہیں جو من گھڑت اور خود ساختہ ہے۔ کیوں کہ یہ تاویل عقل ونقل کے خلاف ہے بلکہ عربی قواعد سے نابلد ہونے کی علامت ہے کیوں کہ اس صورت میں ''تراہ'' کا الف جواب شرط ہونے کی بناء پر حذف ہونا چاہیے تھا۔ جبکہ حدیث کے تمام طرق میں الف موجود ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہ معنی لیا جائے تو (فانہ یراک) کا کیا مفہوم ہوگا؟ پھر حدیث میں صراحت ہے کہ مرنے سے پہلے تم اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتے۔ 1 بہرحال محو وفنا کی اصطلاحات عجمی ہیں ان سے احتراز کرنا چاہیے پھر ایسی اصطلاحات کے پس منظر میں غلط عقائد کارِ بھی فرما ہیں۔ واللہ اعلم

کلمہ طیبہ کا ثبوت

] کسی حدیث میں کلمہ طیبہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کا ذکر آیا ہے؟ کتب احادیث میں اکثر ''لا الٰہ الا اللہ'' آتا ہے، ''محمد رسول اللہ'' کے الفاظ نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کلمہ طیبہ کا ذکر کسی حدیث میں ہے تو اس کی نشاندہی فرمادیں؟

[ہمارے نزدیک اس قسم کے سوالات سے مراد اپنے دماغ اور ذہن کو فارغ کرنا ہے۔ کیوں کہ ان کا کوئی بھی دینی یا دنیوی فائدہ نہیں۔ تاہم جن احادیث میں صرف ''لا الٰہ الا اللہ'' آیا ہے وہاں اس کے دوسرے جزو ''محمد رسول اللہ'' کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ چنانچہ امام نووی a نے تبویب مسلم میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''باب الامر بقتال الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' 2

''لوگوں سے قتال کا حکم تا آنکہ وہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھیں۔''

اس عنوان کے تحت جو احادیث ذکر کی ہیں ان میں ''لا الٰہ الا اللہ'' کا ذکر ہے۔ امام نووی a کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ احادیث میں ''لا الٰہ الا اللہ'' کا ذکر ہے لیکن معنی کے اعتبار سے ''محمد رسول اللہ'' بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔

بعض احادیث میں توحید و رسالت پر مشتمل ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کا ذکر بھی آیا ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تکبر کرنے والی ایک قوم کا ذکر بایں الفاظ فرمایا:

! مسلم، الفتن: ۲۹۳۱. @ مسلم، الایمان، باب ۸.

﴿ اِنَّهُمۡ كَانُوۡۤا اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴾ 1

''جب انہیں لا الٰہ الا اللہ کے متعلق کہا جاتا ہے تو تکبر کرتے ہیں۔''

مزید ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِذۡ جَعَلَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الۡجَاهِلِيَّةِ فَاَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَ اَلۡزَمَهُمۡ كَلِمَةَ التَّقۡوٰى وَكَانُوۡۤا اَحَقَّ بِهَا وَاَهۡلَهَا ؕ ﴾ 2

''جب کفر کرنے والوں نے اپنے دلوں میں جاہلیت کی ضد رکھی تو اللہ تعالیٰ نے اپنا سکون واطمینان اپنے رسول اور اہل ایمان پر اتارا اور ان کے لیے کلمہ تقویٰ کو لازم قرار دیا کیوں کہ وہ اس کے زیادہ حق دار اور اہل تھے۔''

وہ کلمہ تقویٰ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' ہے، صلح حدیبیہ کے موقع پر مشرکین نے اس کلمہ سے تکبر کیا تھا۔ 3

اس سلسلہ میں سیدنا ابوہریرہ t سے مروی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''مجھے لوگوں سے قتال کا حکم دیا گیا ہے تا آنکہ وہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کہیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں یہ بات ایک دوسری حدیث میں بھی ہے۔'' 4

اس حدیث میں بھی ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کی صراحت ہے۔

کلمہ طیبہ پر مشتمل ایک موضوع طویل حدیث بھی ذکر کی جاتی ہے کہ جب سیدنا آدم u نے غلطی کا ارتکاب کیا تو اللہ تعالیٰ سے بایں الفاظ دعا کی: ''اے اللہ! میں تجھ سے محمد رسول اللہ e کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں نے تو ابھی محمد e کو پیدا نہیں کیا تو نے کیسے اس کا نام لے لیا؟''

تو سیدنا آدم u نے عرض کیا: ''میں نے تیرے عرش پر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا دیکھا ہے۔'' 5

اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد امام حاکم کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے اور یہ پہلی روایت ہے جو میں نے اس کتاب میں عبدالرحمن بن زید بن اسلم کے حوالے سے درج کی ہے۔ اس تبصرہ کے متعلق امام ذہبی a لکھتے ہیں: ''بلکہ یہ روایت خود ساختہ اور موضوع ہے، عبدالرحمن جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں بیان کرنے والا راوی ہے۔ اس کے علاوہ عبداللہ بن مسلم الفہری کے متعلق بھی میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے جس پر اس حدیث کا دارومدار ہے۔''

بہر حال یہ روایت موضوع ہے، استاذی المکرم علامہ البانی a نے بھی اسے موضوع قرار دیا ہے۔ 6

ان احادیث کے علاوہ کلمہ طیبہ کے الفاظ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پر اہل اسلام کا اجماع ہے۔ حافظ ابن حزم a

! الصافات: ۳۵. @ الفتح: ۲۶.

کتاب الاسماء و الصفات للبیهقی، باب ماجاء فی فضل الکلمۃ: ص۱۰۵، ۱۰۶.

$ الفتح الربانی: ۱/ ۹۷. % مستدرک الحاکم: ۲/ ۶۱۵.

۸ الاحادیث الضعیفہ: ۱/ ۳۸.

لکھتے ہیں: ’’یہ اجماع صحیح ہے جیسا کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ‘‘ کے کلمے پر اجماع ہے۔‘‘ 1

حاصل کلام یہ ہے کہ کلمہ طیبہ ’’لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ‘‘ کا صحیح حدیث اور اجماع امت سے ثبوت موجود ہے۔ واللہ اعلم

رسول اللہ e سے محبت اور اس کے تقاضے

] رسول اللہ e سے محبت کا ہر مسلمان دعویدار ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اس محبت کا معیار کیا ہے اور رسول اللہ e سے محبت کے تقاضے کیا ہیں تاکہ آپ سے محبت کرنا قیامت کے دن ہمارے لیے ذریعہ نجات ہو جائے۔

[امام بخاری a نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

’’باب حب الرسول من الایمان‘‘

’’رسول اللہ e سے محبت ایمان کا حصہ ہے۔‘‘ 2

اس کے بعد سیدنا ابوہریرہ t سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

’’تم میں سے کوئی بھی ایمان دار نہیں ہو سکتا تاآنکہ میں اسے اس کے والد اور اس کی اولاد سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔‘‘ 3

ایک حدیث میں نفس کی محبت کا بھی ذکر ہے۔

چنانچہ سیدنا عمر t نے ایک مرتبہ عرض کیا، اللہ کے رسول e! آپ کی محبت میرے دل میں ہر چیز سے زیادہ ہے مگر میں اپنے نفس کی محبت کو زیادہ پا رہا ہوں۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ’’اے عمر! ابھی ایمان میں کمی باقی ہے۔‘‘

پھر سیدنا عمر t نے غور کیا اور عرض کرنے لگے، اب آپ کی محبت میرے دل میں میرے نفس سے بھی زیادہ ہے، یہ سن کر رسول اللہ e نے فرمایا:

’’اب ایمان کی تکمیل ہو گئی ہے۔‘‘ 4

ایک روایت میں تمام لوگوں کی محبت کا ذکر ہے۔

چنانچہ سیدنا انس t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

’’تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں بن سکتا جب تک میری ذات اس کے نزدیک اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو۔‘‘ 5

! محلی ابن حزم: ۱/ ۴۲۳.

@ بخاری، الایمان، باب ۸.

بخاری، الایمان: ۱۴.

$ صحیح بخاری، الایمان والنذور: ۶۶۳۲.

% بخاری، الایمان: ۱۵.

محبت کی تین اقسام ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ محبت تعظیم:...... جیسے والد اور استاد سے کی جاتی ہے۔

☆ محبت شفقت:...... جیسے اولاد اور شاگردوں سے کی جاتی ہے۔

☆ محبت استحسان:...... جو عام لوگوں سے کی جاتی ہے۔

رسول اللہ e نے اس حدیث میں تمام اصناف محبت کو جمع کر دیا ہے کہ ''اس وقت تک ایمان کی تکمیل نہیں ہوگی جب تک ان تمام اقسام سے زیادہ مجھ سے محبت نہ ہو۔'' ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ''جو انسان رسول اللہ e سے اس طرح محبت کرے گا وہ آپ کے ساتھ جنت میں جائے گا۔'' 1

رسول اللہ e سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی سنت کی تائید و نصرت، اس کا دفاع کیا جائے، آپ کے لائے ہوئے طریقے پر عمل کیا جائے، اس کے لیے وقت، صلاحیت اور مال وغیرہ خرچ کیا جائے، حقیقی ایمان انہی باتوں سے مکمل ہوگا، اس سلسلہ میں جو چیز رکاوٹ بنے اسے قربان کر دیا جائے، اگر مومن اپنے اندر اس معیار کو محسوس کرتا ہے تو حقیقی مومن ہے، بصورت دیگر اسے اپنے ایمان کے متعلق غور و فکر کرنا چاہیے۔

اصولِ ایمان اور اس کی شاخیں

] ایمان کے متعلق احادیث میں ہے کہ اس کے درج ذیل کچھ اصول ہیں: ''اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، یوم آخرت، اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لایا جائے۔'' جبکہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ''ایمان کی ساٹھ سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں۔'' ان میں کیا تطبیق ہے؟

[حدیث جبریل u میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''ایمان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، قیامت کے دن اور اچھی بری تقدیر پر ایمان لاؤ۔'' 2

اس حدیث میں اصول ایمان کی تعداد چھ بیان ہوئی ہے جبکہ دوسری احادیث میں ایمان کی ساٹھ سے کچھ زیادہ شاخیں بیان ہوئی ہیں اور ایک حدیث میں وضاحت ہے کہ ''حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔'' 3

ان دونوں احادیث میں تطبیق یہ ہے کہ پہلی حدیث میں ایمان کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے اور دوسری احادیث میں امور ایمان یعنی اعمال ایمان بیان ہوئے ہیں۔

امام بخاری a نے انہیں امور ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ 4

! بخاری، الادب: ۶۱۷۱.
@ بخاری، الایمان: ۵۰.
# بخاری، الایمان: ۹.
$ بخاری، الایمان، باب۳.

ایک حدیث میں ہے کہ ان شعبوں میں سب سے اعلیٰ شعبہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ شعبہ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے۔'' 1

اس حدیث میں ادنیٰ اور اعلیٰ شاخ کی تعیین کر دی گئی ہے لیکن فروع ایمان کی اصل تعداد متعین نہیں ہوتی۔

حافظ ابن حجر a نے مذکورہ حدیث کی شرح میں لکھا ہے: ''امورِ ایمان، اعمالِ قلب، اعمالِ زبان اور اعمالِ بدن پر مشتمل ہیں۔ ایمانِ قلب کی چوبیس، اعمالِ زبان کی سات اور اعمالِ بدن کی اڑتیس شاخیں ہیں، ان کا مجموعہ ۶۹ ہے۔ 2

پھر آپ نے ان فروع ایمان کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

امام بیہقی a نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے مستقل ایک کتاب ''شعب الایمان'' کو مرتب فرمایا ہے جو مطبوع ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے فروع ایمان کو احادیث کی روشنی میں بڑی شرح وبسط سے بیان کیا ہے بہرحال ایمان کے بنیادی اصول چھ ہیں جو حدیث جبریل میں بیان ہوئے ہیں اور امور ایمان کی تعداد ساٹھ سے زیادہ ہے۔ امام بخاری نے بھی امورِ ایمان کی تفصیل بیان کی ہے۔ واللہ اعلم

شیطانی وساوس اور برے خیالات

] میں آج کل سخت ذہنی پراگندگی کا شکار ہوں، میرے دل میں بہت برے برے خیالات آتے ہیں، میں انہیں بیان نہیں کر سکتا۔ ان کے متعلق قرآن وحدیث میں کیا وضاحت ہے اور انہیں کیوں کر دور کیا جا سکتا ہے؟

[شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار یہ ہے کہ وہ انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے ان کے دلوں میں برے برے وسوسے اور سنگین قسم کے خیالات ڈالتا رہتا ہے تاکہ انہیں نفسیاتی قلق اور فکری اضطراب میں مبتلا کرے جس سے ان کا عقیدہ خراب اور ایمان مکدر ہو جائے۔ صحابہ کرام y کو بھی اس طرح کی باتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

چنانچہ سیدنا ابوہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم اپنے دلوں میں ایسی باتیں پاتے ہیں جنہیں زبان سے بیان کرنا بہت گراں گزرتا ہے۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ''کیا تم واقعی ایسی باتیں سوچتے ہو اور انہیں زبان پر لانا گراں گزرتا ہے؟''

لوگوں نے عرض کیا، جی ہاں! ایسا ہی معاملہ ہے۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ''یہ ایمان کے خالص ہونے کی علامت ہے۔'' 3

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا: ''میرے دل میں ایسے خیالات آتے ہیں کہ انہیں زبان پر لانے سے مجھے یہ بات پسند ہے کہ میں جل کر کوئلہ بن جاؤں۔''

! صحیح مسلم، الایمان: ۱۵۳. @ فتح الباری: ۱/ ۷۳.
مسلم، الایمان: ۲۳۲.

یہ سن کر رسول اللہ e نے فرمایا: ''سب تعریف اس اللہ عز وجل کے لیے ہے جس نے اس معاملہ کو وسوسہ کی طرف لوٹا دیا ہے۔'' 1

رسول اللہ e نے برے خیالات آنے کو خالص ایمان کی علامت اس لیے قرار دیا ہے کہ چور، ڈاکو ہمیشہ اس گھر میں آتے ہیں جہاں انہیں کوئی خزانہ ملنے کی امید ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے گھر میں کچھ نہ ہو وہاں چور وغیرہ نہیں آتے۔

اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہ a نے بہت خوب صورت بات لکھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: ''ایسے خیالات طالب علم اور عبادت گزار لوگوں کو پیش آتے ہیں، ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو ان سے واسطہ نہیں پڑتا کیوں کر دوسرے لوگ تو اللہ تعالیٰ کی شریعت اور اس کے بنائے ہوئے راستے پر چلتے ہی نہیں بلکہ وہ اپنے رب سے غافل اور اپنی خواہشات کے پجاری ہیں، شیطان کا یہی مقصد ہے اس لیے انہیں مزید گمراہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کے برعکس جو لوگ علم کے حصول اور عبادت میں لگے ہیں شیطان ان کا دشمن ہے، وہ انہیں وساوس اور برے خیالات کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے دور لے جانا چاہتا ہے۔'' 2

ایسے خیالات کے متعلق رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دلوں میں پیدا ہونے والے وساوس سے درگزر فرمایا ہے، جب تک وہ ان کے مطابق عمل نہ کریں یا ان کے مطابق بات نہ کریں۔'' 3

حدیث میں مزید وضاحت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''تم میں سے کسی ایک کے پاس آ کر شیطان کہتا ہے کہ مخلوق کو اس طرح کس نے پیدا کیا ہے؟''

فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا ہے؟

حتیٰ کہ وہ کہتا ہے تیرے رب کو کس نے پیدا کیا ہے؟

جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے تو انسان کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے اور آگے بڑھنے سے رک جائے۔'' 4

رسول اللہ e نے اس قسم کے خیالات کے لیے بہت مفید علاج تجویز کیا ہے کہ انسان ''اعوذ باللہ'' پڑھے اور ایسے خیالات کو دل سے جھٹک دے پھر اللہ کی عبادت میں لگ جائے، تو اللہ کے فضل و کرم سے ایسے وساوس ختم ہو جائیں گے۔ مذکورہ احادیث کی روشنی میں سائل کو درج ذیل کاموں کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ اسے برے خیالات اور شیطانی وساوس سے نجات مل جائے۔

☆ جب اس قسم کے خیالات آئیں تو ''اعوذ باللہ'' پڑھے اور خیالات کو ترک کر دے۔

☆ اللہ کا ذکر شروع کر دے اور ایسے وساوس کو دل سے جھٹک دے۔

! ابوداود، الادب: ۵۱۱۲. @ الایمان: ص ۱۴۷.

بخاری، العتق: ۲۵۲۸. $ مسلم، الایمان: ۱۳۴.

☆ اللہ تعالیٰ سے دعا اور التجاء کرے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اسے محفوظ رکھے۔

اگر انسان ایسے حالات میں عبادت اور عمل میں لگ جائے تو امید ہے کہ تمام وساوس اور خیالات کافور ہو جائیں گے۔ قرآن کریم نے اس قسم کے خیالات کو شیطان کا بہت بڑا ہتھیار قرار دیا ہے اور ان سے پناہ مانگنے کی تلقین کی ہے جیسا کہ سورة الناس میں اس کی صراحت ہے۔ امید ہے کہ درج بالا علاج کرنے سے سائل کو ایسے وساوس سے نجات مل جائے گی۔ واللہ اعلم

ایک سوال کے مختلف جواب

] حدیث میں ہے کہ کسی نے اسلام کے متعلق سوال کیا کہ کونسا اسلام بہتر ہے؟ رسول اللہ e نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں جو احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔

[ایک ہی سوال کے مختلف جوابات اس بناء پر ہوتے ہیں کہ سائل کے احوال مختلف ہوتے ہیں۔ اس کی ضرورت کو دیکھ کر جواب دیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نماز کا پابند ہے، روزے بھی رکھتا ہے لیکن طبیعت میں ذرا بخل ہے تو اس شخص کو ایسا عمل بتایا جائے گا جو اس کمی کی تلافی کر سکے۔

اسی طرح ایک شخص مہمان نواز ہے، رحم دل بھی ہے لیکن نماز میں کوتاہی کرتا ہے تو اسے نماز کے متعلق تلقین کی جائے گی کہ یہ افضل عمل ہے۔

رسول اللہ e چونکہ ہمارے لیے روحانی مربی ہیں اس لیے آپ e نے جس شخص میں کوئی کمی دیکھی اسے اس کے متعلق ترغیب دی۔ مثلاً ایک آدمی نے رسول اللہ e سے سوال کیا: ''کس انسان کا اسلام افضل ہے؟'' تو آپ e نے اس کے جواب میں فرمایا: ''جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔'' 1

جبکہ ایک دوسری حدیث میں اسی قسم کا ایک سوال ہوا کہ کونسا اسلام بہتر ہے؟ تو آپ e نے فرمایا: ''تم کھانا کھلاؤ، سب کو سلام کرو، خواہ تم اسے پہچانتے ہو یا نہیں پہچانتے۔'' 2

اس حدیث میں کھانا کھلانے کو بہترین اسلام سے تعبیر کیا گیا ہے، اس میں مسلم یا غیر مسلم کی تخصیص بھی نہیں ہے بلکہ دیگر احادیث کے مطابق جانوروں کو بھی کھلانے میں اجر و ثواب بتایا گیا ہے۔ البتہ مسلمان کو کھلانے میں زیادہ اجر و ثواب ہوگا۔

واضح رہے کہ دونوں احادیث میں اسلام کے افضل اور بہتر ہونے کو بیان کیا گیا ہے، اگرچہ عربی زبان کے اعتبار سے اسم تفضیل کے صیغے ہیں تاہم افضل کے معنی کثرتِ ثواب کے ہیں، جو قلت کے مقابلے میں ہے اور خیر کے معنی نفع کے ہیں جو شر کے مقابلے میں ہے۔

پہلا سوال مقدار سے متعلق اور دوسرے سوال کا تعلق معیار سے ہے۔ بہرحال ایک ہی قسم کے سوال کے مختلف جوابات کسی حکمت کے تحت ہوتے ہیں اور رسول اللہ e سائل کی حالت کو دیکھ کر جواب دیا کرتے تھے۔ جو بظاہر مختلف لگتا ہے۔ واللہ اعلم

! بخاری، الایمان: ۱۱. @ بخاری، الایمان: ۱۲.

بھگوت گیتا کیا ہے؟

] ہمارے پڑوس میں ہندو رہتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہمارے نبی کرشن مہاراج ہیں اور بھگوت گیتا آسمانی کتاب ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا موقف ہے؟ مزید وضاحت فرمائیں کہ ہر قوم کے لیے نبی کا آنا ضروری ہے؟

[قرآن مجید میں ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ 1

''کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔''

دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ 2 ''ہر امت کے لیے ایک رہنما ہے۔''

اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے مزید فرمایا:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ 3

''ہم نے ہر امت کے لیے ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے کنارہ کشی کرو۔''

ان آیات کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے انبیاء اور رسول o بھیجے ہیں لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں یاد رکھی جائیں:

☆ ایک نبی کی تبلیغ جہاں جہاں تک پہنچ سکتی تھی وہاں کے لیے وہی نبی کافی رہا، یہ ضروری نہیں تھا کہ ہر ہر بستی اور ہر ہر قوم میں الگ الگ انبیاء آتے۔

☆ ایک نبی کی دعوت کے آثار اور اس کی رہنمائی کے نقوش قدم جب تک محفوظ رہے، اس وقت تک کسی نئے نبی کی ضرورت نہ تھی۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر نسل اور ہر پشت کے لیے الگ نبی بھیجا جائے۔ نبی کریم e خاتم النّبیین ہیں اور آپ e کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے۔ اب جو بھی نبوت کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا اور کذاب ہوگا۔

اس وضاحت کے بعد کرشن مہاراج کے متعلق ہمارا رجحان یہ ہے کہ وہ ایک مذہبی راہنما تھا لیکن اللہ عزوجل کی طرف سے فرستادہ نہیں اور بھگوت گیتا اس کی تصنیف ہے، اگرچہ اس میں شدید اختلاف ہے کہ بھگوت گیتا ان کی تصنیف ہے یا کسی دوسرے شخص نے لکھ کر اس کی طرف منسوب کر دی ہے۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں تحریف ہوتی رہی جیسا کہ اکثر مذہبی کتابوں کے ساتھ ہوتا رہا۔ اس کتاب کا موضوع ایسے عمل کی نشاندہی کرنا ہے جس کی مدد سے انسان اللہ سے تعلق جوڑ سکے۔ اس کے دو نصب العین حسب ذیل ہیں:

☆ رہبانیت اور ترک دنیا سے قلب کی پاکیزگی حاصل کرنے کی بجائے معاشرہ میں رہتے ہوئے تزکیہ نفس کیا جائے۔

! فاطر: ۲۴. @ الرعد: ۷. # النحل: ۳۶.

☆ معاشرہ میں رہتے ہوئے اپنے ذاتی مفاد کے بجائے محض اللہ کی رضا اور عوام کی بھلائی کے لیے کام کیا جائے۔

محمد رسول اللہ e کا مفہوم

] شہادتین کے اقرار سے ایک کافر اسلام میں داخل ہوتا ہے، آپ اس بات کی وضاحت کریں کہ محمد رسول اللہ(e) کی شہادت کا کیا مفہوم ہے اور اس کے کون سے تقاضے ہیں جنھیں پورا کرنا ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے؟

[شہادتین سے مراد یہ ہے کہ اس بات کی گواہی دی جائے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں اور حضرت محمد e اللہ کے رسول ہیں، بلاشبہ یہ دونوں شہادتین اسلام کی چابی ہیں، ان کے بغیر اسلام میں داخل ہونا ممکن ہی نہیں۔ محمد رسول اللہ e کا مفہوم یہ ہے کہ تسلیم و رضا کے ساتھ دل کی گہرائی سے اس بات کا اقرار کیا جائے کہ حضرت محمد e اللہ تعالیٰ کے بندے اور تمام جن و انس کے لیے اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اس اقرار کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی بتائی ہوئی تمام چیزوں کو دل و جان سے تسلیم کیا جائے خواہ وہ ماضی کی اخبار ہوں یا مستقبل کے حوادث و واقعات۔ نیز آپ کی لائی ہوئی شریعت کی پیروی کرنا اور آپ کے فیصلوں پر راضی رہنا بھی اس میں شامل ہے۔ اس سلسلہ میں یہ عقیدہ بھی ضروری ہے کہ آپ کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے اور آپ کی نافرمانی، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس وقت تک اپنے پاس نہیں بلایا جب تک آپ نے اپنی امت کو اس روشن راستہ سے آگاہ نہیں کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر اس وصف سے متصف فرمایا جو ادائے رسالت اور تبلیغ دین کے لیے ضروری تھا۔ اس وضاحت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ درج ذیل دو کاموں سے ''محمد رسول اللہ'' کی گواہی کالعدم ہوسکتی ہے:

☆ رسول اللہ e کی ذات گرامی کو ہدف تنقید بنانا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے صدق و امانت اور عفت و عصمت کے متعلق حرف گیری کرنا یا آپ کی ذات عالی صفات کے ساتھ کسی بھی پہلو سے استہزء و تمسخر کرنا یا آپ کو گالی دینا، برا بھلا کہنا اور آپ کی ذات پر کسی بھی پہلو سے اعتراض کرنا اس میں شامل ہے۔

☆ آپ کی لائی ہوئی شریعت کے کسی حصے کا انکار کرنا یا اس پر طعن کرنا، اس میں ہر اس چیز کا انکار شامل ہے جس کے متعلق رسول اللہ e نے خبر دی ہے۔ مثلاً قیامت کے دن، حساب و کتاب، میزان و صراط اور جنت و دوزخ وغیرہ جن کا تعلق امور مغیبات سے ہے۔ فرضیت نماز کو نہ ماننا، ادائیگی زکوٰۃ کو تسلیم نہ کرنا، چوری اور زنا کی حرمت سے انکار کرنا وغیرہ تمام امور اسی قسم میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس شہادت پر کاربند رہنے کی توفیق دے۔

ستارے اور مستقبل

] کیا برج اور ستارے ہماری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ کیا ان کے ذریعے مستقبل کی باتیں معلوم کی جاسکتی ہیں؟ آج کل اخبارات میں جو بڑے بڑے اشتہارات آتے ہیں ''جو چاہو پوچھو'' اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ قرآن

وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

] مستقبل سے متعلقہ واقعات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾ 1

''کسی انسان کو پتہ نہیں کہ وہ کل کیا کرے گا۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ آنے والے وقت سے متعلقہ تمام معلومات اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھی ہیں، کوئی بھی انسان یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ اس کا کل کس طرح گزرے گا یا پرسوں اس پر کیا بیتے گی۔ لیکن سیدھے سادے لوگوں کو مزید بے وقوف بنانے کے لیے اخبارات میں بڑے بڑے اشتہارات دیے جاتے ہیں کہ آپ کا کل کیسے گزرے گا اور آپ جو چاہیں پوچھیں؟ اسی طرح فٹ پاتھ پر بیٹھے بزعم خویش ''پروفیسر'' طوطے کے ذریعے مستقبل کی خبریں دیتے ہیں، یہ سب جھوٹ اور فراڈ ہے اور اس کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔ ایسے لوگوں کے پاس جا کر اپنی قسمت آزمائی کرنا اور ان کی باتوں پر عمل پیرا ہونا اللہ عزوجل اور اس کے رسول e کی سراسر نافرمانی ہے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''جو شخص کسی نجومی یا قسمت بتانے والے کی بات پر یقین کرتا ہے وہ حضرت محمد e پر اترنے والی تعلیمات کا انکار کرتا ہے۔'' 2

ایک دوسری روایت میں ہے رسول اللہ e نے فرمایا:

''جو شخص کسی کاہن، نجومی یا قسمت بتانے والے کے پاس آیا پھر اس کی بات پر یقین کیا تو چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوگی۔'' 3

اس قسم کی جادوگری کا پیشہ اختیار کرنے والے خود بدحالی کا شکار ہوتے ہیں، لوگوں کی جیبوں سے پیسہ نکالنے کے لیے اشتہار بازی کرتے ہیں۔ ان کے پاس جا کر اپنی قسمت معلوم کرنا اپنے ایمان سے محروم ہونا ہے۔ لہٰذا ان کے پاس نہیں جانا چاہیے اور نہ ہی ان کی باتوں پر یقین کرنا چاہیے۔

پاؤں پکڑنے کے لیے جھکنا

] ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ جب کوئی بڑا ناراض ہوتا ہے تو اس کے پاؤں پکڑ کر اسے راضی کیا جاتا ہے اور پاؤں پکڑنے کے لیے جھکنا پڑتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے، جبکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ صرف اللہ عزوجل کے آگے جھکنا چاہیے؟ وضاحت فرمادیں۔

! لقمان: ۳۴.

@ ابوداؤد، الکہانۃ: ۳۹۰۴.

مسلم، السلام: ۲۲۳۰.

[اس میں کوئی شک نہیں کہ عبادت کرتے وقت صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنا چاہیے جیسا کہ رکوع کرتے وقت کیا جاتا ہے، لیکن عبادت کی نیت کے بغیر طبعی طور پر یا کسی کام کے لیے جھکنے میں کوئی حرج نہیں۔ جیسا کہ سیدنا مغیرہ بن شعبہ t بیان کرتے ہیں کہ میں ایک سفر میں رسول اللہ e کے ہمراہ تھا، آپ وضو کر رہے تھے، میں آپ کے موزے اتارنے کے لیے جھکا تو آپ e نے فرمایا:

''انہیں چھوڑ دو، میں نے انہیں وضو کر کے پہنا تھا، پھر آپ نے موزوں پر مسح کر لیا۔'' 1

اس طرح کی دیگر مثالیں بھی موجود ہیں، بطور تعظیم جھکنا ناجائز ہے کیوں کہ تعظیم صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ واللہ اعلم

کفریہ کلمات

] کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم فلاں کام کریں تو کافر ہو جائیں گے پھر وہ کام کر بھی لیتے ہیں۔ کیا ایسا کہنے اور پھر اسے عمل میں لانے سے انسان کافر ہو جاتا ہے؟ وضاحت فرمادیں۔

[اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کا ایک وصف بایں الفاظ بیان کیا ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ١۪ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ١۪۫ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ۰۰۱۳۵﴾ 2

''وہ لوگ جب کوئی کھلا گناہ کرتے ہیں یا اپنے حق میں کوئی اور برائی کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے؟ اور وہ جان بوجھ کر اپنے افعال پر اڑے نہیں رہتے۔''

اس آیت کی روشنی میں ہم صورت مسئولہ میں ذکر کردہ لوگوں کے متعلق بطور نصیحت کہتے ہیں کہ انہیں اپنے مذکورہ فعل سے توبہ کرنی چاہیے اور اگر وہ اس پر اڑے ہوئے ہیں اور توبہ کرنے کے لیے تیار نہیں، تو ایسا کرنا کفر میں واپسی ہے اور یہ بہت سنگین جرم ہے۔

بعض دفعہ انسان منہ سے ایسا کلمہ نکالتا ہے جس کی اسے کوئی پروا نہیں ہوتی لیکن اللہ عزوجل کے ہاں وہ کلمہ جہنم میں دھکیلنے والا ہوتا ہے، انسان کو چاہیے کہ وہ ایسے کفریہ کلمات کہنے سے خود کو باز رکھے اور اگر کہہ دیتا ہے تو فوراً اللہ کے حضور توبہ کر لینی چاہیے۔ اگر اسی حالت میں موت آ گئی تو قیامت کے دن معاملہ بہت سنگین صورت حال اختیار کر جائے گا۔ (واللہ اعلم)

ایصال ثواب کی صورتیں

] ہمارے ہاں میت کے ایصال ثواب کے لیے بہت سی رسومات ادا کی جاتی ہیں، مثلاً قل خوانی، رسم فاتحہ، رسم سوئم، دسواں، چالیسواں اور برسی وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے، قرآن وحدیث کے مطابق میت کے لیے ایصال ثواب کی کون سی

! بخاری، الوضوء: ۲۰۶۔ @ آل عمران: ۱۳۵۔

صورت جائز ہے؟

[ہمارے معاشرہ میں لواحقین کی طرف سے میت کے ایصال ثواب کے لیے برادری کو دعوت دی جاتی ہے اور ان کے لیے کھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے، حالانکہ رسول اللہ e کے صحابہ کرام اسے انتہائی ناپسند کرتے تھے۔

چنانچہ سیدنا جریر بن عبداللہ t فرماتے ہیں: ''اہل میت کے ہاں اجتماع اور کھانے کا اہتمام ہمارے ہاں نوحہ شمار کیا جاتا تھا (جو شریعت میں جائز نہیں)۔ 1

اس قسم کی دعوت کو ایصال ثواب کا نام دے کر رواج دیا جاتا ہے جس کی شریعت میں کوئی دلیل نہیں۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے کہ جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو تین صورتوں کے علاوہ اس کے تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں، وہ تین چیزیں یہ ہیں:

☆ جاری رہنے والا صدقہ۔

☆ وہ علم جس سے نفع اٹھایا جاتا رہے۔

☆ نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہے۔ 2

جاری رہنے والے صدقہ سے مراد وہ اشیاء ہیں جو لوگوں کے لیے خیر کا باعث بنی رہیں، جب تک یہ موجود رہیں گی میت کو ان کا ثواب پہنچتا رہے گا۔ مثلاً مسجد، مدرسہ، مسافر خانہ یا کوئی اور رفاہ عامہ کے کام کر جانا۔ اسی طرح کسی ہسپتال یا ڈسپنسری کی تعمیر بھی اس میں شامل ہے، پانی پلانے کا اہتمام بھی صدقہ جاریہ ہے۔ لوگوں کو فائدہ دینے والے علم سے یہ مراد ہے کہ قرآن وحدیث کی تعلیم، دینی اصلاح کے لیے وعظ ونصیحت کا بندوبست یا کوئی بھی دین کی نشر واشاعت کے لیے کام کرنا۔ مثلاً دینی کتب تالیف کرنا، کیسٹ یا سی ڈی میں تقاریر محفوظ کر جانا یا کوئی بھی سائنسی ایجاد جس سے لوگ استفادہ کریں، نیز دینی شاگرد بھی بہترین صدقہ جاریہ ہیں۔ ہمارے نزدیک اپنی اولاد کی شرعی بنیادوں پر تربیت سب سے بڑھ کر صدقہ جاریہ ہے جو میت کے لیے دعا مغفرت کرتی رہے۔ چنانچہ رسول اللہ e فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ جنت میں نیک آدمی کا درجہ بلند فرمائے گا، آدمی عرض کرے گا یا اللہ! یہ درجہ مجھے کیسے حاصل ہوا؟''
اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تیرے بیٹے نے تیرے لیے دعائے مغفرت کی تھی۔'' 3

ویسے بھی اولاد کے نیک اعمال کا ثواب ازخود والدین کو پہنچتا رہتا ہے اگرچہ اولاد ایصال ثواب کی نیت نہ بھی کرے، اس کا ذکر متعدد احادیث میں ہے۔ ان کے علاوہ درج ذیل صورتیں بھی ایصال ثواب کی ہیں:

☆ میت کے لیے دعا مغفرت کرنا خواہ کوئی بھی ہو۔

! مسند امام احمد: ۲/ ۲۰۴۔ @ صحیح مسلم، الجنائز: ۱۶۳۱۔
مسند امام احمد: ۵/ ۵۰۹۔

☆ میت کی طرف سے قرض کی ادائیگی۔

☆ میت کی طرف سے حج بدل کرنا۔

☆ گھر والوں کو قرآن وحدیث کا پیرو بنانا۔

☆ والدین کے دوست واحباب کی عزت اور ان کے رشتے داروں سے صلہ رحمی کرنا۔ یہ ہیں وہ چند امور جو ایصال ثواب کے لیے کارگر ہو سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر عمل کی توفیق دے۔ آمین

علی t مشکل کشا ہونے کا عقیدہ

] ہمارے ہاں اکثریت کا عقیدہ ہے کہ سیدنا علی t مشکل کشا ہیں اور مصائب کے وقت وہ کسی کی مدد کر سکتے ہیں، اس قسم کے عقیدہ کی شرعی طور پر کیا حیثیت ہے؟

[سیدنا علی t کے متعلق مشکل کشاء ہونے کا عقیدہ رکھنا ایک مشرکانہ عقیدہ ہے کیوں کہ مشکل کشا ہونے کی خصوصیت صرف اللہ وحدہ لاشریک کے لیے ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ﴾ 1

''اگر اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے علاوہ کوئی دوسرا اسے دور نہیں کر سکتا اور اگر وہ آپ کو کوئی بھلائی دینا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں۔''

یہ آیت کریمہ اور قرآن کریم کی متعدد دوسری آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی دوسرا مشکل کشا یا حاجت روا نہیں۔ سیدنا علی t کے مشکل کشا ہونے کا عقیدہ رکھنا مذکورہ آیت کے خلاف ہے پھر سیدنا علی t کو شہید کیا گیا اور وہ اپنے قتل کے منصوبے کو اپنی زندگی میں ناکام نہ کر سکے، وفات پانے کے بعد وہ کیسے مشکل کشا بن سکتے ہیں؟

یاد رہے! کہ سیدنا علی t کی زندگی میں ہی ایک قوم آپ کو اپنا پروردگار اور خالق ورازق مانتی تھی، سیدنا علی t تین دن تک بلا کر انہیں توبہ کرنے اور اپنے مشرکانہ عقیدے سے رجوع کرنے کی تلقین کرتے رہے، جب وہ اپنے اس عقیدے سے باز نہ آئے تو سیدنا علی t نے انہیں آگ کی خندق میں ڈال کر جلا دیا تھا۔ 2

اس بات کی تاریخ بھی گواہی دیتی ہے کہ سیدنا علی t اپنی زندگی میں کئی قسم کی مشکلات میں گھرے رہے اور وہ اپنے مصائب کو دور نہ کر سکے تو فوت ہونے کے بعد دوسروں کی مشکلات کیوں کر دور کر سکتے ہیں؟ مشکل کشا اور حاجت روا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْۗءَ﴾ 3

! یونس: ۱۰۷. @ فتح الباری: ۱۲/ ۳۳۴. # النمل: ۶۲.

''لاچار اور بے کس کی پکار کو جبکہ وہ پکارے، کون قبول کر کے سختی کو دور کر دیتا ہے۔''

اس آیت کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہی اللہ ہے جسے شدائد کے وقت پکارا جاتا ہے اور مصائب کے وقت جس سے امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی دوسری ہستی ایسی نہیں جس کی طرف مصیبت کے وقت رجوع کیا جا سکے اور وہ کوئی تکلیف دور کر سکے۔ بہرحال سیدنا علی t کے متعلق مشکل کشا ہونے کا عقیدہ رکھنا کتاب وسنت کے خلاف ہے اور تاریخی حقائق بھی اس عقیدے کے خلاف ہیں۔ واللہ اعلم

عیسیٰ u کو غائبانہ سلام

] میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ رسول اللہ e نے حضرت عیسیٰ u کو سلام بھیجا ہے کہ افراد امت میں سے اگر کسی کی حضرت عیسیٰ u سے ملاقات ہو تو وہ انہیں میرا اسلام کہہ دے، اب اس کا حوالہ یاد نہیں، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں۔

[قرآن وحدیث کی صحیح نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ u آسمانوں پر زندہ موجود ہیں اور قرب قیامت ان کا نزول ہوگا اور وہ اس عالم رنگ و بو میں عدل وانصاف قائم کریں گے اور ان کے دورِ میمون میں شریعت محمدی کا بول بالا ہوگا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴾ 1

''اور یقیناً عیسیٰ u قیامت کی علامت ہیں، اس لیے تم قیامت کے متعلق شک نہ کرو اور میری پیروی کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے قریب آسمان سے ان کا نزول ہوگا جیسا کہ صحیح اور متواتر احادیث سے ثابت ہے، واقعی رسول اللہ e نے انہیں سلام بھیجا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''میں امید رکھتا ہوں کہ اگر میری عمر لمبی ہوئی تو میں حضرت عیسیٰ u سے خود ملاقات کروں گا اور اگر پہلے فوت ہو جاؤں تو تم میں سے جو حضرت عیسیٰ u سے ملاقات کرے تو وہ میری طرف سے انہیں سلام کہہ دے۔'' 2

یہ روایت دو طرح سے بیان کی گئی ہے: امام شعبہ سے جب محمد بن جعفر بیان کرتے ہیں جو اسے رسول اللہ e کے حوالے سے نقل کرتے ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا روایت میں ہے۔ جب ان سے یزید بن ہارون بیان کرتے ہیں تو اسے سیدنا ابوہریرہ t سے موقوف نقل کرتے ہیں یعنی یہ ان کا قول ہے جیسا کہ اس سے اگلی روایت میں ہے۔ حافظ احمد شاکر نے اس کے مرفوع ہونے کو ترجیح دی ہے کیوں کہ یہ ثقہ راوی کا اضافہ ہے، نیز حضرت شعبہ اکثر مرفوع روایات کو موقوف بیان کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں بیان کردہ مفہوم امور غیب سے ہے، اس لیے ایسی روایت مرفوع ہوتی ہے۔ جبکہ کچھ اہل علم کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ u کو سلام پہنچانے کا واقعہ مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح سے مروی ہے۔ جبکہ اس روایت کا پہلا حصہ جس میں عمر کے

! الزخرف: ۶۱.   @ مسند امام احمد: ۲/ ۲۹۸.

طویل ہونے کا ذکر ہے اس کا مرفوع ہونا محل نظر ہے۔ کیوں کہ کچھ احادیث میں صراحت ہے کہ حضرت عیسیٰ u کے نزول کے وقت رسول اللہ e وفات پا چکے ہوں گے۔ بہر حال یہ روایت صحیح ہے کیوں کہ بخاری اور مسلم کی شرائط کے عین مطابق ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ u ابھی تک زندہ ہیں جو کہ قرب قیامت کے وقت نزول فرمائیں گے۔ (واللہ اعلم)

صفات باری تعالیٰ

] قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے حضرت آدم کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا، اس آیت کریمہ کا کیا مفہوم ہے؟ وضاحت کردیں۔

[اس آیت کا سیاق وسباق یوں ہے کہ جب ابلیس نے حضرت آدم u کو سجدہ نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَالَ يٰۤاِبۡلِيۡسُ مَا مَنَعَكَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَیَّ﴾ 1

''اے ابلیس! تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اسے سجدہ کرے جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔''

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کو ''کن'' کہہ کر پیدا کیا لیکن آدم کے خمیر کو اپنے ہاتھوں سے گوندھا، پھر اس کا پتلا بنا کر اس کی نوک پلک کو ٹھیک کیا، اس کے بعد اپنی طرف سے اس میں روح پھونک کر اسے جیتا جاگتا انسان بنایا پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے اعزاز واکرام میں اسے سجدہ کرو، ابلیس کے علاوہ تمام فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری کرتے ہوئے حضرت آدم u کو سجدہ کیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے حکم عدولی کا جواب طلب کیا جس کا ذکر مذکورہ آیت میں ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں، کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کا انکار کرتے ہیں اور اس کی تاویل کرتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے، جبکہ یہ معنی آیت کے سیاق وسباق کے خلاف ہے کیوں کہ یہ معنی کرنے سے آدم کی کوئی برتری ثابت نہیں ہوتی جس کی بناء پر اسے لائق سجدہ ٹھہرایا جائے۔ کیوں کہ کائنات کی تمام چیزیں اللہ کی قدرت کا شاہکار ہیں، اگر آدم بھی اللہ کی قدرت سے پیدا ہوا ہے تو اس میں ان کی کیا فضیلت ہے۔ جو لوگ اللہ کی اس صفت کا انکار کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم اللہ کے ہاتھ مان لیں تو وہ ہمارے جیسا ہو جائے گا حالانکہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں، لیکن لوگوں کی یہ بات درست نہیں کیوں کہ یہ تو اس وقت ہوگا جب ہم اللہ کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں جیسا تسلیم کریں۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ اللہ کے ہاتھ ہیں لیکن ہمارے ہاتھوں جیسے نہیں بلکہ ایسے ہیں جیسے اس کی شان کے شایان ہیں، یہ معنی کرنے سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ موجود ہے اور ہم بھی موجود ہیں، کیا ہمارے موجود ہونے سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کر دیا جائے گا کہ اس سے مشابہت لازم آتی ہے، اللہ کی ذات بھی بے مثل ہے اور اس کی صفات بھی بے مثل ہیں۔ ہمارے معاشرہ میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اس طرح کے شبہات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کرتے ہیں یا پھر تاویل کا سہارا لیتے ہیں۔ جبکہ اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود، اس کا چہرہ اور اس کے ہاتھ ہیں لیکن ہمارے جیسے نہیں بلکہ

! ص: ۷۵.

ایسے ہیں جیسے اس کی شان کے شایاں ہیں، اس کا انکار یا تاویل بدترین الحاد ہے جس کی قرآن میں تردید کی گئی ہے۔(دیکھئے سورۃ الاعراف:۱۸۰) اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دے۔

حضرت آدم u کا وسیلہ

] کچھ علماء کہتے ہیں کہ جب حضرت آدم u سے غلطی ہوئی تو انہوں نے عرش الٰہی پر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا دیکھا، پھر انہوں نے حضرت محمد e کے وسیلہ سے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی غلطی کو معاف کر دیا، اس روایت سے دعا کے وقت رسول اللہ e کا وسیلہ ثابت کیا جاتا ہے، اس کی وضاحت کر دیں؟

[سوال میں ذکر کردہ روایت موضوع، خودساختہ اور بے سند ہے، شرعی مسائل کے اثبات میں ایسی روایت کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت آدم u سے جنت میں ایک درخت کے پاس جانے کی غلطی ہوئی تھی جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں منع کیا تھا پھر اس غلطی کی معافی کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے چند کلمات سکھائے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ 1

''حضرت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔''

متعدد مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت آدم u نے اپنے رب سے درج ذیل کلمات سیکھے تھے:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ 2

''اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم خسارہ پانے والے ہوں گے۔''

اس قرآنی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم u نے اپنی غلطی کی معافی کے لیے رسول اللہ e کا وسیلہ نہیں بلکہ مذکورہ بالا دعا پڑھی تھی جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے اعتراف خطا کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرف قبولیت سے نوازا اور ان کی غلطی کو معاف کر دیا۔ علاوہ ازیں تمام انبیاء o نے براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیں، کسی نبی کا وسیلہ نہیں ڈالا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ 3

''اللہ تعالیٰ کے خوبصورت نام ہیں تم ان ناموں کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرو۔''

بہرحال سوال میں ذکر کردہ روایت کی کوئی حیثیت نہیں، اس کے علاوہ یہ قرآن کریم کے بھی خلاف ہے۔ رسول اللہ e سمیت تمام انبیاء o کا یہی طریقہ ہے کہ وہ دعا کرتے وقت کسی قسم کے واسطے کے بغیر براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے تھے، ہمیں بھی دعا کے وقت اسی انداز کو اختیار کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

! البقرہ: ۳۷. @ الاعراف: ۲۳. # الاعراف: ۱۸۰.

تعویذات میں حروف ابجد کا استعمال

] ہمارے ہاں عامل حضرات عملیات والے تعویذات میں حروف ابجد کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ ہندسے اور حروف ابجد کیا ہیں اور انہیں تعویذات میں کیوں لکھا جاتا ہے؟ اس کی وضاحت کر دیں اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

[سفلی علوم میں حروف ابجد یعنی الف، با، تا اور ثا وغیرہ کے ہندسے نکالے جاتے ہیں، عاملین حضرات حروف استعمال کرنے کی بجائے ان ہندسوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان حروف اور ان کے اعداد کو بطور تعویذ استعمال ہی خلاف شرع ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس W نے ایسی قوم کے متعلق فرمایا کہ جو کسی بھی مقصد کے لیے حروف ابجد کو استعمال کرتے ہیں اور ستاروں کی تاثیر کے پیش نظر انہیں دیکھ کر زائچے بناتے ہیں۔

آپ t نے فرمایا: ''میرے یقین کے مطابق یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جن کا اللہ عزوجل کے ہاں قیامت کے دن کوئی حق نہیں ہوگا۔'' 1

عملیات والے اکثر طور پر لفظ بدوح اور اس کے اعداد کو تعویذات میں استعمال کرتے ہیں۔

ہمارے رجحان کے مطابق یہ شیطان کا نام ہے اور غیر اللہ سے مدد لینے کے لیے اسے تعویذات میں لکھا جاتا ہے۔ ایسا کرنا جادو کی ایک قسم ہے جو شرک باللہ پر قائم ہے کیوں کہ جادو، شرک کے بغیر کوئی اثر نہیں کرتا۔ لفظ بدوح کے اعداد بیس (۲۰) ہیں کیوں کہ ب کے دو، دال کے چار، واؤ کے چھ اور حا کے آٹھ عدد ہیں۔ ان کا مجموعہ ۲+ ۴+ ۶+ ۸= ۲۰ ہے۔ عموماً ان کے حروف کو مربع شکل میں لکھا جاتا ہے جس کی صورت یہ ہے:

ح	و	د	ب
و	د	ب	د
د	ح	و	و
ب	و	و	ح

اور ان کے اعداد کو مربع اور مثلث شکل میں لکھا جاتا ہے۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ ہر طرف کے اعداد کو جمع کرنے سے ان کا مجموعہ بیس بنتا ہے جس کی صورت یہ ہے:

7	5	8
5	8	7
8	7	5

! سنن الکبریٰ بیہقی: ۸/ ۱۳۹.

8	6	4	2
2	4	8	6
4	2	6	8
6	8	2	4

ہمارے نزدیک ایسے تعویذات جو حروف یا اعداد کی شکل میں ہوں، یہ تمام جادو کی اقسام ہیں۔ہمیں چاہیے کہ ایسے نقش ہرگز عمل میں نہ لائیں کیوں کہ یہ سب ایمان کے لیے زہر قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم

مزاروں کے در و دیوار کو چومنا

] میری ایک قبر کے مجاور سے بات چیت ہوئی تو اس نے کہا کہ جب بیت اللہ میں لگے ہوئے حجر اسود کو چوما جا سکتا ہے تو بزرگوں کی قبروں پر لگے ہوئے پتھروں کو کیوں نہیں چوما جا سکتا؟ اس کے متعلق قرآن وحدیث کی روشنی ڈالیں۔

[اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ قبروں پر عمارتیں تعمیر کرنا اور قبے بنانا ہی خلاف شرع ہے۔

سیدنا جابر t کا بیان ہے کہ رسول اللہ e نے قبر کو پختہ بنانے، اس پر عمارت تعمیر کرنے اور اس پر (مجاور بن کر) بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ 1

دوسری بات یہ ہے کہ حجر اسود قابل تکریم اس لیے ہے کہ یہ دنیاوی پہاڑوں کا نہیں بلکہ جنت سے آیا ہوا پتھر ہے جیسا کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''حجر اسود جنت کا پتھر ہے، یہ برف سے زیادہ سفید تھا لیکن ابن آدم کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا ہے۔'' 2

نیز سیدنا عبداللہ بن عباس w مرفوعاً بیان کرتے ہیں کہ قیامت کے دن حجر اسود کے دو ہونٹ اور زبان ہوگی اور جس نے اخلاص نیت سے اسے بوسہ دیا ہوگا اس کے متعلق یہ پتھر حق پر ہونے کی گواہی دے گا۔ 3

تیسری بات یہ ہے کہ سیدنا عمر t بھی صرف اتباع سنت کی نیت سے حجر اسود کو بوسہ دیتے تھے۔ جیسا کہ ان کے متعلق حدیث میں ہے کہ وہ حجر کے پاس آئے اور اسے بوسہ دے کر فرمایا: ''میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، کسی کو نفع یا نقصان پہنچانا تیرے بس میں نہیں، اگر میں نے رسول اللہ e کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں کبھی تجھے بوسہ نہ دیتا۔'' 4

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ تمام مسلمان حجر اسود کو اتباع سنت کے جذبہ سے بوسہ دیتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قبروں کی چوکھٹ، ان کی زمین اور ان کے در و دیوار کو بوسہ دینا، انہیں چومنا بدعت اور جہالت کے کام ہیں۔ اہل اسلام حجر اسود کی تعظیم بصورت استلام کرتے ہیں وہ صرف اس بناء پر ہے کہ مذہب اسلام کی حقانیت پر یہ پتھر ایک تاریخی شاہد عادل کی حیثیت رکھتا ہے جسے ہزاروں سال کے انقلابات ختم نہ کر سکے جبکہ یہ مرتبہ مزاروں پر رکھے ہوئے پتھروں کا نہیں بلکہ یہ تو سراسر

! مسلم، الجنائز: ۲۲۴۵۔ @ ابن خزیمہ: ۴/ ۲۲۰۔

ابن خزیمہ: ۴/ ۲۲۰۔ $ بخاری، الحج: ۱۵۹۷۔

شریعت کی خلاف ورزی ہے۔ واللہ اعلم

بیعت تصوف کی حیثیت

] ہمارے معاشرہ میں کچھ دیندار لوگ بیعت کا سلسلہ جاری رکھے ہوتے ہیں اور اسے ضروری قرار دیتے ہیں، اس قسم کی بیعت کے متعلق شریعت کی ہدایات معلوم کرنا چاہتا ہوں، رہنمائی فرمائیں۔

[صوفیائے کرام نے جب لوگوں کی تربیت کا بیڑا اُٹھایا تو انہوں نے لوگوں کو اپنے حلقہ ارادت میں داخل کرنے کے لیے بیعت کا سلسلہ شروع کیا تا کہ ان کی ہر بات کو بلا کم و کاست مانا جائے، اسے بیعت تصوف کہتے ہیں۔ اس عالم رنگ و بو میں جس کی ہر بات کو مانا جاتا ہے وہ تو انبیاء کرام o کی شخصیت ہیں جب کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ﴾ 1

''ہم کسی بھی رسول کو اس لیے بھیجتے ہیں کہ اللہ کے اِذن سے اس کی بات مانی جائی۔''

بیعت کی چند صورتیں درج ذیل ہیں:

بیعت اسلام: جب کوئی شخص اپنا دین چھوڑ کر دین اسلام میں داخل ہونا چاہتا تو رسول اللہ e، دین اسلام پر کاربند رہنے کے لیے اس سے بیعت لیتے تھے۔ جیسا کہ سیدنا عمرو بن العاص t جب مسلمان ہوئے تو انہوں نے از خود رسول اللہ e سے کہا تھا کہ آپ اپنا ہاتھ پھیلائیں، میں آپ سے بیعت اسلام کرنا چاہتا ہوں۔ 2

بیعت ہجرت: اگر معاشرتی طور پر دین اسلام پر عمل ناممکن ہوتا تو مسلمانوں کے لیے وہاں سے ہجرت کرنا ضروری ہے تا کہ وہ ایسی جگہ چلے جائیں جہاں اسلام پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ قرآن کریم میں اس کا تذکرہ ہے، اس وقت جو بیعت لی جاتی اسے بیعت ہجرت کہا جاتا ہے۔

بیعت جہاد: جو مجاہدین، جہاد میں شرکت کرنے والوں سے میدان کارزار میں ڈٹے رہنے کی بیعت لی جاتی کہ وہ کسی بھی صورت میں راہ فرار اختیار نہیں کریں گے۔ جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعت رضوان ہوئی تھی، قرآن کریم میں بھی اس بیعت کا ذکر آیا ہے۔

بیعت اطاعت: اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کے لیے اہل اسلام سے بیعت لی جاتی کہ وہ تنگی و خوش حالی میں اللہ عزوجل اور اس کے رسول e کی اطاعت کریں گے اور ان کی مخالفت سے گریز کریں گے۔ قرآن کریم کی سورۂ ممتحنہ آیت نمبر ۱۲ میں اس بیعت کا ذکر ہے۔

بیعت اطاعت، رسول اللہ e کے ساتھ خاص تھی، جواب ختم ہے، صحابہ کرام y اور تابعین عظام کے دور میں ایسا ہی رہا۔ مروجہ بیعت اگر بیعت امارت ہے تو اطاعت شریعت کے حوالے سے اس کا جواز کشید کیا جا سکتا ہے لیکن صحابہ کرام y

---

! النساء: ۶۴. @ مسلم الایمان: ۳۲۱.

نے ایسا نہیں کیا۔

اس بناء پر ہمارا رجحان ہے کہ اسے مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا، اگر یہ بیعت اپنی اطاعت کے لیے ہے تو ایسا کرنا جائز نہیں کیوں کہ شرعی طور پر رسول اللہ e کے علاوہ کوئی دوسرا مطاع نہیں ہے کہ اس کی اطاعت مطلقاً جائز ہو۔ واللہ اعلم

نزول عیسیٰ u

] ہمارے ہاں کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ سیدنا عیسیٰ u فوت ہو چکے ہیں اور وہ آخری زمانے میں اب نازل نہیں ہوں گے۔ اس مسئلہ کے متعلق وضاحت کر دیں۔

[یہودیوں کا یہ دعویٰ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے کہ انہوں نے سیدنا عیسیٰ u کو قتل کر دیا ہے اور سولی پر چڑھا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعویٰ کی تردید کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ﴾ 1

''یہودیوں کے یہ کہنے کے سبب کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح کو جو اللہ کے رسول تھے قتل کر دیا ہے (اللہ تعالیٰ نے ان کو ملعون کر دیا) انہوں نے عیسیٰ u کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی انہیں سولی پر چڑھایا ہے۔''

بلکہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا کہ ﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ﴾ 2 ''اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف اٹھا لیا ہے۔''

رسول اللہ e نے اس عقیدہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! قریب ہے کہ تم میں ابن مریم حاکم عادل کی حیثیت سے نازل ہوں جو صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیہ بھی ختم کریں گے اور مال و دولت کی اس قدر فراوانی ہو جائے گی کہ اسے کوئی قبول کرنے والا نہ ہوگا۔'' 3

یہ حدیث بیان کرنے کے بعد سیدنا ابو ہریرہ t فرماتے ہیں کہ اگر چاہو تو اس کی تصدیق میں یہ آیت پڑھ لو:

﴿وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴾ 4

''اور اہل کتاب سب کے سب سیدنا مسیح عیسیٰ u پر اس کی موت سے پہلے ضرور ایمان لائیں گے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوں گے۔''

نزول عیسیٰ u کے متعلق متواتر احادیث ہیں، ان میں آپ کے نزول اور مقام نزول کی وضاحت ہے، لہٰذا سیدنا عیسیٰ u کے نزول کا انکار کسی طرح بھی درست نہیں۔

! النساء: ۱۵۷. @ النساء: ۱۵۸.

بخاری، الانبیاء: ۳۴۴۸. $ النساء: ۱۵۹.

عورت کے لیے تمام سر کا مسح

] دوران وضو کیا عورت اپنے سر کے تمام بالوں کا مسح کرے گی؟ میں نے سنا ہے کہ عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ دوران وضو اپنے سر کے کچھ حصے کا مسح کرے یہ بات کس حد تک صحیح ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[قرآن کریم میں وضو کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ 1

''اے ایمان والو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کرو تو اپنا منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھولیا کرو نیز سر کا مسح بھی کرو، اس کے علاوہ ٹخنوں تک اپنے پاؤں دھویا کرو۔''

اس آیت کریمہ میں وضو کے لیے سر کے مسح کو بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس کا طریقہ اور کیفیت احادیث میں بیان ہوئی ہے، امام بخاری a نے اس آیت کریمہ پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''باب مسح الراس كله'' ''تمام سر کا مسح کرنا۔'' 2

اس کے بعد انہوں نے سیدنا سعید بن مسیب کا قول نقل کیا ہے کہ عورت بھی مردوں کی طرح اپنے تمام سر کا مسح کرے گی، پھر امام مالک a کا حوالہ دیا ہے کہ ان سے سوال ہوا، آیا کچھ سر کا مسح کرنا جائز ہے؟ تو انہوں نے سیدنا عبداللہ بن زید t کی حدیث بطور حوالہ پیش کی کہ عورت کو بھی تمام سر کا مسح کرنا ہوگا۔

سیدنا عبداللہ بن زید t کی حدیث حسب ذیل ہے:

''انہوں نے وضو کا طریقہ عملاً بیان کر کے مسح کی وضاحت فرمائی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کا مسح کیا، اپنے دونوں ہاتھوں کو سر کے آگے اور پیچھے لے گئے، پیشانی سے شروع کیا یہاں تک کہ گدی تک لے گئے، پھر اسی جگہ واپس لائے جہاں سے شروع کیا تھا۔'' 3

! المائدۃ: ۶.　　@ بخاری، الوضوء، باب: ۳۸.　　# بخاری، الوضوء: ۱۸۵.

اس حدیث کے مطابق وضو کرنے میں مرد وزن سب برابر ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں لیکن اس مقام پر یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ عورت کے سر کے نیچے جو بال لٹک رہے ہیں، ان کا مسح کرنا ضروری نہیں، وہ صرف سر کا مسح کرے گی جیسا کہ قرآن میں ہے۔ لٹکتے ہوئے بال اس کے سر سے باہر ہیں، وہ صرف اپنے سر پر مسح کرنے کی پابند ہے۔ واللہ اعلم

بچوں کی صفائی کے بعد وضو کرنا

] میں نے وضو کیا ہوتا ہے، اس کے بعد بچوں کی صفائی کی ضرورت پڑتی ہے یا انہیں نہلانا ہوتا ہے، کیا مجھے اس کے بعد دوبارہ وضو کرنا ہوگا؟ اس متعلق قرآن وحدیث میں کیا ہدایات ہیں، وضاحت کردیں؟

[شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹنے یا نہ ٹوٹنے کی دونوں روایات کتب حدیث میں مروی ہیں چنانچہ سیدہ بسرہ بنت صفوان w سے مروی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جو کوئی اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگائے اسے چاہیے کہ وضو کرے۔'' 1

بلکہ سیدنا طلق بن علی t بیان کرتے ہیں کہ ہم وفد کی صورت میں اپنے علاقے سے نکلے حتیٰ کہ رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ سے بیعت ہوئے اور نماز ادا کی، نماز ختم ہونے کے بعد ایک بدوی سا آدمی آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! اس آدمی کے متعلق کیا حکم ہے جو نماز میں اپنی شرمگاہ کو چھو بیٹھتا ہے؟

آپ e نے فرمایا: ''وہ بھی تیرے جسم کا ایک ٹکڑا ہی ہے۔'' 2

ان دونوں احادیث میں تطبیق کی یہ صورت ہے کہ اگر براہ راست بغیر کسی حائل رکاوٹ کے شرم گاہ کو ہاتھ لگے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ درمیان میں کپڑا وغیرہ ہو تو پھر وضو نہیں ٹوٹتا، اس بات کی صراحت سیدنا ابوہریرہ t سے مروی حدیث میں موجود ہے۔ 3

اس کے علاوہ سیدنا طلق t کی روایت پہلے کی ہے کیوں کہ وہ جب رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت مسجد نبوی تعمیر ہو رہی تھی اور سیدہ بسرہ r کی روایت بہت بعد کی ہے کیوں کہ انہوں نے فتح مکہ والے سال ۸ ہجری کو اسلام قبول کیا تھا۔

اس اعتبار سے ہمارا رجحان یہ ہے کہ اگر کپڑے کے بغیر شرمگاہ کو چھوا جائے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس حکم میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں، اگلی اور پچھلی دونوں شرمگاہ کا ایک ہی حکم ہے۔ نیز اپنی شرمگاہ کی طرح دوسرے کی شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن صورت مسئولہ میں بچوں کی شرمگاہ کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ اگر انہیں استنجاء کرانے سے وضوء ٹوٹ جائے تو یہ عام مصیبت بن جائے کیوں کہ اس میں بہت حرج اور تکلیف ہے۔ اگر یہ عمل ناقض وضو ہوتا تو صحابہ کرام y اور تابعین عظام سے ضرور منقول ہوتا۔ بہر حال صفائی کی غرض سے بچوں کی شرم گاہ کو ہاتھ لگانا ناقض وضو

! ابوداود، الطہارۃ: ۱۸۱.   @ النسائی، الطہارۃ: ۱۶۵.
مسند امام احمد: ۲/ ۳۳۳.

نہیں۔ واللہ اعلم

ناک میں اُگے ہوئے بال

] ناک میں اُگے ہوئے بالوں کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟ کچھ لوگوں کے یہ بال بڑھ کر ناک سے باہر آجاتے ہیں جو اس کی شخصیت کے بدنما ہونے کا باعث بن جاتے ہیں، کیا ایسے بالوں کو صاف کیا جا سکتا ہے؟

[اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی کوئی چیز فضول یا بے کار نہیں ہوتی، اس میں ضرور کوئی حکمت پنہاں ہوتی ہے، اگرچہ ہم اپنی عقل کے ناقص ہونے کی وجہ سے اس تک رسائی نہ حاصل کر سکیں۔ البتہ بعض پیدا کردہ چیزوں کا کاٹنا یا زائل کرنا امور فطرت میں شمار کیا گیا ہے۔ مثلاً مونچھیں، زیر ناف اور بغلوں کے بال وغیرہ، ان کے متعلق شریعت کے واضح احکام ہیں۔ ناک کے بالوں کے متعلق شرعی طور پر کاٹنے یا انہیں صاف کر دینے کے متعلق کوئی حکم میری نظر سے نہیں گزرا، اس لیے انہیں اپنی حالت پر رہنے دیا جائے۔ قدیم طب اور جدید میڈیکل سائنس نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ فلٹر کا کام دیتے ہیں، بیرونی گرد وغبار کو دماغ تک نہیں پہنچنے دیتے، اسی طرح اندرونی آلائش کے لیے بھی رکاوٹ کا باعث ہیں، اسے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ تاہم اگر یہ بال تکلیف کا باعث ہوں یا انسانی وقار اور خوبصورتی کے منافی ہوں تو انہیں کاٹا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ صورت مسئولہ میں وضاحت کی گئی ہے اور ہمارا بھی مشاہدہ ہے کہ کچھ لوگ جب ہنستے ہیں یا بات کرتے ہیں تو ان کے ناک میں اگے ہوئے بال ان کی شخصیت کو داغدار کرتے ہیں۔ شاید انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا ہوگا اور نہ ہی انہیں اس بات سے کوئی آگاہ کرنے والا ہوتا ہے، ایسے حالات میں اگر انہیں کاٹ دیا جائے تو امید ہے کہ کوئی حرج نہیں ہوگا کیوں کہ تکلیف دہ چیز کا ازالہ ضروری ہے۔ اسی طرح جو چیز انسانی وقار یا اس کی خوبصورتی میں حائل ہو اسے بھی دور کرنے میں چنداں حرج نہیں، البتہ کاٹتے وقت دو چیزوں کا خیال رکھا جائے:

۱: حالت احرام میں انہیں کاٹنے سے گریز کرنا چاہیے کیوں کہ اس حالت میں جسم کا کوئی بھی بال کاٹنا منع ہے۔

۲: یکم ذوالحجہ سے قربانی کرنے تک بھی ایسے بالوں سے چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے کیوں کہ احادیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ واللہ اعلم

اونٹ کا گوشت کھا کر وضو کرنا

] ہمارے خطیب نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ وضو کرنے کے بعد اگر اونٹ کا گوشت کھا لیا جائے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، نماز پڑھنے کے لیے دوبارہ وضو کرنا ہوگا، کیا یہ مسئلہ صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو اس میں کیا حکمت ہے؟ وضاحت کر دیں۔

[شرعی احکام کی یہی علت اور حکمت کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول نے انہیں بجا لانے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ 1

''رسول جو تمہیں دے وہ لے لو اور جس سے روک دے اس سے رک جاؤ۔''

اونٹ اگرچہ حلال جانور ہے مگر اس کا گوشت تناول کرنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس بات کا حکم خود رسول اللہ e نے دیا ہے۔

چنانچہ سیدنا جابر بن سمرہ t سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ e سے دریافت کیا کہ ہم بکری کا گوشت کھانے کے بعد وضو کریں؟ تو آپ e نے فرمایا: ''اگر چاہو تو کرلو اور اگر چاہو تو نہ کرو۔''

اس نے دریافت کیا کہ اونٹ کا گوشت استعمال کرنے کے بعد وضو کریں؟ تو آپ e نے فرمایا:

''ہاں! تم اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرو۔'' 2

اسی طرح سیدنا براء بن عازب t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e سے سوال کیا گیا کہ آیا اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو لازم آتا ہے؟

آپ e نے فرمایا: ''ہاں، اس سے وضو کیا کرو۔'' 3

اس میں کیا حکمت اور کیا علت ہے؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، ہمارا کام اللہ عزوجل کے احکام کو بجالانا ہے۔ صحابہ کرام y کا یہی فکر اور طرز عمل تھا کہ وہ علت معلوم کیے بغیر احکام کو بجالاتے تھے۔

چنانچہ ام المومنین سیدہ عائشہ r سے مروی ہے کہ ''حائضہ عورت اپنے ایام کے دوران روزہ نہیں رکھتی اور نہ نماز پڑھتی ہے لیکن بعد میں روزوں کی قضا دیتی ہے جبکہ فوت شدہ نمازوں کی قضاء نہیں ہے۔'' اس میں کیا علت اور کیا حکمت ہے؟ ام المومنین نے اس سوال پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ اس کا جواب بایں الفاظ دیا: ''ہمیں رسول اللہ e کے عہد مبارک میں روزے کی قضاء کا حکم دیا جاتا تھا اور نماز کی قضاء کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔'' 4

سیدہ عائشہ r کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ e کا حکم ہی حکمت ہے اس کے علاوہ کوئی دوسری حکمت تلاش کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ اسی طرح اونٹ کے گوشت سے وضو ٹوٹ جانے کا مسئلہ خود رسول اللہ e نے بیان کیا ہے، اس کی یہی حکمت ہے کہ آپ کا فرمان ہے، اس کے بعد ہمیں مزید کوئی حکمت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم

حائضہ عورت کا میت کو غسل دینا

] ہمارے گاؤں میں ایک عورت، مرنے والی خواتین کو غسل دیتی ہے، جب ہماری ایک عزیزہ فوت ہوئی تو غسل دینے والی خاتون حالت ایام میں تھی، وہاں یہ بحث چلی کہ ایام والی عورت میت کو غسل دے سکتی ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق

! الحشر: ۷. @ مسلم، الحیض ۳۶۰.

ابوداود، الطہارۃ: ۱۸۴. $ مسلم، الحیض ۳۳۵.

قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[بلوغت کے بعد ہر عورت ایام سے دوچار ہوتی ہے، یہودی ایسی حالت میں عورت کو بالکل نجس خیال کرتے تھے اوراس کے ساتھ کھانا پینا اور رہنا سہنا جائز نہیں سمجھتے تھے، اس سلسلہ میں صحابہ کرام y نے رسول اللہ e سے دریافت کیا تو درج ذیل آیت نازل ہوئی:

﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ﴾ 1

''آپ سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ فرمائیں کہ یہ گندگی ہے، حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو۔''

اس کے بعد رسول اللہ e نے فرمایا: ''جماع کے علاوہ سب کچھ جائز ہے۔'' 2

بدقسمتی سے جہالت کی بناء پر ایام میں مبتلا عورت کے متعلق بہت سے مسائل مشہور ہیں، مثلاً:

۱: ان دنوں عورت بچے کو دودھ نہ پلائے۔

۲: کھانا وغیرہ تیار نہ کرے۔

۳: میت کو غسل نہ دے وغیرہ۔

رسول اللہ e کا اسوۂ مبارک اس کے برعکس ہے۔ مثلاً

☆ رسول اللہ e، سیدہ عائشہ r کی گود میں ٹیک لگا کر قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے جبکہ آپ r اس وقت مخصوص ایام میں ہوتی تھی۔ 3

☆ سیدہ عائشہ r کو اسی حالت میں رسول اللہ e کو چٹائی دینے سے کچھ ہچکچاہٹ ہوئی تو آپ نے فرمایا: ''تیرا حیض تیرے ہاتھ میں نہیں ہے۔'' 4

☆ سیدہ عائشہ r اسی حالت میں پانی پیتیں تو رسول اللہ e بھی وہی پانی نوش فرماتے اور اپنا منہ وہاں لگاتے جہاں سیدہ عائشہ r نے لگایا ہوتا، اسی طرح ہڈی والی بوٹی کھاتے وقت کرتے۔ 5

ان دنوں عورت کو صرف مسجد میں جانے کی ممانعت ہے اور نماز و روزہ بھی نہیں ادا کرسکتی، نیز اس حالت میں تعلقات زن وشوئی پر بھی پابندی ہے۔ باقی ذکر استغفار پر کوئی پابندی نہیں بلکہ سیدہ ام عطیہ r نے جب مسئلہ بیان کیا کہ حیض والی عورتیں عیدگاہ جائیں، مجالس خیر اور مسلمانوں کی دعاءِ خیر میں شریک ہوں تو حفصہ بنت سیرین نے عرض کیا کہ حائضہ عورت بھی ایسی مجالس میں شریک ہوسکتی ہے؟

انہوں نے جواب دیا: ''کیا حائضہ عورت عرفات میں اور دیگر مقامات میں نہیں جاتی۔'' 6

! البقرۃ: ۲۲۲.
@ مسلم، الحیض: ۶۹۴.
# بخاری، الحیض: ۲۹۷.
$ مسلم، الحیض ۶۸۹.
% مسلم، الحیض ۶۹۲.
^ بخاری، الحیض ۳۲۴.

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ حائضہ عورت کے لیے کچھ پابندیاں ضروری ہیں لیکن وہ نجس نہیں ہوتی کہ میل ملاپ یا سلام وکلام نہ کرے۔ ہمارے رجحان کے مطابق ایام والی عورت درج ذیل کام کرسکتی ہے:

☆ وہ اپنے بچے کو دودھ پلا سکتی ہے۔

☆ وہ مجالس ذکر میں شریک ہوسکتی ہے۔

☆ وہ گھر کا کھانا وغیرہ تیار کرسکتی ہے۔ نیز وہ میت کو غسل بھی دے سکتی ہے۔ شریعت میں اس کے متعلق کوئی پابندی نہیں۔

واللہ اعلم

مہندی لگے سر پر مسح

] میں نے وضو کرنے کے بعد سر پر مہندی لگائی، پھر نماز ادا کی، جب وضو دوبارہ کرنا ہوگا تو کیا مہندی پر مسح کافی ہو گا یا مہندی اتار کر بال دھو کر مسح کرنا ہوگا، اس کے متعلق قرآن وحدیث میں کیا ہدایات ہیں؟ نیز بتائیں کہ سر کے مسح میں مرد اور عورت دونوں کے لیے ایک ہی حکم ہے؟

[رسول اللہ e جب سفر حج پر روانہ ہوئے تو اپنے بالوں کو زیادہ پراگندہ ہونے یا بہت زیادہ گردوغبار وغیرہ سے بچانے کے لیے کسی مناسب چیز سے انہیں چپکا لیتے تھے۔ اس عمل کو عربی میں تلبید کہا جاتا ہے۔ اس عمل کے لیے آپ ایک خاص قسم کی گوند استعمال کرتے تھے، آپ یہ کام احرام کے وقت ہی کر لیتے تھے، پھر وضو کرتے وقت اس پر مسح کر لیتے اور انہیں صاف نہیں کرتے تھے۔ سر پر مہندی لگانے کو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مہندی لگے سر پر مسح کرنا ہو تو دھونے کی ضرورت نہیں بلکہ اسی پر مسح کیا جاسکتا ہے۔ البتہ غسل کرنے کے لیے اس قسم کا مسح کافی نہیں بلکہ اسے اتار کر سر پر پانی ڈالنا ضروری ہے۔

جیسا کہ سیدہ ام سلمہ r نے ایک مرتبہ رسول اللہ e سے عرض کیا تھا یا رسول اللہ! میں اپنے سر کے بالوں کو کس کر باندھتی ہوں، کیا غسل جنابت کے لیے انہیں کھولنا ہوگا؟

رسول اللہ e نے فرمایا: ''سر کو کھولنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہی کافی ہے کہ سر پر تین لپ پانی ڈال لیا جائے پھر تمام جسم پر پانی بہا لیا جائے۔'' 1

بہرحال دوران وضو مسح کرتے وقت مہندی اتارنے کی ضرورت نہیں، مہندی لگے سر پر مسح کیا جاسکتا ہے۔ واضح رہے کہ وضو میں سر کے مسح کا حکم عورت کے لیے وہی ہے جو مرد کے لیے ہے۔

کیوں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ﴾ 2 ''تم اپنے سروں کا مسح کرو۔''

اس حکم میں مرد اور عورتیں برابر ہیں، عورت بھی اپنے پورے سر کا مسح کرے گی، اسے سر کے ایک حصے پر مسح کرنا کافی نہیں ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن زید t نے مسح کے متعلق بتایا ہے:

! مسلم، الطہارۃ: ۳۳۰۔ @ المائدہ: ۶۔

’’پھر آپ e نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کا مسح کیا، دونوں ہاتھوں کو سر کے آگے اور پیچھے لے گئے، پیشانی سے شروع کیا یہاں تک کہ انہیں گدی تک لے گئے پھر اسی جگہ پر واپس لائے جہاں سے شروع کیا تھا۔‘‘ 1

عورت کے لیے موضع سر کے علاوہ لٹکتے ہوئے بالوں یعنی چوٹیوں کا مسح کرنا ضروری نہیں بلکہ وہ صرف اپنے سر کے اوپر مسح کرے گی جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں بیان ہوا ہے، اس میں کانوں کا اندرونی اور بیرونی حصہ بھی شامل ہے۔ واللہ اعلم!

خون سے غسل کرنا

] میری والدہ بیمار ہے، وہ کئی ہسپتالوں میں زیر علاج رہی مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا، ہمیں ایک ’’بزرگ‘‘ نے بتایا ہے کہ اسے کسی جانور کے خون میں غسل دیا جائے، کیا ہم بغرض علاج ایسا کر سکتے ہیں؟

[خون سے غسل کرنا جائز نہیں، کیوں کہ ذبح کرتے وقت جو خون نکلتا ہے، اللہ نے اسے حرام قرار دیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ﴾ 2

’’تم پر مردار اور خون حرام کر دیا گیا ہے۔‘‘

دوسرے مقام پر یہ صراحت ہے کہ اس سے مراد ذبح کرتے وقت بہنے والا خون ہے، جیسا کہ سورۃ الانعام آیت نمبر ۱۴۵ میں ہے اور حرام چیزوں سے علاج کرنا ناجائز ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’اللہ تعالیٰ نے بیماری اور علاج دونوں کو نازل کیا ہے اور ہر بیماری کا علاج بھی طے کیا ہے لہٰذا علاج کیا کرو، لیکن حرام چیزوں سے علاج نہ کرو۔‘‘ 3

ایک دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں: اللہ تعالیٰ نے حرام کردہ چیزوں میں قطعاً شفا نہیں رکھی۔ 4

رسول اللہ e سے شراب سے علاج کرنے کے متعلق دریافت ہوا تو آپ نے فرمایا:

یہ دوا نہیں بلکہ یہ تو بذات خود بیماری ہے۔ 5

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال نہیں کرنا چاہیے اور جس ’’بزرگ‘‘ نے یہ علاج تجویز کیا ہے اسے بھی اللہ عزوجل کے حضور توبہ کرنی چاہیے کیوں کہ یہ علاج جادو کی قسم معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

دوران حمل آنے والا خون

] میں امید سے ہوں، لیکن حسب عادت خون آ رہا ہے، اس خون کے متعلق شرعی ضابطہ کیا ہے؟ کیا یہ نماز روزہ کے

! بخاری، الوضوء:۱۸۵۔ @ المائدہ:۳۔
ابو داؤد، الطب:۳۸۷۴۔ $ الاحادیث الصحیحہ:۱۶۳۳۔
% ابو داؤد، الطب:۳۸۷۳۔

لیے رکاوٹ بنے گا یانہیں؟ اس سلسلہ میں میری رہنمائی کتاب وسنت کی روشنی میں کریں۔

[اہل علم کہتے ہیں، کہ خون حیض کو اللہ تعالیٰ نے شکم مادر میں پرورش پانے والے بچے کی غذا کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حمل قرار پاتا ہے تو خون حیض بند ہو جاتا ہے۔

امام احمد a فرماتے ہیں کہ عورتیں انقطاع حیض سے حمل معلوم کر لیتی ہیں، لیکن کچھ ایسی عورتیں ہوتی ہیں کہ انہیں دوران حمل حسب عادت خون حیض آتا رہتا ہے اور اس سے حمل متاثر نہیں ہوتا۔ اسے خون حیض ہی قرار دیا جائے اور یہ ان تمام امور کے لیے مانع ہوگا جن سے غیر حاملہ عورت کا حیض مانع ہوتا ہے۔ یعنی وہ نماز روزہ کی ادائیگی کے لیے رکاوٹ کا باعث ہو گا۔ لیکن اگر کسی حاملہ کو حادثہ کی وجہ سے خون جاری ہو تو اسے خون حیض شمار نہیں کیا جائے گا۔ اہل علم نے حاملہ کے لیے آنے والے خون کی دو اقسام بیان کی ہیں:

☆ وہ خون حسب عادت جاری رہے جس طرح حمل سے پہلے تھا گویا حمل اس پر اثر انداز نہیں ہوا، اسے خون حیض میں شمار کیا جائے گا۔

☆ وہ خون جو حاملہ کو اچانک جاری ہو جائے، اس کا سبب کوئی حادثہ، پریشانی یا بھاری چیز اٹھانے یا کسی چیز سے گر جانے کی بناء پر ہو تو اسے خون حیض شمار نہیں کیا جائے گا، بلکہ یہ کسی رگ کا خون ہے اور یہ نماز روزہ کی ادائیگی سے مانع نہیں۔

صورت مسئولہ میں عورت دوران حمل جاری ہونے والے خون کے متعلق ہماری بتائی ہوئی تفصیل کی روشنی میں خود فیصلہ کرے کہ وہ کون سا خون ہے۔ واللہ اعلم!

ایام میں کمی وبیشی

] مجھے عام طور پر چھ دن ایام آتے ہیں، لیکن بعض اوقات ان ایام کی کمی وبیشی ہو جاتی ہے۔ ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اس سلسلہ میں کتاب وسنت کے مطابق میری رہنمائی کریں۔

[خون حیض کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى﴾ 1

''تم سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ ان سے کہہ دیں کہ یہ تو نجاست ہے۔''

حیض آنے کے دوران نماز، روزہ کی ادائیگی منع ہے۔ رسول اللہ e نے خون حیض کے متعلق کوئی حد مقرر نہیں کی۔ البتہ اس کی شناخت کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ رنگ یا بو سے پہچانا جاتا ہے۔ اس بناء پر جب تک خون حیض آئے گا نماز روزہ کے لیے رکاوٹ ہوگا۔ جب وہ اس سے پاک ہو جائے تو غسل کر کے نماز روزہ کا اہتمام کرے۔ لہٰذا اگر کسی عورت کی عادت چھ دنوں کی ہے، پھر کسی وقت اس مدت میں اضافہ ہو جائے یا کمی آ جائے تو وہ دوران حیض پاک ہونے تک نماز روزہ ادا نہ کرے۔ اس

! البقرہ:۲۲۲.

سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ جب عورت کا حیض موجود ہوگا تو وہ نماز نہیں پڑھے گی خواہ وہ حیض سابقہ عادت کے مطابق یا اس سے زیادہ ہو یا اس سے کم ہو۔ بہرحال جب وہ پاک ہوگی تب نماز روزے کا اہتمام کرے گی۔ واللہ اعلم!

وضو کرتے وقت صرف بسم اللہ پڑھنا

] جب ہم نماز کے لیے وضوء کرتے ہیں تو آغاز میں بسم اللہ پڑھنا چاہیے یا بسم اللہ الرحمن الرحیم مکمل پڑھنی چاہیے، اس کے متعلق کتاب وسنت میں کیا وارد ہوا ہے؟ وضاحت کریں۔

[رسول اللہ e کی تعلیمات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر کام کا آغاز بسم اللہ سے کرنا چاہیے، اسی طرح وضو کا آغاز بھی اللہ عزوجل کے نام سے کرنا ضروری ہے۔

جیسا کہ حدیث میں ہے: ''جس نے وضو کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا اس کا وضو نہیں ہے۔'' 1

ہمارے نزیک اللہ عزوجل کے نام سے مراد بسم اللہ کہنا ہے، جب کہ سیدنا انس t سے منقول ہے، رسول اللہ e کے صحابہ کرام y نے ایک مرتبہ وضو کا پانی تلاش کیا تو اللہ کے رسول e نے فرمایا:

''کیا تم میں سے کسی کے پاس کچھ پانی ہے؟''

پانی لایا گیا تو آپ e نے اپنا ہاتھ پانی میں رکھ دیا اور فرمایا: ''بسم اللہ پڑھ کر وضو کرو۔'' 2

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو کرتے وقت بسم اللہ کہنا چاہیے۔

چنانچہ علامہ ابن قدامہ a وضو سے پہلے مسئلہ تسمیہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جب یہ ثابت ہوا کہ تسمیہ کا طریقہ یہ ہے کہ بسم اللہ کہا جائے، اس کی جگہ دوسرے الفاظ کافی نہیں ہوں گے۔'' 3

جو حضرات اس کے ساتھ ''الرحمن الرحیم'' کے اضافے کو جائز خیال کرتے ہیں یا اسے مستحب کہتے ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ اس کے جواز یا استحباب پر کتاب وسنت کی کوئی دلیل پیش کریں، بعض روایات میں ہے، کہ رسول اللہ e نے سیدنا ابو ہریرہ t سے فرمایا تھا: ''جب تم وضوء کرو تو بسم اللہ والحمد للہ کہو۔'' 4

اگرچہ علامہ ہیثمی a نے اس کی سند کو حسن کہا ہے لیکن یہ حدیث منکر ہے کیوں کہ اس کی سند میں ابراہیم بن محمد بن ثابت نامی ایک راوی ہے جسے علامہ ذہبی نے منکر روایات بیان کرنے والا لکھا ہے۔ 5 اس لیے بسم اللہ کے ساتھ الحمد للہ کا اضافہ بھی درست نہیں۔ واللہ اعلم!

! ترمذی، الطہارہ:۲۵.

@ نسائی، الطہارہ:۷۸.

مغنی:ج۱،ص۱۰۴.

$ مجمع الزوائد: ج۱،ص۲۲۵.

% میزان: ج۱،ص۵۶.

نماز باجماعت کی فضیلت

] نماز، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں پر ایک اہم فریضہ ہے، لیکن اسے باجماعت ادا کرنے کے متعلق اس کی فضیلت میں اختلاف کیوں ہے؟ کسی حدیث میں پچیس درجے اضافہ کی فضیلت بیان ہوئی ہے اور کسی میں ستائیس درجے ہے اس کی وضاحت کر دیں۔

[اس میں کوئی شک نہیں کہ نماز باجماعت ادا کرنے کی بہت فضیلت ہے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمر w سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''نماز باجماعت اکیلے شخص کی نماز سے ستائیس درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔'' 1

جبکہ سیدنا ابوسعید خدری t سے بیان کردہ حدیث میں ہے کہ جماعت کی نماز اکیلے شخص کی نماز سے پچیس درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔ 2

بظاہر ان احادیث میں درجات کی تعداد کے متعلق تعارض ہے لیکن محدثین کرام نے اس تعارض کو درج ذیل صورتوں میں دور کیا ہے:

z...... امام ترمذی a نے سیدنا ابوسعید خدری t سے مروی حدیث کو راجح قرار دیا ہے جس میں پچیس درجات کا بیان ہے اور سیدنا عبداللہ بن عمر w سے مروی حدیث کو مرجوح کہا ہے جس میں ستائیس درجے بیان ہوئے ہیں اور اس حدیث کو انہوں نے سیدنا ابن عمر w کے منفردات وغرائب میں شمار کیا ہے، لیکن اس توجیہ پر دل مطمئن نہیں کیوں کہ بلاوجہ ایک حدیث کو مہمل قرار دینا محل نظر ہے۔ ایسی توجیہ کی جائے جس میں دونوں احادیث کا مفہوم اپنی اپنی جگہ پر صحیح برقرار رہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق اس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں:

☆ درجات کے اعتبار سے کم تعداد والی روایت کو ابتدائی طور پر محمول کیا جائے اور زیادہ والی کو انتہاء قرار دیا جائے کیوں کہ اللہ کی رحمت سے یہ بعید ہے کہ وہ کوئی چیز دے کر پھر اسے واپس لے لے۔

☆ درجات کا یہ تفاوت نمازیوں کے کم وبیش ہونے پر ہے، اگر نمازی کم ہیں تو پچیس درجے اور اگر زیادہ ہیں تو ستائیس

! بخاری، الاذان: ۶۴۵۔ @ بخاری، الاذان: ۶۴۶۔

درجے زیادہ ثواب ہوگا۔

☆ نماز پڑھنے والوں کے اخلاص، تقویٰ اور خشوع وخضوع میں تفاوت کی وجہ سے ثواب میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے یعنی درجات کا تفاوت، اختلاف احوال پر مبنی ہے۔

☆ ہر نماز میں پچیس اور عصر وفجر میں ستائیس درجے ہوں کیوں کہ ان دونوں نمازوں میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں جیسا کہ احادیث میں اس کی صراحت ہے۔

☆ درجات کا یہ تفاوت، مسجد کے دور اور قریب ہونے پر مبنی ہے کیوں کہ جتنی مسجد دور ہوگی اس میں نماز پڑھنے کے لیے جانا زیادہ فضیلت کا باعث ہے۔

واضح رہے کہ رفع تعارض کی یہ تمام صورتیں حافظ ابن حجر a نے بیان کی ہیں، انہوں نے مزید لکھا ہے کہ سیدنا ابن عمر W سے مروی حدیث میں اضافہ ہے اور ثقہ کی زیادتی قبول ہوتی ہے، لہٰذا ستائیس درجے والی سیدنا ابن عمر W کی روایت کو راجح قرار دیا جائے۔ واللہ اعلم 1

زمانہ دجال میں نمازیں

] ایک حدیث میں ہم نے پڑھا ہے کہ دجال کی آمد کے وقت پہلا دن ایک سال کا ہوگا جب دن ایک سال کا ہوگا تو نمازیں کس حساب سے ادا کی جائیں گی؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[دجال کے متعلق جب رسول اللہ e نے وضاحت فرمائی تو صحابہ کرام y نے دریافت کیا کہ وہ زمین میں کتنی مدت ٹھہرے گا؟ تو رسول اللہ e نے فرمایا: ''وہ چالیس دن ٹھہرے گا، پہلا دن سال کی طرح، دوسرا دن مہینے کی طرح اور تیسرا دن سات دن کے برابر ہوگا'' باقی ایام دیگر ایام کی طرح ہوں گے۔ 2

اس کے بعد صحابہ کرام y نے وہی سوال کیا جو سائل نے کیا ہے، صحابہ کرام y نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کیا وہ دن جو سال کے برابر ہوگا تو کیا اس میں ایک دن نماز پڑھنا کافی ہوگا؟ رسول اللہ e نے فرمایا: نہیں، بلکہ تم، اس کے لیے نمازوں کا اندازہ کر لینا۔'' 3

اس کا مطلب یہ ہے کہ دو نمازوں کے درمیان جو دورانیہ ہے، اس کے مطابق ہم حساب کر کے نمازیں پڑھیں گے چونکہ ہماری نمازوں کے دائمی اوقات چھپے ہوئے ہیں، ہم ان کے حساب سے نمازیں پڑھتے رہیں گے۔ صرف اس دن پانچ نمازیں کافی نہیں ہوں گی۔ واللہ اعلم

! فتح الباری: ۲/ ۱۷۳.

@ مسلم، الفتن: ۷۳۷۳.

مسلم، حوالہ مذکور.

جوتے پہن کر نماز پڑھنا

] ہمارے ہاں کچھ نوجوان جوتے سمیت نماز پڑھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ایسا کرنا مستحب عمل ہے کیوں کہ رسول اللہ e نے فرمایا ہے: ''یہودیوں کی مخالفت کرواور جوتوں میں نماز پڑھو۔'' اس حدیث کی کیا حیثیت اور اس کا کیا مطلب ہے؟

[سیدنا موسیٰ u جب کوہ طور پر گئے تو ادب کے طور پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنِّيٓ أَنَا۠ رَبُّكَ فَٱخۡلَعۡ نَعۡلَيۡكَ إِنَّكَ بِٱلۡوَادِ ٱلۡمُقَدَّسِ طُوٗى ١٢﴾ 1

''بلاشبہ میں تمہارا رب ہوں، یقیناً اس وقت تم وادی مقدس طویٰ میں ہو لہٰذا تم اپنے جوتے اتار لو۔''

یہود نے اس حکم کو مطلق طور پر ممانعت پر محمول کیا۔ جس کی بناء پر ان کے نزدیک کسی بھی صورت میں جوتوں سمیت نماز پڑھنا درست نہیں۔

رسول اللہ e نے یہود کی اس شدت کی اصلاح کرتے ہوئے مطلق جواز کو باقی رکھا اور فرمایا: ''یہود کی مخالفت کرو اور جوتوں میں نماز پڑھو۔'' 2

لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ جوتے پاک ہوں۔ کیوں کہ ناپاکی کی صورت میں انہیں پہن کر نماز پڑھنا درست نہیں۔ امام بخاری a نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: (باب الصلاة فی النعال) ''جوتوں سمیت نماز پڑھنا۔'' 3

پھر انہوں نے اس سلسلہ میں ایک حدیث بیان کی ہے کہ سعید بن یزید ازدی نے ایک دفعہ سیدنا انس t سے سوال کیا کہ کیا رسول اللہ e جوتوں سمیت نماز پڑھ لیتے تھے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں پڑھ لیتے تھے۔ 4

لیکن رسول اللہ e کا یہ عمل دائمی نہیں، جیسا کہ ایک اور حدیث میں صراحت ہے: ''رسول اللہ e جوتے اتار کر نماز پڑھ لیتے تھے اور پہن کر بھی۔'' 5

ہمارے رجحان کے مطابق جوتے پہن کر نماز پڑھنے کی رخصت ضرور ہے لیکن اسے درجہ استحباب دے کر دیدہ و دانستہ صاف ستھری مساجد میں جہاں قالین بچھے ہوں، جوتوں سمیت نماز ادا کرنے پر اصرار انتہا پسندی ہے۔ ہمارے بعض شدت پسند نوجوان اسے مردہ سنت خیال کر کے اس کے احیاء کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس فکری غلطی کی اصلاح بہت ضروری ہے۔ شریعت نے اس عمل کو صرف جائز قرار دیا ہے بذات خود یہ مطلوب نہیں۔ عہد نبوی میں مساجد کی حالت اور اس وقت کے جوتوں کی نوعیت پھر ہمارے دور کی بود و باش اور طرز معاشرت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، پھر اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ

! طٰہٰ: ۱۲.
@ ابوداود، الصلوٰۃ: ۶۵۲.
# بخاری، الصلوۃ، باب ۲۴.
$ بخاری، الصلوٰۃ: ۳۸۶.
% ابوداود، الصلوٰۃ: ۶۵۳.

ہمارا کوئی عمل بے علم عوام کے لیے فتنے کا باعث نہ بنے۔ واللہ اعلم

بے نماز والدین کی خدمت

] میرے والدین بے نماز ہیں، میرے بار بار کہنے کے باوجود وہ نماز نہیں پڑھتے اور مجھے دینی اجتماعات میں جانے سے بھی منع کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں میری کیا ذمہ داری ہے؟ کیا میں والدہ کی تیار کردہ روٹی وغیرہ کھا سکتا ہوں؟ آپ میری اس پریشانی کو دور کریں۔

[اس عالم رنگ و بو میں والدین بہت بڑی نعمت ہیں اور ان کی خدمت گراں قدر سعادت ہے۔ سائل کی پریشانی کا حل یہ ہے کہ وہ نماز پنجگانہ کے بعد اور دیگر اوقات میں بھی اپنے والدین کے لیے دعا کرتا رہے اور ان کی خدمت کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔ قرآن مجید میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق بیان کیے ہیں ساتھ ہی والدین کا حق خدمت بیان کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا١ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۝۲۳ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًاؕ۝۲۴﴾ 1

’’تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک بھی نہ کہو اور نہ ہی انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو، نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کرتے رہا کرو، پروردگار! ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت وشفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔‘‘

ان آیات کا تقاضا ہے کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا چاہیے، اگر وہ دین اسلام پر کاربند نہ بھی ہوں تب بھی ان کی خدمت گزاری میں کسی قسم کی کمی نہ کی جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر اس کی وضاحت کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

’’دنیوی معاملات میں والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرتے رہو۔‘‘ 2

اگرچہ جو شخص مستقل طور پر بے نماز ہے اور کبھی نماز کے قریب نہیں جاتا وہ اسلام سے بالکل بیگانہ ہے اور دین اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں تاہم ایسے والدین سے ترک تعلقات کی شرعاً اجازت نہیں اور نہ ہی ان کا تیار کردہ کھانا حرام ہے، ایسے حالات میں والدہ کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کھانے میں کوئی قباحت نہیں۔ رسول اللہ e نے ایک یہودیہ عورت کا تیار کردہ

! الاسراء: ۲۳، ۲۴.　　@ لقمان: ۱۵.

کھانا تناول فرمایا تھا۔ 1

باقی رہا دینی اجتماعات میں جانے سے روکنے کا مسئلہ تو اس کے متعلق وضاحت یہ ہے کہ دینی امور کی دو اقسام حسب ذیل ہیں:

☆ وہ فرض اور واجب ہیں...... مثلاً نماز پڑھنا اور روزے رکھنا وغیرہ تو ان امور میں اگر والدین رکاوٹ بنتے ہیں اور ان کی ادائیگی سے روکتے ہیں تو ایسے معاملات میں ان کی بات نہ مانی جائے بلکہ اللہ اور اس کے رسول e کی بات کو مقدم سمجھا جائے۔

☆ وہ معاملات فرض یا واجب نہیں بلکہ جائز اور استحباب کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً دینی اجتماعات میں شرکت کرنا تو ایسے معاملات میں ان والدین کی بات کو مانا جائے اور دینی پروگرام سے استفادہ کرنے کا کوئی متبادل راستہ تلاش کیا جائے۔ مثلاً سی ڈی یا کیسٹ وغیرہ سن لی جائے۔

ہمارا سائل کو مشورہ ہے کہ وہ اپنے والدین کی خوب خدمت کریں اور انہیں تنگ کر کے اپنی دنیا و آخرت کی تباہی کا سامان پیدا نہ کریں۔ نیز محبت و پیار سے نماز کی طرف راغب کریں۔ واللہ اعلم

اذان کی فضیلت

] امام بخاری a نے کتاب الاذان میں ایک باب بایں الفاظ قائم کیا ہے: (باب فضل التاذين) یعنی اذان دینے کی فضیلت، پھر جو حدیث پیش کی ہے اس میں ہے کہ شیطان اذان کی آواز سن کر گوز مارتا ہوا بھاگتا ہے۔ اس حدیث سے اذان کی فضیلت کیسے ثابت ہوتی ہے؟

[امام بخاری a کے قائم کردہ عناوین ٹھوس اور خاموش ہوتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بہت مضبوط اور جاندار ہوتے ہیں۔ نیز وہ خاموشی کے ساتھ اپنی معنویت پر دلالت کرتے ہیں۔ اگرچہ تاذین کا لفظ موذن کے قول وفعل اور اس کی ہیئت وغیرہ سب کو شامل ہے لیکن اس مقام پر اس سے مراد اذان کے الفاظ ہیں۔ امام بخاری a نے اذان کی بجائے تاذین کے الفاظ اس لیے استعمال کیے ہیں تاکہ عنوان کی الفاظ سے مطابقت ہو جائے کیوں کہ حدیث میں تاذین کا لفظ آیا ہے۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی بایں الفاظ مروی ہے: ''جب نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر گوز مارتا ہوا بھاگتا ہے تاکہ اذان کی آواز نہ سن سکے۔'' 2

اذان کی فضیلت بایں طور ثابت ہوتی ہے کہ اذان ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی آواز سن کر شیطان بھاگنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اگرچہ اذان کی فضیلت میں متعدد احادیث کتب حدیث میں مروی ہیں لیکن امام بخاری a نے صرف مذکورہ حدیث کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ اذان سے متعلق دیگر فضائل کو متعدد نیک اعمال سے حاصل کیا جا سکتا ہے جبکہ شیطان کے بھاگنے کی خصوصیت صرف اذان سے وابستہ ہے۔

! بخاری، الھبہ: ۷۶۱۷۔ @ بخاری، الاذان: ۶۰۸۔

واضح رہے کہ شیطان سے ہوا کا خارج ہونا بعید از امکان نہیں کیوں کہ اس کا بھی ایک جسم ہے جسے غذا کی ضرورت ہوتی ہے، یہی غذا اس کا سبب بنتی ہے، اس کی مذکورہ حرکت کی کئی ایک وجوہات ہیں جنہیں محدثین نے بایں الفاظ بیان کیا ہے:

☆ وہ اس نازیبا حرکت سے اذان کے ساتھ مذاق کرتا ہے جیسا کہ غیر مہذب لوگوں کا شیوہ ہے۔

☆ وہ دانستہ یہ کام کرتا ہے تا کہ اذان کی آواز اس کے کانوں میں نہ آ سکے کیوں کہ جب قریب شور برپا ہو تو دور کی آواز سنائی نہیں دیتی۔

☆ اذان کی وجہ سے اس پر بوجھ پڑتا ہے، وہ اس دباؤ کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔

جیسے کسی آدمی کو انتہائی پریشان کن اور دہشت ناک معاملہ پیش آ گیا ہو تو ایسے حالات میں خوف کی وجہ سے اس کے جوڑ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور اسے خود پر کنٹرول نہیں رہتا، اس بے بسی کے عالم میں اس کا پیشاب اور ہوا از خود خارج ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ شیطان لعین جب اذان سنتا ہے تو اس کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے یعنی وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ وہ مقام روحاء تک بھاگتا چلا جاتا ہے تا کہ اذان کی آواز نہ سن سکے۔ 1

مقام روحاء، مدینہ طیبہ سے چھتیس میل کے فاصلے پر ہے۔ 2

بہر حال اس حدیث سے اذان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے جیسا کہ وضاحت کر دی گئی ہے۔ واللہ اعلم

دوران جماعت سنت فجر پڑھنا

] ہمارے ہاں عام طور پر جب فجر کی نماز کھڑی ہو جاتی ہے تو کچھ لوگ جلدی جلدی مسجد کے کسی کونے میں فجر کی دو سنت پڑھ کر جماعت میں شامل ہوتے ہیں۔ قرآن و حدیث کے مطابق ایسا کرنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ وضاحت کر دیں۔

[جب فجر کی نماز کھڑی ہو جائے تو نماز باجماعت کے علاوہ ہر قسم کی نماز منع ہے خواہ سنت ہو یا نوافل، راتبہ ہوں یا غیر راتبہ، کیوں کہ حدیث میں ہے: ''جب نماز کی اقامت ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ اور کوئی نماز نہیں ہوتی۔'' 3

امام بخاری a نے اپنی صحیح میں اس مسئلہ کو دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ البتہ کچھ اہل علم نے نماز فجر کی تکبیر کے بعد چند شرائط کے ساتھ فجر کی دو سنت ادا کرنے کی گنجائش پیدا کی ہے۔ چنانچہ متداول درسی بخاری کے حاشیہ پر بیہقی کے حوالے سے ایک حدیث بیان کی گئی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

''جب نماز کی تکبیر ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ دوسری کوئی نماز نہیں ہوتی، ہاں فجر کی دو سنتیں پڑھی جا سکتی ہیں۔'' بلاشبہ یہ حدیث سنن بیہقی میں مروی ہے۔ 4

لیکن امام بیہقی a نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد خود وضاحت کی ہے کہ مذکورہ اضافہ بالکل بے اصل اور بے

! مسلم، المساجد: ۸۵۶۔ @ فتح الباری: ۲/ ۱۱۳۔

مسلم، الصلوٰۃ: ۱۶۴۴۔ $ بیہقی: ۲/ ۴۸۳۔

بنیاد ہے۔ نیز اس کی سند میں حجاج بن نصر اور عباد بن کثیر دو راوی ضعیف ہیں۔

اس کے برعکس امام بیہقی نے سیدنا ابوہریرہ t سے ایک روایت بایں الفاظ بیان کی ہے۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ''جب نماز فجر کی تکبیر ہو جائے تو دوسری کوئی نماز نہیں ہوتی۔'' عرض کیا گیا اللہ کے رسول! ایسے حالات میں فجر کی دو سنت پڑھنا بھی درست نہیں؟

آپ e نے فرمایا: ہاں، تکبیر کے بعد فجر کی دو سنت پڑھنا بھی جائز نہیں۔'' 1

اگرچہ اس کی سند میں مسلم بن خالد نامی ایک راوی متکلم فیہ ہے تاہم امام ابن حبان نے اسے ثقہ قرار دیا ہے اور اپنی صحیح میں اسے قابل حجت کہا ہے۔

حافظ ابن حجر a لکھتے ہیں: ''اس روایت کو ابن عدی نے حسن سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔'' 2

سیدنا عمر t اس شخص کو پیٹتے تھے جو نماز کی تکبیر کے بعد کسی دوسری نماز میں مشغول ہوتا۔ نیز سیدنا ابن عمر w ایسے شخص کو کنکریاں مارتے تھے۔ 3

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبیر ہو جانے کے بعد فجر کی سنتیں ادا کرنا اور فرض نماز میں شمولیت نہ کرنا شرعاً درست نہیں نیز ایسا کرنا طریقہ نبوی کے خلاف ہے۔ تکبیر کے بعد نوافل وغیرہ ترک کر کے جماعت میں شامل ہونا اور اسے فرض نماز کے بعد ادا کرنا ہی اتباع سنت کا عین تقاضا ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص مسجد میں ایسے وقت پہنچے کہ فجر کی نماز کھڑی ہو چکی ہو اور اس نے ابھی تک سنتیں نہ پڑھی ہوں تو اسے چاہیے کہ وہ جماعت میں شامل ہو جائے اور فرض پڑھ کر سنتیں ادا کر لے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ سیدنا قیس بن فہد t نے صبح کے فرض پڑھنے کے بعد دو رکعت (سنت) پڑھی تو رسول اللہ e نے حقیقت حال معلوم ہو جانے کے بعد انہیں کچھ نہ کہا بلکہ سکوت فرمایا۔ 4

ان دو سنتوں کو طلوع آفتاب کے بعد بھی پڑھا جا سکتا ہے، اس کے لیے مسجد میں بیٹھ کر طلوع آفتاب کا انتظار کرنا ضروری نہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے کہ

''جو شخص فجر کی دو سنت نہ پڑھ سکے تو اسے چاہیے کہ وہ طلوع آفتاب کے بعد پڑھے۔'' 5

اگرچہ اس روایت کو اہل علم نے ضعیف کہا ہے تاہم علامہ البانی a نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ 6

اس مقام پر یہ اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ سید نذیر حسین محدث دہلوی a نے صحیح بخاری کے حاشیہ نگار مولانا احمد علی سہارنپوری کے نام اس سلسلہ میں ایک خط بھی لکھا تھا جس کی تفصیل ہم نے شرح بخاری میں لکھی ہے۔ (یسر اللہ طبعہ)

! بیہقی: ۴/ ۴۸۳.
@ فتح الباری: ۲/ ۱۹۴.
# سنن بیہقی: ۲/ ۴۱۸۳.
$ صحیح ابن خزیمہ: ۱۱۱۶.
% ترمذی، الصلوٰۃ: ۴۲۳.
^ سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ: ۲۳۶۱.

واضح رہے کہ اس موضوع پر علامہ شمس الحق عظیم آبادی a نے مستقل ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ''اعلام اہل العصر فی احکام رکعتی الفجر'' ہے۔ واللہ اعلم

سلام پھیرنے کے بعد امام کا وہیں نفل ادا کرنا

] میں ایک مسجد میں امام ہوں، میں نے ایک دن سلام پھیرنے کے بعد وہیں سنتیں ادا کرنا شروع کر دیں، ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ ایسا کرنا درست نہیں، آپ کو جگہ بدل لینی چاہیے تھی۔ اس مسئلہ کی وضاحت کر دیں۔

[امام بخاری a نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: (باب مکث الامام فی مصلاہ بعد السلام) ''سلام پھیرنے کے بعد امام کا اپنی جگہ پر ٹھہرے رہنا۔'' 1

اس عنوان سے امام بخاری a یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ امام سلام پھیرنے کے بعد وہیں نفل وغیرہ پڑھ سکتا ہے اسے جگہ بدلنے کی ضرورت نہیں۔ امام بخاری a نے اس مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے سیدنا عبداللہ بن عمر w کا ایک عمل پیش کیا ہے کہ وہ اسی جگہ پر نفل وغیرہ پڑھتے جہاں انہوں نے فرض نماز ادا کی ہوتی تھی۔ اس روایت کو ابن ابی شیبہ نے متصل سند سے بیان کیا ہے۔ 2

امام بخاری a مزید بیان کرتے ہیں کہ سیدنا ابو ہریرہ t سے مروی وہ روایت صحیح نہیں جس میں رسول اللہ e فرماتے ہیں: ''امام اسی جگہ نفل پڑھے جہاں اس نے فرض نماز ادا کی تھی۔'' امام بخاری a نے اس کی تفصیل اپنی مایہ ناز تصنیف تاریخ الکبیر میں بیان کی ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق جس نماز کے بعد سنن وغیرہ ہیں، اس کے متعلق جمہور اہل علم کا موقف ہے کہ پہلے اذکار مسنونہ پڑھے جائیں پھر نوافل پڑھنے چاہئیں۔ اگر وظائف کی بجائے جگہ بدل لی جائے تو بھی کافی ہے۔ اگر نماز کے بعد سنن وغیرہ نہیں ہیں تو اس صورت میں امام اور مقتدی کو چاہیے کہ وہ خود کو مسنون وظائف میں مصروف رکھیں۔ وظائف کے لیے جگہ بدلنے کی چنداں ضرورت نہیں، وہیں بیٹھے بیٹھے انہیں پورا کر سکتا ہے، وہاں نوافل بھی ادا کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جو ممانعت آئی ہے محدثین کے ہاں اس کی صحت محل نظر ہے۔ جیسا کہ امام بخاری a نے اپنی صحیح میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی ہم نے پہلے وضاحت کر دی ہے۔ واللہ اعلم

دوران نماز انگلیاں چٹخانا

] ہم نے کچھ نمازی دیکھے ہیں جو دوران نماز اپنی انگلیاں چٹخانے میں مصروف رہتے ہیں یا اپنے کپڑے درست کرتے رہتے ہیں، کیا ایسا کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے، قرآن وحدیث کے مطابق اس عمل کا کیا حکم ہے؟

[دوران نماز انگلیاں چٹخانا یا اپنے کپڑے درست کرنا ایک فضول کام ہے، اس سے نماز تو باطل نہیں ہوتی البتہ نماز

! بخاری، الاذان، باب ۱۵۷۔ @ المصنف لابن ابی شیبہ: ۲/ ۲۳۔

کے خشوع اور خضوع میں فرق ضرور آ جاتا ہے اس کے علاوہ نمازی کی یہ حرکت دوسرے نمازیوں کی تشویش کا باعث ضرور بنتی ہے، بہرحال ایسی حرکات انتہائی ناپسندیدہ ہیں جو نماز کے خشوع میں خلل انداز ہوں۔ فقہاء ومحدثین نے دوران نماز حرکات کی پانچ اقسام ذکر کی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

حرکت واجب: اس سے مراد ایسی حرکت ہے جس پر نماز کا کوئی فعل واجب موقوف ہو۔ مثلاً ایک نمازی کو دوران نماز یاد آیا کہ اس نے نجاست آلود جرابیں پہن رکھی ہیں تو اس صورت میں ضروری ہے کہ وہ اپنی جرابیں اتار دے، اس قسم کی حرکت ضروری ہے کیوں کہ نجاست آلود جرابوں میں نماز نہیں ہوتی۔

حرکت مسنون: ایسی حرکت جس پر نماز کا کمال موقوف ہو۔ مثلاً دوران نماز کسی کا وضو ٹوٹ گیا اور وہ وضو بنانے چلا گیا صف میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے پر کرنے کے لیے حرکت کرنا یہ حرکت مسنون ہے کیوں کہ دوران نماز صف میں خلا پر کرنا مسنون عمل ہے۔

حرکت مکروہ: ایسی حرکت جس کی دوران نماز کوئی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی تکمیل نماز کے ساتھ اس کا کوئی تعلق تھا۔ جیسا کہ سوال میں پوچھا گیا ہے کہ دوران نماز اپنی انگلیوں کے پٹاخے نکالنا، ایسی حرکت انتہائی ناپسندیدہ ہے۔

حرام حرکت: جو بہت زیادہ اور مسلسل ہو۔ مثلاً حالت قیام میں نمازی نے ایسی حرکت شروع کی، پھر اسے رکوع اور سجدہ کی حالت میں بھی برقرار رکھا، ایسا معلوم ہو کہ یہ انسان نماز نہیں پڑھ رہا بلکہ کسی دوسرے کام میں مصروف ہے۔ ایسی حرکت حرام ہے۔

حرکت مباح: مذکورہ بالا صورتوں کے علاوہ جو حرکت ہو۔ مثلاً ضرورت پیش آنے پر نمازی کھجلی کرنے لگے، یا آنکھوں کے آگے آنے والے کپڑے کو دور کر دے، کسی موذی چیز کو مارے کہ جس سے نمازی کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو وغیرہ بہرحال نمازی کو چاہیے کہ دوران نماز فضول قسم کی حرکات سے خود کو بچائے رکھے تا کہ اس کی نماز خشوع اور خضوع سے ادا ہو۔ واللہ اعلم

نمازِ عشاء سے پہلے سو جانا

] اگر نماز عشاء نیند کی وجہ سے فوت ہو جائے اور صبح کی نماز کے بعد یاد آئے تو اسے فوراً پڑھ لینا چاہیے یا اسے عشاء کی نماز کے ساتھ پڑھا جائے؟

[رسول اللہ e نے عشاء سے پہلے سونا منع فرمایا ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نماز عشاء سے قبل سونے کو ناپسند کرتے تھے۔ 1

اگر کوئی شخص نماز عشاء سے پہلے سو جاتا ہے اور صبح سے پہلے بیدار نہیں ہوتا تو جب بھی بیدار ہو وہ نماز پڑھ لے۔ اسے اگلی اس جیسی نماز کے وقت تک مؤخر نہیں کرنا چاہیے۔ چاہے وہ کراہت کا وقت ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ حدیث میں ہے رسول

! بخاری، مراتب الصلوٰۃ: ۵۶۸.

اللہ e نے فرمایا:

’’جب تم میں سے کوئی نماز سے (پہلے) سو جائے یا وہ نماز پڑھنا بھول جائے تو وہ اسے یاد آنے پر پڑھ لے۔‘‘ 1

کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ۝۱۴﴾ 2 ’’میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔‘‘

بہرحال اگر کوئی نیند کی وجہ سے بروقت نماز نہ پڑھ سکے تو اسے چاہیے کہ جب بھی بیدار ہو تو اسے ادا کر لینا چاہیے، اسے دوسری نماز تک کے لیے مزید موخر نہ کرے۔ واللہ اعلم

جلسہ استراحت

] جب نماز کی پہلی یا تیسری رکعت مکمل کر کے اٹھتے ہیں تو اطمینان وسکون سے بیٹھ کر اٹھنا چاہیے یا سجدہ کر کے اپنے قدموں کے بل سیدھا کھڑا ہونا چاہیے، کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا صراحت ہے، تفصیل سے اس کے متعلق وضاحت فرمادیں۔

[پہلی اور تیسری رکعت کے آخری سجدہ سے فراغت سے جب اٹھا جاتا ہے تو آرام اور سکون سے بیٹھنے کو جلسہ استراحت کہتے ہیں۔ امام بخاری a نے اس سلسلہ میں ایک عنوان قائم کیا ہے:

’’باب من استوى قاعدًا فى وتر من صلاته ثم نهض‘‘

’’جو شخص اپنی نماز کی طاق رکعات میں سیدھا ہو کر بیٹھے پھر کھڑا ہو۔‘‘ 3

پھر اس عنوان کو ثابت کرنے کے لیے سیدنا مالک بن حویرث t کا ایک مشاہدہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ e کو نماز پڑھتے دیکھا۔ جب آپ طاق رکعت میں ہوتے تو اس وقت تک نہ اٹھتے جب تک سیدھے ہو کر اچھی طرح بیٹھ نہ لیتے۔ 4

طاق رکعت سے مراد پہلی اور تیسری رکعت ہے، ان میں آخری سجدے سے فراغت کے بعد اچھی طرح سیدھے ہو کر بیٹھنے کے بعد رسول اللہ e کھڑے ہوتے تھے۔

اس کی مزید وضاحت درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے:

’’رسول اللہ e اللہ اکبر کہتے ہوئے دوسرے سجدے سے اٹھتے اور اپنا بایاں پاؤں موڑتے ہوئے اسے بچھاتے اور اس پر بیٹھ جاتے پھر دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہوتے۔‘‘ 5

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ e بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے بیٹھتے تھے، پھر زمین کا سہارا لے کر کھڑے ہوتے

! صحیح مسلم، مساجد: ۳۱۶. @ طٰہٰ: ۱۴.

بخاری، الاذان، باب ۱۴۱. $ بخاری، الاذان: ۸۲۳.

% ابوداود، الصلوٰۃ: ۷۳۰.

تھے، ان کے نزدیک جلسہ استراحت سنت نہیں ہے، لیکن ان کی بات قطعی طور پر درست نہیں کیوں کہ احادیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ آپ بڑھاپے یا کمزوری کی وجہ سے ایسا کرتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو صحابہ کرام y اسے ضرور بیان کرتے۔ اس لیے ہمارے رجحان کے مطابق جلسہ استراحت سنت ہے اور اس کی پابندی کرنی چاہیے۔ واللہ اعلم

مرد، عورت کی نماز میں فرق

] ہم نے کئی مرتبہ گھر میں عورتوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے کہ وہ سجدہ کرتے وقت زمین سے چپک جاتی ہیں، اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ مرد اور عورت کی نماز میں فرق ہے۔ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[واضح رہے کہ نماز کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ ایک حصہ نماز کی ہیئت اور اس کے ادا کرنے کے طریقے پر مشتمل ہے، جو تکبیر تحریمہ سے سلام پھیرنے تک ہے، اسے ہم اصل نماز سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں مرد اور عورت کی نماز میں کوئی فرق نہیں۔

اس کے متعلق رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

"تم نماز اسی طرح پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔" 1

اس حدیث کے مطابق مرد، عورت دونوں کا نماز میں قیام، رکوع، قومہ، سجدہ، جلسہ استراحت، قعدہ وغیرہ سب برابر ہے۔ رسول اللہ e نے نماز کی ادائیگی کے لیے مرد اور عورت میں کسی قسم کے فرق کی کوئی نشاندہی نہیں کی۔ یہ فرق اپنی طرف سے ہے کہ عورتیں سجدہ کرتے وقت زمین سے چپک جائیں اور مرد حضرات ایسا نہ کریں اور عورتیں نماز میں سینے پر ہاتھ باندھیں اور مرد زیر ناف باندھیں، کتاب وسنت میں اس کا کوئی فرق بیان نہیں ہوا ہے بلکہ امام ابوحنیفہ a کے استاد امام ابراہیم نخعی a کا فتویٰ صحیح سند کے ساتھ بایں الفاظ مروی ہے:

"نماز میں عورت بھی بالکل ایسے ہی بیٹھے گی جس طرح مرد بیٹھتا ہے۔" 2

☆ دوسرا حصہ نماز سے متعلقہ چیزوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً لباس، پردہ، جماعت اور امامت وغیرہ اس میں مرد اور عورت کے دائرہ عمل میں کچھ فرق حسب ذیل ہے:

☆ عورت کے لیے سر سے پاؤں تک کپڑے کا ہونا ضروری ہے جبکہ مرد کے لیے ناف سے گھٹنوں تک کا حصہ ڈھانپنا، نیز اس کے کندھوں پر کپڑا ہونا بھی ضروری ہے۔

☆ مرد امام صف کے آگے نکل کر کھڑا ہوتا ہے جبکہ عورت امام صف کے اندر ہی کھڑی ہوگی اور وہ صرف عورتوں کی ہی جماعت کروائے گی۔

☆ امام کے بھولنے پر مرد حضرات سبحان اللہ کہیں گے جب کہ عورت تالی بجا کر امام کو مطلع کرے گی۔

! بخاری، الاذان: ۲۳۱۔ @ مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث: ۲۷۸۸۔

☆ دوران جماعت مردوں کی پہلی صف کو بہتر قرار دیا گیا ہے جبکہ عورتوں کی آخری صف بہتر ہے۔

یہ فرق نماز سے متعلقہ مسائل میں ہے، نماز کی ادائیگی سے متعلق نہیں۔ اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ نماز کی ہیئت میں فرق کرنا خود ساختہ ہے، کتاب وسنت سے اس کی کوئی دلیل نہیں۔ واللہ اعلم

اذان عصر کا وقت

] وزارت مذہبی امور پاکستان ایک قانون کے ذریعے اسلام آباد کی تمام مساجد میں اذان کے لیے ایک نظام الاوقات نافذ کرنا چاہتی ہے، جس کی رو سے اذان عصر سایہ دو مثل ہونے پر دی جائے گی۔ کیا شرعی طور پر اس کی گنجائش ہے؟ آپ بتائیں کہ اذان عصر کا صحیح وقت کیا ہے؟

[امام نووی a نے نماز عصر کے پانچ اوقات بیان کیے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

فضیلت کا وقت: اس کا اول وقت جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو جائے۔

اختیاری وقت: جب ہر چیز کا سایہ دو مثل ہو جائے۔ یعنی اس کا سایہ دو گنا ہو جائے۔

وقت جواز: سورج کی دھوپ زرد ہونے تک ہے۔

وقت مکروہ: دھوپ زرد ہونے سے غروب آفتاب تک ہے۔

وقت عذر: وہ ظہر کا وقت ہے جب سفر وغیرہ کے لیے نماز عصر کو ظہر کے ساتھ جمع تقدیم سے پڑھا جاتا ہے۔ 1

ہمارے رجحان کے مطابق نماز عصر کا اول وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب آدمی کا سایہ اس کے برابر ہو جائے۔ چنانچہ بشیر بن سلام کہتے ہیں کہ میں اور محمد بن علی باقر، حجاج بن یوسف کے دور حکومت میں سیدنا جابر t کے پاس گئے اور ان سے رسول اللہ e کی نماز کے متعلق سوال کیا کہ وہ کن اوقات میں ادا کرتے تھے تو آپ t نے نماز عصر کے بارے میں فرمایا:

''رسول اللہ e نے نماز عصر اس وقت پڑھی جبکہ سایہ آدمی کے قد اور تسمہ کے برابر تھا۔ پھر اگلے دن نماز عصر اس وقت پڑھی جب آدمی کا سایہ دگنا ہو گیا اور اتنا وقت باقی تھا کہ ایک اونٹ سوار درمیانی تیز چال سے ذوالحلیفہ پہنچ سکتا تھا۔'' 2

سیدنا جبریل u کی امامت والی حدیث میں صراحت ہے کہ پہلے دن انہوں نے نماز عصر اس وقت پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو گیا اور دوسرے دن نماز عصر اس وقت پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ دو مثل یعنی دو گنا ہو گیا۔ آخر میں فرمایا:

''یہ آپ سے پہلے انبیاء کا وقت ہے اور نمازوں کا وقت انہی دو اوقات کے درمیان ہے۔'' 3

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز ان عبادات میں سے ہے کہ سیدنا جبریل u نے محض زبانی القاء کرنے کی بجائے

! شرح نووی: ۳/ ۱۲۴. @ نسائی، المواقیت: ۵۲۵.
ابوداود، الصلوٰۃ: ۳۹۳.

عملی تربیت سے آپ کوتمام جزئیات سے آگاہ فرمایا۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز عصر کا وقت ایک مثل کے بعد شروع ہوتا اور دومثل تک ختم ہو جاتا ہے۔ نیز اس حدیث سے نماز عصر کے اول وقت اور آخری وقت کی تحدید بھی ہو جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں اوقات میں ادا کی گئی نماز صحیح ہے اور اس طرح دونوں اوقات کا درمیانی وقت نماز کا وقت ہے۔ یوں ہرنماز کے لیے تین اوقات کا اثبات ہوالیکن ان میں افضل وقت کونسا ہے؟ وہ دوسری احادیث سے پتہ چلتا ہے ہاں عشاء کی نماز کوتاخیر سے پڑھنا افضل ہے۔

رسول اللہ e کا اپنا معمول بھی یہی تھا کہ آپ نماز کو اول وقت میں ادا فرماتے تھے۔اس بناء پر نماز عصر کا اول وقت ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہونے پر ہے لیکن نئے نظام الاوقات میں نماز عصر سایہ دومثل ہونے تک ادا کی جائے گی۔ایسا کرنا احادیث کے خلاف ہے۔ہم اہل حدیث حضرات کورواداری کے نام پر مداہنت کا شکارنہیں ہونا چاہیے۔

حافظ ابن حجر a لکھتے ہیں:''کسی اہل علم سے اس میں مخالفت منقول نہیں (نماز عصر کا وقت ایک مثل ہونے پر ہے) سوائے امام ابوحنیفہ a کے ان کے مشہور قول کے مطابق عصر کا اول وقت ہر شئے کا سایہ دومثل ہونے پر ہوتا ہے۔'' امام قرطبی a نے کہا ہے کہ

''اس موقف میں سب لوگ ان کے مخالف ہیں یہاں تک کہ ان کے شاگرد بھی یعنی جو ان سے بلاواسطہ اخذ کرنے والے ہیں۔'' 1

امام ابویوسف اور امام محمد ; کے نزدیک بلکہ ایک روایت میں امام ابوحنیفہ a کے نزدیک نماز عصر کا وقت یہ ہے کہ جب ہر چیز کا سایہ اس کے مثل ہو جائے۔ 2 واللہ اعلم

نماز قصر کی علت اور حکمت

] آج کل جب ہم سفر کرتے ہیں تو آرام دہ ذرائع سفر میسر ہونے کی بناء پر ہمیں سفر کا احساس نہیں ہوتا۔سفر انتہائی آرام دہ اور جلدی طے ہو جاتا ہے،کیا ایسے حالات میں بھی نماز قصر کی جاسکتی ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

[قرآن کریم میں نماز قصر کی وجہ سفر کوٹھہرایا گیا ہے۔چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ﴾ 3

''اور جب تم سفر کے لیے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر تم نماز میں اختصار کر دو۔''

احادیث میں مسافت کی تعیین بھی کی گئی ہے جو نماز قصر کا باعث ہے۔

چنانچہ سیدنا انس t کے شاگرد خاص جناب یحییٰ بن یزید نے آپ سے نماز قصر کے لیے مسافت کے متعلق سوال کیا تو

! فتح الباری، تحت حدیث بخاری: ۵۴۶. @ الہدایہ، کتاب الصلوٰۃ، باب المواقیت.
النساء: ۱۰۱.

آپ نے جواب دیا کہ جب رسول اللہ e تین میل یا تین فرسخ کا سفر کرتے تو نماز قصر فرماتے۔'' 1

واضح رہے کہ حدیث میں تین میل کی بجائے تین فرسخ مراد لینا زیادہ قرین قیاس ہے کیوں کہ اس میں تین میل بھی آ جاتے ہیں۔ پھر ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسافت اگر نو میل ہو تو اپنے شہر یا گاؤں کی حد سے نکل کر نماز قصر کی جا سکتی ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ نو میل سے مراد حجازی ہیں، حجازی میل دو ہزار چھ صد پچیس گز کا ہوتا ہے جبکہ ہمارے ہاں برطانوی میل ایک ہزار سات صد ساٹھ گز کا ہے۔ نو میل حجازی کی مقدار موجودہ نظام کے مطابق تقریباً بائیس کلو میٹر بنتی ہے، اس مسافت پر نماز قصر کی جا سکتی ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ مسافر کو تنگی اور مشقت سے محفوظ رکھا جا سکے۔ چونکہ نماز قصر کی علت اور وجہ ایک محدود مسافت ہے جیسا کہ قرآن حکیم نے بیان کیا ہے لہٰذا جب بھی مسافت شرعی موجود ہوگی وہاں نماز قصر کا حکم ہوگا خواہ وہ کتنی ہی پر آرام کیوں نہ ہو۔ اگر مسافت شرعی سے کم سفر ہو وہاں نماز قصر نہیں کی جا سکے گی خواہ وہ کتنی ہی پر مشقت کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ یہاں نماز قصر کی علت موجود نہیں۔

اسے ایک مثال سے آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ شہروں میں بڑے بڑے چوک آتے ہیں وہاں ٹریفک کنٹرول کرنے کے لیے سبز اور سرخ بتیاں ہوتی ہیں، سرخ بتی، گاڑی رک جانے کی علامت ہے، اس کی حکمت یہ ہے کہ گاڑیوں کا ٹکراؤ نہ ہو، اب جہاں سرخ بتی جل رہی ہوگی وہاں گاڑی کا روکنا ضروری ہے۔ اگرچہ وہاں تصادم یا ٹکراؤ کا اندیشہ نہ ہو۔

علت اور حکمت میں یہی فرق ہے، جس مقام پر نماز قصر کی علت، شرعی مسافت ہوگی وہاں نماز قصر پڑھنا ہے، خواہ وہ مسافت کتنی آرام دہ ہو، جیسا کہ ہوائی سفر ہوتا ہے اور جہاں علت قصر یعنی شرعی مسافت نہیں ہوگی جیسا کہ دو تین میل دشوار گزار پہاڑی سفر ہو وہاں نماز قصر نہیں پڑھی جائے گی اگرچہ پر مشقت سفر ہے لیکن شرعی مسافت نہیں۔ واللہ اعلم

اذان مغرب بلا وجہ مؤخر کرنا

] وزارت مذہبی امور پاکستان نے نظام اقامت صلوٰۃ کے متعلق علماء سے رائے لی ہے، علماء نے میٹنگ کرنے کے بعد نماز مغرب کے متعلق یہ فیصلہ دیا ہے کہ غروب آفتاب کے پانچ منٹ بعد اذان دی جائے البتہ رمضان میں افطاری سائرن پر ہوگی، کیا یہ فیصلہ کتاب و سنت کے مطابق ہے؟

[ہماری مساجد میں جو اذان دی جاتی ہے یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ نماز کا وقت ہو چکا ہے، نماز مغرب کی اذان کا وقت غروب آفتاب ہے جیسا کہ متعدد احادیث سے ثابت ہے۔

چنانچہ سیدنا جابر t کا بیان ہے کہ رسول اللہ e ہمیں نماز مغرب اس وقت پڑھاتے جب سورج غروب ہو جاتا۔'' 2

اسی طرح سیدنا سلمہ بن اکوع t فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ e کے ہمراہ نماز مغرب اس وقت پڑھتے جب سورج

! مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۶۹۱۔ @ بخاری، مواقیت الصلوٰۃ: ۵۶۰۔

غروب ہو جاتا۔ 1

سیدنا عمر t نے اپنے دورحکومت میں نمازوں کے لیے جو نظام اوقات جاری کیا تھا اس کے مطابق نماز مغرب کا وقت غروب آفتاب کو قرار دیا گیا۔ 2

ان واضح نصوص کی موجودگی میں نماز مغرب کے لیے اذان کو بلاوجہ پانچ منٹ دیر سے اللہ تعالیٰ کے دین میں مداخلت ہے۔ پھر افطاری کے لیے اذان کی بجائے سائرن کی آواز کو انتخاب بھی سخت محل نظر ہے۔ جبکہ قرون اولیٰ سے لے کر اب تک رمضان المبارک میں افطاری اذان کہنے سے ہوتی آ رہی ہے۔ اب اذان کے بجائے سائرن بجانا، ایک بہتر چیز کی بجائے گھٹیا چیز کا انتخاب کرنا ہے۔ جیسا کہ سیدنا موسیٰ u نے کہا:

﴿اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ﴾ 3

’’کیا تم ایک بہتر چیز کے بجائے گھٹیا درجے کی چیز لینا چاہتے ہو۔‘‘

ہمارے رجحان کے مطابق جب سورج غروب ہو جائے تو نماز مغرب کے لیے اذان دینا ہی مسنون عمل ہے اور اسی طرز پر روزہ افطار کرنا چاہیے۔ اذان کو بلا وجہ مؤخر کرنا اور اس کے بجائے سائرن پر روزے افطار کرنا ہمارے نزدیک درست نہیں۔ واللہ اعلم

عورت کی امامت

] میں کالج میں زیر تعلیم ہوں، ہمیں کالج میں نماز ظہر ادا کرنا پڑتی ہے۔ میں لڑکیوں کی امامت کراتی ہوں، کیا عورت کا امامت کرانا جائز ہے؟ میں نے سنا ہے کہ عورت امامت نہیں کرواسکتی، اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کریں۔

[عورت، عورتوں کی امامت کرواسکتی ہے، لیکن وہ امامت کرواتے وقت آگے بڑھ کر کھڑی نہیں ہوگی بلکہ وہ دوسری عورتوں کے درمیان میں کھڑی ہوگی۔

چنانچہ امام ابوداود a نے اپنی سنن میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ’’باب امامۃ النساء‘‘ ’’عورتوں کی امامت کا مسئلہ۔‘‘ 4

پھر ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے کہ رسول اللہ e سیدہ ام ورقہ r کے ہاں اس کے گھر میں ملاقات کے لیے آیا کرتے تھے، آپ e نے ان کے لیے ایک مؤذن مقرر کر دیا تھا جو ان کے لیے اذان دیتا تھا۔ رسول اللہ e نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اپنے اہل خانہ کی امامت کروایا کرے۔ 5

! بخاری، مواقیت الصلوٰۃ: ۵۶۰۔ @ موطا امام مالک، مواقیت الصلوٰۃ: ۶۰۔
البقرۃ: ۶۱۔ $ ابوداود،الصلوٰۃ: باب ۶۔
% ابوداود، الصلوٰۃ: ۵۹۲۔

ابوداود a کی ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے کافی قرآن یاد کر رکھا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ وہ اپنے گھر کی عورتوں کو نماز باجماعت پڑھایا کرتی تھیں۔ 1

واضح رہے کہ سیدہ ام ورقہ r کا مؤذن ایک بوڑھا شخص تھا جو اذان دے کر چلا جاتا تھا اور سیدہ ام ورقہ r صرف اہل خانہ عورتوں کی جماعت کراتی تھیں۔ ایک حدیث میں وضاحت ہے کہ آپ r فرض نماز کی جماعت کراتی تھیں۔ 2

اسی طرح سیدہ عائشہ اور سیدہ ام سلمہ w کے متعلق بھی احادیث میں آیا ہے کہ وہ عورتوں کی امامت کراتی تھیں۔ 3

نیز سیدہ حجیرہ بنت حصین r بیان کرتی ہیں کہ سیدہ ام سلمہ r نے ہمیں عصر کی نماز پڑھائی تو وہ ہمارے درمیان کھڑی ہوئیں۔ 4

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت جماعت کروا سکتی ہے لیکن اس کے لیے درج ذیل شرائط ہیں:

☆ وہ صرف عورتوں کی جماعت کروائے، مرد حضرات اس کے پیچھے کھڑے نہ ہوں۔

☆ وہ عورتوں کے درمیان پہلی صف میں کھڑی ہو، آگے بڑھ کر جماعت نہ کروائے۔ واللہ اعلم

سجدوں کے درمیان رفع الیدین کی تحقیق

] ایک اشتہار دیکھا ہے کہ دو سجدوں کے درمیان بھی رفع الیدین کرنا چاہیے، اس کے متعلق متعدد احادیث کا حوالہ دیا گیا ہے، ہمارے لیے یہ ایک نئی بات ہے، کیا سجدوں کے درمیان رفع الیدین کرنا ثابت ہے؟

[جن احادیث میں رفع الیدین کا ذکر ہے، وہ نماز میں متعدد مقامات پر کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر w سے مروی درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے:

”رسول اللہ e جب نماز شروع فرماتے، جب رکوع کرتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع الیدین کرتے، لیکن سجدوں میں ایسا نہیں کرتے تھے۔“ 5

اس حدیث میں سیدنا عبداللہ بن عمر w صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ e سجدے میں جاتے یا سجدے سے اٹھتے وقت رفع الیدین نہیں کرتے تھے۔ جن روایات میں سجدہ سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کرنے کا ذکر ہے وہ صحیح نہیں ہیں، جن کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ سیدنا مالک بن حویرث t سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e جب سجدے سے سر اٹھاتے تو رفع الیدین کرتے تھے۔ 6

! دارقطنی: حدیث ۱۰۶۹.

@ صحیح ابن خزیمہ: حدیث ۱۷۶۷.

سنن دارقطنی: حدیث ۱۴۹۲.

$ بیہقی: ۳/ ۱۳۰.

% بخاری: ۷۳۵.

^ نسائی، التطبیق: ۱۰۸۸.

اس روایت میں ایک راوی سعید بن ابی عمرو مدلس ہے اور وہ عن سے بیان کرتا ہے۔ اس کے استاد قتادہ بھی مدلس ہیں، انہوں نے اپنے استاد سے تصریح سماع نہیں کی۔

☆ سیدنا ابو ہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e اپنے کندھوں کے برابر ہاتھ اٹھاتے جب نماز شروع کرتے، جب رکوع کرتے اور جب سجدے میں جاتے۔ 1

اس روایت کو اسماعیل بن عیاش الحمصی نے عبدالرحمن بن ہرمز الاعرج سے روایت کیا ہے اور اسماعیل بن عیاش کی روایت غیر متابعین سے ضعیف ہوتی ہے جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں۔

☆ سیدنا عبداللہ بن عمر w بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e تکبیر تحریمہ کے وقت اور سجدے میں جاتے وقت رفع الیدین کرتے تھے۔ 2

اس روایت کے ضعیف ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ خود ان کی صراحت ہے، رسول اللہ e سجدوں میں رفع الیدین نہیں کرتے تھے، جیسا کہ صحیح بخاری کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔

☆ سیدنا انس t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e رکوع اور سجدے میں رفع الیدین کیا کرتے تھے۔ 3

اس کی سند میں حمید الطویل ایک راوی مدلس ہے جو صیغہ عن سے بیان کرتا ہے۔ اس بناء پر یہ روایت قابل استدلال نہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ایک راوی عبدالوہاب الثقفی ہے جسے عمر کے آخری حصہ میں اختلاط ہو گیا تھا، بہر حال اس قسم کی جملہ روایات ضعیف ہیں۔ جبکہ ان کے مقابلے میں صحیح بخاری کی روایت صحیح ترین ہے جس میں سجدے کے رفع الیدین کی نفی آئی ہے۔ اس صحیح روایت کو چھوڑ کر ضعیف یا کم از کم متنازعہ روایات پر عمل کرنا دانش مندی نہیں ہے۔

اگرچہ ہمارے ہاں کچھ اہل علم نے سیدنا مالک بن حویرث t سے مروی روایت کی سند کو جید کہا ہے اور کبھی کبھار اس پر عمل کرنے کو جائز قرار دیا ہے تاکہ دونوں قسم کی احادیث پر عمل ہو جائے لیکن ہمارے رجحان کے مطابق یہ روایت بھی قابل حجت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مسبوق کے لیے امام کی اقتداء

] ایک امام ظہر کی نماز پڑھا رہا ہے، اس نے تیسری رکعت میں سلام پھیر دیا، یاد دلانے پر اس نے رکعت مکمل کی اور سجدہ سہو کر لیا، اب جو نمازی دوسری یا تیسری رکعت میں ملے ہیں وہ کیا امام کے ساتھ رکعت پڑھیں گے؟ یا اپنی الگ نماز مکمل کریں گے؟ کیوں کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ کھڑے ہو گئے اور اپنی فوت شدہ رکعات شروع کر چکے ہیں۔ رہنمائی فرمائیں۔

! مسند امام احمد۔ @ مجمع الزوائد: ۲/ ۱۰۲۔

مسند ابی یعلی: ۶/ ۳۰۹۹۔

[سوال میں بیان کردہ صورت حال کے پیش نظر جو نمازی بعد میں شامل ہوئے ہیں اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ اپنی فوت شدہ نماز مکمل کرنے کے لیے کھڑے ہو چکے ہیں ان کے لیے دونوں صورتیں جائز ہیں، یعنی وہ اپنی نماز علیحدہ طور پر بھی مکمل کر سکتے ہیں اور دوبارہ امام کی اقتداء میں واپس آ سکتے ہیں۔

ان دونوں صورتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ اس کی اقتداء سے آزاد ہو چکے ہیں، لہٰذا وہ اپنی انفرادی نماز کی نیت سے اپنے طور پر اپنی نماز مکمل کر لیں۔ شریعت میں اس امر کی دلیل موجود ہے کہ اگر مقتدی کسی شرعی عذر کی وجہ سے امام سے الگ ہو کر اپنی نماز مکمل کر لیتا ہے تو اس کی گنجائش ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ سیدنا معاذ بن جبل t رسول اللہ e کے ہمراہ عشاء کی نماز پڑھتے پھر فراغت کے بعد واپس آ کر اپنی قوم کی امامت کراتے اور لمبی لمبی سورتوں کی قراءت کرتے۔ ایک دیہاتی نے اس صورت حال سے تنگ آ کر سیدنا معاذ t کی اقتداء کو ختم کر کے اپنی الگ نماز پڑھ لی۔ جب معاملہ رسول اللہ e کے پاس آیا تو آپ e نے سیدنا معاذ t کو سخت سست کہا لیکن اس دیہاتی سے کچھ نہیں فرمایا۔'' 1

اس حدیث کی بناء پر مسبوق حضرات جب امام کے سلام پھیرنے کی وجہ سے آزاد ہو چکے ہیں تو انہیں اپنی انفرادی طور پر نماز مکمل کر لینے کی اجازت ہے اور شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔

☆ ان کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ وہ دوبارہ امام کی اقتداء میں واپس آ جائیں اور امام کی اقتداء میں اسے مکمل کر لیں۔ چنانچہ محدث العصر شیخ ابن عثیمین a نے اس کی صراحت کی ہے کہ وہ امام کی اقتداء کی نیت کر سکتا ہے اور شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔ 2

جس طرح دوسرے لوگ امام کے سلام پھیرنے کے بعد آزاد ہو گئے تھے اور وہ پھر امام کی اقتداء میں واپس آ گئے اسی طرح مسبوق حضرات بھی واپسی کی نیت کر سکتے ہیں۔ واللہ اعلم

باجماعت نماز چھوڑنے کا عذر

] شریعت میں کوئی ایسا عذر بھی ہے جو تندرست آدمی کے لیے نماز باجماعت چھوڑنے کا باعث ہو؟ کچھ حضرات اس معاملہ میں بہت سختی کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ نماز باجماعت ہی ہوتی ہے، اکیلے نماز پڑھے تو نماز نہیں ہوتی۔

[نماز باجماعت فرض ہے، بلاوجہ اسے ترک نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ نابینا شخص رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے گزارش کی کہ مجھے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے کیوں کہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر لانے والا کوئی نہیں جو مجھے مسجد میں نماز کے لیے لائے۔ رسول اللہ e نے اسے اجازت دے دی، جب

! بخاری، الاذان: ۷۰۵. @ شرح ممتع: ۲/ ۳۱۴.

وہ واپس جانے کے لیے مڑا تو آپ e نے فرمایا:

''تم اذان سنتے ہو؟''

اس نے عرض کیا، جی ہاں۔

آپ e نے فرمایا:

''پھر نماز کے لیے ضرور مسجد ہی آؤ۔'' 1

شریعت میں دو عذر نمایاں طور پر بیان ہوتے ہیں جن کے پیش نظر جماعت کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

☆ کھانے کی شدید حاجت اور کھانا سامنے آجائے۔

چنانچہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''جب رات کا کھانا پک کر سامنے آجائے اور جماعت کھڑی ہو تو پہلے کھانے سے فراغت حاصل کرو۔'' 2

☆ قضاء حاجت محسوس ہو تو نماز سے پہلے فارغ ہو لینا چاہیے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

''جب تم میں سے کوئی قضاء حاجت کی ضرورت محسوس کرے تو اسے چاہیے کہ نماز سے پہلے قضاء حاجت کرے۔'' 3

گھر میں ایک کمرہ کو نماز کے لیے مخصوص کرنا

] بعض اوقات گھر کے ایک کمرہ کو نماز کے لیے مخصوص کر لیا جاتا ہے، اسی طرح اپنی زرعی زمین میں کوئی خطہ نماز کے لیے مقرر کر دیا جاتا ہے، کیا ایسی مساجد کے وہی احکام ہیں جو شرعی مساجد کے ہوتے ہیں؟ وضاحت فرما دیں۔

[مساجد تین طرح کی ہوتی ہیں، رسول اللہ e کے فرمان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تمام روئے زمین کو مسجد قرار دیا ہے۔ مسافر آدمی کو جس مقام پر نماز پڑھنے کی فرصت ملے وہیں نماز پڑھ لے۔ اس طرح کی مساجد عام مساجد کے حکم میں نہیں ہیں۔ دوسری مساجد وہ ہیں جو گھر کے کسی کونے میں یا کسی کمرہ میں نماز پڑھی جاتی ہے اور اسے نماز کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا عتبان بن مالک t نے گھر کے ایک حصہ کو مسجد قرار دے دیا تھا۔ پھر رسول اللہ e سے گزارش کی کہ آپ وہاں نماز پڑھیں تاکہ ہم وہاں آئندہ نماز پڑھا کریں۔ 4

اس طرح کی مساجد کے لیے عام مساجد کے احکام نہیں ہوتے۔ تیسری وہ مساجد ہیں جو فی سبیل اللہ وقف ہوتی ہیں اور وہاں اذان اور جماعت کا اہتمام ہوتا ہے۔ ایسی مساجد کے لیے شرعی مساجد کے احکام نافذ ہوں گے۔ سوال میں مذکور گھر کی مسجد کے لیے شرعی مساجد کے احکام نہیں ہیں۔ کیوں کہ تمام مساجد کسی کی ملکیت نہیں ہوتیں اور نہ ہی ان کی خرید و فروخت کی جا سکتی ہے۔ ان میں وراثت بھی جاری نہیں ہوتی، بحالت جنابت و حیض ایسی مساجد میں آمد و رفت بھی منع ہے جبکہ گھر کی یا

! مسلم، المساجد: ۶۵۳. @ مسلم، المساجد: ۵۵۷.

نسائی، الامامۃ: ۸۵۳. $ بخاری، الصلوٰۃ: ۴۳۵۵.

زرعی زمین کی مسجد صاحب خانہ اور صاحب زمین کی ملکیت ہوتی ہے۔ اس کی خرید وفروخت بھی کی جا سکتی ہے۔ گھر اور زمین کی مساجد کی خرید وفروخت بھی جائز ہے، انہیں میراث میں تقسیم بھی کیا جا سکتا ہے اور حیض و جنابت کی حالت میں وہاں آنا جانا بھی جائز ہے۔

واضح رہے کہ اگر گھر کی مسجد میں نماز باجماعت پڑھی جائے تو وہاں صرف جماعت کا ثواب حاصل ہوگا، شرعی مسجد کی جماعت کا ثواب نہیں ملے گا۔ مذکورہ عتبان بن مالک t سے روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ معذور انسان کے لیے اس طرح کی گھریلو مساجد میں فرائض کی ادائیگی درست ہے۔ اگر وہ جماعت کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے گھر میں کوئی جگہ مقرر کر لیتے ہیں جہاں معذوری کی حالت میں نماز باجماعت کا اہتمام ہو تو انہیں جماعت کا ثواب مل جائے گا اور ان پر شرعی مسجد سے غیر حاضر ہونے کا الزام عائد نہیں ہوگا۔ بہر حال معذور حضرات، بچے اور خواتین گھر کے کسی کمرے کو نماز کے لیے مخصوص کر لیتے ہیں تو اس کمرے پر شرعی مسجد کے احکام لاگو نہیں ہوں گے۔

مسجد نبوی میں نماز کا ثواب

] مسجد نبوی میں نماز پڑھنے سے کتنی نمازوں کا ثواب ملتا ہے؟ بعض روایات میں پچاس ہزار نمازوں کا ذکر ہے، اس قسم کی روایات کی کیا حیثیت ہے؟

[رسول اللہ e کی مسجد میں نماز پڑھنا ایک ہزار نماز پڑھنے کے برابر ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''میری اس مسجد میں پڑھی گئی ایک نماز کا ثواب دیگر مساجد میں پڑھی گئی ایک ہزار نماز سے افضل ہے، سوائے مسجد حرام کے۔'' 1

''مسجد حرام میں نماز پڑھنا ایک لاکھ نماز سے بھی زیادہ فضیلت رکھتا ہے جیسا کہ دیگر احادیث میں اس کی صراحت ہے۔'' 2

جس حدیث میں پچاس ہزار نمازوں کے برابر ثواب بتایا گیا ہے۔ یہ روایت سند کے اعتبار سے صحیح نہیں۔ کیوں کہ اس روایت میں ایک راوی ابو الخطاب دمشقی ہے جس کے حالات کا علم نہیں۔ حافظ ابن حجر a نے تقریب میں اسے مجہول قرار دیا ہے اور امام ذہبی a نے اس حدیث کو ''منکر جدا'' کہا ہے۔ 3

بیٹھ کر نماز پڑھنا

] ایک حادثہ میں میری ٹانگ ٹوٹ گئی، اس پر پلستر چڑھا دیا گیا ہے، اس بناء پر میں کھڑا نہیں ہو سکتا، اب میرے لیے نماز کے متعلق کیا حکم ہے؟

! بخاری، الصلوٰۃ: ۱۱۹۰۔ @ ابن ماجہ، اقامۃ الصلوٰۃ: ۱۱۴۰۶۔
میزان الاعتدال: ۴/ ۵۲۰۔

] قیام پر قدرت کی صورت میں فرض نماز کھڑے ہو کر پڑھنا ضروری ہے، تندرست آدمی کے لیے بیٹھ کر نماز پڑھنا بہتر نہیں۔ ہاں اگر کوئی بیماری کی وجہ سے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر نہیں تو اسے بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔

جیسا کہ سیدنا عمران بن حصین t سے روایت ہے وہ بواسیر کے مریض تھے، رسول اللہ e نے انہیں فرمایا تھا:

''کھڑے ہو کر نماز پڑھو، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھ لو اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر پڑھ لو۔ 1

اگر کوئی استطاعت کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو اسے نصف اجر ملے گا، جیسا کہ ایک دوسری روایت میں اس کی صراحت ہے، رسول اللہ e نے فرمایا:

''اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو یہ افضل ہے اور اگر کوئی بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو اسے کھڑے ہو کر پڑھنے کے مقابلہ میں نصف اجر دیا جائے گا۔'' 2

صورت مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص کسی لاٹھی یا دیوار کے سہارے کھڑا ہو سکتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے اور اگر کھڑے ہونے کی استطاعت نہیں یا ٹانگ کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے تو بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے اور امید ہے کہ اللہ کے ہاں اسے پورا اجر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

نمازی جماعت کے لیے کب کھڑے ہوں؟

] ہماری مسجد میں اگر امام ذرا دیر سے آئے تو نمازی اس کے انتظار میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور مجھے یہ منظر اچھا نہیں لگتا، ہم دوسرے کاموں کے لیے تسلی سے انتظار کرتے ہیں جبکہ جماعت کے لیے بیٹھ کر امام کا انتظار کرنے کی بجائے فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں، اس کے متعلق شرعاً کیا ہدایات ہیں؟

[سوال میں ذکر کردہ صورت حال واقعی بہت معیوب ہے، مجھے خود اس سے واسطہ پڑتا ہے، اگر جماعت کے وقت سے ایک آدھا منٹ لیٹ ہو جاؤں تو کچھ حضرات کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھتے ہیں، واقعی اس سے امام کو بہت تکلیف ہوتی ہے کہ نمازی، تسلی کے ساتھ امام کی آمد کا انتظار کیوں نہیں کرتے۔

بہر حال رسول اللہ e نے لوگوں کو یہ تاکید فرمائی تھی: ''جب تک مجھے حجرے سے نکلتا ہوا نہ دیکھ لو، اس وقت تک کھڑے نہ ہوا کرو۔'' 3

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کے آنے سے پہلے نمازیوں کو کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ ایک دوسری حدیث میں کچھ تفصیل ہے، سیدنا جابر بن سمرہ t بیان کرتے ہیں: ''سیدنا بلال t، اقامت شروع نہیں کرتے تھے تا آنکہ وہ رسول اللہ e کو حجرہ سے نکلتا ہوا نہ دیکھ لیتے، جب آپ e نکلتے تو سیدنا بلال t آپ کو دیکھ لیتے، پھر اقامت کہتے تھے۔'' 4

! صحیح بخاری، تقصیر الصلوٰۃ: ۱۱۱۷۔ @ بخاری، تقصیر الصلوٰۃ: ۱۱۱۵۔

بخاری، الاذان: ۶۴۷۔ $ مسلم، المساجد: ۶۰۶۔

ان احادیث کا تقاضا ہے کہ اقامت، امام کے خروج پر ہونی چاہیے، امام کے خروج کا مطلب یہ ہے کہ

☆ اگر وہ مسجد سے باہر ہے تو وہ صفوں میں آجائے۔

☆ اگر صف میں بیٹھا ہے تو مصلے کی طرف چلنے لگے۔

جب اس طرح خروج امام ہو جائے تو اقامت کہنا شروع کر دی جائے، جب اقامت کہی جائے تو نمازی کھڑے ہو جائیں اور صف بندی کریں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نمازی اس وقت کھڑے ہوں جب امام آجائے یا مصلے کی طرف چلنے لگے۔ اگر اتفاق سے لیٹ ہو جائے تو اس کا انتظار کرنا چاہیے، کیوں کہ جو وقت نماز کے انتظار میں گزرتا ہے وہ نماز ہی میں شمار ہوتا ہے۔ امام کو بھی چاہیے کہ وہ وقت کی پابندی کرے اور حتی الامکان تاخیر سے اجتناب کرے۔ مقتدی حضرات کو بھی درگزر سے کام لینا چاہیے اور اقامت کے حساب سے کھڑا ہونا چاہیے۔

اذان کا جواب

] اذان کا جواب کس طرح دیا جائے؟ آیا جس طرح مؤذن کہتا ہے، انہی کلمات کو دہرا دیا جائے یا کچھ کلمات کے جواب میں متبادل الفاظ کہے جائیں؟ وضاحت فرمائیں۔

[اذان کا جواب دینے کے متعلق مختلف روایات ہیں، بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اذان کے جواب میں بعینہٖ مؤذن کے کلمات دہرا دیے جائیں۔ جیسا کہ سیدنا ابوسعید خدری t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جب تم اذان سنو تو وہی کلمات کہو جو مؤذن کہتا ہے۔'' 1

جبکہ دوسری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ''حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح'' کے موقع پر ''لا حول ولا قوۃ الا باللہ'' پڑھا جائے جیسا کہ سیدنا امیر معاویہ t سے روایت ہے کہ انہوں نے اذان میں ''حی علی الصلوٰۃ'' کے موقع پر ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ'' پڑھا اور فرمایا کہ میں نے تمہارے نبی کو اس طرح کہتے سنا ہے۔'' 2

ان مختلف روایات کے پیش نظر اذان کے جواب کے متعلق تین صورتیں ممکن ہیں:

☆ بعینہٖ وہی الفاظ دہرا دیے جائیں جو مؤذن کہتا ہے۔

☆ ''حی علی الصلوٰۃ'' اور ''حی علی الفلاح'' پر ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ'' پڑھا جائے اور باقی کلمات موذن کی طرح کہے جائیں۔

☆ ''حی علی الصلوٰۃ'' اور ''حی علی الفلاح'' بھی پڑھا جائے اور ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ'' بھی کہا جائے۔

! بخاری، الاذان: ٦١١۔ @ بخاری، الاذان: ٦١٣۔

جمہور علماء امت نے دوسری صورت کو اختیار کیا ہے کہ ''حی علی الصلوٰۃ''اور ''حی علی الفلاح'' پر ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ'' پڑھا جائے اور باقی کلمات مؤذن کی طرح کہے جائیں۔صحیح بخاری میں موجود بیان سے بھی اسی موقف کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے سیدنا ابوسعید خدری t سے مروی حدیث کو بیان کیا ہے جس میں اجمال ہے، پھراس کے بعد سیدنا امیر معاویہ t سے مروی حدیث لائے ہیں جس میں تفصیل ہے تاکہ اس کے ذریعے پہلی روایت کے اجمال کوکھولا جائے۔ چنانچہ سیدنا عمر بن الخطاب t سےمروی ایک حدیث میں پوری تفصیل موجود ہے۔ 1

ہمارے رجحان کے مطابق ''حی علی الصلوٰۃ'' اور ''حی علی الفلاح'' کے موقع پر ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ'' پڑھا جائے اور باقی کلمات مؤذن کی اذان کے مطابق کہے جائیں۔اس میں حکمت یہ ہے کہ نماز ہی کا کہا جا رہا ہے کہ''اس دنیا میں رہتے ہوئے اپنی ظاہری اور باطنی توجہ کے ساتھ راہ راست یعنی نماز کی طرف چلے آؤاور قیامت کے دن کی نعمتوں کے حصول کی کامیابی کی طرف آ ؤ۔تو مناسب معلوم ہوا کہ اس کا جواب بایں طور پر دیا جائے کہ کمزور، ناتواں ہونے کی وجہ سے اس کے متعلق اپنے اندر طاقت نہیں پاتا، ہاں! اگر اللہ تعالیٰ مجھے برائی سے بچنے اور نیکی کی طرف آنے کی توفیق دے تو اور بات ہے۔'' 2

اذان کے جوابی کلمات کو اگر صدق دل سے کہا جائے تو ایسا شخص یقیناً جنت میں داخل ہوگا جیسا کہ احادیث میں اس کی صراحت ہے۔واللہ اعلم

نماز باجماعت کی فضیلت

] نماز باجماعت کی فضیلت مختلف احادیث میں مختلف انداز سے بیان ہوئی ہے،بعض میں ستائیس درجے اور کچھ احادیث میں پچیس درجے زیادہ کا بیان ہے۔ آخر احادیث میں اس قسم کا اختلاف کیوں ہوتا ہے؟ پھر نماز باجماعت کی فضیلت کس بنیاد پر ہے؟ قرآن وحدیث میں اس قدر فضیلت اور پھراس فضیلت میں تفاوت کی کیا وجوہات بیان ہوئی ہیں؟

[جس طرح ہماری اس مادی دنیا میں چیزوں کے خواص واثرات میں درجات کا فرق ہوتا ہے،جس کی وجہ سے ان کی قدروقیمت اور افادیت میں بھی فرق ہوجاتا ہے، اسی طرح ہمارے اعمال میں بھی درجات کا تفاوت ہوتا ہے۔ان میں سے ایک نماز باجماعت کی ادائیگی بھی ہے، اس کی فضیلت بایں الفاظ بیان کی گئی ہے:''نماز باجماعت، اکیلے شخص کی نماز سے ستائیس درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔'' 3

اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز باجماعت کی پابندی کرنے والے کوستائیس گنا زیادہ اجر ملتا ہے۔اب صاحب ایمان کا مقام یہ ہونا چاہیے کہ وہ اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لیے اس پر دل وجان سے یقین رکھتے ہوئے ہر وقت کی نماز جماعت ہی سے

! صحیح مسلم، الصلوٰۃ: ۸۵۰. @ فتح الباری: ۲/ ۱۲۳.
بخاری، الاذان: ۶۴۵.

پڑھنے کا اہتمام کرے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بلاوجہ جماعت کے بغیر اکیلے نماز پڑھنا صحیح ہے، بلکہ واجب کی فضیلت دوسرے واجب کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے: ''جماعت کی نماز اکیلے شخص کی نماز سے پچیس درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔'' 1

نماز پڑھنے والوں کے اخلاص، تقویٰ اور خشوع وخضوع کے تفاوت کی وجہ سے ثواب میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ یعنی درجات کا تفاوت، اختلافِ احوال پر مبنی ہے۔ درجات کا یہ تفاوت مسجد کے دور اور قریب ہونے کے اعتبار سے بھی ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ جتنی مسجد دور ہوگی، اس میں نماز پڑھنے کے لیے جانا زیادہ ثواب کا باعث ہے۔ محدثین نے درجات کے تفاوت کی یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ ہر نماز میں پچیس اور فجر وعصر میں ستائیس درجے ہوں گے، کیوں کہ ان دونوں نمازوں میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ یہ تفاوت نمازیوں کے قلیل وکثیر ہونے کے پیش نظر بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی اگر نمازی کم ہیں تو پچیس درجے اور اگر زیادہ تعداد ہے تو ستائیس درجے زیادہ ثواب ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تفاوت سری اور جہری نمازوں کے لحاظ سے ہو یعنی سری نمازوں (ظہر وعصر) میں پچیس درجے اور جہری نمازوں (مغرب، عشاء اور فجر) میں ستائیس درجات کی برتری ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابتدائی طور پر پچیس درجات کا بیان ہوا ہو پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے درجات کا اضافہ کرکے ستائیس درجے کردیا ہو۔ واللہ اعلم

نماز باجماعت میں فضیلت کی وجوہات کیا ہیں؟ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، لیکن یہ بات اپنی جگہ پر حقیقت ہے کہ نماز باجماعت کے اہتمام میں زیادہ مشقت ہوتی ہے، اس لیے اس کی فضیلت بھی زیادہ رکھی گئی ہے۔ محدثین کرام نے بیان کیا ہے کہ نماز باجماعت کی ادائیگی میں ایسی ستائیس فضیلتیں پائی جاتی ہیں جن کی فضیلت کے متعلق الگ الگ احادیث مروی ہیں، ان خصلتوں کی تفصیل یہ ہے:

۱: نماز باجماعت ادا کرنے کی نیت سے اذان کا جواب دینا۔

۲: مسجد میں اول وقت پہنچنے کے لیے جلدی کرنا۔

۳: مسجد کی طرف سکون ووقار سے جانا۔

۴: دعا پڑھتے ہوئے مسجد میں داخل ہونا۔

۵: مسجد میں پہنچ کر تحیۃ المسجد ادا کرنا۔

۶: نماز باجماعت کا انتظار کرنا۔

۷: فرشتوں کا اس کے لیے دعائے رحمت کرنا۔

۸: فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ کر نمازی کے لیے گواہی دینا۔

1 بخاری، الاذان: ۶۴۶.

۹: اقامت کا جواب دینا۔

۱۰: اقامت کے وقت شیطانی وساوس سے محفوظ رہنا کیوں کہ شیطان، اقامت کے وقت بھاگ جاتا ہے۔

۱۱: امام کی تکبیر کا انتظار کرنا۔

۱۲: تکبیر تحریمہ میں شمولیت کرنا۔

۱۳: صفوں کے شگاف بند کرتے ہوئے صف بندی کا اہتمام کرنا۔

۱۴: امام کی تسمیع یعنی ''سمع اللہ لمن حمدہ'' کا جواب دینا۔

۱۵: سہو ونسیان سے محفوظ رہنا۔

۱۶: امام اگر بھول جائے تو اسے ''سبحان اللہ'' کہہ کر آگاہ کرنا۔

۱۷: خشوع وخضوع کی وجہ سے دورانِ نماز آنے والے خیالات سے محفوظ رہنا۔

۱۸: نماز ادا کرتے وقت مطلوبہ شرعی زینت کا اہتمام کرنا۔

۱۹: ملائکہ رحمت کا انہیں ڈھانپ لینا۔

۲۰: ارکان نماز اور بہترین قراءت کی مشق کرنا۔

۲۱: شعائر اسلام کا اظہار کرنا۔

۲۲: عبادت کے وقت جمع ہو کر شیطان کو ذلیل وخوار کرنا۔

۲۳: صفت نفاق سے سلامت رہنا۔

۲۴: امام کے سلام کا جواب دینا۔

۲۵: پانچ وقت نظم جماعت کو برقرار رکھنا۔

۲۶: امام کی قراءت کو توجہ سے سننا۔

۲۷: آمین بالجہر کہنا۔

اذانِ فجر کا وقت

] پچھلے دنوں پشاور کے کچھ اہل علم کی طرف سے یہ بات بہت زور سے کہی گئی کہ پنجاب کے اکثر مقامات پر اذان فجر تقریباً اٹھارہ بیس منٹ پہلے دی جاتی ہے، انہوں نے اس بات کا عملی مشاہدہ کر کے بتایا کہ پنجاب کے بعض علاقوں میں فجر کی اذان قبل از وقت دی جاتی ہے، شرعی طور پر اس کی کیا حیثیت ہے؟

[شریعت میں روزہ کے لیے سحری کی بندش کو اذان فجر سے وابستہ کیا گیا ہے، قرآن کریم میں ہے:

﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ 1

''کھاؤ اور پیو، تا آنکہ فجر کے وقت سفید دھاری کالی دھاری سے واضح طور پر نمایاں ہو جائے۔''

رسول اللہ e کے عہد مبارک میں دو مؤذن تھے۔ سیدنا بلال t سحری کی اذان دیتے اور سیدنا ابن ام مکتوم t فجر کی اذان دیتے تھے۔ حدیث میں اس امر کی وضاحت ہے کہ سیدنا ابن ام مکتوم t نابینا آدمی تھے، وہ اس وقت اذان نہیں دیتے تھے تا آنکہ ان سے کہا جاتا کہ صبح ہوگئی، صبح ہوگئی۔ 2

قرآن کریم کے مطابق سپیدہ سحر کے نمایاں ہونے پر اذان فجر دی جاتی ہے، رسول اللہ e نے اس بات کو ہاتھ کے اشارے سے واضح کیا ہے کہ سپیدہ سحر وہ نہیں جو اس طرح لمبی ہوتی ہے، پھر آپ نے ہاتھ اوپر اٹھا کر بتلایا کہ یہ صبح کاذب ہے، پھر ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے جدا کر کے دائیں بائیں کھینچا کہ یہ صبح صادق ہے۔ 3

ایک روایت میں راوی حدیث زہیر نے اس کی مزید وضاحت فرمائی کہ آپ e نے اپنی شہادت کی انگلیوں کو ایک دوسری کے اوپر رکھا، پھر انہیں دائیں بائیں پھیلا دیا۔ 4

اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرقی افق کے دائیں بائیں دونوں گوشوں میں روشنی پھیل جائے تو صبح ہو جاتی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ e نے اس کی وضاحت ایک دوسرے انداز سے کی کہ فجر کی دو اقسام ہیں:

ایک وہ صبح ہے جو بھیڑیے کی دم کی طرح بالکل سیدھی آسمان میں اوپر چڑھتی معلوم ہوتی ہے، اس میں نماز فجر پڑھنا جائز نہیں ہوتا۔ البتہ یہ سحری تناول کرنے کو حرام نہیں کرتی۔

دوسری وہ جو آسمان کے کناروں میں دائیں بائیں پھیل جاتی ہے، یہ روزے دار کے لیے کھانے کو حرام کر دیتی ہے اور اس میں نماز فجر ادا کرنا جائز اور حلال ہوتا ہے۔ 5

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان فجر کا وقت یہ ہے کہ جب سپیدہ سحر نمایاں ہو کر مشرقی افق کے دائیں بائیں پھیل جائے۔ رسول اللہ e نے پہلے پہلے اذان فجر کے لیے سیدنا بلال t کی ڈیوٹی لگائی تھی۔ چنانچہ ایک صحابیہ انیسہ بنت خبیب r بیان کرتی ہیں کہ ''میرا مکان مدینہ میں سب سے اونچا تھا، سیدنا بلال t میرے مکان کی چھت پر چڑھ جاتے اور طلوع فجر کو دیکھتے رہتے، جب فجر طلوع ہو جاتی تو انگڑائی لیتے اور اذان کہنا شروع کر دیتے۔'' 6

لیکن بعض اوقات سیدنا بلال t غلبہ نیند کی وجہ سے اذان فجر کہہ دیتے، جس کی بعد میں تلافی کرنا پڑتی۔ 7 اس کے بعد رسول اللہ e نے فجر کی اذان کے لیے سیدنا ابن ام مکتوم t کو تعینات فرمایا۔ چونکہ وہ نابینا تھے، اس لیے وہ اس

! البقرة: ١٨٧.

@ بخاری، الاذان: ٦١٧.

بخاری، الطلاق: ٥٢٩٨.

$ بخاری، الاذان: ٦٢١.

% مستدرک حاکم: ١/ ١٩١.

^ بیہقی : ١/ ٤٢٥.

& ابوداؤد : الصلوٰة : ٥٣٢.

وقت اذان دیتے جب انہیں طلوع فجر کے متعلق اطلاع دی جاتی۔ اس ضمن میں ہم دو باتوں کی وضاحت کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔

ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ا: سپیدہ سحر کا نمایاں ہونا اور فجر صادق کا مشرقی افق کے دائیں بائیں پھلاؤ ایسا امر نہیں جس کا منٹوں اور سیکنڈوں سے تعین کیا جا سکے، ہم نے جو اذانِ فجر کا وقت مقرر کیا ہے وہ محض اندازے اور تخمین پر مبنی ہے۔

۲: آج کل شہری آبادی میں صبح کے وقت روشنیاں بہت ہوتی ہیں، صبح کاذب یا صبح صادق کا کوئی مشاہدہ نہیں کرتا۔ ہمارے ہاں محکمہ موسمیات کی طرف سے اذان کے لیے اوقات کا تعین کیا جاتا ہے اور اس کے لیے کیلنڈر شائع کیے جاتے ہیں، ہم نے بھی میاں چنوں اور مضافات کی سہولت کے پیش نظر اوقات نماز کے لیے ایک دائمی کیلنڈر شائع کیا ہے۔

جب ہمارے سامنے یہ سوال آیا تو ہم نے مشاہدہ کے لیے ۱۵ نومبر ۲۰۱۴ء بروز ہفتہ چولستان جانے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ ہفتہ اور اتوار کی درمیانی رات ہم نے چولستان میں بسر کی، ہمارا بہاولپور سے وقت دو منٹ پہلے ہے۔ یعنی اگر ہمارے ہاں صبح صادق پانچ بج کر سولہ منٹ پر ہے تو ضلع بہاولپور میں پانچ بج کر اٹھارہ منٹ پر ہوگی۔ اس رات صبح کا مشاہدہ کرنے کے لیے تقریباً ساڑھے چار بجے اٹھے اور ایک مکان کی چھت پر چڑھ کر مشرقی جانب دیکھتے رہے، پہلے ایک سفید دھاری مشرقی افق پر نمایاں ہوئی جو طول میں آگے کو بڑھنا شروع ہوئی، پھر آدھے پونے گھنٹے بعد نیچے سے روشنیاں نمودار ہوئیں جو دائیں بائیں پھیلنا شروع ہوئیں، جب وہ اچھی طرح پھیل گئیں اور مشرقی افق خوب روشن ہوگیا تو اس وقت ہماری گھڑیوں پر پانچ بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ سوال میں جس مشاہدے کا ذکر ہے وہ ہمارے مشاہدے کے بالکل خلاف ہے۔ ہمارے ہاں جو اوقات نماز شائع شدہ ہیں، وہ ہمارے مشاہدے کے مطابق صحیح ہیں، ممکن ہے پشاور اور مضافات کے لیے سوال میں ذکر کردہ مشاہدہ کارگر ہو لیکن ہمارے پنجاب کے لیے وہ بالکل غلط ہے۔ بہرحال اٹھارہ منٹ پہلے اذان دینے کا مفروضہ ہمارے مشاہدے کے اعتبار سے انتہائی محل نظر ہے۔ واللہ اعلم

عصر کے بعد دو رکعت پڑھنا

] رسول اللہ e سے ثابت ہے کہ آپ عصر کے بعد دو رکعت نفل پڑھتے تھے، حالانکہ خود آپ نے عصر کے بعد نفل پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ ہمارے ہاں کچھ اہل علم ان دو رکعات کی بہت فضیلت بیان کرتے ہیں، جب عصر کے بعد نوافل کی ادائیگی منع ہے تو ان دو نفلوں کی فضیلت چہ معنی دارد؟

[اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ e عصر کے بعد دو رکعت پڑھا کرتے تھے، ان دو رکعات کی ابتداء سیدہ ام سلمہ r کے گھر سے ہوئی جبکہ وفد عبدالقیس کی آمد کی وجہ سے ظہر کے بعد کی دو رکعت نہ پڑھ سکے تو آپ نے انہیں عصر کے

بعد ادا کیا۔ 1 پھر ان کی ادائیگی پر دوام فرمایا، جیسا کہ سیدہ عائشہ r سے مروی ایک روایت میں معلوم ہوتا ہے۔ 2
سیدہ عائشہ r کا ہی بیان ہے کہ رسول اللہ e انہیں میرے گھر میں عصر کے بعد ادا کرتے تھے لیکن آپ دوسروں کو اس سے منع فرماتے تھے۔ 3 دراصل رسول اللہ e کے افعال کی دو اقسام حسب ذیل ہیں:

ا: وہ افعال جنہیں آپ نے بطور نمونہ اور اسوۂ ادا فرمایا ہے، وہ افعال شریعت کا حصہ ہیں اور امت کے لیے ایسے افعال کی پیروی کرنا ضروری ہے۔

۲: وہ افعال جو رسول اللہ e کی خصوصیت پر محمول ہیں، وہ امت کے لیے اسوۂ یا نمونہ نہیں ہیں۔

عصر کے بعد دو رکعت پڑھنا اور پھر اس پر دوام کرنا رسول اللہ e کی خصوصیت ہے جیسا کہ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے لیکن سیدنا عبداللہ بن زبیر w عصر کے بعد دو رکعت پڑھا کرتے تھے اور وہ اس مسئلہ میں سیدہ عائشہ r کا حوالہ دیتے تھے کہ جب بھی رسول اللہ e آپ کے گھر آتے تو آپ انہیں ضرور پڑھتے تھے۔ 4 رسول اللہ e اسے برسرِ عام نہیں پڑھتے تھے بلکہ انہیں سیدہ عائشہ r کے گھر میں ادا کرتے تھے مبادا لوگ انہیں سنت خیال کر کے پڑھنا شروع کر دیں۔ سیدہ عائشہ r کے متعلق آپ کو یقین تھا کہ لوگوں کو منع کرنے کے باوجود مجھے پابندی سے یہ دو رکعات پڑھتے دیکھ کر اسے خصوصیت پر محمول کریں گی لیکن سیدہ عائشہ r پر ذہین وفطین ہونے کے باوجود یہ بات مخفی رہی اور انہوں نے رسول اللہ e کے اس عمل کو سنت خیال کیا اور منع کرنے کے مختلف اسباب بیان فرمائے۔ ایک تو یہ کہ لوگ خواہ مخواہ مشقت میں مبتلا نہ ہوں کیوں کہ رسول اللہ e لوگوں پر تخفیف کو پسند کرتے تھے۔ 5 واضح رہے کہ سیدنا عمر t عصر کے بعد دو رکعت پڑھنے والوں کو مارا کرتے تھے۔ 6

بہرحال ہمارے رجحان کے مطابق عصر کے بعد دو رکعت پڑھنا رسول اللہ e کا خاصہ ہے، امت کے لیے یہ کوئی مسنون عمل نہیں۔ جیسا کہ بعض اہل علم کی طرف سے یہ تاثر دیا جا رہا ہے اور ان کی ادائیگی پر جو فضیلت بیان کی جاتی ہے وہ انتہائی محل نظر ہے۔ واللہ اعلم

نماز میں مخصوص سورتوں کی تلاوت

] ہمارے امام مسجد جمعہ کے دن نماز فجر میں لمبی لمبی سورتوں کو پڑھتے ہیں، جس سے نمازی بہت تنگ آ جاتے ہیں، کیا جمعہ کے دن نماز فجر میں کوئی خاص سورت پڑھنے کے متعلق کوئی حدیث آئی ہے؟ وضاحت کر دیں۔

[جمعہ کے دن نماز فجر میں سورۂ السجدہ اور سورۃ الدھر پڑھنے کا ذکر احادیث میں ملتا ہے۔

! بخاری، السہو: ۱۲۳۳.   @ مسلم، الصلوٰۃ: ۱۹۳۴.
ابوداود، التطوع: ۱۲۸۰. $ بخاری، الحج: ۱۶۳۱.
% بخاری، مواقفت الصلوٰۃ: ۹۲۰.   ^ بخاری، السہو: ۱۲۳۳.

چنانچہ سیدنا ابوہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e جمعہ کے دن نماز فجر کی پہلی رکعت میں سورۂ السجدہ اور دوسری رکعت میں سورۂ الدھر پڑھتے تھے۔ 1

سیدنا عبداللہ بن مسعود t سے مروی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ e ہمیشہ ایسا کیا کرتے تھے۔ 2

ان سورتوں کے التزام کی یہ علت معلوم ہوتی ہے کہ ان سورتوں میں تخلیق آدم، قیامت کے دن بندوں کا میدان محشر میں جمع ہونا مذکور ہے اور احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ قیامت بھی جمعہ کے دن قائم ہوگی، غالباً اسی مناسبت کے پیش نظر رسول اللہ e جمعہ کے دن ان سورتوں کے پڑھنے کا التزام کرتے تھے۔ ہمارے نزدیک جمعہ کے دن نماز فجر میں ان سورتوں کا بالالتزام پڑھنا ایک مسنون عمل ہے۔ جن سورتوں کو رسول اللہ e نے کسی نماز میں ہمیشہ پڑھا ہو ہمارے لیے انتقال امر اور تعمیل حکم کی بناء پر ان سورتوں کو انہی نمازوں میں پڑھنا افضل اور مسنون ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کوئی دوسری سورت نہیں پڑھی جاسکتی مگر اتباع سنت کا تقاضا ہے کہ انہی سورتوں کو پڑھا جائے جو رسول اللہ e نے پڑھیں۔ الحمدللہ! آج اہل حدیث اس کی پابندی کرتے ہیں اور اس عمل کو اپنے لیے باعث سعادت خیال کرتے ہیں۔ اگر بوڑھے ضعیف اس کی استطاعت نہیں رکھتے تو وہ بیٹھ کر نماز ادا کرلیں لیکن امام کو چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھنے پر مجبور نہ کریں۔ آخر رسول اللہ e کے عہد مبارک میں بھی بوڑھے لوگ موجود تھے، کسی نے بھی رسول اللہ e سے عرض نہیں کیا کہ ہم کمزور ہیں اور تھک جاتے ہیں اس لیے آپ چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھ لیا کریں۔ بہرحال رسول اللہ e کی سنت پر عمل کرنا بہت بڑی سعادت ہے، ہمیں بھی خوشی سے اس سعادت کو حاصل کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم

نماز میں صف بندی

] آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ جب نماز باجماعت ہوتی ہے تو صف بندی کا اہتمام نہیں کیا جاتا، امام صاحب بھی اس طرف توجہ نہیں دیتے اور نہ ہی مقتدی حضرات اس کا خیال رکھتے ہیں، براہ کرم صف بندی کی اہمیت کو واضح فرمادیں۔

[دوران نماز صف بندی، نماز کے اہم مسائل میں سے ہے، جس کے ساتھ ہماری اجتماعی زندگی کی بہت سی اقدار وابستہ ہیں، لیکن ہم اس اہم فریضہ سے غفلت کا شکار ہیں۔ امام حضرات کا فرض ہے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے مقتدیوں کی صف بندی کا اچھی طرح جائزہ لیں اور ان کی درستگی کے لیے تمام امکانی وسائل استعمال کریں۔ صف بندی سے مراد یہ ہے کہ

☆ ترتیب وار پہلی صفوں کو مکمل کیا جائے، جب تک پہلی صف مکمل نہ ہو دوسری صف میں کھڑا ہونا درست نہیں۔

☆ صفوں کے درمیان جو فاصلہ یا شگاف ہو اسے اچھی طرح پر کیا جائے، پاؤں سے پاؤں اور کندھے سے کندھا ملا ہونا چاہیے۔

☆ دوران نماز اس طرح کھڑے ہونا چاہیے کہ کسی فرد کا سینہ یا جسم کا کوئی حصہ اس کے پہلو میں کھڑے دوسرے نمازی سے آگے بڑھا ہوا نہ ہو۔

! بخاری، الجمعہ: ۸۹۱. @ مجمع الزوائد: ۲/ ۱۶۸.

حافظ ابن حجر a لکھتے ہیں: ''تسویۃ الصفوف'' سے مراد صف میں نمازیوں کا ایک ہی سمت میں برابر کھڑا ہونا اور جو فاصلہ ہو اسے ختم کرنا ہے۔'' 1

اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''اپنی صفوں کو بالکل برابر اور سیدھا کرو، بصورت دیگر اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کو بدل دے گا۔'' 2

ایک روایت میں ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں اختلاف ڈال دے گا۔'' 3

رسول اللہ e نے اس کی اہمیت بایں الفاظ بیان کی ہے:

''بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے ان نمازیوں پر رحمت بھیجتے ہیں جو صفوں کو ملاتے ہیں۔'' 4

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''جو شخص صفوں کو ملائے گا اللہ تعالیٰ بھی اسے اپنی رحمت سے ملائے گا اور جو شخص صف کو کاٹے گا اللہ تعالیٰ بھی اسے اپنی رحمت سے کاٹ دے گا۔'' 5

صف بندی کی اہمیت کا درج ذیل امور سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے:

☆ رسول اللہ e نے صف بندی کو اقامت صلوٰۃ قرار دیا ہے۔

چنانچہ آپ e کا ارشاد گرامی ہے:

''اپنی صفوں کو برابر کرو، کیوں کہ صفوں کا برابر کرنا اقامت نماز سے ہے۔'' 6

☆ صف بندی مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دوستی رکھنے اور باہمی صلہ رحمی کا عظیم سبب ہے، کیوں کہ اگر صف بندی کا اہتمام نہ ہو تو ایسا عمل باہمی نفرت اور اختلافات کی عکاسی کرتا ہے جیسا کہ پہلے ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ ''تم اپنی صفوں کو بالکل برابر کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کو بدل دے گا۔''

☆ نماز میں صف بندی ہمیں سابقہ امتوں سے ممتاز کرتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''ہمیں انسانوں پر تین اعتبار سے فضیلت دی گئی ہے، ایک یہ ہے کہ ہماری صفوں کو فرشتوں کی صف بندی کی مانند قرار دیا گیا ہے۔'' 7

☆ صف بندی، دوران نماز شیطان کی مداخلت کو ختم کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

! فتح الباری: ٢/ ٢٦٨.   @ بخاری، الاذان: ٧١٧.

ابوداود، الصلوٰۃ: ٦٦٢. $ مسند احمد: ٦/ ٦٧.

% ابوداود، الصلوٰۃ: ٦٦٦.   ^ بخاری، الاذان: ٧٢٣.

& مسند امام احمد: ٥/ ٤٨٤.

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’اپنی صفوں کو درست کرو، اللہ کی قسم! میں شیطان کو دیکھتا ہوں کہ وہ شگافوں سے صف میں گھس آتا ہے۔‘‘ 1

ان احادیث کا تقاضا ہے کہ ہم دوران نماز صف بندی کا اہتمام کریں اور اس کے متعلق غفلت سے کام نہ لیں۔ واللہ اعلم

اقامت کے بعد نوافل پڑھنا

] ایک نمازی، سنتیں یا نوافل پڑھ رہا ہے، اس دوران فرض نماز کی اقامت ہو جاتی ہے تو کیا نماز نفل توڑ کر امام کے ساتھ شامل ہو جانا چاہیے یا وہ اپنی نماز مکمل کر کے نماز باجماعت میں شریک ہو؟ وضاحت کریں۔

[اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ نماز باجماعت کھڑی ہو جاتی ہے، اس کے باوجود کچھ نمازی سنتیں پڑھتے رہتے ہیں، ایسا کرنا شرعاً درست نہیں۔ کیوں کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’جب فرض نماز کے لیے اقامت کہہ دی جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی دوسری نماز نہیں ہوتی۔‘‘ 2

اگر چہ کچھ اہل علم بایں طور نرم گوشہ رکھتے ہیں کہ اگر نمازی نے ایک رکعت پڑھ لی ہے، اس دوران اقامت ہو جاتی ہے تو اسے چاہیے کہ وہ خفیف انداز میں اپنی دوسری رکعت ادا کر کے امام کے ساتھ شامل ہو جائے اور اگر وہ پہلی رکعت میں ہے تو اسے نماز توڑ کر جماعت میں شامل ہو جانا چاہیے۔

ہمارے رجحان کے مطابق یہ موقف محل نظر ہے، کیوں کہ درج بالا حدیث کی اس سے خلاف ورزی ہوتی ہے، لہٰذا اس حدیث کے مطابق نمازی انسان کو چاہیے کہ وہ فرض نماز کو اہمیت دے اور وہ اپنی نفل نماز توڑ کر جماعت میں شامل ہو جائے۔ البتہ آخری تشہد اور سجدہ میں اقامت ہو جائے تو ایسی حالت میں جماعت کے ساتھ کوئی رکعت فوت ہونے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس صورت میں نفل نماز پوری کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ بہرحال نمازی کو چاہیے کہ وہ فرض نماز کو اہمیت دے اور فرض نماز کی اقامت ہونے کے بعد نوافل یا سنت کو ختم کر کے فرض نماز میں شمولیت کر لے۔ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ اسے نوافل کے ثواب سے بھی محروم نہیں کرے گا۔ واللہ اعلم

صبح کی سنتوں کے بعد لیٹنا

] صبح کی سنتوں کے بعد دائیں کروٹ لیٹنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا ایسا کرنا ضروری ہے؟ نیز اس دوران میں دعائے نور پڑھی جاتی ہے، کتاب وسنت میں اس دعا کا پڑھنا ثابت ہے؟ تفصیل سے اس مسئلہ کے متعلق وضاحت فرمادیں۔

[صبح کی دوسنت کے بعد لیٹنے کے متعلق ہمارے ہاں افراط وتفریط پایا جاتا ہے، بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ سنتوں کے بعد دائیں کروٹ لیٹنا ضروری ہے اور صحت نماز کے لیے شرط ہے جیسا کہ امام ابن حزم a کا موقف ہے۔ 3 جبکہ امام

! ابوداود، الصلوٰۃ: ۶۶۷. @ مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۷۱۰.

زاد المعاد: ۱/ ۳۱۹.

ابراہیم نخعی a نے اسے شیطان کا لیٹنا قرار دیا ہے جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے۔'' 1

امام بخاری نے اس کی مشروعیت کو بیان کرنے کے لیے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''باب الضجعه علی الشق الایمن بعد رکعتی الفجر''

''صبح کی دوسنت کے بعد دائیں کروٹ لیٹنا۔'' 2

اس عنوان کو ثابت کرنے کے لیے آپ نے سیدہ عائشہ r سے مروی ایک حدیث پیش کی ہے، آپ فرماتی ہیں کہ ''رسول اللہ e جب فجر کی دوسنت پڑھ لیتے تو اپنی دائیں کروٹ لیٹ جاتے۔'' 3

اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا امر بھی وارد ہے۔

سیدنا ابوہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی فجر سے پہلے سنتیں پڑھے تو چاہیے کہ وہ اپنی دائیں جانب لیٹ جائے۔'' 4

اس حدیث سے بعض اہل علم نے اس کے واجب ہونے کا مسئلہ کشید کیا ہے جبکہ امام بخاری a کا موقف ہے کہ مذکورہ امر وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب کے لیے ہے۔ کیوں کہ بعض اوقات رسول اللہ e نے اس پر عمل نہیں کیا، جیسا کہ خود سیدہ عائشہ r فرماتی ہیں:

''رسول اللہ e جب فجر کی دوسنت پڑھ لیتے تو اگر میں بیدار ہوتی تو میرے ساتھ گفتگو کرتے، بصورت دیگر آپ لیٹ جاتے۔'' 5

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فجر کی سنتوں کے بعد لیٹنا ضروری نہیں، بہرحال صبح کی دوسنت پڑھنے کے بعد لیٹنا مشروع ہے اور اسے خلاف سنت یا بدعت قرار دینا صحیح نہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر دوسنتوں کے بعد لیٹنے کے دوران دعائے نور پڑھنے کا رواج ہے، اس کا کسی حدیث میں ذکر نہیں۔ رسول اللہ e سے اس دعا کا پڑھنا ثابت ہے لیکن محل کی تعین کے متعلق حسب ذیل روایات ہیں:

☆ تہجد سے فراغت کے بعد۔ 6

☆ نماز یا سجدہ میں۔ 7

☆ فجر کے لیے مسجد کی طرف جاتے ہوئے۔ 8

! فتح الباری: ۳/ ۵۶.
@ بخاری، التہجد: باب ۲۳.
# بخاری، التہجد: ۱۱۶۰.
$ ابوداود، التطوع: ۱۲۶۱.
% بخاری، التہجد: ۱۱۶۱.
^ الادب المفرد: ۶۹۶.
& مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۱۸۷.
* مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۱۹۱.

بہتر ہے کہ فجر کی سنتوں کے بعد لیٹنے سے پہلے اس دعا کو پڑھ لیا جائے کیوں کہ دل کی نرمی اور اس میں گداز پیدا کرنے کے لیے یہ دعا کیمیا اثر ہے۔ واضح رہے کہ دعا نور سے مراد اَللّٰہُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِی نُوْرًا الی آخرہ ہے۔"

فجر کی سنتوں کے بعد درج ذیل دعا کا پڑھنا رسول اللہ e سے ثابت ہے: "اَللّٰہُمَّ رَبَّ جِبْرِیْلَ وَاِسْرَافِیْلَ وَمِیْکَائِیْلَ وَمُحَمَّدٍ النَّبِیِّ□ اَعُوْذُبِکَ مِنَ النَّارِ" "اے حضرت جبریل، حضرت اسرافیل، حضرت میکائیل اور حضرت محمد e کے رب! میں آگ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔" 1 اسے تین مرتبہ پڑھا جائے۔ واللہ اعلم

نماز کو پڑھائی کی وجہ سے لیٹ کرنا

] میں ایک اکیڈمی میں پڑھتا ہوں، وہاں ظہر کی نماز کا وقت ہو جاتا ہے، ہمارے پاس ہی مسجد ہے، وہاں اذان ہوتی ہے لیکن اکیڈمی والے مسجد میں نہیں جانے دیتے، اس بناء پر نماز میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ کیا ایسے حالات میں نماز کو دیر سے پڑھا جا سکتا ہے؟

[ہمارے معاشرہ میں تعلیم و تربیت کی بہت کمی ہے، اس لیے علماء حضرات کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش میں رہنے والے افراد کی اسلامی خطوط پر تربیت کریں، انہیں اسلامی تعلیمات سے روشناس کروایا جائے اور مقاصد شریعت سے آگاہ کیا جائے۔ سوال میں ذکر کردہ المیہ کئی ایک مقامات پر دیکھنے میں آتا ہے۔ مثلاً

☆ ایک مزدور کہیں تعمیراتی کام میں مزدوری کرتا ہے تو مالک مکان یا ٹھیکیدار اسے نماز کے لیے وقت نہیں دیتا بلکہ ایسے اوقات میں مزدور کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔

☆ ایک ملازم کسی دکان پر ملازمت کرتا ہے تو دکان دار اسے نماز بروقت ادا کرنے کے لیے دس پندرہ منٹ کی رخصت نہیں دیتا کہ اس سے کاروبار متاثر ہوتا ہے۔

☆ ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل حضرات بھی اپنے ماتحت ٹیچروں سے یہی برتاؤ کرتے نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پڑھانا تمہاری ڈیوٹی میں شامل ہے جس کے بدلے تمہیں تنخواہ دی جاتی ہے۔

الغرض بہت سے حضرات کا یہ مسئلہ ہے کہ انہیں بروقت نماز ادا کرنے کے لیے وقت نہیں دیا جاتا، ممکن ہے کہ کچھ مزدور یا ملازمین نماز کی ادائیگی کو اپنی ڈیوٹی سے کوتاہی کے لیے بطور بہانہ استعمال کرتے ہوں تاہم نماز ایک ایسا فریضہ ہے کہ قیامت کے دن حقوق اللہ میں سے سب سے پہلے اس کا حساب لیا جائے گا۔ اگر اس میں ناکامی ہوئی تو آگے حساب نہیں چلے گا۔ اسی کو بنیاد بنا کر فیصلہ کر دیا جائے گا۔ بہر حال نماز کو اس بناء پر مؤخر نہیں کیا جا سکتا کہ اہلکار کو رخصت نہیں ملتی۔

رسول اللہ e نے فرمایا:

"میرے بعد تمہارے کچھ امراء ہوں گے کہ چند چیزیں انہیں بروقت نماز پڑھنے سے غافل کر دیں گی حتیٰ کہ اس

! مستدرک الحاکم: ۳/ ۶۲۲.

کا وقت گزر جائے گا، جب یہ صورت حال ہو تو تم نماز کو بروقت ادا کرو۔'' 1

رسول اللہ e نے سیدنا علی t کو بھی یہ وصیت کی تھی کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو اس میں تاخیر نہ کی جائے۔ 2

بہر حال اگر ماتحت عملے کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی جاتی تو ایسی ملازمت کو ترک کر دیا جائے اور کسی دوسری جگہ ملازمت کر لی جائے۔ اس بناء پر نماز کو لیٹ کرنا جائز نہیں کہ مالک نے اجازت نہیں دی ہے۔ اسی طرح اس اکیڈمی کو بھی خیر باد کہہ دینا ہی بہتر ہے جہاں نماز کی اجازت نہ دی جائے۔ واللہ اعلم

سجدے میں ایڑیاں ملانا

] دورانِ نماز جماعت کی صورت میں اپنے پاؤں دوسرے کے پاؤں کے ساتھ ملائے جاتے ہیں، لیکن سجدہ کرتے وقت پاؤں کی حالت کیا ہونی چاہیے؟ اسے دوسرے کے ساتھ ملایا جائے یا انہیں آپس میں ملایا جائے گا؟ اس سلسلہ میں وضاحت فرمادیں۔

[دوران نماز رکوع اور سجدے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سیدنا حذیفہ t نے ایک آدمی کو دیکھا جو نماز میں رکوع اور سجدہ پوری طرح ادا نہیں کر رہا تھا، تو آپ نے اسے فرمایا:

''تو نے نماز نہیں پڑھی، اگر تیری موت اسی حالت میں آئی تو یہ موت اس فطرت کے خلاف ہوگی جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد e کو پیدا کیا ہے۔'' 3

اس حدیث کی بناء پر نمازی کو چاہیے کہ وہ رکوع اور سجدے اس طریقہ کے مطابق ادا کرے جس طرح رسول اللہ e نے تعلیم دی ہے اور خود کر کے دکھائے ہیں۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''تم اس طرح نماز ادا کرو جس طرح تم مجھے نماز ادا کرتے دیکھتے ہو۔'' 4

سجدہ کرتے وقت نمازی کو چاہیے کہ وہ اپنے پاؤں ملا کر رکھے اور انہیں کھلا نہ رکھے۔ جیسا کہ سیدہ عائشہ r کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ e کو ایک رات بستر سے گم پایا، میں نے دیکھا کہ آپ سجدہ میں پڑے ہیں، آپ کی دونوں ایڑیاں باہم ملی ہوئی ہیں اور پاؤں کی انگلیوں کا رخ قبلہ کی طرف ہے۔ 5 ایک روایت میں ہے کہ میں نے آپ کو اندھیرے میں تلاش کیا تو میرا ہاتھ آپ کے دونوں پاؤں کے تلوؤں کو لگا اور آپ کے دونوں پاؤں کھڑے تھے۔ 6

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو سجدہ کرتے وقت اپنے دونوں پاؤں ملا کر رکھنے چاہئیں، انہیں کھلا نہ چھوڑا جائے، جیسا کہ رسول اللہ e کے پاؤں سجدہ کی حالت میں ملے ہوئے تھے۔ اگر آپ کی ایڑیاں ملی ہوئی نہ ہوتیں تو رسول

! ابوداود، الصلوٰۃ: ۴۳۳۔ @ ترمذی، مواقیت الصلوٰۃ: ۱۷۱۔

بخاری، الاذان: ۷۹۱۔ $ بخاری، الاذان: ۶۳۱۔

% ابن خزیمہ: ۱/ ۳۲۸۔ ^ مسلم، الصلوٰۃ: ۴۸۶۔

اللہ e کے دونوں تلوؤں کو سیدہ عائشہ r کے ہاتھ نہ لگتے۔ امام ابن خزیمہ a نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے "باب ضمّ العقبين فی السجود" "سجدے میں اپنی ایڑیاں ملانا۔" 1

بہر حال نمازی کی حالت میں نمازی کو چاہیے کہ وہ سجدہ کرتے ہوئے اپنی ایڑیاں ملا کر رکھے اور پاؤں کی انگلیوں کا رخ قبلہ کی طرف کرے۔

گیس ہیٹر کے سامنے نماز پڑھنا

] نماز پڑھتے وقت بعض اوقات آگے گیس ہیٹر جل رہا ہوتا ہے، اکثر مساجد میں ایسا ہوتا ہے، کیا آگ کے سامنے نماز پڑھنا جائز ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں؟

[نماز پڑھتے وقت اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہوتی ہے، اگر اس نیت سے نماز پڑھی جائے تو آگے اگر گیس ہیٹر جل رہا ہو تو اس میں چنداں حرج نہیں۔ کیوں کہ نماز کا مقصد آگ کی پوجا کرنا نہیں بلکہ اس کا مقصد صرف اللہ عزوجل کی عبادت کرنا ہے۔ رسول اللہ e کے سامنے بحالت نماز دوزخ کا منظر پیش کیا گیا تھا، جیسا کہ آپ e نے فرمایا ہے:

"نماز کی حالت میں مجھ پر آگ پیش کی گئی اور میں نے اسے اس دیوار پر قبلہ کی جانب دیکھا۔" 2

امام بخاری a نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:

"جو شخص نماز پڑھے اور اس کے سامنے تنور ہو یا آگ یا کوئی بھی چیز جس کی عبادت کی جاتی ہے لیکن نمازی کا ارادہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہے۔" 3

امام بخاری a کا موقف یہ ہے کہ ایسی حالت میں نماز درست ہے، اسے کچھ نقصان نہیں ہوتا۔

صورت مسئولہ میں بھی گیس ہیٹر کے سامنے نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ نمازی کا مقصد آگ کی پوجا کرنا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی رضا جوئی ہے۔ واللہ اعلم

دوران نماز قراءت میں سورتوں کی ترتیب

] نماز میں قراءت کرتے وقت کیا سورتوں کی ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں، کیوں کہ ہمارے ہاں کچھ لوگ اس کے متعلق بہت زور دیتے ہیں۔

[نماز میں قراءت کرتے وقت سورتوں کی ترتیب کا لحاظ رکھنا نہ واجب ہے اور نہ اسے سنت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ e نے ایک دفعہ رات کی نماز میں پہلے سورۃ بقرہ تلاوت کی اس کے بعد سورۃ نساء پھر سورۃ آل عمران پڑھی۔ 4 حالانکہ سورۃ نساء سورۃ آل عمران کے بعد ہے، اسی طرح امام بخاری a نے ایک عنوان بایں طور پر قائم کیا ہے:

! صحیح ابن خزیمہ، الصلوٰۃ: باب ۱۹۱۔ @ بخاری، الاذان: ۷۴۹۔

بخاری، الصلوٰۃ: باب ۵۱۔ $ مسند امام احمد : ۵/ ۳۸۲۔

''دوسورتیں ایک رکعت میں پڑھنا، سورتوں کی آخری آیات یا سورتوں کو تقدیم وتاخیر سے پڑھنا یا سورتوں کی ابتدائی آیات پڑھنے کا بیان۔''

پھر اس مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے چند احادیث وآثار کا حوالہ دیا ہے جو اس مسئلہ کے اثبات کے لیے کافی ہیں، طالب حق کو بخاری کے اس مقام کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

دوران نماز قرآن دیکھ کر قراءت کرنا

] جو آدمی سورۃ فاتحہ یا قرآن کی دیگر آیات زبانی نہ پڑھ سکتا ہو، اسے کیا کرنا چاہیے، کیا وہ قرآن دیکھ کر پڑھ سکتا ہے؟

[جو آدمی سورۃ فاتحہ زبانی نہ پڑھ سکتا ہو اسے چاہیے کہ وہ دوران نماز تسبیح وتہلیل کرتا رہے اور جب تک سورۃ فاتحہ یاد نہ ہو سکے وہ اسی پر اکتفا کرتا رہے۔ رسول اللہ e نے ایک شخص کو نماز سکھائی اور فرمایا کہ اگر تمہیں قرآن کا کچھ حصہ یاد ہے تو اسے نماز میں پڑھو بصورت دیگر الحمد لله ، الله اکبر اور لا الٰه الا الله پڑھتے رہو پھر رکوع میں چلے جاؤ۔ 1

اسی طرح ایک آدمی نے رسول اللہ e سے عرض کیا یا رسول اللہ e! مجھے قرآن میں سے کچھ بھی یاد نہیں لہٰذا اپ مجھے وہ چیز سکھا دیں جو مجھے کافی ہو؟

آپ e نے فرمایا: تم سبحان الله ، الحمد لله ، لا الٰه الا الله والله اکبر اور لاحول ولا قوة الا بالله کہتے رہو۔ 2

لیکن ہمیشہ کے لیے ان کلمات پر اکتفاء کرنا صحیح نہیں۔ ناخواندہ شخص کو چاہیے کہ وہ فاتحہ سیکھنا شروع کر دے جب تک یاد نہ ہو وہ ان کلمات کو دوران نماز پڑھتا رہے، اسی طرح اگر دیکھ کر قرآن پڑھ سکتا ہے تو دوران نماز قرآن دیکھ کر پڑھنا بھی جائز ہے لیکن اس پر دوام اختیار کرنا درست نہیں۔

حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ r کا ایک غلام دیکھ کر قرآن پڑھتا اور امامت کراتا تھا۔ 3

تین وتر پڑھنے کا طریقہ

] تین وتر پڑھنے کا کیا طریقہ ہے؟ قرآن وحدیث میں اس کی ادائیگی کس طرح منقول ہے؟ تفصیل سے وضاحت فرمادیں۔

[تین وتر پڑھنے کے عام طور پر تین طریقے حسب ذیل ہیں:

☆......سیدنا ابن عمر w کے متعلق مروی ہے کہ وہ دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیتے تھے، اس کے بعد وتر (ایک رکعت) پڑھتے۔ 4

ایک مرفوع روایت میں بھی ہے کہ رسول اللہ e دو رکعت الگ پڑھتے اور ایک رکعت جدا ادا کرتے اور کبھی کبھی سلام کی

! بیہقی: ۲/ ۱۰۲.	@ ابوداود، الصلوٰة: ۸۳۲.
# صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب: ۵۴.	$ صحیح بخاری، الوتر: ۹۹۱.

آواز سنا بھی دیتے تھے۔ 1

امام ابن حبان a نے ایک باب بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''رسول اللہ e دو رکعت پڑھ کر سلام پھیرتے اور ایک الگ پڑھتے۔''

☆ تین وتر ایک ہی سلام سے پڑھ لیے جائیں، یہ بھی جائز ہے، اس میں چنداں قباحت نہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e تین وتر پڑھتے اور آخری رکعت کے علاوہ تشہد نہیں بیٹھتے تھے۔ 2

سیدہ عائشہ r سے مروی ایک حدیث سے بھی یہ استنباط کیا گیا ہے جس میں صراحت ہے کہ رسول اللہ e گیارہ رکعت پڑھتے، پہلے چار جو خوبصورت اور طویل ہوتیں، اسی طرح پھر چار رکعت پڑھتے، آخر میں تین رکعت پڑھتے تھے۔ 3

☆ تین اس طرح ادا ہوں کہ دو رکعت پڑھ کر سلام کے بغیر تشہد پڑھیں پھر اٹھ کر ایک رکعت پڑھیں اور دوسرے تشہد سلام پھیر دیں، لیکن یہ طریقہ کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔

اگرچہ بعض اہل علم اور عوام الناس اس طرح تین وتر پڑھتے ہیں، بلکہ اس طرح پڑھنے سے ایک گونہ ممانعت ہے کیوں کہ رسول اللہ e کا ارشاد ہے کہ تین وتر پڑھتے وقت مغرب کی نماز سے مشابہت نہیں ہونی چاہیے۔ 4

مغرب سے مشابہت نہ ہونے کی دو صورتیں ہیں:

۱: اسے دو سلام کے ساتھ پڑھا جائے۔

۲: ایک ہی تشہد کے ساتھ ادا کیے جائیں۔ واللہ اعلم

سجدہ میں جانے کی کیفیت

] سجدہ میں جاتے ہوئے نمازی کو زمین پر پہلے گھٹنے رکھنے چاہئیں یا ہاتھ قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ وضاحت فرمادیں۔

[سجدہ میں جاتے ہوئے زمین پر پہلے ہاتھ رکھے جائیں یا گھٹنے، اس سلسلہ میں دونوں طرح کی احادیث منقول ہیں۔ ایک حدیث میں سیدنا وائل بن حجر t کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ e کو دیکھا، آپ جب سجدہ کرتے تو اپنے گھٹنے اپنے ہاتھوں سے پہلے رکھتے۔ 5

نیز عقلی طور پر جو عضو زمین کے زیادہ قریب ہے وہ پہلے لگنا چاہیے اور جو دور ہے اسے بعد میں زمین پر رکھا جائے، اس لیے نقل وعقل کا تقاضا ہے کہ سجدہ میں جاتے ہوئے ہاتھوں سے پہلے گھٹنے زمین پر رکھیں جائیں۔ ہمارے ہاں اہل کوفہ کا اسی پر

! مسند امام احمد: ۲/ ۷۶۔ @سنن بیہقی: ۳/ ۳۱۔

بخاری، التہجد: ۱۱۴۷۔ $ مستدرک حاکم: ۱/ ۳۰۴۔

% ابوداود، الصلوٰۃ: ۸۳۸۔

عمل ہے جبکہ محدثین کا موقف ہے کہ اس موقع پر گھٹنوں سے پہلے ہاتھ رکھے جائیں۔

جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی آدمی سجدہ کرنے لگے تو اپنے ہاتھ اپنے گھٹنوں سے پہلے زمین پر رکھے اور اونٹ کی طرح نہ بیٹھے۔'' 1

اس روایت میں صراحت ہے کہ سجدہ کرتے وقت ہاتھ پہلے رکھے جائیں، ایسا کرنا فطرت انسانیہ کے عین مطابق ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سہارے کے لیے ہاتھ دیئے ہیں، لیکن جانور اس سے محروم ہیں۔ اس بناء پر وہ سہارے کے بغیر ہی اٹھتے بیٹھتے ہیں بلکہ سب کام ہاتھوں کے بغیر کرتے ہیں کھانا پینا وغیرہ، مگر انسان جب اپنے ہاتھوں کا استعمال نہیں کرے گا تو جانوروں سے مشابہت ہو جائے گی۔

مذکورہ حدیث میں اس کی وضاحت ہے کہ وہ ہاتھوں کا سہارا لیے بغیر بیٹھتے وقت پہلے گھٹنے زمین پر رکھتا ہے، اگر دوران نماز گھٹنے پہلے رکھے جائیں تو ہاتھوں کا سہارا نہ ہونے کی وجہ سے گھٹنے اونٹ کی طرح زمین پر ٹکیں گے، اس کی حدیث میں ممانعت ہے۔ علاوہ ازیں عمر رسید بوڑھوں کے لیے ایسا کرنا مشکل بھی ہے اور انہیں چوٹ لگنے یا گرنے کا خطرہ بھی رہتا ہے، اس بناء پر عقل ونقل کے مطابق پہلے ہاتھ اور بعد میں گھٹنے زمین پر رکھے جائیں۔ واضح رہے کہ اونٹ کے گھٹنے اگلے پاؤں میں ہوتے ہیں اور وہ سیدھا گھٹنوں پر بیٹھتا ہے، اس لیے اس کا حدیث میں خاص ذکر ہے اور اس کی مشابہت سے روکا گیا ہے۔

امام بخاری a نے سیدنا ابن عمر w کا عمل بھی نقل کیا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے رکھتے تھے۔ 2

حافظ ابن حجر a نے بھی اسی عمل کو ترجیح دی ہے، عام محدثین کا یہی عمل ہے۔

البتہ امام ابن قیم a نے اپنی مایہ ناز کتاب زاد المعاد میں اس موقف سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مذکورہ حدیث مقلوب ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ مذکورہ حدیث مقلوب نہیں بلکہ محفوظ ہے۔

البتہ سیدنا وائل بن حجر t سے مروی پہلی حدیث ضعیف ہے کیوں کہ اس میں شریک قاضی مدلس ہے اور اس نے اپنے استاد سے سماع کی صراحت نہیں کی۔ بہر حال صحیح روایات کے مطابق سجدے میں جاتے ہوئے اونٹ کی مشابہت سے بچتے ہوئے پہلے ہاتھ زمین پر رکھنے چاہئیں اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اونٹ بلکہ تمام حیوانات کے گھٹنے ان کی اگلی ٹانگوں میں ہوتے ہیں اور اونٹ جب بیٹھنے کے لیے جھکتا ہے تو پہلے اپنے گھٹنے ہی زمین پر رکھتا ہے، نمازی کو اس مشابہت سے منع کیا گیا ہے۔ لہٰذا وہ پہلے ہاتھ اور بعد میں اپنے گھٹنے زمین پر رکھے۔ واللہ اعلم

نماز کے بعد اللہ اکبر کہنا

] عرب ممالک میں نماز کے اختتام پر بآواز بلند اللہ اکبر نہیں کہا جاتا جبکہ ہمارے ہاں سلام پھیرنے کے بعد

! مسند امام احمد: ۴/ ۳۸۱. @ بخاری، الاذان، باب نمبر ۱۲۸.

لوگ اونچی آواز سے اللہ اکبر کہتے ہیں پھر دیگر اذکار کیے جاتے ہیں، اللہ اکبر اونچی آواز سے کہنے کی کیا دلیل ہے؟

] نماز کے بعد اذکار مسنونہ کے متعلق متعدد روایات کتب حدیث میں مروی ہیں، چنانچہ صحابہ کرام y نماز کے بعد اونچی آواز میں ذکر کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ سیدنا ابن عباس w فرماتے ہیں:

''رسول اللہ e کے عہد مبارک میں جب لوگ فرض نماز سے فارغ ہوتے تو بآواز بلند ذکر ہوتا تھا۔'' 1

اس حدیث کے آخر میں سیدنا ابن عباس w فرماتے ہیں کہ مجھے بآواز بلند ذکر سننے سے معلوم ہو جاتا کہ نماز ختم ہو چکی ہے، آپ اس وقت اپنی خالہ سیدہ میمونہ r کے گھر ہوتے اور صغرسنی کی وجہ سے مسجد میں حاضر نہ ہوتے۔

دوسری روایت میں صراحت ہے کہ اس ذکر سے مراد اللہ اکبر کہنا ہے، چنانچہ وہ خود ہی اس کی مزید وضاحت کرتے ہیں کہ:

''میں رسول اللہ e کی نماز کے اختتام کو ''اللہ اکبر'' کہنے سے معلوم کر لیتا تھا۔'' 2

بہر حال ہمارے برصغیر میں نماز کے اختتام پر نمازی حضرات انفرادی طور پر اونچی آواز سے اللہ اکبر کہتے ہیں، اس مسنون عمل کی دلیل سیدنا ابن عباس w سے مروی مذکورہ حدیث ہے، جس پر امام بخاری a نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:''باب الذكر بعد الصلاة'' ''نماز کے بعد ذکر کرنا۔'' 3

اگرچہ عرب ممالک میں سلام کے بعد اونچی آواز سے اللہ اکبر نہیں کہا جاتا۔ واللہ اعلم

حالت جنابت میں ادا کی گئی نماز

] میں نے صبح کی نماز ادا کی، نماز کے بعد مجھے پتہ چلا کہ مجھے غسل کرنا چاہیے تھا کیوں کہ کپڑوں پر احتلام کے اثرات تھے، ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیے، مجھے نماز دوبارہ پڑھنا ہوگی یا پہلی نماز کافی ہوگی؟

] اگر کسی انسان کو نماز پڑھنے کے بعد پتہ چلے کہ وہ بے وضو تھا یا اس نے غسل کرنا تھا تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ وضو کرے اگر وضو کرنے کی ضرورت تھی اور غسل کرے اگر اس پر غسل کرنا فرض تھا پھر دوبارہ نماز کو ادا کرے، ناپاکی کی حالت میں ادا کی ہوئی نماز شرعاً نماز نہیں۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''اللہ تعالیٰ طہارت کے بغیر کوئی نماز بھی قبول نہیں کرتا۔'' 4

اس حدیث کے پیش نظر ناپاکی کی حالت میں ادا کردہ نماز باطل ہے، اس سے کسی قسم کے ثواب کی امید نہ رکھی جائے، یعنی وہ نوافل میں بھی تبدیل نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم

! بخاری، الاذان: ۸۴۱. @ صحیح بخاری، الاذان: ۸۴۲.
بخاری، الاذان: باب ۱۵۵. $ نسائی، الطهارة: ۱۳۹.

مسافر امام کے پیچھے نماز

] ہمارے ہاں مسجد میں اگر کوئی عالم دین آ جائے تو امام مسجد اس کے احترام میں اسے نماز پڑھانے کے متعلق کہہ دیتے ہیں، جب کہ مہمان نے نماز قصر پڑھنا ہوتی ہے لیکن بعض نمازی اسے اچھا نہیں سمجھتے، وہ امام کو مجبور کرتے ہیں کہ خود نماز پڑھائیں، کیا مسافر کے پیچھے مقیم کی نماز نہیں ہوتی؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[اگر مسجد میں کوئی عالم دین آ جائے تو احترام کے پیش نظر اسے نماز پڑھانے کے لیے کہنا جائز ہے اور مقیم آدمی، مسافر کے پیچھے نماز ادا کر سکتا ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

جیسا کہ سیدنا عمر t ایک مرتبہ مکہ تشریف لائے تو انہوں نے وہاں کے باشندوں کو دو رکعت پڑھائیں اور فرمایا:

''اے اہل مکہ! تم اپنی نماز مکمل کر لو، ہم تو مسافر لوگ ہیں۔'' 1 اس لیے مقتدی حضرات کو یہ عمل برا محسوس نہیں ہونا چاہیے اور انہیں اپنے امام کو اس امر پر مجبور نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کسی مہمان کی موجودگی میں خود ہی نماز پڑھائے۔ بہر حال امام مسجد کا عمل شریعت کے عین مطابق ہے۔ واللہ اعلم

قبل از وقت نماز ادا کرنا

] اگر قبل از وقت نماز پڑھ لی جائے تو کیا وقت آنے پر دوبارہ پڑھنا ہوگی یا پہلے سے پڑھی ہوئی نماز کافی ہوگی؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[شریعت نے نماز کے اوقات مقرر کیے ہیں، بلاوجہ اسے قبل از وقت ادا کرنا جائز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ 2

''بے شک نماز کا اہل ایمان پر مقرر اوقات میں ادا کرنا فرض ہے۔''

حدیث میں ہے کہ ظہر کا وقت سورج ڈھلنے سے شروع ہوتا ہے۔ 3

قرآنی آیت اور پیش کردہ حدیث کے مطابق اگر کسی نے وقت سے پہلے نماز ادا کی ہے تو اس سے فرض کی ادائیگی نہ ہوگی، البتہ اس نماز کو نفل شمار کیا جائے گا۔ یعنی اسے نفل کا ثواب مل جائے گا لیکن وقت ہونے کے بعد سے دوبارہ ادا کرنا ہوگا پہلی ادا شدہ نماز کافی نہ ہوگی۔ واللہ اعلم

دوران نماز وساوس کا آنا

] مجھے دوران نماز بہت برے برے خیالات اور وسوسے آتے ہیں، کوشش کے باوجود ان سے نجات نہیں ملتی، آپ اس سلسلہ میں کوئی کامیاب علاج بتائیں تاکہ میں ان خیالات و وساوس سے محفوظ رہوں۔

! موطا امام مالک:۱/ ۱۲۶۔ @ النساء: ۱۰۳۔

صحیح بخاری، المواقیت: ۵۴۱۔

[ابلیس لعین نے مختلف شیاطین کو گمراہی پھیلانے کے لیے ذمہ داریاں سونپی ہیں، دوران نماز، نمازی کو خیالات میں مصروف کرنے کے لیے ایک شیطان تعینات ہے جس کا نام خنزب ہے، اس کا کام دوران نماز وسوسہ اندازی کرنا ہے۔ جیسا کہ سیدنا عثمان بن ابوالعاص t نے رسول اللہ e سے شکایت کی کہ یا رسول اللہ! شیطان میرے اور میری نماز نیز قراءت کے درمیان حائل ہوکر میری نماز خلط ملط کر دیتا ہے، رسول اللہ e نے فرمایا:

اس کام کے لیے ایک شیطان مقرر ہے جس کا نام خنزب ہے، جب تم اس کی وسوسہ اندازی محسوس کرو تو تم اس وقت اعوذ باللہ پڑھ لیا کرو اور اپنی بائیں جانب تین بار تھوکر دیا کرو۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ e کی اس ہدایت پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے شیطان کی وسوسہ اندازی سے نجات دے دی۔ 1

صورت مسئولہ میں بھی سائل اسی قسم کے حالات سے دو چار ہے، اسے چاہیے کہ وہ رسول اللہ e کی ہدایت کے مطابق عمل کرے، ان شاء اللہ وسوسہ اندازی اور برے خیالات ختم ہو جائیں گے۔ بہرحال نمازی کے لیے ضروری ہے کہ وہ وساوس سے بچتے ہوئے ان کے خلاف جنگ لڑے اور کثرت سے تعوذ پڑھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴾ 2

''اور اگر شیطان کی طرف سے آپ کو کوئی وسوسہ آنے لگے تو فوراً اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو، وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

شیطان کی وسوسہ اندازی کو اللہ تعالیٰ نے بطور خاص بیان کیا ہے بلکہ انسان کو گمراہ کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار اور اس کا طریقہ واردات ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِکِ النَّاسِ ۙ اِلٰہِ النَّاسِ ۙ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ ۬ۙ الۡخَنَّاسِ ۪ۙ الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ ﴾ 3

''آپ کہہ دیں، میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ میں آتا ہوں، لوگوں کے مالک اور ان کے معبود کی پناہ میں آتا ہوں، وسوسہ ڈالنے والے، پیچھے ہٹ کر دوبارہ عمل کرنے والے کی برائی سے وہ جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے جو جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔''

نمازی کو چاہیے کہ وہ ابلیس کے خلاف اس طریقہ واردات سے نبرد آزما رہے اور اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے کیوں کہ تنہا نمازی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ واللہ اعلم

! مسلم، السلام: ۵۷۳۸. @ الاعراف: ۲۰۰.
سورة الناس: ۱، ۶.

نماز عشاء کے بعد سونے سے پہلے وتر پڑھنا

] کچھ اہل علم کہتے ہیں کہ وتر، نماز تہجد کا حصہ ہیں، چونکہ نماز تہجد سونے کے بعد اٹھ کر پڑھی جاتی ہے اس لیے وتر بھی سونے کے بعد اٹھ کر پڑھنے چاہئیں، انہیں نماز عشاء کے متصل بعد پڑھنا درست نہیں۔ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کردیں۔

[بلاشبہ وتر، نماز تہجد کا حصہ ہے لیکن اس حصہ کو نماز عشاء سے متصل پڑھنا جائز ہے اگرچہ بہتر یہ ہے کہ انہیں تہجد کے وقت ہی پڑھا جائے لیکن اگر کسی کو اندیشہ ہو کہ وہ صبح نہیں اٹھ سکے گا تو اسے شرعی طور پر اجازت ہے کہ وہ سونے سے پہلے نماز وتر پڑھ لے۔

چنانچہ سیدنا ابوہریرہ t سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ مجھے میرے خلیل e نے تین باتوں کی وصیت کی تھی۔ میں زندگی بھر انہیں ترک نہیں کروں گا، وہ یہ ہیں:

۱: ہر مہینے تین روزے (ایام بیض ۱۳، ۱۴، ۱۵) رکھوں۔

۲: چاشت کی دو رکعت ادا کروں۔

۳: وتر پڑھ کر نیند کروں۔ 1

ایک روایت میں ہے کہ سونے سے پہلے وتر پڑھا کروں۔ 2

سیدنا امیر معاویہ t کے متعلق بھی احادیث میں ہے کہ وہ عشاء کے بعد نماز وتر پڑھ لیتے تھے جیسا کہ ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ سیدنا امیر معاویہ t نے نماز عشاء کے بعد ایک رکعت نماز وتر پڑھی۔

سیدنا ابن عباس w کے آزاد کردہ غلام آپ کے پاس تھے، انہوں نے سیدنا ابن عباس w سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ:

''انہیں چھوڑ، کیوں کہ انہیں رسول اللہ e کی صحبت اختیار کرنے کا شرف حاصل ہے۔'' 3

ایک روایت میں ہے کہ سیدنا ابن عباس w نے فرمایا:

''انہوں نے درست کہا ہے کیوں کہ وہ ایک فقیہ شخص ہیں۔'' 4

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''یہ بیداری ایک مشکل اور گراں کام ہے، جب تم میں سے کوئی شخص وتر پڑھ لے تو وہ دو رکعت ادا کرے پھر اگر وہ رات کے وقت بیدار ہو جائے تو تہجد پڑھ لے بصورت دیگر یہ دو رکعت اس کے لیے کافی ہیں۔''

! صحیح بخاری، التہجد: ۱۱۷۸. @ صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۸۱.

صحیح بخاری، الفضائل: ۳۷۶۴. $ صحیح بخاری، حدیث: ۳۷۶۵.

ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز عشاء کے بعد سونے سے پہلے نماز وتر پڑھنا جائز ہے، اگر کوئی شخص نماز فجر سے پہلے بیدار ہو جائے تو دو، دو رکعت کر کے مزید نوافل پڑسکتا ہے مگر وتر دوبارہ نہ پڑھے۔ واللہ اعلم

فجر کی نماز سے پہلے تحیۃ المسجد پڑھنا

] ایک آدمی گھر سے نماز فجر کی دو سنتیں پڑھ کر آتا ہے، جب وہ مسجد میں آتا ہے تو کیا وہ بیٹھ جائے یا تحیۃ المسجد کی دو رکعت پڑھ کر بیٹھے، اس سلسلہ میں قرآن وحدیث میں کیا ہدایات وارد ہیں؟

[جب فجر طلوع ہو جائے تو نماز فجر کی دو سنتوں کے علاوہ کوئی نماز پڑھنا جائز نہیں۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمر W بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''فجر کے بعد دو رکعات کے علاوہ کوئی نماز نہیں۔'' 1

یہ روایت بیان کرنے کے بعد امام ترمذی a فرماتے ہیں کہ اس امر پر اہل علم کا اجماع ہے کہ کوئی شخص طلوع فجر کے بعد نماز فجر کی دو سنتوں کے علاوہ کوئی نماز نہ پڑھے۔ رسول اللہ e کا عمل مبارک بھی یہی تھا کہ اذان فجر کے بعد نماز فجر کی دو سنت ادا کرتے تھے جیسا کہ سیدہ حفصہ r کا بیان ہے:

''رسول اللہ e جب فجر طلوع ہوتی تو ہلکی سی دو رکعت ہی پڑھتے تھے۔ 2

ان روایات کا تقاضا ہے کہ اذان فجر کے بعد دو سنتوں کے علاوہ عمومی نوافل نہ پڑھے جائیں، لیکن تحیۃ المسجد ادا کرنے کے بارے میں بہت تاکیدی حکم آیا ہے۔ سیدنا قتادہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی ایک مسجد میں آئے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعات پڑھے۔'' 3

اگرچہ تحیۃ المسجد فرض نہیں جیسا کہ دیگر متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے تاہم اگر کوئی گھر سے فجر کی دو سنت پڑھ کر آئے تو مسجد میں داخل ہونے کے بعد بیٹھنے سے پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہے۔ اگرچہ ان کا پڑھنا ضروری نہیں تاہم مسجد کے احترام کا تقاضا ہے کہ وہ دو رکعت پڑھ کر بیٹھے یا وہ نماز کے انتظار میں کھڑا رہے۔ واللہ اعلم

مندر کی جگہ مسجد بنانا

] ہمارے ہاں سندھ کے علاقہ میں ایک قدیم مندر ہے جو بالکل متروک ہو چکا ہے، ہم اسے خرید کر وہاں مسجد بنانا چاہتے ہیں۔ کیا شرعی طور پر ایسا کرنا جائز ہے؟ اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی فرمائیں۔

[اگر غیر مسلم قوم کی عبادت گاہیں متروک ہو چکی ہوں تو وہاں مسجد بنانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ اسی طرح عیسائیوں کا گرجا گھر، یہودیوں کا صومعہ، ہندوؤں کا مندر، سکھوں کا گردوارہ، مشرکین کا بت خانہ، آتش پرستوں کا آتش کدہ

! ترمذی، الصلوٰة: ۴۱۹. @ مسلم، صلوٰة المسافرین: ۱۶۷۵.

بخاری، الاذان: ۴۴۴.

اور مرزائیوں کی عبادت گاہ وغیرہ کو اگر مسلمان حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو اسے مسمار کر کے مسجد میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یا وہاں قائم عمارت میں اس انداز سے تبدیلی کر لی جائے کہ ظاہری طور پر وہ غیر مسلم قوم کی عبادت گاہ معلوم نہ ہو، بلکہ قبلہ کی سمت درست کر کے اور مینار وغیرہ بنا کر مسجد کی حیثیت کو نمایاں کر دیا جائے تو ایسا کرنا جائز ہے۔

چنانچہ طائف کے مقام پر جہاں لات نامی بت نصب تھا، اس کی جگہ اب عظیم الشان اور پر شکوہ مسجد تعمیر ہو چکی ہے۔ حدیث میں ہے کہ سیدنا عثمان بن ابی العاص t جنہیں رسول اللہ e نے طائف میں اپنا نمائندہ مقرر کیا تھا وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ e نے انہیں طائف میں اس جگہ مسجد بنانے کا حکم دیا تھا۔ جہاں اہل طائف کا بت نصب تھا۔ 1

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت میں کفار کی متروکہ عبادت گاہوں کو مساجد میں تبدیل کرنا جائز ہے، تاریخی طور پر یہ بات بھی ثابت ہے کہ عالمگیر بادشاہ نے بھی ہندوستان میں کفار کے معابد کو مساجد میں تبدیل کر دیا تھا۔ اسی طرح سیدنا طلق بن علی t بیان کرتے ہیں:

ہم وفد کے طور پر رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوئے، ہم نے آپ کی بیعت کی اور آپ کے ساتھ نمازیں ادا کیں، پھر ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارے علاقہ میں ہمارا ایک گرجا ہے، نیز ہم نے آپ سے آپ کے وضو سے بچا ہوا پانی طلب کیا، آپ نے پانی منگوایا، پھر وضو کیا اور کلی کی پھر اس پانی کو ایک چھاگل میں انڈیل دیا اور فرمایا:

''جب تم اپنے علاقہ میں جاؤ تو اپنے اس گرجا کو توڑ دینا اور اس کی جگہ یہ پانی چھڑک دینا، پھر اس جگہ کو مسجد بنا لینا۔''

چنانچہ جب ہم واپس اپنے علاقہ میں گئے تو ہم نے گرجے کو توڑ کر وہاں آپ کے وضو کا بچا ہوا پانی چھڑک دیا اور اس جگہ مسجد بنائی۔ 2

واضح رہے کہ مذکورہ گرجا ان لوگوں کا اپنا تھا جب وہ مسلمان ہو گئے تو انہوں نے اپنے گرجے کو توڑ کر مسجد میں بدل لیا، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ البتہ وہاں کے باشندے غیر مسلم ہوں تو ان کی عبادت گاہوں کو زبردستی مساجد میں تبدیل کرنا جائز نہیں۔ کیوں کہ ایسا کرنا آزادی مذہب کے خلاف ہے اور اس طرح کی زبردستی اسلام میں جائز نہیں۔ صورت مسئولہ میں اگر مندر متروک ہو چکا ہے اور وہاں ہندوؤں کی آبادی نہیں ہے تو اسے توڑ کر مسجد میں تبدیل کیا جا سکتا ہے یا اس کی عمارت میں معمولی تبدیلی کر کے مسجد کی شکل دی جا سکتی ہے۔ واللہ اعلم

گرجا گھر میں نماز پڑھنا

] کیا عیسائیوں کے گرجا گھر میں نماز پڑھی جا سکتی ہے؟ جبکہ وہاں مورتیاں اور مجسّمے وغیرہ نصب ہوں، تا کہ اسلام کی وسعت اور عالمی بھائی چارے کا مظاہرہ کیا جا سکے۔ اس کے متعلق شرعی ہدایات کیا ہیں؟

! ابن ماجہ، ابواب المساجد: ۷۴۳۔ @ النسائی، المساجد: ۷۰۲۔

[کفار کی عبادت گاہوں میں نماز پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ وہ نجاست آلود نہ ہوں اور نہ ہی وہاں کوئی مجسمہ یا مورتی یا تصویر وغیرہ ہو۔ اگر وہاں تصویریں آویزاں ہیں یا وہاں مجسمے اور مورتیاں نصب ہیں تو وہاں نماز پڑھنا تو کجا اس جگہ قدم رکھنا بھی جائز نہیں۔ امام بخاری a نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ بیان کیا ہے:

''عیسائیوں کے گرجا گھر میں نماز پڑھنا۔'' 1

پھر آپ نے سیدنا عمر اور سیدنا ابن عباس w سے مروی آثار تعلیقاً نقل کیے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

ایک مرتبہ سیدنا عمر t نے شام کا سفر کیا تو وہاں کے ایک بڑے پادری نے آپ کو دعوت طعام دی تو آپ نے فرمایا:

''ہم ان تصاویر اور مجسموں کی وجہ سے تمہارے عبادت خانوں میں نہیں جاتے۔'' 2

معلوم ہوا کہ تصاویر اور مورتیوں کی وجہ سے جب وہاں داخلہ ممنوع ہے تو ایسے مقامات پر نماز پڑھنا بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہوگا۔ اس کی مزید وضاحت سیدنا ابن عباس w کے اثر سے ہوتی ہے۔

سیدنا ابن عباس w عیسائیوں کے گرجا گھر میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے سوائے اس گرجا گھر کے جس میں تصاویر ہوتیں۔

اس کی مزید وضاحت دوسری روایت میں ہے:

''اگر ان میں تصاویر ہوتیں تو سیدنا ابن عباس w باہر نکل کر نماز پڑھتے خواہ بارش ہی کیوں نہ ہو رہی ہوتی۔'' 3

امام ابن تیمیہ a سے جب معابد وکنائس میں نماز پڑھنے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس کے متعلق علماء کے تین اقوال حسب ذیل ہیں:

(۱) مطلق ممانعت: یہ امام مالک a کا قول ہے۔ (۲) مطلق اجازت: اسے امام احمد a کے اصحاب نے اختیار کیا ہے۔ (۳) اس میں تفصیل ہے کہ اگر یہودیوں کے معبد یا عیسائیوں کے گرجا میں تصویریں ہوں تو وہاں نماز نہیں پڑھی جائے گی کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس گھر میں نہیں آتے جس میں تصاویر ہوں اور اگر تصاویر نہ ہوں تو صحابہ کرام y سے گرجا میں نماز پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ 4

لہٰذا اس تفصیل کے مطابق مذکورہ سوال کا حل یہی ہے کہ اگر گرجا میں تصاویر نہ ہوں تو وہاں بامر مجبوری نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ بصورت دیگر وہاں داخل بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اس مناسبت سے ہم گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے گھروں کے کمروں میں اپنوں اور بیگانوں کی تصاویر آویزاں ہوتی ہیں اور ہم وہاں نماز بھی پڑھتے ہیں تو ایسی نمازوں کا کیا حال ہوگا؟ ہمیں اس کے متعلق ضرور غور وفکر کرنا ہوگا۔ واللہ اعلم

! بخاری، الصلوٰۃ: باب ۵۴۔ @ فتح الباری: ۱/ ۶۸۵۔

فتح الباری: ۱/ ۶۸۸۔ $ مجموع الفتاویٰ: ۲۲/ ۱۶۲۔

بچوں کا عیدگاہ جانا

] نماز عید میں شمولیت کرنے والی خواتین کے ہمراہ بچے بھی ہوتے ہیں، جو عیدگاہ میں دوڑتے پھرتے ہیں اور دوسرے نمازیوں کے لیے خلل کا باعث بنتے ہیں، کیا بچوں کا بھی عیدگاہ جانا مسنون ہے؟ اس کے متعلق شرعی ہدایات کیا ہیں؟

[بچوں کو تعلیم کے لیے عیدگاہ لے جانے میں کوئی حرج نہیں۔ اس سلسلہ میں امام بخاری a نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''باب خروج الصبیان الی المصلی'' ''بچوں کو عیدگاہ لے جانا۔'' 1

پھر ایک حدیث ذکر کی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس w فرماتے ہیں: ''میں عید الفطر یا عید الاضحیٰ کے موقع پر رسول اللہ e کے ہمراہ نکلا اور آپ e نے نماز عید پڑھائی۔'' 2

اس کی وضاحت ایک دوسری حدیث میں ہے: سیدنا عبداللہ بن عباس w سے کسی نے دریافت کیا، کیا آپ عید کے موقع پر رسول اللہ e کے ہمراہ باہر جایا کرتے تھے؟

تو آپ e نے جواب دیا: ''ہاں جایا کرتا تھا۔''

اگر صغر سنی کے باوجود رسول اللہ e کے ہاں میرا مقام و مرتبہ نہ ہوتا تو مجھے آپ اپنے ساتھ کیوں لے جاتے۔'' 3

امام بخاری a کا مطلب یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس w خود اس وقت چھوٹی عمر کے تھے جب وہ رسول اللہ e کے ہمراہ عیدگاہ گئے، اس سے بچوں کا عیدگاہ جانا ثابت ہوتا ہے۔

حافظ ابن حجر a لکھتے ہیں کہ بچوں کو عیدگاہ جانا تبرک اور شوکت اسلام کے اظہار کے لیے ہے۔ جیسا کہ حائضہ عورتوں کو بھی شمولیت کے لیے کہا گیا ہے۔ 4

ہمارے رجحان کے مطابق درج ذیل شرائط کے ساتھ بچوں کو عیدگاہ لے جانا جائز ہے:

☆ وہ بچے جو سن شعور کو پہنچ چکے ہوں، کیوں کہ سات سال کی عمر میں رسول اللہ e نے بچوں کو نماز پڑھنے کے متعلق حکم دیا

! بخاری، العیدین، باب: ۱۶. @ بخاری، العیدین: ۹۷۵.
بخاری، العیدین: ۹۷۶. $ فتح الباری: ۲/ ۶۰۰.

ہے۔اس عمر میں بچہ عام طور پر سمجھ دار اور صاحب شعور ہو جاتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس W کی شمولیت سے یہ شرط اخذ کی جاسکتی ہے۔

☆ عیدگاہ لانے سے پہلے ان کی اس پہلو سے تربیت کرنا ضروری ہے کہ عید اور عیدگاہ کے آداب کیا ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ عیدگاہ میں اودھم مچاتے رہیں اور انہیں کوئی روکنے والا نہ ہو۔

☆ چھوٹے شیر خوار بچوں کو عیدگاہ لے جانے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ وہ خود ماؤں اور دیگر خواتین وحضرات کے لیے پریشانی کا باعث بن سکتے ہیں۔

☆ شرارتی اور بے عقل بچوں کو بھی گھر میں رہنے دیا جائے، کیوں کہ شرارتی بچوں کو دیکھ کر سنجیدہ بچے بھی اچھل کود میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

☆ بچے ماں کے بجائے باپ کے ساتھ ہوں تو بہتر ہے تاکہ بوقت ضرورت ان پر کنٹرول کرنا آسان ہو اور وہ عیدگاہ میں دوسروں کی نماز خراب نہ کرسکیں۔

حافظ ابن حجر a نے بھی اس قسم کی شرائط کو ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم

عیدین کا وقت

] ہمارے ہاں نماز عید کافی دیر سے ادا کی جاتی ہے، اس کا مسنون وقت کیا ہے؟ راہنمائی فرمائیں۔ تاکہ سنت کے مطابق اسے مستحب وقت میں ادا کیا جائے اور لوگوں کو اس کا پابند کیا جائے۔

[نماز عید کا وقت طلوع آفتاب سے لے کر زوالِ آفتاب تک ہے۔ رسول اللہ e کو ایک مرتبہ زوال آفتاب کے بعد عید کا چاند نظر آنے کی اطلاع ملی تو آپ e نے فرمایا:

’’کل صبح لوگ نماز عید کے لیے عیدگاہ پہنچیں۔‘‘ 1

اس کا مطلب یہ ہے کہ زوال آفتاب کے بعد نماز عید کا وقت نہیں، اسے صبح طلوع آفتاب کے بعد جلدی ادا کرنا چاہیے۔

چنانچہ سیدنا عبداللہ بن بسر t سے مروی ہے، وہ لوگوں کے ساتھ عید الفطر یا عید الاضحیٰ کے دن نکلے تو انہیں امام کے تاخیر کر دینے پر بہت تعجب ہوا، انہوں نے فرمایا:

’’بے شک ہم تو اس وقت نماز پڑھ کر فارغ ہو جاتے تھے اور نماز چاشت کا وقت تھا۔‘‘ 2

سیدنا جندب t سے مروی ہے، رسول اللہ e عید الفطر اس وقت پڑھتے تھے جب سورج دو نیزوں کے برابر ہو جاتا اور عید الاضحیٰ اس وقت پڑھتے تھے جب سورج ایک نیزے کے برابر ہو جاتا۔ 3

! ابوداود، الصلوٰۃ: ۱۱۵۷. @ ابوداود، الصلوٰۃ: ۱۱۳۵.

تلخیص الحبیر: ۲/ ۱۶۷.

اگر چہ یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے تاہم اسے سیدنا عبداللہ بن بسر t سے مروی روایت کی تائید میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ امام ابن قیم a لکھتے ہیں:

’’رسول اللہ e نماز عید الفطر کچھ تاخیر سے ادا کرتے جبکہ عید الاضحیٰ جلدی ادا کرتے تھے۔‘‘ 1

عید الاضحیٰ کے وقت لوگوں نے قربانی کرنا ہوتی ہے، اس لیے لوگوں کو جلدی فارغ کر دینا چاہیے جبکہ عید الفطر کے بعد کوئی مصروفیت نہیں ہوتی، اس لیے اس کی ادائیگی میں ذرا تاخیر کرنے میں چنداں حرج نہیں۔ زیادہ دیر کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم

چاند رات میں خصوصی عبادت کرنا

] چاند رات میں عبادت کرنے کی کیا حیثیت ہے؟ اس کے متعلق کچھ احادیث بھی بیان کی جاتی ہیں، ان کی استنادی حیثیت کیسی ہے؟ وضاحت کر دیں۔

[عیدین کی رات خصوصی عبادت کرنا کتاب وسنت سے ثابت نہیں، ہاں اگر کوئی شخص پابندی سے تہجد پڑھتا ہے تو اس رات تہجد پڑھی جاسکتی ہے لیکن عیدین کی رات کا عبادت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سلسلہ میں حدیث بیان کی جاتی ہے:

’’جو شخص عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی رات عبادت کرتا رہا، اس کا دل اس دن بھی مردہ نہیں ہوگا جس دن تمام دل مردہ ہو جائیں گے۔‘‘ 2

یہ روایت خود ساختہ اور بناوٹی ہے کیوں کہ اس میں ایک راوی عمر بن ہارون البلخی ہے جس کے متعلق علامہ ذہبی a فرماتے ہیں:

’’ابن معین نے اسے کذاب کہا ہے اور محدثین کی ایک جماعت نے اسے متروک قرار دیا ہے۔‘‘ 3

میزان الاعتدال میں اس کے متعلق ’’کذاب خبیث‘‘ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ 4

علامہ البانی a نے بھی اس روایت کو موضوع کہا ہے۔ 5

عیدگاہ کی طرف پیدل جانا

] ہمارا گھر عیدگاہ سے کافی دور ہے، میں اپنے بچوں کے ہمراہ وہاں سواری پر جاتا ہوں، مجھے چند دوستوں نے کہا ہے کہ عیدگاہ پیدل جانا مسنون عمل ہے، اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی فرمائیں۔

[امام بخاری a نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ’’عیدگاہ میں پیدل اور سوار ہو کر جانا۔‘‘ 6

! زاد المعاد: ۱/ ۱۲۱۔ @ مجمع الزوائد: ۲/ ۱۹۸۔
تلخیص المستدرک: ۴/ ۸۷۔ $ میزان الاعتدال: ۲/ ۲۲۸۔
% سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ: ۲/ ۱۔ ^ بخاری، العیدین: باب ۷۔

پھر آپ a نے چند احادیث سے اس مسئلہ کا استنباط کیا ہے کہ عیدگاہ سواری پر جانا بھی جائز ہے۔ اس عنوان کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر a لکھتے ہیں:

''شاید امام بخاری a نے اس عنوان کو قائم کر کے نمازِ عید کے لیے پیدل جانے کے استحباب کے متعلق احادیث کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے، یعنی امام بخاری a عیدگاہ میں پیدل اور سوار ہو کر جانا دونوں طرح جائز سمجھتے ہیں۔'' 1

پیدل جانے کے متعلق سیدنا علی t سے مروی ایک حدیث مندرجہ ذیل ہے:

''عیدگاہ کی جانب پیدل جانا مسنون عمل ہے۔'' 2

اگرچہ علامہ البانی a نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔ 3

تاہم اس کی سند میں ایک راوی حارث اعور ہے جسے امام نووی a نے بالاتفاق کذاب کہا ہے۔ لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔ 4

اس حدیث کے متعلق امام ترمذی a لکھتے ہیں:

''اکثر اہل علم کا اس پر عمل ہے کہ وہ عید کے لیے مردوں کا پیدل جانا پسند کرتے ہیں اور یہ کہ کوئی عذر کے بغیر سوار ہو کر نہ جائے۔''

صورت مسئولہ میں سائل کا گھر عیدگاہ سے کافی دور ہے، جس کی بناء پر وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ سوار ہو کر آتے ہیں، ان کا یہ عذر معقول ہے، اس بناء پر اس کے سوار ہو کر آنے میں چنداں حرج نہیں۔ اکثر اہل علم کہتے ہیں کہ عیدگاہ پیدل جانا مستحب ہے اور سواری پر جانا جائز ہے۔ علامہ شوکانی a فرماتے ہیں:

''عیدین میں مسنون افعال میں سے پیدل چل کر جانا بھی ہے۔'' 5

''جمعۃ المبارک'' یا صرف ''جمعہ''

] ہماری کلاس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ جمعۃ کے دن کو جمعۃ المبارک کہا جاتا ہے، اس دن میں کیا خصوصیات ہیں جن کی بناء پر اسے جمعۃ المبارک کہا جاتا ہے؟ حالانکہ خصوصیت کے ساتھ اس دن کا روزہ رکھنے سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔

[جمعہ کا دن کئی ایک خصوصیات کا حامل ہے، جن میں کچھ حسب ذیل ہیں:

☆ ہم مسلمانوں کے لیے جمعہ کا دن بطور قومی تہوار ہے، جس طرح یہود کے لیے ہفتہ اور عیسائیوں کے لیے اتوار ہے۔ ہم اس دن میں بطور خاص اللہ کی عبادت بجالانے پر مامور ہیں جیسا کہ رسول اکرم e کا ارشاد گرامی ہے:

! فتح الباری: ۳/ ۱۲۷۔

@ ترمذی، الجمعہ: ۵۳۰۔

صحیح ترمذی، حدیث: ۴۳۷۔

$ نیل الاوطار: ۲/ ۵۸۲۔

% السیل الجرار: ۱/ ۳۲۰۔

''یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت بجالانا ہم پر فرض ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ہماری رہنمائی فرمائی ہے، باقی لوگ ہمارے پیچھے ہیں یعنی یہودی کل بروز ہفتہ اور عیسائی پرسوں بروز اتوار عبادت بجالاتے ہیں۔'' 1

☆ رسول اللہ e نے اس دن کو تمام دنوں سے بہتر اور افضل قرار دیا ہے جیسا کہ آپ کا ارشاد گرامی ہے:

''بہترین دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے وہ جمعہ کا دن ہے، اس دن حضرت آدم u پیدا کیے گئے، اسی دن انہیں جنت میں داخل کیا گیا اور اس دن انہیں جنت سے نکالا گیا۔'' 2

سیدنا آدم u کے جنت سے نکالے جانے کو جمعہ کی فضیلت اس لیے شمار کیا گیا ہے کہ اس میں زمین کی آبادی، اللہ کی شریعت پر عمل درآمد اور اس کے تقرب کا حصول، انبیاء کرام o کا ظہور اور زمین پر عدل و انصاف کے قیام کا آغاز ہوا۔

☆ جمعہ کے دن عبادت کرنے والے کو ایسی مغفرت سے نوازا جاتا ہے کہ دوسری کسی نماز کی ادائیگی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''جو شخص غسل کر کے جمعہ پڑھنے کے لیے چلے، پھر حسب توفیق نماز ادا کرے اور خاموش رہ کر امام کا خطبہ سنے، پھر اس کے ساتھ مل کر نماز پڑھے تو اس جمعہ سے لے کر آئندہ جمعہ بلکہ مزید تین دن تک اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔'' 3

☆ جمعہ کی فضیلت میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ایک گھڑی رکھی ہے، جو شخص بھی بحالت نماز اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوا اسے پالے تو اس کی دعا کو شرف قبولیت سے نوازا جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں اس کا بطور خاص ذکر ہے۔ 4

لہٰذا ہر مسلمان کو جمعہ کے دن اس عظیم نعمت کے حصول کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ بہرحال جمعہ کا دن متعدد خصوصیات کا حامل ہے۔ امام ابن قیم a نے اس دن کی تینتیس (۳۳) خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی a نے بھی ان کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ 5

ان خصوصیات کی بناء پر رسول اللہ e نے دوسرے تمام دنوں سے افضل قرار دیا ہے بلکہ اسے تمام دنوں کا سردار کہا ہے۔ 6

لہٰذا اس دن کا یہ حق ہے کہ اسے ''جمعۃ المبارک'' کہا جائے، کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے شمار خیر و برکات کا حامل ہے۔ واللہ اعلم

! صحیح مسلم، الجمعہ: ۱۹۷۸۔ @ مسلم، الجمعہ: ۱۹۷۷۔

صحیح مسلم، الجمعہ: ۱۹۷۸۔ $ النسائی، الجمعہ: ۱۳۹۰۔

% فتح الباری: ۳/ ۳۵۳۔ ۸ مسند امام احمد: ۳/ ۴۳۰۔

صدقہ فطر کی ادائیگی

] فطرانہ کس پر، کب واجب ہوتا ہے اور اس کی ادائیگی کا وقت کونسا ہے، کیا اسے رمضان میں ہی ادا کرنا ہوتا ہے یا اس کے بعد بھی اس کی ادائیگی ہوسکتی ہے؟

[صدقہ فطر ہر مسلمان نابالغ اور بالغ پر فرض ہے، جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشادگرامی ہے:

''صدقہ فطر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جَو، غلام، آزاد، مرد، عورت، نابالغ اور بالغ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ 1

البتہ بیوی بچوں اور غلاموں کا فطرانہ مالک اور صاحب خانہ کو ادا کرنا ہوگا، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر t سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ e نے بالغ، نابالغ، آزاد، غلام کے نفقہ اور اخراجات کا جو ذمہ دار ہے اسے ان کی طرف سے صدقہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ 2

فطرانہ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ مسلمان صاحب نصاب ہو بلکہ جس طرح ایک صاحب ثروت مسلمان پر فرض ہے اسی طرح غریب اور نادار کے لیے بھی اس کی ادائیگی ضروری ہے بلکہ غرباء کو دوسروں کے دیے ہوئے غلہ سے صدقہ فطر ادا کرنا چاہیے۔ جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشادگرامی ہے:

''صدقہ فطر کے ذریعے اللہ تعالیٰ غنی کو پاک صاف کرتا ہے اور غریب لوگوں کو اس کے ساتھ جتنا اس نے دیا ہے اس سے زیادہ واپس لوٹاتا ہے۔'' 3

صدقہ فطر، نماز عید سے قبل ادا کرنا چاہیے، اگر نماز کے بعد ادا کیا گیا تو یہ عام صدقہ ہوگا، صدقہ فطر کی ادائیگی نہیں ہوگی اور نہ ہی اس کا ثواب ملے گا، جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشادگرامی ہے:

''جس نے صدقہ فطر نماز عید سے پہلے ادا کیا وہ صدقہ فطر مقبول ہوگا اور جس نے عید کی نماز کے بعد ادا کیا وہ عام خیرات کے حکم میں ہوگا۔'' 4

سیدنا ابن عمر w فرماتے ہیں کہ رسول اللہ e نے صدقہ فطر لوگوں کے نماز عید کے لیے باہر نکلنے سے قبل ادا کرنے کا حکم دیا۔ 5

اگر کہیں بیت المال کا نظام قائم ہے تو وہاں عید سے ایک دو دن پہلے صدقہ فطر بھیج دینا درست ہے تاکہ وہاں جمع ہوکر مستحقین کو تقسیم کیا جاسکے۔

جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر w کے متعلق ہے کہ وہ جہاں صدقہ فطر جمع ہوتا تھا وہاں عیدالفطر سے ایک دو دن پہلے فطرانہ

! صحیح بخاری، الزکوٰۃ: ۱۵۰۳۔ @ دارقطنی: ۲/ ۱۴۰۔

ابوداود، الزکوٰۃ: ۱۶۱۹۔ $ ابوداود، الزکاۃ: ۱۶۰۹۔

% بخاری، الزکاۃ: ۱۵۰۹۔

بھیج دیتے تھے۔ 1 لہٰذا فطرانہ کی بروقت ادائیگی ضروری ہے۔ واللہ اعلم

عید کھلے میدان میں

] آج کل محلے کی مساجد میں نماز عید پڑھانے کا رواج چل نکلا ہے، کیا شریعت میں اس کی گنجائش ہے یا نماز عید باہر کھلے میدان میں ادا کرنی چاہیے، کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

[عیدین کے موقع پر اسلام کی شان وشوکت کا اظہار مقصود ہوتا ہے، اس لیے نماز عید آبادی سے باہر کھلے میدان میں پڑھی جائے۔ رسول اللہ e بھی نماز عید باہر کھلے میدان میں پڑھا کرتے تھے۔ آپ کا مصلّٰی (عیدگاہ) جبانہ نامی صحراء میں تھا، یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ e مردوں اور عورتوں سب کو عیدگاہ جانے کا حکم دیتے تھے حتیٰ کہ نماز نہ پڑھنے والی عورتوں کو بھی وہاں حاضری کی تاکید کی جاتی۔ لیکن آج کل یہ سنت متروک ہوتی جا رہی ہے جس کی درج ذیل وجوہات ہیں:

مسجد میں تمام سہولیات میسر ہوتی ہیں، وضو کے لیے پانی، بچھی بچھائی صفیں اور ہوا دینے کے لیے برقی پنکھے وغیرہ جبکہ باہر کسی پارک میں اس قسم کے انتظامات کرنا پڑتے ہیں، اس لیے سہل گوشی کے پیش نظر ہم مسجد میں ہی نماز عید ادا کر لیتے ہیں، اگرچہ کسی مجبوری کی بناء پر نماز عید مسجد میں ادا کی جا سکتی ہے لیکن اسے عادت بنا لینا درست نہیں۔

چنانچہ رسول اللہ e نے ایک بارش کی وجہ سے مسجد نبوی میں نماز عید ادا کی تھی۔ 2

یہ روایت سند کے اعتبار سے کمزور ہے لیکن اگر واقعی کوئی عذر ہو تو مسجد میں نماز عید ادا کی جا سکتی ہے بصورت دیگر عید کھلے میدان میں پڑھنا افضل ہے۔ جیسا کہ امیر المومنین سیدنا عمر W سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

”اے لوگو! بلاشبہ رسول اللہ e لوگوں کو عیدگاہ لے جاتے تھے تاکہ انہیں وہاں نماز عید پڑھائیں، یہ بات زیادہ آسان اور وسعت والی تھی کیوں کہ مسجد میں وہ لوگ نہیں سما سکتے تھے، لہٰذا اگر بارش ہو تو تم مسجد میں نماز عید پڑھ لو، یہ زیادہ آسان بات ہے۔“ 3

بہرحال نماز عید آبادی سے باہر کھلے میدان میں ادا کرنا افضل ہے، کیوں کہ سنت پر عمل کرنا ہی بہتر اور اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم

خطبہ جمعہ کو غور سے سننا

] عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ سامعین حضرات دوران خطبہ باتیں کرتے رہتے ہیں یا کسی کو اشارہ سے کوئی کام کہتے ہیں، دوسرے حضرات انہیں خاموشی اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں، اس کے متعلق وضاحت درکار ہے کہ دوران خطبہ ایسا عمل درست ہے یا نہیں؟

[خطیب کو چاہیے کہ وہ مقتضی الحال کے مطابق گفتگو کرے، بے مقصد باتوں سے اجتناب کرے۔ سامعین کو

! بخاری، الزکاۃ: ۱۵۱۱۔ @ ابوداود، الصلوٰۃ: ۱۱۶۰۔

بیہقی: ۳/ ۳۱۰۔

چاہیے کہ وہ ہمہ تن گوش ہو کر خطبہ سنیں اور اپنے دل کے نہاں خانے میں اسے اتارنے کی کوشش کریں۔ اگر کسی کو خاموش کرانا ہو تو خطیب کو چاہیے کہ وہ خود اس فریضہ کو انجام دے، سامعین کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ باتیں کرنے والوں کو خاموش کرائیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جس شخص نے جمعہ کے دن اس وقت بات کی جب امام منبر پر کھڑا خطبہ جمعہ دے رہا ہو تو وہ شخص اس گدھے کی طرح ہے جس نے اپنے اوپر کتابیں اٹھا رکھی ہوں اور اس انسان کا بھی جمعہ نہیں جس نے اسے خاموش رہنے کا کہا۔'' 1

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ خطبہ جمعہ کی کیا حیثیت ہے اور اسے سننے کی بجائے باتوں میں مشغول ہونا کس قدر سنگین جرم ہے۔ پھر جو شخص اسے خاموش رہنے کے متعلق کہتا ہے، اس کا سرے سے جمعہ ہی نہیں ہوتا، جیسا کہ اس حدیث میں صراحت ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی نماز نہیں ہوئی بلکہ وہ اس ناروا حرکت کی بناء پر ثواب سے محروم کر دیا جاتا ہے، چنانچہ ایک دوسری حدیث میں ہے جسے سیدنا ابوہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جب تم یہ کہو کہ خاموش ہو جاؤ اور امام خطبہ دے رہا ہو تو تم نے لغو کام کیا۔'' 2

حافظ ابن حجر a لکھتے ہیں کہ اوپر والی حدیث سیدنا ابوہریرہ t سے مروی حدیث کی تفسیر کرتی ہے یعنی اسے ثواب و اجر سے محروم کر دیا جاتا ہے۔'' 3

ایک حدیث میں اس کی مزید وضاحت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جمعہ میں تین طرح کے افراد آتے ہیں: ایک وہ شخص جو لغو کام کرتا ہے، اس کا خطبہ جمعہ سے یہی حصہ ہے۔ دوسرا دعا کے لیے آتا ہے، یہ دعا کرتا ہے اللہ چاہے تو عطا فرمائے چاہے تو محروم رکھے۔ تیسرا وہ شخص جو خطبہ جمعہ خاموشی سے سنتا ہے اور سکوت اختیار کرتا ہے، کسی مسلمان کی گردن پھلانگتا ہے نہ کسی کو ایذاء دیتا ہے، اس آدمی کے لیے یہ جمعہ آئندہ جمعہ تک کے لیے اور مزید تین دن کے لیے گناہوں کے لیے کفارہ بن جاتا ہے۔'' 4

بہرحال جو حضرات خطبہ جمعہ میں حاضر ہوں انہیں چاہیے کہ وہ نہایت اطمینان وسکون سے خطبہ جمعہ سنیں اور ایسی حرکات نہ کریں جن سے دوسرے نمازیوں کو تشویش ہو۔ اسی طرح دوسروں پر بھی پابندی ہے کہ وہ باتیں کرنے والوں کو خاموشی کی تلقین کر کے لغو حرکت کا ارتکاب نہ کریں۔ واللہ اعلم

خطبہ عیدین کے دوران چندہ جمع کرنا

] ہمارے ہاں خطبہ عید سے پہلے یا اس کے دوران چندہ جمع کیا جاتا ہے تاکہ اس سے امام کی اضافی خدمت کی جا سکے اور اسے مسجد کی ضروریات میں استعمال کیا جائے، اس وقت چندہ جمع کرنے کی شرعی طور پر کیا حیثیت ہے وضاحت کریں۔

! مسند امام احمد: ۱/ ۲۳۰. @ بخاری، الجمعہ: ۹۳۴.
بلوغ المرام: ۱/ ۷۴. $ ابوداود، الصلوٰۃ: ۱۱۱۳.

[عیدین کے خطبہ کوغور اور انہماک سے سننا چاہیے، دوران خطبہ یا خطبہ سے پہلے چندہ جمع کرنا درست نہیں۔ اگر کوئی ہنگامی ضرورت ہے تو خطبہ سے فراغت کے بعد اس کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ e خطبہ سے فراغت کے بعد عورتوں کے پاس آئے، انہیں وعظ و نصیحت فرمائی، پھر سیدنا بلال t کے ذریعے عورتوں سے صدقہ وصول کیا۔ 1

ایک روایت میں ہے کہ حدیث کے راوی ابن جریج نے اپنے استاد حضرت عطاء بن ابی رباح سے سوال کیا کہ آیا رسول اللہ e نے عورتوں سے صدقہ فطر وصول کیا؟ تو انہوں نے جواب دیا: نہیں، یہ صدقہ فطر نہیں تھا بلکہ عام صدقہ تھا جو سیدنا بلال t کے ذریعے عورتوں سے وصول کیا گیا۔ 2

صورت مسئولہ میں جو خطبہ سے پہلے یا خطبہ کے دوران چندہ جمع کیا جاتا ہے تا کہ امام کی خدمت کریں یہ کوئی اجتماعی ضرورت ہے جس کے لیے اس قسم کا تکلف کیا جائے۔ ایسا کرنا عیدین کے تقدس اور وقار کے بھی منافی ہے، البتہ خطبہ سے فراغت کے بعد چندہ کی اپیل کی جا سکتی ہے تا کہ لوگ حسب استطاعت اطمینان و سکون سے اس میں شریک ہو سکیں۔

عیدگاہ میں نوافل

] کچھ لوگ عیدگاہ میں نوافل پڑھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ عیدگاہ کی حیثیت بھی مسجد جیسی ہے کیوں کہ اس میں حائضہ عورتوں کو آنے کی اجازت نہیں جس طرح وہ مسجد میں نہیں جا سکتیں، اس لیے تحیۃ المسجد پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کی وضاحت کریں۔

[نماز عید سے پہلے یا بعد میں کوئی سنت یا نفل پڑھنا رسول اللہ e سے ثابت نہیں اور نہ ہی صحابہ کرام y سے کوئی ایسا عمل منقول ہے۔

چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباس w سے روایت ہے کہ عید کے دن رسول اللہ e عیدگاہ تشریف لے گئے، آپ e نے دو رکعت نماز پڑھائی۔ آپ نے نہ اس سے پہلے کوئی نماز پڑھی اور نہ بعد میں۔ 3

اس طرح سیدنا ابوسعید خدری t کا بیان ہے کہ رسول اللہ e نماز عید سے پہلے کوئی نماز نہ پڑھا کرتے تھے لیکن جب آپ گھر تشریف لاتے تو دو رکعت نماز ادا کرتے۔ 4

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عیدگاہ میں نماز عید سے پہلے یا بعد میں کسی قسم کے نوافل نہیں پڑھنے چاہئیں، عورتوں کو عیدگاہ میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے، اس سے عیدگاہ میں نماز سے پہلے تحیۃ المسجد پڑھنے کا استدلال غلط ہے کیوں کہ رسول اللہ e نے تمام روئے زمین کو مسجد قرار دیا ہے۔ کیا مسجد کے علاوہ جس جگہ بھی نماز ادا کی جائے وہاں تحیۃ المسجد پڑھنا مشروع

! بخاری، العیدین: ۹۷۷. @ بخاری، العیدین: ۹۷۸.
بخاری، العیدین: ۹۸۹. $ ابن ماجہ، اقامۃ الصلوات: ۱۲۹۳.

قرار دیا جائے؟

بہر حال عیدگاہ میں اگر نوافل یا تحیۃ المسجد پڑھنا مشروع ہوتا تو صحابہ کرام y ضرور اسے بیان کرتے۔ ہاں اگر کسی عذر کی بناء پر مسجد میں نماز عید پڑھی جائے تو وہاں تحیۃ المسجد پڑھے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر مقامات میں ایسا کرنا محض تکلف ہے۔ ہاں ابن ماجہ کی حدیث میں گھر آ کر نوافل پڑھنے کا ذکر ہے، ان کا نماز عید سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ مطلق نوافل ہیں۔ واللہ اعلم

خواتین کو عیدگاہ لے جانا

] عید کی آمد آمد ہے، ہمارے ہاں عیدگاہ میں عورتیں بھی شرکت کرتی ہیں اور اجتماعی طور پر عیدین کی نماز ادا کرتی ہیں لیکن ان کے ہاں اس قدر شور ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے والے دیگر حضرات کے لیے اذیت کا باعث بن جاتا ہے۔ کیا ایسے حالات میں ان پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی؟

[عید میں خوشی اور شان و شوکت کا اظہار مقصود ہے۔ اس لیے مردوں اور عورتوں حتیٰ کہ سمجھدار بچوں کو اس میں شرکت کا حکم دیا گیا ہے۔ نیز نماز نہ پڑھنے والی عورتوں کو بھی حاضری کی تاکید کی گئی ہے تاکہ عید کے دیگر مقاصد پورے ہو سکیں۔

چنانچہ حفصہ بنت سیرین کا بیان ہے کہ ہم اپنی جوان لڑکیوں کو عید کے دن باہر نکلنے سے منع کرتی تھیں، چنانچہ ایک لڑکی قصر بنی خلف میں آ کر مقیم ہوئی تو میں اس کے پاس گئی۔ اس نے بیان کیا کہ اس کا بہنوئی رسول اللہ e کے ہمراہ بارہ جنگوں میں شریک ہوا تھا۔ اس کی بہن بھی کچھ غزوات میں اس کے ہمراہ تھیں۔ ہمشیرہ نے بیان کیا کہ ہمارا کام مریضوں کی خبر گیری اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا تھا۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

> ''پردہ نشین دوشیزائیں اور نوجوان لڑکیاں عید کے لیے ضرور جائیں، جبکہ حائضہ عورتیں بھی شریک ہوں لیکن وہ نماز کی جگہ سے الگ تھلگ رہیں۔''

ہمشیرہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر کسی عورت کے پاس بڑی چادر نہ ہو، ایسے حالات میں اگر وہ عید کے لیے باہر نہ جائے تو کوئی حرج ہے؟ تو رسول اللہ e نے جواب دیا:

> ''اس کی سہیلی اپنی چادر میں سے کچھ حصہ اسے پہنا دے تاہم انہیں چاہیے کہ وہ امور خیر اور اہل ایمان کی دعاؤں میں ضرور شمولیت کریں۔'' 1

حافظ ابن حجر a نے سہیلی سے چادر لینے کے دو مفہوم بیان کیے ہیں:

☆ اپنی سہیلی سے چادر عاریۃً لے لے اور عیدگاہ ضرور جائے۔ اس کی تائید ایک دوسری روایت سے ہوتی ہے۔ رسول اللہ e نے ارشاد فرمایا: ''اس کی بہن اسے عاریۃً اپنی چادر دے دے۔'' 2

! بخاری، العیدین: ۹۸۰۔ @ ترمذی، ابواب الصلوٰۃ: ۵۳۹۔

☆ اگر چادر بڑی ہوتو اس کا کچھ حصہ اپنی سہیلی کو اوڑھا دے۔

چنانچہ اس کی تائید بھی ایک روایت سے ہوتی ہے۔ رسول اللہ e نے ارشاد فرمایا: ''اس کی سہیلی اسے اپنی چادر کا ایک حصہ اوڑھا دے۔'' 1

حافظ ابن حجر a نے اس مسئلہ کے متعلق تمام صحابہ کا اجماع نقل کیا ہے۔ 2

سوال میں جس صورت حال کا ذکر کیا گیا ہے وہ انتہائی تکلیف دہ ہے، خواتین کو چاہیے کہ وہ آرام اور سکون سے عید میں شمولیت کریں۔ ہمارے رجحان کے مطابق خواتین کو چاہیے کہ وہ اس سنت پر عمل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور کو مدنظر رکھیں۔

☆ راستہ میں ایک طرف ہو کر چلیں اور مردوں سے اختلاط سے پرہیز کریں۔

☆ باپردہ اور سادہ لباس پہن کر عیدگاہ جائیں اور خوشبو وغیرہ نہ لگائیں۔

☆ ظاہری زیبائش سے گریز کریں وگرنہ نیکی برباد گناہ لازم کے مترادف ہوگا۔

☆ عیدگاہ میں تکبیرات اور ذکر الٰہی میں مصروف رہیں، ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع نہ کریں۔

☆ شور و غل کرنے والے شرارتی بچوں کو ہمراہ نہ لائیں۔

ان شرائط کی پابندی کرتی ہوئی عیدگاہ جائیں اور نماز عید ادا کریں۔ واللہ اعلم

! ابوداود، الصلوٰۃ: ۱۱۳۶.   @ فتح الباری: ۲/ ۶۰۶.

رات کے وقت میت کی تدفین

] کیا رات کے وقت میت کو دفن کرنا منع ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق اس کی وضاحت کردیں۔

[رات کے وقت میت کو دفن کرنے کے متعلق رسول اللہ e نے یہ ہدایت دی ہے جسے حضرت جابر t نے بیان کیا ہے:

''اپنے مرنے والوں کو رات کے وقت دفن نہ کرو الا یہ کہ تم اس کے لیے مجبور کردیئے جاؤ۔'' 1

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ e نے رات کے وقت میت کو دفن کرنے کے متعلق ڈانٹا ہے، ہاں اگر نماز جنازہ پڑھ لی گئی ہو تو چنداں حرج نہیں۔ 2

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رات کے وقت میت کو دفن کرنے کی ممانعت اس لیے ہے کہ رات کے وقت نماز جنازہ میں کم لوگ شریک ہوتے ہوں گے، لہٰذا اگر دن کے وقت، جنازہ پڑھ لیا گیا ہو اور کسی عذر کی وجہ سے رات کو دفن کرنا پڑے تو ایسا کرنا ممنوع نہیں۔

نیز حضرت ابن عباس w کہتے ہیں کہ رسول اللہ e نے رات کے وقت ایک آدمی کو قبر میں داخل کیا تھا۔ 3

امام بخاری a نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''رات کے وقت دفن کرنا۔''

پھر سند کے بغیر یہ حدیث لائے ہیں کہ حضرت ابوبکر t کو رات کے وقت دفن کیا گیا تھا۔ 4

بہر حال کسی مجبوری کے بغیر میت کو رات کے وقت دفن نہیں کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

جنازہ پڑھانے کا حق دار کون ہے؟

] ہمارے ہاں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ جنازے کا حق دار میت کا بیٹا ہے۔ یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟ خیر القرون میں اس پر کوئی عمل ثابت ہے، تو اس کی وضاحت کریں۔

! ابو داؤد، الجنائز:۳۱۴۸.
@ صحیح مسلم، الجنائز:۹۴۳.
# ابن ماجہ، الجنائز:۱۵۲۰.
$ صحیح بخاری، الجنائز، قبل حدیث:۱۳۴۰.

[جنازہ کے استحقاق کے متعلق اہل علم کے ہاں تین آراء حسب ذیل ہیں:

☆ حاکم یا اس کا نائب جنازہ پڑھانے کا زیادہ حق دار ہے، اگر وہ نہ ہو تو قاضی، اگر وہ بھی موجود نہ ہو تو محلے کا امام نماز جنازہ پڑھائے۔

☆ جنازہ پڑھانے کا وہ زیادہ حق دار ہے جس کے لیے میت نے جنازہ پڑھانے کی وصیت کی ہو، جیسا کہ متعدد صحابہ کرام y کی وصیت کے مطابق جنازے پڑھائے گئے، اگر ایسا نہیں تو حاکم، اگر وہ موجود نہ ہو تو اس کے رشتے دار زیادہ حق دار ہیں۔

☆ اس کا قریبی رشتہ دار جنازہ پڑھانے کا زیادہ حق رکھتا ہے، کیوں کہ میت کے متعلق مخلصانہ جذبات اقرباء میں زیادہ ہوتے ہیں۔

ہمارے رجحان کے مطابق حاکم یا اس کا نائب زیادہ حق رکھتا ہے۔

جیسا کہ سیدنا حسن بن علی t کا جنازہ سیدنا امیر معاویہ t کے گورنر سیدنا سعید بن العاص t نے پڑھایا، سیدنا حسین t نے نماز جنازہ کے لیے انہیں خود آگے کیا تھا، وہ جنازہ پڑھاتے وقت رو رہے تھے۔ 1

واضح رہے کہ سیدنا سعید بن العاص t بڑے جلیل القدر صحابی ہیں اور وہ سیدنا امیر معاویہ t کی طرف سے مدینہ طیبہ کے گورنر تھے، انہیں فتنوں سے بے انتہاء نفرت تھی، انہوں نے سیدنا امیر معاویہ t کے ساتھ رہتے ہوئے کسی جنگ میں شرکت نہیں کی۔

اس حیثیت کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ ہر جگہ اور ہر وقت حاکم وقت یا اس کا نائب میسر نہیں ہوتا، پھر آج کل تو حاکم وقت بھی نااہل اور نالائق ہوتے ہیں جو جنازہ پڑھانے کی اہلیت نہیں رکھتے، لہٰذا مسجد کا حقیقی حاکم اس کا امام ہی ہوتا ہے، لہٰذا دیگر نمازوں کی طرح نماز جنازہ کا استحقاق بھی مسجد کے مستقل امام کا ہے الا یہ کہ میت نے کسی کو جنازہ پڑھانے کی وصیت کی ہو، اس صورت میں جسے وصیت کی گئی ہے، وہی میت کا جنازہ پڑھائے گا۔ واللہ اعلم

میت پر نوحہ کرنا

] ہمارے ہاں جب کوئی فوت ہو جاتا ہے تو اس کے اہل خانہ چیختے چلاتے ہیں، کیا میت پر نوحہ کرنے سے کوئی اثر ہوتا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[مرنے کے بعد میت پر چیخنا، چلانا اور نوحہ کرنا ناجائز ہے۔

چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعود t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: جو شخص بوقت مصیبت رخسار پیٹتا، گریبان پھاڑتا اور جاہلانہ انداز میں چیختا چلاتا ہے وہ ہم سے نہیں ہے۔ 2

! مستدرک الحاکم:ج۳،ص۱۹۰۔ @ صحیح بخاری، الجنائز:۱۲۹۷۔

اگر میت کو اس امر کا علم ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے اہل خانہ غیر شرعی کام کریں گے اور وہ انہیں منع کر کے نہیں گیا تو اُسے اہل خانہ کے چیخنے چلانے اور غیر شرعی کام کرنے سے عذاب ہوگا جیسا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: میت کو اس کے اہل خانہ کے رونے دھونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔ 1

اگر مرنے والا ان غیر شرعی کاموں سے منع کر کے گیا ہے تو امید ہے کہ اس کے اہل خانہ کے چیخنے چلانے سے میت پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ چنانچہ امام بخاری a نے اپنے ایک عنوان میں اس امر کی وضاحت کی ہے۔ 2

ہمیں چاہیے کہ میت پر نوحہ کرنے کی بجائے صبر کریں اور میت کے لیے مغفرت کی دعا مانگیں۔ (واللہ اعلم)

قریب المرگ کو قبلہ رو لٹانا

] کیا یہ بات صحیح ہے کہ جو انسان مرض الموت میں مبتلا ہو، اسے قبلہ رو لٹایا جائے نیز اسے قبلہ رو لٹانے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[قریب المرگ انسان کو قبلہ رخ کرنا تاکہ اسی حالت میں اسے موت آئے، اس میں کوئی حرج نہیں، اگرچہ ایسا کرنا ضروری نہیں، تاہم اس کی مشروعیت میں کوئی شک نہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ نے سیدنا براء بن معرور t کے متعلق سوال کیا، لوگوں نے بتایا کہ وہ تو فوت ہوگئے ہیں اور انہوں نے وصیت کی تھی کہ جب ان کی وفات کا وقت آئے تو انہیں قبلہ رخ کر دیا جائے۔ رسول اللہ e نے ان کی وصیت سن کر فرمایا: ''اس نے فطرت کو پا لیا ہے۔'' 3

اسی طرح رسول اللہ e کی لخت جگر سیدہ فاطمہ r کے متعلق حدیث میں ہے کہ صفات سے قبل انہوں نے قبلہ رو ہو کر اپنا ہاتھ رخسار کے نیچے رکھ لیا تھا۔ 4

لوگوں کا اس وقت یہ عمل کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس وقت یہ بات رائج تھی، تمام مسلمان قریب المرگ کے وقت ایسا کرتے تھے۔ قبلہ رخ کرنے کی دو صورتیں حسب ذیل ہیں:

☆ اسے سیدھا کمر کے بل لٹا کر اس کے پاؤں قبلہ کی طرف کر دیئے جائیں اور سر کو تھوڑا سا اوپر اٹھا دیا جائے۔

☆ اسے دائیں پہلو پر لٹا کر اس کا منہ قبلہ کی طرف کر دیا جائے۔

ہمارے نزدیک یہ آخری صورت راجح ہے، اس پر عمل کرنے میں چنداں حرج نہیں، امام نووی a نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ 5 واللہ اعلم

! صحیح مسلم الجنائز:۲۱۴۲.
@ صحیح بخاری، باب ۳۲.
# مصنف عبد الرزاق:ج۳،ص۳۹۱.
$ مسند احمد، ج ۲، ص۴۶۱.
% المغنی، ج۲،ص۴۵۱.

قبرستان میں مجاور بٹھانا

] ہمارے اہل دیہات نے قبرستان میں ایک مجاور بٹھانے کا پروگرام بنایا ہے، تاکہ وہ قبروں کی حفاظت کرے اور اس کی خدمت کے لیے ہر گھر سے کچھ طے شدہ رقم لی جاتی ہے۔ کیا قبروں میں اس طرح مجاور بٹھانا شرعاً جائز ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔

[قبروں میں کون سا خزانہ مدفون ہے، جس کے لیے کسی مجاور کو بٹھانے کی ضرورت ہے، یہ ایک فضول حرکت ہے، دین اسلام اس طرح کے بے فائدہ کاموں کی اجازت نہیں دیتا۔ ۹۷ھ میں حضرت حسن t کے بیٹے حسن بن حسن فوت ہوئے تو ان کی شریک حیات حضرت فاطمہ بنت حسین نے ایک سال تک ان کی قبر پر خیمہ لگائے رکھا، خاوند کی شدید محبت نے انہیں اس کام پر مجبور کیا، جب خیمہ اکھاڑ دیا گیا تو ھاتف غیبی سے آواز آئی، ''کیا انہوں نے اپنی گم شدہ چیز کو حاصل کر لیا۔'' اس کے جواب میں ایک دوسری آواز سنائی دی ''حاصل کیا ہونا تھا بلکہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے ہیں۔'' 1

ہاتف غیبی سے جو آواز آئی ہے، اس سے اس عمل کے ناپسندیدہ ہونے کا اشارہ ملتا ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر a نے علامہ ابن منیر a کے حوالے سے لکھا ہے۔ 2

ویسے بھی قبر پر بیٹھنے کی سخت ممانعت ہے۔

چنانچہ حضرت جابر t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے قبر کو پختہ کرنے، اس پر بیٹھنے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے۔ 3

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ قبروں پر مت بیٹھو۔ 4

قبروں پر بیٹھنا اور قبروں میں بیٹھنا دونوں کا ایک ہی حکم ہے، اس کے علاوہ قبرستان سے اس قسم کا تعلق رکھنا کئی ایک قباحتوں کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ اس سے اہل قبور سے روحانی فیض لینے کا چور دروازہ کھلتا ہے۔

اس بناء پر ہمارے رجحان کے مطابق اس فضول حرکت کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ اس کے لیے ہر گھر سے مخصوص رقم لے کر مجاور کی ''خدمت'' کا بندوبست کیا جائے۔ ایک دوسرے پہلو سے بھی اس کی قباحت واضح ہے کہ قبرستان میں نماز وغیرہ نہیں پڑھی جا سکتی، لہٰذا ایک بے نماز ہی قبروں کی مجاوری کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے فضول کاموں سے محفوظ رکھے اور شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق دے۔ آمین

قبر پر قرآن خوانی

] میت کو دفن کرنے کے بعد ہمارے ہاں قبر پر قرآن خوانی کا رواج ہے، اسی طرح اپنے گھروں میں بھی ایصال

! صحیح بخاری، تعلیقاً، باب نمبر ۶۱. @ فتح الباری، ص۲۵۶، ج۳.
صحیح مسلم، الجنائز: ۹۷۰. $ صحیح مسلم، الجنائز: ۹۷۱.

ثواب کے لیے قرآن خوانی کی جاتی ہے، اس کے متعلق شرعی کلام کیا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

[عبادت اور حصول ثواب کے لیے جو کام رسول اللہ e نے نہ کیا ہو اور نہ ہی خیر القرون میں وہ کام کرنا ثابت ہو، اسے بدعت کہا جاتا ہے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''جو شخص ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات ایجاد کرے جو اس میں سے نہ ہو وہ مردود ہے۔'' 1

دفن کرنے کے بعد قبر پر قرآن خوانی بھی اسی زمرے میں آتی ہے، کیوں کہ رسول اللہ e کے عہد مبارک میں اس کا کوئی رواج نہ تھا اور نہ ہی رسول اللہ e نے اس بات کا کوئی حکم دیا۔ نیز خیر القرون میں کسی سے بھی ایسا کرنا ثابت نہیں ہے۔ دفن کرنے کے بعد رسول اللہ e سے جو ثابت ہے وہ یہ ہے کہ دفن کے بعد قبر کے پاس کھڑے ہو کر دعا کی جائے۔ جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''اپنے بھائی کے لیے بخشش اور ثابت قدمی کی دعا کرو کیوں کہ اب اس سے سوال و جواب ہو گا۔'' 2

اسی طرح ایصال ثواب کے لیے گھر میں جمع ہو کر قرآن خوانی کرنا بھی رسول اللہ e سے ثابت نہیں، یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین سے ایسا کرنا ثابت نہیں ہے۔ ایک مسلمان کے لیے تو یہ حکم ہے کہ اسے جب کوئی مصیبت پہنچے تو صبر و استقامت کا مظاہرہ کرے اور زبان سے وہی الفاظ ادا کرے جو صبر کرنے والوں کا شعار ہے اور وہ یہ ہیں:

''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، اَللّٰهُمَّ اَجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ وَاخْلُفْ لِيْ خَيْرًا مِّنْهَا'' 3

''اے اللہ! ہم سب تیرے لیے ہیں اور تیری طرف ہی لوٹنے والے ہیں۔ اے اللہ! میری اس مصیبت کا مجھے اجر دے اور اس کے عوض مجھے بہتر بدلہ عطا فرما۔''

ہمارے رجحان کے مطابق میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر قرآن خوانی یا ایصال ثواب کے لیے قرآن پڑھنا یا پڑھانا بدعت کے زمرہ میں آتے ہیں، جن سے اجتناب انتہائی ضروری ہے۔ واللہ اعلم

دعائے مأثور کے الفاظ

] ہمارے ہاں تعزیت کے موقع پر درج ذیل دعا پڑھی جاتی ہے:

''اِنَّ لِلّٰهِ مَا اَخَذَ وَلَهٗ مَا اَعْطٰى، وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى، فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ''

اس دعا کے آخری الفاظ پر ایک عالم دین نے اعتراض کیا ہے کہ یہ دعا کا حصہ نہیں ہیں، وضاحت فرما دیں۔

[دعا کرتے وقت قرآن وحدیث میں منقول الفاظ کا ہی التزام کرنا چاہیے، اس میں بہت خیر و برکت ہے۔ چنانچہ

! بخاری، الصلح:۲۶۹۷. @ ابو داؤد، الجنائز:۳۲۲۱.

مسلم، الجنائز:۹۱۸.

ایک مرتبہ رسول اللہ e نے سیدنا براء بن عازب t کو رات کے وقت سونے کی دعا سکھائی، اس کے آخر میں یہ الفاظ تھے: ((وَنَبِيِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ)) ... انہوں نے یہ دعا یاد کرنے کے بعد آپ کو سنائی تو بایں الفاظ اسے پڑھا ((وَرَسُوْلِکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ))......یعنی انہوں نے ''نبیک'' کی بجائے ''رسولک'' پڑھ دیا۔ رسول اللہ e نے فرمایا کہ ''اسی طرح پڑھو جس طرح میں نے تعلیم دی تھی۔'' یعنی ((وَنَبِيِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ)) ... پڑھو۔ 1

سوال میں ذکر کردہ دعا کے متعلق ہم نے اکثر علماء کرام سے سنا کہ وہ تعزیت کرتے وقت دعا کے آخر میں فلتصبر ولتحتسب کے الفاظ بھی پڑھتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ e کی صاحبزادی کا بیٹا نزع کی حالت میں تھا، انہوں نے رسول اللہ e کو تشریف لانے کے لیے پیغام بھیجا تو رسول اللہ e نے جواباً پیغام بھیجا کہ ''اللہ ہی کا تھا جو اس نے لے لیا اور اسی کا ہے جو اس نے دیا اور ہر چیز ایک مقررہ مدت کے لیے ہے۔'' ......''بیٹی کو چاہیے کہ وہ صبر کرے اور ثواب کی امید رکھے۔'' 2

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آخری الفاظ دعا کا حصہ نہیں بلکہ صبر کرنے اور ثواب کی امید رکھنے کی تلقین ہے اور یہ الفاظ واحد مؤنث کا صیغہ ہیں، مذکر حاضر کا صیغہ نہیں کہ مخاطب کو ان الفاظ سے صبر کرنے اور ثواب کی امید رکھنے کی تلقین کی جائے۔

بہر حال تعزیت کی دعا صرف حسب ذیل ہے:

''اِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ وَلَہٗ مَا اَعْطٰی، وَکُلُّ شَیْ ءٍ عِنْدَہٗ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّى'' (واللہ اعلم)

عورتوں کا قبرستان جانا

] ہمارے خطیب نے دوران جمعہ یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ عورتیں قبرستان میں نہ جائیں بلکہ رسول اللہ e نے ایسی عورتوں پر لعنت کی ہے جو قبرستان جاتی ہیں، اس کے متعلق راہنمائی کریں کہ واقعی عورتیں قبرستان نہیں جاسکتیں؟

[رسول اللہ e نے مدنی زندگی کے آغاز میں مرد و عورت دونوں کو زیارت قبور سے منع فرمایا تھا تاکہ شرک کی طرف ذہن متوجہ ہی نہ ہو، لیکن جب توحید کا چرچا عام ہو گیا اور مسلمانوں کے ذہن شرک سے بیزار ہو گئے تو آپ نے قبروں پر جانے کی اجازت دے دی اور فرمایا:

''میں نے تمہیں زیارت قبور سے منع کیا تھا، اب تم ان کی زیارت کیا کرو کیوں کہ ان کی زیارت کرنے میں سامان عبرت ہے۔'' 3

جب قبرستان جانے کی ممانعت تھی تو اس وقت عورتوں کے متعلق بطور خاص حکم دیا کہ ان کے لیے قبروں کی زیارت کرنا

! بخاری، الوضوء: ۲۴۷۔ @ بخاری، التوحید: ۷۳۷۷۔

مسند امام احمد: ج۳، ص۳۸۔

باعث لعنت ہے۔ چنانچہ سیدنا ابن عباس w سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔ 1

جب رسول اللہ e نے قبرستان جانے کی اجازت دی تو یہ اجازت مردوں اور عورتوں تمام کے لیے تھی۔

چنانچہ سیدہ عائشہ r سے روایت ہے، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! زیارت قبر کے موقع پر کیسے دعا کروں تو رسول اللہ e نے انہیں اس معروف دعا کی تعلیم دی جو قبرستان کی زیارت کے موقع پر پڑھی جاتی ہے۔ 2

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورتیں بھی قبرستان کی زیارت کر سکتی ہیں، تاہم عورتوں میں صبر وضبط بھی کم ہوتا ہے اس لیے یہ اجازت دو شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔

☆ کبھی کبھار جائیں، ہر روز زیارت سے اجتناب کریں۔

☆ ٹولیوں کی شکل میں نہ جائیں۔

چنانچہ ایک روایت میں اس کی وضاحت ہے کہ رسول اللہ e نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو کثرت سے قبرستان جاتی ہیں۔ 3

آخری آرام گاہ

] قبرستان میں قبر پر جو کتبے لگے ہوتے ہیں، ان پر آخری آرام گاہ لکھا ہوتا ہے، کیا قبر واقعی انسان کے لیے آخری آرام گاہ ہے؟ کیا اس طرح کے الفاظ لکھنے یا کہنے جائز ہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں اس لیے بھیجا ہے کہ وہ اپنے رب کی عبادت کر کے آخرت کی کامیابی حاصل کرے، انسان اپنی حیات مستعار کے دن پورے کر کے بالآخر عالم آخرت کو سدھار جاتا ہے۔ سفر آخرت کی پہلی منزل قبر ہے جسے عامۃ الناس آخری آرام گاہ سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ یہ آخری نہیں بلکہ منزل مقصود کا پہلا نشان منزل ہے۔ البتہ اس میں انسان کو اپنی کامیابی یا ناکامی کا پتہ چل جاتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’قبر، جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے، یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔‘‘ 4

قبر کے آرام گاہ ہونے کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے ہمیں تو اس کے احکام کی بجا آوری کرنا ہے۔ جو انسان اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے دین کو قبول کر کے اُسے خود پر نافذ کرتا ہے۔ اس کے متعلق امید کی جا سکتی ہے کہ قبر اس کے لیے آرام گاہ ہو لیکن پورے وثوق سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ واقعی اس کے لیے آرام گاہ ہی ہے۔ قبر کے بعد جنت تک پہنچنے کے لیے مزید منازل

! ابوداؤد، الجنائز: ٣٢٣٦۔ @ صحیح مسلم، الجنائز: ٢٢٥٦۔

مسند امام احمد: ج٢، ص٣٣٦۔ $ ترمذی، القیامہ: ٢٤٦٠۔

بھی ہیں۔ ان میں میدان محشر، پل صراط، اعمال کے وزن، پھر دائیں یا بائیں ہاتھ سے اعمال نامے وصول کرنا ہیں۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد پھر جنت اس کی آخری آرام گاہ یا جہنم اس کی آلام گاہ ہوگی۔ مرنے کے بعد یہ کہنا کہ انسان اپنی آخری آرام گاہ میں پہنچ گیا ہے درست نہیں، کیوں کہ قبر کو آخری جگہ قرار دینا بعثت، حشر ونشر اور دیگر مراحل کا انکار کرنا ہے۔ یہ بات تو عام مسلمانوں کو بھی معلوم ہے کہ قبر انسان کے لیے آخری مقام نہیں اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ قبر ہی کو آخری ٹھکانہ خیال کرتے ہیں۔ ایک مسلمان کو اس قسم کے الفاظ سے اجتناب کرنا چاہیے، جن سے انکار آخرت کی بو آتی ہو۔ واللہ اعلم

مسلمان کو عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کرنا

] ہم ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں عیسائیوں کی حکومت ہے، وہاں ان کے اپنے قبرستان ہیں، جب ہمارا کوئی آدمی فوت ہو جاتا ہے تو ہم اسے عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، ایسے حالات میں ہمارے اس عمل کی کیا شرعی حیثیت ہے؟

[جب کوئی مسلمان فوت ہوتا ہے تو اس کے چند ایسے حقوق ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ خاص ہیں، مثلاً:

- ☆ مسلمان میت کو ایک خاص طریقہ سے غسل دینا
- ☆ ایک خاص انداز سے اسے کفن پہنانا
- ☆ اس کی نماز جنازہ پڑھنا
- ☆ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا
- ☆ دفن کرتے وقت اس کا چہرہ قبلہ رخ کرنا وغیرہ

دیار غیر میں رہنے والے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمان میت سے متعلقہ حقوق کی ذمہ داری اٹھائیں، وہ کوشش کر کے اپنا الگ قبرستان بنائیں، اس کے حصول کے لیے باہمی تعاون کریں، کیوں کہ خاص قبرستان سے ہی ان کا تشخص قائم رہ سکتا ہے۔ اگر مسلمان الگ قبرستان بنانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور مالی اعتبار سے انتہائی کمزور ہیں یا وہاں کا قانون اس کے حصول میں رکاوٹ کا باعث ہے تو انہیں چاہیے کہ عیسائیوں کے قبرستان میں ہی ایک حصہ مخصوص کر لیا جائے جہاں وہ اسلامی طریقے کے مطابق اپنے مردوں کو دفن کر سکیں، اگر مسلمان اتنے ہی کمزور ہیں کہ اپنا خاص قبرستان نہیں بنا سکتے یا عیسائیوں کے قبرستان میں اپنے مردوں کے لیے کوئی حصہ مخصوص نہیں کر سکتے تو عیسائیوں کے قبرستان میں جہاں بھی جگہ ملے وہاں میت کو دفن کر دیا جائے کیوں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ 1

''اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

امید ہے کہ ایسے حالات میں اگر کسی مسلمان کو عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا تو اسے کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ کیوں کہ مسلمان کی اخروی نجات کا دارومدار اس کا عقیدہ اور اخلاق و کردار ہے، اس کے مقام تدفین کے بجائے اس کا نیک عمل اسے نفع پہنچائے گا۔

واضح رہے کہ اگر میت کے ورثاء اسے اپنے ملک لے جا سکتے ہیں تو لے جائیں، بصورت دیگر اسے وہیں دفن کر دیا جائے کیوں کہ شریعت کا بھی مسئلہ ہے کہ آدمی جہاں فوت ہوا سے وہیں دفن کر دیا جائے، وہاں اگر اس ملک میں کہیں بھی مسلمانوں کا قبرستان ہے تو انہیں وہاں دفن کرنا چاہیے، دور ہونے کی بناء پر اسے عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کر دینا درست نہیں ہو گا۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسے حالات سے دوچار نہ کرے کہ وہ اپنے مردوں کو عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ آمین!

مدفون آدمی کا دوسروں کو پہچاننا

] جب آدمی کو قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو کیا قبر کی زیارت کرنے والوں کو وہ پہچان لیتا ہے کہ فلاں شخص میری قبر پر کھڑا دعا کر رہا ہے؟ وضاحت کریں۔

[مرنے کے بعد قبر میں دفن ہونے سے لے کر قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے تک عالم برزخ ہے، اس کے متعلق اپنی طرف سے کوئی بات کہنا انتہائی خطرناک اقدام ہے۔ عالم برزخ کے متعلق جو کچھ کتاب وسنت میں ہے، اسی پر اکتفاء کیا جائے اور اس پر ایمان لایا جائے، کتاب وسنت میں اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں۔

کچھ لوگوں نے ایسی احادیث بنا رکھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کسی واقف شخص کو جب وہ قبر پر آتا ہے تو پہچان لیتی ہے، لیکن ایسی احادیث کی شرعی طور پر کوئی حیثیت نہیں۔

قرآن وحدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ میت کو کوئی احساس نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی روح قبر میں موجود ہوتی ہے۔

﴿وَمِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴾ 2

''اب مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ حائل ہے جو دوبارہ زندہ ہونے تک پڑا رہے گا۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ فوت ہونے والوں اور اہل دنیا کے درمیان ایک مضبوط آڑ اور پردہ حائل ہے جو قیامت کے دن تک قائم رہے گا۔ اگر مرنے والا، مرنے کے بعد بھی قبر پر آنے والوں کو دیکھتا ہے اور انہیں پہچانتا ہے یا ان کی آمد محسوس کرتا

! البقرہ:۲۸۶۔ @ المؤمنون:۱۰۰۔

ہے اوران کی آواز سنتا ہے تو پھر اس کا تعلق دنیا سے ختم نہیں ہوا اور نہ ہی اس کے اور دنیا کے درمیان کوئی پردہ حائل ہوا ہے۔ یہ تو قرآن کریم کی بیان کردہ حقیقت کے صریح خلاف ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَآ اَنۡتَ بِمُسۡمِعٍ مَّنۡ فِى الۡقُبُوۡرِ﴾ 1

''آپ ان اہل قبور کو اپنی آواز نہیں سنا سکتے۔''

ان دلائل کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ جب بھی کوئی قبر پر آتا ہے تو میت اسے پہچان لیتی ہے، اور اسے اس کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے، بالکل غلط اور کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ (واللہ اعلم)

خواب میں فوت شدہ کو بری حالت میں دیکھنا

] میرا چچا فوت ہوا، میں نے اسے خواب میں دیکھا کہ وہ خون آلود ہے، اس خواب کے بعد میں بہت پریشان رہتا ہوں، براہ کرم بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

[خواب میں کسی فوت شدہ آدمی کو اچھی یا بری حالت میں دیکھا جا سکتا ہے، اگر فوت شدہ کو بری حالت میں دیکھا جائے تو یہ شیاطین کی طرف سے مثالی چیزیں ہیں چونکہ شیطان کسی شخص کی مثال برے انداز میں پیش کر سکتا ہے تاکہ زندہ آدمی غمگین اور پریشان ہو۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

خواب تین طرح کے ہوتے ہیں:

☆ اچھا خواب اللہ کی طرف سے بشارت ہوتی ہے۔

☆ برا خواب شیطان کی طرف سے غمگین کرنے والا ہوتا ہے۔

☆ کچھ خواب بندے کے اپنے اوہام وخیالات ہوتے ہیں۔

جب کوئی خواب میں ناپسندیدہ چیز دیکھے تو اٹھ کھڑا ہو، نماز پڑھے اور اسے لوگوں میں بیان نہ کرے۔ 2

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور برا خواب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے، جب تم میں سے کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے تو اسے چاہیے کہ اپنی بائیں جانب تین بار تھوکے پھر اس کے شر سے اللہ عزوجل کی پناہ مانگے بلاشبہ وہ اسے نقصان نہیں دے گا۔'' 3

ایک تیسری حدیث میں ہے کہ برا خواب دیکھنے کی صورت میں اپنی کروٹ کو بدل لیا جائے۔ 4

! فاطر:۲۲.

@ بخاری، الادب:۵۰۱۹.

بخاری، الرؤیا:۶۹۸۴.

$ ابو داؤد، الادب:۵۰۲۲.

ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ انسان جب کوئی برا خواب دیکھے تو اسے چار کام کرنے چاہئیں۔

۱: تین دفعہ بائیں جانب تھوتھو کرے۔

۲: تین مرتبہ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھے۔

۳: اٹھ کر نماز پڑھنا شروع کردے۔

۴: اپنی کروٹ بدل کر لیٹ جائے۔

صورت مسئولہ میں سائل نے اپنے چچا کو بری حالت میں دیکھا ہے، یہ خواب شیطان کی طرف سے ہے۔ اس میں قطعاً یہ اشارہ نہیں کہ چچا کو اللہ عزوجل کے ہاں عذاب ہو رہا ہو، یا اسے کوئی سزا دی جا رہی ہے بلکہ یہ خواب شیطانی ہے۔ سائل کو چاہیے کہ ایسے خواب دیکھنے کے موقع پر درج بالا امور کو عمل میں لایا جائے۔ (واللہ اعلم)

مقروض کا جنازہ

] ہمارے ہاں ایک آدمی فوت ہوا جو انتہائی مقروض تھا، امام مسجد نے اس کا جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا، کیا مقروض کا جنازہ نہیں پڑھنا چاہیے؟

[شروع اسلام میں ایسا ہی تھا کہ اگر مقروض، اپنے قرض کی ادائیگی کے لیے کچھ چھوڑ کر نہیں گیا تو اس کا جنازہ نہیں پڑھا جاتا تھا، لیکن اسلامی حکومت مستحکم ہوگئی تو رسول اللہ e نے فرمایا:

''جو شخص قرض چھوڑ جائے یا اولاد چھوڑ جائے تو وہ میرے پاس آئیں، میں ان کا سرپرست ہوں۔'' 1

مقروض، مسلمان ہے تو اس کا قرض ادا کرنا اسلامی حکمران کے ذمے ہے، وہ بیت المال سے ادا کرے، چونکہ وہ مسلمان ہے، اس لیے اس کا جنازہ پڑھنا چاہیے۔ صورت مسئولہ میں امام مسجد کا موقف مبنی برحقیقت نہیں۔ (واللہ اعلم)

تعزیت اور اس کے آداب

] ہمارے معاشرے میں تعزیت کے متعلق بہت سی رسومات ایسی ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، کتاب و سنت کی روشنی میں تعزیت سے متعلق آگاہ کریں کہ اس کے کیا آداب ہیں؟

[تعزیت کا لغوی معنی تسلی دینا ہے۔

اصطلاحی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ مصیبت زدہ یا میت کے اقارب سے اظہار افسوس کرنا، انہیں تسلی دینا، صبر کی تلقین کرنا اور ایسی باتیں کرنا جن سے ان کا غم ہلکا ہو۔ اس کے علاوہ میت کے لیے دعا کرنا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ تعزیت

---

1 بخاری، الاستقراض: ۲۳۹۹.

کرنا مومن سے ہمدردی کا اظہار ہے اور مومن سے ہمدردی جزو ایمان ہے، اس کے متعلق رسول اللہ e کا ارشاد ہے کہ ’’جو مومن اپنے بھائی کو کسی مصیبت پر تسلی دیتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے عزت افزائی کا لباس پہنائیں گے۔‘‘ 1

محققین حدیث نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے، چنانچہ محدث العصر علامہ البانی a نے اس حدیث کو احادیث صحیحہ میں نقل کیا ہے۔ 2

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

’’جو شخص کسی مصیبت زدہ کو تسلی دے اسے قیامت کے دن مصیبت زدہ کے برابر ثواب ملے گا۔‘‘ 3

رسول اللہ e نے اپنی لخت جگر سے بایں الفاظ تعزیت کی تھی:

’’اللہ ہی کے لیے تھا جو اس نے لے لیا اور اسی کا ہے جو اس نے دے رکھا ہے، اس کے ہاں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے لہٰذا صبر کر کے اس کا اجر و ثواب لینا چاہیے۔‘‘ 4

مختلف احادیث کے پیش نظر تعزیت کے درج ذیل آداب ہیں:

☆ اہل میت سے ہمدردی کرتے ہوئے ان کے لیے دعا خیر کی جائے اور انہیں صبر کی تلقین کرنا چاہیے۔
☆ گھر والوں کی ہر ممکن مدد کی جائے، ان کے لیے وقت اور مال کی قربانی دی جائے۔
☆ تعزیت کے لیے مناسب وقت کا انتخاب اور محدود مدت کے لیے ان کے ہاں ٹھہرا جائے۔
☆ کھانے پینے کے اوقات میں ان کے ہاں جانے سے پرہیز کیا جائے تاکہ وہ خواہ مخواہ تکلف میں نہ پڑیں۔
☆ وہاں بیٹھ کر لغو گفتگو نہ کی جائے اور سنت کے مطابق ان کے غم میں شریک ہو کر میت کے لیے دعا مغفرت کی جائے۔
☆ مروجہ طریقہ تعزیت سے گریز کریں جیسا کہ آنے والا ’’فاتحہ‘‘ کہہ کر اپنی حاضری لگواتا ہے۔
☆ وہاں فارغ نہ بیٹھیں بلکہ ذکر اور دعا و استغفار میں خود کو مصروف رکھیں۔

قبر پر پھول کی پتیاں بکھیرنا

] جب ہم قبرستان جاتے ہیں تو وہاں قبروں پر گلاب کے پھول کی پتیاں بکھری ہوتی ہیں، نیز ان کے آس پاس چاول اور مسور کی دال بھی ڈالی ہوتی ہے، ایسا کیوں کیا جاتا ہے، کیا اس سے میت کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے؟

[جب انسان دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اس کے ہر قسم کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، پھولوں کی پتیاں بکھیرنے کا مقصد صرف میت کو نفع پہنچانا ہے تو ایسا کرنا ایک فضول حرکت ہے اور قبر پر یا اس کے ارد گرد دال اور چاول ڈالنا

! ابن ماجه، الجنائز:۱۶۰۱. @ سلسلة الاحاديث الصحيحه:۱۹۵.
ترمذی، الجنائز:۱۰۳۷. $ بخاری، الجنائز:۱۲۸۴.

بھی اسی قبیل سے ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق میت کے عزیز جب پھول کی پتیاں بکھیر تے ہیں، تو اس سے مقصود محض اپنے جذبات کا اظہار ہے کہ ہمیں میت سے بہت محبت ہے، اگر واقعی ایسا ہے تو انہیں وہ کام کرنے چاہیے جن سے میت کو فائدہ پہنچتا ہو، محض جذبات کا اظہار کافی نہیں۔ ویسے بھی رسول اللہ e نے اس طرح مال کو ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

جیسا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے مال کو ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔ 1

حضرت عبداللہ بن عمر w نے حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر t کی قبر پر خیمہ نصب دیکھا تو وہاں مامور غلام سے کہا کہ اسے اکھاڑ دو، میت کو اس کے اعمال کا سایہ ہوگا۔ 2

صحابہ کرام y اس بات سے آگاہ تھے کہ مرنے کے بعد اس طرح کے ظاہری اعمال میت کو کوئی فائدہ نہیں دیتے، انسان کو اپنا ذاتی کردار ہی فائدہ دے سکتا ہے۔ البتہ رسول اللہ e نے چند کاموں کی نشاندہی ضرور کی ہے جو مرنے کے بعد میت کے لیے سودمند ہو سکتے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

☆ میت کے لیے دعا کرنا جبکہ اس میں شرائط قبولیت موجود ہوں۔

☆ صالح اولاد جو بھی نیک اعمال سرانجام دے۔

☆ صدقہ جاریہ اور اس کے اچھے اثرات۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

’’جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو تین اعمال کے سوا اس کے تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں، وہ تین اعمال یہ ہیں:

۱۔صدقہ جاریہ، ۲۔ایسا علم جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہوں، ۳۔نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہے۔‘‘ 3

اس لیے اہل میت کو چاہیے کہ وہ قبرستان میں پھولوں کی پتیاں اور دال وغیرہ ڈالنے کے بجائے کسی غریب کو سہارا دیں، اس کی ضروریات کا بندوبست کریں اور میت کے نام سے صدقہ وخیرات کریں، فضول کاموں میں اپنا مال ضائع نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس عمل کی قدر وقیمت ہے جس پر رسول اللہ e کی طرف سے مہر تصدیق ثبت ہو۔ (واللہ اعلم)

میت کو ایک ملک سے دوسرے ملک لانا

] میرے بھائی کی وفات سعودیہ میں ہوئی تھی، ہم نے اسے پاکستان لا کر دفن کر دیا، اب کچھ اہل علم کی طرف سے کہا جا رہا ہے، کہ ہم نے یہ ناجائز کیا ہے۔ قرآن وسنت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ آپ شریعت کی رو سے اس مسئلہ کی وضاحت کر دیں۔

! بخاری،الادب:۵۹۷۵. @ صحیح بخاری، الجنائز، باب:۸۱.

مسند امام احمد، ص۳۷۲:ج۲.

[میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پر منتقل کرنے کا مسئلہ نیا نہیں بلکہ پہلے وقت میں بھی موجود تھا۔ باوجود اس کے کہ اس وقت وسائل نقل وحرکت اتنے ترقی یافتہ اور تیز رفتار نہ تھے، تاہم اس کے متعلق علمائے امت میں اختلاف ہے۔ البتہ درج ذیل دو صورتوں میں میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا بالاتفاق جائز نہیں اور ان میں کسی کو اختلاف نہیں۔

☆ شہداء معرکہ جہاں شہید ہوں انہیں دوسری جگہ منتقل کرنے کی بجائے وہیں دفن کر دیا جائے۔ جیسا کہ شہداء احد کو مدینہ طیبہ لایا گیا تو رسول اللہ e نے حکم دیا کہ انہیں میدان احد میں ہی دفن کیا جائے۔ 1

اگر اس جگہ دشمن کا قبضہ ہو تو انہیں کسی قریبی جگہ بھی دفن کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال انہیں عام آبادی میں لے جانے کی ممانعت ہے، ویسے بھی اسلام عمومی طور پر میت کی منتقلی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔

☆ میت کو دوسری جگہ منتقل کرنے سے اس کی بے حرمتی ہوتی ہو یا اس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو بھی انسان جہاں فوت ہوا اسے وہیں دفن کر دیا جائے۔

درج ذیل صورت میں اسے دوسری جگہ منتقل کرنا ضروری ہوتا ہے: اگر کسی جگہ دفن کرنے سے میت کی بے حرمتی کا اندیشہ ہو یا خطرہ ہو کہ کفار اس کی لاش کو جلا دیں گے تو ایسے حالات میں اسے دوسری جگہ لے جا کر دفن کرنے میں کسی کو اختلاف نہیں۔

مذکورہ بالا صورتوں کے علاوہ بعض حضرات وصیت کر جاتے ہیں کہ مجھے اپنے ملک میں دفن کیا جائے کیوں کہ وہاں اس کے عزیز واقارب ہیں یا حصول برکت کے لیے مقامات مقدسہ۔ (مدینہ طیبہ، مکہ مکرمہ یا بیت المقدس) میں دفن ہونے کی وصیت کرتا ہے یا وہ خود کوئی وصیت نہیں کرتا، بلکہ اس کے خویش واقارب چاہتے ہیں کہ اسے ہمارے پاس دفن کیا جائے تو کیا ایسے حالات میں میت کی وصیت یا عزیز واقارب کی خواہش کو پورا کیا جا سکتا ہے؟

اس کے متعلق اختلاف ہے، کچھ اہل علم جواز کے قائل ہیں جبکہ بعض کے ہاں تفصیل ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق دو صورتوں میں میت کی دوسری جگہ منتقلی جائز ہے:

☆ جب مسافت کم ہو اور میت کو منتقل کرنا آسان ہو تو جائز ہے۔ جیسا کہ سیدنا سعد بن ابی وقاص t جب فوت ہوئے تو ان کی میت کو وادی عقیق سے مدینہ طیبہ لایا گیا تھا اور وادی عتیق مدینہ طیبہ سے دس میل کے فاصلے پر تھی۔ 2

سیدنا موسیٰ u کی موت کا وقت قریب ہوا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ انہیں ارض مقدس میں پتھر پھینکنے کی مسافت پر قریب کر دیا جائے۔ 3

امام بخاری a نے اس حدیث پر عنوان قائم کیا ہے: ''جوارض مقدس میں دفن ہونے کی خواہش کرتا ہے۔''

☆ اگر کوئی شخص غیر اسلامی ملک میں فوت ہوا ہو اور اس کے خویش واقارب کی خواہش پر اسے اپنے ملک لا کر دفن کرنے میں

! نسائی، الجنائز:۲۰۰۵۔ @ بیہقی، ج۴،ص۵۷۔
بخاری ، الجنائز:۱۳۳۹۔

چنداں حرج نہیں۔ جیسا کہ سیدنا عمر t نے رسول اللہ e کے پہلو میں دفن ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ 1
اس سے بعض اہل علم نے یہ مسئلہ ثابت کیا ہے کہ اگر کوئی اپنے خویش و اقارب میں دفن ہونے کی وصیت کرتا ہے تو ایسا کرنا جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔
اس کے علاوہ صورتوں میں میت کو دوسری جگہ منتقل کرنا محل نظر ہے۔
جیسا کہ سیدنا عبد الرحمن بن ابی بکر t جب مکہ سے دور حبشی مقام پر فوت ہوئے تو انہیں مکہ میں دفن کیا گیا، سیدہ عائشہ r نے فرمایا:
''اگر میں وفات کے وقت وہاں موجود ہوتی تو انہیں وہاں ہی دفن کر دیا جاتا، انہیں مکہ نہ لایا جاتا۔'' 2
نیز رسول اللہ e کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جہاں کوئی فوت ہوتا اسے وہیں دفن کر دیا جاتا تھا۔ مدینہ طیبہ اور مکہ مکرمہ سے باہر فوت ہونے والوں کو مقدس مقامات (مدینہ اور مکہ) میں دفن کرنا ثابت نہیں، علاوہ ازیں میت کو جلدی دفن کرنے کا حکم ہے، میت کی منتقلی، اس حکم کی تعمیل میں رکاوٹ کا باعث ہے پھر اس پر جو مالی اخراجات آتے ہیں وہ اس پر مستزاد ہے۔ واللہ اعلم!

قبرستان میں مسجد بنانا

] قبرستان میں مسجد بنانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر پرانی قبروں کو نیست و نابود کر کے مسجد بنائی جائے تو کیا وہاں نماز پڑھی جا سکتی ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔
[رسول اللہ e نے نفلی نماز ادا کرنے کے متعلق حکم دیا ہے کہ اسے اپنے گھروں میں پڑھا کرو اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔'' 3
اس حدیث کا واضح مطلب یہ ہے کہ قبرستان نماز پڑھنے کی جگہ نہیں ہے، جب قبرستان میں نماز نہیں پڑھی جا سکتی تو وہاں مسجد بنانا کیونکر جائز ہو سکتا ہے، اس امر کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے۔
رسول اللہ e نے فرمایا: ''زمین، تمام کی تمام مسجد ہے، سوائے حمام اور مقبرہ کے۔'' 4
اس حدیث کا مطلب ہے کہ قبرستان میں مسجد نہیں بنائی جا سکتی، قبرستان میں قبر کے آس پاس نماز پڑھنے کا معاملہ بہت حساس ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ e نے کسی بزرگ یا نبی کی قبر کے پاس مسجد بنانے سے منع کیا ہے۔ مبادا لوگ یہ خیال کریں کہ مدفون ہستی کی برکات اور اس کے فیوض کی بناء پر یہاں نماز پڑھنا افضل ہے اور یہ بات شرک کے لیے ایک چور دروازہ کھولتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

! بخاری، الفضائل: ۲۷۰۰۔ @ ترمذی، الجنائز: ۱۰۵۵۔
نسائی، قیام اللیل: ۱۵۹۹۔ $ ابو داؤد، الصلوٰۃ: ۴۹۲۔

”اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر انہوں نے اپنے انبیاء o کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔“ 1

علامہ البانی a فرماتے ہیں کہ قبروں کو مسجدیں بنانے میں تین امور شامل ہیں۔

۱۔ قبروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا۔

۲۔ قبروں پر سجدے کرنا۔

۳۔ قبروں پر مساجد تعمیر کرنا۔ 2

اس بناء پر ہمارے رجحان کے مطابق قبرستان میں مسجد تعمیر کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، اگر کوئی قبرستان میں مسجد بناتا ہے تو اس کا حکم قبر جیسا ہی ہے۔

چنانچہ حضرت قتادہ سیدنا انس t سے بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ قبرستان کے پاس سے گزرے تو لوگ اس میں مسجد تعمیر کر رہے تھے، انہیں دیکھ کر حضرت انس t نے فرمایا:

”قبروں کے درمیان مسجد بنانا ناپسند کیا جاتا تھا۔“ 3

ہاں اگر قبرستان پرانا ہو چکا ہو اور وہاں دفن کرنے کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہو اور وہ قبرستان بھی غیر مسلم لوگوں کا ہو تو وہاں قبروں کو سطح زمین کے برابر کرے وہاں مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ e جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو مدینہ طیبہ کے ایک پرانے قبرستان کو ہموار کر کے مسجد نبوی تعمیر کی تھی۔ 4

امام بخاری a نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:

”کیا مشرکین کی قبروں کو ہموار کر کے وہاں مسجد بنائی جا سکتی ہے۔“ 5

لیکن مسلمانوں کے قبرستان میں یہ کام نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ ان کی قبریں اعزاز و تکریم کی حق دار ہیں، انہیں اکھاڑنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے، بعض لوگ مسجد نبوی میں موجود قبور ثلاثہ سے دلیل لیتے ہیں کہ قبرستان میں مسجد بنائی جا سکتی ہے لیکن یہ دلیل اس لیے بے کار ہے کہ قبور ثلاثہ سے پہلے وہاں مسجد موجود تھی اور یہ تینوں قبریں سیدہ عائشہ r کے حجرہ میں ہیں جو مسجد نبوی سے باہر تھا، ان تینوں قبروں کو مسجد میں شامل کرنے کا حکم نہ اللہ تعالیٰ نے دیا نہ اس کے رسول e نے اور نہ ہی صحابہ کرام t نے اس کے متعلق کوئی اشارہ دیا۔ اسے خیر القرون کے بعد مسجد نبوی میں شامل کیا گیا اس لیے یہ کام کسی شرعی مسئلہ کی

! بخاری، الصلوٰۃ:۴۳۵۔
@ احکام الجنائز،ص۲۷۹۔
# المغنی ص۴۷۵،ج۲۔
$ صحیح بخاری، الصلوٰۃ:۴۲۸۔
% بخاری، الصلوۃ، باب ۴۸۔

دلیل نہیں بن سکتا، ویسے بھی حضرت عائشہ کا حجرہ مبارکہ جس میں یہ تینوں قبریں موجود ہیں چاروں طرف سے بند ہے، وہاں جانا ممکن نہیں، اس طرح گویا انہیں مسجد سے الگ کر دیا گیا ہے۔

بہرحال قبرستان میں مسجد تعمیر کرنا اور تعمیر شدہ مسجد میں دو تین قبروں کا آجانا ان دونوں میں واضح فرق ہے، تعمیر شدہ مسجد میں بھی اگر قبر سامنے قبلے کی طرف ہو تو وہاں نماز پڑھنا درست نہیں، کیوں کہ رسول اللہ e نے قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔ 1

البتہ نماز جنازہ جس میں رکوع اور سجدہ نہیں ہوتا، اسے پڑھنے کی خصوصی اجازت ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے۔ (واللہ اعلم)

! صحیح مسلم، الجنائز:۹۷۲.

دنیاوی علوم سیکھنے والے کا مالی تعاون

] کیا دنیاوی علوم پڑھنے والے طالب علم کا مالی تعاون کیا جا سکتا ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

[دنیاوی علوم دوطرح کے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ ایسے علوم وفنون جو تمدن کی ترقی کے لیے ضروری ہیں، بلکہ اس کا حصہ ہیں، ایسے علوم میں غریب اور نادار طلبہ سے مالی تعاون کیا جاسکتا ہے۔

☆ ایسے علوم جو دین سے دوری کا باعث ہوں، جنہیں سیکھنے سے عقائد واعمال میں بگاڑ پیدا ہوتا ہو، ایسے علوم کا سیکھنا ناجائز ہے اور اس پر مالی تعاون بھی حرام ہے۔ واضح رہے کہ حق دار طلبہ کو ان کی غربت کی بناء پر مال زکوٰۃ بھی دیا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم

مشینری پر زکوٰۃ

] زکوٰۃ کے متعلق اسلام کا کیا ضابطہ ہے، کیا فیکٹری میں نصب شدہ آلات اور فرنیچر وغیرہ پر بھی زکوٰۃ لاگو ہے، یا صرف پیداوار سے زکوٰۃ دینا ہوتی ہے؟

[اسلام کا قانون یہ ہے کہ پیداوار پر زکوٰۃ ہوتی ہے، پیداوار کے ذرائع زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ جیسا کہ زمین سے اگنے والی زرعی پیداوار سے عشر دیا جاتا ہے، زمین کی قیمت پر زکوٰۃ لاگو نہیں ہوتی۔ اسی طرح دکان میں پڑا ہوا باردانہ یا فرنیچر پر بھی زکوٰۃ نہیں بلکہ اس میں موجود تجارتی سامان پر زکوٰۃ ہے۔ فیکٹری میں نصب شدہ مشینیں جو پیداوار کا ذریعہ ہیں خود بکاؤ مال نہیں ہوتا، وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوتی ہیں البتہ ان کی پیداوار پر زکوٰۃ ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا ارشاد ہے:

''پیداوار کا ذریعہ بننے والے جانوروں پر زکوٰۃ نہیں۔'' 1

اس حدیث میں اگرچہ جانوروں کا ذکر آیا ہے، تاہم یہ ایک عام اصول ہے کہ جو چیز پیداوار کا ذریعہ ہے وہ زکوٰۃ سے

! ابو داؤد، الزکوٰہ:۱۵۷۲.

مستثنیٰ ہے۔ اگر کسی نے پیداوار دینے والی مشینری برائے فروخت رکھی ہے تو اس کی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی کیوں کہ اب وہ تجارتی مال بن چکی ہے لہٰذا اس سے زکوٰۃ دی جائے گی۔ لیکن جب اسے پیداوار کے لیے نصب کیا جائے گا تو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا، اسی طرح دیگر اشیاء کا حکم ہے۔ (واللہ اعلم)

حق مہر کی زکوٰۃ

] میرے نکاح کے موقع پر دو لاکھ روپیہ حق مہر مقرر ہوا تھا، لیکن وہ مجھے ملا نہیں، البتہ میں اس سے مایوس نہیں ہوں، اس کی زکوٰۃ کے متعلق کیا حکم ہے؟ کیا میں نے اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہے یا میرے شوہر نے دینی ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق اس کی وضاحت فرما دیں۔

[حق مہر کی ادائیگی خاوند کے ذمے ضروری ہے، قرآن مجید میں ہے:

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ﴾ 1

''عورتوں کا حق مہر انہیں خوشی سے ادا کرو۔''

ہمارے ہاں حق مہر کی دو اقسام ہیں، ایک یہ ہے کہ اسے نکاح کے موقع پر ہی ادا کر دیا جائے، اسے مہر معجّل کہا جاتا ہے۔ دوسری یہ ہے کہ اسے آئندہ ادا کرنا ہوتا ہے اس کو مہر موجل کہتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں عورت اس کی مالک ہوتی ہے، اگر وہ حق مہر زکوٰۃ کے نصاب کے برابر ہے تو سال کے بعد اس سے زکوٰۃ کی ادائیگی عورت کے ذمے ہے بشرطیکہ وہ اس کی ضروریات سے زائد ہو۔ عورت کے حق مہر میں زکوٰۃ کے متعلق درج ذیل اصول ہیں:

☆ اگر عورت نے حق مہر وصول کر لیا ہے اور وہ نصاب کو پہنچ چکا ہے تو جب سال گزر جائے گا تو عورت اس سے چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرے گی۔

☆ اگر عورت نے حق مہر وصول نہیں کیا یعنی مہر موجل ہے تو اس کا حکم قرضے جیسا ہے۔ اگر اس کا خاوند صاحب حیثیت ہے اور اسے ادا کرنے کی پوزیشن میں ہے تو بھی سال کے بعد اس سے زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔ اگر وہ تنگ دست ہے اور جلدی وصول کرنے کی امید نہیں ہے تو جب وہ حق مہر وصول کرے گی تو اسے ایک سال کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔

☆ اگر اس نے حق مہر وصول کر لیا ہے اور اسے رخصتی سے پہلے طلاق مل گئی ہے تو اگر وہ نصاب کو پہنچ چکا ہے اور اس پر سال بھی گزر چکا ہے تو نصف حق مہر پر اسے زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی اور نصف مہر کی زکوٰۃ خاوند ادا کرے گا۔

صورت مسئولہ میں حق مہر دو لاکھ روپیہ ہے۔ درج بالا تفصیل کے مطابق اس سے زکوٰۃ یعنی پانچ ہزار کی ادائیگی عورت کے ذمے ہے۔ واللہ اعلم

---

1 النساء:۴.

ڈیری فارم پر زکوٰۃ

] لوگوں نے بھینسوں اور گائیوں کے فارم بنا رکھے ہیں، ان سے زکوٰۃ کیسے ادا ہوگی؟ زکوٰۃ کے لیے جانوروں کا حساب ہوگا یا ان کی پیداوار یعنی دودھ وغیرہ کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی؟ قرآن وحدیث کے مطابق وضاحت فرمائیں۔

[پالتو جانوروں کی چار اقسام حسب ذیل ہیں:

۱۔ وہ جانور جو سال کے اکثر حصہ میں باہر چرتے ہوں، ان کے لیے قیمتاً چارہ نہیں خرید اجاتا۔

ایسے جانوروں کی زکوٰۃ کے لیے تین شرائط ہیں:

الف: نصاب کو پہنچ جائیں۔

ب: ان پر سال گزر جائے۔

ج: وہ جنگلات میں چرنے والے ہوں۔

۲۔ جانور گھروں یا ڈیری فارم میں رکھے ہوتے ہیں، ان کے لیے چارہ خرید ا جاتا ہے، یا کاشت کیا جاتا ہے، وہ صرف دودھ یا افزائش نسل کے لیے رکھے جاتے ہیں، ایسے جانوروں کی پیداوار (دودھ) کی آمدن اگر نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر سال گزر جائے تو اس سے زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔

۳۔ وہ جانور جو کھیتی باڑی یا سواری کے لیے رکھے جاتے ہیں، ان میں زکوٰۃ نہیں ہوتی۔

۴۔ وہ جانور جو تجارت کے لیے رکھے جاتے ہیں، ان کی قیمت میں زکوٰۃ ہوگی، مثلاً ایک بھینس اگر لاکھ روپے کی ہے تو اس میں اڑھائی ہزار روپیہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا ہوگا۔

صورت مسئولہ میں اسی تفصیل کے مطابق اگر ڈیری فارم میں گائے بھینس صرف دودھ کے لیے رکھی گئی ہے تو ان کے دودھ کا حساب ہوگا، اس سے حاصل ہونے والی رقم اگر نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر سال گزر جائے تو اس سے زکوٰۃ ادا کرنا ہو گی۔ اس صورت میں بھینسوں اور گائیوں کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں اور اگر انہیں برائے فروخت رکھا گیا ہے یا انہیں گوشت کے لیے پالا گیا ہے یا بکریاں قربانی کے دنوں میں فروخت کے لیے رکھی گئی ہیں تو ان کی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی۔

ہمارے ہاں جو ڈیری فارم ہیں، ان میں جانور دودھ کے لیے رکھے جاتے ہیں، لہٰذا اس دودھ سے حاصل ہونے والی رقم نصاب کو پہنچ جائے تو اس سے چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

ہبہ میں قبضہ کرنا

] میں نے زبانی طور پر ایک قطعہ ارضی اپنی بیوی کو ہبہ کیا، لیکن اس کے نام لگوانے سے پہلے وہ فوت ہوگئی، اب وہ قطعہ ارضی کیسے تقسیم ہوگا؟ واضح رہے کہ مرحومہ کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں، کیا یہ قطعہ ارضی اس کے ترکہ میں شامل ہوگا؟

نیز اس کی ایک بہن اور ایک بھائی بھی زندہ ہیں۔

[جو چیز کسی کو ہبہ کی جائے وہ اس کے حوالے کرنا ضروری ہوتا ہے، تب ہبہ مکمل ہوتا ہے۔

جیسا کہ امام بخاری a نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''جب کسی نے کوئی چیز ہبہ کی اور دوسرے نے اس پر قبضہ کر لیا لیکن یہ نہیں کہا کہ میں نے اسے قبول کیا تو اس کا کیا حکم ہے۔'' 1``

اس کا مقصد یہ ہے کہ ہبہ میں قبضہ کر لینا ہی کافی ہے، زبان سے قبول کرنے کے الفاظ کہنا ضروری نہیں ہیں۔

جبکہ امام شافعی a طرفین سے ایجاب وقبول کو شرط قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح کچھ اہل علم کا موقف ہے کہ ہبہ کرنے والے کی طرف سے یہ کہنا ہی کافی ہے کہ میں نے فلاں چیز اسے ہبہ کی، اس سے ہبہ مکمل ہو جاتا ہے، اس پر قبضہ کرنا ضروری نہیں۔

امام بخاری a نے ان حضرات کی تردید کرتے ہوئے ہی یہ عنوان قائم کیا ہے۔ امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ ہبہ میں قبضہ ضروری ہے، صرف عقد سے ہبہ مکمل نہیں ہوتا۔ اسی طرح دوسرے شخص کو قبولیت کے الفاظ ادا کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، بہر حال ہبہ میں قبضہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

صورت مسئولہ میں سائل نے زبانی طور پر ایک قطعہ ارضی اپنی بیوی کو ہبہ کیا اور اس کے نام نہیں لگوایا اور وہ اس پر قبضہ کرنے سے پہلے فوت ہو گئی، لہٰذا وہ قطعہ ارضی کی مالکہ نہیں۔ بلکہ وہ بدستور سائل کی ملکیت ہے۔ وہ اس وقت تقسیم نہیں ہو گا کیوں کہ اس پر مرحومہ کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی۔ البتہ اس کی دیگر ذاتی اشیاء تقسیم ہوں گی، ان میں سے چوتھا حصہ خاوند کا ہے، کیوں کہ مرحومہ کی اولاد موجود ہے اور باقی تین حصے اس طرح تقسیم کیے جائیں کہ ایک لڑکے کو لڑکی سے دوگنا حصہ ملے۔ سہولت کے پیش نظر مرحومہ کی ذاتی جائیداد کے چالیس حصے کر لیے جائیں، ان میں سے دس حصے شوہر کو، چھ چھ حصے مرحومہ کے بیٹوں کو اور تین تین حصے مرحومہ کی بیٹیوں کو ملیں گے۔

میت/40

خاوند	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی	بیٹی	بیٹی
10	6	6	6	3	3	3	3

چونکہ مرحومہ کی اولاد موجود ہے، اس لیے بہن بھائیوں کو اس کی جائیداد سے کچھ بھی نہیں ملے گا، اور وہ محروم شمار ہوں گے۔ واللہ اعلم

! بخاری، الهبہ، باب: ٢٠.

قرض کو زکوٰۃ کی مد سے منہا کرنا

] میں ایک فیکٹری کا مالک ہوں، ماتحت عملہ مجھ سے قرض حسنہ لے لیتا ہے، پھر وہ اسے ادا نہیں کر پاتا، جب میں نے زکوٰۃ ادا کرنا ہوتی ہے، تو زکوٰۃ کی مد میں اس قرض کو منہا کر دیتا ہوں، جبکہ وہ زکوٰۃ کا حق دار بھی ہوتا ہے۔ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

[کسی کو قرض دینا بہت بڑا ثواب ہے، لیکن اگر کوئی مقروض تنگ دست ہے تو اسے ادائیگی تک کے لیے مزید مہلت دینا بھی کارِ ثواب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے؛

﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾ 1

''اگر کوئی تنگی والا ہے تو اسے کشادگی تک مہلت دینی چاہیے۔''

رسول اللہ e نے اس کی بہت فضیلت بیان کی ہے، سیدنا عمران بن حصین t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''کسی کا دوسرے انسان پر حق ہو اور حق لینے والا اسے مہلت دے تو ہر روز کے بدلے اسے صدقہ کا ثواب ملے گا۔'' 2

بنی اسرائیل کا ایک مال دار تاجر آدمی لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا، اگر کسی کو تنگ دست دیکھتا تو اپنے خدام سے کہتا کہ اس سے درگزر کرو، شاید اللہ تعالیٰ اس کے بدلے ہم سے درگزر کرے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس سے درگزر فرمایا۔ 3

اگر مقروض کو قرض معاف کر دیا جائے تو قرآن کریم نے اس کی بہت ترغیب دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ 4

''اور صدقہ کرو تو تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہے اگر تمہیں علم ہو۔''

زمانہ جاہلیت میں قرض کی ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں سود در سود میں اضافہ ہوتا جاتا، جس سے وہ تھوڑی رقم بھی پہاڑ بن جاتی اور اس کی ادائیگی ناممکن ہو جاتی۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اگر کوئی تنگ دست ہے تو اسے کشادگی تک مہلت دی جائے اور اگر قرض بالکل ہی معاف کر دیا جائے تو بہت ہی بہتر ہے۔

جیسا کہ حدیث میں اس کی بہت فضیلت آئی ہے:

''جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کی تکالیف سے نجات دے تو وہ تنگ دست کو مہلت دے یا اسے قرض معاف کر دے۔'' 5

صورت مسئولہ میں زکوٰۃ کی مد میں قرض معاف کر دینے والی بات ایک سودا بازی ہے اور اپنی رقم نکلوانے کا ایک بہانہ ہے۔ مال دار آدمی نے تو زکوٰۃ کی مد سے اپنا قرض وصول کر لیا ہے، اس نے کون سا مقروض پر احسان کیا ہے۔ پھر زکوٰۃ ایک

! البقرہ: ۲۸۰.
@ مسند امام احمد: ج۴، ص۴۴۲.
# بخاری، البیوع: ۲۰۷۸.
$ البقرہ: ۲۸۰.
% مسلم، المساقاۃ: ۴۰۰۰.

عبادت ہے، اور عبادات میں نیت شرط ہوتی ہے، جس وقت مقروض کو رقم دی گئی تھی اس وقت زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت نہ تھی۔ اس لیے اگر قرض کو زکوٰۃ کی مد سے معاف کیا جائے، تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ بہتر ہے کہ اسے قرض معاف کر دیا جائے یا پھر اسے زکوٰۃ دے کر اپنے قرض کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کو زکوٰۃ دیئے بغیر خود ہی زکوٰۃ کی مد سے رقم رکھ لینا انتہائی محل نظر ہے۔ واللہ اعلم

صدقۃ الفطر کے لیے بیت المال

] ہماری مسجد میں ایک بیت المال قائم کیا گیا ہے جس میں فطرانہ اور چرمہائے قربانی کو جمع کیا جاتا ہے، پھر اس سے مسجد کے امام اور خطیب کی تنخواہ دی جاتی ہے، اس قسم کے بیت المال کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

[لغوی اعتبار سے ہر اس گھر کو بیت المال کہا جاتا ہے کہ جو کسی بھی قسم کے مال کی حفاظت کے لیے تیار کیا جائے، لیکن اصطلاحی طور پر اس سے مراد وہ ادارہ ہے جو اہل اسلام سے ان کے اجتماعی اموال وصول کر کے ان کے اجتماعی کاموں پر صرف کرنے کا ذمہ دار ہو، اسے اسلام کے ابتدائی دور میں بیت المال المسلمین یا بیت مال اللہ کہا جاتا تھا، آخر اس پر بیت المال کا اطلاق ہونے لگا۔ رسول اللہ e کے عہد مبارک میں اس قسم کے اجتماعی مال کو فوراً خرچ کر دیا جاتا تھا۔ رسول اللہ e کے دور میں صدقہ فطر وصول کرنے والے سرکاری کارندے ہوتے تھے جو عید سے ایک دو دن پہلے صدقہ فطر وصول کر لیتے تھے۔

جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر w کے متعلق روایات میں ہے کہ وہ سرکاری کارندوں کو اپنا اور اپنے اہل وعیال کا فطرانہ عید سے ایک دو دن پہلے جمع کروا دیتے تھے۔ 1

اسے سرکاری طور پر جمع کیا جاتا اور اس کی حفاظت کے لیے باقاعدہ ڈیوٹی لگائی جاتی تھی۔

جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ t کے متعلق حدیث میں ہے کہ وہ اس کام پر مامور تھے۔ 2

اسے فوری طور پر حق داروں تک پہنچا دیا جاتا تھا، اسے اپنی مرضی سے صرف کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہمارے ہاں عام طور پر مندرجہ ذیل لوگ بیت المال قائم کرنے کا اہتمام کرتے ہیں پھر اسے ''اپنا مال اپنوں'' پر صرف کیا جاتا ہے۔

☆ بڑی فیکٹریوں کے مالکان یا وسیع کاروبار رکھنے والے مذہبی حضرات اپنے ہاں بیت المال قائم کر لیتے ہیں، اس میں زکوٰۃ، فطرانہ اور چرمہائے قربانی کی قیمت جمع کی جاتی ہے پھر فیکٹری میں قائم کردہ مسجد کے اخراجات اسی مد سے پورے کیے جاتے ہیں۔

☆ دینی ذہن رکھنے والے لوگ ایک اجتماعی بیت المال بنا لیتے ہیں، اس میں مقامی طور پر مال زکوٰۃ، عشر، فطرانہ، اور چرمہائے قربانی سے آمدہ رقم جمع کی جاتی ہے، پھر اس سے امام مسجد کی تنخواہ اور خطیب کا حق الخدمت ادا کیا جاتا ہے۔ نیز

! بخاری، الزکاۃ: ۱۵۱۱.   @ بخاری، الزکاۃ: ۲۳۱۱.

لائبریری و دیگر اخراجات پورے کیے جاتے ہیں۔

☆ بعض دور اندیش حضرات اپنے طور پر ایک انفرادی بیت المال بنا لیتے ہیں پھر لوگوں سے چندہ مانگ مانگ کر اسے بھرتے ہیں پھر اسے بچیوں کے جہیز کے نام سے استعمال کیا جاتا ہے۔نگران ہونے کی حیثیت سے اپنی ضروریات کو بھی اس سے پورا کیا جاتا ہے۔

صورت مسئولہ میں بھی اسی طرح کی صورت حال بیان کی گئی ہے، ہمارے نزدیک غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کا مال غلط طریقہ سے استعمال کیا جاتا ہے، اس قسم کے چور دروازوں کو بند ہونا چاہیے۔ ہمارے نزدیک ہر مسجد کا بیت المال ایک غیر اسلامی حرکت ہے، اس کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔اس کے لیے یا تو جماعتی سطح پر ایک بیت المال قائم کیا جائے یا پھر انسان انفرادی طور پر اپنی زکوۃ، عشر، فطرانہ اور چرمہائے قربانی کو صحیح مصرف میں خرچ کرنے کا پابند ہے۔ واللہ اعلم

موت کے وقت تمام جائیداد وقف کر دینا

] ہمارے والد محترم نے موت کے وقت اپنا مکان جو مسجد سے ملحق تھا، مسجد کے لیے وقف کر دیا ہے، جبکہ ہم دو بھائی، اس کے شرعی وارث تھے، کیا ایسا کرنا درست ہے؟ اگر درست نہیں تو اس کی اصلاح کیسے کی جاسکتی ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[ہمارے ہاں مرتے وقت اس قسم کے اقدام کو وصیت کا درجہ دیا جاتا ہے۔حالانکہ وصیت کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ وہ ''غیر مضار'' یعنی وہ کسی وارث کے لیے ضرر رساں نہ ہو۔ضرر رساں وصیت کی صورت یہ ہے کہ ایسے طور پر وصیت کی جائے جس سے مستحق رشتے داروں کے حقوق تلف ہوتے ہوں، ناجائز اور ضرر رساں وصیت کی درج ذیل صورتیں بھی ہیں:

☆ جن ورثاء کے لیے وصیت کی جاتی ہے وہ اس کے حق دار نہیں ہوتے۔مثلاً بیوی کے حق میں وصیت کر جانا۔

☆ جائز ورثاء کے لیے شریعت کی قائم کردہ حد سے زیادہ وصیت کرنا۔مثلاً کسی کے لیے نصف جائیداد کی وصیت کرنا۔

☆ ظلم اور بے انصافی پر مبنی وصیت کرنا جس سے دوسروں کے حقوق تلف ہوتے ہیں۔

صورت مسئولہ میں وصیت بھی ظلم، ناانصافی پر مبنی ہے، کیوں کہ اولاد کی موجودگی میں تمام مال کی وصیت جائز نہیں، اس قسم کی وصیت کو درست کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ 1

''ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی طرف سے جانب داری یا حق تلفی کا اندیشہ رکھتا ہو اگر وہ باہمی طور پر ان کی اصلاح کر دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔''

---

1 البقرہ:۱۸۲.

خود رسول اللہ e نے بھی بعض غلط وصایا کی اصلاح فرمائی تھی۔ چنانچہ صورت مسئولہ سے ملتی جلتی ایک وصیت کا ذکر احادیث میں آیا ہے کہ ایک انصاری کی کل جائیداد چھ غلام تھے، اس نے مرتے وقت وصیت کے ذریعے انہیں آزاد کر دیا، اس کے مرنے اور کفن ودفن کے بعد اس کے ورثاء رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو حقیقت حال سے آگاہ کیا تو آپ نے مرنے والے کو سخت برا بھلا کہا۔ پھر اس کی وصیت کو کالعدم قرار دیتے ہوئے ان چھ غلاموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ اس کے ایک تہائی یعنی دو غلام آزاد کر دیئے اور باقی چار غلام واپس لا کر انہیں ان کے ورثاء کے حوالے کر دیا۔ 1

اس حدیث میں ان بزرگ حضرات کے لیے درس عبرت ہے جو دینی جذبہ کے پیش نظر اپنی تمام جائیداد وقف کر جاتے ہیں۔ رسول اللہ e نے ایسے ہی ایک شخص کے متعلق سخت برا بھلا کہا تھا۔ حدیث میں ''قولا شديدا'' کے الفاظ آتے ہیں، دوسری روایات میں اس قول شدید کی وضاحت بھی منقول ہے۔

چنانچہ ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: ''اگر ہمیں اس کی وصیت کا پہلے علم ہوتا تو ہم اس کی نماز جنازہ نہ پڑھتے۔'' 2

بلکہ ایک روایت کے الفاظ اس سے بھی زیادہ سنگین ہیں۔

آپ e نے فرمایا: ''اگر ہمیں پہلے علم ہوتا تو ہم اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کرتے۔'' 3

ان احادیث کے پیش نظر ہمیں وصیت کے معاملہ میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ صورت مسئولہ میں درج بالا حدیث کے پیش نظر اس طرح اصلاح کی جاسکتی ہے کہ مسجد سے ملحقہ مکان کا تیسرا حصہ مسجد کے لیے وقف کر دیا جائے یا اس کی مالیت کا تیسرا حصہ مسجد کو دے دیا جائے اور باقی حصے دو بیٹوں میں تقسیم ہوں، ہاں بیٹے اگر اپنی رضامندی سے اپنے باپ کی وصیت کو جوں کا توں برقرار رکھنا چاہیں تو یہ ان کی اپنی صواب دید ہے۔ بہرحال ان کا حق ہے وہ انہیں ملنا چاہیے تاکہ مرحوم کو اخروی باز پرس سے رہائی ملے۔ واللہ اعلم

مال زکوۃ سے خود فائدہ اٹھانا

] میں نے ایک لائبریری قائم کی ہے، اس میں مال زکوۃ اور فطرانہ وغیرہ سے کتابیں خرید کر جمع کرتا ہوں۔ اس لائبریری سے خود بھی استفادہ کرتا ہوں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کے لیے دیتا ہوں۔ میرا یہ عمل شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟ وضاحت کر دیں۔

[قرآن وحدیث کی رو سے مال زکوۃ یا فطرانہ کو اپنے استعمال میں لانا بالاتفاق ممنوع اور ناجائز ہے۔ سیدنا عمر t نے کسی کو اپنا گھوڑا فی سبیل اللہ دیا، اس نے اس گھوڑے کو ضائع کر دیا اور فروخت کرنے کے لیے لگا دیا، سیدنا عمر t نے اسے خریدنا چاہا تو رسول اللہ e نے فرمایا: ''اسے مت خریدو، اپنے صدقہ کو اپنی طرف مت لوٹاؤ اگرچہ وہ تجھے ایک درہم

! صحیح مسلم، الایمان:۴۳۳۵۔ @ مسند امام احمد:ج۴،ص۴۴۳۔
ابو داؤد، العتق:۳۹۵۸۔

کے عوض فروخت کرے، کیوں کہ اپنے صدقے کو واپس لینا اس طرح ہے جیسا کہ کتا قے کر کے چاٹتا ہے۔ 1

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ وخیرات کی ہوئی چیز سے خود استفادہ کرنا ناجائز ہے، مصارف زکوٰۃ کی تعیین خود قرآن کریم نے بیان کی ہے، مال زکوٰۃ کو انہیں مصارف ثمانیہ میں خرچ کرنا چاہیے، اس سلسلہ میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

صورت مسئولہ میں سائل نے اپنے گھر میں ایک لائبریری قائم کی ہے اور اس میں اپنی زکوٰۃ اور فطرانے سے کتب خرید کر رکھی جاتی ہیں، یہ صرف غرباء اور مساکین کا حق ہے، مال زکوٰۃ انہی پر خرچ ہونا چاہیے۔

حدیث میں ہے کہ پانچ صورتوں کے علاوہ کسی غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں۔

☆ جو اللہ کی راہ میں غازی اور مجاہد ہو۔

☆ صدقات اکٹھا کرنے پر مامور ہو۔

☆ چٹی بھرنے والا ہو۔

☆ اپنے مال سے صدقہ کی چیز خریدنے والا ہو۔

☆ وہ آدمی کہ کوئی مسکین اس کا ہمسایہ ہو، اس مسکین کو صدقہ دیا گیا ہو تو اس نے کسی غنی کو ہدیہ دیا ہو۔ 2

ان احادیث وآثار کا تقاضا ہے کہ انسان کسی بھی طریقہ سے اپنی زکوٰۃ اور فطرانے کو اپنے مصرف میں لانے کی کوشش نہ کرے۔ صورت مسئولہ میں سائل کو چاہیے کہ اگر وہ لائبریری سے استفادہ کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنے حلال پاکیزہ مال سے کتب خریدے جو مال زکوٰۃ سے نہ ہو۔

ساری جائیداد صدقہ کرنا

] میرے بھائی بہت پارسا اور نیک انسان تھے، وہ بیمار ہوئے تو انہوں نے اپنی ساری جائیداد جو ایک مکان کی شکل میں تھی، مسجد کو دے دی، تاکہ اسے عورتوں کے لیے جائے نماز کے طور پر استعمال کیا جائے۔ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[اللہ تعالیٰ نے انسان کو خود مختار بنا کر دنیا میں بھیجا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جیسے چاہے استعمال کر سکتا ہے، مال وجائیداد بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، اس میں بھی تصرف کرنے کا اسے پورا پورا حق ہے۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''ہر مالدار اپنے مال میں تصرف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔'' 3

! بخاری، الزکوٰۃ: ۱۴۹۰. @ ابو داؤد، الزکوٰۃ: ۱۶۳۵.

بیہقی: ج۶، ص۱۷۸.

انسان کو اپنے مال میں تصرف کرنے کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ہوگا:

☆ یہ تصرف کسی ناجائز اور حرام کام کے لیے نہ ہو اور نہ ہی حرام کاری کے لیے کسی دوسرے کو اپنا مال دیا جائے کیوں کہ ایسا کرنا سخت گناہ ہے۔

☆ جائز تصرف کرتے وقت کسی وارث کو جائیداد سے محروم رکھنے کی نیت نہ ہو کیوں کہ ایسا کرنے سے اسے جنت سے محروم کیا جا سکتا ہے۔

☆ اگر یہ تصرف ہبہ کے طور پر ہے تو بیٹے اور بیٹیوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جائے کیوں کہ ایک کو دینا اور دوسرے کو محروم رکھنا ظلم ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

☆ اگر یہ تصرف بطور وصیت ہے تو وصیت کل جائیداد کے سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ نیز یہ کسی شرعی وارث کے لیے بھی نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ اس کی احادیث میں ممانعت ہے۔

شرائط بالا کے پیش نظر سائل کے بھائی کو چاہیے تھا کہ وہ اپنی پوری جائیداد، مسجد کے نام وقف نہ کرتے کیوں کہ اس میں شرعاً ممانعت ہے۔

جیسا کہ حدیث میں ہے۔

سیدنا سعد بن ابی وقاص t بیان کرتے ہیں کہ میں بیمار ہوا تو رسول اللہ e سے عرض کیا، یا رسول اللہ! میں اپنے سارے مال کے متعلق وصیت کرنا چاہتا ہوں؟

تو رسول اللہ e نے فرمایا: ''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

میں نے عرض کیا، نصف مال دے سکتا ہوں؟

آپ e نے فرمایا: ''تم نصف بھی نہیں دے سکتے۔''

میں نے عرض کیا: ایک تہائی دینے کی اجازت ہے؟

رسول اللہ e نے فرمایا: ''ایک تہائی دے سکتے ہو لیکن یہ بھی بہت زیادہ ہے۔''

پھر آپ e نے فرمایا: ''تم اگر اپنے ورثاء کو مال دار چھوڑ جاؤ تو یہ اس سے بہتر ہے کہ انہیں تنگ دست اور محتاج چھوڑو جو لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلا کر مانگتے پھریں۔'' 1

سائل کے بھائی کی پارسائی اپنی جگہ پر لیکن اس کا اپنی جائیداد میں اس طرح کا تصرف کہ رشتے دار کو محروم کر دیا جائے قطعاً جائز نہیں۔ اس حدیث کا تقاضا ہے کہ جائیداد سے مسجد کے نام وقف کر دیا جائے اور باقی اس کے حقیقی وارث بھائی

! بخاری، الوصية: ٢٧٤٢.

کو دیا جائے۔ امت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جو میت کا وارث ہو اس کے لیے ایک تہائی سے زیادہ وصیت کرنا جائز نہیں۔
صورت مسئولہ میں قرآنی تعلیم کے مطابق وصیت کی اصلاح ضروری ہے۔ واللہ اعلم

نشر و اشاعت پر زکوٰۃ فنڈ خرچ کرنا

] صاحب حیثیت لوگ زکوٰۃ فنڈ سے دینی کتب طبع کر کے تقسیم کرتے ہیں۔ کیا ''فی سبیل اللہ'' کی مد میں دینی کتب کی نشر و اشاعت بھی آتی ہے، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں کہ فی سبیل اللہ کی مد میں کیا کیا مصارف آتے ہیں؟

[انسان جب صدقہ و خیرات کرتا ہے تو اس کی دو اقسام ہیں:

☆ فرض صدقہ: اس سے مراد وہ صدقات ہیں جو شریعت کی طرف سے ایک مسلمان پر فرض ہیں، ان کی مقدار اور مصارف بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے شدہ ہیں، مثلاً زکوٰۃ، فطرانہ اور کفارہ وغیرہ۔

☆ نفلی صدقہ: اس سے مراد وہ صدقات ہیں جو انسان اپنی خوشی سے دیتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی پر فرض نہیں، اسے عام طور پر خیرات کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی مقدار اور مصارف اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے شدہ نہیں ہیں، ایسے صدقات کو اپنی صوابدید کے مطابق خرچ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں فرض صدقات یعنی زکوٰۃ وغیرہ کے آٹھ مصارف بیان ہوئے ہیں، ان میں ایک ''فی سبیل اللہ'' ہے جسے ہم لوگوں نے بہت عام کر دیا ہے کہ ہر کار خیر کو فی سبیل اللہ کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے اور وہاں مال زکوٰۃ کو خرچ کیا جاتا ہے۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے جو براہ راست اللہ تعالیٰ کے دین کو باقی ادیان پر غالب کرنے کے لیے کیا جائے، اس سے مراد قتال وغیرہ ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق جہاد و قتال کے علاوہ دیگر تمام کوششیں فی سبیل اللہ میں داخل نہیں ہیں کہ ان پر مال زکوٰۃ صرف کیا جائے۔ دینی کتب کی نشر و اشاعت، اللہ کے دین کو عام کرنے کی کوشش ہے لیکن اسے جہاد و قتال کا درجہ نہیں دیا جا سکتا کہ اس پر زکوٰۃ وغیرہ صرف کی جائے۔ اسی طرح حج اور عمرہ کو بھی بعض احادیث میں فی سبیل اللہ میں داخل کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس W سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے جب حج کرنے کا ارادہ کیا تو ایک عورت نے اپنے خاوند سے کہا کہ مجھے بھی رسول اللہ e کے ہمراہ اپنے اونٹ پر حج کراؤ، اس نے جواب دیا کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں جس میں میں تمہیں حج کراؤں۔

عورت نے کہا کہ تیرا فلاں اونٹ موجود ہے۔

خاوند نے جواب دیا کہ وہ جہاد (فی سبیل اللہ) کے لیے وقف ہے۔

چنانچہ وہ رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی بیوی کا معاملہ پیش کیا تو آپ نے فرمایا:

''اگر تم اسے اس اونٹ پر حج کرا دو تو یہ بھی فی سبیل اللہ ہی ہے۔'' 1

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حج فی سبیل اللہ میں شامل ہے اور سفر حج میں جانے والوں کے لیے زکوٰۃ فنڈ سے تعاون کیا جا سکتا ہے۔

ان احادیث کی بناء پر جہاد اور حج کو فی سبیل اللہ میں شمار کرنا چاہیے اور اسے عام نہ کیا جائے۔ اس بناء پر اسلامی کتب کی نشر و اشاعت جو اصلاح معاشرہ کے لیے ہوں انہیں نفلی صدقات سے نشر کیا جائے۔ مال زکوٰۃ سے دینی کتب چھپوا کر تقسیم کرنا محل نظر اور مشکوک عمل ہے، اس سے گریز کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

سودی رقم کو رفاہی کاموں میں خرچ کرنا

] میں نے سود لینے دینے سے توبہ کر لی ہے لیکن بینک میں کافی سودی رقم پڑی ہے، کیا میں اس نیت سے وصول کر سکتا ہوں کہ اسے غریبوں، مسکینوں اور رفاہی کاموں میں صرف کر دیا جائے، کتاب و سنت کی روشنی میں راہنمائی کریں۔

[اسلام میں سود لینا دینا ایک سنگین جرم ہے۔ اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا﴾ 2

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو۔''

صورت مسئولہ میں سائل سودی رقم وصول نہ کرے، سود چونکہ حرام ہے اس لیے مسکینوں اور غریبوں کو دینے نیز رفاہی کاموں میں صرف کرنے کی نیت سے بھی وصول کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ خود بھی پاک ہے اور پاک چیز کو ہی پسند کرتا ہے لہٰذا اسے صدقہ و خیرات میں خرچ نہیں کیا جا سکتا۔

اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود t سے مروی ایک حدیث حسب ذیل ہے:

''جب کوئی بندہ حرام مال کماتا ہے، پھر اسے اچھے کاموں میں خرچ کرنے کے باوجود اس کے مال میں برکت نہیں ہوتی اور ایسے مال سے کیا گیا صدقہ بھی قبول نہیں ہوتا، ایسا آدمی اپنے پیچھے آگ چھوڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ برائی کو برائی کے ذریعے نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو نیکی کے ذریعے ختم کرتا ہے، خبیث اشیاء، خبیث اعمال کو نہیں مٹاتیں۔'' 3

اس حدیث سے بھی یہی رہنمائی ملتی ہے کہ سودی رقم کو وصول نہ کیا جائے، بلکہ اسے بینک میں ہی پڑا رہنے دے۔ ہاں اگر کوئی بینک کے ناجائز تاوان کے نیچے دبا ہوا ہے تو ثواب کی نیت کیے بغیر اسے دیا جا سکتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''مال حرام

! ابو داؤد، المناسک: ۱۹۹۰۔ @ البقرۃ: ۲۷۸۔
مسند امام احمد، ج۶، ص۱۸۹۔

بود جائے حرام رفت‘‘

ہمارے رجحان کے مطابق اس قسم کے حرام مال کو وصول کرنے سے اجتناب کرنا ہی بہتر ہے کیوں کہ یہ ہمارا مال نہیں ہے۔(واللہ اعلم)

صاع کا وزن اور اس کا حجم

] ہمارے ہاں صدقہ فطر کی مقدار ایک صاع بتائی جاتی ہے اور یہ حجم یعنی ماپ کا پیمانہ ہے، اس کا حجم کتنا ہے؟ پھر اس میں گندم کا وزن کتنا ہے؟ کیوں کہ عام طور پر صدقہ فطر میں گندم دی جاتی ہے، اس کے متعلق تفصیل درکار ہے۔

[اس میں شک نہیں ہے کہ صاع، ماپ کا پیمانہ ہے، جب اسے کسی جنس سے بھرا جائے تو مختلف اجناس کا وزن مختلف ہوتا ہے، اس سلسلہ میں ایک روایت پیش خدمت ہے:

’’امام احمد بن حنبل a کے بیٹے عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد گرامی امام احمد بن حنبل a نے ایک مرتبہ مد میں صاف گندم ڈالی پھر اس کا وزن کیا تو وہ ایک رطل اور ایک تہائی رطل تھی یعنی رطل۔‘‘ 1

چونکہ ایک صاع میں چار مد ہوتے ہیں اس لیے ایک صاع رطل کا ہوا، رطل وزن کا پیمانہ ہے اس کا وزن نوے مثقال ہے، اس حساب سے رطل 480 مثقال بنتے ہیں۔ ایک مثقال ساڑھے چار ماشے کا ہے، اس حساب سے 480 مثقال کے دو ہزار ایک سو ساٹھ ماشے ہوتے ہیں اور اس کا ایک سو اسی تولے وزن بنتا ہے۔ جدید اعشاری نظام کے مطابق تین تولے کے پینتیس گرام ہوتے ہیں، اس حساب سے ایک سو اسی تولے کا وزن دو ہزار ایک سو گرام بنتا ہے۔ یعنی یہ وزن دو کلو سو گرام ہے، یہ ایک صاع گندم کا وزن ہے۔

اب اس کے حجم کا اندازہ کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ہم نے بڑی تگ و دو کے بعد ایک مد کا پیمانہ حاصل کیا، پھر لیٹر کا پیمانہ لیا، جب مد کو پانی سے بھرا تو وہ چھ سو بیاسی ملی لیٹر تھا، اس اعتبار سے ایک صاع میں دو ہزار سات سو اٹھائیس ملی لیٹر پانی ریکارڈ ہوا یعنی دو لیٹر اور سات سو اٹھائیس ملی لیٹر۔

انٹرنیشنل طور پر گندم کی کثافت کے پیش نظر ایک لیٹر میں 770 گرام گندم آتی ہے۔ جب ہم نے مذکورہ مد میں صاف گندم ڈالی تو اس کا وزن 525 گرام ہوا۔ اس اعتبار سے ایک صاع میں دو ہزار، ایک سو گرام گندم آتی ہے، یعنی دو کلو ایک سو گرام صاع کے حجم میں گندم کا وزن ہے۔ ہمارے ہاں برصغیر کے اکثر محدثین ایک صاع میں گندم کا وزن دو کلو سو گرام بتاتے ہیں جبکہ کچھ اہل علم ایک صاع حجم میں گندم کا وزن دو کلو پانچ سو گرام بتاتے ہیں۔ ہمارے رجحان کے مطابق ایک صاع بھر کر گندم صدقہ فطر کے طور پر دی جائے خواہ اس کا وزن جتنا بھی ہو۔ واللہ اعلم

! محلی ابن حزم:ج۵،ص۲۴۵.

انسانی جسم کے جوڑوں کا صدقہ

] میں نے کسی حدیث میں پڑھا تھا کہ انسان پر اپنے جوڑوں کا صدقہ دینا ضروری ہے، کس قدر صدقہ دینے سے انسان اس سے بری الذمہ ہوجاتا ہے، نیز زندگی میں ایک مرتبہ دینا ہے یا کہ ہر روز یہ کام کرنا ہوگا۔ وضاحت کریں؟

[انسان پر اللہ تعالیٰ کی بہت نعمتیں ہیں اور اس کی ہر نعمت پر اس کا شکر ادا کرنا ضروری ہے۔ انسانی وجود بھی کئی ایک جوڑوں پر مشتمل ہے تا کہ انسان نقل وحرکت کر سکتے اور کسی چیز کو آسانی سے پکڑ کر اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکے، اگر انسان کا وجود ایک تختہ ہوتا تو اسے کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا؟ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کا شکر ادا کرنا بھی واجب ہے۔

اس کے متعلق رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''انسان کے اندر تین سو ساٹھ جوڑ ہیں، اس پر واجب ہے کہ وہ اپنے ہر جوڑ کے بدلے صدقہ دیا کرے۔'' 1

ایک دوسری حدیث میں صراحت ہے کہ یہ صدقہ ہر روز دینا ہوتا ہے۔ 2

رسول اللہ e کے صحابہ کرام y نیکی کرنے کے بہت حریص تھے، انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ e! اپنے جوڑوں کے بدلے ہر روز صدقہ دینے کی کون ہمت رکھتا ہے، تو رسول اللہ e نے مختلف کارہائے خیر کو اس صدقے کا بدل قرار دیا جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

☆ لوگوں کے درمیان عدل کرنا۔ 3
☆ مسجد میں پڑا ہوا بلغم دفن کرنا۔ 4
☆ راستے میں پڑی ہوئی اذیت ناک چیز مثلاً پتھر، کانٹا اور ہڈی وغیرہ دور کر دینا۔ 5
☆ سہارا دے کر کسی کو سواری پر بٹھا دینا۔ 6
☆ کسی کا سواری پر سامان لاد دینا۔ 7
☆ نماز پڑھنا، روزہ رکھنا اور حج کرنا۔ 8
☆ اپنے ملنے والوں کو سلام کہنا۔ 9

! مسند احمد:ج۵،ص۳۵۴۔
@ ابو داوٗد، التطوع:۱۲۸۶۔
# بخاری، الصلح:۲۷۰۷۔
$ مسند احمد؛ج۵،ص۳۵۴۔
% بخاری، الجہاد:۲۹۸۹۔
^ بخاری، الجہاد:۲۸۹۱۔
& بخاری ، الجہاد:۲۹۸۹۔
* ابو داوٗد، التطوع:۱۲۸۶۔
) ابوداوٗد، الادب:۲۴۳۔

☆ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا۔ 1

☆ خود کو شر سے روکے رکھنا۔ 2

☆ اپنی بیوی سے ہم بستر ہونا۔ اس پر صحابہ کرام y نے عرض کیا اللہ کے رسول! انسان اپنی نفسانی خواہش پوری کرے تو یہ کیسے صدقہ ہے؟

تو آپ e نے فرمایا: ''بتاؤ، اگر وہ یہ خواہش حرام جگہ پوری کرے تو کیا اسے اس پر گناہ ہوتا ہے؟ اسی طرح اگر وہ اسے حلال جگہ پوری کرتا ہے تو اس کے لیے اجر ہے۔'' 3

☆ اچھی بات منہ سے نکالنا۔ 4

☆ کسی کو راستہ بتانا۔ 5

☆ ایک دفعہ الحمد للہ کہنا، ایک دفعہ سبحان اللہ کہنا، ایک دفعہ اللہ اکبر کہنا اور ایک دفعہ لا الہ الا اللہ کہنا۔ 6

☆ ایک دفعہ استغفر اللہ کہنا۔ 7

اس کی فضیلت بیان کرتے ہوئے رسول اللہ e نے فرمایا:

''جس نے جوڑوں کی تعداد کے مطابق اچھے کام کیے تو وہ اس طرح چلے گا گویا وہ خود کو دوزخ کی آگ سے آزاد کر چکا ہوگا۔'' 8

رسول e نے اِس امت پر احسان کرتے ہوئے مزید فرمایا: ''اِن تمام امور کی جگہ جو انسان چاشت کی دو رکعات پڑھتا ہے وہ اس کے لیے کفایت کرتی ہیں۔'' 9

اس سلسلہ میں دو باتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

☆ اشراق کے دو نفل انسان کو فرض عبادات سے کفایت نہیں کریں گے، فرض عبادات کو بہر حال ادا کرنا ہوگا۔

☆ چاشت کی ادائیگی سے بندے پر واجب شکر کا حق ادا ہو جاتا ہے مگر اس کو پڑھ لینے سے انسان مالی صدقات سے بری الذمہ نہیں ہو سکے گا۔

جوڑوں کا صدقہ ہر روز ادا کرنا ہوگا، اس لیے نیکی کے مذکورہ کام ایک دفعہ کر لینے سے کام نہیں چلے گا بلکہ انہیں ہر روز کرنا

! مسلم، المسافرین:۸۴۔
@ مسلم، الزکوٰۃ:۵۵۔
# مسلم، المسافرین:۸۴۔
$ بخاری، الجهاد:۲۸۹۱۔
% بخاری،الجهاد:۲۸۹۱۔
^ مسلم، المسافرین:۸۴۔
& مسلم، الزکوٰۃ:۵۴۔
* مسلم، الزکاۃ: ۵۴۔
) مسلم، المسافرین:۸۴۔

ہوگا۔ واللہ اعلم

مقامی مدرسہ کے لیے زکوٰۃ

] ہم نے مسجد میں ایک ادارہ قائم کیا ہے، جس نے مقامی بچوں کے لیے حفظ اور ناظرہ قرآن کی کلاسیں ہوتی ہیں، ادارہ کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے، کیا اس ادارہ کو زکوٰۃ وغیرہ دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

[زکوٰۃ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا فریضہ ہے جس کے مصارف خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کر دیئے ہیں، ان مصارف کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ فقیر:......اس سے مراد وہ مسلمان انسان ہے جس کے پاس اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کچھ بھی نہ ہو۔

☆ مسکین:...... اس سے مراد وہ مسلمان انسان ہے جس کے پاس مال تو موجود ہے لیکن وہ اس کی ضروریات کے لیے ناکافی ہو۔

☆ عاملین:......وہ افراد جو مسلمانوں سے زکوٰۃ جمع کر کے، اس کا حساب وکتاب رکھنے پر تعینات ہوں، واضح رہے کہ اس سے مدارس کے سفراء مراد نہیں ہیں۔

☆ مؤلفۃ القلوب:......کسی غیر مسلم کی حوصلہ افزائی اور دل جوئی کرنا جس کے اسلام لانے کا قوی امکان ہو اور وہ اسلام کی طرف میلان رکھتا ہو۔

☆ گردن آزاد کرنا:......کسی غلام کو آزادی دلانے کے لیے اس کی مدد کرنا یا کسی مسلمان قیدی کو کفار سے رہائی دلانے کے لیے اس کا مالی تعاون کرنا۔

☆ قرض دار:......ایسا مقروض جس نے اپنی ضروریات کے لیے قرض لیا لیکن تنگ دستی کی وجہ سے ادائیگی پر قادر نہیں، اس سے کاروباری مقروض مراد نہیں ہیں۔

☆ فی سبیل اللہ:......اللہ کے راستے میں خرچ کرنا، اس سے مقصود براہ راست ''کلمہ اسلام'' کو بلند کرنا ہو۔ حدیث میں اس سے مراد جہاد اور حج کی صراحت ہے۔

☆ ابن السبیل:......مسافر جو دوران سفر اپنی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہو، خواہ وہ اپنے گھر میں امیر ہی کیوں نہ ہو۔

قرآن مجید کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ صرف انہی مصارف پر خرچ کی جاسکتی ہے جیسا کہ آغاز میں کلمہ

''انما'' سے معلوم ہوتا ہے، صرف ان مصارف پر، دیگر مصارف پر اسے صرف کرنا شرعاً درست نہیں ہے، مذکورہ مصارف میں ایسے رفاہی ادارے شامل نہیں جن میں مقامی بچے زیر تعلیم ہوں اور ان کے والدین صاحب حیثیت ہوں، ایسے اداروں کے مصارف بچوں کے والدین برداشت کریں، البتہ ایسے دینی مدارس جہاں اقامتی طلباء رہائش پذیر ہوں اور وہ خود معاش کے سلسلہ میں دوڑ دھوپ نہ کر سکتے ہوں وہاں زکوٰۃ وغیرہ صرف کی جاسکتی ہے۔''فی سبیل اللہ'' کا مفہوم اتنا وسیع نہیں ہے کہ اس میں مساجد اور اس میں قائم ادارے جہاں مقامی بچے قرآن حکیم حفظ یا ناظرہ پڑھتے ہوں، اس طرح خیراتی ہسپتال مقامی لائبریریاں یا قبرستان کی تعمیر، راستوں کی کشادگی بھی اس میں آجاتے ہیں، ہاں مریض اگر غریب ہوں تو ان کی غربت کے پیش نظر ادویات کے لیے انہیں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ وہ بھی بیماری کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی غربت کی بناء پر ایسا کیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم

582

عمرہ کے لیے طواف کعبہ کی حیثیت

] میں اپنے بیوی بچوں سمیت سعودیہ میں رہتا ہوں، ہم دونوں میاں بیوی عمرہ کی ادائیگی کے لیے روانہ ہوئے، راستہ میں میری بیوی کو ایام آ گئے، میں نے عمرہ کیا، جب کہ میری بیوی اس وجہ سے عمرہ نہ کر سکی، ایسے حالات میں میری بیوی کے لیے شریعت کا کیا حکم ہے؟

[عمرہ کرنے کے لیے طواف کعبہ ایک بنیادی شرط ہے، جس طرح طواف افاضہ، حج کے لیے ایک رکن کی حیثیت رکھتا ہے، طواف کے بغیر عمرہ نہیں ہو سکتا اور ایام والی عورت طواف کعبہ نہیں کر سکتی۔ اس لیے صورت مسئولہ میں سائل کی بیوی کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ مکہ میں ہی رہے اور طہارت حاصل ہونے پر اپنا عمرہ مکمل کرے۔

رسول اللہ e نے سیدہ صفیہ r کے متعلق فرمایا، جب کہ وہ حائضہ ہو گئی تھیں: ''کیا یہ ہمیں روک دے گی؟ کیا اس نے طواف افاضہ کر لیا ہے؟'' دیگر اہل خانہ نے عرض کیا کہ وہ طواف افاضہ کر چکی ہیں تو آپ نے فرمایا: ''تب کوئی حرج نہیں۔'' 1

واضح رہے کہ طواف وداع کے وقت ایسا ہوا تھا تو رسول اللہ e نے فرمایا کہ ''اگر طواف افاضہ کر لیا ہے تو طواف وداع کی ضرورت نہیں، اسے چاہیے کہ وہ مدینہ روانگی کی تیاری کرے۔'' 2

رسول اللہ e نے جب یہ فرمایا:

''کیا یہ صفیہ r ہمیں روک لے گی''

یہ الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ اگر کوئی عورت طواف سے پہلے حائضہ ہو جائے تو اس کا ادھر حرم میں ٹھہرے رہنا ضروری ہے حتی کہ فراغت کے بعد طہارت کی حالت میں بیت اللہ کا طواف کر لے۔ عمرہ کے طواف کی وہی حیثیت ہے جو حج کے لیے طواف افاضہ کی ہے۔ طواف کعبہ عمرہ کے لیے رکن کی حیثیت رکھتا ہے، اس بناء پر اگر عمرہ کرنے والی عورت طواف کعبہ سے پہلے حائضہ ہو جائے تو اسے وہاں انتظار کرنا ہو گا حتی کہ وہ پاک ہو جائے اور اس حالت میں وہ طواف کر کے اپنا عمرہ مکمل کر لے۔ واللہ اعلم

! صحیح بخاری، الحج: ۱۷۵۷۔ @ بخاری، الحج: ۱۷۶۲۔

عمرہ کرنے سے پہلے حیض آنا

] ہم دونوں میاں بیوی رمضان المبارک میں عمرہ کرنے کے لیے سعودیہ گئے، الحمد للہ! ہم نے اپنا عمرہ مکمل کرلیا، لیکن زیارت مدینہ طیبہ کے بعد جب ہم نے بئر علی سے دوسرے عمرہ کی ادائیگی کے لیے احرام باندھا تو دوران سفر میری بیوی کو حیض آ گیا، اب ہمارے ٹکٹ کنفرم ہیں، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

[دین اسلام کی بنیاد آسانی اور سہولت پر ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ 1

''اللہ تعالیٰ نے دین کے سلسلہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ 2

''اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمہارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

ان تمہیدی گزارشات کے بعد ہمارے نزدیک سوال میں مذکور الجھن سے نکلنے کے لیے حسب ذیل دو راستے ہیں، ان میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جا سکتا ہے:

☆ اس عورت کو چاہیے کہ وہ واپس وطن چلی آئے، آئندہ جب کبھی موقع ملے تو عمرہ کرے، چونکہ یہ نفلی عمرہ ہے اس لیے اس کی ادائیگی ضروری نہیں۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''جب میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اسے بجا لاؤ۔'' 3

اس حالت میں عمرہ کرنا اس کی استطاعت سے باہر ہے لہٰذا وہ واپس اپنے وطن آ جائے۔

☆ دوسری صورت عرب علماء کرام نے نکالی ہے کہ وہ مضبوطی سے لنگوٹ باندھ لے اور اسی حالت میں عمرہ مکمل کرے، اس حالت میں بربنائے ضرورت عورت سے دخول مسجد طواف کعبہ کے لیے حیض سے پاک ہونے کی شرط ساقط ہو جائے گی، اصول یہ ہے: ''ضرورت کی بناء پر ممنوع چیز مباح ہو جاتی ہے۔''

اس عورت کو چاہیے کہ وہ اسی حالت میں طواف کعبہ کرے اور صفا مروہ کے درمیان سعی بھی بجا لائے پھر اپنے سر کے تھوڑے سے بال کاٹ کر احرام کی پابندیوں سے آزاد ہو جائے۔ دین اسلام کی آسانی اور سہولت کا یہی تقاضا ہے۔ واللہ اعلم

! الحج: ۷۸.

@ البقرۃ: ۱۸۵.

مسند امام احمد: ۲/ ۴۲۸.

حائضہ کے لیے احرام کی پابندی

] میں اپنے خاوند کے ہمراہ عمرہ کرنے کے لیے مکہ مکرمہ جا رہی تھی لیکن میقات سے قبل ہی مجھے ایام آ گئے اس لیے میں احرام کی نیت کیے بغیر مکہ چلی آئی، پاک ہونے تک مکہ میں رہی، طہارت کے بعد میں نے مکہ ہی سے احرام کی نیت کر کے عمرہ کر لیا، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

[جو مرد و عورت عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ آئے اسے چاہیے کہ میقات سے پہلے احرام باندھے، اس کے بغیر میقات سے گزرنے کی اجازت نہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے، رسول اللہ e نے میقات بیان کرنے کے بعد فرمایا:

''یہ میقات ان لوگوں کے لیے ہیں جو ادھر رہائش رکھتے ہیں اور ان راستوں سے آنے والوں کے لیے بھی ہیں جب کہ وہ حج و عمرہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں اور جو ان مواقیت کے اندر رہتا ہے تو وہ اپنے گھر سے ہی احرام باندھے گا۔'' 1

اگر ان میقات سے گزرنے والی خاتون حائضہ ہے اور وہ عمرہ کرنا چاہتی ہے تو اسے بھی احرام کی نیت کرنا ہوگی، ایسی حالت میں اس کا احرام صحیح ہوگا۔ جیسا کہ سیدنا ابو بکر t کی بیوی سیدہ اسماء بنت عمیس r نے بچے کو جنم دیا جب کہ رسول اللہ e ذوالحلیفہ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور حجۃ الوداع کا ارادہ رکھتے تھے، سیدہ اسماء بنت عمیس r بھی حج کا ارادہ رکھتی تھیں، انہوں نے رسول اللہ e کو پیغام بھیجا کہ ایسے حالات میں میرے لیے کیا حکم ہے؟

تو آپ e نے فرمایا: ''تو غسل کر لے، مضبوطی سے کپڑا باندھ لے اور احرام کی نیت کر لے۔'' 2

نفاس کا خون بھی حیض کی طرح ہے، دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔ اس حدیث کے پیش نظر سائلہ کو چاہیے تھا کہ اس کا عمرہ کرنے کا ارادہ تھا تو وہ میقات سے گزرتے ہوئے غسل کرتی، مضبوطی سے کپڑا باندھ لیتی اور احرام کی نیت کر لیتی، اس طرح جب وہ مکہ پہنچتی تو وہ بیت اللہ کا طواف نہ کرتی حتی کہ پاک ہو جاتی۔

رسول اللہ e نے سیدہ عائشہ r کو حکم فرمایا تھا جب کہ وہ عمرہ کے احرام کے بعد حائضہ ہو گئی تھیں:

''تو وہی کچھ کر جو حاجی کرتے ہیں، البتہ بیت اللہ کا طواف نہ کرحتی کہ تو پاک ہو جائے۔'' 3

چنانچہ سیدہ عائشہ r جب پاک ہو گئیں تو انہوں نے بیت اللہ کا طواف کیا اور صفا مروہ کی سعی بھی کی تھی۔ 4

اس کا مطلب یہ ہے کہ طواف سے قبل اگر حیض آ جائے تو بیت اللہ کا طواف اور صفا مروہ کی سعی نہیں کی جا سکے گی حتی کہ وہ پاک ہو جائے اور غسل کر لے۔

سائلہ کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تھا کہ وہ میقات سے گزرنے سے پہلے احرام کی نیت کر لیتی اور مکہ میں رہتے ہوئے اپنے

! بخاری، الحج: ۱۵۲۶.
@ مسلم، المناسک: ۱۲۱۸.
# بخاری، الحج: ۱۶۵۰.
$ بخاری، الحج: ۱۵۵۶.

پاک ہونے کا انتظار کرتی، جب پاک ہو جاتی تو غسل کر کے بیت اللہ کا طواف اور صفا مروہ کی سعی کرتی پھر اپنے سر کے بال کاٹ کر عمرے کو پورا کرتی، لیکن وہ میقات سے بغیر احرام کی نیت کیے ہوئے گزری ہے تو اس واجب کے ترک کرنے پر اسے ایک بکری بطور فدیہ دینا ہوگی، جس کا گوشت حرم کے فقراء میں تقسیم کر دیا جائے۔ واللہ اعلم

دوران احرام خوشبودار کریم لگانا

] میں نے رمضان المبارک میں عمرہ کیا اور دوران احرام خوشبودار کریم استعمال کی تا کہ پسینہ آنے کی وجہ سے ماحول میں تکدر پیدا نہ ہو۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ایسا کرنا جائز نہیں تھا، اب کیا کروں؟

[احرام کی نیت کرنے سے پہلے اپنے بالوں اور جسم پر خوشبو لگانا سنت ہے۔

چنانچہ سیدہ عائشہ r کا بیان ہے کہ ''میں رسول اللہ e کو آپ کے احرام باندھنے کے وقت احرام سے پہلے خوشبو لگایا کرتی تھی اور ایسے ہی احرام کھولنے کے بعد، بیت اللہ کا طواف کرنے سے پہلے۔'' 1

سیدہ عائشہ r کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ احرام کی تیاری کے وقت غسل کرتے اور لباس بدلتے ہوئے احرام کی نیت کرنے سے پہلے خوشبو لگا لینا سنت ہے۔ اس خوشبو کا رنگ اور اثر اگر حالت احرام میں باقی رہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ جیسا کہ سیدہ عائشہ r بیان کرتی ہیں: ''گویا میں کستوری کی اس چمک کو دیکھ رہی ہوں جو رسول اللہ e کی مانگ میں لگی ہوئی تھی جب آپ احرام میں تھے۔'' 2

عمرہ کرنے والے کے لیے یہ ممنوع عمل ہے کہ وہ احرام کی نیت کرنے کے بعد خوشبو استعمال کرے، اگر کسی نے لاعلمی کی وجہ سے خوشبو کو احرام کی نیت کے بعد استعمال کیا یعنی اسے ممانعت کا علم نہیں تھا یا علم تو تھا لیکن بھول کر خوشبو لگا لی تو ایسی صورت میں کچھ بھی واجب نہیں۔ اگر کوئی جانتے ہوئے دوران احرام خوشبو استعمال کرتا ہے یا خوشبودار کریم لگاتا ہے تو اسے تین کاموں میں سے ایک کام ضرور کرنا ہوگا:

☆ ایک بکری ذبح کرے۔ ☆ چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

☆ اگر ان کی استطاعت نہیں تو تین دن کے روزے رکھے۔

سائل نے دوران احرام خوشبودار کریم استعمال کی ہے، اسے چاہیے کہ وہ تفصیل بالا کے مطابق عمل کرے۔

واضح رہے کہ احرام کی چادروں کو خوشبو لگانا کسی صورت میں جائز نہیں۔ ایسا کرنا احرام سے پہلے اور احرام کے بعد دونوں صورتوں میں منع ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ e نے ایسا احرام پہننے سے منع فرمایا ہے جسے خوشبو لگی ہوئی ہو۔ واللہ اعلم

سن رسیدہ عورت کا محرم کے بغیر عمرہ کرنا

] ہم دونوں میاں بیوی نے عمرہ پر جانے کا پروگرام بنایا ہے، ہمارے ساتھ ایک عمر رسیدہ خاتون بھی جانا چاہتی

! بخاری، الحج: ۱۵۳۹. @ مسلم، الحج: ۱۱۹۰.

ہے جب کہ ہمارا اس کے ساتھ کوئی خونی رشتہ نہیں ہے، کیا اس طرح کی عورت محرم کے بغیر عمرہ پر جاسکتی ہے؟

] ہر مسلمان کا دل زیارت حرمین کے لیے بہت مچلتا ہے، ائمہ اسلام نے اس زیارت کے لیے درج ذیل پانچ شرائط بیان کی ہیں:

☆ اسلام ☆ بلوغت ☆ عقل

☆ حریت ☆ استطاعت

استطاعت سے مراد اخراجات سفر ہیں جیسا کہ رسول اللہ e نے اس کی وضاحت کی ہے مگر خواتین کے لیے ایک مزید شرط بھی ہے کہ زیارت حرمین کے اس مقدس سفر میں اس کا رفیق سفر اس کا خاوند یا کوئی محرم رشتے دار ہو، محرم کے بغیر ایک مسلمان خاتون کو سفر کرنے کی اجازت نہیں۔

جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''کوئی عورت اپنے محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔'' 1

جب آپ نے یہ حکم سنایا تو حاضرین میں سے ایک شخص کھڑا ہو کر عرض کرنے لگا، یا رسول اللہ e! میری بیوی حج پر جانے کا پروگرام رکھتی ہے جب کہ میرا نام فلاں فلاں غزوہ میں لکھا جا چکا ہے۔ رسول اللہ e نے فرمایا:

''تم جاؤ اور اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو۔''

یہ حدیث اس امر کی واضح دلیل ہے کہ مسلمان خاتون کے لیے سفر حج میں کسی نہ کسی محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ e نے اپنے صحابی کو جہاد سے رخصت دے کر بیوی کے ساتھ حج کرنے کا حکم دیا۔

لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں اس کے متعلق بھی لاپروائی پائی جاتی ہے اور رسول اللہ e کے اس تاکیدی حکم کا لحاظ نہیں رکھا جاتا اور جذبات سے مغلوب ہو کر جعلی طور پر کسی اجنبی کو اپنا ''محرم'' بنا کر حرمین کا سفر اختیار کیا جاتا ہے۔ کچھ حضرات رسول اللہ e کی ایک پیشین گوئی سے محرم کے بغیر سفر کرنے کا مسئلہ کشید کرتے ہیں، وہاں آپ نے صرف آئندہ ہونے والے ایک واقعہ کی خبر دی اور محرم کے بغیر سفر کرنے کا فتویٰ نہیں دیا۔ صورت مسئولہ میں ایک عمر رسیدہ خاتون محرم کے بغیر عمرہ پر نہیں جا سکتی۔ واللہ اعلم

مقام تنعیم سے عمرہ کرنا

] کچھ لوگ عمرہ کرنے کے لیے جاتے ہیں اور عمرے سے فارغ ہونے کے بعد مقام تنعیم سے احرام باندھ کر دوبارہ عمرہ کرتے ہیں، ایسے عمرہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

[سیدہ عائشہ r جب حج کے لیے رسول اللہ e کے ہمراہ آئیں تو آپ شرعی عذر کی بنا پر حج سے پہلے عمرہ نہ کر سکیں، آپ نے رسول اللہ e سے عرض کیا، یا رسول اللہ e! آپ لوگ حج اور عمرہ کر کے جا رہے ہیں جب کہ میں نے

! مسلم، الحج: ٣٢٧٢.

صرف حج کیا ہے۔

تو آپ e نے ان کے بھائی سیدنا عبدالرحمن بن ابوبکر W سے فرمایا کہ تم اپنی ہمشیرہ کو مقام تنعیم لے جاؤ تا کہ وہاں سے احرام باندھ کر عمرہ کرے۔'' 1

ہمارے رجحان کے مطابق اگر کسی عورت کو سیدہ عائشہ r جیسا عارضہ لاحق ہو جائے تو وہ مقام تنعیم سے عمرہ کر سکتی ہے۔ وہاں سے احرام باندھ کر عمرہ کرنے کی عمومی اجازت محل نظر ہے کیوں کہ ان کے ہمراہ عبدالرحمن بن ابوبکر W بھی تھے، انہوں نے اس ''اجازت'' سے فائدہ نہیں اٹھایا اور وہ بغیر احرام کے واپس آئے تھے، انہوں نے عمرہ نہیں کیا، لہٰذا عمرہ کرنے والوں کو چاہیے کہ جب وہ عمرہ سے فارغ ہو جائیں تو وہ اپنا زیادہ وقت بیت اللہ میں گزاریں اور طواف کرتے رہیں کیوں کہ یہ سعادت دوسرے کسی مقام پر حاصل نہیں ہوتی۔ اگر طواف کرتے کرتے تھک جائے تو بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرے یا اذکار میں مصروف ہو جائے۔ مقام تنعیم سے جو مروجہ عمرے کیے جاتے ہیں وہ انتہائی محل نظر ہیں۔ اگر عمرہ کرنا ہے تو اس کے لیے نیا سفر کیا جائے اور میقات پر جا کر احرام باندھے اور عمرہ کرے۔ واللہ اعلم

مقروض کے لیے حج کی ادائیگی

] میرے پاس اتنا سرمایہ موجود ہے کہ میں حج کر سکتا ہوں، لیکن میں مقروض ہوں، کیا ایسے حالات میں مجھے قرض اتارنا چاہیے یا حج کرنا ضروری ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں میری رہنمائی کریں۔

[قرض کے متعلق بہت سخت وعید ہے، رسول اللہ e اپنی نماز میں دعا کیا کرتے تھے:

''اے اللہ! میں گناہ اور قرض سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں۔''

سیدہ عائشہ r نے سوال کیا یا رسول اللہ e آپ قرض سے اس قدر پناہ کیوں طلب کرتے ہیں؟

آپ e نے فرمایا: ''بلاشبہ جب آدمی مقروض ہوتا ہے تو بات بات پر جھوٹ بولتا ہے اور وعدہ کرتا ہے تو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔'' 2

ایک حدیث میں رسول اللہ e نے قرض لینے کو ''خودکشی'' قرار دیا ہے۔ 3

ہمارے رجحان کے مطابق اگر انسان کے پاس اس قدر مال موجود ہو کہ اس سے قرض کی ادائیگی ہو سکے تو اسے سب سے پہلے قرض ادا کرنا چاہیے، قرض کی موجودگی میں مال دار آدمی حج کے لیے صاحب استطاعت نہیں۔ اگر اس کا قرض کاروباری ہے، جس میں آئی چلائی ہوتی رہتی ہے تو اسے چاہیے کہ وہ حج بیت اللہ کے لیے اسے رکاوٹ نہ بننے دے۔ اس کے علاوہ اگر اس نے گھریلو ضروریات کے لیے قرض لیا ہے اور وہ اس کے پاس موجود مال سے بہت کم ہے یعنی وہ بچے ہوئے مال سے حج

! بخاری، العمرہ: ۱۷۸۵. @ بخاری، الاستقراض: ۲۳۹۷.
مستدرک حاکم: ج۲،ص ۲۶.

کرسکتا ہے تو چاہیے کہ اپنا قرض اتار کر حج کرے، اگر قرض وصول کرنے والوں کا مطالبہ ہے کہ اسے جلدی ادا کرو تو اسے قرض اتارنا چاہیے۔ اگر ان کی طرف سے مہلت ہے کہ جب میسر ہو قرض اتار دیا جائے تو ایسے حالات میں اسے حج کرنا چاہیے۔ کیوں کہ حج بھی فرض ہے، شاید بعد میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ وہ حج نہ کر سکے، لہٰذا اسے وقت غنیمت سمجھتے ہوئے حج بیت اللہ کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ غیب سے ضرور قرض کی ادائیگی کا بندوبست کر دے گا۔ واللہ اعلم

غلاف کعبہ کو چومنا

] ہم نے کچھ لوگوں کو دیکھا ہے کہ طواف کعبہ کے دوران وہ غلاف کعبہ کو چومتے ہیں اور اس پر ہاتھ پھیر کر اپنے چہرے پر ملتے ہیں، غلاف کعبہ کو چومنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کے متعلق رہنمائی کریں۔

[غلاف کعبہ تیار کرنا اور اسے بیت اللہ کو پہنانا ایک بہترین عمل ہے۔ دور جاہلیت سے اس مستحسن روایت کو باقی رکھا گیا ہے اور رسول اللہ e نے فتح مکہ کے وقت اپنے قول وعمل سے اس پر مہر تصدیق ثبت کی ہے، لیکن اس کے باوجود غلاف کعبہ کو چھونا اور اسے چومنا، اسے چھو کر ہاتھوں کو تبرک کے طور پر اپنے چہرے پر پھیرنا بدعت ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ e اور آپ کے جانثار صحابہ کرام [سے ایسا کرنا ثابت نہیں۔ یہ تو غلاف کعبہ ہے، ہمارا کعبہ شریف کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ اس کے جس حصے کو رسول اللہ e نے چوما ہے وہی مشروع ہے، اس کے علاوہ دوسرے کسی حصے کا استلام کرنا صحیح نہیں۔ جیسا کہ ابوشعثاء نے ایک مرتبہ کہا کہ بیت اللہ کے کسی حصے سے کون پرہیز کرتا ہے کیوں کہ سیدنا امیر معاویہ t بھی تمام ارکان کعبہ کا استلام کرتے تھے تو ان سے سیدنا عبداللہ بن عباس w نے فرمایا کہ

''ان دونوں کونوں یعنی رکن شامی اور رکن عراقی کو بوسہ نہیں دیا جاتا۔''

سیدنا امیر معاویہ t نے فرمایا کہ ''بیت اللہ کی کوئی چیز متروک نہیں۔

سیدنا عبداللہ بن الزبیر w بھی تمام ارکان کعبہ کا استلام کرتے تھے۔'' 1

ایک روایت میں ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس w نے سیدنا امیر معاویہ t کو جواب دیا:

''تمہارے لیے اللہ کے رسول e بہترین نمونہ ہیں اور میں نے رسول اللہ e کو حجر اسود اور رکن یمانی کو چھوتے دیکھا ہے۔'' اس پر سیدنا امیر معاویہ t نے جواب دیا: ''آپ صحیح کہتے ہیں۔'' 2

سیدنا امیر معاویہ t نے جو کچھ فرمایا اور سیدنا عبداللہ الزبیر w نے جو کچھ کیا ان کا ذاتی فہم ہے مگر رسول اللہ e کا عمل ان تمام حضرات کے قول وعمل پر مقدم ہے۔

ان احادیث وآثار کی بناء پر غلاف کعبہ کو چھونا اور اسے چومنا رسول اللہ e سے ثابت نہیں۔ لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں سیدنا عمر t کا ٹھوس عقیدہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ آپ t نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور فرمایا: ''اگر میں نے

! بخاری، الحج: ۱۶۰۸. @ فتح الباری، ج۳، ص ۵۹۸.

رسول اللہ e کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں کبھی تجھے بوسہ نہ دیتا۔'' 1

بہر حال غلاف کعبہ کو تبرک کے لیے چھونا یا اسے چومنا کتاب وسنت سے ثابت نہیں اور نہ ہی رسول اللہ e نے اس انداز سے محبت کی ہے۔ واللہ اعلم

استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا

] ہمارے ہاں کچھ مسلمان فریضہ حج کی ادائیگی میں استطاعت اور وسائل ہونے کے باوجود سستی اور تاخیر کرتے ہیں۔ آخر کار وہ دیگر مصروفیات میں پھنس کر معذور ہو جاتے ہیں، ان کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[اس میں کوئی شک نہیں کہ حج، اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اس لیے جب کسی کے حق میں اس رکن کے واجب ہونے کی شرائط پوری ہو جائیں تو اس کا بجالانا انتہائی ضروری ہے۔ ایسے حالات میں اس شخص کا اسلام ہی خطرے میں رہتا ہے جب تک وہ حج نہ کرے۔ رسول اللہ e نے بھی اس فریضہ کی ادائیگی کی بہت تاکید کی ہے جب کہ آپ کا ارشاد گرامی ہے:

''جو شخص حج کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ جلدی کرے کیوں کہ ممکن ہے آدمی بیمار ہو جائے یا اس کی سواری گم ہو جائے یا اسے کوئی اور ضرورت پیش آ جائے جس کی وجہ سے وہ حج نہ کر سکے۔'' 2

ہمارے رجحان کے مطابق اگر کسی کو نیکی کا موقع ملے تو اسے جلدی ہی انجام دے لینا بہتر ہے، ممکن ہے یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے، اس کے بعد دوبارہ موقع نہ مل سکے، اگر طاقت ہونے کے باوجود اسے مؤخر کر دیا جائے تو شاید آئندہ جانا ممکن نہ ہو یا زندگی میں اگلا حج نہ آئے یا حج آئے تو آدمی کو استطاعت نہ ہو۔

حج کی استطاعت سے مراد یہ ہے کہ گھر سے روانہ ہونے سے لے کر واپسی تک کے اخراجات برداشت کر سکتا ہو، اس میں کھانے پینے کے اخراجات بھی شامل ہیں اور سواری کا خرچہ یعنی کرایہ وغیرہ بھی، پھر اہل خانہ کے لیے بھی اس کے بعد اخراجات میسر ہوں۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے:

''جو شخص زاد سفر اور سواری رکھتا ہے جو اسے بیت اللہ لے جا سکتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ حج نہیں کرتا تو وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی بن کر، اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں۔'' 3

اگرچہ اس حدیث کے متعلق امام ترمذی نے خود ہی کلام کی ہے اس کی سند کمزور ہے تاہم وعید کے طور پر ایسی روایات پیش کی جا سکتی ہیں۔

! بخاری، الحج: ۱۶۱۰. @ ابن ماجہ، المناسک: ۲۸۸۳.
ترمذی، الحج: ۸۱۲.

سیدنا عمر t کے متعلق علامہ شوکانی نے لکھا ہے کہ وہ ان لوگوں پر بہت ناراض ہوئے تھے جو استطاعت کے باوجود حج نہیں کرتے اور کہا کرتے تھے کہ ان سے جزیہ وصول کرنا چاہیے کیوں کہ ایسے لوگ مسلمان نہیں ہیں۔'' 1

بہر حال، استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا انسان کے لیے بہت بڑی بدبختی ہے، ہاں اگر کوئی شرعی عذر ہو تو عذر کے زائل ہونے تک حج کی ادائیگی میں تاخیر کی جاسکتی ہے۔ واللہ اعلم

عمرہ کرنے کے لیے مکہ میں احرام کے بغیر آنا

] سعودی حکومت نے رش کی وجہ سے سعودیہ میں رہنے والوں پر عمرہ کرنے کی پابندی لگا رکھی ہے، کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے مکہ سے پہلے واپس کر دیا جاتا ہے، ہم نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ مکہ میں احرام کے بغیر آجاتے ہیں پھر یہیں سے احرام باندھ کر عمرہ کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے؟

[شریعت نے حج یا عمرہ کرنے کے لیے میقات مقرر کی ہیں، میقات سے باہر رہنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جب حج یا عمرہ کے لیے آئیں تو میقات سے پہلے حالت احرام میں ہوں، میقات سے احرام کے بغیر گزرنے کی ممانعت ہے، البتہ وہ لوگ جو میقات کے اندر رہتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسی جگہ سے احرام باندھیں جہاں وہ رہائش پذیر ہیں۔

چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباس W کا بیان ہے:

''رسول اللہ e نے اہل مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ، اہل شام کے لیے جحفہ، اہل نجد کے لیے قرنِ منازل اور اہل یمن کے لیے یلملم میقات مقرر کی ہے۔ یہ جگہیں حج یا عمرہ کی غرض سے مقامی اور باہر سے آنے والے لوگوں کے لیے میقات ہیں اور جو شخص حدود میقات کے اندر رہتا ہے وہ اپنے گھر سے ہی احرام باندھ کر تلبیہ کہے گا۔'' 2

اس حدیث کے مطابق میقات سے باہر رہنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ جب وہ عمرہ کی غرض سے مکہ مکرمہ آنا چاہیں تو میقات سے احرام باندھ کر گزریں، احرام کے بغیر میقات سے تجاوز کرنا جائز نہیں۔ اگر بھول کر یا لاعلمی سے ایسا ہوا ہے تو ترک واجب کی وجہ سے ایک بکری ذبح کر کے اسے فقراء حرم میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ اس واجب کے ترک کرنے کی تلافی ہو جائے۔ لیکن سائل نے سعودی حکومت کی آنکھوں میں مٹی ڈالنے کے لیے یہ چور دروازہ تلاش کیا ہے کہ وہ میقات سے احرام کے بغیر مکہ میں داخل ہوا ہے تاکہ سعودی کارندوں سے بچ کر مکہ مکرمہ آجائے۔ ہمارے رجحان کے مطابق اس نے دو قسم کی خلاف ورزی کی ہے:

☆ میقات سے احرام کے بغیر گزرا ہے جو شرعاً ناجائز ہے۔

☆ سعودی حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے جو شرعی طور پر اولوالامر ہے، ان کی بجا آوری ضروری ہے۔

! نیل الاوطار: ج۴، ص۳۱۷۔ @ بخاری، الحج: ۱۴۵۴۔

واضح رہے کہ اس قسم کی پابندیاں ہمارے ہی فائدے کے لیے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس طرح عمرہ کرنا صحیح نہیں اور نہ ہی اس قسم کے خلاف ورزی جائز ہے، پھراس کی تلافی دم وغیرہ سے بھی نہیں ہوسکتی۔ واللہ اعلم

ذبیح کون تھا؟

] قرآن کریم میں ہے کہ سیدنا ابراہیم u نے اپنے بیٹے کی قربانی دی، عام طور پر مشہور ہے کہ وہ سیدنا اسماعیل تھےلیکن عیسائیوں کا کہنا ہے کہ وہ سیدنا اسحاق u تھے، وضاحت سے بتائیں کہ ذبیح کون تھا؟

[ہمارے رجحان کے مطابق ذبیح سیدنا اسماعیل u تھے، اس کے قرائن و دلائل حسب ذیل ہیں:

☆ قرآن کریم میں ہے کہ سیدنا ابراہیم u نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے زمین پر لٹایا پھران کے فدیہ میں ایک ذبیحہ ذبح کیا، اس واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم u کو سیدنا اسحاق u کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ 1

''اور ہم نے اسے اسحاق u کی بشارت دی جو صالحین میں سے نبی ہوگا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبیح سیدنا اسحاق u نہیں بلکہ سیدنا اسماعیل u تھے۔

☆ ایک دوسرے مقام پر سیدنا اسحاق u کی ولادت کے ساتھ سیدنا یعقوب کی ولادت کا مژدہ سنایا گیا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ﴾ 2

''ہم اسے (یعنی سارہ کو) اسحاق اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دیتے ہیں۔''

اگر سیدنا اسحاق u ذبیح تھے تو ان کے بعد یعقوب کی بشارت چہ معنی دارد؟

☆ ایک روایت میں اس امر کی صراحت ہے کہ ذبیح سیدنا اسماعیل u تھے، یہ روایت اس اختلاف کے متعلق نص قطعی اور فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس w فرماتے ہیں کہ

''جب سیدنا ابراہیم u کو اپنے بیٹے کے متعلق ذبح کا حکم ہوا تو سیدنا اسماعیل u نے سفید قمیص پہن رکھی تھی، انہوں نے عرض کیا ابا جان! اس قمیص کے علاوہ میرا کوئی کپڑا نہیں جس میں آپ مجھے کفن دے سکیں، اسے اتار لیں تاکہ مجھے اس میں کفن دیا جاسکے، وہ اتارنے لگے تو پیچھے سے آواز آئی، اے ابراہیم u! تو نے واقعی اپنے خواب کو سچا کر دکھایا ہے۔ سیدنا ابراہیم u نے جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں سینگوں والا سفید خوبصورت مینڈھا تھا۔'' 3

! الصافات: ۱۱۲.   @ هود: ۷۱.

مسند امام احمد: ج۱، ص۲۹۷.

اس روایت سے معلوم ہوا کہ ذبیح سیدنا اسماعیل u تھے۔ واللہ اعلم

احرام کی پابندیاں کب تک؟

] جس انسان نے حج کرنا ہے اس پر احرام کی وجہ سے کچھ پابندیاں عائد ہوتی ہیں، وہ پابندیاں کب شروع ہوتی ہیں اور کب ختم ہوتی ہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں ہمیں اس کی تفصیل سے آگاہ فرمائیں کیوں کہ امسال ہمارا حج کرنے کا پروگرام ہے۔

[احرام کی پابندیوں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں، تو جو شخص ان مہینوں میں حج کا عزم کرے اسے چاہیے کہ حج کے دوران نہ جنسی چھیڑ چھاڑ کرے، نہ بدکرداری اور نہ ہی لڑائی جھگڑا۔''

یکم شوال سے دس ذوالحجہ تک کی مدت کا نام ''اشھر حج'' ہے۔ حج کا احرام اسی مدت کے اندر اندر باندھا جاتا ہے۔ احرام صرف دو چادریں اوڑھ لینے کا نام نہیں بلکہ حج کی نیت کرنے سے انسان محرم بنتا ہے۔ یعنی جب بھی احرام باندھ کر حج کی نیت کرے گا اس پر احرام کی پابندیاں لاگو ہو جائیں گی۔ احرام کی یہ پابندیاں دوران حج عائد رہتی ہیں تا آنکہ وہ دسویں ذوالحجہ کو جمرہ عقبہ کو کنکریاں نہ مار لے۔ حدیث میں ہے، رسول اللہ e نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی (دسویں تاریخ کو) جمرہ عقبہ کی رمی کرے تو اس کے لیے بیویوں کے سوا ہر چیز حلال ہو جاتی ہے۔'' 1

اگرچہ اس حدیث کے صحت وضعف کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے تاہم دیگر احادیث کی روشنی میں یہ مسئلہ اسی طرح ثابت ہے کہ دسویں ذوالحجہ کو رمی کے بعد حاجی کے لیے بیوی کے علاوہ دیگر ممنوعات حلال ہو جاتی ہیں۔ اسے شرعی اصطلاح میں ''حلت صغریٰ'' کہا جاتا ہے۔ طواف افاضہ کے بعد بیوی سے بھی مباشرت ہو سکتی ہے اور اسے ''حلت کبریٰ'' کہتے ہیں۔ لیکن حلت کبریٰ کی شرط ہے کہ حاجی دسویں تاریخ کو مغرب سے پہلے پہلے طواف افاضہ سے فارغ ہو جائے۔ اگر مغرب سے قبل طواف افاضہ نہیں کیا جا سکا تو احرام کی پابندیاں اس پر عائد ہو جائیں گی جس کی صراحت سیدہ ام سلمہ r سے مروی ایک حدیث میں ہے۔

آپ فرماتی ہیں:

''قربانی والے دن شام کو میری باری کی رات تھی جس میں رسول اللہ e نے میرے پاس تشریف لانا تھا۔''

چنانچہ آپ تشریف لائے اس دوران میرے پاس وہب بن زمعہ آیا اور اس کے ساتھ آلِ ابی امیہ کا ایک اور آدمی بھی تھا، ان دونوں نے قمیصیں پہن رکھی تھیں۔ رسول اللہ e نے وہب سے فرمایا:

! ابوداود المناسک: ۱۹۷۸.

''اے ابوعبداللہ! کیا تم نے طواف افاضہ کر لیا ہے؟''

اس نے کہا نہیں، یا رسول اللہ e!

رسول اللہ e نے فرمایا: ''اپنی قمیص اتار دو۔''

چنانچہ اس نے اپنی قمیص سر کی جانب سے اتار دی، اور اس کے ساتھی نے بھی اپنی قمیص سر کی جانب سے اتار دی پھر انہوں نے سوال کیا، اے اللہ کے رسول e! ایسا کیوں ہے؟

رسول اللہ e نے فرمایا:

''بلاشبہ تمہیں اس دن رخصت ہے کہ جب تم جمرہ کو کنکریاں مار لو تو تم حلال ہو جاؤ یعنی ہر اس چیز سے جو تم پر حرام کی گئی ہے سوائے بیویوں کے۔ اگر بیت اللہ کے طواف کرنے سے پہلے شام ہو جائے تو تم پھر سے محروم ہو جاؤ گے جیسا کہ کنکریاں مارنے سے پہلے تھے حتی کہ اس کا طواف کر لو۔'' 1

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دسویں تاریخ کو شام تک اگر حاجی طواف افاضہ نہ کر سکا ہو تو اسے دوبارہ احرام کی حالت میں آ جانا چاہیے۔ یعنی اسے احرام پہن لینا چاہیے اور طواف افاضہ مکمل کرنے تک اس پر احرام کی پابندیاں برقرار رہیں گے۔ واللہ اعلم

احرام کی دو رکعت

] حائضہ عورت، احرام کی دو رکعت کیسے ادا کرے گی جب کہ وہ تو نماز پڑھنے کے قابل نہیں، نیز یہ بھی بتائیں کہ حائضہ عورت زبانی قرآن کریم کی تلاوت کر سکتی ہے؟

[ہمارے ہاں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ احرام باندھ کر دو رکعت پڑھی جائیں، اکثر حضرات اس پر عمل پیرا ہیں، حالانکہ احرام کے لیے خاص طور پر کوئی نماز مشروع نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نبی e سے کوئی ایسی بات منقول نہیں، البتہ ذوالحلیفہ میں آپ نے احرام باندھ کر ظہر کی دو رکعت ادا کی تھیں، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ احرام کی کوئی خاص نماز ہے۔ صحابہ کرام [سے بھی کوئی عمل یا بات منقول نہیں جس سے معلوم ہوتا ہو کہ احرام کی دو رکعت ہیں۔ اگر کوئی عورت احرام سے قبل حائضہ ہو گئی ہے تو اسے چاہیے کہ اسی حالت میں احرام باندھ لے اور حج یا عمرہ کی نیت کرے، اسے احرام کی دو رکعت ادا کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ نماز مشروع نہیں۔ حالت احرام میں مسجد جانا منع ہے، باقی ذکر و اذکار اور تلاوت قرآن پر کوئی پابندی نہیں البتہ تقدس و احترام کے پیش نظر قرآن مجید کو ہاتھ نہ لگائے۔

بلند آواز سے تلبیہ کہنا

] حج یا عمرہ کے موقع پر با آواز بلند تلبیہ کہنا مستحب ہے۔ کیا عورتیں بھی مذکورہ تلبیہ با آواز بلند کہیں گی یا وہ آہستہ

! ابوداود، المناسک: ۱۹۹۹.

آواز سے کہیں؟ کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا حکم ہے، وضاحت سے لکھیں۔

] اس میں شک نہیں کہ عمرہ یا حج کے موقع پر با آواز بلند تلبیہ کہنا مشروع ہے۔

جیسا کہ حضرت سائب t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''میرے پاس حضرت جبریل u تشریف لائے اور انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنے ساتھیوں کو با آواز بلند تلبیہ کہنے کا حکم دوں۔'' 1

اونچی آواز سے تلبیہ کہنا بہت فضیلت رکھتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e سے دریافت کیا گیا ''کونسا حج افضل ہے؟''

تو آپ نے فرمایا: ''جس میں بلند آواز سے تلبیہ پکارا جائے اور قربانی کا خون بہایا جائے۔'' 2

حج سے متعلق اس حکم میں مرد اور عورتیں سب برابر ہیں تاہم کچھ اہل علم کہتے ہیں کہ خواتین آہستہ آواز سے تلبیہ کہیں کیوں کہ سیدنا ابن عمر t سے مروی ہے کہ آپ e نے فرمایا:

''عورت تلبیہ کہتے وقت اپنی آواز کو بلند نہ کرے۔'' 3

لیکن یہ روایت عیسیٰ بن ابی عیسیٰ الخیاط کے ضعیف ہونے کی وجہ سے قابل حجت نہیں۔ 4

اس روایت کے مقابلے میں حضرت عائشہ r کا موقف ہے کہ وہ با آواز بلند تلبیہ کہنے کی فاعل اور قائل ہیں۔

جیسا کہ حدیث میں ہے کہ نفر کی رات سیدنا امیر معاویہ t باہر نکلے تو انہوں نے بلند آواز سے تلبیہ کہنے کی آواز سنی، آپ نے پوچھا یہ کون ہے؟

لوگوں نے بتایا کہ یہ سیدہ عائشہ r ہیں۔ انہوں نے مقام تنعیم سے عمرہ کا احرام باندھا ہے، سیدہ عائشہ r سے جب اس کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا: ''اگر وہ مجھ سے پوچھتے تو میں انہیں اس کا جواب دیتی۔'' 5

حافظ ابن تیمیہ a نے اس سلسلہ میں اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ عورت بھی اس قدر بلند آواز سے تلبیہ کہے کہ اس کے ساتھ والی عورتیں اسے سن لیں۔ 6

طواف افاضہ میں تاخیر

] طواف افاضہ میں کسی حد تک تاخیر کی جا سکتی ہے، نیز بتائیں کہ طواف افاضہ کے لیے احرام ضروری ہے یا اسے عام کپڑے پہن کر بھی کیا جا سکتا ہے؟

! ابن ماجہ، المناسک: ۲۹۲۲. @ ترمذی، الحج: ۸۲۷.
بیہقی: ج۵، ص ۴۶. $ محلی ابن حزم: ج۷، ص ۹۵.
% محلی ابن حزم: ج۷، ص ۹۵. ^ مجموع الفتاویٰ: ج۲۶، ص ۱۱۵.

[ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو جب حجاج کنکریاں مار کر فارغ ہوجاتے ہیں تو احرام کی پابندی ختم ہوجاتی ہے،عورتوں کے پاس جانے کے علاوہ ہر چیز جائز ہو جاتی ہے۔ اگر مغرب سے پہلے پہلے طواف افاضہ نہ کر سکے تو دوبارہ احرام پہن لیا جائے، جیسا کہ حدیث میں ہے رسول اللہ e نے فرمایا:

''بلا شبہ ہمیں اس دن میں رخصت ہے کہ تم جب جمرہ کو کنکریاں مارلو تو حلال ہو جاؤ یعنی ہر اس چیز پر جو تم پر حرام کی گئی ہے سوائے بیویوں کے، اگر بیت اللہ کا طواف کرنے سے پہلے شام ہو جائے تو تم پھر سے محرم ہو جاؤ گے جیسا کہ تم کنکریاں مارنے سے پہلے تھے حتیٰ کہ اس کا طواف کرلو۔'' 1

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر دسویں تاریخ کو شام تک حاجی طواف افاضہ نہ کر سکا تو اسے دوبارہ احرام کی حالت میں آجانا چاہیے۔

چنانچہ حضرت وہب بن زمعہ t نے رمی جمار کے بعد احرام اتار دیا تھا لیکن مغرب کے پہلے پہلے طواف افاضہ نہ کر سکے تو رسول اللہ e نے اسے قمیص اتار دینے کا حکم دیا یعنی دوبارہ احرام پہننے کے متعلق فرمایا۔اس امر میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ طواف افاضہ کس حد تک مؤخر کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق طواف افاضہ ایام تشریق میں کر لینا چاہیے۔اس سے زیادہ مؤخر نہ کیا جائے۔

چنانچہ امام ابن تیمیہ a فرماتے ہیں:''دسویں تاریخ کو مکہ آئے اور طواف افاضہ اسی دن کرے، اس کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اسے چاہیے کہ ایام تشریق تک اسے کر لے، اس کے بعد تک مؤخر کرنا محل نظر ہے۔'' 2

بہر حال بہتر ہے کہ حجاج کرام دسویں تاریخ کو طواف افاضہ کر لیں، بہ صورت دیگر ایام تشریق تک اسے مؤخر کیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم

عورتوں کے لیے رمل کا حکم

] عمرہ اور حج کے پہلے طواف میں رمل کیا جاتا ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟ کیا خواتین بھی اس طواف میں رمل کر سکتی ہیں؟ نیز بتائیں کہ یہ کہاں سے کہاں تک کرنا چاہیے؟

[طواف قدوم کرتے وقت پہلے تین چکروں میں کندھے ہلا ہلا کر آہستہ آہستہ دوڑنا ''رمل'' کہلاتا ہے۔اس کا آغاز یوں ہوا کہ جب رسول اللہ e سات ہجری میں عمرۃ القضاء کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لائے تو مشرکین مکہ نے کہا کہ محمد e آئے ہیں اور ان کے ساتھ ایسے لوگ ہیں جنہیں یثرب یعنی مدینہ طیبہ کے بخار نے کمزور و ناتواں کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ e کو اس بات کی اطلاع دی تو آپ نے صحابہ کرام y کو حکم دیا کہ طواف کے پہلے تین چکروں میں ذرا تیز چل کر اپنی قوت کا اظہار کریں اور رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان عام رفتار سے چلیں، جب مشرکین نے انہیں دیکھا تو کہنے لگے

! ابوداود، المناسک: ۱۹۹۹۔ @ مجموع الفتاویٰ: ج۲۶، ص۱۳۸۔

کہ یہ تو ہم سے بھی زیادہ طاقتور ہیں۔ 1

اگرچہ اس وقت یہ رمل ایک خاص مقصد کے پیش نظر شروع ہوا تھا اور آج کل وہ صورت حال نہیں تاہم پھر بھی رسول اللہ e کی سنت پر عمل کرتے ہوئے رمل کو ترک نہیں کیا جا سکتا تاکہ عروج اسلام کا دور بھی یاد رہے۔

چنانچہ سیدنا عمر t نے بھی فرمایا: ''اگرچہ اب وہ صورت تو نہیں لیکن اس کے باوجود ہم کسی ایسی چیز کو نہیں چھوڑیں گے جسے ہم عہد رسالت میں کیا کرتے تھے۔'' 2

واضح رہے کہ رسول اللہ e نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر بھی طواف قدوم کرتے ہوئے رمل کیا تھا۔ حالانکہ اس وقت مشرکین کو کچھ دکھانا مقصود نہیں تھا۔ اس وقت صرف اتباع کے پیش نظر رمل کیا گیا، یہی وجہ ہے کہ اس موقعہ پر حجر اسود سے حجر اسود تک پورے چکر میں رمل کیا گیا۔ 3

یاد رہے کہ رمل صرف طواف قدوم میں ہے، طواف زیارتِ یا طواف وداع میں رمل نہیں ہوتا۔

چنانچہ سیدنا ابن عباس w سے مروی ایک روایت میں اس کی وضاحت ہے۔ 4

عورتوں کے لیے رمل کرنا مشروع نہیں۔

چنانچہ سیدہ عائشہ r فرماتی ہیں: ''اے خواتین! تمہارے ذمے رمل نہیں ہے۔'' 5 سیدنا ابن عمر t سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ 6

بہر حال مردوں کے لیے آج بھی رمل مشروع ہے اور طواف قدوم کے پہلے چکروں میں کرنا چاہیے، خواتین اس سے مستثنیٰ ہیں۔ واللہ اعلم

حج کی اہمیت

] ہمارے ہاں کچھ لوگ صاحب حیثیت ہوتے ہیں اور جسمانی طور پر بھی حج کرنے کی ہمت رکھتے ہیں، لیکن اولاد کی شادی کا بہانہ بنا کر حج نہیں کرتے، ایسے لوگوں کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[تندرست اور صاحب حیثیت انسان پر عمر میں ایک مرتبہ حج کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ 7

''لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہے وہ اس کا حج کرے۔''

! ابوداود، المناسک: ۱۸۸۶۔

@ مسند الامام احمد: ج۱، ۴۵۔

ابوداود، المناسک: ۱۸۹۱۔

$ ابوداود، المناسک: ۲۰۰۱۔

% بیہقی: ج۵، ص ۸۴۔

^ بیہقی: ج۵، ص ۸۴۔

& آل عمران: ۹۷۔

نیز حج، دین اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''اسلام کی بنیاد پانچ اشیاء پر رکھی گئی ہے ان میں سے ایک حج بیت اللہ ہے۔'' 1

سیدنا ابو ہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ e نے ہمیں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے لہٰذا تم حج کرو۔'' 2

سیدنا عبداللہ بن عباس W سے ایک مرفوع روایت کے یہ الفاظ ہیں:

''حج ایک مرتبہ تو فرض ہے اور جس نے زیادہ کیا تو وہ نفلی حج ہے۔'' 3

ان احادیث کے پیش نظر ہمارا رجحان یہ ہے کہ صاحب استطاعت مسلمان پر حج کرنا فرض ہے اور اس کی ادائیگی میں سستی نہ کرے اور جس قدر ہو سکے جلدی اس فرض کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اس کے سامنے کوئی بھی ایسی ضرورت آسکتی ہے جو حج بیت اللہ سے رکاوٹ کا باعث ہو، جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''حج کی طرف جلدی کرو کیوں کہ تم میں سے کسی کو اس کا علم نہیں جو اسے پیش آنے والا ہے۔'' 4

ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جو حج کرنا چاہتا ہو وہ جلدی کرے کیوں کہ اسے کوئی بیماری لاحق ہو سکتی ہے، سواری گم ہو سکتی ہے یا کوئی اور حاجت پیش آسکتی ہے۔'' 5

بچوں کی شادی کا بہانہ بنانا محل نظر ہے، یہ قطعی طور پر حج بیت اللہ سے تاخیر کا باعث نہیں بننا چاہیے، امید ہے کہ حج بیت اللہ کے بعد دوسری ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ خود سبب پیدا کر دے گا۔ اس سلسلہ میں حضرت عمر t کا ایک فرمان ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے، آپ نے ایک دفعہ اپنے ایک ارادے کا اظہار کیا کہ میں ان شہروں کی طرف کچھ آدمی روانہ کرنا چاہتا ہوں جو ہر ایسے شخص کو دیکھ کر اس پر جزیہ مقرر کر دیں جس نے طاقت کے باوجود حج نہیں کیا کیوں کہ وہ لوگ مسلمان نہیں ہیں۔'' 6

دوران احرام انڈر ویئر کا استعمال

] کچھ لوگ جو فریضہ حج ادا کرتے ہیں وہ شلوار یا پاجامہ پہننے کے عادی ہوتے ہیں، انہیں چادر پہننا بہت مشکل ہوتا ہے، کیا وہ احرام کی چادر کے نیچے انڈر ویئر (جانگیہ) پہن سکتے ہیں تا کہ ستر کھلنے کا اندیشہ نہ رہے؟

[دوران حج یا عمرہ، احرام کی دو چادریں پہنی جاتی ہیں، ایک کو بدن پر اوڑھا جاتا ہے اور دوسری چادر کو بطور تہبند باندھا جاتا ہے۔ دوران حج، احرام کی چادروں کے علاوہ سلے ہوئے کپڑے پہننے کی اجازت نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ

! بخاری، الایمان:۸۔ @ مسلم، الحج: ۱۳۳۸۔

ابوداود، المناسک: ۱۷۲۱۔ $ مسند الامام احمد: ج۱، ص ۳۱۴۔

% ابن ماجہ، المناسک: ۲۸۸۳۔ ^ بیہقی: ج۴، ص ۳۳۴۔

رسول اللہ e نے فرمایا:

''محرم آدمی قمیص، پگڑی، شلوار اور کوٹ وغیرہ نہیں پہن سکتا۔'' 1

ہم اس مقام پر یہ وضاحت کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں کہ سلے ہوئے کپڑوں سے وہ لباس مراد ہے جو جسم کے مطابق جس کی سلائی کی گئی ہو، اگر جسم کے مطابق جن کپڑوں کی سلائی نہ کی گئی ہو مثلاً چادر کا عرض یا طول کم ہے تو اس کے ساتھ مزید کپڑے کا سلائی کے ساتھ پیوند لگا دیا جائے تو ایسا کپڑا منع نہیں ہے۔

اس وضاحت کے بعد ہم صورت مسئولہ کا جائزہ لیتے ہیں کہ جو لوگ زندگی میں دھوتی، لنگی یا تہبند پہننے کے عادی ہوتے ہیں ان کے لیے احرام کی چادریں پہننا آسان ہوتا ہے وہ تہبند باندھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے لیکن جن لوگوں نے زندگی بھر کبھی چادر نہ باندھی ہو ان کے لیے کافی مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اگر تکلف سے باندھ لیں تو چادر کھلنے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔ اگرچہ پیٹی کمر بند سے اس مشکل پر قابو پایا جاسکتا ہے اس کے باوجود بے پردہ ہونے کا خطرہ بدستور قائم رہتا ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق ایسے لوگوں کو احرام کی چادر کے نیچے انڈرویئر جانگیہ اور نیکر پہننے میں چنداں حرج نہیں، کیوں کہ اصول فقہ کا قاعدہ ہے:

''ضرورت کے پیش نظر بعض ممنوع چیزیں بھی مباح ہو جاتی ہیں''

لیکن ضرورت سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔

چنانچہ جو لوگ حضرت عائشہ r کے پالکی بردار تھے حضرت عائشہ r نے انہیں احرام کی چادر کے نیچے نیکر پہننے کی اجازت دے رکھی تھی۔ 2

حافظ ابن حجر a نے مزید روایات کی روشنی میں اس سے متعلق روایات کی بایں طور وضاحت فرمائی ہے کہ جو نوجوان ان کی پالکی اٹھانے پر مامور تھے، ہوا وغیرہ کے چلنے سے ان کی چادریں ادھر ادھر اڑتی تھیں اور ان کو بے پردہ ہونے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا، اس بناء پر حضرت عائشہ r نے انہیں حکم دیا کہ اپنی چادروں کے نیچے نیکر پہن لیا کریں جب کہ وہ بحالت احرام ہوتے تھے۔ 3

دوران احرام کمر پر بیلٹ باندھنا

] میں نے عمرہ کرنے کے لیے سعودیہ جانا ہے، احرام کی کیا پابندیاں ہیں، نیز اس بات کی بھی وضاحت کر دیں کہ دوران احرام بیلٹ باندھا جاسکتا ہے تاکہ اپنے ضروری کاغذات اور رقم وغیرہ کی حفاظت کی جاسکے؟

[ضروری کاغذات اور اپنی رقم کی حفاظت کے لیے بیلٹ یا مخصوص کپڑے کو دوران احرام باندھا جاسکتا ہے۔

! بخاری، الحج: ۱۵۴۲.   @ صحیح بخاری، الحج، باب نمبر ۱۸.

فتح الباری: ج۳، ص ۵۰۱.

رسول اللہ e سے ایک شخص نے سوال کیا کہ محرم انسان کون سے کپڑے پہن سکتا ہے؟ تو آپ e نے جائز چیزوں کی تفصیل بتانے کی بجائے احرام میں ممنوع اشیاء کی نشاندہی فرمائی۔

رسول اللہ e نے فرمایا:

''محرم انسان قمیص، پگڑی، شلوار، ٹوپی اور موزے نہ پہنے، ہاں اگر جوتا نہ ملے تو موزے پہن لے لیکن انہیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لے نیز ایسا کپڑا نہ پہنے جسے زعفران یا ورس لگی ہوئی ہو۔'' 1

احرام کے متعلق مذکورہ پابندیاں صرف مرد حضرات کے لیے ہیں البتہ عورتیں صرف زعفرانی اور ورس زدہ کپڑوں سے اجتناب کریں، اس کے علاوہ نقاب اوڑھنے پر پابندی ہے لیکن جب غیر محرم سامنے آئے تو پردہ کرنا بھی ضروری ہے۔

اس حدیث میں صرف ممنوع اشیاء کو بیان کیا گیا ہے، ان میں بیلٹ پہننے کی وضاحت نہیں لہٰذا دوران احرام اسے پیٹ پر باندھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ حفاظت کے لیے مخصوص اشیاء کا استعمال بھی آثار سلف سے ثابت ہے۔

جیسا کہ امام بخاری a بیان کرتے ہیں، سیدنا ابن عباس w نے فرمایا:

''محرم آدمی پھولوں کی خوشبو سونگھ سکتا ہے اور آئینہ بھی دیکھ سکتا ہے اور کھانے کی اشیاء مثلاً تیل، گھی کو بطور دوا استعمال کر سکتا ہے۔''

امام عطاء بن ابی رباح a کہتے ہیں کہ محرم آدمی انگوٹھی پہن سکتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر w نے بحالت احرام طواف کیا، اس دوران انہوں نے اپنے پیٹ پر کپڑا باندھ رکھا تھا۔

سیدہ عائشہ r نے ان لوگوں کے لیے بحالت احرام جانگیہ پہننے میں کوئی مضائقہ نہیں خیال کیا جو آپ کا ہودج اونٹ پر رکھا کرتے تھے۔ 2

واضح رہے کہ خوشبو کی چند اقسام حسب ذیل ہیں:

☆ اس میں زعفران یا ورس کی ملاوٹ ہوتی ہے، اسے عام طور پر عورتیں استعمال کرتی ہیں، یہ خوشبو مردوں کے لیے کسی حالت میں جائز نہیں خواہ احرام سے پہلے ہو یا بعد میں۔

☆ اس میں کسی چیز کی ملاوٹ نہیں ہوئی، اس کے استعمال کی دو صورتیں ہیں:

(ا) احرام سے پہلے آدمی اسے استعمال کر سکتا ہے اگرچہ اس کے اثرات، احرام کے بعد بھی موجود رہیں۔

(ب) احرام کے بعد اسے استعمال کرنا جائز نہیں۔

☆ وہ خوشبو جسے وقتی طور پر سونگھا جا سکتا ہے جیسے پھول وغیرہ، انہیں دوران احرام بھی سونگھنے کی اجازت ہے۔

بہرحال دوران احرام بیلٹ باندھنا جائز ہے اور اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ واللہ اعلم

! بخاری، الحج: ۱۵۴۲. @ بخاری، الحج، باب: ۱۸.

دوران احرام نکاح کرنا

] کیا دوران احرام نکاح کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق وضاحت سے لکھیں کیوں کہ کتب حدیث میں اس مسئلہ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ محرم آدمی نکاح کر سکتا ہے جب کہ دوسری احادیث میں اس کی ممانعت بھی آئی ہے، اس کی وضاحت کر دیں۔

[اس مسئلہ کے متعلق امام بخاری a نے اپنی صحیح میں دو عنوان قائم کیے ہیں:

☆ ''باب تزویج المحرم 1'' ''باب نکاح المحرم 2''...

پھر انہوں نے ان عنوانات کے تحت سیدنا عبداللہ بن عباس w سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے:

''رسول اللہ e نے بحالت احرام سیدہ میمونہ r سے نکاح کیا ہے۔'' 3

امام بخاری a کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں محرم نکاح کر سکتا ہے جب کہ سیدنا عثمان t سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ محرم انسان نہ نکاح کرے نہ نکاح کروائے اور نہ ہی نکاح کا پیغام بھیجے۔ 4

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم انسان کو حالت احرام میں نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔ ہمارا رجحان بھی یہی ہے کہ محرم آدمی نکاح نہیں کر سکتا، اس موقف کی تائید سیدہ میمونہ r کے اپنے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

آپ r نے فرمایا کہ رسول اللہ e نے مجھ سے نکاح کیا تو اس وقت ہم دونوں حالت احرام میں نہیں بلکہ حلال تھے۔ 5

اس صراحت کے پیش نظر سیدنا عبداللہ بن عباس r سے مروی حدیث کی دو تاویلیں کی جاتی ہیں:

☆ سیدنا عبداللہ بن عباس w کا بیان وہم پر مبنی ہے جیسا کہ سیدنا سعید بن مسیب a فرماتے ہیں کہ سیدنا ابن عباس w کو وہم ہوا کہ رسول اللہ e نے سیدہ میمونہ r سے حالت احرام میں نکاح کیا تھا۔ 6

☆ جب سیدنا عبداللہ بن عباس w کو علم ہوا تو اس وقت رسول اللہ e محرم تھے۔ انہوں نے اپنے علم کے مطابق کہہ دیا کہ آپ نے حالت احرام میں نکاح کیا۔

بہر حال ہمارے نزدیک محرم آدمی کے لیے نکاح کرنا یا نکاح کروانا جائز نہیں، جیسا کہ احادیث میں اس امر کی صراحت موجود ہے۔ اس بناء پر سیدنا ابن عباس w کی مذکورہ روایت مرجوح یا قابل تاویل ہے۔ واللہ اعلم

نوٹ:...... امام بخاری کے نزدیک بھی نکاح سے مراد صرف عقد کرنا ہے کیوں کہ دوران احرام مباشرت کرنے سے حج یا عمرہ فاسد ہو جاتا ہے۔

! بخاری، الحج: باب نمبر ۱۲.

@ بخاری، النکاح: باب نمبر ۳۱.

بخاری، الحج:۱۸۳۷۔ بخاری، النکاح:۵۱۱۴.

$ مسلم، النکاح: ۳۴۴۶.

% ابوداود، المناسک: ۸۴۳.

^ مسند امام احمد: ج۶، ص۳۳۲.

حائضہ عورت کے لیےطواف وداع

] امسال ہم میاں بیوی دونوں حج پر گئے، حج سے فراغت کے بعد جب ہماری واپسی کا پروگرام بنا تو میری بیوی حیض سے دوچار ہوگئی اور طواف وداع نہ کرسکی کیوں کہ واپسی کی سیٹ کنفرم تھی، ایسی حالت میں اسے کیا کرنا چاہیے؟

[امام بخاری a نے اس مسئلہ کے متعلق ایک عنوان قائم کیا ہے:

((باب المراة تحیض بعد الافاضة))

''اس عورت کا بیان جسے طواف کے بعد حیض آجائے۔'' 1

اس کے بعد امام بخاری a نے سیدہ عائشہ r سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ حج سے واپسی کے وقت سیدہ صفیہ r کو حیض آگیا تو رسول اللہ e نے فرمایا: ہمیں اب اس کی خاطر یہاں رکنا پڑے گا۔ کیا اس نے تمہارے ساتھ دسویں تاریخ کو طواف افاضہ نہیں کیا تھا؟

میں نے بتایا کہ کیوں نہیں، اس نے طواف افاضہ کیا تو آپ e نے فرمایا کہ اسے واپسی کی تیاری کرنا چاہیے۔ 2

ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اسے طواف وداع چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہیں۔ 3

سیدنا ابن عباس w کا فتویٰ ہے کہ حائضہ عورت نے ایک افاضہ کرلیا تو اسے طواف وداع کی ضرورت نہیں اور وہ اس کے بغیر واپس اپنے وطن آسکتی ہے۔ 4

تقریباً تمام صحابہ کرام [کا اس مسئلہ پر اتفاق ہے، اس بناء پر سائل کی بیوی نے اگر دسویں تاریخ کو طواف افاضہ کرلیا تھا تو اسے طواف وداع کے بغیر واپس وطن آنے میں کوئی حرج نہیں، اس سلسلہ میں اس کا حج مکمل ہے۔ واللہ اعلم

طواف وداع کے بعد خریداری

] میں نے رمضان المبارک سے پہلے عمرہ کیا، واپسی سے پہلے میں نے طواف وداع کیا اور بازار سے کچھ خریداری بھی کی، اب کچھ دوستوں کا کہنا ہے کہ طواف وداع کے بعد اپنے گھر روانگی ہونا چاہیے، خریداری وغیرہ میں مصروف ہونا صحیح نہیں رہنمائی فرمادیں۔

[عمرہ کرنے کے بعد طواف وداع کرنا ضروری نہیں، ہاں اگر کوئی کرلے تو بہتر اور افضل ہے لیکن اس کے بغیر عمرہ کرنے والے کا عمرہ مکمل ہے، البتہ حج کرنے والے کے لیے طواف وداع کرنا ضروری ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

! بخاری، الحیض: ۲۷۔
@ بخاری، الحیض: ۲۹۴۔
# بخاری، الحج: ۱۷۵۷۔
$ بخاری، الحج: ۱۷۶۰۔

”بیت اللہ کا طواف وداع کیے بغیر کوئی شخص اپنے گھر روانہ نہ ہو۔“ 1

رسول اللہ e کا مذکورہ خطاب حجاج کرام کے لیے تھا، طواف و داع کرنے کے بعد اگر کسی کو کوئی چیز خریدنے کی ضرورت پڑے تو خریداری کرسکتا ہے، اس کے متعلق کوئی ممانعت نہیں۔ اگر خریداری کرنے میں طویل مدت صرف ہو جائے تو از راہ احتیاط دوبارہ طواف وداع کرے، اگر عرف عام کے مطابق وہ مدت دراز نہیں تو دوبارہ طواف وداع کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال عمرہ کرنے والے پر طواف وداع ضروری نہیں، اگر کسی نے یہ طواف کرلیا اور اسے کسی چیز کو خریدنے کی ضرورت پڑی ہے تو وہ خریداری کرسکتا ہے، اس میں چنداں حرج نہیں اور نہ ہی اس پر کوئی دم یا تاوان پڑتا ہے۔ واللہ اعلم

! مسلم، المناسک: ١٣٢٧.

میت کی طرف سے روزے رکھنا

] میری والدہ بیمار تھیں، وہ رمضان المبارک کے روزے نہ رکھ سکی تھیں، اب وہ وفات پا چکی ہیں، کیا ہمیں ان کے قضاء شدہ روزے رکھنے کی شرعاً اجازت ہے یا ہم ان کی طرف سے فدیہ ادا کریں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

[اگر کوئی شخص وفات پا جائے اور اس کے ذمے رمضان کے روزے ہوں تو مرنے والے کی طرف سے قضا شدہ روزوں کا فدیہ دیا جائے، ورثاء کو روزے رکھنے کی اجازت نہیں۔

جیسا کہ سیدنا ابن عباس W کا اس سلسلہ میں فتویٰ حسب ذیل ہے:

’’کوئی شخص دوسرے کی طرف سے نماز نہ پڑھے اور نہ ہی کوئی شخص دوسرے کی طرف سے روزے رکھے بلکہ ہر دن روزے کے بدلے میں اس کی طرف سے گندم کا ایک مد کھانا کھلائے۔‘‘ 1

اس سلسلہ میں سیدہ عائشہ W سے مروی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

’’جو شخص فوت ہو جائے اور اس پر روزے ہوں تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے گا۔‘‘ 2

اس حدیث میں ’’روزوں‘‘ سے مراد رمضان کے روزے نہیں بلکہ نذر کے روزے ہیں کیوں کہ دوسری احادیث میں اس کی صراحت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس W سے روایت ہے کہ ایک عورت نے سمندری سفر کیا اور ایک مہینہ روزے رکھنے کی نذر مانی، پھر وہ روزے رکھنے سے پہلے ہی فوت ہوگئی تو اس کی بہن نے رسول اللہ e سے اس کے متعلق مسئلہ دریافت کیا تو آپ e نے فرمایا:

’’وہ اپنی بہن کی طرف سے روزے رکھے۔‘‘ 3

اسی طرح ابن عباس W سے ہی مروی ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ e کے پاس ایک عورت آئی اور عرض کیا، یا رسول اللہ! میری ماں فوت ہوگئی ہے اور اس پر نذر کے روزے باقی ہیں تو کیا میں اس کی طرف سے روزے رکھوں

! السنن الکبریٰ للنسائی: حدیث نمبر:۲۹۱۸. @ بخاری، الصوم:۱۹۵۲.
السنن الصغریٰ، الایمان والنذور: ۳۸۴۷.

تو آپ e نے فرمایا:

’’تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تمہاری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تو اسے ادا کرتی تو اس کی طرف سے ادا ہو جاتا۔‘‘

اس نے عرض کیا جی ہاں۔

تو آپ e نے فرمایا: ’’تم اپنی ماں کی طرف سے روزے رکھو۔‘‘ 1

سیدہ عائشہ r سے سوال ہوا کہ میری ماں فوت ہوگئی ہے اور اس کے ذمے رمضان کے روزے باقی تھے، کیا میں اس کی طرف سے رمضان کے روزے رکھ سکتی ہوں؟ تو آپ r نے جواب دیا:

’’نہیں! بلکہ ان کی طرف سے ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دو، یہ اس کی طرف سے تمہارے روزے رکھنے سے بہتر ہے۔‘‘ 2

صورت مسئولہ میں میت کی طرف سے رمضان کے فوت شدہ روزوں کا فدیہ دے دیا جائے اور خود ورثاء کو روزے رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم

طلوع فجر سے پہلے روزہ کی نیت

] ایک آدمی آغاز رمضان کے اعلان سے پہلے سو جاتا ہے اور طلوع فجر کے بعد اسے معلوم ہوا کہ ماہِ رمضان شروع ہو چکا ہے، لیکن وہ رات کے وقت سونے کی وجہ سے روزے کی نیت نہیں کر سکا، اب اس کے لیے کیا حکم ہے؟ وہ روزہ رکھے یا بعد میں اس کی قضا دے؟

[رمضان المبارک کے روزوں کے لیے طلوع فجر سے پہلے رات کے وقت نیت کرنا ضروری ہے، جو شخص رات کے وقت رمضان کے روزے کی نیت نہیں کرتا اور اس کے بغیر ہی روزہ رکھ لیتا ہے، اس کا روزہ نہیں۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’جس نے فجر سے قبل رات کو روزے کی نیت نہیں کی اس کا روزہ نہیں۔‘‘ 3

واضح رہے کہ نیت کا تعلق دل سے ہے، زبان سے نیت کرنا قرآن وسنت سے ثابت نہیں۔ مختلف کتابچوں اور کیلنڈروں میں روزے کی نیت کے الفاظ شائع کیے جاتے ہیں وہ بے اصل اور بے بنیاد ہیں، البتہ نفلی روزے کی نیت موقع پر بھی کی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ رات کے وقت اس کی نیت کر کے سوئے۔

جیسا کہ سیدہ عائشہ r سے مروی ہے کہ ایک دن رسول اللہ e میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا:

’’کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟‘‘

! صحیح مسلم، الصوم: ۲۶۹۶۔ @ شرح مشکل الآثار: ج۶، ص۱۷۸۔

ابوداود، الصیام:۲۴۵۴۔

ہم نے عرض کیا نہیں، یہ سن کر آپ e نے فرمایا:

''تب میں روزے دار ہوں۔'' 1

صورت مسئولہ میں جو شخص ماہ رمضان ثابت ہونے سے قبل یا اس کا اعلان ہونے سے پہلے سو گیا اور طلوع فجر کے بعد بیدار ہوا جب کہ اس نے رات کے وقت روزے کی نیت نہیں کی تھی تو اس کے متعلق جمہور اہل علم کی رائے ہے کہ اسے رمضان کے بعد اس روزے کی قضا دینا ہوگی۔ البتہ احترام رمضان کے پیش نظر اسے کھانے پینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ احناف کے نزدیک چونکہ زوال آفتاب سے پہلے پہلے فرض روزے کی نیت کی جاسکتی ہے، اس کے لیے رات کے وقت نیت کرنا ضروری نہیں، لہٰذا ایسا شخص جب بیدار ہو تو روزے کی نیت کر لے اور کچھ کھائے پیئے بغیر اپنا روزہ پورا کرے اور اسے بعد میں قضا دینے کی ضرورت نہیں۔ چونکہ جمہور اہل علم کے نزدیک رات کو فرض روزے کی نیت کرنا ضروری ہے، اس لیے مذکورہ شخص کا روزہ نہیں۔ ہمارا رجحان بھی یہی ہے کہ اس شخص نے رات کو روزے کی نیت نہیں کی اس لیے اس کا روزہ نہیں۔ جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے البتہ احتیاط کے پیش نظر اسے دن کے وقت کھانے پینے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم

اذانِ تہجد یا اذانِ سحر

] ہمارے ہاں مساجد میں فجر کی دو اذانیں ہوتی ہیں، ان دونوں کے درمیان تقریباً ایک گھنٹے کا فاصلہ ہوتا ہے، پہلی اذان کو اذان تہجد کہا جاتا ہے، جب کہ کچھ اہل علم اذان اول کو صحیح نہیں کہتے، کیا اذان اول کا ثبوت ہے اور اسے اذان تہجد ہی کہا جاتا ہے؟ وضاحت کریں۔

[رسول اللہ e کے عہد مبارک میں نماز فجر سے پہلے دو اذانیں ہوا کرتی تھیں۔ پہلی اذان کے لیے سیدنا بلال t تعینات تھے جب کہ دوسری اذان سیدنا ابن ام مکتوم t کہا کرتے تھے۔ پہلی اذان فجر کاذب کے بعد اور دوسری اذان فجر صادق کے بعد دی جاتی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''فجر کی دو اقسام ہیں، ایک فجر جس میں کھانا حرام اور نماز حلال ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں نماز حرام اور کھانا حلال ہوتا ہے۔'' 2

ایک روایت میں ہے کہ ''وہ فجر جس میں کھانا حرام ہوتا ہے وہ افق میں دائیں بائیں پھیلی ہوتی ہے اور دوسری فجر کاذب جو بھیڑیئے کی دم کی طرح فضا میں بلند ہوتی ہے۔'' 3

پہلی اذان کا مقصود بایں الفاظ بیان ہوتا ہے، رسول اللہ e نے فرمایا:

''تمہیں بلال کی اذان سحری کھانے سے ہرگز نہ روکے کیوں کہ وہ رات میں اذان دیتا ہے تا کہ تمہارا قیام کرنے

! مسلم، الصیام: ۱۱۵۱. @ صحیح ابن خزیمہ: ج۱، ص۱۸۵.

مستدرک حاکم: ج۱، ص۵۹۱.

والا لوٹ جائے اور سونے والا متنبہ ہو جائے۔'' 1

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی اذان تہجد کے لیے نہیں ہوتی تھی بلکہ تہجد گزار حضرات کو گھر واپس بھیجنے کے لیے دی جاتی تھی تا کہ وہ نماز فجر کی تیاری کریں اور اگر روزہ رکھنا ہے تو سحری تناول کریں۔ ہمارے ہاں اس اذان کا نام اذان تہجد غلط مشہور ہو گیا ہے، چنانچہ ایک روایت میں مزید وضاحت ہے:

''بلال t رات میں اذان کہتے ہیں، لہٰذا تم سحری کھاؤ پیؤ حتی کہ ابن ام مکتوم t اذان دیں۔ یہ نابینا شخص تھے اور اس وقت تک اذان نہ کہتے تھے جب تک انہیں بتایا نہ جاتا کہ صبح ہوگئی ہے، صبح ہوگئی ہے۔'' 2

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''تم میں سے کسی کو بلال t کی اذان سحری کے متعلق دھوکے میں مبتلا نہ کرے۔ (کہ وہ رک جائے اور سحری نہ کھائے)'' 3

طلوع فجر سے قبل اذان دینا مستحب ہے۔ حافظ ابن قیم a نے اس کی مشروعیت اور اس کے استحباب کو پر زور طریقے سے ثابت کیا ہے۔ 4

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صرف رمضان میں سحری کی اذان کا اہتمام ہونا چاہیے، دیگر ایام میں اس کی ضرورت نہیں، لیکن ہمارے رجحان کے مطابق رمضان کے علاوہ دیگر ایام میں بھی اذان اول کا اہتمام کرنا مسنون و مستحب ہے کیوں کہ صحابہ کرام [تقریباً سارا سال ہی وقتاً فوقتاً روزے رکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ اس لیے پورا سال ہی انہیں اس اذان کی ضرورت رہتی تھی۔ رمضان کے علاوہ روزوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

j رمضان کے بعد ماہ شوال کے چھ روزے۔

j پورے محرم کے روزوں کو افضل الصیام کہا گیا ہے۔

j ایام بیض یعنی چاند کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ کے روزے۔

j ہر ہفتے سوموار اور جمعرات کے دن کا روزہ۔

j اکثر ماہ شعبان کے روزے بھی مسنون ہیں۔

j ذوالحجہ کے ابتدائی نو دنوں کے روزے۔

j عاشوراء محرم کا روزہ بلکہ دس محرم کے ساتھ نو محرم کا روزہ بھی رکھا جاتا تھا۔

j حجاج کرام کے علاوہ دوسرے حضرات کے لیے یوم عرفہ کا روزہ بھی بہت فضیلت کا باعث ہے۔

! بخاری، الاذان: ۶۲۱۔ @ بخاری، الاذان: ۶۱۷۔

مسلم، الصیام: ۱۰۹۴۔ $ اعلام الموقعین: ج۲، ص۳۲۵۔

j رسول اللہ e نے صیام داؤدی کو احب الصیام قرار دیا ہے، اس صورت میں آدھا سال روزوں کے ساتھ گزرتا ہے۔ یعنی ایک دن روزہ رکھا جائے اور ایک دن اسے چھوڑ دیا جائے۔

بہر حال اذان اول سارا سال چلتی تھی، اسے صرف رمضان کے ساتھ خاص کرنا انتہائی محل نظر ہے۔

احناف کے علاوہ جمہور فقہاء اور محدثین، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل s سحری کے وقت اس اذان کو مستحب کہتے ہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ ان دونوں اذانوں کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ فاصلہ بہت کم ہوتا تھا۔

جیسا کہ سیدہ عائشہ r بیان کرتی ہیں: ''ایک اترتا اور دوسرا (اذان دینے کے لیے مینارہ پر) چڑھ جاتا تھا۔'' 1

اس سے قلت میں مبالغہ مقصود ہے، ہمارے نزدیک زیادہ سے زیادہ فاصلہ نصف گھنٹہ کا ہونا چاہیے، اسے منٹوں میں بیان کیا جا سکتا ہے گھنٹوں میں نہیں۔ واللہ اعلم

رمضان کا شیڈول

] ماہِ رمضان اپنی برکتوں کے ساتھ سایہ فگن ہے، لیکن ہماری اکثریت اسے غفلت میں گزار دیتی ہے، روزہ رکھنے کے بعد اکثر لوگ سو جاتے ہیں اور دن کا اکثر حصہ نیند میں گزار دیا جاتا ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں اسے گزارنے کا کیا شیڈول ہونا چاہیے؟

[یقیناً یہ مہینہ بہت برکتوں کا حامل ہے، اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق گزارا جائے۔

ہمارے نزدیک اس پروگرام کی تفصیل حسب ذیل ہونا چاہیے:

b سحری کرنے کے بعد، نماز فجر سے پہلے تھوڑا سا وقت دعا اور تنہائی کے لیے خاص کر لیا جائے، اس میں تمام مواصلاتی آلات یعنی موبائل وغیرہ بند کر کے اپنے پروردگار سے تعلق جوڑنے کی لیے مخصوص کر لیں۔ اللہ سے دعائیں کریں اور دنیا و آخرت کی بھلائی طلب کریں یعنی اس وقت کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اور اللہ عزوجل سے اپنے قیمتی مطالبات منوانے کے لیے مخصوص کر لیں۔

b فجر کی نماز با جماعت ادا کرنے کے لیے تیاری کریں اور فجر کی سنتوں کو نماز فجر سے پہلے ادا کرنے کی عادت اختیار کریں کیوں کہ یہ دو سنت دنیا و مافیہا سے بہتر اور افضل ہیں۔ نماز فجر جماعت کے ساتھ نہایت خشوع و خضوع اور حضور قلب سے ادا کریں۔

b نماز کے بعد مسنون اذکار ضرور کریں اور کچھ وقت تلاوت قرآن کے لیے ضرور مخصوص کریں پھر طلوع آفتاب کے بعد

! ابوداود، نسائی، الاذان: ۶۴۰.

نماز اشراق ادا کریں۔

حدیث میں ہے:

’’جس نے نماز فجر با جماعت ادا کی، پھر وہاں بیٹھ کر اللہ عزوجل کا ذکر کرتا رہا تا آنکہ سورج طلوع ہو گیا پھر اس نے دو رکعت ادا کیں تو اسے ایک حج اور ایک عمرے کا ثواب ملے گا۔ حج اور عمرے کا پورا پورا ثواب ملے گا۔‘‘ 1

b نماز اشراق اور نماز ظہر کے درمیان جو وقت ہے اسے اپنے ضروری کام یا آرام میں گزاریں، اگر فرصت ہو تو کسی حدیث یا سیرت کی کتاب کا مطالعہ کریں، اپنے علم میں اضافہ کی کوشش کریں پھر نماز ظہر با جماعت ادا کریں، نماز سے پہلے ظہر کی چار رکعت ایک سلام سے پڑھیں، حدیث میں اس کی بہت فضیلت آئی ہے۔

سیدنا ابو ایوب انصاری t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

’’ظہر سے پہلے چار رکعات سے جن میں سلام نہ ہو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔‘‘ 2

b ظہر اور عصر کے درمیان کا وقت لوگ غفلت میں گزارنے کے عادی ہیں، آپ اس وقت کو اللہ کی تسبیح، تہلیل اور تکبیر میں گزاریں، رسول اللہ e پر بکثرت درود پڑھیں، نماز عصر کی تیاری کریں، اذان ہوتے ہی مسجد میں جائیں اور جماعت سے پہلے چار رکعت پڑھیں۔

حدیث میں ہے رسول اللہ e نے فرمایا:

’’اللہ اس انسان پر رحم کرے جو عصر کی نماز سے قبل چار رکعت پڑھتا ہے۔‘‘ 3

b عصر کے بعد مغرب تک بہت وقت ہے، اس سے فائدہ اٹھائیں اور تلاوت قرآن کا اہتمام کریں، خواتین افطاری کی تیاری کرتے وقت اللہ کے ذکر اور اس کی تسبیح وتہلیل میں مصروف رہیں۔ حدیث میں ہے کہ جس نے ایک دن میں سو مرتبہ سبحان اللہ و بحمدہ پڑھا اس کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔ 4

b جب غروب کا وقت قریب ہو تو ایک لحہ بھی ضائع نہ کریں، اس وقت خود کو دعا کے لیے فارغ کر دیں کیوں کہ روزے دار کے لیے قبولیت کی سب سے اہم گھڑی ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ افطاری کے وقت دعا قبول ہوتی ہے، قبلہ رو ہو کر قرآن وحدیث میں وارد جامع دعائیں پڑھنے کا اہتمام کریں اور اللہ کی بارگاہ میں اپنی ضروریات قبولیت کے یقین کے ساتھ پیش کریں۔

b افطاری کرنے کے بعد مغرب کی نماز با جماعت ادا کریں، نماز تراویح بھی با جماعت ادا کریں، احادیث میں اس کی بہت فضیلت آئی ہے۔ رسول اللہ e نے فرمایا:

! ترمذی:۵۸۶.　　@ ابوداود، الصلوٰۃ:۵۱۲۷.

مسند امام احمد: ج۲، ص۱۱۷.　　$ بخاری، الدعوات:۶۴۰۵.

''جس نے امام کے ساتھ قیام کیا تا آنکہ امام نماز سے فارغ ہو جائے تو اس کے لیے ایک رات کے قیام کا ثواب لکھ دیا جاتا ہے۔'' 1

سحری کی دعوت

] ہماری مسجد کی انتظامیہ نے رات کے وقت مسجد میں قیام کرنے والوں کے لیے سحری کے کھانے کا بندوبست کیا ہے تا کہ اللہ کے ہاں اجر وثواب لیا جائے لیکن مقامی علماء نے اسے بدعت قرار دیا ہے اور انتظامیہ کو مجبور کر کے سحری کے بندوبست سے روک دیا ہے، کیا یہ سحری کی دعوت دینا بدعت ہے؟

[رمضان المبارک میں ہر عمل خیر کا اجر وثواب دو چند کر دیا جاتا ہے۔

چنانچہ احادیث میں اس کی صراحت ہے، حدیث میں افطاری کرانے کی بہت فضیلت بیان ہوئی ہے۔

سیدنا زید بن خالد جہنی t کا بیان ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''جس نے کسی روزہ دار کا روزہ کھلوایا اس کے لیے روزہ دار کی مثل اجر ہے، بغیر اس کے کہ روزہ دار کے اجر سے کچھ کمی ہو۔'' 2

اسی طرح کسی روزہ دار کی سحری کا بندوبست کرنا بھی اللہ کے ہاں اجر وثواب کا باعث ہے۔

چنانچہ سیدنا عرباض بن ساریہ t بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ e کو رمضان المبارک میں سحری کی دعوت دیتے سنا، آپ e فرما رہے تھے: ''آؤ! اس مبارک کھانے کی طرف۔'' 3

اسی طرح سیدنا خالد بن ہمدان t کا بیان ہے کہ رسول اللہ e نے ایک آدمی کو سحری کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا: ''اس بابرکت کھانے یعنی سحری کے لیے آؤ۔'' 4

امام نسائی نے اس طرح کی دیگر احادیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''سحری کی دعوت دینا۔'' 5

سیدنا انس t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے سحری کے وقت مجھے فرمایا: ''اے انس t! میں روزہ رکھنا چاہتا ہوں، سحری کا بندوبست کرو اور مجھے کچھ کھلاؤ۔''

سیدنا انس t کہتے ہیں کہ میں کھجوریں اور پانی کا برتن لے کر آیا، رسول اللہ e نے فرمایا:

''اے انس t! کوئی آدمی دیکھو جو میرے ساتھ سحری کھائے۔''

چنانچہ سیدنا زید بن ثابت t کو بلا لایا تو انہوں نے رسول اللہ e کے ہمراہ سحری کھائی۔ 6

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ افطاری کی طرح سحری کی دعوت دینا بھی مسنون ہے۔ صورت مسئولہ میں

! ابن ماجہ، اقامۃ الصلوات:۱۳۲۷.

@ ترمذی، الصوم:۸۰۷.

ابوداود، الصیام: ۲۳۴۴۔

$ نسائی، الصیام: ۲۱۶۷.

% نسائی، الصیام: باب ۲۵.

^ مسند امام احمد: ج۳، ص۱۹۷.

جن علماء نے سحری کھلانے کی دعوت کو بدعت قرار دیا ہے ان کا یہ اقدام انتہائی محل نظر ہے۔ واللہ اعلم

روزے کی حالت میں ٹوتھ پیسٹ کا استعمال

] روزے کی حالت میں مسواک کرنا تو جائز ہے لیکن کیا روزے دار کے لیے منجن یا ٹوتھ پیسٹ کرنا بھی جائز ہے؟ یا اسے مکروہ قرار دیا جائے کیوں کہ اس کا ذائقہ ہوتا ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں ہماری رہنمائی کریں۔

[بلاشبہ روزے دار کے لیے تمام اوقات میں مسواک کرنا جائز ہے، اس سلسلہ میں بکثرت احادیث وارد ہیں، اگر مسواک کرنا ناجائز ہوتا تو رسول اللہ e اس کی وضاحت فرما دیتے اور یہ بھی واضح رہے کہ مسواک کے مختلف ذائقے ہوتے ہیں۔ مثلاً شیشم کی مسواک میٹھی ہوتی ہے اور جھاؤ کی نمکین، نیز نیم کی کڑوی ہوتی ہے، اس کے باوجود اسے جائز قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح ٹوتھ پیسٹ یا منجن کو بھی روزے کی حالت میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر ٹوتھ پیسٹ قوی الاثر ہے اور اس کا ذائقہ معدے تک پہنچ سکتا ہے تو اس قسم کے ٹوتھ پیسٹ سے روزے کی حالت میں اجتناب کرنا چاہیے۔ اگر وہ اتنا سریع الاثر اور قوی نہیں اور اس کا اثر حلق تک محدود رہتا ہے تو اس کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ منہ کا حکم ظاہر والا ہی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس W فرماتے ہیں:

> ''اگر سرکہ یا کوئی چیز چکھ لی جائے جب کہ انسان روزے دار ہو اور وہ حلق میں نہ جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔'' 1

اسی طرح امام ابن تیمیہ a فرماتے ہیں:

> ''بلا ضرورت کھانا چکھنا مکروہ ہے مگر کسی ضرورت کے پیش نظر ایسا کیا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ کلی کی طرح ہے۔'' 2

یہ آثار پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ٹوتھ پیسٹ اور منجن میں اگرچہ ذائقہ ہوتا ہے لیکن یہ حلق میں رہتا ہے، اس کے نیچے اتر کر معدہ میں نہیں جاتا، اس بنا پر روزے دار کے لیے جائز ہے کہ روزے کی حالت میں اسے استعمال کر سکتا ہے جس طرح مسواک کرنا جائز عمل ہے۔ واللہ اعلم

بحالت روزہ دانتوں کی صفائی کروانا

] مجھے دانتوں کی تکلیف کا عارضہ ہے، میں نے ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو اس نے صفائی کرانے کا مشورہ دیا، کیا روزہ کی حالت میں دانتوں کی صفائی کروائی جا سکتی ہے؟ ایسا کرنے سے روزہ تو متاثر نہیں ہوتا؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

[ہمارے دین اسلام کی بنیاد سہولت اور آسانی پر رکھی گئی ہے، اس میں ناروا قسم کی پابندیاں نہیں ہیں، دانت میں

! مصنف ابن ابی شیبہ: ج۳، ص۴۷۔ @ مجموع الفتاویٰ: ج۲۵، ص۲۶۶۔

اگر شدید درد ہے تو اسے روزے کی حالت میں نکلوایا جا سکتا ہے اور منہ کو تکلیف سے بچانے کے لیے ٹیکہ لگا کر اسے سن بھی کیا جا سکتا ہے تا کہ دانت نکالتے ہوئے تکلیف کا احساس نہ ہو۔ اس سے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اسی طرح دانتوں کی صفائی بھی کی جا سکتی ہے اور بوقت ضرورت ان کے سوراخوں کو کیمیکل کے ذریعے بھرا بھی جا سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس دوران نکلنے والے خون کو حلق سے نیچے نہ اتارا جائے اور اسی طرح مواد وغیرہ کو بھی تھوک کر باہر پھینک دیا جائے۔

عرب علماء کا بھی یہی فتویٰ ہے کہ دانت کو سن کرنے کے لیے انجکشن کا روزے کی صحت پر کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن مریض کو چاہیے کہ وہ خون اور دوا نگلنے سے احتیاط کرے، ایسا کرنا کھانے پینے کی قبیل سے ہے کہ اس سے روزہ خراب ہو جاتا ہے۔ بہر حال ان چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ واللہ اعلم

مسافر کے لیے روزہ

] کیا مسافر کے لیے روزہ رکھنا جائز ہے؟ بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ e دوران سفر روزہ رکھا کرتے تھے جب کہ روایات میں یہ بھی ہے کہ دوران سفر روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں۔ اس کے متعلق وضاحت کریں۔

[جتنی مسافت پر نماز قصر کی جا سکتی ہے، اس میں مسافر کے لیے رخصت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے اور جتنے دن روزہ نہ رکھ سکے، ان کی اختتام سفر پر قضاء دے دے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ 1

''جو شخص بیمار ہے اور سفر میں ہے وہ (روزے) چھوڑ دے اور دوسرے دنوں میں اس کی گنتی پوری کرے۔''

دراصل ہمارے رجحان کے مطابق مسافر کی کئی حالتیں ہیں، ان کے پیش نظر ان کے احکام بھی مختلف ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

☆ دوران سفر مسافر کے لیے روزہ رکھنا باعث مشقت نہیں تو اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ روزہ رکھ لے اور اسے افطار نہ کرے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ 2

''روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے۔''

سیدنا ابوالدرداء t بیان کرتے ہیں کہ ہم سخت گرمی میں رسول اللہ e کے ہمراہ ایک سفر کے لیے نکلے۔ سخت گرمی کی وجہ سے آدمی اپنے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ ہم میں کوئی بھی روزے کی حالت میں نہ تھا، البتہ رسول اللہ e اور عبداللہ بن رواحہ t روزے کی حالت میں تھے۔ 3

! البقرہ: ۱۸۵. @ البقرہ: ۱۸۴.

صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۴۵.

سیدنا حمزہ بن عمرو اسلمی t نے رسول اللہ e سے دریافت کیا کہ آیا میں دوران سفر روزہ رکھ لوں؟ کیوں کہ یہ صاحب بہت روزے رکھا کرتے تھے۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ''تیری مرضی ہے اگر چاہے تو رکھ لے اگر چاہے تو چھوڑ دے۔'' 1

جب روزہ رکھنے میں کوئی مشقت نہ ہو تو دوران سفر روزہ رکھ لینا بہتر ہے۔

☆ دوران سفر روزہ رکھنا مشقت کا باعث ہو اور نیکی کے کاموں میں رکاوٹ کا موجب ہو تو ایسے انسان کے لیے روزہ چھوڑ دینا بہتر ہے۔ اگرچہ روزہ رکھنا بھی جائز ہے۔

جیسا کہ سیدنا انس t بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ e کے ہمراہ تھے، ہم میں سے کچھ روزے دار تھے اور بعض حضرات نے روزہ چھوڑ رکھا تھا۔ آخر کار روزے دار نڈھال ہو کر گر پڑے اور روزہ چھوڑنے والوں نے خیمے لگائے اور سواریوں کے لیے پانی کا بندوبست کیا، رسول اللہ e نے یہ منظر دیکھ کر فرمایا:

''آج تو روزہ چھوڑنے والے اجر وثواب لینے میں بازی لے گئے۔'' 2

☆ روزہ ناقابل برداشت حد تک گراں ہو جو ہلاکت تک لے جائے تو ایسے حالات میں روزہ رکھنا حرام اور چھوڑ دینا واجب ہے۔

جیسا کہ فتح مکہ کے موقع پر آپ e سفر میں تھے جب آپ e کراع الغیم مقام پر پہنچے تو آپ e نے لوگوں کی حالت کو دیکھ کر برسر عام روزہ افطار کر دیا۔ آپ e کو بتایا گیا کہ کچھ لوگ ابھی تک روزہ سے ہیں تو آپ e نے فرمایا:

''یہ لوگ نافرمان ہیں۔'' آپ نے تین مرتبہ ان الفاظ کو دہرایا۔ 3

ایسے حالات میں دوران سفر روزہ چھوڑ دینا ضروری ہے۔ واللہ اعلم

بھول کر کھانے والے کو یاد دلانا

] روزہ دار اگر بھول کر کھا لے تو کیا اس کا روزہ صحیح ہے؟ سنا ہے کہ اگر روزے دار بھول کر کوئی چیز کھانے یا پینے لگے تو اسے منع نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ اسے اللہ تعالیٰ کھلا پلا رہا ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟

[روزہ کی حالت میں بھول کر کھانے پینے سے روزہ خراب نہیں ہوتا لیکن جب اسے یاد آئے تو فوراً رک جانا چاہیے اور منہ میں جو کچھ ہو اسے بھی پھینک دینا چاہیے۔ سیدنا ابوہریرہ t سے مروی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جو روزہ دار بھول کر کھا پی لے تو اسے اپنا روزہ پورا کرنا چاہیے کیوں کہ اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا پلایا ہے۔'' 4

ویسے بھی بھول کر ممنوع فعل کے ارتکاب پر انسان سے مؤاخذہ نہیں ہوتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

! بخاری، الصوم:۱۹۴۳. @ مسلم، الصیام: ۱۲۱۹.
بخاری، الصوم:۱۹۴۳. $ بخاری، الصوم: ۱۹۳۳.

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ﴾ 1

’’اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے بھول یا چوک ہو جائے تو اس پر ہمارا مؤاخذہ نہ کرنا۔‘‘

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: ’’میں نے ایسا ہی کیا۔‘‘ 2

لیکن جو شخص روزے دار کو دیکھے کہ وہ کھا پی رہا ہے تو اس پر واجب ہے کہ اسے یاد دلائے کیوں کہ روزے کی حالت میں کھانا ایک برائی ہے جس سے روکنا ضروری ہے۔ اگرچہ حالت نسیان کی وجہ سے اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا لیکن دیکھنے والے کے لیے کوئی عذر مانع نہیں۔ لہٰذا وہ اسے یاد دلائے اور اسے منع کرے۔

حدیث میں ہے: ’’تم میں سے جو شخص برائی دیکھے تو اسے ہاتھ سے مٹائے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے کہے اور اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے برا سمجھے اور یہ کمزور ترین ایمان کی علامت ہے۔‘‘ 3

بہر حال بھول کر کھانے پینے سے روزہ متاثر نہیں ہوتا۔ البتہ دیکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسے یاد دلائے اور کھانے پینے سے منع کرے۔ واللہ اعلم

کلی کرتے وقت پانی کا پیٹ میں چلے جانا

] اگر کوئی روزہ دار وضو کرے اور کلی کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر پانی پیٹ میں چلا جائے تو کیا اس سے روزہ خراب ہو جاتا ہے؟

[جب روزہ دار کلی کرتا ہے اور غیر ارادی طور پر پانی پیٹ میں چلا جاتا ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ کیوں کہ اس نے اپنے مقصد اور ارادے سے کوئی ایسا کام نہیں کیا جو روزے کی توڑ دینے والا ہو، ہاں قصداً ایسا کرنے سے روزہ ختم ہو جائے گا۔ غیر اختیاری طور پر کوئی غیر شرعی کام سرزد ہونے پر مؤاخذہ نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ﴾ 4

’’اور جو بات تم سے غلطی سے ہو گئی ہو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں لیکن جو دل کے ارادے سے کرو تو اس پر مؤاخذہ ہے۔‘‘

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ غلطی پر اللہ کے ہاں مؤاخذہ نہیں ہے۔ صورت مسئولہ میں روزے دار نے کلی کی اور غیر ارادی طور پر پیٹ میں پانی چلا گیا تو اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں اور نہ ہی اس سے روزہ خراب ہوگا۔ واللہ اعلم

احتلام اور روزہ

] میں نے روزہ رکھا ہوا تھا، دوپہر کے وقت مجھے نیند آ گئی، اس دوران مجھے احتلام ہو گیا۔ کیا میرا روزہ برقرار ہے

! البقرہ: ۲۸۶. @ مسلم، الایمان:۱۲۶.

مسلم، الایمان:۴۹. $ الاحزاب:۵.

یا احتلام ہونے سے ٹوٹ گیا ہے؟ رہنمائی فرمائیں۔

] روزہ رکھنے کے بعد اگر احتلام ہو جائے تو اس سے روزہ خراب نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ انسان کے اختیار میں نہیں۔ حالت نیند میں ویسے بھی انسان مرفوع القلم ہے جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے، لیکن اس امر کی توجہ دلانا ضروری ہے کہ احتلام کی عام طور پر دو وجہ ہوتی ہیں، ایک تو طبی کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ انسان گندا لٹریچر پڑھتا ہے، وہ فحش مناظر دیکھتا ہے تو ایسے انسان کو نیند میں احتلام ہو جاتا ہے۔ یہ دوسری وجہ سے احتلام ہونا اگرچہ روزے کے لیے خرابی کا باعث نہیں البتہ اس احتلام کے جو اسباب اختیار کیے گئے ہیں اس پر اللہ کے ہاں ضرور مؤاخذہ ہوگا۔ نیز جو لوگ رات کو فضول کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور دن کو سو کر گزارتے ہیں انہیں بھی اپنے عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

ماہِ رمضان میں وفات پانے والا

] حدیث میں ہے کہ رمضان میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رمضان میں وفات پانے والا شخص سیدھا جنت میں جائے گا اور اس کا حساب نہیں ہوگا؟

[اس میں کوئی شک نہیں کہ جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازوں کو بند کر دیا جاتا ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جنت کے دروازے عمل کرنے والوں میں نشاط پیدا کرنے کے لیے کھول دیئے جاتے ہیں تاکہ ان کے لیے داخلہ آسان ہو اور جہنم کے دروازے اس لیے بند کر دیئے جاتے ہیں تاکہ اہل ایمان گناہوں سے رک جائیں اور ان دروازوں سے داخل ہونے کا موقع نہ رہے۔ اس کا قطعاً معنی یہ نہیں کہ جو شخص رمضان میں فوت ہوتا ہے وہ بغیر حساب جنت میں جائے گا۔ کیوں کہ جنت میں داخلے کے لیے ایمان اور توحید بنیادی شرط ہے۔ معرکہ بدر رمضان میں ہوا تھا، ابوجہل اسی مہینہ میں واصل جہنم ہوا کیوں کہ وہ ایمان کی دولت سے محروم تھا۔ پھر بغیر حساب جنت میں داخل ہونے والے وہ خوش نصیب ہیں جن کی تعداد ستر ہزار ہوگی اور ان کے اوصاف احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔

ان کی تفصیل یہ ہے: ''وہ ناجائز دم جھاڑ نہیں کراتے، وہ بدشگونی نہیں لیتے، وہ آگ سے علاج نہیں کراتے، داغ نہیں لگواتے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔'' 1

ان اوصاف کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے اعمال صالحہ بھی بجالاتے ہیں جو ان پر واجب ہیں۔ بہر حال رمضان میں ایمان کے ساتھ فوت ہونا بہت بڑی سعادت ہے لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں کہ اس سے حساب نہیں لیا جائے گا۔ واللہ اعلم

ماہانہ ایام میں روزے رکھنا

] ایک لڑکی جو چھوٹی تھی، اسے ایام شروع ہو گئے، اسے علم نہیں تھا کہ ان دنوں روزے نہیں رکھے جاتے۔ اب ان

---

1 مسلم، الایمان:۲۱۸.

ایام میں رکھے گئے روزوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

] عورتیں ایام میں روزہ نہیں رکھتیں جیسا کہ رسول اللہ e نے عورت کے متعلق فرمایا ہے:

''جب عورت حائضہ ہوتی ہے تو کیا وہ نماز اور روزہ نہیں چھوڑتی؟'' 1

اگر کوئی عورت جہالت کی وجہ سے ان دنوں کا روزہ رکھتی ہے تو اس کا روزہ نہیں ہے، اسے بعد میں ان کی قضا دینا ہوگی۔ کیوں کہ عورت کو جب حیض آنا شروع ہو جاتے ہیں تو اس کے لیے احکام شریعت کی پابندی واجب ہو جاتی ہے اور حیض بلوغت کی علامات میں سے ہے۔

صورت مسئولہ میں رکھے گئے روزے قابل قبول اور صحیح نہیں ہیں، اگرچہ وہ مسئلہ سے ناواقف تھی اسے بعد میں قضا دینا ہوگی۔ اس مسئلہ کی مذکورہ صورت کے برعکس ایک صورت یہ بھی ہے کہ چھوٹی لڑکی کے ایام شروع ہو گئے اور اس نے حیا کی وجہ سے اہل خانہ کو نہ بتایا اور روزے بھی نہ رکھے تو اس پر ان دنوں ترک کردہ روزوں کی قضا واجب ہے۔ اگر لاعلمی کی وجہ سے فراغت کے بعد بھی روزے نہیں رکھے تو توبہ استغفار کے ساتھ ان دنوں کے روزوں کی قضا دینا بھی ضروری ہے۔ واللہ اعلم!

بحالت روزہ سرمہ لگانا

] کیا روزہ کی حالت میں سرمہ لگایا جا سکتا ہے؟ یا آنکھوں میں دوائی کے قطرے ڈالے جا سکتے ہیں؟ جب کہ اس کے اثرات حلق میں آ جاتے ہیں۔ نیز کان اور ناک میں دوائی ڈالنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

[روزہ کی حالت میں خوشبو لگانا بھی جائز ہے اور سرمہ استعمال کرنا بھی نیز آنکھوں میں دوائی کے قطرے ڈالنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح ضرورت کے وقت کان میں دوائی بھی ڈالی جا سکتی ہے۔ البتہ ناک میں دوائی ڈالنا جائز نہیں کیوں کہ ایسا کرنے سے دوائی کے قطرے معدے تک پہنچ جاتے ہیں جو روزے کے لیے نقصان دہ ہیں۔

چنانچہ رسول اللہ e نے سیدنا لقیط بن صبرہ t سے فرمایا تھا: ''ناک میں پانی چڑھانے میں خوب مبالغہ سے کام لو الا یہ کہ تم روزے سے ہو۔'' 2

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے کی حالت میں وضوء کرتے ہوئے ناک میں پانی ڈالتے وقت مبالغہ نہیں کرنا چاہیے، اس سے معلوم ہوا کہ ناک میں دوائی کا استعمال بھی درست نہیں، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم

نماز کے بغیر روزہ رکھنا

] ہمارے ہاں کچھ جذباتی قسم کے نوجوان رمضان کے روزے بہت اہتمام سے رکھتے ہیں، اس کے لیے وہ بھوک اور پیاس برداشت کرتے ہیں لیکن وہ نماز نہیں پڑھتے یا اس کی ادائیگی میں سستی کرتے ہیں، ایسے نوجوان روزے رکھنے

! بخاری، الحیض:۳۰۴۔ @ ابوداود، الطہارہ:۱۴۲۔

کا اجر پائیں گے؟

[انسان، جب شہادتین کی ادائیگی کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے تو سب سے پہلے نماز پنجگانہ کا ادا کرنا اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کیوں کہ شہادتین کی ادائیگی کے بعد نماز اسلام کا سب سے اہم رکن ہے، نماز کے بغیر انسان کے اسلام کا کوئی اعتبار نہیں۔

ہمارے نزدیک نماز نہ پڑھنے والوں کی حسب ذیل دو اقسام ہیں:

☆ نماز کی فرضیت اور اہمیت کا قائل ہے لیکن سستی کی وجہ سے کچھ نمازیں رہ جاتی ہیں، اگرچہ ایسا کرنا بہت بڑا جرم ہے تاہم اسے دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دیا جا سکتا۔

☆ نماز کی فرضیت کا قائل نہیں اور نہ ہی نماز کے قریب جاتا ہے، اس کے نامہ اعمال میں نماز نامی کوئی چیز نہیں، ایسے شخص کے اقرار شہادتین کا کوئی اعتبار نہیں، ایسا اسلام جس میں نماز نہ ہو اللہ کے ہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ لہٰذا وہ نوجوان جو روزہ بڑے شوق سے رکھتے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ پیاس اور بھوک بھی برداشت کرتے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے اور نماز کی فرضیت اور اہمیت کے پیش نظر اسے باجماعت ادا کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

پہلی قسم کے لوگوں کو بھی چاہیے کہ وہ نماز کی ادائیگی میں سستی نہ کریں، ہم انہیں یہ فتویٰ نہیں دیتے کہ جب انہوں نے نماز میں سستی کرنی ہے تو وہ روزہ نہ رکھیں، بلکہ انہیں یہ نصیحت کرتے ہیں کہ وہ روزے پابندی سے رکھیں اور روزہ رکھنا انہیں اللہ کے دین کے قریب کر دے گا۔ اگر وہ اللہ کے خوف کی وجہ سے روزہ رکھتے ہیں تو امید ہے کہ روزوں کا یہ اہتمام نمازوں کی باقاعدہ ادائیگی پر ابھارے گا اور جو نمازیں سستی کی وجہ سے رہ گئی ہیں وہ خالص توبہ کرنے سے ان کی تلافی بھی ہو جائے گی۔

دوسری قسم کے لوگوں کو ہم نصیحت کرتے ہیں کہ نمازوں کے بغیر روزے بے وزن اور بے کار ہیں، نمازوں کی فرضیت کا اقرار کریں اور ان کی ادائیگی کا اہتمام کریں، اس کے بعد روزے رکھیں، ایسا کرنے سے سابقہ گناہوں کی تلافی ہو جائے گی اور آئندہ بھی اللہ تعالیٰ فرائض کی ادائیگی میں مدد کرے گا اور توفیق عطا فرمائے گا۔ واللہ اعلم!

اذان فجر سن کر کھاتے رہنا

] میں دیر سے بیدار ہوتا ہوں، سحری کھاتے کھاتے اذان شروع ہو جاتی ہے یا بعض اوقات اذان کے بعد سحری کھاتا ہوں، ایسے حالات میں میرے روزے کا کیا حکم ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس طرح میرے فرض کی ادائیگی ہو جائے گی؟

[ایک مسلمان کو روزہ رکھنے کے لیے سحری کھانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''سحری کھایا کرو کیوں کہ سحری کرنا باعث برکت ہے۔'' 1

! بخاری، الصوم: ۱۹۲۳.

ہمارے اہل اسلام اور اہل کتاب کے درمیان روزے کا فرق سحری کھانا ہے۔

جیسا کہ ارشاد نبوی e ہے: ’’ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں کے درمیان فرق سحری کا کھانا ہے۔‘‘ 1

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں سحری کھانا باعث برکت ہے وہاں یہود نصاریٰ کی مخالفت بھی ہے۔

سحری کے اعتبار سے لوگوں کی تین اقسام ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہیں:

☆ جو لوگ اذان فجر سے پہلے سحری کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، ان کے لیے حکم یہ ہے کہ جب سپیدہ سحر، رات کی تاریکی سے نمایاں ہو جائے تو کھانا پینا بند کر دیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ 2

’’کھاؤ اور پیو یہاں تک تمہارے لیے صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے۔‘‘

☆ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اذان فجر سے پہلے سحری کھانا شروع کر دیتے ہیں لیکن کھانے کے دوران اذان ہو جاتی ہے، ان کے لیے حکم ہے کہ وہ اپنے کھانے کو مکمل کر لیں۔

جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے، جسے سیدنا ابو ہریرہ t بیان کرتے ہیں:

’’جب تم میں سے کوئی اذان سنے اور کھانے کا برتن اس کے ہاتھ میں ہو تو اسے اپنی حاجت کو پورا کر لینا چاہیے۔‘‘ 3

☆ کچھ لوگ اذان کے دوران یا اس کے بعد بیدار ہوتے ہیں، انہیں چاہیے کہ کچھ کھائے پیئے بغیر ہی روزہ رکھ لیں، ایسے حالات میں اذان کے دوران سحری کا آغاز کرنا یا اذان کے بعد جلدی جلدی کھانا کھا کر روزہ رکھنا صحیح نہیں۔ کیوں کہ سحری کا وقت گزر چکا ہے، وقت گزرنے کے بعد کھانا پینا خلاف شریعت ہے۔

صورت مسئولہ میں اذان کے دوران سحری شروع کرنا یا اذان کے بعد سحری کھانا روزہ پر اثر انداز ہو سکتا ہے لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم

روزہ کی حالت میں مسواک کرنا

] کچھ لوگ روزہ کی حالت میں مسواک نہیں کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ بحالت روزہ مسواک کرنے سے روزہ خراب ہو جاتا ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں ان حضرات کا موقف کہاں تک درست ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

[مسواک کرنے کی بہت اہمیت ہے اور احادیث میں اس عمل کی بہت فضیلت بیان ہوئی ہے، رمضان المبارک میں دن کے وقت یا دیگر ایسے ایام میں جب روزہ رکھا ہو مسواک کرنے سے پرہیز کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ’’مسواک کرنا منہ کی صفائی اور رب کی رضا مندی کا سبب ہے۔‘‘ 4

! مسلم، الصیام:۱۰۹۶۔ @ البقرہ:۱۸۷۔

مسند احمد، ج۲، ص۵۱۰۔ $ نسائی، الطہارہ:۵۔

رسول اللہ e بھی مسواک کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ سیدہ عائشہ r سے کسی نے سوال کیا کہ رسول اللہ e جب گھر تشریف لاتے تو سب سے پہلے کیا کام کرتے تھے؟

تو آپ r نے فرمایا: ''مسواک کرتے تھے۔'' 1

سیدنا حذیفہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e جب نیند سے بیدار ہوتے تو اپنا منہ مسواک سے خوب صاف کرتے۔ 2

سیدنا عامر بن ربیعہ t بیان کرتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ e کو روزے کی حالت میں متعدد مرتبہ وضو کے ساتھ مسواک کرتے دیکھا ہے۔'' 3

سیدنا ابو ہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''اگر میری امت پر مشکل نہ ہوتی تو میں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا۔'' 4

سیدنا جابر t اور سیدنا زید بن حارثہ t فرماتے ہیں: رسول اللہ e نے اس سلسلہ میں روزہ دار اور غیر روزہ دار کی کوئی تخصیص نہیں کی۔ 5

ان احادیث و آثار سے معلوم ہوا کہ روزہ کی حالت میں مسواک کی جا سکتی ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور جو لوگ اس مبارک عمل سے منع کرتے ہیں ان کا موقف انتہائی محل نظر ہے۔ واللہ اعلم

ماہِ رمضان کے علاوہ اعتکاف کرنا

] رمضان کے مہینہ میں اور دوسرے مہینوں میں اعتکاف کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اعتکاف صرف ماہِ رمضان کے ساتھ خاص ہے؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔

[ایک خاص کیفیت کے ساتھ کسی شخص کا خود کو مسجد میں عبادت کے لیے روک لینا اعتکاف کہلاتا ہے۔ شارع u نے اسے کسی معین وقت کے ساتھ خاص نہیں کیا۔ اس بناء پر مساجد میں اعتکاف کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سیدنا عمر t نے ایک مرتبہ رسول اللہ e سے دریافت کرنے کی غرض سے عرض کیا، یا رسول اللہ e میں نے زمانہ اسلام سے قبل نذر مانی تھی کہ مسجد حرام میں ایک رات کا اعتکاف کروں گا تو آپ e نے فرمایا:

''تم اپنی نذر پوری کرو۔'' 6

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اعتکاف کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں سیدہ عائشہ r سے روایت ہے۔ آپ r نے فرمایا: میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ e سے اعتکاف کرنے کی اجازت مانگی تو آپ نے مجھے اجازت

! مسلم، الطہارہ:۲۵۳۔ @ بخاری الوضوء:۲۴۵۔

بخاری، تعلیقاً، الصوم، قبل الحدیث:۱۹۳۴۔ $بخاری، الجمعہ:۸۸۷۔

% بخاری تعلیقاً۔ ۸ بخاری، الاعتکاف:۲۰۳۲۔

دے دی۔ میں نے مسجد میں خیمہ لگا لیا، سیدہ حفصہ r نے سنا تو انہوں نے بھی آپ کی اجازت سے خیمہ لگا لیا۔ سیدہ زینب r نے سنا تو انہوں نے بھی خیمہ کا بندوبست کر لیا۔ جب رسول اللہ e صبح اٹھے تو آپ کی نظر چار خیموں پر پڑی، آپ e نے دریافت کیا: ''یہ کیا ہے؟''

آپ کو حقیقت حال سے آگاہ کیا گیا، آپ e نے فرمایا:

''انہوں نے ثواب کی نیت سے یہ کام نہیں کیا، اس لیے ان خیموں کو اکھاڑ دیا جائے، میں انہیں اچھا خیال نہیں کرتا۔''

چنانچہ وہ اکھاڑ دیئے گئے اور آپ e نے اس رمضان میں اعتکاف نہیں کیا بلکہ شوال کے آخری عشرہ میں اعتکاف کیا۔ 1

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ رمضان اور غیر رمضان میں اعتکاف کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ امام بخاری a نے اس حدیث پر ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

((باب الاعتکاف فی شوال))2

''ماہ شوال میں اعتکاف کرنا۔''

اگرچہ مسنون یہی ہے کہ آدمی ثواب کی نیت سے مسجد میں رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرے۔ واللہ اعلم!

افطاری کا وقت

] کچھ لوگ غروب آفتاب کے بعد احتیاط کے طور پر مزید کچھ منٹ انتظار کر کے روزہ افطار کرتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

[جب سورج غروب ہو جائے اور مشرقی افق سے سیاہی نمودار ہو تو روزہ افطار کر دینا چاہیے، بلاوجہ تردد یا شک میں پڑ کر دیر نہیں کرنا چاہیے۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''جب رات سامنے آئے یعنی مشرقی افق سے سیاہی نمودار ہو جائے، دن پلٹ جائے اور سورج غروب ہو جائے تو روزہ افطار کرنے کا وقت ہو گیا، اب روزے دار کو روزہ افطار کر دینا چاہیے۔'' 3

جلدی کا مطلب یہ نہیں کہ آفتاب کے غروب ہونے سے پہلے روزہ افطار کر لیا جائے بلکہ غروب آفتاب کا یقین ہونے کے بعد روزہ افطار کیا جائے، اسی میں خیر و برکت ہے۔

چنانچہ رسول اللہ e نے ارشاد فرمایا:

''لوگ جب تک افطار میں جلدی کریں گے خیر و برکت میں رہیں گے۔'' 4

ایک دوسری حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

! بخاری، اعتکاف: ۲۰۴۱۔ @ بخاری، الصوم، باب: ۱۴۔

بخاری، الصوم: ۱۹۵۴۔ $ بخاری، الصوم: ۱۹۵۷۔

"مجھے سب بندوں میں زیادہ محبوب وہ ہے جو روزہ افطار کرنے میں جلدی کرتا ہے۔ واللہ اعلم!

بحالت روزہ بلغم نگلنا

] میں بلغمی امراض کا شکار ہوں، بعض دفعہ میرے حلق یا منہ میں بلغم آ جاتی ہے اور میں اسے روزے کی حالت میں نگل لیتا ہوں، اس کے متعلق وضاحت کریں کہ اس سے روزہ متاثر تو نہیں ہوتا؟

[بلغم کے نگل لینے سے روزہ متاثر نہیں ہوتا، اس امر پر اہل علم کا اجماع ہے کہ بلغم اگر حلق میں ہے اور وہ منہ میں نہیں آئی تو اسے نیچا کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور اگر بلغم منہ تک آ جائے تو اس کے متعلق اہل علم کے دو قول ہیں:

☆ بعض حضرات نے اسے کھانے پینے کے ساتھ ملایا ہے اور اس کے نگل لینے سے ان کے ہاں روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

☆ جب کہ کچھ اہل علم نے اسے لعاب دہن کے ساتھ ملایا ہے اور اس کے نگل لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

امام بخاری a نے حضرت عطاء اور حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے کہ روزہ دار اپنا تھوک نگل سکتا ہے۔ 1

جب کسی معاملہ میں علماء امت کا اختلاف ہو تو کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

چنانچہ جب ہمیں کسی امر کے متعلق شک ہو کہ اس سے عبادت فاسد ہوتی ہے یا نہیں تو قاعدے کے مطابق محض شک سے عبادت فاسد نہیں ہوگی، اس بناء پر ہمارا رجحان یہ ہے کہ بلغم نگلنے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ روزے دار کو چاہیے کہ وہ بلغم کو اپنے حال پر چھوڑ دے اور خود اسے منہ کی طرف نہ کھینچے اور اگر منہ میں آ جائے تو اسے باہر پھینک دے خواہ کوئی روزہ دار ہو یا نہ ہو۔ جہاں تک نگل لینے اور روزہ ٹوٹ جانے کا معاملہ ہے اس کی دلیل چاہیے۔ کتاب وسنت میں اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں۔

اس مناسبت سے ہم احناف کا ایک عجوبہ نقل کرتے ہیں، علامہ عینی نے بخاری کے اس مقام کی شرح میں لکھا ہے:

"اگر روزہ دار نے منہ میں تھوک جمع کر کے نگل لیا تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ اگر کسی دوسرے کا تھوک نگل لیا تو روزہ فاسد ہو جائے گا مگر اس پر کفارہ واجب نہیں اور اگر اس نے اپنے کسی محبوب کا تھوک نگل لیا تو روزہ فاسد ہو جائے گا اور اس پر کفارہ بھی واجب ہوگا کیوں کہ وہ اسے مکروہ خیال نہیں کرتا بلکہ اس سے لذت اور سرور حاصل کرتا ہے۔" 2

ہم اس عجوبے پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے، البتہ صورت مسئولہ میں اگر بلغم حلق کے نیچے ہو جائے یا کر لی جائے تو اس سے روزہ متاثر نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم!

رکعات تراویح کی تعداد

] ہمارے ہاں اکثر رمضان میں نماز تراویح کی تعداد کے متعلق جھگڑا ہوتا ہے، کوئی آٹھ کہتا ہے اور کسی کا بیس

! بخاری، الصوم، باب نمبر:۲۷۔ @ عمدة القاری: ج۸، ص۹۷۔

تراویح پڑھنے پر اصرار ہوتا ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا معمول کیا تھا؟ اس کی وضاحت کریں۔

] نماز تراویح کی تعداد کے متعلق فیصلہ کن حدیث درج ذیل ہیں۔

حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمن t، سیدہ عائشہ r سے سوال کرتے ہیں کہ رسول اللہ e کا رمضان میں قیام اللیل کیسا ہوتا تھا؟ آپ t نے جواب دیا: ''رسول اللہ e رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زائد نہیں پڑھا کرتے تھے۔ آپ e چار رکعت پڑھتے، ان کے خوبصورت اور لمبی ہونے کے متعلق تم مت پوچھو، پھر اسی کیفیت سے چار رکعت پڑھتے اس کے بعد تین رکعت پڑھتے۔'' 1

رسول اللہ e نے صحابہ کرام [کے ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے رمضان المبارک میں تین مرتبہ جماعت بھی کروائی، پھر فرضیت کے خطرے کے پیش نظر آپ e نے جماعت کا اہتمام ترک کردیا۔

سیدنا جابر t کا بیان ہے کہ ان تین راتوں میں بھی رسول اللہ e نے ہمیں آٹھ رکعت پڑھائی اور وتر بھی پڑھائے۔'' 2

رسول اللہ e کی وفات کے بعد سیدنا عمر بن خطاب t نے نماز تراویح با جماعت ادا کرنے کا اہتمام فرمایا جو آج تک جاری ہے۔ 3

روایات میں اس بات کی صراحت ہے کہ سیدنا عمر t نے بھی سنت کے مطابق گیارہ رکعت پڑھانے کا اہتمام کیا تھا۔ چنانچہ سیدنا سائب بن یزید t فرماتے ہیں: سیدنا عمر بن خطاب t نے سیدنا ابی بن کعب t اور سیدنا تمیم داری t کو گیارہ رکعت نماز تراویح پڑھانے کا حکم دیا تھا۔ 4

معلوم ہوا کہ نماز تراویح کی اصل اور مسنون تعداد وتر کے علاوہ آٹھ رکعت ہیں، البتہ اگر کوئی شخص بغیر سنت سمجھے محض ادائیگی نوافل کے طور پر زیادہ پڑھنا چاہے تو وہ پڑھ سکتا ہے مگر وہ گیارہ رکعت کے علاوہ دیگر تعداد کو سنت قرار دینے پر اصرار نہ کرے۔

یہ بات انتہائی افسوس ناک ہے کہ ہم لوگ تراویح کی تعداد محل نزاع قرار دیتے ہیں لیکن ان کی کیفیت ادا کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ جب کہ سیدہ عائشہ r بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ e جب قیام اللیل فرماتے تو آپ کی پنڈلیوں اور قدم پر ورم آجاتا۔ 5

اس بناء پر ہمیں تعداد تراویح کے ساتھ اس کی کیفیت ادا کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔

معتکف پر پابندیاں

] جب آدمی اعتکاف میں بیٹھ جاتا ہے تو اس پر کون کون سی پابندیاں عائد ہوتی ہیں اور کن کن کاموں کی اجازت

! بخاری، التہجد: ۱۱۴۷۔ @ مختصر قیام اللیل: ص۱۵۴۔

بخاری، التراویح: ۲۰۱۰۔ $ بیہقی: ج۱، ص۲۹۳۔

% بخاری، التہجد: ۱۱۳۰۔

ہوتی ہے؟

[اعتکاف یہ ہے کہ انسان اللہ کی عبادت کے لیے خود کو مسجد میں پابند کرلے، اس کے متعلق سیدہ عائشہ r نے رسول اللہ e کا اسوہ مبارک بیان کیا ہے۔

آپ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ e اعتکاف بیٹھتے تو کسی سخت حاجت کے بغیر گھر نہ جاتے تھے۔ 1

اس سے معلوم ہوا کہ معتکف کو بلاضرورت اپنے گھر جانے کی اجازت نہیں۔ ہاں اگر کوئی سخت ضرورت درپیش ہو جو مسجد سے نکلے بغیر پوری نہ ہوسکتی ہو تو ایسے حالات میں مسجد سے نکلنا جائز ہے۔ مثلاً:

☆ مسجد میں نہانے یا قضاء حاجت کا بندوبست نہیں تو ایسے حالات میں وہ گھر جا کر اپنی ضرورت پوری کرسکتا ہے۔ اسی طرح اگر مسجد میں پانی کا نظام خراب ہے تو گھر میں وضو کے لیے جاسکتا ہے۔

☆ گھر سے کھانا وغیرہ لانے والا کوئی نہیں تو گھر جا کر کھانا وغیرہ کھا سکتا ہے لیکن ضروری ہے کہ حاجت پوری ہوتے ہی مسجد میں واپس چلا آئے وہاں اہل خانہ کے ساتھ بات چیت میں مصروف نہ ہو۔

☆ اگر اہل خانہ اس سے مسجد میں ملاقات کے لیے آئیں اور انہیں دیر ہو جائے تو راستے پر لگانے کے لیے مسجد سے باہر نکلا جاسکتا ہے لیکن کسی بیمار کی تیمارداری کرنا، جنازہ میں شریک ہونا یا کسی سے باہر جا کر تعزیت کرنا ایسی ضروریات سے نہیں ہے۔ جیسا کہ سیدہ عائشہ r سے مروی ہے کہ آپ e نے فرمایا:

''اعتکاف کرنے کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ تیمارداری نہ کرے اور نہ ہی جنازہ پڑھے۔'' 2

ہاں اگر مسجد میں جنازہ آجائے تو پڑھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مسجد میں کسی بیمار کی تیمارداری بھی کی جاسکتی ہے۔ واللہ اعلم

اعتکاف اور خواتین

] میری والدہ اس رمضان میں اعتکاف کرنا چاہتی ہیں اور ان کا گھر میں اعتکاف بیٹھنے کا ارادہ ہے۔ کیا عورتوں کو گھر میں اعتکاف بیٹھنے کی اجازت ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[حافظ ابن حجر a اعتکاف کی لغوی اور اصطلاحی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: اعتکاف کا لغوی معنی کسی چیز کو اپنے لیے لازم کرلینا اور اپنے نفس کو اس پر مقید کر دینا ہے۔ شرعی طور پر کسی بھی مخصوص شخص کا مسجد میں خاص طریقہ کے مطابق ٹھہرنا اعتکاف کہلاتا ہے۔ 3

اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف کے تین ارکان ہیں:

☆ مسجد میں ٹھہرنا ☆ مسجد ☆ اعتکاف کرنے والا۔ 4

! بخاری، اعتکاف: ۲۰۲۹۔ @ ابوداود، الصوم: ۲۴۷۳۔

فتح الباری: ج۴، ص ۳۴۴۔ $ الفقہ علی المذاهب الاربعۃ: ج۱، ص ۵۸۲۔

اس تعریف کی بناء پر اگر اعتکاف مسجد میں نہیں تو اس اعتکاف کی کوئی حقیقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کے لیے مساجد کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ 1

''اور جب تم مساجد میں اعتکاف بیٹھے ہو تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔''

آیت کریمہ میں مساجد کا ذکر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اعتکاف کے لیے مسجد کا ہونا ضروری ہے، اس بناء پر عورتوں کا گھروں میں اعتکاف کرنا صحیح نہیں۔ سیدہ عائشہ r کا بیان ہے کہ اعتکاف جامع مسجد میں ہونا چاہیے۔ 2

سیدنا عبداللہ بن عباس w اور حضرت حسن بصری a فرماتے ہیں:

''اعتکاف اس مسجد میں ہوتا ہے جس میں نماز باجماعت کا اہتمام ہو۔'' 3

بلکہ سیدنا عبداللہ بن عباس w تو بڑی صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام کاموں میں زیادہ غصہ دلانے والے کام بدعات ہیں اور یہ بھی بدعات سے ہے کہ گھر میں مسجد بنا کر اس میں اعتکاف کرنا۔'' 4

ان آثار سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا گھروں میں اعتکاف کرنا صحیح نہیں۔ البتہ مساجد میں ان کے لیے الگ باپردہ معقول بندوبست ہونا چاہیے جہاں مرد و خواتین کا اختلاط نہ ہو۔ اگر مناسب بندوبست نہ ہو تو عورتوں کو چاہیے کہ وہ اس نفلی عبادت کے لیے اپنی عزت و عصمت کو خطرے میں نہ ڈالیں۔ ازواج مطہرات، رسول اللہ e کی حیات طیبہ میں آپ کے ہمراہ مسجد میں اعتکاف کیا کرتی تھیں اور آپ e کی زندگی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

جیسا کہ ایک حدیث میں ہے، رسول اللہ e کے بعد آپ کی بیویوں نے اعتکاف کیا۔ 5

اگرچہ اس حدیث میں مسجد کی صراحت نہیں تاہم آثار و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مسجد میں ہی اعتکاف کیا تھا۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے:

ایک مرتبہ رسول اللہ e نے اعتکاف کا ارادہ فرمایا، جب آپ اعتکاف کے لیے مسجد میں اپنے خیمہ کی طرف گئے تو دیکھا کہ آپ کی بیویوں نے بھی مسجد نبوی میں اعتکاف کے لیے خیمے لگا رکھے ہیں۔ آپ e نے یہ دیکھ کر فرمایا:

''تم نے یہ کام حسن نیت کی بناء پر نہیں بلکہ جذبہ رقابت کی وجہ سے کیا ہے۔''

آپ نے ان سب کے خیمے اکھاڑ دینے کا حکم دیا۔ پھر آپ نے اپنا خیمہ بھی اکھاڑ دیا۔ 6

! البقرہ: ۱۸۷۔
@ ابوداود، حدیث:۲۴۷۳۔
# بیہقی: ج۶، ص ۴۱۹۔
$ بیہقی: ج۶، ص ۲۱۹۔
% بخاری، الاعتکاف: ۱۱۷۲۔
^ بخاری، الاعتکاف: ۲۰۳۴۔

اگر خواتین کے لیے مسجد کے علاوہ گھروں میں اعتکاف کرنا صحیح ہوتا تو آپ انہیں گھروں میں اعتکاف کرنے کا حکم دے دیتے لیکن آپ e نے ایسا نہیں کیا۔

چنانچہ حافظ ابن حجر a لکھتے ہیں: ''اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اعتکاف کے لیے مسجد کا ہونا شرط ہے، کیوں کہ عورتوں کو گھر میں چھپ کر عبادت کرنا مشروع ہے۔ اگر اعتکاف کے لیے مسجد کا ہونا شرط نہ ہوتا تو آپ سے اجازت اور پھر منع کرنا کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ آپ انہیں گھروں کی مساجد میں اعتکاف کرنے کا حکم دے دیتے۔'' 1

اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے لیے مسجد کا اہتمام ضروری ہے لیکن اس کے لیے چند شرائط حسب ذیل ہیں:

- ☆ عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے خاوند یا سرپرست سے اجازت لے۔
- ☆ مسجد میں اعتکاف کرنے سے کسی قسم کے فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو۔
- ☆ مسجد میں پردے کا معقول بندوبست ہو، وہاں مردوں سے اختلاط کا مکمل تحفظ ہو۔
- ☆ مسجد میں سحری وافطاری کا معقول انتظام ہو یا کوئی گھر سے کھانا لانے والا ہو۔
- ☆ بحالت اعتکاف مخصوص ایام آنے کا اندیشہ نہ ہو۔
- ☆ اعتکاف کی حالت میں موبائل وغیرہ کے استعمال پر مکمل پابندی ہو۔

اگر یہ شرائط پوری نہ ہوں تو عورتوں کے لیے مسجد میں اعتکاف سے اجتناب زیادہ بہتر ہے، ایسے حالات میں گھر کے کسی گوشہ میں شوق عبادت پورا کر لینا چاہیے لیکن اسے شرعی طور پر اعتکاف نہیں کہا جا سکے گا اور نہ ہی اعتکاف کی پابندیاں ان پر عائد ہوں گی۔ رسول اللہ e کی حیات طیبہ میں ایک مستحاضہ بیوی کا آپ کے ہمراہ مسجد میں اعتکاف کرنا ثابت ہے۔ 2

جب ایسی حالت میں بھی اعتکاف کے لیے مسجد کا ہی انتخاب کیا جاتا تھا تو اس کا واضح مطلب ہے کہ عورتوں کے لیے گھر میں اعتکاف کرنا مشروع نہیں۔ واللہ اعلم

روزے کی نیت

] روزے کی نیت کے متعلق کیا احکام ہیں؟ کیا نیت کے بغیر روزہ رکھا جا سکتا ہے۔ آج کل مختلف کتب میں روزے کی نیت لکھی ہوتی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا نیت کے لیے ان الفاظ کا پڑھنا ضروری ہے؟

[ہر عمل کے لیے نیت کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے رسول اللہ e نے فرمایا: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر انسان کے لیے وہی کچھ ہوگا جو اس نے نیت کی ہوگی۔'' 3

امام بخاری a نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:

! فتح الباری، ج۴، ص۳۵۲۔ @ بخاری، الاعتکاف: ۲۰۳۷۔

بخاری، الایمان:۵۴۔

((باب ماجاء ان الاعمال بالنية والحسبة))

''اعمال کا اعتبار نیتوں کے ساتھ ہے اور ثواب کا ارادہ کرنا ضروری ہے۔''

آپ مزید فرماتے ہیں کہ ہر انسان کو وہی کچھ دیا جائے گا جو اس نے نیت کی ہوگی، اس میں ایمان، وضو، نماز، زکوۃ، حج، روزہ اور دیگر تمام افعال شامل ہیں۔ 1

روزے کی نیت کے متعلق خاص حکم ہے۔

چنانچہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''جس شخص نے فجر سے پہلے روزے کی نیت نہ کی تو اس کا روزہ درست نہ ہوگا۔'' 2

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فرض روزے کی فجر سے پہلے نیت کرنا ضروری ہے اور افضل یہ ہے ہر روزے کی نیت علیحدہ کی جائے۔ یہ عزم وارادہ غروب آفتاب کے بعد صبح صادق کے طلوع سے پہلے پہلے کرنا چاہیے، البتہ نفلی روزے کی نیت کے متعلق یہ پابندی نہیں بلکہ اس کی نیت دن کے وقت میں کی جاسکتی ہے۔

جیسا کہ حدیث میں ہے، سیدہ عائشہ r فرماتی ہیں: رسول اللہ e جب میرے پاس تشریف لاتے تو دریافت فرماتے:

''کیا تمہارے ہاں کوئی کھانا ہے؟'' جب ہم کہتے کہ ''نہیں'' تو آپ e فرماتے تھے: ''تب میں روزہ رکھ لیتا ہوں۔'' 3

مگر خیال رہے کہ نیت، دل کے عزم وارادہ کا نام ہے، رسول اللہ e یا آپ کے بعد صحابہ کرام [سے لفظی نیت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لہٰذا آج کل مختلف کیلنڈروں اور کتب میں جو نیت کے الفاظ درج ہوتے ہیں، روزہ کی نیت کے طور پر انہیں پڑھنا درست نہیں۔ بلکہ اس قسم کا اہتمام بدعت ہے، جس سے اجتناب انتہائی ضروری ہے۔

واضح رہے کہ اگر کسی کو دن کے وقت رمضان کی اطلاع ملے تو وہ اسی وقت نیت کرلے اور روزہ رکھ لے بشرطیکہ اس سے پہلے کچھ کھایا پیا نہ ہو، لیکن نفلی روزہ کے لیے فجر سے پہلے نیت کا اہتمام ضروری نہیں ہے۔ واللہ اعلم!

چاند دیکھنے کی شہادت

] رمضان کے مہینہ کا آغاز چاند سے ہوتا ہے، اس کی گواہی کا کیا ضابطہ ہے؟ کیا یہ ضابطہ تمام مہینوں کے لیے یکساں ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[رمضان ہو یا کوئی دوسرا مہینہ، بلکہ سال کے تمام مہینوں کا آغاز نئے چاند سے ہوتا ہے، اس میں فلکی حساب پر انحصار کرنا درست نہیں، مہینے کے آغاز کے تین طریقے حسب ذیل ہیں:

☆ چاند کو خود دیکھا جائے۔ ☆ کسی عادل شخص کی گواہی پر اعتبار کیا جائے۔

! بخاری، الایمان، باب ۴۱۔ @ ابوداود الصیام: ۲۴۵۴۔

ابوداود، الصیام: ۲۴۵۵۔

☆ اگر مطلع ابر آلود ہو تو مہینے کے تیس دن پورے کر کے اگلے مہینہ کا آغاز کر دیا جائے۔

رمضان کے لیے چاند کی رؤیت اگر کسی گواہی کی بنیاد پر ہے تو اس کے لیے ایک معتبر مسلمان کی گواہی کافی ہے۔

جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس W سے روایت ہے: ایک اعرابی رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا، یقیناً میں نے رمضان کا چاند دیکھ لیا ہے، رسول اللہ e نے فرمایا:

''کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا معبود برحق نہیں؟''

اس نے عرض کیا جی ہاں، میں اس امر کی بھی گواہی دیتا ہوں۔

اس کے بعد رسول اللہ e نے سیدنا بلال t سے فرمایا: ''لوگوں کو اطلاع دے دو کہ وہ کل روزہ رکھیں۔'' 1

لیکن عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے چاند کی شہادت کے لیے دو معتبر مسلمانوں کا اعتبار ہوگا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رمضان کے آخری دن کے متعلق لوگوں کو اختلاف ہو گیا تو دو اعرابیوں نے رسول اللہ e کے ہاں گواہی دی کہ انہوں نے کل شام چاند دیکھا تھا، اس پر رسول اللہ e نے روزہ افطار کرنے کا حکم فرمایا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ e نے فرمایا:

''کل عید پڑھنے کے لیے عید گاہ جائیں۔'' 2

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ رمضان کے چاند کے لیے ایک معتبر مسلمان کی گواہی کافی ہے جب کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے لیے دو معتبر مسلمانوں کی گواہی کا اعتبار ہوگا۔ واللہ اعلم!

افطاری کے احکام

] افطاری کے لیے کون سا وقت افضل ہے؟ کچھ لوگ غروب آفتاب کے بعد احتیاط کے طور پر مزید انتظار کرتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ نیز کسی کا روزہ افطار کرانے کی کیا فضیلت ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں اس سے آگاہ فرمائیں۔

[جب سورج کے غروب ہونے کا یقین ہو جائے تو روزہ افطار کر دینا چاہیے۔ احتیاط کے نام پر مزید انتظار کرنا درست نہیں۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''ہمیشہ وہ لوگ بھلائی اور خیر و برکت میں رہیں گے جو روزہ افطار کرنے میں جلدی کرتے ہیں۔'' 3

ایک حدیث میں ہے کہ یہود و نصاریٰ دیر سے افطار کرتے ہیں۔ 4

کسی دوسرے کو افطاری کروانا بہت زیادہ اجر و ثواب کا کام ہے۔

حدیث میں ہے: ''جو کسی روزے دار کا روزہ افطار کرائے تو اسے روزے دار کے برابر ثواب ملے گا۔ نیز ان کے اجر و

! ابوداود، الصیام: ۲۳۴۰. @ ابوداود، الصیام: ۲۳۳۹.

بخاری، الصوم: ۱۹۵۷. $ ابوداود، الصیام: ۲۳۵۳.

ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔'' 1

لیکن افسوس! ہمارے ہاں روزہ افطار کرانا بھی نمود ونمائش کا ذریعہ بن گیا ہے بلکہ اب تو روزہ افطار کرانے کے لیے باقاعدہ کارڈ شائع کیے جاتے ہیں۔ ایسی باتیں افطاری کی روح اور اس کے فلسفہ کے عین منافی ہیں۔ افطاری میں اس قدر تکلف کیا جاتا ہے کہ روزہ افطار کرتے وقت نظریں افطاری کے سامان کا جائزہ لینے میں لگی رہتی ہیں۔ حالانکہ یہ وقت قبولیت دعا کا ہوتا ہے، بہر حال افطاری کا اہتمام کریں لیکن تکلفات سے اجتناب کرتے ہوئے شہرت اور نمود ونمائش سے دور رہیں۔

سحری کھانے کا صحیح وقت

] ہمارے ہاں لوگ سحری کے متعلق افراط وتفریط کا شکار ہیں، کچھ لوگ تو آدھی رات کو ہی کھانا کھا کر سحری سے فارغ ہو جاتے ہیں جب کہ کچھ سحری کرتے ہی نہیں، اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اذان ہونے کے بعد بھی کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ آپ اس کی شرعی حیثیت بیان کریں۔

[شروع میں مسلمان یہودیوں کی دیکھا دیکھی شام سے شام تک روزہ رکھتے تھے، پھر قرآنی ہدایت کے مطابق روزہ صبح سے شام تک ہو گیا۔

چنانچہ سیدنا براء بن عازب t کا بیان ہے کہ ابتداء اسلام میں مسلمانوں سے کوئی شخص جب رات کو کھانا کھانے سے پہلے سو جاتا تو اس کے لیے کچھ بھی کھانا پینا جائز نہیں ہوتا تھا۔ نہ اس رات اور نہ اگلے دن حتی کہ سورج غروب ہو جاتا۔
پھر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ﴾ 2

''کھاؤ اور پیؤ حتی کہ تمہارے لیے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے واضح ہو جائے۔''

رسول اللہ e نے اس سلسلہ میں واضح طور پر حکم دیا کہ:

''ہمارے اور اہل کتاب کے روزے کے درمیان فرق سحری کھانا ہے۔'' 3

بلکہ رسول اللہ e نے تاکیدی طور پر فرمایا:

''سحری کھاؤ، کیوں کہ سحری کھانے میں برکت ہے۔'' 4

اس برکت کے فوائد یہ ہیں کہ سحری کھانے سے روزہ نبھانا آسان ہو جاتا ہے اور جسمانی قوت برقرار رہتی ہے۔ اسی طرح سحری کھانے سے نیت بروقت ہوگی اور صبح بیدار رہنے کا موقع ملے گا۔ الغرض اس انداز سے سحری کرنے میں بہت سے دنیوی اور اُخروی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

! ترمذی، الصوم: ۸۰۷۔
@ البقرہ:۱۸۷۔ بخاری، الصیام:۲۱۷۰۔
# مسلم، الصیام:۲۰۹۶۔
$ بخاری، الصیام: ۱۹۲۳۔

اس کے علاوہ لغوی اعتبار سے سحری، سحر سے ماخوذ ہے جس کا معنی رات کا آخری حصہ ہے۔ لہٰذا سحری وہی ہوگی جو رات کے آخری حصے یعنی طلوع فجر سے عین پہلے ہو۔ زیادہ دیر پہلے کھانا یہ عام کھانا ہے اسے سحری کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ جو لوگ بہت پہلے سحری کر کے سو جاتے ہیں ان کے لیے روزہ نبھانا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اسے صبح کی نماز رہ جانے کا بھی قوی اندیشہ ہے۔

سیدنا زید بن ثابت t فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک مرتبہ رسول اللہ e کے ہمراہ سحری کھائی، پھر نماز صبح کے لیے اٹھے، سیدنا انس t نے پوچھا کہ درمیان میں کتنا فاصلہ تھا؟

فرمایا: اتنا کہ آدمی پچاس آیات پڑھ سکے۔ 1

سکون کے ساتھ پچاس آیات پڑھنے کے لیے کم از کم دس منٹ درکار ہوتے ہیں۔ یعنی سحری، طلوع فجر سے دس منٹ قبل کھالی جاتی تھی۔ سوال میں ذکر ہے کہ کچھ لوگ اذان کے بعد بھی کھاتے رہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا ارشاد ہے: ''جب تم میں سے کوئی اذان سنے اور کھانے کا برتن اس کے ہاتھ میں ہو تو اذان کی وجہ سے اسے رکھ نہ دے بلکہ اس سے اپنی ضرورت پوری کر لے۔'' 2

یہ اس صورت میں ہے کہ سحری کا وقت تنگ ہو رہا ہو اذان فجر اپنے وقت پر شروع ہو جائے تو اجازت ہے کہ انسان پی لے اور دو چار لقمے لے لے، مگر چائے کی طرح کے مشروب کی چسکیاں لینا جائز نہیں ہے۔ نیز مذکورہ حدیث کا تعلق ان حضرات کے لیے ہے جو دیر سے بیدار ہوں، لیکن جو پیٹ بھر کر کھانے کے باوجود اذان ختم ہونے کے بعد تک کھاتے رہتے ہیں اور اس کے بعد بھی کھانے سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں انہیں اس حدیث سے فائدہ اٹھانے کی قطعاً اجازت نہیں۔ واللہ اعلم!

بیماری اور روزہ

] مجھے معمولی نزلہ و زکام کے ساتھ سر درد بھی رہتا ہے، لیکن روزہ رکھنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوتی، کیا ایسی بیماری میں اگر روزہ ترک کر دیا جائے تو شرعی طور پر جائز ہے یا نہیں؟

[قرآن مجید میں روزہ ترک کرنے کے دو اسباب بیان ہوئے ہیں: یعنی بیماری اور سفر۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ 3

''جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اسے دوسرے ایام میں گنتی پوری کرنا ہوگی۔''

لیکن ہر قسم کی بیماری ترک روزہ کا باعث نہیں ہوتی۔ دراصل بیمار تین طرح کے ہوتے ہیں، اور روزے کے متعلق تینوں کے احکام مختلف ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

☆ بیماری معمولی قسم کی ہو۔ مثلاً معمولی نزلہ و زکام وغیرہ یا ہلکا سا سر درد، اس قسم کی بیماری میں روزہ رکھنا چاہیے کیوں کہ

! صحیح مسلم، الصیام: ۱۰۹۷۔ @ابوداود، الصیام: ۲۳۵۰۔

البقرہ: ۱۸۴۔

روزہ، اس قسم کی بیماری پر اثر انداز نہیں ہوتا اور نہ ہی اس قسم کی بیماری میں روزہ رکھنے سے بیماری کے زیادہ ہونے کا اندیشہ ہے۔

☆ ایسی بیماری کہ روزہ رکھنے سے اس کے زیادہ ہونے کا اندیشہ ہے یا شفایابی میں تاخیر ہوسکتی ہے۔ نیز روزہ رکھنا اس کے لیے مشقت کا باعث ہے تو اس قسم کے بیمار کو چاہیے کہ وہ روزہ نہ رکھے اور جب تندرست ہو جائے تو چھوٹ جانے والے روزوں کی قضا دے۔ قرآن کریم میں اسی قسم کی بیماری کا بیان ہے کہ دوران بیماری جتنے روزے رہ جائیں انہیں بعد میں رکھ لیا جائے۔

☆ ایسی بیماری جس میں روزہ رکھنا مشقت ہو اور انسان کی ہلاکت کا موجب ہو تو ایسی حالت میں روزہ رکھنا حرام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ﴾ 1

''تم خود کو قتل نہ کرو۔''

اس قسم کے بیمار لوگوں کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ ہر دن ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ﴾ 2

''اور جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے وہ فدیہ کے طور پر ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔''

وہ تندرست آدمی جسے روزہ رکھنے سے کسی بیماری کا اندیشہ ہو، اس کا فیصلہ کوئی تجربہ کار اور سمجھ دار ڈاکٹر کرے، ایسا آدمی اگر روزہ نہ رکھے تو ایسا کرنا اس کے لیے جائز ہے۔ وہ بھی فدیہ کے طور پر ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ٻ﴾ 3

''تم خود کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو۔''

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتے ہیں اور وہ انہیں تنگی اور مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود فیصلہ نہ کرے کہ روزے رکھنے سے میرے بیمار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ماہر حکیم یا تجربہ کار ڈاکٹر رپورٹ دے یا خود آدمی کو بار بار اس بات کا تجربہ ہوا ہو کہ روزہ اس کے لیے باعث ضرر ہے۔ واللہ اعلم!

جنت کے دروازے کھلنے کا مفہوم

] حدیث میں ہے کہ جب ماہِ رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اس حدیث کا کیا

! النساء:۲۹۔ @ البقرہ:۱۸۴۔ #البقرہ:۱۹۵۔

مفہوم ہے، وضاحت کریں؟

] سوال میں مذکور حدیث متعدد الفاظ سے مروی ہے، حضرت ابو ہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جب رمضان کا مہینہ شروع ہوتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔'' 1

ایک روایت میں ہے کہ رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ 2

ایک اور روایت میں ہے کہ جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ 3

ہمارے رجحان کے مطابق آسمان یا جنت یا رحمت کے دروازوں کا کھلنا مبنی برحقیقت ہے، اسے کنایہ یا مجاز پر محمول کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اگرچہ بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ آسمان کے دروازوں کا کھولنا نزول رحمت سے کنایہ ہے اور جنت کے دروازوں کا کھولنا اس سے مراد اچھے اور نیک کاموں کی توفیق دینا مراد ہے۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی a نے اس مفہوم کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہر مسلمان کا حسب توفیق نیک اور اچھے عمل کرنا اور ہلاکت خیز برائیوں سے بچنا، گویا ان پر جنت کے دروازوں کا کھول دینا اور دوزخ کے دروازوں کا بند کر دینا ہے کیوں کہ یہ چیزیں انہیں دوزخ سے بچا کر جنت میں لے جانے والی ہیں۔ 4

بہرحال عقلی طور پر یہ کوئی محال امر نہیں کہ اسے مجاز پر محمول کیا جائے، اسی طرح ماہ رمضان میں شیاطین کو جکڑ دینے سے مراد بھی سرکش قسم کے شیاطین ہیں جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے۔

رسول اللہ e فرماتے ہیں: ''اس مہینے میں آسمان کے دروازے کھولے اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں نیز اس ماہ میں ہر سرکش شیطان کو باندھ دیا جاتا ہے اور ایک منادی کرنے والا ہر رات یہ اعلان کرتا ہے۔

''اے خیر کے متلاشی! آگے بڑھ اور اے برائی کے طالب! اب تو رک جا۔'' 5

اس وضاحت سے یہ اعتراض بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب شیاطین کا باندھ دیا جاتا ہے تو لوگ شیطانی حرکات کیوں کرتے ہیں؟ چونکہ بڑے بڑے سرکش شیاطین کو پابند سلاسل کیا جاتا ہے اس لیے چھوٹے شیاطین اپنا کام جاری رکھتے ہیں اور وسوسہ اندازی سے لوگوں کو شیطانی حرکات پر اکساتے رہتے ہیں۔ واللہ اعلم!

چاند کو دیکھ کر روزہ رکھنا

] کیا ماہِ رمضان کا آغاز فلکی حساب، جنتری یا کیلنڈر وغیرہ سے کیا جا سکتا ہے یا اس کے لیے چاند کا دیکھنا ضروری

! بخاری، الصوم:۱۸۹۹۔
@ صحیح مسلم، الصیام:۲۴۹۵۔
# بخاری، الصوم:۱۸۹۹۔
$ حجۃ اللہ البالغہ۔
% نسائی، الصوم:۲۱۱۰۔

ہے، وضاحت کریں؟

[ماہ رمضان کا آغاز فلکی حساب سے یا کیلنڈروں اور جنتریوں کے مطابق ہی ہوگا بلکہ اس لیے چاند دیکھنا ضروری ہے۔ البتہ رمضان کے چاند کے لیے ایک معتبر مسلمان کی گواہی ہی کافی ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس t بیان کرتے ہیں کہ ایک دیہاتی رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا:

''بلاشبہ میں نے رمضان کا چاند دیکھا ہے۔''

آپ نے فرمایا: ''کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں۔''

اس نے عرض کیا جی ہاں۔

آپ نے فرمایا: کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد (e) اللہ کے رسول ہیں۔''

اس نے عرض کیا جی ہاں۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: اے بلال! لوگوں کو اطلاع دے دو کہ وہ کل سے روزہ رکھیں۔ 1

اسی طرح حضرت ابن عمر t سے مروی ہے کہ لوگوں نے چاند دیکھنے کی کوشش کی، میں نے رسول اللہ e کو خبر دی کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے، اس کے بعد آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ 2

یہ دونوں احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ آغاز رمضان کے سلسلہ میں ایک معتبر آدمی کی گواہی قبول کی جائے گی البتہ عیدین کے چاند کے لیے دو آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔

چنانچہ ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ رمضان کے آخر میں چاند کے متعلق اختلاف ہوا تو دو دیہاتی، رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا اللہ کی قسم! ہم نے کل شام چاند دیکھا ہے تو رسول اللہ e نے لوگوں کو روزہ افطار کر لینے کا حکم دیا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''کل، عید پڑھنے کے لیے عیدہ گاہ جائیں۔'' 3

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عید الفطر کے لیے ایک آدمی کی گواہی کافی نہیں بلکہ کم از کم دو معتبر آدمیوں کا ہونا ضروری ہے جو گواہی دیں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے۔

امام نووی a فرماتے ہیں کہ ابوثور کے علاوہ تمام علماء کے نزدیک شوال کے چاند پر ایک عادل گواہ کی گواہی جائز نہیں ہے۔ بہرحال چاند دیکھ کر روزہ رکھنا چاہیے یا خود نہیں دیکھا تو گواہی سے ماہِ رمضان کا آغاز کر دیا جائے۔ اگر مطلع ابر آلود ہو تو شعبان کے تیس دن پورے کر کے ماہِ رمضان کا آغاز کیا جائے۔

! ابوداؤد، الصیام:۲۳۴۰. @ ابوداؤد، الصیام:۲۳۴۲.

ابوداؤد، الصیام:۲۳۳۹.

مشکوک دن کا روزہ

] بعض لوگ رمضان سے پہلے روزے رکھ لیتے ہیں کہ شاید رمضان کا آغاز ہو چکا ہے، کیا ایسے لوگوں کا روزہ صحیح ہے، کتاب وسنت کے مطابق وضاحت کریں؟

[شریعت میں روزہ رکھنے کا ضابطہ یہ ہے کہ چاند نظر آ جائے یا اس کی شہادت مل جائے یا شعبان کے تیس دن پورے ہو جائیں، لیکن کچھ لوگ احتیاط کے پیش نظر تیس شعبان کا روزہ رکھ لیتے ہیں کہ شاید اس دن رمضان کا آغاز ہو چکا ہو، لیکن ایسا کرنا تکلف اور تشدد ہے۔ صحیح روایات میں ایسے دن کا روزہ رکھنا رسول اللہ e کی نافرمانی بتایا گیا ہے۔

چنانچہ حضرت عمار بن یاسر t سے روایت ہے۔

انہوں نے فرمایا: ''جس نے شک والے دن کا روزہ رکھا، اس نے حضرت ابو القاسم e کی نافرمانی کی۔'' 1

جس روایت میں صحابی اس قسم کے الفاظ استعمال کرے وہ روایت حکماً مرفوع ہوتی ہے۔ شک والے دن سے مراد شعبان کی تیس تاریخ ہے کیوں کہ اس دن امکان ہوتا ہے کہ شاید رمضان المبارک کی پہلی تاریخ ہو۔ بعض حضرات اس دن چاند نظر آئے بغیر احتیاط کے طور پر روزہ رکھ لیتے ہیں کہ شاید چاند طلوع ہو گیا ہو مگر اس قسم کی احتیاط شریعت میں نافرمانی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے چاند دکھانے میں احتیاط نہیں فرمائی تو ہمیں خواہ مخواہ اس احتیاط میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

مذکورہ حدیث میں پس منظر بایں الفاظ بیان ہوا ہے کہ حضرت صلہ بیان کرتے ہیں، ہم ایک دن حضرت عمار t کی خدمت میں تھے اور دن مشکوک تھا، ہمارے سامنے بکری کا گوشت پیش کیا گیا، مجلس میں سے کچھ لوگ علیحدہ ہو گئے، انہیں دیکھ کر حضرت عمار بن یاسر t نے فرمایا: ''جس نے اس دن کا روزہ رکھا ہے، اس نے ابو القاسم e کی نافرمانی کی ہے۔'' 2

اس روایت کے متعلق بعض اہل علم نے کلام کیا ہے لیکن متعدد شواہد کی بناء پر اسے قابل حجت ٹھہرایا گیا ہے۔

چنانچہ حضرت ابن عباس t فرماتے ہیں:

''مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو ماہ رمضان شروع ہونے سے پہلے روزے رکھتا ہے جب کہ رسول اللہ e نے فرمایا: جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب اگلا چاند دیکھو تو روزے رکھنا چھوڑ دو، اگر چاند چھپ جائے تو مہینے کی گنتی تیس دن پوری کرو۔'' 3

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ رمضان کا چاند نظر آنے سے پہلے مشکوک دن کا روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ واللہ اعلم!

ترک روزہ کے لیے بہانہ سازی

] میں نے امتحان کی تیاری کرنی ہے، جب کہ روزہ رکھ لینے سے یہ ممکن نہیں کہ میں اس کی تیاری کرسکوں، کیا ایسے

! نسائی، الصیام: ۲۱۹۰.

@ ابوداوٗد، الصیام: ۲۳۳۴.

نسائی، الصیام: ۲۱۲۷.

حالات میں مجھے روزہ چھوڑ دینے کی اجازت ہے، راہنمائی فرمائیں؟

] رمضان المبارک کے روزے ایک مسلمان کے لیے بسا غنیمت ہیں، حدیث میں ہے کہ روزے کا اجر وثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں بلا حد وحساب ملے گا۔'' 1

افسوس ہے ان لوگوں پر جو مختلف قسم کی بہانہ سازی سے اس کی حرمت پامال کرتے ہیں اور اس مقدس مہینہ کو فسق و فجور، عصیان وطغیان، برائی و بے حیائی اور غفلت ولا پرواہی میں گزار دیتے ہیں اور اس مہینے کی رحمتوں اور برکتوں کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور اس سے بچنے کے لیے طرح طرح کے بہانے اور حیلے تلاش کرتے ہیں۔ جیسا کہ سوال میں امتحان کی تیاری کا ذکر ہے، کچھ مزدور پیشہ لوگ ہیں جو اپنی محنت ومزدوری کا بہانہ بنا کر روزہ نہیں رکھتے، کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو رمضان کے مہینے کو رشتے داروں سے ملنے کے لیے مخصوص کر لیتے ہیں، اس طرح وہ سارا مہینہ مسافر بن کر گزار دیتے ہیں۔ اس طرح کچھ لوگ خود ساختہ بیماری کا بہانہ تراش لیتے ہیں، حالانکہ دوران سفر رسول اللہ e کے صحابہ کرام جہاد کرتے ہوئے بھی روزہ رکھتے تھے بلکہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جس نے ایک دن کا روزہ بلا وجہ ترک کر دیا پھر وہ تمام عمر روزے رکھتا رہے تو بھی اس جرم کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔'' 2

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''مجھے خواب میں ایک وحشت ناک منظر دکھایا گیا، میں نے چند لوگوں کو دیکھا کہ انہیں ایڑیوں کے بل الٹا لٹکایا گیا ہے اور ان کی باچھیں چیری جا رہی ہیں اور ان سے مسلسل خون بہہ رہا ہے۔ میرے دریافت کرنے پر بتایا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزہ رکھنے کے بعد اس کی حرمت کو یوں پامال کرتے تھے کہ وقت سے پہلے ہی افطار کر لیتے تھے۔'' 3

ان احادیث کی بناء پر ایک مسلمان انسان کے لیے ضروری ہے کہ اگر وہ تندرست اور گھر میں موجود ہے تو رمضان کے روزے رکھنے میں سستی نہ کرے بلکہ ان ایام میں اپنی عاقبت بنانے کی فکر کرے۔ اگر بہانہ سازی کر کے دانستہ اس فریضہ سے پہلو تہی کی تو قیامت کے دن سنگین عذاب سے دوچار ہونے کا اندیشہ ہے۔ دنیا میں دوسرے انسانوں کو دھوکہ دینے کے لیے بہانہ سازی کام آسکتی ہے مگر خالق کائنات کے حضور کیا جواب دیا جائے گا جب اس کے متعلق باز پرس ہوگی؟ واللہ المستعان!

روزے کی حفاظت

] ہمارے معاشرہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو روزہ رکھتے ہیں لیکن اسے نبھانے کے لیے کیرم بورڈ یا کمپیوٹر کے ذریعے مختلف کارٹون اور کھیلوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور بعض بے ہودہ قصے کہانیوں پر مشتمل جرائد ورسائل پڑھتے ہیں،

! مسلم، الصیام: ۲۷۰۶. @ ترمذی، الصوم: ۷۲۳.

صحیح ابن خزیمہ، ص۲۲۳، ج۳.

کیا ایسا کرنے سے روزہ تو متاثر نہیں ہوتا؟

] روزے کا مقصد اور ثمرہ حصول تقوی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روزے دار ہر قسم کی جسمانی، نفسانی، دنیاوی لذتوں اور خواہشات سے اپنے جسم اور روح کو محفوظ رکھے۔ روزے کے احترام وادب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر اس کام سے پرہیز کرے جو روزہ میں رخنہ اندازی کا باعث ہے۔

بعض امور ایسے ہیں جو روزے کو باطل تو نہیں کرتے البتہ انسان ان کے ارتکاب کے بعد روزے کے ثواب سے ضرور محروم ہو جاتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''بہت سے روزے دار ایسے ہیں جن کو ان کے روزے سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا اور کتنے ہی شب بیدار ایسے ہیں جن کو ان کی شب بیداری سے ماسوائے بیداری کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔'' 1

اب ہم چند ایک کاموں کی تفصیل بتاتے ہیں جن کے ارتکاب سے روزہ بے کار ہو جاتا ہے:

(۱) فحش گوئی اور بدزبانی: روزے دار کو چاہیے کہ وہ دوران روزہ فحش گوئی سے اجتناب کرے۔

حدیث میں ہے: ''جب تم میں سے کوئی روزہ دار ہو تو اسے فحش گوئی اور جہالت سے اجتناب کرنا چاہیے۔'' 2

(۲) گالی گلوچ: روزے کے ساتھ سب وشتم کرنا بھی روزے کی روح ختم کر دیتا ہے۔

حدیث میں ہے: اگر کوئی دوسرا روزے دار کو گالی دے کر جہالت کا ثبوت دیتا ہے تو اسے چاہیے کہ خاموش رہے، اسے جوابی طور پر گالی نہ دے۔ 3

(۳) جھوٹی باتیں برے عمل: جھوٹی باتوں اور برے کاموں سے بھی روزہ متاثر ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے: ''جو شخص روزے کی حالت میں کذب بیانی اور اس کے مطابق عمل کرنا ترک نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔ 4

(۴) غیبت وعیب جوئی: غیبت اور عیب جوئی سے بھی روزہ کارآمد نہیں رہتا بلکہ اس ڈھال کی طرح بن جاتا ہے جس میں شگاف پڑ چکے ہوں اور لڑائی میں بچاؤ کا کام نہ دے سکے۔ اس بناء پر روزہ رکھ کر وقت کٹی کے لیے ناول وڈائجسٹ پڑھنا، ڈرامے اور فلمیں دیکھنا، کیرم بورڈ، لڈو، تاش اور شطرنج کھیلنا، اس طرح دن بھر گانے، مزاحیہ لطیفے سننا ایک دوسرے کی غیبت کرنا، ان تمام کاموں سے روزے کی روح ختم ہو جاتی ہے اور ایسے روزے کا کوئی فائدہ نہیں۔ واللہ اعلم

افطاری میں جلدی کرنا

] ہم نے سنا ہے کہ افطاری جلدی کرنی چاہیے جب کہ کچھ لوگ احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے کافی دیر سے افطاری

! مسند امام احمد ص۴۴۱، ج۲۔ @ بخاری، الصوم: ۱۹۰۴۔

بخاری، الصوم:۱۹۰۶۔ $ بخاری، الصوم:۱۹۰۳۔

کرتے ہیں، شرعی طور پر اس احتیاط کی کیا حیثیت ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کردیں۔

] اس میں شک نہیں کہ دن غروب ہوتے ہی روزہ افطار کر دینا چاہیے کیوں کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''جب مشرقی افق سے رات سامنے آجائے اور مغربی افق سے دن پلٹ کر غروب ہو جائے تو روزہ افطار کرنے کا وقت ہو جاتا ہے، اب روزے دار کو روزہ افطار کر دینا چاہیے۔'' 1

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب سورج غروب ہو جائے اور مشرقی جانب سے سیاہی نمودار ہو جائے تو روزہ افطار کر دینا چاہیے، بلاوجہ احتیاط کا بہانہ بنا کر دیر نہیں کرنی چاہیے، روزہ افطار کرنے کا یہی وقت ہے، اسی میں خیر و برکت ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''لوگ جب تک افطاری کرنے میں جلدی کریں گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و برکت میں رہیں گے۔'' 2

ایک حدیث قدسی میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''مجھے سب بندوں سے زیادہ محبوب وہ ہے جو روزہ افطار کرنے میں جلدی کرتا ہے۔'' 3

افطاری میں جلدی کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آفتاب غروب ہونے سے پہلے یا اس کے غروب ہونے میں شک اور تردد ہونے کے باوجود روزہ افطار کر لیا جائے۔ بہر حال افراط و تفریط سے احتراز کرنا چاہیے۔ یہود و نصاریٰ کا شیوہ ہے کہ وہ روزہ افطار کرنے میں بہت تاخیر کرتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں اس امر کی صراحت ہے۔ 4

بلکہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''میری امت کے لوگ اس وقت تک میرے طریقے پر گامزن رہیں گے جب تک وہ افطاری کرنے میں ستاروں کے چمکنے کا انتظار نہیں کریں گے۔'' 5

صحابہ کرام کا یہ خاص وصف بیان ہوتا ہے کہ وہ افطاری میں جلدی کرتے اور سحری دیر سے کھاتے تھے۔ 6

ہمیں بھی ان کے اسوہ پر عمل کرنا چاہیے اور افطاری میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ واللہ اعلم!

رمضان کے آخری عشرہ میں تقاریر کا اہتمام

] ہمارے ہاں اکثر یہ ہوتا ہے کہ جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ ہوتا ہے تو شب بیداری کے نام پر تقاریر کا اہتمام کیا جاتا ہے، مختلف علماء اہل مسجد کو بیدار رکھنے کے لیے گرم جوشی سے بیان جاری رکھتے ہیں پھر ان راتوں میں کھانے اور چائے وغیرہ کا بھی خصوصی اہتمام ہوتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کتاب وسنت کی روشنی میں واضح فرمائیں۔

! بخاری، الصوم: ۱۹۵۴۔ @ بخاری، الصوم: ۱۹۵۷۔

ترمذی، الصیام: ۷۰۰۔ $ ابن حبان ص۲۰۹ ج۶۔

% ابن حبان ص۲۰۹ ج۶۔ ^ بیہقی ص۲۳۷ ج۴۔

[ہمارے لیے ہر قسم کی عبادات میں رسول اللہ e ہی بہترین نمونہ ہیں۔ اپنی طرف سے کسی قسم کی ایجاد گمراہی کا پیش خیمہ ہوسکتی ہے۔ رسول اللہ e کا رمضان المبارک کا آخری عشرہ کس طرح گزرتا تھا، اس کے متعلق حضرت عائشہ r بیان کرتی ہیں ں کہ آپ آخری عشرہ میں اتنی محنت اور مشقت اٹھاتے جتنی دوسرے دنوں میں نہیں اٹھاتے تھے۔ 1

اس محنت کی تفصیل ایک دوسری حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ حضرت عائشہ r ہی بیان فرماتی ہیں:

''جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو رسول اللہ e عبادت کے لیے کمربستہ ہوجاتے، ساری رات عبادت میں گزارتے اور اپنے اہل خانہ کو بھی بیدار رکھتے تھے۔'' 2

اس میں کوئی شک نہیں کہ دل میں پاکیزگی اور بالیدگی اس وقت بیدار ہوسکتی ہے جب انسان کا دل مخلوق سے بے پرواہ ہوکر اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ کثرت سے کھانے پینے، گفتگو کرنے اور سونے سے دل منتشر اور غافل ہوجاتا ہے۔

ماہِ مبارک میں ان تمام چیزوں پر کنٹرول ہوتا ہے جو قربِ الٰہی میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہیں۔ اس مہینہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انسان کا دل اللہ کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس ذاتِ اقدس کے قرب کو محسوس کرتا ہے۔ ویسے تو سارا مہینہ ہی اللہ عزوجل کی طرف سے خیرات و برکات اور انوار وتجلیات اپنے جلو میں لے کر آتا ہے لیکن اس آخری عشرہ خاص فیوض و برکات کا حامل ہوتا ہے۔ رسول اللہ e اس آخری عشرہ میں عبادت کے لیے خصوصی اہتمام فرماتے تھے جیسا کہ احادیث بالا میں مذکور ہے اور یہ سب کچھ اجتماعی طور پر نہیں بلکہ انفرادی طور پر ہوتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں اسے اجتماعیت کا رنگ دے دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم طاق راتوں میں تقاریر اور دروس کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں اور باہر سے علماء کرام کو دعوت دیتے ہیں بلکہ سارا عشرہ ہی بہترین ماکولات اور مشروبات کے دور کے لیے مخصوص کردیا جاتا ہے۔

حالانکہ رسول اللہ e کے اسوۂ حسنہ میں ان چیزوں کا دور دور تک کوئی نشان نہیں ملتا۔ ہمیں اس آخری عشرہ کے قیمتی دنوں اور سنہری راتوں کو سوکر یا کھانے پینے یا تقاریر سننے میں ضائع نہیں کرنا چاہیے بلکہ انفرادی عبادت کا اہتمام کرنا چاہیے۔

حدیث میں ہے کہ جب رمضان ختم ہونے میں چند دن باقی رہ جاتے تو نبی اکرم e گھر میں ہر فرد کو نیند سے اٹھا دیتے جو قیام کی طاقت رکھتا تھا۔ 3

ہمیں اس حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے گھر میں موجود افراد کو اٹھانے کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ وہ اللہ عزوجل کی عبادت میں مصروف ہوں۔ کھانے پینے اور تقاریر کا اہتمام کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، ایسے کاموں کے لیے اور بہت مواقع ہیں، ان میں اس کا اہتمام کرلیا جائے۔ واللہ اعلم!

! صحیح مسلم، الاعتکاف:۱۱۷۴۔ @ بخاری، لیلۃ القدر:۲۰۲۴۔
قیام اللیل: ص۱۷۹۔

اعتکاف کا آغاز

] اعتکاف کا آغاز کب کرنا چاہیے اور بحالت اعتکاف کون کون سے کام کیے جا سکتے ہیں، بعض لوگ اعتکاف کی حالت میں غسل نہیں کرتے کہ ایسا کرنا ان کے ہاں اعتکاف کے منافی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

[اعتکاف کے متعلق رسول اللہ e کا یہ عمل ہے کہ آپ رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تھے۔ 1

اس سلسلہ میں دوسری حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ e جب اعتکاف کا ارادہ کرتے تو نماز فجر ادا کر کے اپنی اعتکاف گاہ میں داخل ہو جاتے۔ 2

آخری عشرے کا آغاز بیس رمضان کی شام کو ہو جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اعتکاف کا آغاز بیس رمضان کی شام کے بعد ہونا چاہیے پھر رات بھر مسجد میں مصروف عبادت رہے اور اگلے روز صبح کی نماز پڑھ کر اپنی اعتکاف گاہ میں داخل ہو، اکثر ائمہ حدیث نے اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔ دوران اعتکاف مسجد میں رہتے ہوئے غسل کیا جا سکتا ہے اور سر میں تیل بھی لگایا جا سکتا ہے بلکہ خوشبو کا استعمال بھی جائز ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔

حضرت عائشہ r فرماتی ہیں:

''معتکف کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ کسی بیمار کی تیمار داری نہ کرے اور نہ جنازے میں شریک ہو، نہ عورت کو چھوئے اور نہ ہی اس کے ساتھ مباشرت کرے اور کسی ضروری حاجت کے علاوہ جائے اعتکاف سے نہ نکلے۔'' 3

مسجد سے نکلنے کی حسب ذیل تین اقسام ہیں:

(۱) کسی ایسے امر کے لیے باہر نکلنا جس کے بغیر چارہ کار نہ ہو مثلاً کھانے پینے کے لیے نکلنا جب کہ گھر سے کوئی کھانا لانے والا نہ ہو، اسی طرح بول و براز اور وضو غسل کے لیے مسجد سے نکلنا جائز ہے۔

(۲) کسی ایسے نیک کام کے لیے مسجد سے نکلنا جو معتکف کے لیے واجب نہ ہو مثلاً بیمار کی تیمار داری یا نماز جنازہ کی ادائیگی کے لیے مسجد سے نکلنا۔ ایسا کرنا جائز نہیں جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں ہے۔

(۳) کسی ایسے کام کے لیے مسجد سے نکلنا جو اعتکاف کے منافی ہو مثلاً بلاوجہ گھر جانے کے لیے، خرید و فروخت کرنے کے لیے، وظیفہ زوجیت ادا کرنے کے لیے نکلنا، کسی صورت میں جائز نہیں۔ ان کاموں سے اعتکاف باطل ہو جاتا ہے، بہر حال معتکف کو چاہیے کہ وہ آرام و سکون کے ساتھ عبادت میں مصروف رہے، اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ e نے اپنے اعتکاف میں سادگی کو برقرار رکھا، اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ جہلاء جنہیں سستی شہرت اور محض نمائش و پارسائی مقصود ہوتی ہے وہ اعتکاف بیٹھنے کے لیے دو آدمیوں کی جگہ گھیر لیتے ہیں اور عجیب و غریب حرکات کے ذریعے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مرکوز

! بخاری، فضائل القرآن:۴۹۹۹۔ @ ترمذی، الصوم: ۷۹۱۔

ابوداؤد، الصیام:۲۴۷۳۔

کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، مثلاً وہ گھونگٹ نکال کر باہر نکلنے میں اوراپنے کسی کام کے لیے پرچی سسٹم اختیار کرتے ہیں یا دوران اعتکاف اپنی صفائی کا خیال نہیں رکھتے اور اس کے لیے غسل نظافت سے بھی اجتناب کرتے ہیں، ان کاموں کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں۔ واللہ المستعان!

اگر روزہ رکھنے کے بعد عید کا چاند نظر آجائے

] اگر کسی نے رمضان کا روزہ رکھا ہو اور کسی طرف سے عید کا چاند دیکھنے کی شہادت مل جائے تو پھر کیا کیا جائے، روزہ پورا کیا جائے یا اسے ختم کر دیا جائے نیز ایسے حالات میں نماز عید کا کیا حکم ہے؟

[میڈیا کے تیز ترین دور میں بظاہر ایسا ناممکن نظر آتا ہے کہ عید کا چاند موجود ہو اور کچھ لوگ اسے دیکھ بھی لیں لیکن بروقت دوسرے لوگوں کو اس کی اطلاع نہ ہو سکے تاہم دور دراز علاقوں میں شاید ایسا ہو سکے۔ چنانچہ رسول اللہ e کے دور میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ حضرت ابوعمیر انصاری t اپنے صحابی چچاؤں سے بیان کرتے ہیں کہ موسم ابر آلود ہونے کی وجہ سے شوال کا چاند نظر نہ آیا، ہم نے اگلے دن کا روزہ رکھا، دن کے آخری حصہ میں سوار آئے اور انہوں نے رسول اللہ e کے سامنے شہادت دی کہ ہم نے کل شام چاند دیکھ لیا تھا تو آپ نے فرمایا:

’’روزہ افطار کر دو اور کل صبح عید کی نماز کے لیے عید گاہ جائیں گے۔‘‘ 1

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاند دیکھنے والے حضرات مدینہ طیبہ کے نہیں بلکہ باہر کے باشندے ہوں گے، اگر مدینہ طیبہ کے رہائشی ہوتے تو رات کے وقت ہی رسول اللہ e کو چاند کے متعلق مطلع کر دیتے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چاند کی اطلاع جب بھی ملے اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر روزہ رکھا ہوا ہے تو اسے کھول دینا واجب ہوگا، اس لیے رسول اللہ e نے اہل مدینہ کو روزہ کھول دینے کا حکم دیا۔ اگر اسی دن عید پڑھنا ممکن ہو تو زوال سے پہلے نماز عید پڑھی جائے بصورت دیگر اگلے دن نماز عید ادا کی جائے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سخت بارش یا تیز آندھی کی وجہ سے اسی دن نماز عید پڑھنا ممکن نہ ہو تو بھی یہی حکم ہے کہ اگلے دن زوال سے پہلے نماز عید ادا کی جائے۔ صورت مسئولہ میں اگر مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے چاند نہیں دیکھا گیا اور نہ ہی کسی طرف سے چاند دیکھنے کے متعلق کوئی معتبر شہادت مل سکی نیز لوگوں نے روزہ رکھ لیا تو اس کی دو صورتیں ہیں:

۱: اسی دن زوال سے پہلے معتبر شہادت مل جائے تو اسی وقت روزہ افطار کر کے نماز عید پڑھ لی جائے۔

۲: اگر زوال آفتاب کے بعد چاند دیکھنے کی اطلاع موصول ہو تو روزہ افطار کر لیا جائے اور نماز عید اگلے دن بروقت ادا کی جائے۔

واضح رہے کہ چاند کی رؤیت میں عموماً ایک ہی دن کا فرق ممکن ہے لہٰذا ایک دن سے زیادہ نماز عید کو مؤخر نہ کیا جائے،

! ابوداؤد، الصلوٰۃ:۱۱۵۷.

حدیث میں بھی ایک ہی دن کا ذکر ہے، عید الفطر اور عید الاضحیٰ دونوں عیدوں کے لیے یہی حکم ہے۔ واللہ اعلم!

سحری دیر سے کھانی چاہیے

] ہمارے کچھ لوگ آدھی رات کو ہی سحری کھا کر سو جاتے ہیں، بعض اوقات فجر کی نماز بھی باجماعت ادا نہیں ہوتی، کیا ایسا کرنا کتاب وسنت سے ثابت ہے؟

[ہم سحری کے متعلق بہت افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ کچھ حضرات سحری کھاتے ہی نہیں اور دیر سے اٹھنے کی وجہ سے کچھ کھائے پیئے بغیر ہی روزہ رکھ لیتے ہیں۔

حالانکہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''سحری کھایا کرو کیوں کہ سحری کھانے میں برکت ہے۔'' 1

نیز آپ نے فرمایا کہ ہمارے روزے اور اہل کتاب کے روزے میں فرق کرنے والی چیز سحری کھانا ہے۔'' 2

اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب سحری کھائے بغیر روزہ رکھتے ہیں لیکن ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ ہم روزے کے لیے سحری کا اہتمام کریں، لیکن ہمارے ہاں کچھ لوگ اس ڈر سے کہ رات کے آخری حصہ میں بیدار نہ ہو سکیں گے تو قبل از وقت سحری کھا کر سو جاتے ہیں، پھر کھانے کے نشہ میں خوب گہری نیند سو جاتے ہیں جس کی وجہ سے صبح کی نماز بروقت ادا نہیں ہو پاتی۔ ہماری شریعت میں سحری کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ صبح کاذب طلوع ہونے سے صبح صادق تک سحری کر لی جائے۔

جیسا کہ حضرت زید بن ثابت t کا بیان ہے:

''ہم نے رسول اللہ e کے ساتھ سحری کھائی، پھر ہم نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ راوی نے عرض کیا: ان دونوں میں کتنا فاصلہ ہوتا تھا؟ فرمایا: تقریباً پچاس آیات پڑھنے کے برابر۔'' 3

اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ e کی سحری اور نماز فجر کے درمیان فاصلہ پچاس آیات کے برابر ہوتا تھا۔ سحری کرنے والوں کو یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اذان فجر کے بعد کھانے پینے سے رک جانا چاہیے۔ ہاں اگر کھانے کے دوران اذان ہو جائے تو کھانے کو مکمل کر لیا جائے، لیکن اس جائز سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے کہ اذان کے بعد ہم چائے کی پیالی ہاتھ میں پکڑ لیں اور چسکیاں لے لے کر چائے پیتے رہیں، ایسا کرنا درست نہیں، افراط وتفریط سے اجتناب کرتے ہوئے اعتدال کی راہ اختیار کرنا چاہیے۔ سحری دیر سے کی جائے لیکن اذان کے بعد کھانے پینے سے گریز کیا جائے۔ واللہ اعلم!

نفلی روزے کے لیے خاوند کی اجازت

] میری بیوی کو نفلی روزے رکھنے کی عادت ہے، وہ اکثر سوموار، جمعرات اور ایام بیض کے روزے رکھتی ہے، کیا یہ حق ہے کہ میں اسے بکثرت نفلی روزے رکھنے سے منع کروں؟ اگر میں اسے اس اقدام سے باز رکھوں تو مجھے گناہ تو نہیں ہوگا؟

! بخاری، الصوم، ۱۹۲۳۔ @ مسلم، الصیام: ۲۵۵۰۔

صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۲۱۔

[میاں بیوی کے تعلقات بہت نزاکت کے حامل ہیں، شریعت نے ان تعلقات میں معمولی رخنہ آنے کی بھی اجازت نہیں دی۔ اس لیے عورت کو پابند کیا ہے کہ وہ نفلی روزے کے لیے اپنے شوہر کی اجازت حاصل کرے کیوں کہ شوہر کو اس سے فائدہ اٹھانے کی کسی وقت بھی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''کسی عورت کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر نفلی روزے رکھے۔'' 1

ایک روایت میں ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر روزہ نہ رکھے۔ 2

امام بخاری a نے ان احادیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:

''عورت کا خاوند کی اجازت سے نفلی روزہ رکھنا۔'' 3

البتہ رمضان کے روزے رکھنے کے لیے اجازت کی چنداں ضرورت نہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں اس کی صراحت ہے۔ رسول اللہ e نے فرمایا:

''عورت کو روا نہیں کہ اس کا شوہر موجود ہو تو وہ اس کی اجازت کے بغیر روزہ رکھے الا یہ کہ رمضان کے روزے ہوں۔'' 4

روزے کی حالت میں زوجین کے مابین تعلقات زن وشو قائم نہیں ہو سکتے، علاوہ ازیں بھوک پیاس کی وجہ سے طبیعت میں گرانی سی بھی آ جاتی ہے اور عین فطری بات ہے کہ عام طور پر شوہر ایسی کیفیت گوارا نہیں کرتے اور اس کے نتائج نامناسب بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے شریعت نے یہ ضابطہ بنایا ہے کہ شوہر کی موجودگی میں بیوی کو چاہیے کہ وہ نفلی روزہ رکھنے کے لیے اپنے شوہر سے اجازت لے، ایسے حالات میں شوہر اپنی بیوی کا روزہ توڑ بھی سکتا ہے۔

جیسا کہ سیدنا صفوان بن معطل t کی بیوی نے ایک مرتبہ رسول اللہ e سے شکایت کی تھی کہ جب میں روزہ رکھتی ہوں تو وہ تڑوا دیتا ہے۔ سیدنا صفوان t بھی موجود تھے، انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ e! اس بیوی کی حالت یہ ہے کہ روزے ہی رکھے جاتی ہے اور میں جوان آدمی ہوں صبر نہیں کر سکتا تو آپ e نے یہ ضابطہ بیان فرمایا:

''کوئی عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر روزہ نہ رکھے۔'' 5

ان احادیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیوی کو شوہر کی تسکین کے لیے انتہائی حساس اور ذمہ دار ہونا چاہیے۔ صورت مسئولہ میں اگر شوہر ضرورت محسوس کرے تو اپنی بیوی کو نفلی روزہ رکھنے سے منع کر سکتا ہے اور ایسا کرنے سے ان شاء اللہ اسے کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم!

! صحیح بخاری، النکاح:۵۱۹۵.
@ بخاری، النکاح:۵۱۹۲.
# بخاری، النکاح، باب ۸۵.
$ ابوداؤد، الصیام:۲۴۵۸.
% ابوداؤد، الصیام: ۲۳۵۹.

متروکہ روزوں کی تلافی

] میں رمضان المبارک میں اپنے نومولود بچے کو دودھ پلاتی تھی، اس لیے روزے نہ رکھ سکی، کیا اب میرے ذمے ان روزوں کی قضا ہے؟ فدیہ یا دونوں سے ان متروکہ روزوں کی تلافی ہو سکے گی؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں میری رہنمائی کریں۔

[رمضان المبارک کے روزے فرض ہیں، انہیں بلاعذر ترک کرنا جائز نہیں۔ دودھ پلانے والی خواتین کے لیے یہ حلال نہیں کہ وہ کسی شرعی عذر کے بغیر رمضان کے روزے چھوڑ دیں۔ اگر بچے کو دودھ پلانے کی وجہ سے انہیں جسمانی طور پر نقصان کا اندیشہ ہو یا بچے کے لیے کمزوری یا نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو ایسی عورتیں مریض کے حکم میں ہیں، انہیں رمضان کے بعد اپنے متروکہ روزوں صرف قضا دینا ہوگی، فدیہ دینا ضروری نہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ 1

''جو شخص تم میں سے بیمار یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کا شمار پورا کرے۔''

جو اہل علم قضا کے ساتھ فدیہ بھی لازم کرتے ہیں، ان کا موقف محل نظر ہے کیوں کہ وجوب فدیہ کی کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں اور یہ اصول ہے کہ جب تک کسی چیز کے واجب ہونے کی دلیل نہ ہو اس وقت تک انسان بری الذمہ ہے۔ دلائل کے اعتبار سے یہی موقف قوی تر ہے کہ ایسی خواتین صرف قضا دینے سے اپنے متروکہ روزوں کی تلافی کر سکیں گی، فدیہ وغیرہ کی پابندی سے وہ بری ہیں۔ حدیث میں بھی اس کے متعلق واضح اشارہ ہے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ نے مسافر سے نصف صلوٰۃ ساقط کر دی ہے اور مسافر، دودھ پلانے والی اور حاملہ خاتون سے روزہ بھی ساقط کر دیا ہے۔'' 2

اس حدیث میں دودھ پلانے والی خاتون کو مسافر کے ساتھ ملایا گیا ہے، جیسا کہ مسافر کے ذمے متروکہ روزوں کی قضا ہے اسی طرح دودھ پلانے والی خاتون کو بھی رمضان میں چھوٹ جانے والے روزوں کی صرف قضا دینا ہوگی۔ اس حدیث سے بعض اہل علم نے یہ مسئلہ بھی کشید کیا ہے کہ دودھ پلانے والی خاتون کو روزہ معاف ہے، آئندہ قضا دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے، یہ بات بھی غلط ہے، کیوں کہ اس کے ساتھ مسافر کا حکم بھی بیان ہوا ہے۔ جب کہ مسافر کے لیے قرآن کریم کا حکم ہے کہ وہ بعد میں اپنے قضاء شدہ روزوں کی گنتی پوری کرے گا۔ بہر حال اگر دودھ پلانے سے اس کی اپنی صحت یا بچے کی صحت خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی خاتون روزہ ترک کر دے اور جتنے روزے چھوٹ جائیں ان کی بعد میں قضا دے دے۔ واللہ اعلم!

! البقرہ:۱۸۴.

@ ابوداود، الصیام:۲۴۰۷.

قیمت خرید سے زیادہ کا بل بنانا

] ہماری ہارڈ ویئر کی دکان ہے، ہمارے پاس پلمبر آتا ہے اور ہزار روپے کا سامان خریدتا ہے اور ہمیں کہتا ہے کہ بارہ سو کا بل بنا دو، اگر ہم اس کی خواہش کے مطابق بل بنا کر نہ دیں تو وہ دوسری دکان پر چلا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمیں مجبوراً یہ کام کرنا پڑتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

[گاہک کی فرمائش کے مطابق قیمت خرید سے زیادہ کی رسید دینا جھوٹ اور غلط بیانی ہے۔ جو لوگ اس طرح کا بل بناتے ہیں وہ دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں تاکہ لوگوں سے زیادہ رقم وصول کریں، ایسا کرنا حقوق العباد پر ڈاکہ ڈالنا ہے، قیامت کے دن اس کے متعلق باز پرس ہوگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ۝﴾ 1

"قیامت کے دن ہم عدل و انصاف پر مبنی ترازو کھڑا کریں گے تو کسی شخص کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی ظلم ہوا تو ہم اس کو بھی لا حاضر کریں گے اور ہم اکیلے حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔"

اس آیت کے پیش نظر ان حضرات کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے جو قیمت خرید سے زیادہ بل بنا کر مالک سے زیادہ رقم وصول کرتے ہیں۔ گاہک نہ ٹوٹنے کے خیال سے زیادہ بل بنا کر دینا بھی دوسروں کے ساتھ گناہ کے کام میں تعاون کرنا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں منع کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۠ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۠ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۝﴾ 2

"نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو، گناہ اور ظلم پر مبنی کاموں میں دوسروں کا تعاون نہ کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کیوں کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دیتے ہیں۔"

سوال میں جس کردار ناہنجار کا ذکر ہے یہ ہر محکمے اور ہر شعبہ زندگی میں ہوتا ہے۔ ایک مسلمان کے شایان شان نہیں کہ وہ

! الانبیاء:۴۷.	@ المائدہ:۲.

کسی کے ساتھ اس طرح دھوکا کرے۔ حدیث میں ہے۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ''مسلمان کے لیے دھوکہ بازی حرام ہے۔'' 1

رسول اللہ e کے عہد مبارک میں ایک شخص کو اکثر خرید وفروخت کے وقت دھوکہ دیا جاتا تھا، اس نے آپ سے شکایت کی تو آپ نے فرمایا:

''جب تم کسی سے معاملہ کرو تو کہہ دیا کرو کہ دھوکہ نہیں ہوگا، چنانچہ وہ شخص معاملہ کرتے وقت یہ الفاظ کہہ دیتا تھا۔'' 2

امام بخاری a نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:

''خرید وفروخت میں فریب کاری اور دھوکہ دہی ناجائز ہے۔'' 3

لہٰذا ایک مسلمان کو ایسے کاموں سے اجتناب کرنا چاہیے جن کے ارتکاب سے اس کا ایمان مجروح ہوتا ہو۔ واللہ اعلم!

نگرانِ وقف کے اخراجات

] دورِ حاضر کے مدارس اسلامیہ اور مراکز دینیہ وقف ہی کی ایک شکل ہیں، ان کے جو نگران ہیں، وہ کس حد تک اس وقفی جائیداد سے اپنی ضروریات پوری کر سکتے ہیں؟ کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟ وضاحت کریں۔

[اس میں کوئی شک نہیں کہ مدارس اسلامیہ اس ملک وملت کی نظریاتی حدود کے نگران اور محافظ ہیں، ان کی آبیاری میں ہمیں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے، ان کے ناظمین حضرات کی خدمات بھی لائق تحسین ہیں کہ وہ مادی دور میں ان کی پاسبانی پر لگے ہوئے ہیں، ان پر بہت سخت ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان کی نگرانی وحفاظت کے متعلق کوتاہی کا شکار نہ ہوں، ان حضرات کی ضروریات کے متعلق بھی کتاب وسنت میں واضح ہدایات ہیں۔

جیسا کہ سیدنا ابوبکر t جب خلیفہ منتخب ہوئے تو آپ نے فرمایا: ''میری قوم جانتی ہے کہ میرا کاروبار، میرے اہل خانہ کے اخراجات کے لیے کافی تھا، اب میں مسلمانوں کے معاملات کے حوالے میں مشغول کر دیا گیا ہوں، لہٰذا ابوبکر t کے اہل خانہ اس بیت المال سے کھائیں گے اور مسلمانوں کے لیے کام کریں گے۔'' 4

اس کا مطلب یہ ہے کہ مدارس کے ناظمین، اپنی ضروریات، فراہم شدہ چندہ سے پوری کر سکتے ہیں۔ ضروریات کی مزید تشریح ایک دوسری حدیث میں ہے، رسول اللہ e نے فرمایا:

''جو ہمارا عامل ہو، وہ بیوی حاصل کرلے اگر اس کا کوئی خدمت گزار نہیں تو وہ خادم لے لے اور اگر اس کے پاس رہائش نہیں تو وہ رہائش لے لے اور جو کوئی اس کے علاوہ لے تو وہ خائن ہے یا چور۔'' 5

! ابن ماجہ، التجارات:۲۲۴۱۔
@ بخاری، الاستقراض:۲۴۰۷۔
# بخاری، البیوع، باب ۴۰۔
$ بخاری، البیوع:۲۰۷۰۔
% ابوداود، الخراج:۲۹۴۵۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح کرنا، خادم رکھنا اور اخراجات کے سمیت رہائش حاصل کرنا بنیادی ضروریات ہیں، ان کے علاوہ حیلے بہانے سے یا چوری چھپے اپنی تحویل میں دیئے گئے فنڈز سے مزید سمیٹنے کی کوشش کرنا بہت بڑی اور بری خیانت ہے۔ سیدنا عمر t نے اپنی وقفی جائیداد کے متعلق یہ شرط عائد کی تھی:

''جو اس کا متولی بنے وہ اس سے خود بھی کھا سکتا ہے اور اپنے دوست کو بھی کھلا سکتا ہے البتہ وہ مال جمع نہیں کر سکتا۔'' 1

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو وقفی جائیداد کا نگران ہوگا وہ اپنی محنت کا واجبی سا معاوضہ وقفی جائیداد سے لے سکتا ہے۔ یعنی وہ اس قدر وقف فنڈ سے لے سکتا ہے جس سے اخراجات پورے ہو سکیں۔ بالفاظ دیگر فضولیات کی بجائے ضروریات پورا کرنے کی گنجائش ہے۔ نگران حضرات درج ذیل حدیث کو ضرور پیش نظر رکھیں:

''کچھ لوگ بیت المال میں ناحق تصرف کرتے ہیں، قیامت کے دن ان کے لیے آگ ہوگی۔'' 2

ہمارے رجحان کے مطابق اس حدیث کے پیش نظر دینی مدارس کے مہتمم حضرات کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ وہ جمع شدہ چندہ سے اپنی بچیوں کو بڑے گرانقدر جہیز دینے، بچوں کی دھوم دھام سے شادیاں کرنے اور ان کے لیے محلات تعمیر کرنے کے مجاز نہیں ہیں، اس کا بہترین حل یہ ہے کہ معروف طریقہ کے مطابق اپنے لیے معقول ماہانہ مشاہرہ مقرر کر لیا جائے پھر اسی سے ضروریات زندگی کو پورا کیا جائے۔ واللہ اعلم!

چوری کا مال خریدنا

] باڑا مارکیٹ میں چوری کا مال فروخت ہوتا ہے، گاڑیوں کے پرزے بھی چوری شدہ ہوتے ہیں، کیا شرعی طور پر انہیں خریدا جا سکتا ہے؟ جب کہ وہ عام بازار کے لحاظ سے بہت سستے ہوتے ہیں، اس کے متعلق قرآن وحدیث میں کیا ہے؟

[چوری کرنا حرام ہے۔ رسول اللہ e جب اپنے صحابہ کرام [سے دین قائم رہنے کی بیعت کرتے تھے تو یہ بات بطور خاص کہتے: ''تم چوری نہیں کرو گے۔'' 3

چوری کردہ سامان بھی حرام ہوتا ہے، اس کا استعمال کسی صورت میں جائز نہیں۔ رسول اللہ e نے فرمایا:

''کسی مسلمان کا مال اس کی خوشی کے بغیر حلال نہیں۔'' 4

جب چوری کرنا، ناجائز اور مسروقہ سامان حرام تو اس کی خرید وفروخت کیونکر جائز ہو سکتی ہے؟ ہم ایک دوسرے پہلو سے بھی اس خرید وفروخت کا جائزہ لیتے ہیں کہ چوری کردہ اشیاء کو جو فروخت کر رہا ہے وہ ان کا مالک نہیں اور غیر مملوکہ چیز فروخت کرنا اور اسے خریدنا ناجائز ہے۔ اگر چیز کا مالک کسی کو فروخت کرنے یا خریدنے کے اختیارات دے دے اور اسے اپنی طرف سے وکیل مقرر کر لے تو ایسے حالات میں غیر مملوکہ چیز کو فروخت کیا جا سکتا ہے اور اسے خریدا بھی جا سکتا ہے لیکن چوری کردہ

! بخاری، الشروط:۲۲۷۷. @ بخاری، فرض الخمس:۳۱۱۸.

بخاری، الایمان:۱۸. $ مسند امام احمد:ج۵،ص۷۲.

اشیاء جس کے پاس ہیں اصل مالک نے اسے خرید وفروخت کے لیے قطعی طور پر وکیل نہیں بنایا۔ لہٰذا چوری کی اشیاء کو خریدنا یا فروخت کرنا ہر پہلو سے ناجائز اور حرام ہے۔ پھر چوری کا مال جتنے ہاتھوں میں جائے گا وہ حرام ہی رہے گا اور اصل مالک کے علاوہ کوئی بھی دوسرا ان کا مالک نہیں بن سکے گا۔ اگر اصل مالک کا پتہ ہے تو وہ چیز اسے واپس کی جائے یا جس سے خریدی گئی ہے اسے دے دیں، اس سے فائدہ اٹھانا بھی حرام ہے۔

صورت مسئولہ میں باڑا مارکیٹ سے گاڑیوں کے پرزے جو اصل قیمت سے بہت کم قیمت پر دستیاب ہو جاتے ہیں انہیں خریدنا جائز نہیں اور نہ ہی گاڑی وغیرہ میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ سیدنا تمیم داری t اور ان کے ساتھی نے دور جاہلیت میں ایک چاندی کا جام چوری کر لیا تھا، پھر انہیں اسلام لانے کے بعد اس بات کا احساس ہوا تو وہ اصل مالک کے اہل خانہ کے پاس گئے اور وہاں اعتراف جرم کیا۔ پھر اس کی تلافی بایں صورت کی کہ اپنے حصے کے پانچ صد درہم انہیں واپس کیے اور بتایا کہ باقی پانچ صد درہم میرے دوسرے ساتھی کے پاس ہیں۔ 1

بہر حال چوری کا مال اصل مالک کا ہی رہے گا خواہ وہ کتنے ہاتھوں فروخت ہوتا رہے۔ واللہ اعلم!

پاکستانی مصنوعات پر خود ساختہ جاپان لکھنا

] میں ایک جنرل سٹور پر ملازم ہوں، جہاں مختلف اشیاء فروخت کی جاتی ہیں، مالک دوکان پاکستانی مصنوعات پر خود ساختہ جاپان کا سٹکر لگا کر اسے فروخت کرتے ہیں اور ہمیں بھی ان کے ساتھ تعاون کرنا پڑتا ہے، قرآن وحدیث کے مطابق اس کی وضاحت کریں۔

[دنیوی زندگی گزارنے کے لیے تجارت ایک اہم ذریعہ ہے، لیکن اسے انتہائی سچائی اور دیانت داری کے ساتھ سر انجام دینا چاہیے۔ رسول اللہ e نے سچے دیانت دار تاجر کی بہت فضیلت بیان فرمائی ہے۔

حدیث میں ہے: ’’دیانت دار سچا مسلمان تاجر قیامت کے دن شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔‘‘ 2

یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے تاہم امانت و دیانت اور سچائی کے ساتھ تجارت کرنا بہت فضیلت والا عمل اور نہایت باعث برکت ہے۔ تجارت میں دیانت داری کا تقاضا ہے کہ کوئی عیب دار چیز فروخت نہ کی جائے۔ اگر اس میں کوئی عیب ہے تو اس کی وضاحت کر دینا چاہیے۔

جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ’’مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے اور جو مسلمان اپنے بھائی کے ہاتھ کوئی عیب دار چیز فروخت کرے تو اس کے لیے حلال نہیں کہ اس کے اس عیب کو بیان نہ کر دے۔‘‘ 3

اس حدیث کا تقاضا ہے کہ سودے میں اگر عیب ہے تو اسے بیان کر دیا جائے، عین ممکن ہے کہ جس مقصد کے لیے کوئی

! فتح الباری: ج۵،ص۵۰۲.   @ ابن ماجہ، التجارات:۲۱۳۹.

ابن ماجہ، تجارات:۲۲۴۶.

اسے خریدنا چاہتا ہے اس کے نزدیک یہ عیب کوئی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ رسول اللہ e کے عہد مبارک میں ایک شخص نے عیب کو چھپا کر فروخت کرنے کی کوشش کی تو آپ نے اس کی سرزنش فرمائی۔

چنانچہ حدیث میں ہے: رسول اللہ e ایک دفعہ منڈی میں غلہ کے ڈھیر کے پاس سے گزرے، آپ نے اپنا ہاتھ اس میں داخل فرمایا تو اس میں نمی محسوس ہوئی۔

آپ نے فرمایا: ''اے غلے والے! یہ کیا ہے؟

اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اس پر بارش ہوگئی تھی۔

آپ e نے فرمایا: ''تم نے اسے غلے کے اوپر کیوں نہ رکھا تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں۔ جس نے دھوکہ دیا وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔'' 1

ان احادیث سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تجارت کرتے وقت جھوٹ بولنا، عیب چھپانا اور دھوکہ دینا منع ہے۔ صورت مسئولہ میں پاکستانی مصنوعات پر ''ساختہ جاپان'' کا سٹکر لگا کر اسے فروخت کرنا گاہک کو دھوکہ دینا ہے، اس سے تجارت کے حرام ہونے کا اندیشہ ہے۔ ملازمین کو چاہیے کہ اس سلسلہ میں دکان دار سے تعاون نہ کریں۔ بصورت دیگر وہ بھی جرم میں برابر کے شریک ہوں گے۔ اگر وہ انہیں مجبور کرتا ہے تو اس کی ملازمت چھوڑ کر کوئی دوسری ملازمت اختیار کر لی جائے۔ واللہ اعلم!

عورتوں کے بال فروخت کرنا

] میرا کاروبار یہ ہے کہ میں عورتوں کے بال کوڑے کرکٹ سے اکٹھے کرتا ہوں یا گھروں سے خرید لیتا ہوں پھر انہیں چائنا کی ایک کمپنی کو مہنگے داموں فروخت کرتا ہوں، وہ کمپنی ان بالوں سے وگیں تیار کرتی ہے جسے گنجے حضرات استعمال کرتے ہیں۔ کیا ایسا کاروبار جائز ہے؟

[انسان اور انسان کے تمام اعضاء و اجزاء قابل احترام ہیں، اس کے اعضاء اور اجزاء کے قابل احترام ہونے کی وجہ سے ان کی خرید و فروخت حرام ہے، یہ بال بھی انسان کے اجزاء سے ہیں جو محل بیع نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں۔ لہٰذا بالوں کو گھروں سے خریدنا یا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے اکٹھے کر کے انہیں آگے فروخت کرنا جائز نہیں۔ ان کی خرید و فروخت اس لیے بھی منع ہے کہ یہ آگے ایک ناجائز کام کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ پہلے دور میں بالوں کے ساتھ دوسرے بال پیوند کیے جاتے تھے جسے اسلام نے منع فرمایا۔

چنانچہ سیدہ اسماء بنت ابی بکر r سے روایت ہے وہ بیان کرتی ہیں کہ ''رسول اللہ e نے بال کے ساتھ پیوند کرنے والی اور پیوند کرانے والی دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔'' 2

سیدنا ابوہریرہ t سے روایت ہے وہ رسول اللہ e سے بیان کرتے ہیں کہ آپ e نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے بال

! مسلم، الایمان: ۱۰۲۔ @ بخاری اللباس: ۵۹۳۶۔

کے ساتھ بال لگانے والی اور لگوانے والی دونوں پر لعنت کی ہے۔'' 1

ایک دفعہ سیدنا امیر معاویہ t اپنے دورِ حکومت میں مدینہ طیبہ آئے اور انہیں بالوں کی وگ ملی تو آپ نے فرمایا: ''میں نہیں سمجھتا کہ یہودیوں کے علاوہ کوئی مسلمان یہ کام کرتا ہوگا، رسول اللہ e نے اسے جعل سازی کو جھوٹ قرار دیا ہے۔ یعنی بالوں کی اس طرح پیوند کاری کرنے کو آپ e نے جھوٹ کہا ہے۔'' 2

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''بنی اسرائیل کی ہلاکت کا یہی سبب ہوا کہ انہوں نے ایسے کام شروع کر دیئے تھے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی والے تھے، ان میں سے ایک یہ ہے۔'' 3

بہر حال انسانی بالوں یا دوسرے اعضاء کا کاروبار شرعاً جائز نہیں، لیکن اس وقت اس کاروبار کی سنگینی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، جب اسے کسی ناجائز کام کے لیے استعمال کیا جائے۔ سائل کو چاہیے کہ وہ کوئی دوسرا جائز کاروبار کرے، اس قسم کے حرام اور ناجائز کاروبار کا اختیار کرنا ایک مسلمان کی شان کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ حلال اور جائز کاروبار کی توفیق سے نوازے۔ آمین!

ادھار خریدنے کی ایک ناجائز صورت

] میں تجارت سے منسلک ہوں، مجھے بعض اوقات کچھ رقم کی ضرورت پڑتی ہے، میں کسی سے ادھار پر کوئی چیز خرید لیتا ہوں پھر جس سے میں نے وہ چیز لی ہوتی ہے وہ نقد سستی قیمت سے مجھ سے وہی چیز خرید لیتا ہے، اس سے مجھے رقم مل جاتی ہے۔ کیا اس طرح کی خرید وفروخت جائز ہے؟

[کسی حرام چیز کو مختلف ذرائع سے حلال و جائز بنانے کی کوشش کرنا باعث لعنت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو اس لیے ملعون ٹھہرایا کہ انہوں نے حرام کردہ چیزوں کو مختلف حیلوں سے حلال کرنے کی کوشش کی۔ صورت مسئولہ میں بھی اسی طرح کے ایک حیلہ سے کام لیا گیا ہے جس میں ایک حرام چیز کو حلال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ طے شدہ اضافہ کی شرط سے قرض لینا سود ہے۔ اب اس سود کو خرید وفروخت کے ذریعے حلال کرنے کی کوشش کرنا ناجائز حیلہ ہے جس کی شریعت میں اجازت نہیں۔ شرعی اصطلاح میں اسے بیع عینہ کہا جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

''کوئی آدمی کسی چیز کو مقررہ قیمت پر معین وقت کے لیے فروخت کرے، پھر میعاد پوری ہونے پر خریدار سے وہی چیز کم قیمت پر خرید لے۔''

اس کے متعلق رسول اللہ e کا ارشاد گرامی حسب ذیل ہے: ''جب تم بیع عینہ کرنے لگو گے اور بیلوں کی دمیں پکڑ کر کھیتی

! بخاری، اللباس:۵۹۳۳.
@ بخاری، اللباس:۵۹۳۷.
# بخاری، اللباس:۵۹۳۲.

باڑی میں مگن ہوجاؤ گے اور جہاد ترک کر دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کر دیں گے اور یہ ذلت اس وقت تک تمہارا مقدر رہے گی جب تک تم اپنے دین کی طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔'' 1

اسی طرح ایک عورت نے سیدہ عائشہ r سے عرض کیا کہ مجھ سے زید بن ارقم نے ایک غلام آٹھ سو درہم میں ادھار خریدا ہے پھر وہی غلام میں نے چھ صد درہم میں ان سے نقد قیمت ادا کر کے خرید لیا ہے۔ اس پر سیدہ عائشہ r نے فرمایا: ''تم نے بہت بری خرید و فروخت کی ہے۔'' 2

بہر حال ایک چیز کا کسی سے ادھار خریدنا پھر وہی چیز اصل مالک کو کم قیمت پر نقد فروخت کر دینا بیع عینہ کہلاتا ہے۔ کیوں کہ اس میں سود کی شکل پائی جاتی ہے۔ سوال میں ذکر کردہ معاملہ بھی اسی طرح کا ہے لہٰذا یہ ناجائز اور حرام ہے۔ واللہ اعلم!

گروی شدہ مکان میں رہائش رکھنا

] میں نے کسی آدمی سے کچھ قرض لیا ہے اور اپنا مکان اس کے ہاں گروی رکھا ہے، کیا وہ آدمی جسے مکان دیا گیا ہے، اس میں رہائش رکھ سکتا ہے؟

[کسی سے کوئی چیز خریدنے یا قرضہ لینے پر بطور ضمانت کوئی چیز حق دار کے پاس رکھنے کو گروی کہا جاتا ہے۔ جب قیمت یا قرض ادا کر دوں گا تو میری چیز مجھے واپس مل جائے گی۔ جائز مقصد کے لیے کوئی چیز گروی رکھنے میں کوئی خرابی یا قباحت نہیں لیکن گروی رکھی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانا ناجائز اور حرام ہے، کیوں کہ قرضے یا ادھار کی قیمت کے عوض کوئی بھی فائدہ اٹھانا سود ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن سلام t کی ایک روایت میں ہے، انہوں نے حضرت ابوہریرہ t سے فرمایا تھا:

''تو ایسی سرزمین (عراق) میں رہتا ہے جہاں سود کی وباء عام ہے، لہٰذا اگر تیرا کسی شخص کے ذمے کوئی حق ہے تو اس سے توڑی یا چارے کا گٹھا یا جو وغیرہ بطور ہدیہ قبول نہ کرنا کیوں کہ یہ سود ہے۔'' 3

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرض کے عوض کوئی بھی فائدہ اٹھانا سود ہے۔ ہاں گروی رکھی ہوئی چیز پر خرچ کرنا پڑتا ہو تو خرچ کے عوض تھوڑا بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسی نے حق دار کے پاس بطور ضمانت کوئی جانور وغیرہ گروی رکھا ہو تو اسے گھاس یا چارہ ڈال کر اس پر سواری کی جا سکتی ہے یا اس کا دودھ پیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

''سواری کا جانور اگر گروی ہے تو بقدر خرچ اس پر سواری کی جا سکتی ہے اور اگر دودھ والا جانور گروی ہے تو خرچ کے عوض اس کا دودھ پیا جا سکتا ہے، سوار ہونے والے اور دودھ پینے والے کے ذمے اس کا خرچہ ہے۔'' 4

حافظ ابن حجر a اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اگر کسی کے پاس گروی شدہ بکری ہے تو چارے کی قیمت

! ابوداؤد، الاجارہ:۳۴۶۲۔ @ بیہقی، ج۵، ص۸۴۰۔
بخاری، المناقب:۳۸۱۴۔ $ بخاری، الرہن:۲۵۱۲۔

کے مطابق اس کا دودھ پینے میں کوئی حرج نہیں، قیمت سے زیادہ دودھ حاصل کرنا سود ہے۔'' 1

مرہونہ زمین کی صورت میں اگر مرتہن ٹھیکے کی رقم راہن کے قرضہ سے منہا کردی جائے۔ اگر مرتہن خود کاشت کرے تو پیداوار تقسیم کر کے مالک کے حصے کے مطابق اس کا قرضہ کم کردے۔

صورت مسئولہ میں کسی نے قرضہ کے بدلے اپنا مکان گروی رکھا ہے اگر قرض دار اس میں رہائش رکھنا چاہتا ہے تو اس کا کرایہ طے کیا جائے اور اس کرائے کی رقم قرضے سے کم کرتا رہے، اگر کرایہ کی رقم کو قرض سے منہا نہیں کرتا تو یہ صریح سود ہے۔

ہمارا رجحان یہ ہے کہ ایسی چیز گروی رکھی جائے جس پر خرچ کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ جیسے زیورات وغیرہ تا کہ وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ گروی چیز کی حیثیت ایک امانت کی سی ہے، جب ادھار یا قرض چکا دیا جائے تو وہ چیز مالک کو اصل حالت میں واپس کردی جائے گی۔ واللہ اعلم!

مکان گروی پر دینا

] ہم نے ایک لاکھ روپیہ کسی سے قرض لیا ہے اور اس کے عوض اپنا مکان گروی رکھا ہے۔ ہمیں رہنے کے لیے کوئی مکان نہیں ملتا، اس لیے ہم اس مکان میں رہتے ہیں اور جس سے قرض لیا اسے ہر ماہ اس کا کرایہ ادا کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

[کوئی چیز گروی رکھ کر قرض یا کوئی اور چیز آئندہ کی ادائیگی پر ادھار لی جاسکتی ہے، رسول اللہ e نے ایک یہودی سے چند وسق جو لیے اور اس کے پاس اپنی زرہ گروی رکھی۔ 2 لیکن اس گروی شدہ چیز سے صرف اتنا فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے جس قدر اس پر اخراجات اٹھتے ہوں، مثلاً بکری کو اگر چارہ ڈالنا ہے تو اس کا دودھ حاصل کرلیا جائے اور اگر سواری کا جانور ہے تو چارہ وغیرہ ڈالنے کے عوض اس پر سواری کر لی جائے۔ دور حاضر میں اگر کسی نے گاڑی گروی رکھی ہے تو اپنا پٹرول ڈال کر اس پر سفر کیا جا سکتا ہے لیکن گروی میں زمین لے کر اسے کاشت کرنا اور پیداوار خود اٹھانا یا مکان کے عوض خود رہائش رکھنا یا کسی کو کرایہ پر دے کر خود کرایہ وصول کرنا جائز نہیں۔ صورت مسئولہ میں جس شخص کا مکان ہے وہ خود ہی کرایہ دار کی حیثیت سے اس مکان میں رہائش رکھے ہوئے ہیں، ایسا کرنا جائز نہیں، اگر اس کے کرایہ کو اصل قرض سے منہا کر دیا جائے تو جائز ہے۔ اسی طرح زمین کی پیداوار کو بقدر حصہ اگر قرض سے منہا ادا کر دیا جائے تو گروی شدہ زمین کو کاشت کیا جاسکتا ہے، بصورت دیگر گروی چیز سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا شرعاً جائز نہیں۔ (واللہ اعلم)

کئی سال تک کے لیے باغ خریدنا

] ہمارے ہاں اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک باغ کئی سالوں تک کے لیے خرید لیا جاتا ہے، کیا شرعی طور پر اس

! فتح الباری، ص۱۷۸ ج۵.   @ صحیح بخاری، الرھن:۲۵۰۹.

طرح کی خرید وفروخت جائز ہے، وضاحت کریں؟

[ہمارے ہاں جو کئی سال تک کے لیے باغات ٹھیکے پر دیئے جاتے ہیں، احادیث کی رو سے ناجائز ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ e نے فرمایا ہے: ’’پھلوں کا سودا نہ کروحتیٰ کہ ان کی صلاحیت معلوم ہو جائے۔ آپ نے بیچنے والے اور خریدنے والے دونوں کو روکا ہے۔‘‘ 1

صلاحیت سے مراد وہ کیفیت ہے جس کے بعد عام طور پر اس پر آفت کا احتمال نہیں رہتا۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے پھل پکنے سے پہلے ان کو فروخت کرنے سے منع فرمایا، پوچھا گیا یا رسول اللہ e! پکنے کا کیا مطلب ہے تو آپ نے فرمایا: ’’وہ سرخ ہو جائیں۔‘‘ 2

جب موجودہ پھل جو ابھی تک کھانے کے قابل نہیں ہوا اس کی خرید وفروخت شرعاً ناجائز ہے تو آئندہ کئی سالوں تک ٹھیکہ کیسے جائز ہوسکتا ہے جب کہ ان کا پھل بالکل معدوم ہوتا ہے۔ اس ممانعت کی وجہ بالکل واضح ہے کہ اس میں دھوکہ ہی دھوکہ ہے، اس کے علاوہ یہ ایک مجہول چیز کی خرید وفروخت ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں۔ پھر یہ ایسی چیز کی بیع ہے جو بیچنے والے کے پاس نہیں، جب کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’جو چیز تیرے پاس نہیں اسے مت بیچو۔‘‘ 3

ان تمام احادیث کا تقاضا ہے کہ کئی سالوں تک کے لیے باغات کا ٹھیکہ لینا جائز نہیں۔ اس کے علاوہ ایک صریح حدیث بھی اس سلسلہ میں وارد ہے۔ حضرت جابر t بیان کرتے ہیں:

’’رسول اللہ e نے کئی سال کے لیے پھل بیچنے سے منع فرمایا ہے۔‘‘

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی خرید وفروخت میں سراسر دھوکہ اور فراڈ ہے۔ واللہ اعلم!

مسئلہ وراثت

] ایک آدمی فوت ہوا، پس ماندگان میں بیٹی، پوتی اور ایک بھائی ہے، ترکہ سے ہر ایک کو کتنا کتنا حصہ ملے گا؟

[صورت مسئولہ میں میت کے ذمے قرض کی ادائیگی اور نفاذ وصیت (اگر ہے) کے بعد ترکہ کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ بیٹی کو کل ترکہ سے نصف دیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾ 4

’’اگر ایک بیٹی ہے تو اسے نصف دیا جائے۔‘‘

پوتی کو چھٹا حصہ دے کر 2/3 کی تکمیل کر دی جائے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود t نے کیا تھا کہ بیٹی کو نصف

! ابوداؤد، البیوع:۴۵۱۳۔ @ بخاری، البیوع:۲۱۹۸۔
ترمذی، البیوع:۱۲۳۲۔ $ النساء:۱۱۔

دے کر پھر پوتی کو چھٹا حصہ دیا اور فرمایا کہ یہ ثلثین کی تکمیل ہے۔ 1

ان کے مقررہ حصے دینے کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے بھائی کو دے دیا جائے۔

حدیث میں ہے:

''مقررہ حصہ داروں کو حصے دے کر جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کا ہے۔'' 2

سہولت کے پیش نظر جائیداد کے چھے حصے کر لیے جائیں، ان میں سے نصف یعنی تین حصے بیٹی کو، چھٹا حصہ یعنی ایک پوتی کو (اس طرح 3+1=4) دو تہائی لڑکیوں کو مل جائے گا اور باقی دو حصے بھائی کو دے دیئے جائیں۔ واللہ اعلم!

منشیات کا کاروبار

] ہمارے ہاں منشیات کا کاروبار بہت عروج پر ہے، بھنگ، چرس اور افیون بیرون ملک سپلائی کی جاتی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

[اسلام نے ہر نشہ آور چیز اور جسم کو سن کر دینے والی اشیاء سے منع کیا ہے خواہ وہ کسی چیز سے بھی تیار کی جائے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہ r کا بیان ہے کہ رسول اللہ e نے ہر نشہ آور اور سستی لانے (سن کر دینے) والی اشیاء سے منع کیا ہے۔ 3

حضرت دیلم حمیری t کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ e سے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم سرد علاقے میں رہنے والے ہیں، ہمیں وہاں بہت مشقت کے ساتھ کام کرنا پڑتے ہیں، ہم اس گندم سے ایک مشروب تیار کرتے ہیں، جس کے ذریعے ہم اپنے کام کاج میں طاقت حاصل کرتے ہیں اور سردی سے بھی دفاع کرتے ہیں۔ رسول اللہ e نے دریافت فرمایا کہ وہ مشروب نشہ آور ہے؟

میں نے عرض کیا ہاں۔

آپ نے فرمایا: ایسے مشروب سے اجتناب کرو۔

میں نے عرض کیا کہ ہمارے وہاں کے باشندے اسے ترک نہیں کریں گے۔

آپ نے فرمایا: اگر وہ نہ چھوڑیں تو اس پر ان سے قتال کرو۔ 4

سوال میں جن منشیات (بھنگ، چرس اور افیون) کا ذکر کیا گیا ہے وہ نشہ آور اور انسان کو وقتی طور پر کھڑا کر دیتی ہیں، اس میں چستی آ جاتی ہے لیکن ان کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ہماری اکثریت اس کی عادی ہے لیکن اس کا استعمال صراحتاً اسلام کی خلاف ورزی ہے۔ اس بناء پر نشہ آور چیزوں کی خرید و فروخت، بیرون ملک سمگلنگ کرنا حرام اور ناجائز ہے۔ شریعت میں اس کے اسباب و وسائل، مفاسد کا حکم رکھتے ہیں، ان کا روکنا ہمارا فرض ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق دور حاضر میں

! بخاری، الفرائض: ۶۷۵۶۔ @ بخاری، الفرائض: ۶۷۳۵۔

ابوداؤد، الاشربہ: ۳۶۸۶۔ $ مسند امام احمد: ص۲۳۲، ج۴۔

منشیات فروشی اور اس کی کاشت کاری، خرید وفروخت حرام ہے۔ بحیثیت مسلمان ہمارا اور ہماری حکومت کا فرض ہے کہ اس کالے دھندے کو ختم کرنے کے لیے پوری کوشش کرے۔ اس کام میں ایک دوسرے کی مدد کرنا ظلم اور گناہ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرنا ہے، جس سے قرآن کریم نے منع کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ﴾ 1

’’نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو، ظلم اور گناہ کے کاموں میں کسی کا تعاون نہ کرو۔‘‘

ایڈوانس بیلنس

] مختلف موبائل کمپنیوں نے صارفین کو ایڈوانس بیلنس کی سہولت دے رکھی ہے اگر کبھی بیلنس ختم ہو جائے تو مخصوص نمبر ملانے سے بیلنس آ جاتا ہے لیکن وہ دیئے ہوئے بیلنس سے زیادہ وصول کرتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

[آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں رسول اللہ e نے شاید ایسے حالات کے متعلق پیشین گوئی فرمائی تھی۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے:

’’لوگوں پر ایسا وقت آئے گا کہ انسان اپنی روزی کے متعلق حلال وحرام کی پروا نہیں کرے گا۔‘‘ 2

حرام کی کمائی میں سودی کاروبار بھی شامل ہے، جس کے متعلق رسول اللہ e نے فرمایا:

’’لوگوں پر وہ وقت آنے والا ہے کہ وہ بلا دریغ سود کا استعمال کریں گے، دریافت کیا گیا کہ آیا سب لوگ اس وبا میں مبتلا ہوں گے؟‘‘

آپ نے فرمایا: جو سود نہیں کھائے گا اسے سود کا دھواں یا غبار ضرور اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ 3

صورت مسئولہ میں اسی قسم کا کاروبار ہے، مختلف موبائل کمپنیاں اپنا کاروبار چمکانے کے لیے اس طرح کی سہولیات صارفین کو دیتی ہیں۔ مثلاً:

☆ جاز کمپنی 10 روپے کا بیلنس دے کر 13.20 روپے کاٹتی ہے۔
☆ یوفون کمپنی 30 روپے دے کر 34 روپے واپس لیتی ہے۔
☆ ٹیلی نار والے 40 روپے دے کر 45.12 روپے وصول کرتے ہیں اور اسے سروس چارجز کا نام دیا جاتا ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق یہ سود ہے جس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ 4

’’اگر تم اس سود سے باز نہیں آؤ گے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔‘‘

! المائدہ:۲۔ @ بخاری، البیوع: ۲۰۵۹۰۔

مسند امام احمد ص۴۹۴، ج۲۔ $ البقرہ: ۲۷۹۔

اس بناء پر ہمارا صارفین کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ اس طرح کے ایڈوانس بیلنس کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیں جو ہمیں اللہ اوراس کے رسول سے لڑنے پر آمادہ کرتا ہے۔

گروی مکان کا کرایہ

] ہم نے ضرورت کے پیش نظر ایک آدمی سے آٹھ لاکھ قرض لیا اور اپنا مکان گروی رکھا، اب ہم اسی مکان میں رہتے ہیں اور جس سے قرض لیا ہے اسے اس مکان کا کرایہ دیتے ہیں، کیا شریعت میں ایسا کرنا جائز ہے؟

[شرعی طور پر ایسا کرنا جائز نہیں کیوں کہ قرضے کے عوض جو بھی فائدہ اٹھایا جائے وہ سود ہے۔ گروی رکھی گئی چیز درحقیقت قرض کی ضمانت ہوتی ہے تا کہ قرض لینے والا مقررہ مدت میں قرض کو واپس کر دے۔ اگر وہ اس دوران لیت ولعل سے کام لیتا ہے تو قرض دینے والا گروی شدہ چیز کو فروخت کر کے اپنی رقم پوری کر سکتا ہے۔ اگر اس کی قیمت قرض سے زیادہ ہے تو وہ مقروض کو واپس کر دی جائے گی۔ گروی کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ قرض میں دی گئی رقم کو ضائع ہونے سے بچایا جائے، قرض دینے والا اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا۔ صحابہ کرام [اس معاملہ میں بہت حساس تھے۔ جیسا کہ زر بن حبیش t کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابی بن کعب t سے عرض کیا:

''میں جہاد میں جانا چاہتا ہوں اور لوگوں کو سرزمین عراق میں قرض بھی دیتا ہوں۔ حضرت ابی بن کعب t نے فرمایا کہ تو ایسی سرزمین میں ہے جہاں سودی لین دین بہت ہوتا ہے، اس بناء پر اگر تو کسی کو قرض دے اور وہ تجھے بطور ہدیہ کوئی چیز دیتا ہے تو اسے واپس کر دو اور صرف اپنا قرض وصول کرو۔'' 1

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود t کے متعلق بھی روایات میں آیا ہے کہ انہیں ایک آدمی کے متعلق سوال کیا گیا جو کسی سے قرض لیتا ہے اور اس کے بدلے اپنی سواری کا جانور اسے سواری کے لیے دے دیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود t نے فرمایا: ''قرض کے عوض، سواری کا جانور دینا سود ہے۔'' 2

حضرت ابن عباس t سے کسی نے پوچھا کہ ہمارا ایک پڑوسی مچھلی فروش ہے، اس نے کسی سے پچاس درہم بطور قرض لیے ہیں اور اسے مچھلی بطور ہدیہ دیتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

تو آپ نے فرمایا: ''جس قدر مچھلی بطور ہدیہ دی ہے وہ اس کے قرض سے منہا کر دی جائے۔'' 3

حضرت عبداللہ بن سلام t نے بھی حضرت ابو بردہ t کو اس قسم کی نصیحت کی تھی۔ 4

اس بناء پر اگر کسی نے قرض کے بدلے مکان گروی رکھا ہے تو قرض دینے والے کو اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ قرض لینے والے سے گروی شدہ مکان کا کرایہ وصول کرنا سود ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم!

! بیہقی ص ۳۵۰ ج ۵. @ بیہقی ص ۳۵۱ ج ۵.
بیہقی ص ۷۶۰ ج ۴. $ بخاری، المناقب: ۳۸۱۴.

نرخ مقرر کرنا

] بعض اوقات حکومت اشیاء صرف کے ریٹ مقرر کر دیتی ہے اور دکان پر ریٹ لسٹ آویزاں کرنے کو لازمی کر دیتی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

[حکومت کی طرف سے قیمتوں کو کنٹرول کرنے کا اقدام بعض اوقات عوام الناس کے لیے بہت اذیت کا باعث ہوتا ہے اور اس کے مضر اثرات، نفع بخش اثرات سے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ کنٹرول دو طرح سے ہوتا ہے: ایک یہ کہ حکومت اعلان کر دیتی ہے کہ فلاں چیز اتنی قیمت سے زیادہ فروخت نہیں کی جا سکتی اور دکان داروں کو پابند کیا جاتا ہے کہ وہ ان اشیاء صرف کے نرخ اپنی دکانوں پر آویزاں کریں تا کہ ہر خریدار دیکھ سکے اور گاہے بگاہے حکومت چھاپے بھی مارتی ہے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو بھاری جرمانہ کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دکاندار کنٹرول ریٹ پر صرف ناکارہ، گندی، غیر معیاری اور ملاوٹ والی چیزیں فروخت کرنا شروع کر دیتے ہیں، اگر کوئی گاہک اچھی اور خالص چیز لینا چاہتا ہو تو اس سے الگ ریٹ طے کیا جاتا ہے۔

کنٹرول کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت جس چیز پر کنٹرول کرنا چاہتی ہے اس کے حصول کے لیے مختلف مقامات پر اس کے ڈپو مقرر کر دیئے جاتے ہیں تا کہ ان ڈپوؤں سے وہ چیز مقررہ نرخ پر دستیاب ہو سکے۔ اس سے بھی چور بازی جنم لیتی ہے، سب سے زیادہ بد دیانتی خود ڈپو ہولڈر کرتے ہیں، وہ عام لوگوں کو ٹرخا دیتے ہیں اور اپنوں کو نوازنا شروع کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ڈپو ہولڈر اسے بلیک مارکیٹ میں فروخت کر کے دولت جمع کرتے ہیں، شریعت کی نظر میں اس طرح کا کنٹرول مستحسن نہیں۔

چنانچہ ایک دفعہ مدینہ طیبہ میں اشیاء صرف کے ریٹ بہت بڑھ گئے تو لوگوں نے رسول اللہ e سے عرض کیا، یا رسول اللہ! نرخ بہت بڑھ گئے ہیں، آپ ریٹ مقرر کر دیں۔

رسول اللہ e نے فرمایا:

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی نرخوں پر کنٹرول کرنے والا ہے، وہی تنگی کرنے والا، وسعت دینے والا روزی رساں ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ میں اپنے رب سے بایں حالت ملوں کہ مجھ پر کسی کا کوئی خونی یا مالی حق نہ ہو۔'' 1

اس حدیث کے مطابق رسول اللہ e نے مہنگائی کے باوجود قیمتیں مقرر کرنے سے انکار کر دیا، آپ کا یہ فرمان کہ اللہ تعالیٰ ہی چیزوں کی رسد کو گھٹانے بڑھانے والا ہے، اس کے ذریعے معیشت کا ایک بنیادی اصول بیان فرمایا ہے کہ منڈی کے عوامل کو آزاد رہنے دیا جائے کیوں کہ قیمتوں کے تقرر سے کسی نہ کسی کا حق ضرور مارا جاتا ہے، اس بناء پر اس سے اجتناب کا حکم دیا۔ مہنگائی کا علاج یہ ہے کہ اشیاء کی رسد میں اضافہ کیا جائے، حکومت کو ریٹ مقرر کرنے کے بجائے یہ کرنا چاہیے کہ وہ مہنگائی

! ابوداؤد، البیوع: ۳۴۵۱.

کوتوڑنے کے لیے اشیاء صرف کی رسد کو بڑھائے جب کہ قیمتیں مقرر کرنے سے منڈی میں ان پر عمل نہیں ہوتا اور چیزوں کی چور بازاری شروع ہو جاتی ہے جس سے لوگوں کی اذیت میں اضافہ ہوتا ہے، اسی بات کی طرف رسول اللہ e (نے آخر میں) واضح طور پر اشارہ کیا ہے۔ ہاں اگر اشیاء صرف کی گرانی خود تاجر حضرات کی پیدا کردہ ہو جیسا کہ ذخیرہ اندوزی سے مصنوعی قلت پیدا کر دی جاتی ہے تو ایسے حالات میں حکومت کو کنٹرول کرنے کا حق ہے لیکن اسے کڑی نگرانی کرنا چاہیے تا کہ چور بازاری کا دروازہ نہ کھلے۔ واللہ اعلم!

سود پر قرض لینا

] میرے والد گرامی جیل میں ہیں، ان کی رہائی کے لیے ایک لاکھ روپیہ درکار ہے، اگر یہ رقم نہیں دی جاتی تو مزید دو سال قید بڑھ سکتی ہے، میرے پاس اتنی رقم نہیں اور مجھے کوئی قرض بھی نہیں دیتا، ایک شخص اس شرط پر قرض دینے کے لیے تیار ہے کہ تین سال بعد اسے دو لاکھ واپس کیے جائیں، کیا اس قسم کی مجبوری کے پیش نظر سود پر قرض لیا جا سکتا ہے؟

[سودی کاروبار یا لین دین اس قدر سنگین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کام کرنے والے کو سخت وارننگ دی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ 1

''اگر تم اس سودی لین دین سے باز نہیں آؤ گے تو پھر اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

اور احادیث میں سود لینے اور دینے کو اپنی ماں کے ساتھ منہ کالا کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اسے کسی صورت میں اختیار نہ کرے۔ صورت مسئولہ میں کوئی ایسا عذر نہیں جس کی بنیاد پر سود پر قرض لینے کو جائز قرار دیا جائے، جان بچانے کے لیے مردار کھانے کی اجازت قرآن نے دی ہے، لیکن صورت مسئولہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے رجحان کے مطابق کسی مال دار سے قرض لے کر اپنے باپ کو رہائی دلائی جا سکتی ہے لیکن اس رہائی کے لیے سود پر قرض لینا شرعاً درست نہیں ہے، ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ دو سال تک مزید قید برداشت کر لی جائے لیکن اس حرام کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ واللہ اعلم!

لڑکیوں کے لیے گڑیاں فروخت کرنا

] بچوں کے کھیل کا سامان اور لڑکیوں کے لیے گڑیاں فروخت کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا اس قسم کے ساز و سامان کی خرید و فروخت کی جا سکتی ہے؟

[بچوں کے کھلونے فروخت کرنا شرعاً جائز ہے۔ ہاں اگر کسی خاص کھلونے میں یا کھیل کے سامان میں کوئی شرعی

! البقرہ: ۲۷۹.

قباحت ہو تو اسے فروخت کرنا اور خریدنا جائز نہیں۔ بچوں اور بچیوں کو کھیلنے کا موقع دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ ان کا یہ فطری حق ہے جو انہیں ملنا چاہیے، مگر اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ ان کی تفریحات شرعی مزاج کے خلاف نہ ہوں۔ چنانچہ حضرت عائشہ r فرماتی ہیں:

''میں گڑیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی، بسا اوقت اس دوران رسول اللہ e تشریف لے آتے اور میرے ہاں محلے کی دوسری بچیاں بھی ہوتیں، جب آپ تشریف لاتے تو وہ چلی جاتیں اور جب آپ تشریف لے جاتے تو وہ کھیلنے کے لیے آجاتیں۔'' 1

ایک روایت میں ہے کہ محلے کی بچیاں رسول اللہ e کو دیکھ کر چھپ جاتیں تو رسول اللہ e انہیں میرے پاس بھیجتے اور وہ میرے ساتھ کھیلتیں۔ 2

ایک روایت کے مطابق ان کھلونوں میں ایک گھوڑا بھی تھا جس کے دو پر تھے، رسول اللہ e نے جب اس کے متعلق پوچھا تو حضرت عائشہ t نے بتایا کہ حضرت سلیمان u کے گھوڑے کے بھی پر تھے، اس جواب سے آپ کو بہت محظوظ ہوئے اور اس قدر ہنسے کہ آپ کی داڑھیں نظر آنے لگیں۔ 3

ان احادیث سے بچیوں کے لیے گڑیوں سے کھیلنے کا ثبوت ملتا ہے، اس سے گڑیوں کا بنانا اور انہیں فروخت کرنا بھی جائز معلوم ہوتا ہے لیکن اس سلسلہ میں درج ذیل باتوں کا خیال رکھا جائے:

(۱):...... بہتر ہے کہ بچیاں خود یا گھر کی خواتین کپڑے یا روئی سے گڈیاں گڈے بنا دیں جیسا کہ عام طور پر پہلے ایسا کرنے کا رواج تھا۔

(۲):...... اس میں وہ گڑیاں شامل نہیں جو دورِ حاضر میں ترقی یافتہ شکل میں دستیاب ہیں، جو نقل مطابق اصل ہوتی ہیں، ان میں پوری باریکی کے ساتھ تمام خدوخال کے ساتھ انہیں بنایا جاتا ہے۔ وہ قدیم کھلونوں کی طرح محض سرسری سا ڈھانچہ نہیں ہوتا، ترقی یافتہ کھلونوں کی یہ قسم شرعاً ممنوع ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

(۳):...... کچھ مجسمے اور حیوانات کی خوبصورت تصاویر محض نمائش اور آرائش کے لیے گھروں میں رکھی جاتی ہیں یا گاڑی میں آویزاں کی جاتی ہیں، ان کی بھی کسی طرح سے اجازت نہیں دی جاسکتی۔

(۴):...... کتوں، بلیوں، بندروں اور دیگر حیوانات کے مجسمے یا ایسی تصاویر جو مشرکانہ تخیلات کے نمائندہ ہوں مثلاً رام چندر کی مورتی وغیرہ تو ان کی خرید و فروخت بھی منع ہے۔ بہرحال بچیوں کی گڑیوں کو بنیاد بنا کر غیر شرعی تصاویر کا جواز انتہائی محل نظر ہے۔ واللہ اعلم!

! ابوداؤد، الادب: ۴۹۳۱.   @ بخاری، الادب: ۶۱۳۰.

ابوداؤد، الادب: ۴۹۴۱.

اپنی رقم قومی بچت سکیم میں رکھنا

] میں پچھلے سال سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوا ہوں، میرا کوئی بھی ذریعہ معاش نہیں، میں نے حکومت سے یکمشت ملنے والی رقم کو مرکزی قومی بچت میں رکھ دیا ہے، وہاں سے مجھے ہر ماہ ''منافع'' ملتا ہے،جس سے میرا گزراوقات ہو جاتا ہے،کیاایسا کرنا جائز ہے؟

[اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان کواس امر کا پابند ٹھہرایا ہے کہ وہ گزراوقات کے لیے رزق حلال کا اہتمام کرے اورحرام روزی سے اپنے دامن کو بچا کر رکھے۔قرب قیامت کے وقت ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ انسان روزی کے متعلق لا پروا ہو جائے گا۔ چنانچہ رسول اللہ e کاارشادگرامی ہے:

''لوگوں پر ایسا وقت ضرور آئے گا کہ انسان اپنی روزی کے متعلق حلال وحرام کی پرواہ نہیں کرے گا۔'' 1

اس حدیث کی روشنی میں جب ہم اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ کی اکثریت نے اپنی روزی کے متعلق حلال وحرام کی تمیز چھوڑ دی ہے۔

صورت مسئولہ میں بھی یہی کچھ کارفرما ہے کہ سائل نے گزراوقات کے لیے اپنی رقم کومرکزی قومی بچت میں رکھ دیا ہے اوراس سے ملنے والے''منافع'' سے گزربسر کرتا ہے۔حالانکہ قومی بچت اسکیم سے اسے جو کچھ''منافع'' کی صورت میں ملتا ہے وہ شرعاً سود ہے اوراس کالینا ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں۔نام کے بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی،سود کا لینا اور اسے استعمال میں لانا اللہ اوراس کے رسول e سے جنگ کرنے کے مترادف ہے۔جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ 2

''اگرتم سود لینے سے باز نہ آئے تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اوراس کے رسول e کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔''

سود لینے دینے کے متعلق احادیث میں بہت سخت وعید آئی ہے، رسول اللہ e نے ایسے شخص کوملعون قرار دیا ہے جوسود دیتااور وصول کرتا ہے۔لہٰذا ہم سائل کونصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنے سرمایہ سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرلے، وہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ اللہ اوراس کے رسول e سے جنگ کرتے کرتے اور سود کھاتے پیتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے۔

ہمارے رجحان کے مطابق مرکزقومی بچت یا کسی بھی دوسرے بینک سے سود جائز نہیں خواہ وہ اسے منافع کا نام ہی کیوں نہ دے دیں، اس سے ایک مسلمان کوگریز کرنا چاہیے۔کیوں کہ ایسا کرنے سے دنیا وآخرت میں ذلت ورسوائی کا زبردست اندیشہ ہے۔واللہ اعلم!

! بخاری، البیوع: ۲۰۵۹.   @ البقرہ:۲۷۹.

اراضی کا حکومتی سکیم میں آنا

] ہمارے والدمحترم نے کچھ زرعی زمین کا حصہ ایک مسجد کے لیے وقف کیا تھا، اب وہ زمین حکومت کی موٹروے سکیم میں آگئی ہے اور حکومت نے اس کا معقول معاوضہ دے دیا ہے۔کیا اب اس معاوضے کو بطور وراثت تقسیم کیا جا سکتا ہے یا یہ سرمایہ بھی مسجد کے لیے وقف ہوگا؟

[جو زمین اللہ کے لیے وقف کی جائے اس کی خرید وفروخت نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ رسول اللہ e نے سیدنا عمر t کو فرمایا تھا:

''وقف چیز کو فروخت نہیں کیا جا سکتا، نہ ہی سے کسی کو بطور ہبہ دیا جا سکتا ہے۔ نیز اس میں وراثت بھی جاری نہیں ہوگی۔'' 1

وقف شدہ چیز کے مفادات اور محصولات کو مصالح وقف میں ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔صورت مسئولہ میں مسجد کے لیے وقف شدہ زرعی زمین حکومت کی موٹروے سکیم میں آ چکی ہے اور حکومت نے اس کا معقول معاوضہ بھی دے دیا ہے، اب معاوضے کو کسی صورت میں بطور وراثت تقسیم نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ حدیث بالا میں اس کی ممانعت کے متعلق صراحت ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق حاصل شدہ معاوضے کو ایسی مد میں صرف کر دیا جائے جس کا فائدہ دیر تک باقی رہ سکے۔مثلاً:

- ☆ اس کے بدلے کوئی اور زرعی قطعہ خرید لیا جائے اور اس کی پیداوار مسجد پر اٹھنے والے اخراجات میں صرف کر دی جائے۔
- ☆ اس معاوضے سے کوئی پلاٹ خرید کر اس پر امام مسجد کے لیے مکان تعمیر کر دیا جائے تا کہ وقف کنندہ کو اس کا مسلسل ثواب ملتا رہے۔
- ☆ حاصل ہونے والی رقم سے کوئی مکان خرید کر اسے آگے کرایہ پر بھی دیا جا سکتا ہے اور وہ کرایہ مسجد پر خرچ کر دیا جائے۔
- ☆ مسجد سے ملحقہ پلاٹ خرید کر عورتوں کے لیے نماز پڑھنے کا کمرہ تعمیر کر دیا جائے یا وہاں قرآن کریم کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کر دیا جائے۔
- ☆ مسجد میں لائبریری قائم کر کے معاوضہ سے اصلاحی کتب خریدی جائیں اور لوگوں کو مفت پڑھنے کے لیے دی جائیں۔

لیکن اس رقم کو بجلی کے بل، اساتذہ کی تنخواہ یا خطیب کے حق الخدمت میں صرف نہ کیا جائے، کیوں کہ ایسا کرنے سے صدقہ جاریہ کی صورت پیدا نہیں ہوگی۔ بہر حال وقف شدہ زمین کا حکومتی معاوضہ کسی وقف مد میں خرچ کیا جائے تا کہ وقف کنندہ کے لیے صدقہ جاریہ کی صورت پیدا ہو جائے۔ ایسی جگہ پر خرچ نہ کیا جائے جہاں وہ رفتہ رفتہ بالکل ختم ہو جائے۔ واللہ اعلم!

اشیائے صرف کی خرید وفروخت پر پابندی

] بازار میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کو کوئی چیز فروخت کرنے کی اجازت نہیں دیتے بلکہ وہ خود اس کا

! بخاری، الوصیایا: ۲۷۲۲.

کاروبار کرتے ہیں، کیا بازار میں اس طرح کی شرط لگانا جائز ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو رزق پہنچانے کی ذمہ داری اپنے پاس رکھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ 1

''زمین پر کوئی بھی چلنے پھرنے والی مخلوق ایسی نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے نہ اٹھائی ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی مخلوق کو رزق دینے کا وعدہ کیا ہے، پھر اس وعدہ کو پورا کرنے کے لیے اس نے کئی ایک اسباب پیدا کیے ہیں۔ ان میں ایک تجارت کرنا ہے، اس تجارت کا ایک نظام مرتب کر کے بندوں کے حوالے کیا ہے۔ اس نظام کے تحت اشیاءصرف پوری دنیا میں گردش کرتی رہتی ہیں اور ہر علاقے میں پہنچتی ہیں، جو شخص بھی اس نظام میں داخل ہونا چاہتا ہے اور اس کا حصہ بننے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اس کی پابندی کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس نظام کے تحت اسے حلال وحرام کی تمیز کرنا ہوگی، لالچ، طمع، فراڈ اور دھوکہ دہی سے مکمل اجتناب کرنا ہوگا۔ نیز لوگوں کے ساتھ اخلاص اور ہمدردی کا رویہ اختیار کرنا ہوگا۔ اگر کوئی انسان یہ کہتا ہے کہ مخصوص چیز کی تجارت میں خود ہی کرنا چاہتا ہوں، کوئی دوسرا اس کی تجارت نہیں کر سکتا تو یہ ایک غلط پابندی ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ کیوں کہ اس کی بنیاد لالچ پر ہے بلکہ ایسا انسان شرعاً مجرم قرار پاتا ہے کیوں کہ یہ اللہ کے وضع کردہ قانون میں مداخلت کے مترادف ہے۔ شریعت میں ایسی شرائط کی کوئی حیثیت نہیں۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''ہر وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے۔'' 2

یہی وجہ ہے کہ شریعت نے منڈی کی طرف آنے والے راستوں پر بیٹھ کر اشیاء خریدنے پر پابندی عائد کی ہے۔ کیوں کہ ایسے کرنے سے تجارتی آزادی مجروح ہوتی ہے، لہٰذا مذکورہ پابندی شرعاً درست نہیں ہے۔ واللہ اعلم!

پانی فروخت کرنا

] ہم نے اپنی فصلوں کی آبپاشی کے لیے ایک ٹیوب ویل لگایا ہے، ضرورت سے زائد پانی فروخت کر دیا جاتا ہے، ہمیں کسی نے کہا ہے کہ پانی کی خرید وفروخت جائز نہیں، کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

[امام بخاری a نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''جس نے پانی کا صدقہ کرنا، ہبہ کرنا اور اس کے متعلق وصیت کرنے کو جائز خیال کیا۔'' 3

امام بخاری a نے اس عنوان کے ذریعے ان حضرات کی تردید کی ہے جو کہتے ہیں کہ پانی میں ملکیت جاری نہیں ہوتی اور نہ ہی اسے ہبہ کرنا، صدقہ کرنا یا اس کے متعلق وصیت کرنا جائز ہے۔ دراصل ان حضرات کے موقف کی بنیاد درج ذیل حدیث ہے:

''تین چیزوں سے کسی کو نہ روکا جائے، پانی، گھاس اور آگ سے۔'' 4

!ہود:٦.   @ بخاری، البیوع: ٢١٥٥.

بخاری، المساقاۃ، باب نمبر١. $ ابن ماجہ، المرہون:٢٤٧٣.

اس حدیث میں پانی سے مراد دریا، بارش اور چشمے کا پانی ہے، اس قسم کے پانی میں تمام مسلمان برابر کا حق رکھتے ہیں، ہاں اگر کسی نے تالاب بنا کر اس میں پانی جمع کیا ہے یا اپنی ضرورت کے لیے کنواں کھدوایا، نلکا اور ٹیوب ویل لگوایا ہے تو وہ اس پانی کا مالک ہے۔ اگرچہ افضل یہی ہے کہ فالتو پانی سے کسی کو منع نہ کرے۔

ہمارے رجحان کے مطابق پانی کی درج ذیل تین اقسام ہیں، اور ہر ایک کے احکام مختلف ہیں:

۱: وہ پانی جس کا کوئی مالک نہیں ہوتا بلکہ تمام لوگ اس میں شریک ہوتے ہیں جیسا کہ دریاؤں کا پانی ہے، اس سے خود پیئے، اپنے حیوانات کو پلائے لیکن دوسروں کو اس سے منع نہ کرے۔

۲: وہ چشمہ جس کا امام وقت کسی کو مالک بنا دے، وہ اس کا پانی اپنی صوابدید کے مطابق استعمال کر سکتا ہے، اس کے متعلق وصیت بھی کر سکتا ہے۔

۳: جو پانی برتنوں، ٹینکوں اور مشکیزوں میں محفوظ کر لیا جائے اس میں کسی دوسرے کو حق نہیں، اگر کسی نے ضائع کیا تو اس کا تاوان دینا ہوگا۔

صورت مسئولہ میں ٹیوب ویل کا انسان مالک ہے وہ اس کے پانی کو فروخت کر سکتا ہے کیوں کہ اس پانی پر اخراجات صرف ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم!

آلات الیکٹرونک میڈیا کی خرید و فروخت

] دور حاضر میں الیکٹرونک میڈیا کی افادیت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں ٹی وی، کمپیوٹر، موبائل فون، پروجیکٹر، ڈش اور میموری کارڈ وغیرہ کا کاروبار ہوتا ہے، کیا ان کی خرید و فروخت جائز ہے اور ان کی مرمت کر کے اجرت لینے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

[اشیائے صرف کی دو اقسام ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ ایسی اشیاء جو ذاتی طور پر ناجائز اور حرام ہیں، انہیں ہر صورت میں استعمال کرنا ناجائز ہے خواہ وہ بظاہر اچھے مقاصد کے لیے ہی کیوں نہ ہوں۔ مثلاً آلات موسیقی، شراب کی جملہ اقسام اور سگریٹ، بیڑی، بھنگ، چرس وغیرہ۔ یہ تمام اشیاء ذاتی طور پر احرام ہیں اور ان کا استعمال بھی ناجائز ہے۔

☆ ایسی اشیاء جو ذاتی طور پر حرام یا ناجائز نہیں بلکہ شرعی حکم ان کے استعمال پر ہوتا ہے۔ جیسے آلات حرب مثلاً بندوق یا کلاشنکوف وغیرہ، اگر انہیں جہاد کے لیے استعمال کیا جائے تو باعث ثواب، اگر ذاتی طور پر اپنے بچاؤ کے لیے استعمال کیا جائے تو جائز اور اگر انہیں تخریب کاری یا دہشت گردی کے لیے استعمال کیا جائے تو ناجائز اور حرام ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ e نے گھوڑوں کے متعلق فرمایا ہے:

''گھوڑے تین قسم کے ہیں، کسی شخص کے لیے ثواب کا ذریعہ، کسی کے لیے بچاؤ کا سبب اور کسی کے لیے گناہ کا

باعث ہوتے ہیں۔ 1

پھر رسول اللہ e نے ان کے استعمال پر تین حکم لگائے ہیں:

☆ جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے انہیں باندھا تو باعث ثواب ہے۔

☆ اگر اپنی ضرورت کے لیے انہیں رکھا تو جائز اور مباح ہیں۔

☆ اگر فخر ومباہات اور نمود ونمائش کے لیے رکھا تو حرام اور گناہ ہیں۔

یہ تفصیل حدیث میں موجود ہے، یہی تفصیل گدھوں کے متعلق بتائی گئی ہے۔ 2

سوال میں مذکورہ اشیاء بھی مشینی آلات ہیں ان کے جائز و ناجائز ہونے کا حکم ان اشیاء پر نہیں بلکہ ان کے استعمال پر ہے۔ جیسا استعمال ہوگا اس کے مطابق حکم دیا جائے گا۔ اگر جائز کاموں میں انہیں استعمال کیا جاتا تو ان کی خرید وفروخت جائز اور ان کی مرمت پر اجرت لینا بھی مباح ہے۔ اگر ناجائز کام کے لیے ہیں تو ان کی تنصیب اور مرمت پر اجرت لینا بھی ناجائز ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی کر دینا ضروری ہے کہ اگر انسان کو یقینی علم ہے کہ صارف انہیں غلط استعمال کرے گا تو ایسے شخص کو یہ آلات دینا جائز نہ ہوں گے۔ کیوں کہ اس صورت میں ظلم اور گناہ کے کاموں میں تعاون کرنا ہے جو جائز نہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ﴾ 3

''تم نیکی اور تقویٰ کے متعلق ایک دوسرے کا تعاون کرو لیکن گناہ اور زیادتی کے کاموں میں کسی کی مدد نہ کرو۔''

بہر حال جو آلات صرف معصیت اور گناہ کے لیے متعین ہیں ان کی خرید وفروخت اور ان کی مرمت پر اجرت جائز نہیں اور جو صرف گناہوں کے لیے نہیں بلکہ ان کا استعمال جائز اور ناجائز دونوں طرح ہے تو ایسے آلات کی خرید وفروخت بھی جائز ہے اور ان کی مرمت پر اجرت لینا بھی مباح ہے۔ واللہ اعلم!

باپ کے ساتھ کاروبار کرنے والے بیٹے کا حصہ

] میں میٹرک کا امتحان دے کر اپنے باپ کے ساتھ کاروبار میں لگ گیا، جو کچھ کاروبار سے نفع ہوتا اسے باپ کے کھاتے میں ڈال دیتا، میں نے اپنے لیے کوئی پیسہ جمع نہیں کیا، اب والد محترم وفات پا گئے ہیں، ایسے حالات میں کیا مجھے تمام دوسرے بھائیوں کے برابر حصہ ملے گا؟

[ہمارے ہاں معاشرتی طور پر یہ ہوتا ہے کہ بیٹے اپنے باپ کے ساتھ کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹاتے اور اس کا دست و بازو بنتے ہیں، وہ جو کچھ بھی کماتے ہیں وہ باپ کی جائیداد ہی شمار ہوتا ہے۔ اگر کوئی بیٹا اپنی تعلیم چھوڑ کر باپ کے کاروبار میں اس کی معاونت کرتا ہے تو امید ہے کہ اللہ کے ہاں اس قربانی اور خدمت گزاری پر اجر وثواب کا حق دار ہوگا، مگر

! بخاری، الجہاد: ۲۸۶۰۔ @ بخاری، الاعتصام: ۷۳۵۶۔ # المائدہ: ۲۔

کاروبار میں جو محنت کر کے کمایا ہے وہ والد کا ہی شمار ہوگا۔ والد کی وفات کے بعد وہ ترکہ کی تقسیم کے وقت اپنے حصے کا حق دار ہوگا، زیادہ حصہ لینے کا مجاز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مطلق طور پر یہ فرمایا ہے کہ:

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ 1

''بیٹے کو بیٹی کے مقابلے میں دوگنا حصہ دیا جائے گا۔''

اس میں باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک یا غیر شریک کی کوئی تفریق نہیں، لہٰذا وہ اپنے حصے کا حق دار ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق شرعی حصے سے زیادہ لینے کی دو صورتیں ممکن ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہیں:

☆ بیٹے نے باپ کے ساتھ کاروبار میں شراکت کی ہو اور اس کے لیے کچھ مال اس کاروبار میں لگایا ہو، اس صورت میں وہ اپنے شراکتی حصے کے مطابق شرعی حق سے زیادہ وصول کرنے کا مجاز ہے کیوں کہ کاروبار میں باضابطہ طور پر شریک ہے۔

☆ بیٹے نے باپ کے کاروبار میں ملازم کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی ہو تو وہ اس صورت میں اجرت کا حق دار ہے بشرطیکہ اس کی اجرت طے شدہ ہو اور معروف طریقہ کے مطابق ہو، وہ شروع سے ہی اپنی اجرت وصول کرتا رہا۔

ان دو صورتوں کے علاوہ باپ کی جائیداد سے زیادہ حصہ نہیں لے سکتا۔ کیوں کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ معاون اور مددگار کی حیثیت سے باپ کے کاروبار میں شامل ہوا ہے اور ایسا کرنا معاشرتی ذمے داری ہے۔ ان حالات میں جو محنت کرتا ہے وہ باپ کے لیے ہوگی، البتہ آخرت میں اسے اس مدد و تعاون کی وجہ سے اضافی ثواب ضرور ملے گا۔ ان شاء اللہ!

بیوٹی پارلر کا کاروبار

] ہمارے معاشرہ میں آج کل بیوٹی پارلر کا کام عروج پر ہے، اس میں دلہا اور دلہن کو سنوارا جاتا ہے اور اس کے عوض بھاری رقم وصول کی جاتی ہے، شرعی طور پر اس قسم کے کاروبار کی کیا حیثیت ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

[دور جاہلیت میں عورتیں اپنے حسن و جمال میں اضافے کے لیے زیب و زینت کے ایسے طریقے اختیار کرتی تھیں جن میں دھوکہ اور فریب کا عنصر شامل ہوتا تھا یا پھر ان میں اللہ کی تخلیق میں تبدیلی کا اظہار ہوتا، اس لیے رسول اللہ e نے ایسے کاموں کو باعث لعنت ٹھہرایا ہے۔

جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود t فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں پر لعنت کی ہے جو اپنے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے جسم کے کسی حصہ میں سرمہ بھرتی یا بھرواتی ہیں، چہرے کے بال اکھاڑتی ہیں اور اپنے دانتوں کے درمیان کشادگی پیدا کرتی ہیں۔ ایسا کرنے والی عورتیں اللہ کی خلقت کو بدلتی ہیں میں ایسی عورتوں پر لعنت کیوں نہ کروں جن پر رسول اللہ e نے لعنت کی ہے۔'' 2

آج کل بھی یہ جاہلی فیشن عورتوں میں عام ہے، وہ ابروؤں کے بالوں کو اکھیڑ کر مختلف قسم کے چمکیلے رنگ بھر لیتی ہیں،

! النساء:۱۱.   @ بخاری، اللباس:۵۹۳۱.

ہمارے ہاں بیوٹی پارلروں میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے، ان میں حسن و جمال اور زیبائش و آرائش کے ایسے ہی طریقے سکھائے جاتے ہیں اور عورتیں انہیں اختیار کرتی ہیں جو محض دھوکے فریب پر مبنی ہوتے ہیں، جیسا کہ بالوں کو سنوارنے کے لیے مختلف اسٹائل، بناؤ سنگھار کے ذریعے عورت کے حلیے کو بدل دیا جاتا ہے۔ سیاہ رنگ کی عورت کو سفید فام بنا دیا جاتا ہے اور سفید رنگ والی کو رنگ وروغن کے ذریعے اسے مزید نکھار دیا جاتا ہے۔ یہی وہ کام ہیں جن پر رسول اللہ e نے لعنت کی ہے، چونکہ یہ کام حدیث کی رو سے حرام ہے اور باعث لعنت ہیں اس لیے بیوٹی پارلر کا کاروبار بھی حرام اور ناجائز ہے۔ ہاں اگر شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے شادی کے موقع پر دلہن کو سنوارا جائے تو اس کے جواز کی گنجائش ہے لیکن ہمارے ہاں اس گنجائش سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور ناجائز کاموں کی تربیت دی جاتی ہے۔ نیز مکر وفریب کی صورتوں کو اختیار کیا جاتا ہے، اس بنا پر یہ کام محل نظر ہے۔ واللہ اعلم!

ہاؤسنگ سکیم کا ایک غلط طرز عمل

] ہمارے ہاں عام طور پر جو ہاؤسنگ سکیم، زمین کا کاروبار کرتی ہیں، اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جگہ خرید کر اسے مختلف پلاٹوں میں تقسیم کرتی ہے پھر درخواستیں وصول کی جاتی ہیں اور ایڈوانس ہر درخواست کے ساتھ ایک لاکھ روپیہ جمع کیا جاتا ہے، پھر قرعہ اندازی کے ذریعہ پلاٹ تقسیم کیے جاتے ہیں جن کا قرعہ نہیں نکلتا انہیں پچانوے ہزار روپے واپس کیے جاتے ہیں۔ کیا پانچ ہزار روپے کی کٹوتی شرعاً جائز ہے؟

[شریعت کی رو سے ہر ہاؤسنگ سکیم کا طریقہ کار یہ ہونا چاہیے کہ جگہ خریدنے کے بعد اس کے پلاٹ بنائے جائیں، حسب ضابطہ پارک، سڑکیں وغیرہ نقشے میں ظاہر کر دی جائیں پھر اس کے فروخت کرنے کا اعلان کیا جائے، اس کھلی سکیم کے تحت جو چاہے قیمت ادا کر کے پلاٹ خرید لے۔ اس سے فریقین میں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

صورت مسئولہ اور اس طرح کی دیگر کئی اسکیمیں شرعاً ناجائز ہیں، کیوں کہ نفع اندوزی کے لیے پلاٹوں سے زیادہ درخواستیں وصول کی جاتی ہیں، اس طرح ان کے پاس کافی رقم جمع ہو جاتی ہے جسے کاروبار میں لگا کر اس سے نفع کمایا جاتا ہے، پھر قرعہ اندازی کے ذریعے پلاٹوں کی تقسیم عمل میں آتی ہے، جس کا قرعہ نکل آتا ہے وہ بقیہ رقم ادا کر کے پلاٹ کا مالک بن جاتا ہے اور جن کا قرعہ نہیں نکلتا اس کا پانچ ہزار روپیہ کاٹ کر بقیہ رقم واپس کر دی جاتی ہے۔ اب اس میں رقم ایڈوانس جمع کروانے والے کا کیا قصور ہے کہ اسے پانچ ہزار روپے کا نقصان پہنچایا جائے؟ ایسا کرنا دھوکہ اور ظلم ہے، جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

ہمارے رجحان کے مطابق رقم بٹورنے کے لیے اس طرح قرعہ اندازی کرنا بھی ناجائز ہے اور اصل رقم سے کچھ رقم منہا کرنا بھی باطل طریقے سے مال کھانا ہے جس کی قرآن حکیم میں سخت وعید آئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ﴾ 1

! النساء:۲۹.

''ایمان والو! ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ۔ تمہارا لین دین باہمی رضامندی سے ہونا چاہیے۔''

باطل طریقوں سے مراد وہ طریقے ہیں جو خلاف حق اور شرعاً و اخلاقاً ناجائز ہوں اور باہمی رضامندی سے مراد بھی کسی دھوکے، دباؤ اور فریب پر بھی رضامندی نہیں بلکہ آزادانہ اور معروف معنی میں جائز رضامندی ہے جو صورت مسئولہ میں نہیں ہے۔ لہٰذا ہاؤسنگ سکیم والوں کو چاہیے کہ اتنی ہی درخواستیں وصول کریں جتنے پلاٹ ہوں، زیادہ درخواستیں وصول کر کے قرعہ اندازی کا ڈھونگ رچا کر مال کھینچنا شرعاً ناجائز ہے۔ واللہ اعلم!

ٹھیکے پر زمین دینا

] اگر کوئی شخص اپنی زمین کسی معین اجرت کے بدلے ٹھیکے پر دیتا ہے تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ میں نے کسی عالم سے سنا ہے کہ رسول اللہ e نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے، قرآن وحدیث کے مطابق اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

[رسول اللہ e کے دور میں مزارعت کی دو صورتیں حسب ذیل تھیں:

۱: زمین کو چند شرائط کے ساتھ بٹائی پر دیا جاتا تھا، پھر پیداوار کو تقسیم کر لیا جاتا تھا۔

۲: زمین کو ایک معین اجرت پر ٹھیکے پر دے دیا جاتا اور ٹھیکے پر لینے والا اس کی جملہ پیداوار اٹھاتا۔

یہ دونوں صورتیں رائج تھیں، البتہ ناجائز صورتوں کو آپ e نے حرام قرار دیا تھا۔ مثلاً زمین کا مالک پانی کے راستوں، چھوٹی نالیوں کے کناروں اور برساتی نالوں کے سرے پر واقع زمین کی پیداوار کو اپنے لیے مخصوص کر لیتا، اس ظالمانہ صورت سے منع کیا گیا اور ان صورتوں کو اختیار کرنے کا حکم دیا جن میں حصے متعین اور محفوظ ہوتے تھے یا پھر بٹائی پر دینے کی بجائے نقدی کے عوض زمین دینے کی تلقین فرمائی تاکہ کسی فریق پر زیادتی اور ظلم نہ ہو۔ بہرحال زمین دینے کا معاملہ کھلا، شفاف، واضح اور شریعت کی شرائط کے مطابق ہے تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں، ٹھیکے پر زمین دینے کی متعدد احادیث میں صراحت ہیں۔

سیدنا حنظلہ بن قیس بیان کرتے ہیں کہ میں نے رافع بن خدیج t سے زمین کو سونے، چاندی (نقدی) کے عوض ٹھیکے پر دینے کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: ''اس میں کوئی حرج نہیں۔'' 1

ایک دوسری حدیث میں سیدنا رافع بن خدیج t خود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''تین آدمی ہی زمین کاشت کرنے کے اہل ہیں۔ ایک وہ جسے کوئی زمین بطور ہبہ دی گئی ہو اور وہ اسے کاشت کرے۔ دوسرا وہ جس کی اپنی زمین ہو وہ اسے کاشت کرے۔ تیسرا وہ شخص جو زمین کو سونے چاندی (نقدی) کے عوض پر ٹھیکے پر لے اور اسے کاشت کرے۔'' 2

اس سلسلہ میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ e نے ٹھیکے پر زمین دینے سے منع کیا ہے۔ 3

اس روایت میں عیسیٰ بن سہل نامی ایک راوی ہے جسے ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے، دیگر محدثین نے اس کی توثیق نہیں

! بخاری، المزارعۃ:۲۳۴۶۔ @ ابوداؤد، البیوع:۳۴۰۰۔ # نسائی، المزارعۃ:۳۹۵۸۔

کی، لہٰذا یہ روایت قابل حجت نہیں، بہر حال زمین کو ٹھیکے پر دیا جا سکتا ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ واللہ اعلم!

مال پر قبضے کی ایک صورت

] میرا چاول خریدنے اور فروخت کرنے کا کاروبار ہے، میں ایک گڈز کمپنی کے ذریعے چاول اٹھاتا ہوں، جب وہ چاول لوڈ ہو جاتے ہیں تو میں انہیں آگے فروخت کر دیتا ہوں اور مال جب پہنچتا ہے تو خریدار کے گودام میں اتار دیتا ہوں۔ کیا شرعی اعتبار سے اس طرح کا کاروبار جائز ہے؟

[شرعی طور پر مال کی خرید و فروخت کا یہ ایک اصول ہے کہ جب تک کوئی مال قبضہ میں نہ آ جائے اسے آگے فروخت کرنے کی اجازت نہیں۔

ہمارے ہاں تاجر حضرات سودے پر سودا کرتے رہتے ہیں جب کہ اصل چیز جس کی خرید و فروخت ہوتی ہے وہ ایک ہی جگہ کسی سٹور پر پڑی رہتی ہے، خریدار اسے نہیں دیکھتا، نہ اس کا وزن کرتا ہے اور نہ ہی اسے اپنے قبضے میں لیتا ہے۔ سرمایہ دار اسے وہیں ایک دوسرے کو فروخت کرتے چلے جاتے ہیں، اسے دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی، کسی کو علم نہیں ہوتا کہ وہ چیز درست حالت میں ہے یا خراب ہو چکی ہے۔ بالآخر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آخری خریدار کو نقصان ہوتا ہے۔ یہی چیز جھگڑے فساد کا باعث بنتی ہے۔ شریعت نے اس کا سدباب یہ کیا ہے کہ جب کوئی شخص کسی چیز کو خریدے تو اسے وہاں سے اٹھا کر اپنے قبضے میں کرے اور پھر اسے فروخت کرے تاکہ مزدور کو مزدوری ملے اور لوگوں کو آسانی اور ارزانی سے رزق دستیاب ہو۔

چنانچہ سیدنا ابن عمر W بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e کے عہد مبارک میں اگر کوئی غلے کا ڈھیر خریدتا اور پھر وہیں فروخت کر دیتا تو اس پر اسے سزا دی جاتی تھی حتی کہ وہ اسے اپنی منزل پر لے جائے۔'' 1

نیز سیدنا ابن عباس W بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی غلہ خرید لے تو جب تک اسے اپنے قبضے میں نہ لے لے فروخت نہ کرے۔'' 2

اس حدیث کا واضح مطلب یہ ہے کہ خرید کردہ چیز کو اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے آگے فروخت نہیں کرنا چاہیے۔ قبضے کی شرط لگانے کا مقصد یہ ہے کہ مال کی جانچ پڑتال ہو جائے نیز خریدار چیز خریدنے کے بعد کچھ محنت بھی کرے تاکہ یہ محنت اس منافع کا جواز بن سکے جو وہ بیچ کر حاصل کرے گا۔

سیدنا حکیم بن حزام t کہتے ہیں کہ میں نے صدقہ کے غلے میں سے کچھ غلہ خریدا، قبضے میں لینے سے پہلے ہی مجھے اس میں منافع ملنے لگا تو میں نے رسول اللہ e سے اس کے متعلق دریافت کیا تو آپ e نے فرمایا:

''اپنے قبضے میں لینے سے پہلے اسے مت فروخت کرو۔'' 3

! ابوداود، الاجارہ:۳۴۹۸۔ @ مسلم، البیوع:۱۵۲۵۔

نسائی، البیوع:۴۶۰۷۔

صورت مسئولہ میں جب سائل نے کسی چیز کو خریدا پھر گڈز کمپنی کے ذریعے اس پر قبضہ کیا، کیوں کہ یہ کمپنی ایک نمائندہ کی حیثیت رکھتی ہے اور خریدار اسے کرایہ ادا کرتا ہے، راستے کا رسک اپنے ذمے لیتا ہے۔ گڈز کمپنی کا قبضہ خریدار کا قبضہ ہے۔ اس لیے فروخت کنندہ سے مال اٹھانے اور ٹرک پر لوڈ کرنے کے بعد اسے فروخت کرنا جائز ہے، وہ اسے آگے فروخت کر کے دوسرے خریدار کے گودام میں اتار کر نفع حاصل کر سکتا ہے، اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ واللہ اعلم!

رشوت خور کی دعوت قبول کرنا

] میرا ایک عزیز سرکاری عہدہ پر فائز ہے اور وہ اس عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے رشوت لیتا ہے۔ وہ بعض اوقات میری دعوت کرتا ہے، کیا اس کے گھر سے کھانا پینا اور اس کی دعوت قبول کرنا جائز ہے؟ وضاحت کریں۔

[آج ہم فتن دور سے گزر رہے ہیں، ہر طرف حرام کاری اور حرام خوری کا چرچا ہے، ایسے حالات میں ہمیں چاہیے کہ حکمت عملی کو بروئے کار لائیں اور معاشرے میں رہتے ہوئے غلط کار لوگوں کی اصلاح کریں۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے، اگر وہ اس کی طاقت نہ رکھے تو زبان سے منع کرے۔ اگر وہ اس کی بھی استطاعت نہ رکھے تو پھر اپنے دل سے نفرت کرے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔'' 1

صورت مسئولہ میں سائل کو چاہیے کہ وہ صبر و استقامت سے کام لے اور ادب و احترام کے ساتھ اچھے طریقے سے اپنے عزیز کو وعظ و نصیحت کرتا رہے۔ قطع تعلقی سے مکمل اجتناب کیا جائے، اگر اسے یقین ہے کہ اس نے خالص رشوت کی رقم سے دعوت کی ہے تو اس کی دعوت کو رد کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ e کی دعوت کی، جب آپ کو معلوم ہوا کہ دعوت میں تیار کردہ گوشت چوری کا ہے تو آپ e نے خود تناول نہیں کیا بلکہ قیدیوں کو کھلا دینے کا حکم دیا۔ 2

اگر دعوت کے متعلق خالص حرام کا یقین نہ ہو تو محض شبہ کی بنیاد پر دعوت کو مسترد کرنا درست نہیں ہے جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود t سے کسی نے پوچھا تھا: ''میرا ایک پڑوسی ہے جس کا مال میرے خیال میں خبیث یا حرام ہے اور وہ مجھے کبھی کبھار کھانے کی دعوت دے دیتا ہے، اگر میں اس کی دعوت قبول نہ کروں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے، ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپ e نے فرمایا: ''جاؤ اس کی دعوت کو قبول کرو، اس کا گناہ اس پر ہوگا۔'' 3

اس سے معلوم ہو کہ ایسی دعوت قبول کی جا سکتی ہے جس کے حرام ہونے کا یقین نہ ہو۔ اگر ایسے شخص کے متعلق امکان ہو کہ دعوت قبول نہ کرنے کا ہتھیار کارگر ثابت ہوگا اور وہ توبہ کر کے اس جرم سے باز آ جائے گا تو ایسے حالات میں تادیباً اس کی دعوت رد کی جا سکتی ہے۔ واللہ اعلم!

! مسلم، الایمان:۱۷۷۔ @ ابوداود، البیوع:۳۳۳۲۔

سنن بیہقی: ج۵، ص۳۳۵۔

مسئلہ وراثت

] ہمارے ایک عزیز فوت ہوئے ہیں، اس کی کوئی اولاد نہ تھی، پسماندگان میں والد، والدہ، بیوی، ایک بھائی اور ایک بہن ہے۔ اس کی جائیداد بارہ لاکھ ہے، اسے ورثاء میں کیسے تقسیم کیا جائے گا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کردیں۔

[مرحوم لاولد فوت ہوا ہے، اس کی جائیداد سے چوتھا حصہ اس کی بیوہ کو ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ﴾ 1

''اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو بیویوں کو تمہارے ترکہ میں سے حصہ ملے گا۔''

متعدد بہن بھائیوں کی موجودگی میں ماں کو کل جائیداد میں سے چھٹا حصہ ملتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كَانَ لَهٗٓ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ﴾ 2

''اگر سب کے بہن بھائی ہوں تو ماں کے لیے ہے۔''

باپ عصبہ ہے، مقررہ حصے نکالنے کے بعد جو باقی بچے گا وہ باپ کو عصبہ ہونے کی حیثیت سے مل جائے گا۔

حدیث میں ہے: ''مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کے حصے دو اور جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کے لیے ہے۔'' 3

باپ کی موجودگی میں بہن بھائی محروم ہیں، انہیں میت کے کلالہ ہونے کی صورت میں حصہ دیا جاتا ہے۔ کلالہ وہ میت ہوتی ہے جس کی اصل یا فرع موجود نہ ہو۔ سہولت کے پیش نظر متروکہ جائیداد کے بارہ حصے کر دیئے جائیں۔ اس میں سے دو حصے والدہ کو، تین بیوہ کو اور باقی سات والد کو دیئے جائیں۔ چونکہ کل جائیداد بارہ لاکھ ہے اس لیے دو لاکھ والدہ، تین لاکھ بیوہ اور سات لاکھ والد کو ملیں گے۔ واللہ اعلم!

بیوہ کا حق

] ہمارے بھائی فوت ہو گئے ہیں، ان کی بیوہ نے آگے نکاح کر لیا ہے، ایسے حالات میں وہ بھائی کی جائیداد سے

! النسا:۱۲۔ @ النساء:۱۱۔

بخاری، الفرائض: ۶۷۳۵۔

اپنا حق وصول کر سکتی ہے؟ جب کہ بھائی کی اولاد نہیں ہے، پسماندگان میں ہم دو بھائی اور ایک بہن موجود ہے، اس کی بارہ کنال زرعی زمین ہے، حصّوں کی وضاحت فرمادیں۔

] بیوہ، جب عقد ثانی کرتی ہے تو یہ اس کا حق ہے۔ اس نے کوئی ناجائز کام نہیں کیا جس کی بناء پر اسے شرعی وراثتی حق سے محروم کر دیا جائے۔ جب اس کا خاوند فوت ہوا تو یہ اس کی بیوی تھی۔ اس لیے وہ اپنے خاوند کے ترکے سے اپنا حق وصول کرنے کی مجاز ہے۔ چونکہ اس کی کوئی نرینہ یا مادینہ اولاد نہیں ہے اس لیے بیوہ کو خاوند کی جائیداد سے چوتھا حصہ ملتا ہے۔ بیوہ کا حصہ نکالنے کے بعد جو باقی بچے وہ دو بھائی اور ایک بہن اس طرح تقسیم کریں کہ بھائی کو بہن سے دگنا حصہ ملے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنْ كَانُوٓا۟ إِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ ٱلْأُنثَيَيْنِ﴾ 1

''اور کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہوگا۔''

صورت مسئولہ میں بیوہ کو ۴/۱ اور باقی ۴/۳ دو بھائیوں اور ایک بہن میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ سہولت کے پیش نظر ترکہ کے بیس حصے کر لیے جائیں، ان میں سے پانچ بیوہ کو، چھ چھ دونوں بھائیوں کو اور تین حصے بہن کو دے دیئے جائیں۔ چونکہ ترکہ بارہ کنال زرعی زمین ہے اسے مرلوں میں تبدیل کر کے تقسیم کیا جائے۔ یعنی اس کے ۲۴۰ مرلوں کی تقسیم کیا جائے۔ ۶۰ مرلے بیوہ کو ۷۲ مرلے ایک بھائی کو اور ۷۲ مرلے دوسرے بھائی کو۔ اسی طرح ۳۶ مرلے بہن کو دے دیئے جائیں۔

بہرحال، بیوہ کو اس کے خاوند کی جائیداد سے پورا حق دیا جائے۔ اسے اس بناء پر محروم نہ کیا جائے کہ اس نے عقد ثانی کر لیا ہے۔ عقد ثانی کرنا جائیداد سے محرومی کا سبب نہیں۔ اگر اسے بلاوجہ محروم کیا گیا تو قیامت کے دن اس کے متعلق باز پرس ہوگی۔ واللہ اعلم!

زندگی میں جائیداد سے شرعی حق کا مطالبہ

] میں اپنے بیٹے کی شادی کے بعد اسے علیحدہ کرنا چاہتا ہوں، لیکن وہ علیحدہ ہونے سے پہلے میری جائیداد سے اپنا شرعی حصہ مانگتا ہے، میں اسے اس کا حق دینے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ شریعت میں اس کی گنجائش ہو۔ اس سلسلہ میں میری رہنمائی فرمائیں۔

] شریعت اسلامیہ میں انتقال ملکیت کی حسب ذیل دو صورتیں ہیں:

☆ اختیاری......اپنے عزم و ارادہ سے اپنی جائیداد کسی دوسرے کو دے۔ یہ انتقال ملکیت اگر بلا معاوضہ ہے تو ایسا کرنا ہبہ یا وصیت میں ممکن ہے اور اگر بالمعاوضہ ہے تو اسے بیع وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے۔ عام خرید و فروخت میں یہی صورت ہوتی ہے۔

☆ غیر اختیاری......جس میں انسان کے عزم و اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا، بلکہ کسی کی مملوکہ چیز خود بخود دوسرے کو منتقل ہو جاتی

---

1 النساء: ۱۷۶.

ہے، اس قسم کے انتقال ملکیت کو ''وراثت'' کہا جاتا ہے۔

صورت مسئولہ میں ''شرعی حصہ'' لینے دینے پر اظہار رضامندی، انتقال ملکیت کی یہ دوسری صورت معلوم ہوتی ہے۔لیکن سائل کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس غیر اختیاری انتقال ملکیت کو اپنے ارادہ و اختیار سے اپنے ورثاء کی طرف منتقل کر دے بشرطیکہ شریعت اس کی اجازت دے،لیکن شریعت میں ایسا کرنا جائز نہیں۔ کیوں کہ انتقال ملکیت کی اس صورت میں وراثت کا استحقاق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مورث کی موت حقیقتاً یا حکماً واقع ہو چکی ہو اور وارث بھی زندہ موجود ہو۔ اپنی زندگی میں جیتے جی کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ قانون وراثت کو ہاتھ میں لے کر اپنی جائیداد کو وراثت کے طور پر اپنے ورثاء کو منتقل کرے۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے ورثاء پر زیادتی کا امکان باقی رہتا ہے جو شرعاً جائز نہیں۔ اس طرح کی تقسیم جائیداد کے بعد اگر کوئی وارث اس کی زندگی میں فوت ہو گیا تو اسے جو حصہ دیا گیا تھا وہ اس کا وارث نہیں تھا کیوں کہ وراثت میں مورث کی موت کے وقت وارث کی حیات کا تعین ضروری ہے۔

اس بناء پر صورت مسئولہ میں بیٹے کا اپنے والد سے اس کی زندگی میں اپنے ''شرعی حق'' کا مطالبہ کرنا درست نہیں۔ البتہ ہبہ یا عطیہ کی صورت میں ممکن ہے،لیکن اسے ''شرعی حصہ'' قرار دینا محل نظر ہے کیوں کہ یہ تو والد کی مرضی پر موقوف ہے۔ نیز ایسا کرتے وقت دوسری اولاد کو بھی مساویانہ طور پر اس میں شامل کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی تمام جائیداد بطور ہبہ دینے کا بھی مجاز نہیں۔ اگر کوئی بیٹا کاروبار میں شریک ہے تو اسے علیحدگی کے وقت، اس کا حصہ رسیدی دیا جاسکتا ہےلیکن یہ حصہ کاروبار کا ہوگا وراثت کا نہیں۔ بہر حال کوئی بھی بیٹا، والد کی زندگی میں، اس کی جائیداد سے بطور وراثت ''شرعی حصہ'' کا حق دار نہیں۔

واللہ اعلم!

مسئلہ وراثت

] ہمارے ہاں ایک خاتون فوت ہوئی ہے، اس کی اولاد نہیں اور نہ ہی ماں باپ زندہ ہیں، خاوند بھی فوت ہو چکا ہے، اس کا صرف ایک بھائی موجود ہے، اس نے اپنی زندگی میں اپنی بھتیجی کو مبلغ بیس ہزار روپیہ بطور قرض دیا تھا، اب وہ یہ رقم کسی مسجد کو دینا چاہتی ہے۔کیا وہ ایسا کر سکتی ہے؟ واضح رہے کہ بھائی نے اس کے ساتھ بیماری کے وقت کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔

[صورت مسئولہ میں خاتون، کلالہ ہے، یعنی اس کا کوئی اصل والدین یا فرع اولاد وغیرہ نہیں۔ ایسی صورت میں اس کے وارث عصبہ ہوتے ہیں، چونکہ بھائی موجود ہے اور وہ عصبہ ہے اس لیے وہ تمام جائیداد کا وارث ہوگا۔ واضح رہے کہ عصبہ، میت کے وہ قریبی رشتہ دار ہوتے ہیں جن کے حصے متعین نہیں ہوتے بلکہ مقررہ حصہ لینے والوں سے بچا حصہ ان کو ملتا ہے، اگر کچھ نہ بچے تو یہ محروم ہوتے ہیں۔ مقررہ حصہ لینے والوں کی عدم موجودگی میں تمام ترکہ کے وارث بنتے ہیں۔ بہر حال بھائی، میت کے تمام ترکہ کا وارث ہوگا اگر چہ اس نے بیماری کی حالت میں اپنی بہن کی خدمت نہیں کی جو اس کا اخلاقی فرض تھا، تاہم یہ کوئی ایسا جرم نہیں کہ اس کی پاداش میں اسے جائیداد سے محروم کر دیا جائے۔ بھتیجی کو بیس ہزار بطور قرض دیا گیا تھا وہ

بھی بھائی کو ہی ملے گا، قرضہ کی یہ رقم مسجد میں خرچ نہیں کی جاسکتی۔ اگر اس نے وصیت کی ہوتی تو کل جائیداد سے تک وصیت کے مطابق مسجد وغیرہ پر دی جاسکتی تھی۔ مرنے کے بعد انسان کا کل ترکہ اس کے جائز ورثاء کو منتقل ہو جاتا ہے، اب ان ورثاء کی رضامندی سے ہی مسجد وغیرہ پر خرچ کیا جاسکتا ہے۔

بصورت دیگر وہ ورثاء کا ہے اسے کوئی رشتہ دار اپنی صوابدید کے مطابق خرچ نہیں کرسکتا۔

صدقہ کے متعلق رسول اللہ e سے پوچھا گیا کہ کون سا صدقہ اجر میں زیادہ بڑا ہے تو آپ e نے فرمایا:

''زیادہ اجر وثواب والا صدقہ وہ ہے جو تندرستی کی حالت میں اس وقت خرچ کیا جائے جب انسان کے اندر دولت کی چاہت اور اسے پاس رکھنے کی حرص ہو، اسے خرچ کی صورت میں محتاجی کا خطرہ اور روک رکھنے کی صورت میں دولت مندی کی امید ہو، ایسا نہ ہو کہ تم سوچتے اور ٹالتے رہو یہاں تک کہ تمہارا آخری وقت آجائے اور اس وقت تم مال کے متعلق وصیت کرنے لگو کہ اتنا مال فلاں کو اور اتنا فلاں کو، اللہ کے لیے دے دیا جائے جبکہ اس وقت وہ مال تمہاری ملکیت سے نکل کر فلاں وارثوں کا ہو چکا ہو۔'' 1

بہر حال مرحومہ نے جو کسی کو قرض دیا ہے وہ اس کے مرنے کے بعد اس کے حقیقی وارث اس کے بھائی کو دے دیا جائے، اسے اپنی صوابدید کے مطابق کوئی بھی رشتہ دار خرچ کرنے کا مجاز نہیں۔ واللہ اعلم!

ماموں کے لیے وراثت

] ہمارے ہاں ایک عورت فوت ہوئی ہے، اس کا ترکہ ایک چھوٹا سا مکان ہے، اس کا کوئی بھی رشتہ دار موجود نہیں، صرف اس کا ماموں زندہ ہے۔ کیا وہ مکان ماموں کو دیا جائے گا یا اسے فروخت کر کے کسی محتاج کو دیا جائے؟ وضاحت فرمادیں۔

[مرنے کے بعد جن ورثاء میں میت کا ترکہ تقسیم کیا جاتا ہے وہ تین طرح کے ہیں:

☆ اصحاب الفرائض......جن کا حصہ قرآن وحدیث میں طے شدہ اور مقرر ہے۔ مثلاً خاوند وغیرہ۔

☆ عصبات......جن کا حصہ طے شدہ نہیں بلکہ وہ اصحاب الفرائض سے بچا ہوا لیتے ہیں اور ان کی عدم موجودگی میں میت کی تمام جائیداد کے حق دار بنتے ہیں۔

☆ ذوالارحام......وہ قریبی رشتہ دار جو اصحاب الفرائض اور عصبات نہ ہوں۔ مثلاً ماموں، خالہ اور پھوپھی وغیرہ۔

صورت مسئولہ میں مرحومہ کا وارث ماموں، ''ذوالارحام'' سے ہے۔ ان کی وراثت کے متعلق علمائے امت میں حسب ذیل اختلاف ہے:

ایک اہل علم کی جماعت کا رجحان یہ ہے کہ ''ذوالارحام'' وارث نہیں بنتے اور اصحاب الفرائض یا عصبات کی عدم موجودگی میں میت کا ترکہ بیت المال میں جمع کرادیا جائے۔

! مسلم، الزکاۃ: ۱۰۳۲.

جمہور اہل علم کہتے ہیں کہ اصحاب الفرائض اور عصبات کے نہ ہونے سے ''ذوالارحام'' کو وارث بنایا جائے گا۔ اب جبکہ بیت المال کا نظام درہم برہم ہو چکا ہے تو سب اہل علم اس امر پر متفق ہو گئے ہیں کہ ذوالارحام کو وارث بنایا جائے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''جس میت کا کوئی وارث نہ ہو، اس کے ترکہ کا وارث اس کا ماموں ہوگا۔'' 1

عقل بھی تقاضا کرتی ہے کہ ماموں کو وارث بنایا جائے کیوں کہ اس کا میت کے ساتھ دو قسم کا تعلق ہے: خونی اور اسلامی، جبکہ بیت المال کے ساتھ صرف اسلام کا تعلق ہے۔ دو تعلق والا ایک تعلق رکھنے والے سے زیادہ حق رکھتا ہے۔ اس بناء پر ہمارا رجحان یہ ہے کہ میت کے مکان کا وارث ماموں کو قرار دیا جائے، اگر اسے بیچ کر محتاجوں میں تقسیم کرنا ہے تو اس کی اجازت سے ایسا ممکن ہوگا۔ واللہ اعلم!

شوہر کی وفات کے بعد بیوہ کی بے دخلی

] میرے شوہر ایک حادثہ میں وفات پا چکے ہیں، میری کوئی اولاد نہیں۔ اب اس کے بھائی مجھے مکان سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔ کیا میرا اس مکان میں حصہ نہیں ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلے کا حل بتائیں۔

[جب شوہر فوت ہوتا ہے تو بیوہ کی دو حالتیں ممکن ہیں:

☆ اگر شوہر کی اولاد ہے تو اسے آٹھواں حصہ ملتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ﴾ 2

''اگر تمہاری اولاد ہے تو بیواؤں کا آٹھواں حصہ ہے۔''

☆ اگر اس کی اولاد نہیں تو بیوہ کو چوتھا حصہ ملتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ﴾ 3

''اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو بیویوں کا چوتھا حصہ ہے۔''

صورت مسئولہ میں بیوہ کا خاوند کی جائیداد سے چوتھا حصہ بنتا ہے، شوہر کی وفات کے بعد بیوہ، شوہر کی جائیداد میں شریک ہو جاتی ہے، اس لیے اسے جبراً بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ مکان اگر قابل تقسیم ہے تو اسے تقسیم کر دیا جائے اور بیوہ کو اس کا حصہ اسلامی دیا جائے اور اگر ناقابل تقسیم ہے تو ورثاء ایک دوسرے کے حصے خرید سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کو کرایہ پر دے سکتے ہیں۔ باری باری رہائش بھی رکھ سکتے ہیں۔ مکان کو فروخت کر کے اس کی رقم بھی تقسیم کی جا سکتی ہے۔

الغرض بیوہ کو مکان سے بے دخل کرنا شرعاً جائز نہیں بلکہ اسے وراثت سے حصہ دینا ضروری ہے۔

! ابوداؤد، الفرائض: ۲۸۹۹ @ النساء:۱۲.

النساء:۱۲.

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ’’مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں، اسی طرح عورتوں کے لیے بھی اس مال سے حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں۔ خواہ ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ، ہر ایک کا طے شدہ حصہ ہے۔‘‘ 1

اس آیت کی رو سے بھی بیوہ کو اس کا حصہ دیا جائے۔ اسے مکان سے بے دخل کر کے خاوند کی جائیداد سے محروم کرنا دور جاہلیت کا طریقہ ہے۔ ایک مسلمان کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم!

زندگی میں تمام جائیداد کسی کو دینا

] میرے سسر نے اپنی زندگی میں ایک مکان میری ساس کو دیا تھا، اس نے اپنی زندگی میں وہ مکان جو اس کی کل جائیداد ہے اپنے دونوں نواسوں کے نام لگوا دیا یعنی میرے دو بیٹوں کو دے دیا۔ میں نے وہ مکان فروخت کر کے اپنا قرض اتارا ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں اپنی بیوی کو بھی اعتماد میں لیا تھا، کیا میرا یہ اقدام کتاب وسنت کے مطابق ہے؟ جبکہ میری ساس فوت ہو چکی ہے۔

[اگرچہ صاحب جائیداد اپنی مملوکہ چیزوں کے متعلق تصرف کرنے کا پورا پورا اختیار رکھتا ہے، لیکن اسے شرعی حدود وقیود میں رہتے ہوئے ایسا کرنے کی اجازت ہے۔ شرعی طور پر وہ اپنی جائیداد اپنے موجودہ ورثاء میں بطور وراثت تقسیم کرنے کا مجاز نہیں، کیوں کہ مالی وراثت کا حق اس وقت بنتا ہے جب مورث فوت ہو جائے اور ان ورثاء پر تقسیم ہوتا ہے جو اس کی وفات کے وقت زندہ موجود ہوں۔ نیز اپنی کل جائیداد کسی ایک عزیز کو دینا تو کجا وہ فی سبیل اللہ بھی دینے کا مجاز نہیں۔ جیسا کہ سیدنا کعب بن مالک t کی جب توبہ قبول ہوئی تو انہوں نے عرض کیا: ’’اللہ کے رسول! یہ میری توبہ کا حصہ ہے، کہ میں اپنے تمام مال کو اللہ کی راہ میں صدقہ کر کے اس سے خود دستبردار ہو جاؤں۔ تو رسول اللہ e نے انہیں اجازت نہیں دی بلکہ فرمایا کہ کچھ نہ کچھ اپنے لیے روک لو۔‘‘ 2

رسول اللہ e کے زمانہ میں ایک آدمی کے کل چھ غلام تھے جو اس نے اپنی زندگی میں آزاد کر دیئے گئے۔ ورثاء کی شکایت پر آپ e نے اسے بہت برا بھلا کہا۔ 3

صورت مسئولہ میں سائل کی خوش دامن کا یہ اقدام جو اس نے اپنے نواسوں کے متعلق اٹھایا ہے وہ درست نہیں تھا۔ وہ اس کی اکلوتی بیٹی کا حق ہے کیوں کہ اس کے دیگر ورثاء موجود نہیں ہیں۔ اب سائل نے اس کی مشاورت سے اسے فروخت کر دیا ہے اور اس سے اپنا قرضہ اتارا ہے۔ چونکہ اپنی بیوی کو اعتماد میں لے کر یہ کام کیا ہے لہٰذا یہ اقدام صحیح اور درست ہے۔ واللہ اعلم!

! النساء:۷.	@ بخاری، الوصایا: ۲۷۵۷.

مسلم، الایمان: ۴۳۳۵.

وراثت کا ایک مسئلہ

] ہماری رشتہ دار عزیزہ فوت ہوئی ہے، ترکہ میں اس نے ایک زیور چھوڑا ہے، جس کی مالیت چھبیس ہزار (۲۶،۰۰۰) روپے ہے۔ پسماندگان میں شوہر، ایک بیٹی اور والدین ہیں، انہیں مرحومہ کے ترکہ سے کیا کچھ ملے گا؟

[قرآن کریم کی صراحت کے مطابق اگر فوت ہونے والی خاتون کی اولاد ہے تو اس کے خاوند کو چوتھا حصہ ملتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ﴾ 1

''اگر ان بیویوں کی اولاد ہے تو تمہارے لیے چوتھا حصہ ہے۔''

مرحومہ کی بیٹی کو اس کے ترکہ سے نصف دیا جائے گا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾ 2

''اگر ایک ہی لڑکی ہے تو اسے ترکہ سے نصف دیا جائے۔''

اولاد کی موجودگی میں والدین کو چھٹا، چھٹا حصہ دیا جاتا ہے یعنی والد کو بھی چھٹا اور والدہ کو بھی اس کے برابر چھٹا حصہ دیا جائے گا۔ ارشادی باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ﴾ 3

''اگر میت کی اولاد ہو اور والدین بھی تو والدین میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔''

درج بالا تفصیل کے مطابق ورثاء اور ان کے حصص درج ذیل ہیں:

مسئلہ 12 عول 13

والدہ	والد	بیٹی	شوہر

تقسیم کے لیے بنیادی ہندسہ جسے اصل المسکہ کہا جاتا ہے بارہ ہے۔ اس میں سے تین شوہر، چھ بیٹی، دو والد اور دو والدہ کے ہیں۔ جب ان حصص کو جمع کیا تو یہ تیرہ ہیں۔ جب حصص، اصل مسئلہ سے بڑھ جائیں تو فرائض کی اصطلاح میں اسے عول کہا جاتا ہے۔ اب حصص میں تھوڑی تھوڑی کمی کر کے تمام ورثاء کو پورا پورا تقسیم کیا جائے گا۔

اس عول پر سیدنا عبداللہ بن عباس r کے علاوہ تمام صحابہ کرام y کا اجماع ہے۔

چونکہ کل ترکہ چھبیس ہزار ہے، اسے جب تیرہ پر تقسیم کیا تو ایک حصہ دو ہزار نکلتا ہے۔ خاوند تین حصے یعنی $2\times3 = 6000$، بیٹی کو 6 حصے یعنی $6 \times 2 = 12,000$، باپ کو دو یعنی $2 \times 2 = 4,000$ اور والدہ کو بھی دو یعنی $2 \times 2 = 4,000$۔

! النساء: ۱۲. @ النساء: ۱۱. # النساء: ۱۱.

جواب کے پڑتال کے لیے ان حصص کو جمع کیا یعنی

6,000 + 12,000 + 4,000 + 4,000 = 26,000۔ واللہ اعلم!

کنواری فوت شدہ کا خاوند

] ہم جنازے میں میت کے لیے دعائیں کرتے ہیں، ان میں سے ایک دعا کے الفاظ یہ ہیں: ''اے اللہ! اسے اس کے شوہر سے بہتر شوہر عطا فرما۔'' جس عورت کا خاوند ہی نہیں مثلاً کنواری فوت ہو جائے تو اسے کون سا بہتر خاوند ملے گا؟

[جنت میں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی آسائش و آرام کا سامان مہیا کیا ہے، اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم میں اس امر کی صراحت ہے، جو عورت شادی کرنے سے پہلے ہی فوت ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں آرام اور سکون مہیا کرنے کے لیے اس کی شادی اہل دنیا کے کسی جنتی آدمی سے کر دے گا۔ جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''جنت میں کوئی بھی اکیلا نہیں رہے گا۔'' 1

اس سے معلوم ہوا کہ جنت کی نعمتیں صرف مردوں کے لیے ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی اس میں شریک ہوں گی۔ تمام نعمتوں میں سے شادی بھی ایک نعمت ہے۔

اس وضاحت کے بعد اب ہم سوال کا جواب دیتے ہیں کہ اگر فوت ہونے والی کنواری عورت ہے تو اس کے شوہر سے مراد وہ شوہر ہے جو اس کی قسمت میں تھا اگر وہ زندہ رہتی۔ یہ اشکال اس صورت میں بھی ہو سکتا ہے کہ جب جنت میں اسے دنیا والا ہی شوہر ملے گا بشرطیکہ وہ جنت میں جانے کا اہل ہوا تو اس سے بہتر شوہر کون سا ہو گا جس کے لیے ہم جنازے میں دعا کرتے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا والے شوہر کے اوصاف جنت میں جا کر دنیوی اوصاف سے بہتر ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ایسا کر دے گا کیوں کہ تبدیلی کی دو اقسام ہیں۔

☆ ذاتی تبدیلی...... ایک چیز کی تبدیلی دوسری چیز سے کر دی جائے۔ مثلاً گیہوں کی تبدیلی مکئی سے کر دی جائے۔

☆ صفاتی تبدیلی...... چیز تو وہی رہے لیکن اس کے اوصاف بدل دیئے جائیں مثلاً انسان کے کفر کو ایمان سے بدل دیا جائے۔

بہر حال کنواری عورت کو بھی خاوند مل جائے گا اور وہ بہتر ہو گا۔ اسی طرح شادی شدہ خاتون کے شوہر کے اوصاف بھی جنت میں جا کر بہتر ہو جائیں گے۔ یعنی شوہر تو وہی ہو گا مگر جنت میں جا کر اس کی خوبیاں دنیوی خوبیوں سے بڑھ کر ہوں گی۔ واللہ اعلم!

غلط وصیت کی اصلاح

] ہمارا ایک عزیز فوت ہوا ہے، پسماندگان میں سے ایک بیوہ، دو بیٹیاں اور ایک پوتا ہے، اس کی تحریری وصیت یہ ہے کہ میری جائیداد میں سے بیوہ کو دے کر باقی میں سے میری دونوں بیٹیوں کو نصف اور نصف میرے پوتے کو دیا

---

1 مسلم، الجنہ: ۲۸۳۴۔

جائے، کیا اس قسم کی وصیت جائز ہے اور اس پر عمل کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

] صورت مسئولہ میں وصیت کے ذریعے جو جائیداد کی تقسیم کی گئی ہے وہ شریعت کے مطابق نہیں، شرعی تقسیم حسب ذیل ہے:

☆ بیوہ کو اولاد کی موجودگی میں ملتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ﴾ 1

''اگر میت کی اولاد ہو تو ان کی (بیویوں) کو آٹھواں حصہ ملے گا۔''

☆ بیٹیوں کو ملتا ہے کیوں کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ﴾ 2

''اگر اولاد میں صرف لڑکیاں ہیں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ تو کل ترکہ میں سے ان کا دو تہائی ہے۔''

☆ پوتا عصبہ ہے جو مقررہ حصہ پانے والوں سے بچا ہوا ترکہ لیتا ہے۔

حدیث میں ہے:

''مقررہ حق حصہ داروں کو دینے کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے قریبی رشتہ دار کے لیے ہے۔'' 3

مذکورہ تفصیل کے پیش نظر جائیداد کے کل ۲۴ حصے کر لیے جائیں۔ ۳ بیوہ کے لیے، ۸،۸ دونوں بیٹیوں کے لیے اور باقی ۵ حصے پوتے کو دیئے جائیں۔

قرآن وحدیث کی رو سے اگر وصیت کرنے والا کوئی غلط وصیت کر جائے تو اسے باہمی مل کر درست کیا جا سکتا ہے، اسے جوں کا توں نافذ کرنا جائز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ﴾ 4

''اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف (کسی وارث کی) طرفداری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو تو اگر وہ (وصیت کو بدل کر) وارثوں میں صلح کرا دے تو اس پر کچھ گناہ نہیں۔''

اس آیت کے پیش نظر ورثاء کو چاہیے کہ وہ غلط وصیت پر عمل کرنے کی بجائے کتاب وسنت کے مطابق متوفی کی جائیداد کو تقسیم کریں اور وصیت میں ترمیم کر کے اسے شریعت کے مطابق کر لیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے ہاں مواخذہ نہیں ہوگا۔ اس قسم کی وصیت کو آپس میں نزاع کا باعث نہ بنائیں بلکہ محبت اور ہمدردی کے جذبات کے ساتھ جائیداد تقسیم کریں۔ واللہ اعلم!

! النساء: ۱۲.

@ النساء: ۱۱.

بخاری، الفرائض.

$ البقرہ: ۱۸۲.

ترکہ کیا ہے؟

] میرے والد گرامی جب فوت ہوئے تو انہوں نے دو قسم کا ترکہ اپنے پیچھے چھوڑا تھا۔ ایک قطعہ اراضی جو انہیں ہمارے دادا کی طرف سے بطور وراثت ملا تھا اور کچھ زمین انہوں نے اپنی محنت سے خریدی تھی، ایک مکان بھی انہوں نے بنایا تھا۔ اب تقسیم میراث کس قسم کی جائیداد پر لاگو ہوگی؟ واضح رہے کہ میری ایک بہن بھی زندہ ہے۔

[ترکے کے متعلق ہمارے ہاں بہت غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، ہمارے ہاں ترکہ اسے خیال کیا جاتا ہے جو باپ دادا سے وراثت ملا ہو اور جو کچھ فوت ہونے والے نے اپنی محنت سے کمایا ہو اسے ترکے میں شمار نہیں کیا جاتا۔

حالانکہ ہر منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کو ترکہ کہا جاتا ہے۔ خواہ اسے وہ وراثت میں ملی ہو یا خود کمائی کر کے حاصل کی ہو۔ بہر حال مرنے کے بعد جو کچھ بھی مرنے والے نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے اور کسی دوسرے شخص کا اس میں حق نہیں، اسے ترکہ کہا جائے گا۔ اگر اس کی متروکہ جائیداد میں متعین طور پر کسی غیر کا حق ہے تو اس وقت وہ مال اس کے ترکے میں شامل نہیں کیا جائے گا جب تک اس دوسرے کا حق ادا نہ کر دیا جائے۔ مثلاً مرنے والے نے اپنی کوئی چیز کسی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی، اس نے اس قدر مال نہیں چھوڑا کہ اسے ادا کر کے گروی شدہ چیز کو واگزار کرایا جا سکے تو ایسی چیز مرنے والے کے ترکہ میں شمار نہیں ہوگی کیوں کہ اس چیز کے ساتھ کسی غیر کا حق متعلق ہے۔

اس کے برعکس وہ چیز متوفی کے ترکہ میں شمار ہوگی جس کا سبب ملک اس کی زندگی میں قائم ہو چکا تھا لیکن وہ چیز اس کے مرنے کے بعد اس کی ملکیت میں شامل ہوگی۔ مثلاً ایک شخص نے کسی حکومتی سکیم سے پلاٹ لینے کے لیے درخواست دی جو بذریعہ قرعہ اندازی تقسیم ہونا تھا، لیکن اس کے مرنے کے بعد اس کے نام پلاٹ کا قرعہ نکل آیا تو اس صورت میں وہ پلاٹ اس کا ترکہ شمار ہوگا، کیوں کہ اس پلاٹ کے حصول کا سبب وہ اپنی زندگی میں قائم کر چکا تھا۔

اس مقام پر یہ وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ شادی شدہ بچی کے فوت ہونے کی صورت میں اس کا سامان جہیز، حق مہر اور شادی کے موقع پر ملنے والے تحائف وغیرہ، اس کا کل ترکہ شمار ہوں گے، والد کا اس کے تمام مال پر قبضہ کر لینا یا والدین کا جہیز کو دوسری بچی کی شادی کے لیے رکھ لینا جائز نہیں۔

صورت مسئولہ میں مرحوم نے جو جائیداد بھی اپنے پیچھے چھوڑی ہے اس کے تین حصے کیے جائیں، دو حصے بیٹے کو اور ایک حصہ بیٹی کو دیا جائے، اس میں یہ تفریق نہیں ہوگی کہ کون سی جائیداد اسے وراثت میں ملی تھی اور کون سی جائیداد اپنی محنت سے حاصل کی تھی۔ ہر قسم کی جائیداد قابل تقسیم ہوگی، بشرطیکہ اس کے ساتھ کسی غیر کا حق وابستہ نہ ہو، اگر جائیداد کا کوئی حصہ کسی دوسرے سے متعلق ہے تو اس کی ادائیگی کے بعد وہ تقسیم ہوگی۔

بھتیجی کی وراثت

] ایک آدمی فوت ہوا ہے، اس کی اولاد نہیں، صرف اس کی بیوی زندہ ہے یا اس کے فوت شدہ بھائی کے بیٹے

بیٹیاں یعنی مرحوم کے بھتیجے اور بھتیجیاں موجود ہیں، کیا اس کے ترکہ سے بھائی کی اولاد کو حصہ ملتا ہے؟

] مرنے والے کے ذاتی اخراجات، قرض اور وصیت کے نفاذ کے بعد جو مال بچے عصبات کو ملتا ہے۔ صورت مسئولہ میں مرحوم کی بیوی اصحاب الفرائض سے ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ﴾ 1

''بیویاں تمہارے ترکہ سے چوتھائی کی حق دار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو، اور تمہارے صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا آٹھواں حصہ ہے۔''

اس میں بھتیجیاں شامل نہیں ہوں گی، اس پر تمام اہل علم کا جماع ہے کیوں کہ چار افراد اپنی بہنوں کو عصبہ بناتے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ بیٹا......اپنی بہنوں کو عصبہ بناتا ہے، یعنی وہ اس کے ساتھ جائیداد میں شریک ہوتی ہیں۔

☆ پوتا......اپنی بہنوں کو عصبہ بناتا ہے، اس کے ساتھ اس کی بہنیں بھی شریک ہوں گے۔

☆ حقیقی بھائی اپنی بہنوں کو عصبہ بناتا ہے، انہیں بھی حصہ دیا جائے گا۔

☆ پدری بھائی، اپنی بہنوں کو عصبہ بناتا ہے، وہ اس کے ساتھ وراثت میں حصہ پائیں گے، البتہ ان میں تقسیم کی نسبت دو ایک کی ہوگی، یعنی مرد کو عورت کے مقابلے میں دوگنا ملے گا۔

اس وضاحت کے پیش نظر صورت مسئولہ میں جائیداد کے چار حصے کر لیے جائیں، ان میں سے ایک حصہ بیوہ کو اور باقی اس کے بھتیجوں کو مل جائے گا، بھتیجیاں اس سے محروم ہیں۔ واللہ اعلم!

وراثت کا مسئلہ

] میرے والد صاحب وفات پا گئے ہیں، پسماندگان میں ان کی بیوہ، دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ ان کی کل جائیداد تقریباً چوبیس لاکھ روپیہ ہے، ہر وارث کا کتنا حصہ ہے؟ کتاب وسنت کے مطابق اس کی وضاحت فرمادیں۔

] تقسیم ترکہ سے پہلے تین مراحل ایسے ہیں جن سے ترکہ نے گزرنا ہوتا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

☆ تجہیز وتکفین......اگر کسی مرنے والے کے کفن ودفن کا انتظام کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس کے ترکہ سے مناسب انداز میں کفن ودفن کا انتظام کیا جائے۔

☆ قرض......اس کے بعد میت کے ذمے جو قرض ہو اسے ادا کیا جائے، خواہ اس کی ادائیگی میں تمام ترکہ صرف ہو جائے۔

☆ وصیت......میت کی جائز وصیت کو پورا کیا جائے بشرطیکہ وہ   سے زائد نہ ہو اور نہ ہی کسی شرعی وارث کے لیے ہو۔

ان تین مراحل سے گزرنے کے بعد ترکہ تقسیم ہوگا۔ صورت مسئولہ میں تقسیم بایں طور پر ہوگی:

---

1 النساء: ١٢.

☆ بیوہ کو کل ترکہ سے آٹھواں حصہ دیا جائے، کیوں کہ میت کی اولاد موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ﴾

''اگر تمہاری اولاد ہے تو بیویوں کا آٹھواں حصہ ہے۔'' 1

☆ بیوہ کو آٹھواں حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ لڑکوں اور لڑکیوں میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا ملے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ 2

''اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے متعلق تاکیدی حکم دیتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصہ کے برابر ہے۔''

سہولت کے پیش نظر کل ترکہ کے 8 حصے کر لیے جائیں، پھر ان سے آٹھواں حصہ یعنی ایک بیوہ کو اور باقی سات حصے اس طرح تقسیم ہوں گے کہ دو، دو حصے فی لڑکا اور ایک، ایک حصہ لڑکی کو ملے۔ چونکہ میت کی جائیداد چوبیس لاکھ روپے ہے، چوبیس کو آٹھ پر تقسیم کرنے سے ایک حصہ تین لاکھ بنتا ہے، اس طرح ورثاء کے حصوں کے مطابق اسے تقسیم کر دیا جائے۔ مثلاً

بیوہ	بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی	بیٹی	میزان
تین لاکھ	چھ لاکھ	چھ لاکھ	تین لاکھ	تین لاکھ	تین لاکھ	چوبیس لاکھ

بیٹی کے لیے وصیت

] میرے باپ نے وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد دکان کا کرایہ میری بیٹی وصول کرے گی، باپ کی وفات کے بعد اس بیٹی کو جائیداد سے پورا پورا حصہ دیا گیا ہے، وصیت کے مطابق وہ دکان کا کرایہ وصول کرنے کا مطالبہ بھی کرتی ہے، کیا شرعاً اس کا حق بنتا ہے کہ وہ کرایہ وصول کرے؟

[شریعت اسلامیہ میں وصیت کا ایک مستقل ضابطہ ہے، اس کے مطابق وصیت پر عمل کیا جا سکتا ہے اس ضابطہ کی تین شرائط حسب ذیل ہیں:

وصیت کسی ناجائز کام کی نہ ہو۔ مثلاً اگر وصیت کرتا ہے کہ میرے بعد کوئی مندر یا گرجا گھر تعمیر کر دیا جائے تو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

حدیث میں ہے: ''نافرمانی کے کاموں پر اطاعت نہیں ہوگی بلکہ اطاعت تو صرف کارہائے خیر میں ہے۔'' 3

زیادہ سے زیادہ کل جائیداد سے ایک تہائی کی وصیت قابل عمل ہوگی۔

جیسا کہ سیدنا سعد بن ابی وقاص t نے رسول اللہ e سے سوال کیا تھا:

! النساء: ۱۲.　　@ النساء: ۱۱.

بخاری، اخبار الاحاد: ۷۲۵۷.

”کیا میں اپنے مال سے دو تہائی وصیت کر سکتا ہوں تو آپ e نے فرمایا: نہیں۔ انہوں نے عرض کیا نصف مال کی۔
آپ e نے فرمایا نہیں۔ پھر عرض کیا: ایک تہائی مال کی وصیت کر سکتا ہوں؟
آپ e نے فرمایا: ایک تہائی کی وصیت کر سکتے ہو لیکن یہ بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے۔“ 1

ان ورثاء کے حق میں وصیت نہ کی جائے جو ترکہ میں حصہ لینے والے ہیں۔

رسول اللہ e نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کا حق مقرر کر دیا ہے، اب کسی وارث کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں۔“ 2

صورت مسئولہ میں بیٹی کو باپ کی جائیداد سے حصہ ملتا ہے، اس لیے بیٹی کے حق میں باپ کی وصیت کالعدم ہے، اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ دکان کے کرایہ کو ترکہ میں شامل کر کے ورثاء میں بقدر حصص تقسیم کیا جائے گا۔ ہاں اگر تمام ورثاء اس پر دل کی رضامندی سے خوش ہوں تو دکان کا کرایہ بیٹی کو دیا جاسکتا ہے۔ بصورت دیگر وہ صرف اپنے حصہ کی حق دار ہے۔ واللہ اعلم!

ذوی الارحام کی وراثت

] ہمارے ایک عزیز لاولد فوت ہوئے ہیں، اس کی بیوی پہلے ہی وفات پا چکی تھی، پس ماندگان میں ایک پھوپھی اور ایک بھانجی موجود ہے، اس کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟

[شریعت میں مرنے والے کے ورثاء کی تین اقسام حسب ذیل ہیں:

☆ اصحاب الفرائض: وہ رشتے دار جن کے حصے کتاب و سنت میں متعین کر دیئے گئے ہیں مثلاً خاوند اور بیوی۔

☆ عصبات: میت کے وہ قریبی رشتہ دار جن کے حصے متعین نہیں ہیں بلکہ اصحاب الفرائض سے بچا ہوا ترکہ لیتے ہیں اور ان کی عدم موجودگی میں تمام ترکہ کے وارث بنتے ہیں، مثلاً بھائی اور چچا وغیرہ۔

☆ ذوی الارحام: وہ قریبی رشتہ دار جو اصحاب الفرائض یا عصبات نہ ہوں مثلاً ماموں یا پھوپھی وغیرہ۔

صورت مسئولہ میں مرحوم کے پسماندگان میں سے صرف پھوپھی اور بھانجی زندہ ہے، ان کا تعلق بھی ذوالارحام سے ہے، ان کی وراثت کے متعلق اہل علم میں اختلاف ہے۔

کچھ حضرات کا خیال ہے کہ ذوی الارحام وارث نہیں بنتے۔ اصحاب الفرائض اور عصبات کی عدم موجودگی میں ترکہ بیت المال میں جمع کر دیا جائے۔ جبکہ اکثر اہل علم کا موقف ہے کہ اصحاب الفرائض اور عصبات کی عدم موجودگی میں ذوی الارحام وارث بنیں گے۔ ہمارے رجحان کے مطابق عقل و نقل کے اعتبار سے یہ دوسرا موقف ہی درست اور مبنی بر حقیقت ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ 3

! بخاری، مناقب الانصار: ۳۹۳۶. @ ترمذی، الوصایا: ۲۱۲۰.

الانفال: ۷۵.

''کتاب اللہ میں رشتے دار ایک دوسرے کے (وراثت میں) زیادہ حق دار ہیں۔''

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''ماموں وارث ہوگا جس کا کوئی اور وارث نہ ہو۔'' 1

عقل بھی اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ ذوالارحام کو وارث بنایا جائے کیوں کہ میت کے ساتھ اس کے دو رشتے ہیں: ایک اسلامی اور دوسرا خونی، جبکہ بیت المال کے ساتھ صرف اسلامی تعلق ہے خونی نہیں۔ اس بناء پر دو تعلق رکھنے والا ایک تعلق رکھنے والے کے مقابلے میں زیادہ حق رکھتا ہے، خاص طور پر جبکہ دور حاضر میں بیت المال کا نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ پھر ذوالارحام کو وارث بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں ان اصحاب الفرائض یا عصبات کی جگہ اتار جائے جن کی وجہ سے یہ میت کی طرف منسوب ہیں۔ مثلاً بیٹیوں کی اولاد بیٹیوں کے قائم مقام اور بہنوں کی اولاد بہنوں کے قائم مقام قرار دیا جائے۔ صورت مسئولہ میں پھوپھی، باپ کی وجہ سے میت کی طرف منسوب ہے، اس لیے پھوپھی کو باپ کے قائم مقام رکھا جائے گا اور بھانجی کو بہن کی جگہ پر اتارا جائے گا، ایسا تصور کرنے سے باپ کی موجودگی میں بہن محروم ہوتی ہے۔ اس بناء پر مرحوم کے تمام ترکہ کی وارث پھوپھی کو بنایا جائے گا جو باپ کے قائم مقام ہے اور بھانجی کو مرحوم کے ترکے سے کچھ نہیں ملے گا، کیوں کہ وہ بہن کی جگہ پر ہے جو باپ کی وجہ سے محروم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم!

بچے کی زیادتی کی وجہ سے اسے عاق کرنا

] میرا اپنے بیٹے سے کسی گھریلو معاملہ کی بنا پر اختلاف ہوا، تو اس نے میرے ساتھ انتہائی بدتمیزی کی، اس نے مجھے گندی گالیاں دیں اور مجھے زدوکوب بھی کیا، میں نے اسے اپنی جائیداد سے عاق کر دیا ہے لیکن مجھے اللہ تعالیٰ سے ڈر بھی لگتا ہے کہ شاید میرا یہ عمل درست نہ ہو، اس سلسلہ میں میری رہنمائی کریں۔

[قرب قیامت کی علامات سے ہے کہ اولاد، اپنے والدین کی نافرمان اور گستاخ ہو جائے گی، ہم آئے دن اس علامت کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ہمارے علم میں ہے کہ کچھ بچوں نے والد پر عدالت میں مقدمہ بھی دائر کر رکھا ہے اور وہ والدین کے انتہائی گستاخ اور نافرمان ہیں، ایسی اولاد اللہ کے ہاں اس فعل ناہنجار کی ضرور سزا پائے گی، لیکن اس کے باوجود والد کو یہ حق نہیں کہ وہ اس جرم کی پاداش میں اپنی اولاد کو جائیداد سے محروم کر دے۔ شریعت نے وہ اسباب تفصیل سے بیان کیے ہیں جو جائیداد سے محرومی کا سبب بنتے ہیں، مثلاً بیٹا، باپ کو قتل کر دیتا ہے یا وہ دین اسلام سے برگشتہ ہو جاتا ہے تو از خود جائیداد سے محروم ہو جاتا ہے، ان اسباب میں والد کے حق میں گستاخی کرنا یا اس کی نافرمانی کرنا، اسے گالی گلوچ دینا یا اسے زدوکوب کرنا قطعاً ایسے اسباب نہیں ہیں جن کی بناء پر اولاد کو جائیداد سے محروم کر دیا جائے، اس بنا پر کسی شرعی عذر کے بغیر اپنی اولاد کو جائیداد سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ لوگ محض ڈرانے دھمکانے کے لیے ایسا کرتے ہیں لیکن ایسا کرنا بھی بعض اوقات کئی ایک قباحتوں کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے۔ البتہ قانونی تحفظ کے لیے کوئی ایسی تحریر بنائی جاسکتی ہے۔ جس کے پیش نظر بیٹے کے جرم کی بنا

! ابو داؤد، الفرائض:۲۸۹۹.

پر والد کو باز پرس نہ ہو، لیکن جائیداد سے محروم کرنے کی سزا دینا شرعاً جائز نہیں۔ انسان کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد کو تقسیم کرنے کا طریقہ کار اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ ہے اس میں کسی کو ترمیم و اضافے کا حق نہیں۔ جو حضرات قانون وراثت کو پامال کر کے آئے دن اخبارات میں اپنی اولاد میں سے کسی کے متعلق عاق نامہ کے اشتہارات دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑے خوفناک عذاب کی وعید سنائی ہے۔ قانون وراثت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ 1

”اور جو اللہ اور رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا، اسے اللہ آگ میں ڈالے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن سزا ہے۔“

اس آیت کے پیش نظر کسی باپ کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی اولاد میں سے کسی کو اپنی جائیداد سے محروم کرے، اللہ کے قانون سے اس کی بغاوت کرے۔ وراثت کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا﴾ 2

”مردوں کے لیے اس مال میں سے حصہ ہے جو والدین اور رشتے داروں نے چھوڑا ہے اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں سے حصہ ہے، جو ماں، باپ اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو، خواہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ اس میں ہر ایک کا حصہ مقرر ہے۔“

اس آیت کے پیش نظر کسی وارث کو بلا عذر شرعی وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال بیٹے کا کردار بہت ہی قابل ملامت اور ظلم و ستم پر مبنی ہے، قیامت کے دن اس کے متعلق بہت سخت باز پرس ہوگی۔

صاحب اولاد بیٹی کا حصہ

] میرے والد فوت ہوئے، اس وقت ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا موجود تھا، ایک بیٹی شادی شدہ تھی، اس کا خاوند اور ایک بیٹا موجود ہے۔ بیٹی والد کی وفات کے بعد فوت ہوئی، کیا والد کی جائیداد سے اسے حصہ ملے گا؟ اگر ملے گا تو وہ کیسے دیا جائے گا؟

[مرنے والے کی جائیداد سے حصہ لینے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وارث، متوفی کی وفات کے وقت زندہ ہو، اس سے پہلے فوت ہونے والے رشتہ داروں کو حصہ نہیں ملتا، صورت مسئولہ میں جب بزرگ فوت ہوئے ہیں تو اس وقت ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا موجود تھا، دو بیٹیوں میں سے ایک شادی شدہ تھی، جس کا خاوند اور بیٹا زندہ ہے اور وہ خود باپ کی وفات کے بعد فوت ہو چکی ہیں، اس لیے باپ کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے چار حصے کیے جائیں گے۔ ان میں سے دو حصے بیٹے کو اور

! النساء:۱۴.　　@ النساء:۷.

ایک، ایک حصہ بیٹیوں کو دے دیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ﴾ 1

''اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے متعلق تاکیدی حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہو۔''

شادی شدہ بیٹی کو جو ایک حصہ ملا ہے، وہ آگے اس کے بیٹے اور خاوند کو دے دیا جائے، کیوں کہ جب یہ فوت ہوئی تھی تو اپنے باپ کی جائیداد سے حق دار بن چکی تھی۔ اب اس کے حصے کو اس کے شرعی ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے، شرعی ورثاء اس کا بیٹا اور خاوند ہے۔ واضح رہے کہ مرنے والے کی جائیداد کو شرعی ضابطے کے مطابق فوراً تقسیم کر دینا چاہیے تا کہ بعد میں اٹھنے والے فتنوں سے بچا جا سکے۔ بصورت دیگر بہت سے فتنے کھڑے ہو جاتے ہیں جو ورثاء کی پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ واللہ اعلم!

باپ اور بیٹے کی حادثاتی موت

] میرے دادا جان اور والد محترم گاڑی میں سفر کر رہے تھے، سامنے سے آنے والا ٹرک گاڑی سے ٹکرا گیا، اس حادثہ میں دونوں فوت ہو گئے، واضح رہے کہ والد محترم، میرے دادا جان کے اکلوتے بیٹے تھے اور ہم دو بھائی ہیں۔ جائیداد کی تقسیم کیسے ہوگی؟

[پہلے تو ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حادثہ میں فوت ہونے والے دونوں بزرگوں کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے گناہوں کو معاف فرمائے۔ شریعت کے مطابق ایک سے زیادہ رشتہ دار کسی حادثہ مثلاً آگ لگنے، پانی میں ڈوبنے یا زلزلہ کی وجہ سے مکان گرنے میں اکٹھے فوت ہو جائیں اور یہ علم نہ ہو سکے کہ ان میں سے پہلے کون فوت ہوا ہے اور بعد میں کون مرا ہے تو ایسے اجتماعی حادثہ میں فوت ہونے والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔ بلکہ ان کے زندہ ورثاء، متروکہ جائیداد کے حق دار ہوں گے۔

صورت مسئولہ میں باپ اور بیٹا دونوں ایک ہی حادثہ میں فوت ہوئے ہیں، ان میں سے کسی کی موت کے متعلق تقدیم و تاخیر کا علم نہیں، ایسے حالات میں باپ بیٹے کا وراث نہیں ہوگا، اور نہ ہی بیٹے کو باپ کی جائیداد کا حق دار قرار دیا جائے گا۔ بلکہ فوت ہونے والے کی جائیداد کے زندہ دونوں بھائی وراث ہوں گے۔ یعنی فوت ہونے والے باپ بیٹے کی جائیداد کو ملا کر اس کے دو حصے کیے جائیں گے پھر ایک حصہ ایک بھائی کو اور دوسرا حصہ دوسرے بھائی کو دے دیا جائے گا۔

جس طرح سیدنا زید بن ثابت t سے روایت ہے، آپ فرماتے ہیں کہ سیدنا ابو بکر صدیق t نے ان کو جنگ یمامہ اور سیدنا عمر فاروق t نے طاعون عمواس میں فوت ہونے والوں کے متعلق حکم دیا کہ ''زندہ وارثوں کو فوت شدگان کا وارث بنایا جائے اور فوت ہونے والوں کو ایک دوسرے کا وارث نہ بنایا جائے۔'' 2

امام مالک a نے جنگ جمل، جنگ صفین اور حرہ کے دن قتل ہونے والوں کے متعلق یہی فتویٰ دیا تھا کہ انہیں ایک

! النساء: ١١.

@ بیهقی، ج٢، ص: ٢٢٢.

دوسرے کا وارث نہیں بنایا جائے گا بلکہ ان کے جو زندہ ورثاء ہیں انہیں ان کا وارث قرار دیا جائے گا۔ 1 واللہ اعلم!

ترکہ میں بھائی کا حصہ

] میری بہن زچگی کے دوران فوت ہوگئی، پسماندگان میں اس کی بیٹی، خاوند، والدہ اور ہم دو بھائی ہیں، اس کے خاوند نے میری بہن کی تمام جائیداد پر قبضہ کر رکھا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے بھائیوں کا کوئی حصہ نہیں، اس کی وضاحت فرمائیں؟

[مرنے کے بعد میت کے مال و اسباب اور جائیداد کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا﴾ 2

''مردوں کے لیے اس مال سے حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں، اس طرح عورتوں کے لیے بھی اس مال سے حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں۔ خواہ یہ ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ ہر ایک کا طے شدہ حصہ ہے۔''

اس آیت کے مطابق مرنے والے کی جائیداد کم ہو یا زیادہ، منقولہ ہو یا غیر منقولہ بہرحال وہ قابل تقسیم ہے۔ اسی طرح کسی رشتہ دار کا حصہ زیادہ ہو یا تھوڑا؟ اسے بہرحال ملنا چاہیے۔ اسے دینے سے پہلے ہی دباؤ ڈال کر معاف کرانا غلط رسم ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا، صورت مسئولہ میں عورت دوران زچگی فوت ہوئی ہے، اس کا سامان جہیز، زیورات، حق مہر اور فرنیچر وغیرہ قابل تقسیم ہے۔ سوال کے مطابق شرعی ورثاء چار ہیں، ان کے حصص کی تفصیل درج ذیل ہے:

☆ خاوند کو ملے گا کیوں کہ میت کی اولاد موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ﴾ 3

''بیویوں کی اگر اولاد ہے تو تمہارا (خاوند کا) چوتھا حصہ ہے۔''

☆ والدہ کو چھٹا حصہ ملے گا کیوں کہ میت کی اولاد موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ﴾ 4

''والدین میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے بشرطیکہ میت کی اولاد ہو۔''

☆ بیٹی کو ترکہ سے نصف دیا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾ 5

! موطا امام مالک، ج۱، ص ۳۴۰ مع تنویر الهوالک۔ @ النساء:۷۔

النساء:۱۲۔ $ النساء:۱۱۔

% النساء:۱۱۔

''اگر بیٹی ایک ہے تو اس کا ترکہ سے ہے۔''

☆ دو بھائی، حصے داروں سے بچا ہوا مال لیں گے جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''حق دار حصہ لینے والوں کو ان کا حق دو اور جو بچا رہے وہ میت کے مذکر قریبی رشتے دار کو دیا جائے۔'' 1

پیش آمدہ صورت میں بارہ کے ہندسے کو بنیاد بنا کر تقسیم کی جائے، ان میں سے تین حصے خاوند کو، دو حصے والدہ کو، چھ حصے بیٹی کو اور بچا ہوا ایک حصہ دونوں بھائیوں کو دے دیا جائے، سہولت کے پیش نظر تقسیم کی صورت اس طرح ہے: مسئلہ 12

خاوند	والدہ	بیٹی	بھائی
			عصبہ(۱)

نوٹ:......جہیز کا جو سامان استعمال ہو چکا ہے، اس کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم!

وراثتی حصہ اور اس کا نفع

] میرے والد صاحب فوت ہوئے تو میرے بھائی تقسیم وراثت میں پس وپیش کرتے رہے اور میرے وراثتی حصے سے فائدہ اٹھاتے رہے، اس دوران وہ حج وغیرہ بھی کرتے رہے، کیا شرعی طور پر انہیں میرے حصے سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے؟

[جب کوئی انسان فوت ہوتا ہے تو موت کی ہچکی آتے ہی اس کا ترکہ شرعی ورثاء کے نام منتقل ہو جاتا ہے، میت کی تجہیز وتکفین اور تدفین سے فراغت کے بعد گھر کے سربراہ کو چاہیے کہ میت کے ذمے جو قرض ہے میت کے ترکہ سے اسے اتارے اور اگر اس نے کوئی جائز وصیت کی ہے تو شرعی حد میں رہتے ہوئے اسے پورا کیا جائے۔ پھر تقسیم ترکہ کی طرف توجہ دے، جس کا جتنا حصہ بنتا ہے، اسے دے دیا جائے، ترکہ کی تقسیم میں پس وپیش کرنا، شرعاً جائز نہیں، اسے تقسیم نہ کرنا اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو مدت دراز تک جہنم میں رہنے کی وعید سنائی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَ لَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾ 2

''(تقسیم ترکہ) یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود ہیں، جو انسان اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول e کی فرمانبرداری کرے گا اسے اللہ تعالیٰ جنتوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول e کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کردہ حدود سے نکلنے کی کوشش کرے گا اللہ اسے جہنم میں ڈال دے گا جس میں وہ ہمیشہ

! بخاری، الفرائض: ۶۷۳۲۔ @ النساء:۱۳، ۱۴۔

رہے گا۔ نیز ایسے لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔''

صورت مسئولہ میں بڑے بھائی کو چاہیے کہ مندرجہ بالا آیات کے پیش نظر اپنے باپ کے ترکہ سے چھوٹے بھائی کا جو حصہ بنتا ہے اسے فوراً ادا کرے اور اس کے حصے سے جو نفع کمایا ہے وہ بھی بقدر حصہ اسے واپس کردے۔ اس نے تقسیم ترکہ سے پہلے جو حج وغیرہ کیا ہے وہ شرعی طور پر ادا تو ہو گیا ہے لیکن اُس برکات سے وہ محروم ہے کیوں کہ اسے پہلے اپنے بھائی کا حق دے کر خود کو سبکدوش کرنا چاہیے تھا۔ اللہ تعالیٰ خود بھی پاک ہے اور پاکیزہ مال کو ہی قبول کرتا ہے۔ بہر حال اب بھی اس کی تلافی حقوق کی ادائیگی اور توبہ واستغفار سے ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم!

بھائی کی موجودگی میں بھانجے کا حصہ

] ہمارے ہاں ایک غیر شادی شدہ آدمی فوت ہوا، اس کے والدین پہلے سے فوت شدہ ہیں، اس کی دو بہنیں بھی پہلے فوت ہو چکی ہیں، البتہ ان کی اولاد موجود ہے۔ مرنے والے کے صرف تین بھائی موجود ہیں۔ بہنوں کی اولاد میت کی جائیداد سے وراثت کی طلب گار ہے، کیا انہیں شرعی طور پر کچھ ملے گا؟

[شریعت اسلامیہ میں وراثت کے متعلق حسب ذیل بنیادی اصول ہیں:

☆ صاحب ترکہ کی وفات کے وقت وہ زندہ موجود ہوں، جو پہلے فوت ہو جائیں انہیں میت کے ترکہ سے کچھ نہیں ملتا۔

☆ میت کے قریبی رشتہ داروں کو حصہ دیا جاتا ہے، قریبی قرابت داروں کی موجودگی میں دور والے عزیز واقارب محروم رہتے ہیں۔

☆ تجہیز وتکفین، ادائیگی قرض اور نفاذ وصیت کے بعد جو کچھ باقی بچے اسے شرعی ورثاء میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد ورثاء کی حسب ذیل تین اقسام ہیں:

☆ اصحاب الفرائض:......وہ ورثاء جن کے حصے کتاب وسنت میں متعین کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً میاں بیوی، ماں اور بہن وغیرہ۔

☆ عصبات......میت کے وہ قریبی رشتہ دار جن کے حصے متعین نہیں ہیں بلکہ اصحاب الفرائض سے بچا ہوا ترکہ لیتے ہیں، ان کی عدم موجودگی میں تمام ترکہ کے وارث بنتے ہیں۔ مثلاً بیٹا، بھائی وغیرہ۔

☆ وہ قریبی رشتہ دار جو اصحاب الفرائض یا عصبات میں سے نہ ہوں مثلاً ماموں اور خالہ وغیرہ۔ اگر کسی کا کوئی وارث نہ ہو تو ترکہ اسلامی حکومت کے بیت المال میں جمع ہو جاتا ہے۔ اگر شرعی بیت المال کا نظام نہ ہو تو ترکہ ان غریب رشتہ داروں میں تقسیم کیا جاتا ہے جو شرعی وارث نہیں ہیں۔

صورت مسئولہ میں میت کے بھائی اور بھانجے بھانجیاں موجود ہیں، ان میں سے بھائی عصبات ہیں جو تمام ترکہ کے حق دار ہیں۔ ان کی موجودگی میں اس کی پہلے سے فوت شدہ بہن کی اولاد کو کچھ نہیں ملے گا۔ کیوں کہ ان کا تعلق ذوی الارحام سے ہے۔ وہ اس وقت وارث بنتے ہیں جب مقررہ حصے لینے والے اصحاب الفرائض اور عصبات وغیرہ نہ ہوں۔ جیسا کہ رسول

اللہ e نے ماموں کو اس وقت وارث بنایا ہے جب دوسرا کوئی وارث موجود نہ تھا۔

آپ e کا ارشاد گرامی ہے: ''ماموں! اس وقت وارث ہوگا جب کوئی دوسرا وارث موجود نہ ہو۔'' 1 واللہ اعلم!

فضائی حادثہ میں ہلاکت

] میرے چچا اور ان کے شادی شدہ بیٹے کی وفات ایک فضائی حادثہ میں ہوئی ہے، چچا کی بہو، اس کی وراثت سے حصہ مانگتی ہے، جبکہ اس کی شادی کو چند ماہ ہوئے ہیں۔ قرآن وحدیث کی رو سے اسے کچھ ملتا ہے یا نہیں وضاحت فرمائیں؟

[ہم نے پہلے بھی لکھا تھا کہ کسی حادثہ میں فوت ہونے والے حضرات ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے جبکہ ان کی اموات کے متعلق تقدیم وتاخیر کا علم نہ ہو بلکہ ان کے ورثاء جو زندہ ہوں وہ ان کے وارث ہوں گے۔

جیسا کہ سیدنا زید بن ثابت t سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: سیدنا ابوبکر صدیق t نے انہیں جنگ یمامہ اور سیدنا عمر فاروق t نے طاعون عمواس میں فوت ہونے والوں کے بارے میں حکم دیا کہ زندوں کو فوت شدہ کا وارث بنائیں، اور ان کو آپس میں ایک دوسرے کا وارث بنائیں۔'' 2

اس روایت کے پیش نظر جو لوگ کسی حادثے میں ایک ساتھ ہلاک ہو جائیں مثلاً مکان کے نیچے دب کر یا آگ میں جل کر یا پانی میں ڈوب کر مر جائیں اور یہ معلوم نہ ہو سکے کہ کس کا پہلے اور کس کا بعد میں انتقال ہوا ہے تو وہ ایک دوسرے کے وارث نہیں بنتے اور نہ ہی ایک کی جائیداد سے دوسرے کو کوئی حصہ دیا جاتا ہے۔

صورت مسئولہ میں ایک فضائی حادثہ میں باپ بیٹے کی ہلاکت ہوئی ہے اور یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بیٹے کا انتقال باپ کے بعد ہوا ہے تو بیٹا اپنے باپ کی جائیداد کا وارث نہیں ہوگا۔ جب بیٹے کو باپ کی جائیداد سے کچھ نہیں ملتا تو اس کی بہو کو کیسے مل سکتا ہے؟ ایسے حالات میں بہو کو اپنے سسر کی جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا۔ مردوں میں دوسرے ورثاء کی وضاحت نہیں، اگر کوئی دوسرا وارث موجود نہیں ہے تو سائل جو مرنے والے کا حقیقی بھتیجا ہے۔ عصبہ ہونے کی حیثیت سے تمام جائیداد کا حق دار ہے۔ البتہ باپ کے ساتھ فوت ہونے والے شادی شدہ بیٹے کا اگر کوئی ترکہ موجود ہے تو اس کی جائیداد سے بیوہ کو چوتھا حصہ ملتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ﴾ 3

''اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو تمہاری عورتوں کا ترکہ میں سے چوتھا حصہ ہے۔''

چونکہ مرنے والے بیٹے کی اولاد نہیں اس لیے بیوہ کو اپنے خاوند کی جائیداد سے چوتھا حصہ دیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہم یہ مشورہ ضرور دیں گے کہ اگر بیٹے کی کوئی جائیداد وغیرہ نہیں تو مرحوم کی بیوہ کو اس کے سسر کی جائیداد سے کچھ نہ کچھ ضرور دیا جائے

! ابو داؤد، الفرائض: ۲۸۹۹. @ بیہقی، ج:۲،ص:۲۲۲.
النساء:۱۲.

گا تا کہ اس کی اشک شوئی اور حوصلہ افزائی ہو جائے۔ واللہ اعلم!

ایک مسئلہ وراثت

] میرے ماموں فوت ہوئے ہیں، ان کی نو ایکڑ زمین ترکہ ہے۔ پسماندگان میں چھ بہنیں اور تین چچا زاد بھائی ہیں۔ نیز ان کی خالہ اور پھوپھی بھی زندہ ہیں۔ ان ورثاء میں مرحوم کا ترکہ تقسیم کرنا ہے، وضاحت فرما دیں۔

[اگر میت کے ذمے کوئی قرضہ وغیرہ نہیں اور نہ ہی اس نے کوئی وصیت کی ہے تو ترکہ کی تقسیم حسب ذیل ہوگی۔

☆ اس کی بہنوں کو ترکہ سے دو تہائی ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِن كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ﴾

''اگر میت کی دو (یا دو سے زیادہ) بہنیں ہیں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حق دار ہوں گی۔'' 1

☆ دو تہائی حصہ نکالنے کے بعد جو ایک تہائی باقی ہے، اس کے حق دار چچا زاد بھائی ہیں کیوں کہ وہ عصبہ ہیں۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''مقررہ حصے ان کے حق داروں کو دو اور جو باقی بچے وہ میت کے سب سے زیادہ قریبی مرد رشتے دار کا ہے۔'' 2

☆ میت کی خالہ اور پھوپھی کا تعلق اولوا الارحام سے ہے۔ مقررہ حصے لینے والوں اور عصبات کی موجودگی میں یہ محروم ہیں، انہیں میت کی جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا۔

مرحوم کی جائیداد نو ایکڑ ہے، اس کے دو تہائی چھ ایکڑ، چھ بہنوں کو دیئے جائیں، ہر بہن کو ایک ایک ایکڑ مل جائے گا اور باقی ایک تہائی جو تین ایکڑ ہیں وہ تین چچا زاد بھائیوں کے لیے ہیں۔ ہر چچا زاد بھائی کو بھی ایک ایک ایکڑ مل جائے گا۔

نوٹ:......اگر میت کے ذمے کوئی قرضہ ہے تو پہلے اسے اتارا جائے، اسی طرح اگر اس نے کوئی وصیت کی ہے تو ادائیگی قرض کے بعد وصیت کو پورا کیا جائے، بشرطیکہ وہ ایک تہائی سے زائد ہو اور نہ ہی کسی وارث رشتہ دار کے لیے ہو۔ واللہ اعلم بالصواب!

مسئلہ وراثت

] ہمارے والد گرامی فوت ہوئے، پسماندگان میں تین لڑکے، چار لڑکیاں اور ایک بیوہ ہے، ان کا ترکہ دس بیگے زرعی زمین ہے، اس کی تقسیم کیسے ہوگی؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرما دیں۔

[میت کے ترکہ سے چار حقوق تعلق رکھتے ہیں جو بالترتیب حسب ذیل ہیں:

☆ کفن دفن......اگر میت کے کفن و دفن کا انتظام کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس کے ترکہ سے مناسب انداز کے ساتھ کفن و دفن کا انتظام سب سے پہلے کیا جائے گا۔

☆ ادائیگی قرض......اس کے بعد میت کے ذمے جتنا قرض ہو اسے ادا کیا جائے خواہ ادائیگی میں تمام ترکہ صرف ہو جائے۔

! النساء:۱۷۶.   @ بخاری، الفرائض:۶۷۳۲.

حدیث میں اس کی بہت تاکید کی گئی ہے۔

☆ وصیت......قرض کی ادائیگی کے بعد میت کی جائز وصیت کو پورا کیا جائے، جائز وصیت کی تین شرائط ہیں:

(۱)......وہ کل جائیداد کی ایک تہائی یا اس سے کم ہو۔

(۲)......وصیت کسی شرعی وارث سے متعلق نہ ہو

(۳)......وہ جائز کام کے لیے ہو، حرام اور ناجائز وصیت کو پورا کرنا درست نہیں۔

☆ مذکور مراحل کو تقسیم سے پہلے پورا کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد چوتھا حق یہ ہے کہ اسے عدل و انصاف کے ساتھ ورثاء میں تقسیم کیا جائے، پہلے ان ورثاء کو دیا جائے جن کے حصے طے شدہ ہیں۔ ان سے بچا ہوا ترکہ عصبات میں تقسیم کرنا چاہیے۔ ان کی عدم موجودگی میں ذوالارحام حق دار ہیں۔

صورت مسئولہ میں سب سے پہلے بیوہ کا آٹھواں حصہ نکالا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ﴾ 1

''اگر مرنے والے کی اولاد ہو تو بیویوں کا آٹھواں حصہ ہے۔''

باقی سات حصے اس طرح تقسیم کیے جائیں کہ ایک لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا حصہ ملے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ 2

''اللہ تمہیں اولاد کے متعلق حکم دیتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔''

سہولت کے پیش نظر کل جائیداد کے اسی حصے بنا لیے جائیں، ان میں سے دس حصے بیوہ کو، چودہ حصے فی لڑکا اور سات حصے فی لڑکی دیئے جائیں۔ زرعی زمین دس بیگھے ہیں، جن کے آٹھ صد مرلے بنتے ہیں، اس بناء پر درج ذیل نقشے کے مطابق اسے تقسیم کر دیا جائے۔

میت کی جائیداد ۸۰۰ مرلہ

بیوہ	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی	بیٹی	بیٹی
100	140	140	140	70	70	70	70

مسئلہ وراثت

] ہمارے ایک عزیز فوت ہوئے، پسماندگان میں بیوہ، دو بیٹیاں اور ایک پوتا ہے، اس صورت میں پوتے کو کیا ملے گا، کیا اس کے حصے کے علاوہ اس کی تالیف قلبی کے لیے کچھ زیادہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[بشرط صحت سوال واضح ہو کہ اولاد کی موجودگی میں بیوہ کو آٹھواں حصہ ملتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

! النساء:۱۲.　　　@ النساء:۱۱

﴿فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ﴾ 1
''اگر تمہاری اولاد ہو تو بیویوں کا آٹھواں حصہ ہے۔''

پوتا عصبات سے ہے، اسے مقررہ حصہ لینے والوں سے بچا ہوا ترکہ ملے گا۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:
''مقررہ حصہ داروں کو حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کے لیے ہے۔'' 2

اس تفصیل کے پیش نظر منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے کل چوبیس حصے کر لیے جائیں، ۳ بیوہ کے لیے ۸،۸ لڑکیوں کے لیے اور باقی پانچ حصے پوتے کو دے دیئے جائیں۔

قرآن کریم کی تقسیم کے مطابق پوتے کا یہی حصہ ہے جو بیان کر دیا گیا ہے، لیکن اگر ورثاء اپنے حصے سے مرحوم کے پوتے کو کچھ زیادہ دینا چاہیں تو اس پر شرعی طور پر کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی، لیکن انہیں زیادہ دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، تاہم ورثاء کو چاہیے کہ وہ یتیم پوتے سے ضرور ہمدردی کرتے ہوئے اس کی اشک شوئی کریں۔ واللہ اعلم!

مرتد کو وراثت دینا

] ہم چار بھائی ہیں، بدقسمتی سے ایک مرزائی ہو گیا ہے، اب ہمارے والد گرامی وفات پا چکے ہیں اور اس نے وراثت کا دعویٰ کر دیا ہے، اس سلسلہ میں ہمیں شرعی فتویٰ درکار ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں ہماری راہنمائی فرمائیں۔

[جو شخص ایمان لانے کے بعد دین اسلام سے برگشتہ ہو جائے اور ہوش وحواس کے ساتھ کلمہ کفر ادا کرنے لگے تو ایسے انسان کو مرتد کہا جاتا ہے۔ مرزائی بھی اس قسم کے مرتدین کا ٹولہ ہے۔ ان کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ حکومت پاکستان نے بھی انہیں قانونی طور پر غیر مسلم قرار دیا ہے۔ مسلمان رشتہ داروں کے یہ وارث نہیں بن سکتے اور اہل اسلام رشتہ داروں کو ان کے ترکہ سے کچھ نہیں لینا چاہیے۔ حدیث میں ہے رسول اللہ e نے فرمایا:
''مسلمان کسی کافر کا اور کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا۔'' 3

امام بخاری a نے مزید وضاحت کی ہے کہ اگر کافر ترکہ تقسیم ہونے سے پہلے اسلام قبول کر لے تو بھی اسے ترکہ سے کچھ نہیں ملے گا کیوں کہ مورث کی وفات کے وقت یہ کافر تھا۔ صورت مسئولہ میں مرزائی بیٹے کو مسلمان باپ کے ترکہ سے کچھ بھی نہیں ملے گا، شریعت اور قانون دونوں کا اس امر پر اتفاق ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ مرتد کا مال خواہ اس نے حالت اسلام میں کمایا ہو یا حالت ارتداد میں، تمام بیت المال میں جمع کر دیا جائے گا۔ (واللہ اعلم)

حادثہ میں مرنے والوں کی وراثت

] میرا بھائی، اس کی بیوی اور والدہ گاڑی میں جا رہے تھے، ان کا حادثہ ہو گیا اور اس حادثہ میں تینوں فوت ہو

! النساء:۱۲ @ بخاری، الفرائض: ۶۷۳۲.
صحیح البخاری، الفرائض: ۶۷۶۴.

گئے، ایسی حالت میں ان کی وراثت کا کیا حکم ہے؟

[ایک سے زیادہ رشتہ دار کسی حادثہ میں اجتماعی طور پر فوت ہو جائیں اور ایک دوسرے کی موت کے متعلق علم نہ ہو سکے کہ پہلے کون فوت ہوا ہے اور بعد میں کس کی موت آئی، تو ایسی صورت میں مرنے والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے بلکہ ان کے زندہ ورثاء ہی ان کے وارث قرار پائیں گے۔ جس طرح حضرت زید بن ثابت t سے روایت ہے:

''حضرت ابو بکر t نے جنگ یمامہ اور حضرت عمر t نے طاعون عمواس میں فوت ہونے والوں کے متعلق حکم دیا کہ زندوں کو فوت شدہ کا وارث بنائیں، اور ان کو آپس میں ایک دوسرے کا وارث نہ بنائیں۔'' 1

اس بناء پر صورت مسئولہ میں بھائی، بیوی اور والدہ تو ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے، البتہ جو زندہ شرعی ورثاء ہیں، ان کو وارث بنایا جائے گا اور ان کا ترکہ انہی میں تقسیم ہوگا۔ (واللہ اعلم)

مسئلہ وراثت

] میرے ایک عزیز فوت ہوئے ہیں، پسماندگان میں سے بیوہ، مادری بہن، بھانجا اور چچا کا بیٹا زندہ ہے۔ اس کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی؟ کیا بھانجا بھی اس تقسیم میں حق دار ہوگا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

[مرحوم کی اولاد نہیں اس لیے اس کی بیوہ کو کل جائیداد سے چوتھا حصہ ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ﴾ 2

''اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو تمہاری بیویوں کا تمہارے ترکہ سے چوتھا حصہ ہے۔''

مرحوم کی مادری بہن کو کل ترکہ سے چھٹا حصہ ملے گا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّ لَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ﴾ 3

''اور اگر وہ مرد یا عورت بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی یا بہن کو چھٹا حصہ ملے گا۔''

اس آیت کریمہ میں جملہ مفسرین اہل علم کا اتفاق ہے کہ مذکورہ بہن بھائی سے مراد مادری بہن بھائی ہیں، کیوں کہ حقیقی یا پدری بہن بھائیوں کا ذکر اس سورت کے آخر میں آ رہا ہے۔

مقررہ حصہ لینے والوں کے حصے دینے کے بعد جو باقی بچے وہ چچا کے بیٹے کو ملے گا، جیسا کہ حدیث میں اس امر کی صراحت ہے۔ رسول اللہ e نے فرمایا:

''مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کے حصے دو اور جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کے لیے ہے۔'' 4

! البیہقی، ص: ۲۲۲، ج۲۔ @ النساء:۱۲۔

النساء:۱۲۔ $ بخاری، الفرائض: ۶۷۳۵۔

میت کے بھانجے کو کچھ نہیں ملے گا، وہ محروم ہے۔ سہولت کے پیش نظر کل جائیداد کے بارہ حصے کر لیے جائیں، ان میں سے تین حصے بیوہ کو، دو حصے مادری بہن کو اور باقی سات حصے چچا کے بیٹے کو دے دیئے جائیں۔

میت کی کل جائیداد کے 12 حصے

بیوہ	مادری بہن	چچا کا بیٹا	بھانجا
		باقی ماندہ	محروم
3	2	7	x

واللہ اعلم!

مسئلہ وصیت

] ہمارا بھائی لا ولد فوت ہوا، مرنے سے پہلے اس نے وصیت کی تھی کہ میرا مکان کسی مسجد کو دے دیا جائے جبکہ مکان کے علاوہ اس کا مزید کوئی ترکہ نہیں۔ کیا اس قسم کی وصیت پر عمل کرنا ضروری ہے؟

[جب انسان فوت ہوتا ہے تو اس کے ترکہ سے تین قسم کے حقوق نکال کر تقسیم کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

وہ تین حقوق حسب ذیل ہیں:

☆ کفن ودفن: اگر کفن ودفن کا انتظام کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس کے ترکہ سے مناسب انداز میں کفن ودفن کا انتظام کیا جائے۔

☆ ادائیگی قرض: میت کے ذمے جتنا قرض ہو اسے ادا کیا جائے خواہ قرض کی ادائیگی میں سارا ترکہ صرف ہو جائے اور ورثاء کے لیے کچھ بھی نہ بچے۔

☆ اس کے بعد میت کی جائز وصیت کو پورا کیا جائے۔

جائز وصیت کی درج ذیل تین شرائط ہیں۔

ا: وصیت کسی وارث کے حق میں نہ ہو، جسے ترکہ سے حصہ ملنا ہے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’اللہ تعالیٰ نے ترکہ سے ہر حق دار کا حق مقرر کر کے اسے دے دیا ہے، اب کسی وارث کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں۔ 1

ب: وصیت کسی صورت میں تہائی سے زیادہ نہ ہو۔

کیوں کہ رسول اللہ e نے حضرت سعد بن ابی وقاص t سے فرمایا تھا:

’’اپنے مال سے ایک تہائی کی وصیت کر سکتے ہو لیکن تہائی حصہ بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے۔‘‘ 2

! ترمذی، الوصایا: ۲۱۲۰. @بخاری، مناقب الانصار: ۳۹۳۶.

ج: وہ وصیت کسی ناجائز اور حرام کام کے لیے نہ ہو۔

جیسا کہ حدیث میں ہے:

''نافرمانی کے کاموں میں کسی کی بات کو نہ مانا جائے کیوں کہ اطاعت تو صرف اچھے اور نیکی کے کاموں میں ہوتی ہے۔'' 1

صورت مسئولہ میں بھائی کی وصیت ایک تہائی سے زیادہ ہے، اس لیے اس پر عمل نہیں ہوگا بلکہ مکان کا تیسرا حصہ مسجد کو دیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کی ناجائز وصیت کی اصلاح ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ 2

''جس کو اندیشہ ہو کہ وصیت کرنے والے نے کسی کی طرف ناجائز جھکاؤ یا قصداً کسی کی حق تلفی کی ہے تو پھر وہ معاملے سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان اصلاح کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں۔''

لہٰذا اس وصیت کی اصلاح کر کے اسے قابل عمل بنایا جاسکتا ہے، مکمل وصیت پر عمل کرنا ناجائز ہے۔ (واللہ اعلم)

مطلقہ بیوی کی وراثت

] میرے بھائی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی، ابھی وہ دوران عدت تھی کہ بھائی کا انتقال ہوگیا، کیا اس صورت میں مطلقہ بیوی کو وراثت سے حصہ دیا جائے گا، اس کے متعلق شریعت کا کیا فیصلہ ہے؟

[ہمارے ہاں یہ مشہور ہے کہ طلاق دیتے ہی نکاح ختم ہوجاتا ہے، حالانکہ ایسی بات نہیں کہ طلاق کے فوراً بعد نکاح ختم ہوجائے، بلکہ عدت ختم ہونے تک اس کا نکاح باقی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوران عدت بلاتجدید نکاح رجوع کر کے اسے گھر میں لانے کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا﴾ 3

''ان کے خاوند دوران عدت بلاتجدید نکاح رجوع کر کے اسے گھر میں لانے کی شریعت نے اجازت دی ہے۔''

اس دوران اگر خاوند فوت ہوجائے تو مطلقہ بیوی جو دوران عدت ہو اسے خاوند کی جائیداد سے حصہ ملتا ہے۔ اسی طرح اگر بیوی دوران عدت فوت ہوجائے تو اس کے شوہر کو شریعت نے اس کے ترکہ سے بقدر حصہ حق دار بنایا ہے۔ البتہ تین قسم کی مطلقہ عورتیں خاوند کی جائیداد سے حصہ نہیں پاتیں۔

جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ا۔ وہ بیوی جسے رخصتی سے قبل طلاق ہوجائے، چونکہ ایسی عورت کا طلاق ہوتے ہی نکاح ٹوٹ جاتا ہے، اس لیے مرحوم خاوند

! بخاری، اخبار الآحاد: ۷۲۵۷. @ البقرہ:۱۸۲.
البقرہ:۲۲۸.

کی جائیداد سے اسے کچھ نہیں ملتا۔

۲۔ وہ مطلقہ عورت جس کی عدت ختم ہو جائے، ایسی عورت کا بھی خاوند سے کوئی تعلق نہیں رہتا، اگر عدت کے بعد اس کا سابقہ خاوند فوت ہو جائے تو بھی اسے کچھ نہیں ملے گا۔

۳۔ وہ عورت جسے وقفہ وقفہ سے تیسری طلاق مل جائے۔ اس قسم کی مطلقہ عدت تو گزارے گی لیکن تیسری طلاق ملتے ہی خاوند سے تعلق ختم ہو جاتا ہے، اس قسم کی عورت کو بھی مرحوم خاوند کی جائیداد سے حصہ نہیں دیا جائے گا۔

بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق مدخولہ بیوی جسے پہلی یا دوسری طلاق ملی ہو، اگر وہ دوران عدت ہے اور اس کا خاوند فوت ہو جائے تو اسے مرحوم خاوند کی جائیداد سے حصہ دیا جائے گا۔ (واللہ اعلم)

مسئلہ وراثت

] ایک آدمی فوت ہوا، پس ماندگان میں بیٹی، پوتی، بہن اور فوت شدہ بیٹے کی بیوہ زندہ ہیں، مرحوم کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟

] حضرت ابوموسیٰ اشعری t سے اسی طرح کا ایک سوال ہوا تھا تو آپ t نے فرمایا کہ بیٹی کو نصف اور بہن کو نصف دیا جائے لیکن اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود t سے ضرور سوال کرنا، وہ بھی میرے جواب کی تصدیق کریں گے۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود t سے سوال ہوا اور حضرت ابوموسیٰ اشعری t کے جواب کا بھی حوالہ دیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں تو صورت مسئولہ میں وہی فیصلے کروں گا جو رسول اللہ e نے فرمایا تھا، وہ یہ ہے کہ بیٹی کو نصف اور پوتی کو چھٹا حصہ تاکہ قرآنی فیصلہ کے مطابق دو تہائی پورا ہو جائے اور باقی بہن کو دے دیا جائے۔ جب یہ جواب حضرت ابوموسیٰ اشعری t کو بتایا گیا تو انہوں نے فرمایا:

''جب تک یہ عالم موجود ہیں مجھ سے سوال نہ کیا کرو۔'' 1

صورت مسئولہ میں مرحوم کی وراثت اس طرح تقسیم ہوگی کہ کل ترکہ سے بیٹی کو نصف، پوتی کو چھٹا حصہ اور باقی بہن کو مل جائے گا اور فوت شدہ بیٹے کی بیوہ محروم ہوگی۔

سہولت کے پیش نظر تمام جائیداد کے چھ حصے کر لیے جائیں، ان میں سے تین بیٹے کو، ایک پوتی کو اور باقی دو حصے بہن کو مل جائیں گے۔

جیسا کہ ذیل میں ہے: میت/=۶ بیٹی (۳) پوتی (۱) بہن (۲) بہو (محروم)

هذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

ایک مسئلہ وراثت

] میری ایک ہی بیٹی ہے، میں نے اس کی شادی کر دی ہے، اب وہ اپنے گھر میں اچھی زندگی گزار رہی ہے، میں

! بخاری، الفرائض: ۶۷۳۶.

چاہتا ہوں کہ اپنی جمع پونجی کسی مدرسہ کو دے دوں، کیا میں ایسا کر سکتا ہوں، جبکہ میرے حقیقی چچا کی اولاد لڑکے اور لڑکیاں موجود ہیں، اس سلسلہ میں میری راہنمائی کریں؟

[ہمارے ہاں اکثر لوگ جنہیں خوف آخرت ہوتا ہے، وہ ایسا کرتے ہیں کہ مرتے وقت وہ سب کچھ فی سبیل اللہ دے جاتے ہیں حالانکہ شرعی طور پر ایسا کرنا جائز نہیں کیوں کہ شرعی ورثاء کا حق دبانا کسی صورت میں جائز نہیں۔

چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص t فرماتے ہیں کہ میں مکہ میں بیمار ہو گیا اور میں اس بات کو ناپسند کرتا تھا کہ مجھے ایسی سرزمین میں موت آئے جہاں سے میں ہجرت کر کے گیا ہوں۔ اس دوران رسول اللہ e میری تیمارداری کرنے کے لیے تشریف لائے۔

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں اپنے سارے مال کی وصیت کرنا چاہتا ہوں؟

رسول اللہ e نے اس کی اجازت نہ دی۔

پھر نصف مال کی وصیت کرنے کے متعلق عرض کیا تو اس کی بھی اجازت نہ دی۔

میں نے ایک تہائی کی اجازت طلب کی تو آپ نے اس کی اجازت دے دی۔

لیکن فرمایا: کہ ایک تہائی بھی بہت زیادہ ہے۔ آپ نے مزید فرمایا: اے سعد! اگر تو اپنے ورثاء کو مالدار چھوڑ کر جائے گا تو یہ بہت اچھا ہے مبادا وہ تیرے بعد لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کریں، تو جو بھی خرچ کرے گا، وہ تیرے لیے صدقہ ہو گا حتی کہ اگر تو خوش طبعی کے طور پر اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ دے گا تو وہ بھی تیرے لیے صدقہ اور باعث ثواب ہو گا (ان دنوں آپ کی ایک ہی بیٹی تھی)۔ 1

صورت مسئولہ میں بھی سائل کی ایک ہی بیٹی ہے جس کی اس نے شادی کر دی ہے، اس کے علاوہ اس کے چچا کی اولاد بھی زندہ ہے، وہ اپنی تمام جائیداد کسی مدرسہ یا مسجد کو دینا چاہتا ہے۔ مذکورہ بالا حدیث کے پیش نظر سائل ایسا نہیں کر سکتا، اپنا تمام مال اللہ کی راہ میں دینے کی اجازت نہیں جبکہ اس کے شرعی ورثاء موجود ہیں۔ اس کے شرعی ورثاء اس کی شادی شدہ بیٹی اور چچا کی نرینہ اولاد ہے بشرطیکہ چچا موجود نہ ہو، اگر چچا زندہ ہے تو اس کی موجودگی میں چچا کی اولاد کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس کی وفات کے بعد بیٹی کو نصف اور باقی نصف چچا یا اس کی نرینہ اولاد کو ملے گا، بقیہ اولاد اس سے محروم ہے، کیوں کہ چچا کے بیٹے اپنی بہنوں کو عصبہ نہیں بناتے۔ اس بناء پر سائل کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی میں کوئی ایسا اقدام نہ کرے جو دوسرے ورثاء کی حق تلفی کا باعث ہو، ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن اسے باز پرس ہو۔ (واللہ اعلم)

زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے کا حکم

] میرے دو بیٹے، تین بیٹیاں اور اہلیہ موجود ہے، میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں ہی جائیداد تقسیم کر دوں تا کہ

! بخاری، الوصایا: ٢٧٤٢.

بعد میں کوئی لڑائی جھگڑا نہ ہو، اس کے متعلق شرعی ہدایات کیا ہیں، کتاب وسنت کی روشنی میں میری راہنمائی کریں؟

[اللہ تعالیٰ نے انسان کو خود مختار بنا کر دنیا میں بھیجا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جیسے چاہے استعمال کرسکتا ہے۔ مال و جائیداد بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، اس میں اسے تصرف کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ رسول اللہ e کا ارشاد ہے:

''ہر مال دار اپنے مال میں تصرف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔'' 1

اس حدیث کی بناء پر انسان کو اپنے مال میں تصرف کرنے کا حق ہے لیکن درج ذیل حقائق کو پیش نظر رکھنا ہوگا:

☆ زندگی میں بطور وراثت تقسیم کرنے کا اسے اختیار نہیں، کیوں کہ وراثت اس جائیداد کو کہتے ہیں جو غیر اختیاری طور پر کسی وارث کو منتقل ہو جائے، اس کے لیے وارث کا زندہ ہونا اور مورث کا فوت ہونا بنیادی شرط ہے۔

☆ اپنے ورثاء کو محروم کر کے تمام جائیداد فی سبیل اللہ دینا بھی درست نہیں۔

جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص t نے اپنا دو تہائی مال صدقہ کرنے کی اجازت طلب کی تو رسول اللہ e نے انہیں اجازت نہیں دی۔ 2

☆ مال میں یہ تصرف کسی ناجائز اور حرام کام نیز حرام کاری کے لیے نہ ہو، اگر ایسا کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی باز پرس ہوگی۔

☆ جائز تصرف کرتے وقت بھی کسی وارث کو محروم کرنا مقصود نہ ہو۔

جیسا کہ رسول اللہ e کے عہد مبارک میں ایسا کیا گیا تو رسول اللہ e نے اس کے مرنے کے بعد اسے بہت برا بھلا کہا بلکہ آپ نے فرمایا:

''اگر مجھے پہلے علم ہوتا تو میں اسے مسلمانوں کے قبرستان میں نہ دفن کرتا۔'' 3

☆ اگر یہ تصرف ہبہ کے طور پر اولاد کے لیے ہے تو بیٹے اور بیٹیوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جائے، اگر مساویانہ نہیں تو رسول اللہ e نے فرمایا کہ میں ایسے ظلم وستم پر گواہ نہیں بنتا، آپ نے اسے جائز قرار نہیں دیا۔'' 4

☆ اگر یہ تصرف بطور وصیت ہے تو کل جائیداد کے سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ رسول اللہ e نے اس سلسلہ میں خاص وصیت کی ہے۔ 5 نیز یہ وصیت کسی وارث کے حق میں نہ ہو۔ 6

مندرجہ بالا شرائط کو ملحوظ رکھ کر مناسب حد تک اولاد کو ہبہ تو دیا جا سکتا ہے لیکن سارا مال دینے کی یا وراثت کے ضابطہ کے

! بیہقی، ص: ۱۷۸، ج۶۔
@ بخاری، مناقب الانصار: ۳۹۳۶۔
# ابو داؤد، العتق: ۳۹۶۰۔
$ بخاری، الشہادات: ۳۶۵۰۔
% بخاری، الوصیۃ: ۲۷۴۴۔
۸ ابو داؤد،الوصایا: ۲۸۷۰۔

مطابق تقسیم کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ (واللہ اعلم)

مسئلہ وراثت

] ہمارے بھائی پچھلے دنوں فوت ہوئے، پسماندگان میں بیوہ، تین لڑکے اور ایک لڑکی ہے، جو ابھی نابالغ ہے۔ بیوہ نے اس کی تمام جائیداد پر قبضہ جما رکھا ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں کہ بھائی کی جائیداد میں ہمارا کتنا حصہ ہے؟

[اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ضابطہ میراث بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ؀ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ؀﴾1

''یہ حدیں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ ہیں اور جو انسان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول e کی فرمانبرداری کرے گا اسے وہ جنتوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول e کی نافرمانی کرے اور اس کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرے گا، اسے وہ جہنم میں ڈال دے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ ایسے لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔''

بیوہ کا حصہ نکالنے کے بعد باقی ترکہ مرحوم کی نرینہ اور مادینہ اولاد کا ہے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کا حصہ دو اور جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کا ہے۔'' 2

میت کے قریبی رشتہ دار، اس کے بیٹے ہیں اور وہ اپنی بہنوں کو بھی اس جائیداد میں شریک کریں گے، باقی ماندہ جائیداد اس طرح تقسیم کی جائے، کہ ایک بیٹے کو بیٹی سے دوگنا حصہ ملے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ﴾ 3

''اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔''

سہولت کے پیش نظر مرحوم کی جائیداد کے آٹھ حصے کر لیے جائیں۔ ایک حصہ بیوہ کو، دو، دو حصے ہر لڑکے کو اور ایک حصہ لڑکی کو دے دیا جائے، بھائیوں کو اس کی جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا۔

! النساء: ۱۳، ۱۴.

@ بخاری، الفرائض : ۶۷۳۵.

النساء:۱۱.

میت کی کل جائیداد کے 8 حصے

بیوہ	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹی
1	2	2	2	1

واللہ اعلم!

دیت کی تقسیم

] ہمارے ہاں ایک قتل ہوا، قاتل کے عزیز واقارب نے چوبیس لاکھ روپے دیت ادا کرنے پر مقتول کے ورثاء سے صلح کر لی ہے، مقتول کے ورثاء میں سے والد، والدہ، دو حقیقی بھائی اور دو مادری بھائی ہیں، دیت کی شرعی تقسیم کیسے ہوگی؟

[قتل کے معاملہ میں دیت ان لوگوں نے ادا کرنا ہوتی ہے جو قاتل کے باپ کی طرف سے مرد رشتہ دار ہوتے ہیں، جنہیں عاقلہ کہا جاتا ہے۔ پھر وہ دیت مقتول کے ورثاء میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشادگرامی ہے: ’’دیت کی ادائیگی قاتل کے عصبہ پر ہوتی ہے۔‘‘ 1

صورت مسئولہ میں چوبیس لاکھ روپیہ کی ادائیگی پر صلح کی گئی ہے اور مقتول کے ورثاء والد، والدہ، دو حقیقی بھائی اور مادری بھائی ہیں، مادری بھائی تو محروم ہیں کیوں کہ انہیں میت کے کلالہ ہونے کی صورت میں وارث بنایا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ 2

اب قاتل کی طرف سے ملنے والی دیت کے حق دار صرف والدین ہیں، متعدد بھائیوں کی موجودگی میں ماں کو چھٹا حصہ ملتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ﴾ 1

’’اگر مرنے والے کے متعدد بہن بھائی ہیں تو ماں کو چھٹا حصہ ملتا ہے۔‘‘ 3

ماں کو چھٹا حصہ دینے کے بعد باقی پانچ حصے والد کے ہیں۔

سہولت کے پیش نظر دیت یعنی چوبیس لاکھ کے چھ حصے کر لیے جائیں، ایک حصہ والدہ کو اور باقی پانچ باپ کو دیئے جائیں۔ یعنی چار لاکھ روپیہ والدہ کو اور بیس لاکھ روپیہ والد کو دیا جائے گا۔ مادری بھائی اور حقیقی بھائی محروم ہیں، ان کو اس دیت سے کچھ نہیں ملے گا۔

واضح رہے کہ دیت کی رقم کے علاوہ دیگر جائیداد بھی اسی نسبت سے تقسیم ہوگی۔ اس میں کسی قسم کی کمی بیشی جائز نہیں۔

واللہ اعلم!

! مسلم، القسامہ: ۴۳۹۰. @ النسا: ۱۷۶.

النساء:۱۱.

حق دار فوت شدہ بیٹے کا حصہ

] ایک آدمی فوت ہوا، اس کے پسماندگان میں تین بیٹے تھے، ابھی جائیداد تقسیم ہونی تھی کہ ایک بیٹا فوت ہو گیا، فوت شدہ بیٹے کی آگے اولاد موجود ہے، باقی دو بیٹوں نے جائیداد پر قبضہ کر لیا ہے وہ اپنے بھتیجوں کو ان کے باپ کا حصہ نہیں دیتے جو فوت ہو چکا ہے۔قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[شریعت کا تقاضا ہے کہ جب کوئی فوت ہو جائے تو اس کی متروکہ جائیداد حق دار ورثاء میں تقسیم کر دی جائے، وہ تین مراحل سے گزر کر ورثاء میں تقسیم کے قابل ہو گی۔

☆ اگر میت کے کفن ودفن کا انتظام کرنے والا کوئی نہ ہو تو ترکہ سے مناسب طریقہ سے اس کا انتظام کیا جائے۔

☆ میت کے ذمے جتنا بھی قرض ہو اس کی ادائیگی کی جائے خواہ تمام جائیداد صرف ہو جائے۔

☆ میت کی جائز وصیت کو شرعی حد تک پورا کیا جائے۔

باقی ماندہ جائیداد کو ورثاء میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ورثاء کی تین اقسام حسب ذیل ہیں:

☆ جن ورثاء کے حصے کتاب وسنت میں متعین ہیں، انہیں اصحاب الفرائض کہا جاتا ہے۔

☆ جن قریبی رشتے داروں کے حصے متعین نہیں بلکہ وہ بچا ہوا ترکہ لیتے ہیں انہیں عصبات کہا جاتا ہے۔

☆ وہ قریبی رشتہ دار جو اصحاب الفرائض یا عصبات نہ ہوں انہیں ذوی الارحام کہتے ہیں۔

صورت مسئولہ میں فوت ہونے والے کے تین بیٹے تھے جو عصبات ہیں اور باپ کی پوری جائیداد کے وارث ہیں۔باپ کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے گا اور ایک ایک حصہ ہر بیٹے کو دیا جائے گا۔بہتر تھا کہ باپ کی جائیداد کو وفات کے بعد فوری طور پر تقسیم کر لیا جاتا تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا نہ ہو لیکن بوجہ ایسا نہیں ہوا، اس دوران ایک بیٹا فوت ہو گیا جس کی آگے اولاد ہے، اب چونکہ فوت ہونے والا بیٹا باپ کی وفات کے وقت زندہ تھا، اس لیے وہ باپ کی جائیداد میں دوسرے بیٹوں کے ہمراہ برابر کا حصے دار ہے، اس کے فوت ہونے کے بعد اس کا حصہ اس کی اولاد کو دے دیا جائے۔عدل وانصاف اور شریعت کا تقاضا یہی ہے۔دوسرے بیٹوں کا اس کے حصہ پر قبضہ کر کے اپنے بھتیجوں کو اس سے محروم کرنا شرعاً درست نہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝﴾ 1

"جو لوگ ناحق ظلم سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ ہی بھر رہے ہیں، اور وہ عنقریب دوزخ میں جائیں گے۔"

اس آیت کے پیش نظر متوفی کے بھائیوں کو چاہیے کہ وہ اپنے فوت شدہ بھائی کا حصہ اپنے یتیم بھتیجوں کو بخوبی ادا

---

1 النساء: ١٠.

کریں۔ واللہ اعلم!

مسئلہ وراثت

] ایک آدمی فوت ہوا، پس ماندگان میں بیوہ، بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، اس کی جائیداد 80 لاکھ روپیہ ہے۔ قرآن و سنت کے مطابق اسے کیسے تقسیم کیا جائے گا۔ اس کی وصیت یا اس کے ذمے کوئی قرض وغیرہ نہیں۔

[سب سے پہلے اس کی بیوہ کا آٹھواں حصہ نکالا جائے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ﴾ 1

''اگر میت کی اولاد ہے تو بیویوں کا آٹھواں حصہ ہے۔''

اس کے بعد باقی ماندہ رقم کو سات حصوں میں تقسیم کیا جائے، ان سے دو، دو حصے ایک بیٹے کو اور ایک ایک حصہ بیٹی کو دیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے؛

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ﴾ 2

''تمہاری اولاد کے متعلق اللہ حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔''

صورت مسئولہ میں ۱۰ لاکھ بیوہ کا ہے جو کل رقم کا آٹھواں حصہ ہے۔ باقی ستر لاکھ کے سات حصے کیے جائیں تو ایک حصہ دس لاکھ کا بنتا ہے، ان سے دو حصے یعنی بیس، بیس لاکھ فی لڑکا اور دس، دس لاکھ ایک لڑکی کو دے دیا جائے۔ اس طرح مذکورہ رقم کو تقسیم کرلیا جائے۔ واللہ اعلم!

زندگی میں وراثت کا مطالبہ

] میں اپنے بیٹے کو علیحدہ کرنا چاہتا ہوں، لیکن وہ علیحدہ ہونے سے پہلے میری جائیداد سے اپنا شرعی حصہ مانگتا ہے۔ میں بھی اس کے شرعی حصے پر راضی ہوں، کیا میں اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کو اس کا شرعی حق دے سکتا ہوں؟

[شریعت اسلامیہ میں انتقال ملکیت کی دو صورتیں ہیں: اختیاری اور غیر اختیاری۔ اختیاری طور پر انتقال ملکیت اگر معاوضے کے ساتھ ہے تو اسے بیع یا اس کے مشابہ عقود کا نام دیا جاتا ہے اور اگر بلا معاوضہ ہو تو ایسا ہبہ یا وصیت کی صورت میں ممکن ہے۔ انتقال ملکیت کی دوسری صورت غیر اختیاری ہے وہ ملکیت کو خود بخود مورث کی طرف سے اس کے ورثاء کی جانب منتقل کر دیتی ہے جس میں مورث کے ارادہ نیت یا اختیار کو کچھ بھی دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے اس قسم کے انتقال ملکیت کو شرعی اصطلاح میں ''وراثت'' کہا جاتا ہے۔

صورت مسئولہ میں شرعی حصہ لینے دینے پر رضامندی، انتقال ملکیت کی یہ آخری صورت معلوم ہوتی ہے۔ سائل کا منشا یہ

!النساء:۱۲.   @ النساء:۱۱.

معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس غیر اختیاری انتقال ملکیت کو اپنے اختیار و ارادہ سے اپنے ورثاء کی طرف منتقل کرنا چاہتا ہے لیکن وراثت کے طور پر ایسی تقسیم اپنی زندگی میں جائز نہیں۔ کیوں کہ انتقال ملکیت کی آخری صورت میں وراثت کا استحقاق اسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ مورث کی موت حقیقتاً یا حکماً واقع ہو چکی ہو۔ اپنی زندگی میں جیتے جی کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اللہ کے قانون اور ضابطے کو ہاتھ میں لے کر اس کی زندگی میں فوت ہو گیا تو اسے جو حصہ دیا گیا تھا وہ اس کا وارث نہ تھا۔ کیوں کہ وراثت میں مورث کی موت کے ساتھ وارث کی زندگی کا تعین انتہائی ضروری ہے۔ کیوں کہ مورث کی زندگی میں فوت ہو جانے والا خود بخود وراثت سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس بناء پر صورت مسئولہ میں باپ کی زندگی میں بیٹے کا اپنے ''شرعی حصے'' کا مطالبہ کرنا اور باپ کا اس پر راضی ہونا دونوں ناجائز ہیں۔ البتہ ہبہ یا عطیہ میں بھی ایسا ہو سکتا ہے لیکن اسے شرعی حصہ قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ تو اپنے والد کی رضامندی پر موقوف ہے۔ ہبہ میں دوسری اولاد کو بھی مساویانہ طور پر شامل کرنا ہوگا۔ ہاں اگر بیٹا باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو تو اسے علیحدگی کے وقت اس کا کاروباری حصہ دیا جا سکتا ہے۔ بطور وراثت اپنے والد کی جائیداد سے شرعی حصے کا والد کی زندگی میں حق دار نہیں۔ واللہ اعلم!

جائز وصیت کا نفاذ

] میری نانی فوت ہوئی تو اس کے پاس ۱۳۵ گرام طلائی زیور تھا، اس نے اس کا نصف میرے لیے وصیت کر دیا، جبکہ اس کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں موجود ہیں۔ کیا وصیت پر عمل کرنے کے بعد باقی زیور تقسیم کیا جائے گا؟ اس کی تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔

[میت کا ترکہ تین مراحل طے کرنے کے بعد ورثاء میں تقسیم کیا جاتا ہے، ان میں سے ایک جائز وصیت کا نفاذ ہے۔ جائز وصیت کی تین شرائط حسب ذیل ہیں:

☆ وصیت کسی بھی صورت میں ایک تہائی سے زائد نہ ہو۔

جیسا کہ ایک مرتبہ سیدنا سعد بن ابی وقاص t نے رسول اللہ e سے سوال کیا:

''کیا میں اپنے ذاتی مال سے دو تہائی وصیت کر دوں؟''

آپ e نے فرمایا: ''نہیں۔''

انہوں نے عرض کیا: ''آدھے مال کی وصیت کر دوں؟''

آپ e نے فرمایا: نہیں۔''

انہوں نے عرض کیا، ایک تہائی مال کی وصیت کر دوں؟''

آپ e نے فرمایا: ’’ہاں ایک تہائی مال کی وصیت کردو، لیکن تہائی حصہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔‘‘ 1

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کل جائیداد سے ایک تہائی کی وصیت کی جاسکتی ہے۔

☆ کسی ایسے شرعی وارث کے حق میں وصیت نہ کی جائے جس نے ترکہ سے حصہ لینا ہے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، اب کسی وارث کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں۔‘‘ 2

اس حدیث کی بنا پر شرعی وارث کے لیے وصیت کالعدم ہوگی۔

☆ کسی حرام اور ناجائز کام کی وصیت نہ ہو، مثلاً شراب خانہ بنانا یا قبر کو پختہ کرنے کی وصیت کرنا۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’اطاعت تو صرف نیکی کے کاموں میں ہے، نافرمانی کے معاملات میں کسی کی بات کو نہیں مانا جائے گا۔‘‘ 3

اس حدیث سے پیش نظر ناجائز کام کے متعلق وصیت پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

صورت مسئولہ میں مرحومہ نے نصف ترکہ کی وصیت ہے، جو ناجائز ہے، اس پر عمل نہیں ہوگا بلکہ اس کا تہائی یعنی ۴۵ گرام نواسی کو دیا جائے گا، باقی ۹۰ گرام اس طرح اولاد میں تقسیم کیے جائیں کہ لڑکے کو لڑکی سے دوگنا حصہ ملے۔ چونکہ مرحومہ کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں موجود ہیں، اس لیے ۱۸ گرام فی لڑکا اور ۹ گرام فی لڑکی تقسیم کردیا جائے۔ واللہ اعلم!

زندگی میں جائیداد تقسیم کرنا

] ایک شخص نے اپنی زندگی میں آدھی جائیداد اپنے اکلوتے بیٹے کے نام کردی جبکہ دوسری آدھی اپنے دو پوتوں کے نام بیع کی صورت میں کی۔ جس کا انتقال بعوض -/500 روپے فرضی خریداری ہوا، اس کے بعد وہ تین سال تک زندہ رہا، کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے؟

[اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں خود مختار بنا کر بھیجا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اللہ عزوجل کی نعمتوں کو جیسے چاہے استعمال کرسکتا ہے۔ مال و جائیداد بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، اس میں بھی تصرف کرنے کا اسے پورا پورا حق ہے۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’ہر مال دار اپنے مال میں تصرف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔‘‘ 4

اس تصرف کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ناجائز اور حرام کام کے لیے نہ ہو اور نہ ہی اس کے ذریعے کسی جائز وارث کو محروم کرنا مقصود ہو۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون وراثت کو پامال کرنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ اس وضاحت

! بخاری، مناقب الانصار: ۳۴۳۶۔ @ ترمذی، الوصایا: ۲۱۲۰۔
بخاری: ۷۲۵۷۔ $ بیہقی، ج۶، ص ۱۷۸۔

کے بعد جب ہم صورت مسئولہ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں صاحب جائیداد نے کئی طرح سے ناجائز کام کا ارتکاب کیا ہے۔ مثلاً

☆ اس نے اپنی جائیداد کو زندگی میں تقسیم کر دیا ہے جبکہ وہ قطعاً اس کا مجاز نہ تھا، موت کے بعد جو وارث زندہ ہوتے، وہ خود اپنا اپنا حصہ لے لیتے۔

☆ تقسیم کرتے وقت بھی شرعی تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا گیا کیوں کہ دو پوتوں کے نام بقیہ نصف جائیداد کو بیع کی صورت میں انتقال کر دیا ہے جبکہ خرید وفروخت قطعاً مقصود نہ تھی، بلکہ انہیں وارث بنانے کے لیے بطور حیلہ استعمال کیا ہے تا کہ ان پوتوں کو ان کے مرحوم باپ کی جگہ رکھ کر جائیداد سے حصہ دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ اپنے یتیم پوتوں کے لیے وصیت کر جاتا جو کسی صورت میں سے زیادہ نہ ہوتی۔ اب بھی اس کی اصلاح بایں صورت ہوسکتی ہے کہ کل جائیداد سے بطور وصیت دو پوتوں کو اور باقی دو حصے اس کے بیٹے کو دیئے جائیں۔

چنانچہ اس قسم کا ایک واقعہ رسول اللہ e کی زندگی میں پیش آیا کہ ایک شخص نے موت کے قریب اپنے کل اثاثے چھ غلاموں کو آزاد کر دیا جبکہ اس کے علاوہ اور کوئی جائیداد اس کے پاس نہ تھی۔ مرنے کے بعد اس کے ورثاء نے اس بات کا تذکرہ رسول اللہ e سے کیا تو آپ نے مرنے والے کے عمل کو کالعدم قرار دیتے ہوئے آزاد کردہ غلاموں کو بلایا اور انہیں تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پھر ان کے درمیان قرعہ اندازی کر کے تیسرے حصے یعنی دو غلاموں کو آزاد کر دیا اور باقی چار کو غلامی میں واپس کر کے انہیں ورثاء کے حوالے کر دیا۔'' 1

ہمارے رجحان کے مطابق صورت مسئولہ میں بھی اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ وصیت کے طور پر مرحوم کی کل جائیداد دو پوتوں کو دے دیا جائے اور باقی دو حصے اس کے بیٹے کو دے دیئے جائیں کیوں کہ بیٹے کی زندگی میں پوتے وارث نہیں ہوتے، تاہم تالیف قلبی کے طور پر انہیں بطور وصیت کچھ دیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم!

ترکہ کیا ہے؟

] ہمارے خیال کے مطابق قابل تقسیم ترکہ وہ ہوتا ہے جو باپ دادا سے وراثت کے طور پر حاصل ہو۔ انسان نے جو محنت سے کمایا ہو، اسے ترکہ میں شمار نہیں ہونا چاہیے اس کے متعلق انسان خود مختار ہے جسے چاہے دے دے۔ اس سلسلہ میں ہمارا خیال کہاں تک درست ہے؟

[شرعی اصطلاح میں ہر منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کو ترکہ کہا جاتا ہے جو مرنے کے بعد انسان نے اپنے پیچھے چھوڑا ہو اور کسی دوسرے کا اس میں کوئی حق نہ ہو۔ وہ مال خواہ اسے وراثت میں ملا ہو یا اس نے محنت و ہنر سے کمایا ہو۔

ترکہ کے متعلق درج ذیل امور کو مدنظر رکھنا ہوگا۔

! مسلم، الایمان: ۴۳۳۵.

☆ وہ چیز بھی مرنے والے کا ترکہ شمار ہوگی جو اس کی ملکیت میں مرنے کے بعد شامل ہوئی لیکن اس کا سبب ملک اس کی زندگی میں قائم ہو چکا تھا۔ جیسے ایک شخص نے حکومت کی کسی سکیم کے تحت پلاٹ لینے کے لیے درخواست دی جو بذریعہ قرعہ اندازی تقسیم ہونے تھے، مرنے کے بعد قرعہ اندازی ہوئی تو اس کے نام پلاٹ نکل آیا، وہ پلاٹ بھی اس کا ترکہ شمار ہوگا کیوں کہ اس کا سبب یعنی درخواست اپنی زندگی میں دے چکا تھا۔

☆ شادی شدہ بیٹی کے فوت ہونے کے بعد اس کا جہیز، حق مہر اور شادی کے موقع پر ملنے والے تحائف وغیرہ اس کا ترکہ شمار ہوں گے، والدین کا اس کے تمام مال پر قبضہ کر لینا یا والدین کا جہیز کو دوسری بچی کی شادی کے لیے رکھ لینا شرعاً جائز نہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگر والدین نے بچی کو جہیز وغیرہ دیا ہو تو اس کے عوض بچی کو جائیداد سے محروم کرنا جائز نہیں۔

درج ذیل چیزوں کا ترکہ میں شمار نہیں کیا جائے گا۔

☆ بیمہ زندگی شرعاً ناجائز ہے، مرنے کے بعد کمپنی کی طرف سے ملنے والی رقم ترکہ میں شمار نہیں ہوگی کیوں کہ بیمہ جوئے کے حکم میں ہے، البتہ میت کی طرف سے ادا کردہ رقم اس کا ترکہ شمار ہوگی، جو ورثاء باہم تقسیم کرنے کے مجاز ہوں گے۔

☆ ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ مال بھی ترکہ میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ مثلاً چوری، رشوت یا خیانت کے ذریعے حاصل کیا ہوا مال۔ اسی طرح سود کی رقم بھی ترکہ میں شمار نہیں کی جائے گی۔

☆ میت کی کوئی چیز کسی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی اور اس نے اس قدر مال نہیں چھوڑا کہ اسے ادا کر کے گروی شدہ چیز کو واگزار کرایا جا سکے تو ایسی چیز بھی ترکہ میں شمار نہیں کی جائے گی۔

☆ ایسا مال جو میت کو حاصل ہوا لیکن شریعت نے اس پر مال ہونے کا حکم نہیں لگایا جیسے ذخیرہ شراب وغیرہ، اس قسم کے مال کو بھی ترکہ میں شمار نہیں کیا جائے گا۔

بہر حال ترکہ کے لیے وراثت میں ملنے یا محنت سے کمانے کی تفریق صحیح نہیں، مرنے کے بعد میت نے جو کچھ بھی چھوڑا ہے، اسے ترکہ میں شمار کیا جائے گا۔ (واللہ اعلم)

ایک مسئلہ وراثت

] ایک شخص کو 8 کنال رقبہ وراثت میں ملا اور ۸ کنال اس نے خود خریدا۔ خرید کردہ رقبہ اپنے بڑے بیٹے کے نام کر دیا، اب وہ فوت ہو گیا ہے اور اس کی دو بیویاں ہیں، ایک لا ولد ہے اور دوسری بیوی سے دو بیٹے اور تین بیٹیاں زندہ ہیں، اس کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟

[پہلے تو یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ مرنے کے بعد جو کچھ بھی اس کی ملکیت میں ہے، اسے ترکہ میں شمار کیا جائے گا۔ کفن دفن، ادائے قرض اور نفاذ وصیت کے بعد وہ سب شرعی ورثاء میں تقسیم ہوگا۔ وہ جائیداد اسے وراثت میں ملی ہو یا اس

نے کمائی کر کے خود خریدی ہو، یہ تفریق درست نہیں کہ وہ ترکہ تقسیم کیا جائے گا جو اسے وراثت میں ملا ہے اور جو اس نے خود خریدا ہے وہ تقسیم نہیں ہوگا۔

اس وضاحت کے بعد ہم اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں، جو بیوی لاولد ہے، وہ بھی ترکہ کی حق دار ہے۔ ایک بیوی یا متعدد بیویوں کے لیے میت کی اولاد ہونے کی صورت میں آٹھواں حصہ ہے، متعدد بیویاں اسی آٹھویں حصہ کو تقسیم کرنے کی مجاز ہوں گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ﴾ 1

''ان بیویوں کے لیے آٹھواں حصہ ہے اگر میت کی اولاد ہے۔''

مقررہ حصہ نکالنے کے بعد باقی ترکہ اولاد میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک لڑکے کو لڑکی سے دوگنا حصہ ملے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ﴾ 2

''اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے متعلق تمہیں حکم دیتا ہے کہ مذکر کو دو عورتوں کے برابر حصہ دیا جائے۔''

سہولت کے پیش نظر جائیداد کے آٹھ حصے کر لیے جائیں، ان میں آٹھواں حصہ یعنی ایک دونوں بیویوں کو اور باقی سات حصے اس طرح تقسیم ہوں گے کہ دو حصے فی لڑکا اور ایک ایک حصہ لڑکی کو دے دیا جائے۔ مرحوم نے جو آٹھ کنال رقبہ بڑے بیٹے کو دے دیا ہے وہ جائز نہیں ہے، وہ جائیداد میں شامل کر کے ایک ایک کنال دونوں بیویوں کو پھر چار چار کنال دونوں لڑکوں کو اور دو، دو کنال تینوں لڑکیوں کو دی جائیں۔

درج ذیل صورت کے مطابق تقسیم کیا جائے:

میت

لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکا	لڑکا	بیوی	بیوی
2 کنال	2 کنال	2 کنال	4 کنال	4 کنال	1 کنال	1 کنال

مسئلہ وراثت

] میری پھوپھی کے خاوند لاولد فوت ہوئے، ان کے پاس آٹھ ایکڑ زمین تھی جو انہیں اپنے باپ کی طرف سے ملی تھی، لیکن وہ اسے اپنے نام نہ کرا سکے کہ اچانک فوت ہو گئے، اب وہ زمین اس کے چچا کاشت کرتے ہیں، کیا اس زمین سے میری پھوپھی کو کوئی حصہ ملتا ہے، اگر ملتا ہے تو اس کی مقدار کیا ہے؟

[انسان جب فوت ہوتا ہے، تو اس کی تمام متروکہ جائیداد اس کے شرعی ورثاء کو منتقل ہو جاتی ہے اور وہ اس کے

! النساء:١٢.   @ النساء:١١.

وارث بن جاتے ہیں، کاغذات میں اس کے نام استعمال ہونا یہ ایک قانونی مسئلہ ہے شرعی نہیں۔

صورت مسئولہ میں پھوپھی کے خاوند کو باپ کی طرف سے وراثت کے طور پر جو زمین ملی ہے وہ اس کا شرعی وارث اور مالک تھا خواہ اس نے اپنے نام منتقل نہی کرائی، اس سے اس کے مالک نہ بننے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب اس کی وفات کے بعد وہ زمین اس طرح تقسیم ہوگی کہ اس کی بیوہ کو چوتھا حصہ ملے گا کیوں کہ وہ لا ولد فوت ہوا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ﴾ 1

”اور جو ترکہ تم چھوڑ جاؤ، اس میں ان (بیویوں) کے لیے چوتھائی ہے اگر تمہاری اولاد نہ ہو۔“

بیوہ کو چوتھا حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ چچاؤں کے لیے ہے کیوں کہ وہ اس کے قریبی رشتہ دار ہیں۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

”مقررہ حصے، ان کے حق داروں کو دو اور جو باقی بچے وہ میت کے قریبی رشتہ دار کے لیے ہے۔“ 2

سہولت کے پیش نظر میت کی جائیداد کو چار حصوں میں تقسیم کر لیا جائے، ایک حصہ بیوہ کو دینے کے بعد باقی تین حصوں کے مالک اس کے چچا ہیں۔ چونکہ میت کی جائیداد 8 ایکڑ زرعی زمین ہے، اس سے ان کا چوتھائی یعنی 2 ایکڑ بیوہ کو اور باقی 6 ایکڑ ان کے چچاؤں کے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ مرنے کے بعد جائیداد کی تقسیم جلدی کر لینی چاہیے کیوں کہ اس میں دیر کرنے سے کئی ایک خطرات اور مفاسد جنم لے لیتے ہیں، پھر یہ دنیا کا مال دنیا میں رہ جائے گا، انسان کے ساتھ اس کا عمل اور کردار جائے گا۔ اس لیے دنیاوی مال و متاع کی وجہ سے اپنے اخلاق و کردار کو خراب نہ کیا جائے۔ یہ بھی بات ذہن میں رہے کہ تقسیم عدل و انصاف سے عمل میں لائی جائے۔ شرعی ورثاء کو تھوڑا بہت دے کر مطمئن کرنے کی کوشش نہ کی جائے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے شرعی ورثاء کے حصص بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾ 3

”یہ حدیں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ ہیں، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا اسے اللہ تعالیٰ جنتوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرے گا اسے وہ جہنم میں ڈال دے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، ایسے لوگوں کے لیے ہی رسوا کن عذاب ہوگا۔“

ان آیات کی روشنی میں ہم اپنے قارئین کو نصیحت کرتے ہیں کہ دنیا کی خاطر اپنی آخرت کو تباہ نہ کیا جائے اور ہر ایک

! النساء:۱۲.   @ بخاری، الفرائض: ۶۷۳۵.

النساء: ۱۳، ۱۴.

وارث کا جو حق بنتا ہے وہ پورا پورا ادا کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

والد سے اپنا شرعی حصہ طلب کرنا

] میرا بیٹا جوان ہے لیکن وہ نہ پڑھتا ہے اور نہ ہی میرے ساتھ کام کاج میں ہاتھ بٹاتا ہے، بلکہ آئے دن وہ مجھ سے اپنے شرعی حق کا مطالبہ کرتا رہتا ہے، کیا مجھے اس کا وراثتی حصہ دے دینا چاہیے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[جب تک انسان زندہ ہے، وہ اپنے مال کا خود مالک ہے، اور اس میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنے کا حق رکھتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

"یہ انسان اپنے مال میں تصرف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہے، وہ اسے جہاں چاہے جیسے چاہے استعمال کرسکتا ہے۔" 1

اس حدیث کے مطابق باپ کو یہ حق ہے کہ وہ شریعت کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے اپنے مال کو استعمال میں لائے یا کسی کو عطیہ دے، لیکن اولاد کو عطیہ دینے کی چند ایک شرائط حسب ذیل ہیں:

☆ عطیہ دیتے وقت تقسیم ضابطہ میراث کے مطابق نہیں ہوگی کیوں کہ وراثت ایک غیر اختیاری حق ملکیت ہے جو ورثاء کو اس کے مرنے کے بعد منتقل ہو جاتا ہے جبکہ یہ ابھی زندہ ہے اور اپنے اختیار وارادہ سے اپنا حق ملکیت آگے منتقل کرتا ہے۔ نیز تقسیم وراثت کی تین شرائط ہیں:

☆ میت کی موت کا یقینی ہونا ☆ میت کی موت کے وقت وارث کا زندہ ہونا

☆ وراثت کے موانع کا نہ پایا جانا

زندگی میں ضابطہ میراث کے مطابق تقسیم کرنا اس لیے ناجائز ہے کہ اس میں مذکورہ بالا شرائط میں سے پہلی شرط نہیں پائی جاتی۔ نیز اگر تقسیم کرتا تو زندگی میں کسی وارث کے مرنے کی صورت میں دوسروں پر ظلم ہوگا کیوں کہ مرنے والے کو بلا استحقاق اس کا حصہ مل جاتا ہے جو سراسر زیادتی ہے۔

☆ عطیہ دیتے وقت اپنی اولاد میں لڑکے اور لڑکی کا لحاظ کیے بغیر مساویانہ مال تقسیم کرے۔

چنانچہ امام بخاری a فرماتے ہیں:

"اگر باپ اپنی اولاد میں سے کسی کو کچھ دیتا ہے تو اسے جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، تا آنکہ وہ عدل وانصاف سے کام لیتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کے برابر حصہ دے۔" 2

پھر امام بخاری a نے بطور دلیل ایک حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

! بیہقی، ج۶، ص ۷۸.

@ بخاری، باب الہبہ نمبر ۱۲.

’’عطیہ دیتے وقت اپنی اولاد کے درمیان انصاف سے کام لو۔‘‘ 1

کچھ اہل علم حدیث میں عدل و انصاف سے مراد ضابطہ میراث لیتے ہیں، یہ معنی سراسر غلط ہے کیوں کہ مساوات کا یہ معنی قطعاً نہیں بلکہ یہ تو رسول اللہ e کے درج ذیل فرمان کے خلاف ہے:

’’عطیہ دیتے وقت اپنی اولاد کے درمیان برابری کیا کرو، اگر میں کسی کو زیادہ دینا چاہتا تو عورتیں اس بات کی زیادہ حق دار ہیں کہ انہیں دوسروں سے زیادہ دیا جائے۔‘‘ 2

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ والد اندیشہ فساد کے پیش نظر اپنی زندگی میں تمام جائیداد تقسیم کر دیتا ہے، پھر وہ خود اپنے بچوں کا دست نگر بن جاتا ہے اور بچے اس کے ساتھ بہت ہی ناگفتہ بہ سلوک کرتے ہیں۔ اگر جائیداد باپ کے ہاتھ میں ہوگی تو کم از کم بچوں کی بدسلوکی سے تو محفوظ رہے گا۔

☆ والد کے ذمے یہ از حد ضروری ہے کہ وہ اپنے بچوں کی ضروریات کو پورا کرے، اس میں قطعاً مساوات نہیں ہوسکتی، کیوں کہ کسی بچے کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، اور کسی کی کم ہوتی ہے، حتی کہ شیر خوار کی ضرورت صرف دودھ پینا ہے، لیکن ضروریات سے تجاوز کر کے فضولیات کو پورا کرنا گناہ ہے۔

ہمارے نزدیک اپنی زندگی میں پوری جائیداد تقسیم کرنا فضولیات ہے، اس سے گریز کرنا چاہیے۔

بہر حال میراث انسان کے مرنے کے بعد تقسیم ہوتی ہے، زندہ لوگوں کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، نیز والدین یا اولاد میں سے کون دوسرے کا وارث بنے گا، اس بات کا علم اللہ عزوجل کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں، البتہ والد کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ محدود پیمانے پر اپنی اولاد کو عطیہ دے اور عطیہ دیتے وقت سابقہ شرائط کو ملحوظ رکھے۔

یہ بھی یاد رہے کہ عطیہ دینے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا مگر دور حاضر کی نسل خود کمانے کی بجائے والد کو تقسیم جائیداد پر مجبور کرتی ہے اور اگر والد تقسیم نہیں کرتا تو اسے حیلے بہانے سے تنگ کیا جاتا ہے جبکہ ایسا کرنا نافرمانی بھی ہے اور ناحق دوسرے کا مال کھانا بھی ہے۔ صورت مسئولہ میں بیٹے کا باپ کی زندگی میں اپنے ’’شرعی حق‘‘ کا مطالبہ کرنا ناجائز ہے اور نہ ہی اس کا کوئی شرعی حق بنتا ہے۔ واللہ اعلم!

بیٹیوں کو چھوڑ کر صرف بیٹوں کو کاروبار ہبہ کرنا

] میرے والد کی دو بیویاں، نو بیٹیاں اور پانچ بیٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنا صابن کا کاروبار بیٹوں کے نام ہبہ کر دیا اور باقی ترکہ کے متعلق کہا کہ اسے بطور وراثت تقسیم کر لیا جائے۔ ہم نے والد کی وفات کے بعد بہنوں کو ان کے حصے سے زیادہ دے دیا تا کہ کاروبار سے محروم رہنے کی تلافی ہو جائے۔ کیا ہمارے والد مرحوم کا اقدام اور ہمارا عمل کتاب و سنت کے مطابق ہے؟

! بخاری، الھبہ: ۲۵۸۷۔ @ بخاری، الوصایا: ۲۷۴۲۔

[کتاب وسنت کے مطابق والد مرحوم کا اقدام اور آپ کا عمل دونوں ہی محل نظر ہیں۔ کیوں کہ باپ اپنی زندگی میں بیٹیوں کو نظر انداز کر کے بیٹوں کو کوئی چیز ہبہ نہیں کر سکتا۔

چنانچہ سیدنا نعمان بن بشیر t کہتے ہیں کہ مجھے میرے باپ نے ایک غلام بطور ہبہ دیا، میری والدہ عمرہ بنت رواحہ t کہنے لگیں کہ میں اس پر رسول اللہ e کو گواہ بنانا چاہتی ہوں۔ وہ رسول اللہ e کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں نے اپنے بیٹے نعمان کو ایک غلام بطور ہبہ دیا تھا اور آپ کو اس پر گواہ بنانا چاہتا ہوں۔ رسول اللہ e نے فرمایا؛

''کیا تو نے اپنے تمام بچوں کو اس طرح کا تحفہ دیا ہے؟''

انہوں نے عرض کیا، میں نے تمام بچوں کو اس طرح کا تحفہ نہیں دیا۔

رسول اللہ e نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل کیا کرو۔'' اس کے بعد انہوں نے وہ غلام واپس لے لیا۔'' 1

عطیہ کی صورت میں لڑکی اور لڑکے کا لحاظ کیے بغیر اپنی اولاد میں مساویانہ طور پر مال تقسیم کرنا ہوتا ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا درج ذیل فرمان ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے:

''عطیہ دیتے وقت اپنی اولاد کے درمیان برابری کیا کرو، اگر (کسی کی کمزوری کے پیش نظر) میں کسی کو زیادہ دینا چاہتا تو عورتیں اس بات کی زیادہ حق دار تھیں کہ انہوں دوسروں سے زیادہ دیا جائے۔'' 2

رسول اللہ e کے اس ارشاد کے پیش نظر مرحوم کا زندگی میں صرف بیٹوں کو کاروبار کا ہبہ دینا درست نہیں اور اولاد کا عمل اس لیے محل نظر ہے کہ انہوں نے بہنوں کو دوسرے ورثاء کے حصے کاٹ کر زیادہ دیا ہے، یہ عمل بھی صحیح نہیں۔ اب اس کا حل یہ ہے کہ کاروبار کو بھی دوسری جائیداد کی طرح ترکہ میں شامل کیا جائے اور اسے حاصل ہونے والے منافع تمام ورثاء کو بقدر حصہ دیئے جائیں۔ ورثاء کے حصے مندرجہ ذیل ہیں:

دونوں بیویوں کو دے کر باقی پانچ بیٹیوں اور نو بیٹوں میں تقسیم کیا جائے۔ سہولت کے پیش نظر کل جائیداد کاروبار سمیت 304 حصے کیے جائیں۔ 19 حصے ایک بیوی کو، 19 حصے دوسری بیوی کو 28 حصے ایک بیٹے کو اور 14 حصے ہر لڑکی کو دیئے جائیں۔

بیویوں کا حصہ	19 × 2 = 38
لڑکوں کا حصہ	28 × 5 = 140
لڑکیوں کا حصہ	14 × 9 = 126
مجموعی حصص	= 304

! بخاری، الطهارات: ۲۶۵۰. @ بیہقی، ج۶، ص۱۷۷.

اس تفصیل کے مطابق جائیداد اور کاروبار کے حاصل ہونے والے منافع کو تقسیم کر لیا جائے، جو لڑکے کاروبار میں براہ راست شریک ہیں، ان کا حق الخدمت الگ سے طے کیا جائے۔ کاروبار میں اٹھنے والے اخراجات میں اس حق الخدمت کو بھی شامل کر کے صافی منافع کو درج بالا حصص کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ چونکہ والد صاحب کے اقدام سے اس کی بیٹیوں اور بیویوں کی حق تلفی ہوئی ہے، اس لیے اس کی تلافی کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ 1

''اگر وصیت کنندہ کی طرف سے کسی کی طرفداری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو تو معاملہ سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان کوئی اصلاح کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں۔''

اس آیت کے پیش نظر مرحوم باپ کے غلط اقدام کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم!

1 البقرہ: ۱۸۲۔

نکاح شغار (نکاح وٹہ سٹہ)

] ہماری برادری میں نکاح وٹہ سٹہ کا بہت رواج ہے، اس کے متعلق شرعی حکم کی وضاحت کریں، کیا اگر حق مہر رکھ لیا جائے تو بھی وٹہ بن جاتا ہے؟

[نکاح وٹہ سے رسول اللہ e نے بڑی صراحت کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

چنانچہ حضرت ابن عمر r سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے نکاح وٹہ سے منع فرمایا ہے۔ 1

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''اسلام میں وٹہ سٹہ کی شادی نہیں۔'' 2

رسول اللہ e نے نکاح وٹہ کی صورت یہ بیان فرمائی ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی یا بہن کا رشتہ کسی سے اس شرط پر کرے کہ وہ اپنی بیٹی یا بہن کا رشتہ اس سے کر دے گا، آپ نے اس سلسلہ میں حق مہر کا ذکر نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ممانعت عام ہے، حق مہر ہو یا نہ ہو دونوں صورتوں میں منع ہے اور جس تعریف میں حق مہر نہ ہونے کا ذکر ہے وہ حضرت نافع کی تفسیر ہے، رسول اللہ e کے الفاظ نہیں ہیں۔

چنانچہ ایک حدیث میں اس کی مزید وضاحت ہے کہ امیر مدینہ نے حضرت امیر معاویہ t کی طرف لکھا کہ دو آدمیوں نے نکاح شغار کیا ہے اور مہر بھی مقرر کیا ہے۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ تو امیر معاویہ t نے انہیں جواب لکھا کہ ان میں تفریق کرا دی جائے کیوں کہ یہ وہی شغار ہے جس سے رسول اللہ e نے منع فرمایا ہے۔ 3

نکاح وٹہ اس لیے بھی منع ہے کہ اس میں سرپرست کی طرف سے عورتوں پر ظلم کیا جاتا ہے، انہیں شادی پر مجبور کیا جاتا ہے خواہ وہ اسے ناپسند کرتی ہوں، اس نکاح میں عورتوں کو ایک سودا سلف کی حیثیت دی جاتی ہے، عورت کی مرضی اور رغبت کا اس میں کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ معاشرتی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک عورت کو کسی قصور کی وجہ سے سزا مل جاتی ہے تو دوسری کو بے قصور ہونے کے باوجود اس کے کٹھن مرحلہ سے گزرنا پڑتا ہے، چنانچہ ہمارے ہاں حالات و واقعات سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

! صحیح بخاری، النکاح: ۵۱۱۲.   @ صحیح مسلم، النکاح:۳۴۶۸.

مسند امام احمد، ص: ۹۴، ج۴.

مطلقہ بیوی کی بہن سے نکاح کرنا

] میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر اپنی زوجیت سے فارغ کر دیا ہے لیکن ابھی اس کی عدت ختم نہیں ہوئی، ایسے حالات میں کیا میرے لیے جائز ہے کہ میں اس کی بہن سے نکاح کرلوں، کتاب وسنت سے اس سلسلہ میں کیا راہنمائی ملتی ہے؟

[ہمارے ہاں مشہور ہے کہ بیوی کو طلاق دیتے ہی نکاح ٹوٹ جاتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ طلاق دینے کے بعد عدت کے دوران وہ اس کی بیوی رہتی ہے۔ اگر وہ فوت ہو جائے تو خاوند کو اس کی جائیداد سے حصہ ملتا ہے۔ اسی طرح اگر دوران عدت خاوند فوت ہو جائے تو وہ مطلقہ بیوی اپنے فوت شدہ خاوند سے جائیداد کی حق دار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مطلقہ بیوی سے دوران عدت بلاتجدید نکاح رجوع کرنے کی اجازت دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا﴾ 1

''(جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو) ان کے شوہر اگر تعلقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں تو وہ اس عدت کے دوران میں انہیں پھر اپنی زوجیت میں واپس لے لینے کے حق دار ہیں۔''

یہ حکم صرف اس صورت میں ہے جس میں شوہر نے عورت کو ایک یا دو طلاقیں دی ہوں، اس صورت میں طلاق رجعی ہوتی ہے، لیکن تیسری طلاق کے بعد رجوع کا حق باقی نہیں رہتا۔ مقصد یہ ہے کہ پہلی یا دوسری طلاق کے بعد دوران عدت مطلقہ بیوی، اس کی بیوی ہی رہتی ہے، لہٰذا اس دوران بیوی کی بہن سے نکاح کرنا جائز نہیں۔ کیوں کہ قرآن میں ہے:

﴿وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ﴾ 2

''اور یہ (حرام ہے) کہ تم دونوں بہنوں کو جمع کرو۔''

ہاں اگر اس کی عدت ختم ہو جائے اور زوجیت کا تعلق بھی ختم ہو جائے تو اس صورت میں اس کی بہن سے نکاح کیا جا سکتا ہے، قرآن وحدیث سے اس کے متعلق کوئی ممانعت نہیں۔ بہرحال بیوی کو رجعی طلاق دینے کے بعد دوران عدت اس کی بہن سے نکاح کرنے کی حرمت میں اجماع ہے۔

بیویوں کے اخراجات

] میں ایک مسلمان خاتون ہوں، میرے لیے ایک غریب مسلمان کا رشتہ آیا ہے جب کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے، لیکن اس کے مالی حالات بہت کمزور ہیں، امید نہیں کہ وہ میرے اخراجات برداشت کر سکے، ایسے حالات میں مجھے اس سے شادی کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

[اللہ تعالیٰ نے مرد کو دوسری شادی کرنے کے لیے مشروط اجازت دی ہے کہ وہ نان ونفقہ، رہائش اور بیویوں کے درمیان عدل وانصاف کر سکتا ہو، اگر مرد کو علم ہے کہ وہ اس شرط کو پورا نہیں کر سکے گا تو اسے دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں۔ شیخ الاسلام

! البقرہ: ۲۲۸. @ النساء: ۲۳.

ابن تیمیہ h لکھتے ہیں: ’’رسول اللہ e کی اقتداء کرتے ہوئے بیویوں کے درمیان نان ونفقہ اور رہائش ولباس میں برابری اور عدل وانصاف سے کام لینا مسنون ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ e بھی اپنی بیویوں کے درمیان نان ونفقہ اور تقسیم میں عدل و انصاف کرتے تھے۔ 1 قرآن کریم بھی بیویوں کے اخراجات کے متعلق ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۭ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝ ﴾ 2

’’خوشحال آدمی اپنی خوش حالی کے مطابق نفقہ دے اور جسے رزق کم دیا گیا ہو وہ اس مال میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کو جتنا کچھ دیا ہے اس سے زیادہ کا وہ اسے مکلف نہیں کرتا، بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ تنگ دستی کے بعد فراخی عطا فرمائے۔‘‘

ان آیات واحادیث کی روشنی میں ہم نصیحت کرتے ہیں کہ اگر سائلہ اس غریب شخص کے فقر وتنگی پر صبر کرسکتی ہے تو ایسے شخص سے شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ وہ دین دار اور اچھے اخلاق وکردار کا مالک ہو، اللہ تعالیٰ نے شادی کرنے والے غریب شخص سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے فضل سے اسے غنی کردے گا۔ 3

لیکن اگر سائلہ اس پر صبر نہیں کرسکے تو وہ اس سے شادی نہ کرے۔ جیسا کہ سیدہ فاطمہ بنت قیس r کو جب سیدنا معاویہ t نے شادی کا پیغام دیا تو رسول اللہ e نے انہیں شادی نہ کرنے کا مشورہ دیا کہ وہ تنگ دست ہے اور اس کے پاس مال بھی نہیں۔ 4 بہر حال ایسے حالات میں ہمارے بیان کردہ حقائق کے پیش نظر خود فیصلہ کرے کہ وہ غریب مسلمان مرد سے شادی کرے یا نہ کرے جب کہ وہ پہلے سے شادی شدہ بھی ہے۔ واللہ اعلم!

گرین کارڈ کے لیے پیپر میرج

] ہمارے ہاں اکثر لوگ گرین کارڈ کے حصول کے لیے مغربی ممالک کا رخ کرتے ہیں اور وہاں جاکر کاغذی طور پر ایسی عورت سے شادی کرلیتے ہیں جسے وہاں کی شہریت حاصل ہوتی ہے تاکہ نکاح کرنے والے کو گرین کارڈ کے حصول میں سہولت رہے، کیا ایسا کرنا شرعا جائز ہے؟

[اسلام میں نکاح کے جو مقاصد ہیں وہ متعین ہیں، ان میں سرفہرست حسن معاشرت ہے اور ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھنا ہے۔ صورت مسئولہ میں نکاح کرتے وقت اس طرح کے مقاصد پیش نظر نہیں ہوتے۔ لہٰذا ایک مسلمان کے لیے ایسے اقدامات جائز نہیں جن کی شریعت میں گنجائش نہ ہو۔ گرین کارڈ کے حصول کے لیے اس طرح کا فریب کرنا شرعاً جائز نہیں۔ نیز اس میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ عورت ماہانہ ’’وظیفہ‘‘ کے لالچ میں کئی ایک لوگوں سے نکاح کا ڈھونگ رچالیتی ہے تاکہ اسے

! مجموع الفتاویٰ: ج۳۲،۲۶۹. @ الطلاق: ۷.
النور:۳۲. $ مسلم، الطلاق:۱۴۸.

وظیفہ ملتا رہے۔ بعض ایسے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں کہ اس طرح کا نکاح کرنے والے ایک دوسرے سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں اور انہوں نے نکاح کے بعد ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں ہوتا، محض کاغذی کاروائی کی ہوتی ہے جو انٹرنیٹ پر مکمل کر لی جاتی ہے۔ نکاح کرنے والے کا مقصد گرین کارڈ کا حصول اور عورت کا مقصد صرف ماہانہ وظیفہ حاصل کرنا ہے، حسن معاشرت یا خاندان کی بنیاد کا دور دور تک کوئی نشان نظر نہیں آتا۔

لہٰذا ہمارے رجحان کے مطابق اس طرح کا دھندا شرعاً ناجائز ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

ذاتی مفاد کے لیے نکاح کرنا

] میں بیرون ممالک زیر تعلیم ہوں، میں نے شادی الاؤنس کے لیے ایک لڑکی سے نکاح کیا ہے لیکن میری نیت شادی کی نہیں تھی، میں نے یہ نکاح گواہوں کی موجودگی، لڑکی کے والدین اور اپنے والدین کی رضامندی سے کیا ہے، اس قسم کے نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

[جب نکاح کے تمام ارکان اور شرائط پائی جائیں اور ایجاب وقبول ہو جائے تو نکاح واجب ہو جاتا ہے خواہ نکاح کرنے والے کی نیت ذاتی مفادات کا حصول ہی کیوں نہ ہو، اس قسم کی نیت کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

احناف، شوافع، حنابلہ اور مالکی حضرات اس قسم کے نکاح کو صحیح قرار دیتے ہیں خواہ ہنسی و مذاق میں ہی کیوں نہ ہو۔

ان حضرات کی دلیل رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''تین باتیں ایسی ہیں جنہیں اگر سنجیدگی سے کیا جائے تو بھی پختہ ہیں، اور اگر مذاق میں کیا جائے تو بھی پختہ ہیں:

ایک نکاح، دوسری طلاق اور تیسرا رجوع۔'' 1

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ تینوں کام حقیقی طور پر سنجیدگی سے کیے جائیں تو حقیقت پر مبنی ہوں گے اور اگر بطور مذاق کیے جائیں تو بھی حقیقت ہی ہوں گے۔ ہمارے رجحان کے مطابق سوال میں مذکورہ نکاح حقیقت پر مبنی ہے اور اسے واجب قرار دیا جائے گا، اگرچہ نکاح کرنے والے کی نیت ذاتی مفادات کا حصول تھا۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ a لکھتے ہیں: ''عام علماء کے ہاں مذاق میں طلاق دینے والے کی طلاق بھی واقع ہو جائے گی اور اسی طرح اس کا نکاح بھی صحیح ہے کہ مرفوع حدیث کے متن میں بھی اس کا ذکر ہے۔ صحابہ کرام y اور تابعین عظام کا مؤقف بھی یہی ہے اور مشہور اہل علم نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔ 2

طلاق اور خلع میں فرق

] بعض دفعہ عدالت، عورت کے حق میں خلع کی ڈگری جاری کر دیتی ہے جبکہ خاوند نے اسے طلاق نہیں دی ہوتی، اس خلع اور طلاق میں فرق واضح کریں، کیا خلع کی صورت میں خاوند کا طلاق دینا ضروری نہیں؟

! ابو داؤد، الطلاق: ۲۱۹۴۔ @ مجموع الفتاویٰ، ص ۶۳، ج۶۔

[جب عورت کسی وجہ سے اپنے خاوند کے پاس نہ رہنا چاہتی ہو اور خاوند اسے طلاق نہ دے تو اسے بذریعہ عدالت خلع لینے کا حق ہے خواہ خاوند اسے طلاق نہ بھی دے۔ عدالت کی طرف سے خلع کی ڈگری ہونے کے بعد عورت آزاد ہے۔ خلع اور طلاق میں درج ذیل فرق ہے:

☆ طلاق دینا مرد کا حق ہے جبکہ خلع لینا عورت کا حق ہے۔

☆ خلع میں خاوند کو رجوع کا حق نہیں ہوتا جبکہ طلاق رجعی میں اسے رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔

☆ طلاق میں عدت تین حیض ہے جبکہ خلع میں عدت ایک حیض ہے۔

☆ طلاقوں کی تعداد تین ہے، جب آخری طلاق ہو جائے تو عورت مرد کے لیے حلال نہیں ہوگی، جبکہ خلع کے بعد نکاح تو ختم ہو جاتا ہے لیکن نئے نکاح سے دوبارہ تعلقات بحال ہو سکتے ہیں۔ بہر حال خلع، عورت کا حق ہے وہ اسے جب چاہے استعمال کر سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

ماضی خراب لڑکے سے شادی

] میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہوں اور شادی کے مرحلہ میں داخل ہو چکی ہوں۔ میرے لیے جو رشتے آتے ہیں، ان کا ماضی انتہائی داغدار ہے۔ اگرچہ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ ماضی کو خیر باد کہہ چکے ہیں، لیکن میں ان کے ماضی کو دیکھ کر تذبذب کا شکار ہوں، رہنمائی فرمائیں۔

[نکاح کے متعلق رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''جب تمہارے پاس کوئی شخص نکاح کا پیغام بھیجے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اس سے نکاح کر دو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بہت بڑا فساد ہوگا۔'' 1

اس حدیث کے پیش نظر نکاح کے لیے اچھے کردار کے حامل انسان کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اگر کسی انسان کا ماضی داغدار تھا اور اس نے توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لی ہے تو اس کے ساتھ نکاح کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔

حدیث میں ہے: ''گناہوں سے توبہ کرنے والا تو ایسے ہے جسے اس کا کوئی گناہ ہی نہ ہو۔'' 2

اس قسم کے رشتے کو اس لیے رد کر دینا کہ اس کا ماضی داغدار تھا، عقلمندی نہیں۔ ہاں اس امر کی تحقیق کر لی جائے کہ واقعی اس میں تبدیلی آچکی ہے اور وہ اپنے ماضی سے توبہ کر چکا ہے؟ نیز وہ برائی کو چھوڑ چکا ہے تو اس کے کہنے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم اپنے اسلاف صحابہ کرام y کو دیکھتے ہیں کہ ان میں اکثر دور جاہلیت میں شرک جیسے جرم میں مبتلا تھے، شراب نوشی اور حرام خوری کے خوگر تھے لیکن جب مسلمان ہوئے اور اپنے ماضی سے تائب ہو گئے نیز اپنے اسلام پر اچھی طرح کاربند رہے تو انہوں نے شادیاں کیں، دوسروں سے رشتے ناطے کیے لیکن انہیں اس لیے رد نہیں کیا گیا کہ ان کا ماضی داغدار تھا۔

! ترمذی، النکاح: ۱۰۳۴.   @ ابن ماجہ، الزہد: ۴۳۵۰.

بہرحال مرد کی اس حالت کا اعتبار کیا جائے گا جس پر وہ موجودہ وقت میں کاربند ہے۔لیکن اگر کسی شخص کا ماضی شر وفساد سے آلودہ ہے اور اس نے ان کاموں کو ترک نہیں کیا جن سے اس کا کردار داغدار ہوا ہے تو ایسے شخص کے ظاہری قول واقرار کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ کسی مسلمان، دیندار خاتون سے شادی کا سزاوار ہے۔

بیوی کا بلاوجہ اپنے والدین کے ہاں جانا

] میری بیوی، میری اجازت کے بغیر اپنے میکے چلی گئی اور وہاں والدین کی تیمارداری کے بہانے مستقل قیام رکھے ہوئے ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اسے اپنے گھر لاؤں لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں، ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میری رہنمائی فرمائیں۔

[اللہ تعالیٰ نے خاندانی نظام کو یکجا اور جوڑنے کے لیے رہنما اصول بیان فرمائے ہیں جبکہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ اسے ہر طرح سے سبوتاژ کر دیا جائے وہ چاہتا ہے کہ بیوی اور خاوند کے درمیان علیحدگی ہو جائے۔قرآن وحدیث میں جادو کے نقصانات بیان ہوئے ہیں وہاں میاں بیوی کے درمیان علیحدگی برسرفہرست ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ﴾ 1

''لوگ ان سے ایسا جادو سیکھتے ہیں جس سے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیں۔''

قرآن کریم نے میاں بیوی کی ناچاقی کی صورت میں ایک حل پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

﴿وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَاۤ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا۝۳۵﴾ 2

''اور اگر تم لوگوں کو میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کریں، وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا۔''

آیت کریمہ میں ''دونوں'' سے مراد ثالث بھی ہیں اور میاں بیوی بھی، ہر جھگڑے میں صلح کا امکان ہے بشرطیکہ فریقین بھی صلح پسند ہوں اور درمیان میں آنے والے بھی چاہتے ہوں کہ فریقین میں کسی طرح صلح ہو جائے۔اس دوران خاوند کو چاہیے کہ وہ نرمی اور بردباری سے کام لے، نیز خود کا محاسبہ کرتے ہوئے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو تلاش کرے، بہت سے ایسے خاندان ہیں جو تباہی اور بربادی کے کنارے پہنچ کر خوشی ومسرت کی طرف لوٹ آتے ہیں، ہمیں آپ سے بھی یہی توقع ہے۔ان شاءاللہ!

نکاح کے وقت کوئی شرط رکھنا

] کیا نکاح کے وقت یہ شرط رکھی جا سکتی ہے کہ ہماری لڑکی کو کسی دوسرے ملک نہیں لے جائے گا بلکہ اسے اپنے ملک میں ہی رکھے گا؟ وضاحت فرما دیں۔

@ البقرہ: ۱۰۲.	# النساء: ۳۵.

[امام بخاری نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''نکاح میں شرط رکھنا۔'' 1

پھر رسول اللہ e کا ارشاد نقل کیا ہے، آپ e نے فرمایا:

''تم پر ضروری ہے کہ تم ان شرائط کو پورا کرو جن کے ذریعے تم نے عورتوں کی شرمگاہ کو اپنے لیے حلال کیا ہے۔'' 2

اس حدیث کی بناء پر نکاح کے وقت (سوال میں ذکر کردہ) شرط رکھی جاسکتی ہے جس کی پابندی کرنا ضروری ہے۔ البتہ ناجائز شرط رکھنا درست نہیں اور نہ ہی اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ واللہ اعلم!

خاوند کی اطاعت

] میرا یہ سوال ہے کہ شادی کے بعد عورت کو اپنے خاوند کی اطاعت کو کیوں ضروری قرار دیا گیا ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کا کیا ثبوت ہے؟

[شادی کے بعد میاں بیوی کو شریعت کے مطابق زندگی گزارنا ضروری ہے۔ ایسے حالات میں اختلاف رائے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اب اس اختلاف کو ختم کرنے کے لیے کس فریق کو اتھارٹی ہونی چاہیے، قرآن کریم نے یہ اختیار خاوند کو دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾ 3

''مرد، عورتوں کے جملہ معاملات کے ذمہ دار اور منتظم ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے اور اس لیے بھی کہ وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔''

نیز رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''مرد اپنے اہل بیت پر حکمران ہے۔'' 4

واضح رہے کہ خاوند کی اطاعت مطلق نہیں بلکہ اسے مشروط رکھا گیا ہے کہ خاوند کی بات ماننے میں شریعت کی خلاف ورزی نہ ہو۔ چنانچہ امام بخاری a ایک باب بایں الفاظ قائم کیا ہے۔ ''گناہ اور معصیت میں بیوی، اپنے خاوند کی اطاعت نہیں کرے گی۔'' 5 بہر حال اس اطاعت کے لزوم کے کئی ایک اسباب ہیں:

☆ مردوں میں تفویض کردہ ذمہ داری کو نبھانے کی زیادہ قدرت ہوتی ہے۔

☆ دین اسلام میں مرد، عورت کے تمام اخراجات کا ذمہ دار ہے۔

اس سلسلہ میں درج ذیل چند باتوں کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

☆ بیوی کو اپنے خاوند کی اطاعت کرنے میں اللہ تعالیٰ سے اجر ملے گا۔

! بخاری، النکاح، باب ۵۳۔ @ بخاری، النکاح: ۵۱۵۱۔
النساء: ۳۴۔ $ بخاری، النکاح: ۵۲۰۰۔
% بخاری، النکاح، باب:۹۵۔

☆ جس طرح خاوند کا بیوی پر حق ہے، اسی طرح اسے بیوی کے ساتھ اچھے برتاؤ کا حکم ہے۔

خاوند کو چاہیے کہ وہ اپنے اختیارات کا غلط استعمال نہ کرے اور حکمت و دانائی کے ساتھ معاملات کو چلائے۔ نیز وہ سختی اور بداخلاقی سے اجتناب کرے۔ واللہ اعلم!

بیٹے کی غیر مدخولہ بیوی سے نکاح

] میں نے اپنے بیٹے کا نکاح کسی لڑکی سے کیا، ابھی رخصتی نہ ہوئی تھی کہ ناچاقی کی بناء پر اس نے اپنی منکوحہ کو طلاق دے دی، کیا اپنے بیٹے کی غیر مدخولہ بیوی سے مجھے نکاح کرنے کی اجازت ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[قرآن کریم نے ایسی عورتوں کی تفصیل بیان کی ہے جن سے نکاح کرنا حرام ہے، ان میں سے وہ عورت بھی ہے جو بیٹے کی منکوحہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ﴾ 3

''اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں (بھی حرام ہیں) جو تمہاری صلب سے ہوں۔''

اس قرآنی آیت سے معلوم ہوا کہ حقیقی بیٹا اگر کسی عورت سے نکاح کرے اور وہ اس کی بیوی بن جائے تو باپ کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ خواہ اس کی رخصتی ہوئی یا رخصتی سے پہلے اسے طلاق مل جائے۔ بہرحال بیٹے کے نکاح کر لینے کے بعد باپ پر بہو حرام ہو جاتی ہے۔ خواہ اس کے بیٹے نے اپنی بیوی سے ہم بستری یا خلوت نہ بھی کی ہو۔ واضح رہے کہ بیٹے کی طرح پوتے اور نواسے کی بیوی بھی یہی حکم ہے کہ وہ دادا اور نانا پر حرام ہے۔ قرآن کریم میں بیٹوں کے ساتھ ﴿مِنْ اَصْلَابِكُمْ﴾ کی قید بیان ہوئی ہے یعنی وہ صلبی بیٹے ہوں، اس قید سے کچھ اہل علم نے یہ گنجائش نکالی ہے کہ رضاعی بیٹا یعنی بیوی کا دودھ پینے کی وجہ سے جو بیٹا بنا ہے اس کی منکوحہ سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ فوت ہو جائے یا وہ طلاق دے دے اور بیوی عدت پوری کر لے۔ واللہ اعلم!

حالت حمل میں طلاق

] میرے دوست نے اپنی بیوی کو بحالت حمل طلاق دی اور اپنی بیوی کو میکے بھیج دیا، جب اس نے بچہ جنم دیا تو اسے واپس لے آیا، پھر اس نے دوسری طلاق دے کر اسے میکے بھیج دیا اور اب وہ صلح کرنا چاہتے ہیں، کیا ایسا ممکن ہے؟

[ہمارے ہاں یہ مشہور ہے کہ دوران حمل دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی، حالانکہ یہ بات سرے سے غلط ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے حاملہ عورت کی عدت بیان فرمائی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اسے رجوع کر لینا چاہیے اگر اس نے طلاق دینی ہے تو اسے چاہیے کہ حالت طہر یا حالت حمل میں طلاق دے۔'' 2

صورت مسئولہ میں سائل کے دوست نے اپنی بیوی کو حمل کی حالت میں طلاق دی اور پھر بچہ پیدا ہونے کے بعد اسے اپنے گھر لا کر آباد کر لیا، کیوں کہ نکاح وغیرہ نہیں کیا حالانکہ وضع حمل کے بعد عورت کی عدت ختم ہو چکی تھی اور عدت ختم ہوتے ہی

النساء،۲۳.   @ مسلم، الطلاق: ۳۶۵۲.

اس کا نکاح بھی ختم ہو چکا تھا۔ اسے تجدید نکاح کے بعد اپنے گھر لانا چاہیے تھا، لیکن اس نے بلا تجدید نکاح رجوع کیا اور اپنے گھر میں رکھا جو شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔ پھر اس نے دوسری طلاق دے کر اسے میکے بھیج دیا، اب وہ دوبارہ رجوع کرنا چاہتا ہے، اس سلسلہ میں ہماری گزارشات حسب ذیل ہیں:

☆ چونکہ پہلے تجدید نکاح کے بغیر وہ اسے اپنے گھر لے آیا تھا حالانکہ نکاح ختم ہونے کے بعد وہ عورت اس کی بیوی نہ تھی، اس لیے دوسری طلاق دینا لغو اور فضول ہے کیوں کہ جب وہ اس کی بیوی ہی نہیں تو وہ طلاق کا محل ہی نہیں۔

☆ اب نکاح جدید کے ساتھ رجوع ہو سکتا ہے جس کی حسب ذیل چار شرائط ہیں:

☆ عورت، اس عقد جدید پر رضامند ہو۔ ☆ حق مہر بھی نیا مقرر کیا جائے۔

☆ عورت کا ولی بھی اس کی اجازت دے۔ ☆ گواہ بھی موجود ہوں۔

ان چار شرائط کے ساتھ نکاح جدید سے گھر آباد کیا جا سکتا ہے، چونکہ وہ عورت، اس کے گھر میں رہی ہے، اس لیے تجدید نکاح کے لیے اس بات کا معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کا رحم خالی ہے، اگر حمل ہے تو وضع حمل کے بعد نکاح ہو سکے گا۔ واللہ اعلم!

مہر کا حق دار کون؟

] ہمارے معاشرہ میں کچھ لوگ شادی کے موقع پر بیٹی یا بہن کا حق مہر خود رکھ لیتے ہیں اور اسے اپنی ضروریات میں صرف کر لیتے ہیں، حق مہر کے متعلق شرعی حکم کیا ہے کہ کیا بیوی کے علاوہ کوئی دوسرا اسے استعمال کر سکتا ہے؟

[دین اسلام میں مہر بیوی کا خصوصی حق ہے جو صرف اور صرف بیوی کو ہی ملنا چاہیے۔ کسی دوسرے کو اس کی اجازت کے بغیر اسے استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر معاشرے کے کچھ لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں تو وہ شریعت کی خلاف ورزی کے مرتکب ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ 1

''عورتوں کو ان کے مہر راضی خوشی ادا کرو۔''

اس آیت کے پیش نظر خاوند کے لیے ضروری ہے کہ وہ واجبی طور پر عورت کو مہر ادا کرے، ہاں اگر بیوی اپنے خاوند کو اپنے مہر میں سے کچھ معاف کرتے ہوئے دیتی ہے تو خاوند اسے استعمال کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا۝﴾ 2

''اگر وہ اپنی خوشی سے کچھ مہر چھوڑ دیں تو اسے شوق سے خوش ہو کر استعمال کر لو۔''

حق مہر کے متعلق دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ١ۙ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا١ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا۝﴾ 3

! النساء:۴. @ النساء:۴. # النساء:۲۰.

’’اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کرنا چاہتے ہو تو اگر تم نے ان میں سے کسی کو ایک خزانہ دے رکھا ہو تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو، کیا تم اسے ناحق اور کھلا گناہ کرتے ہوئے لو گے۔‘‘

حافظ ابن کثیر a اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ’’اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم کسی بیوی کو چھوڑنا چاہو اور اس کے بدلے میں کسی اور عورت سے شادی کرنا چاہو تو پہلی بیوی کو دیئے ہوئے مہر میں سے کچھ بھی واپس نہ لو خواہ وہ بہت بڑا خزانہ ہی کیوں نہ ہو۔‘‘ بہر حال مہر صرف لڑکی کا حق ہے، اس کے والد، بھائی یا دوسرے سرپرست کو جائز نہیں کہ وہ اسے اپنے مصرف میں لائے، لیکن لڑکی اگر خود ہی راضی خوشی کچھ دے دے تو اسے استعمال کرنے میں چنداں حرج نہیں۔ واللہ اعلم!

عدت وفات کا آغاز

] میری عمر پچاس سال ہے، میرے خاوند جب فوت ہوئے تو میں نے وفات کے دو ماہ بعد عدت گزارنا شروع کی، اس طرح میں نے چار ماہ دس دن عدت وفات کے پورے کر لیے، کیا ایسا کرنا صحیح تھا؟ اگر نہیں تو اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

[شریعت میں خاوند کی وفات کے ساتھ ہی بیوی پر عدت مرگ واجب ہو جاتی ہے، اسے وقت مقررہ سے موخر کرنا صحیح نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ 1

’’اور تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار ماہ دس دن عدت میں رکھیں۔‘‘

سائلہ کا دو ماہ بعد عدت کا آغاز کرنا گناہ اور اللہ کی نافرمانی ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا اور توبہ کرنی چاہیے۔ اس گناہ کی تلافی کے لیے مزید نیک اعمال کرنے چاہیے کیوں کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ 2 ’’بلاشبہ نیکیاں، گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔‘‘

دوران عدت اگر کوئی مجبوری ہو تو گھر سے باہر جانا جائز ہے بشرطیکہ رات کو اپنے گھر واپس آ جائے اور وہ کام عورت کے بغیر نہ ہو سکتا ہو۔ البتہ شادی وغیرہ میں شرکت کرنا یا کسی مرنے والے کی تعزیت کے لیے نکلنا جائز نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ عدت کا وقت گزر جانے کے بعد اس کی قضا نہیں دی جا سکتی، اگر عورت کو خاوند کی وفات کا علم چار ماہ دس دن گزر جانے کے بعد ہو تو اس صورت میں بھی عدت ساقط ہو جاتی ہے۔ بہر حال سائلہ نے دو ماہ بعد عدت شروع کرنے کا کام صحیح نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمائے اور اس کے گناہ کی تلافی کر دے۔ واللہ اعلم!

غیر فطرتی دودھ سے رضاعت کا ثبوت

] میں عرصہ بیس سال سے شادی شدہ ہوں اور میرے ہاں کوئی اولاد نہیں، میں اپنی بہن کا بیٹا لے کر اس کی

! البقرہ:۲۳۴. @ هود:۱۱۴.

پرورش کرنا چاہتی ہوں، آج کل ایسی ادویات دستیاب ہیں جن کے استعمال سے دودھ اتر آتا ہے، کیا ایسا دودھ پلانے سے رضاعت ثابت ہو جاتی ہے؟

] کسی دوسرے کا بیٹا اپنی گود میں لینے سے وہ حقیقی بیٹا نہیں بن جاتا اور نہ ایسا کرنے سے کوئی حقیقی ماں یا باپ بن سکتا ہے۔ اسلام نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ جس عورت نے اسے گود لیا ہے وہ اسے دودھ پلا دے۔ ایسا کرنے سے وہ اس کی رضاعی ماں اور اس کا خاوند اور اس کا رضاعی باپ بن جاتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آئندہ پردے وغیرہ کے احکامات میں کچھ نرمی آجاتی ہے لیکن رضاعت کے لیے دو شرطوں کا ہونا ضروری ہے جو حسب ذیل ہیں:

☆ بچے کو دودھ مدت رضاعت کے اندر اندر پلایا جائے اور مدت رضاعت دو سال ہے، اس کے بعد دودھ پلانے سے رضاعت ثابت نہ ہوگی۔

☆ دودھ بھی کم از کم پانچ دفعہ پلایا جائے، ایک یا دو دفعہ دودھ پلانے سے رضاعت ثابت نہیں ہوگی، ایک دفعہ پلانے سے مراد یہ ہے کہ بچہ، عورت کی چھاتی کو منہ میں لے اور سیر ہو کر اپنی مرضی سے چھوڑ دے اس طرح کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پلایا جائے۔

صورت مسئولہ میں عورت کا اپنا دودھ نہیں کیوں کہ وہ عرصہ بیس سال سے لا ولد ہے اور ادویات کے ذریعے اترنے والے دودھ سے کام چلانا چاہتی ہے، اس سلسلہ میں درج ذیل حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے:

☆ زمانہ قدیم میں بھی کچھ درختوں کا چھلکا اور جڑیں ایسی تھیں جن کو چبانے سے عورتوں کو دودھ اتر آتا تھا۔ چنانچہ اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ ادویات تیار کر لی گئی ہیں، جن کے استعمال سے دودھ اتر آتا ہے، اگر کوئی لا ولد عورت اس قسم کی ادویات استعمال کرتی ہے اور اسے اتنا دودھ اتر آتا ہے کہ جس سے بچہ سیر ہو جائے اور اس طرح وہ پانچ مرتبہ غیر فطرتی دودھ پی لے تو اس سے رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ بچہ دو سال کی عمر کے اندر اندر دودھ پیئے۔ لیکن اس قسم کے دودھ پینے سے عورت کا خاوند، اس بچے کا رضاعی باپ نہیں بنے گا کیوں کہ اس غیر فطرتی دودھ میں اس کے خاوند کا کوئی حصہ نہیں۔ ہاں حمل کے بعد جو فطرتی دودھ پیدا ہوتا ہے، اگر ایسا دودھ کوئی بچہ نوش کرتا ہے تو خاوند اس بچے کا رضاعی باپ بن جاتا ہے۔ 1

منگیتر سے تصویر طلب کرنا

] میں کالج کی طالبہ ہوں، میری یونیورسٹی میں زیر تعلیم طالب علم سے منگنی ہوگئی ہے۔ وہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ انٹرنیٹ کے ذریعے اپنی تصاویر روانہ کروں، کیا شریعت میں تصاویر کے تبادلے کی اجازت ہے؟ وضاحت کریں۔

] شریعت میں نکاح سے پہلے منگنی کرنا مشروع ہے، لیکن یہ پیغام نکاح ہے، نکاح نہیں۔ اپنی منگیتر کو نکاح سے قبل ایک نظر دیکھ لینے میں چنداں قباحت نہیں، لیکن اس کی بھی کچھ حدود و قیود ہیں۔ ایک نظر دیکھنے سے مراد، تنہائی میں ملاقاتیں کرنا، سیر و تفریح کے لیے جانا، خریداری کرنا، کسی پارک میں جا کر چائے نوش کرنا اور فون پر گھنٹوں گپ شپ کرنا نہیں ہے۔

---

1 مغنی لابن قدامہ، ج ۱۱، ص: ۳۲۴.

سیدنا جابر t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

’’جب تم میں سے کوئی عورت کسی کو پیغام نکاح بھیجے تو پھر اگر اس کے داعیہ نکاح یعنی شکل وصورت کو دیکھنا چاہے تو دیکھ لے۔‘‘ 1

سیدنا جابر t حدیث بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

’’میں نے ایک لڑکی کے لیے پیغام نکاح بھیجا، میں اس کے لیے چھپا کرتا تھا حتی کہ میں نے اسے دیکھ لیا، جس سے مجھے اس کے ساتھ نکاح کرنے کی رغبت ہوئی۔ چنانچہ میں نے اس سے شادی کر لی۔‘‘

لیکن اس اجازت کو ایک حد تک محدود رکھا جائے، اسے مطلق نہ رکھا جائے جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ کیوں کہ قبل از نکاح وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ اس اجنبیت کو ختم کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ ہمارے رجحان کے مطابق منگیتر کو دیکھنے کی محدود اجازت کو بنیاد بنا کر نیٹ کے ذریعے تصاویر کے تبادلے کو جواز مہیا کرنا انتہائی محل نظر ہے کیونکہ

☆ کمپیوٹر کے ذریعے تصاویر میں جعل سازی عام ہے جو آئندہ کسی بھی تنازعہ کا باعث بن سکتی ہے۔

☆ لڑکی کی تصاویر دیکھنے میں دوسرے لوگ شریک ہو سکتے ہیں جو منگیتر کے علاوہ ہیں۔

☆ منگنی ٹوٹنے کے بعد لڑکی کی تصاویر تو لڑکے کے پاس رہیں گی جنہیں بلیک میل کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی کئی ایک وجوہات ہیں جو ان کے محل نظر ہونے کا باعث ہیں، اس لیے انٹرنیٹ کے ذریعے تصاویر بھیجنے سے اجتناب کیا جائے۔ ایسا کرنا بہت سی برائیوں اور قباحتوں کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم!

رضاعی بھتیجی سے نکاح

] میری عمر چھ ماہ کی تھی جب والدہ فوت ہو گئیں، میں نے کسی دوسری عورت کا دودھ پیا، اب میں چاہتا ہوں کہ اس عورت کی پوتی سے نکاح کر لوں، شرعی طور پر مجھے ایسا کرنے کی اجازت ہے، وضاحت کریں؟

[والدہ کے علاوہ کسی بھی دوسری عورت کا دودھ پینا رضاعت کہلاتا ہے۔

رضاعت کے دو اصول ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پیا جائے، ایک یا دو دفعہ دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

☆ وہ دودھ مدت رضاعت یعنی دو سال کی عمر میں پیا جائے۔

دودھ پینے کے بعد وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ سیدہ عائشہ r بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

’’دودھ پینے سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔‘‘ 2

! ابوداؤد، النکاح: ۲۰۸۲۔ @ بخاری، النکاح: ۵۱۰۹۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

’’اللہ تعالیٰ نے رضاعت کی وجہ سے وہ رشتے حرام کیے ہیں جو اس نے نسب کی وجہ سے حرام کیے ہیں۔‘‘ 1

صورت مسئولہ میں سائل نے جس عورت کا دودھ پیا ہے وہ اس کی رضاعی ماں ہے، اس کی اولاد اس کے بہن بھائی، اس کا خاوند، سائل کا رضاعی باپ اور اس کی پوتی، سائل کی رضاعی بھتیجی ہے۔ اب جس طرح حقیقی بھتیجی سے نکاح حرام ہے اسی طرح رضاعی بھتیجی سے بھی نکاح حرام ہے۔ قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ حقیقی بھتیجی سے نکاح کو حرام کیا ہے۔ حدیث کے مطابق دودھ پینے سے بھی وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں، جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔ لہٰذا کسی صورت میں بھی رضاعی ماں کی پوتی سے نکاح کی اجازت نہیں کیوں کہ رضاعی ماں کی پوتی سائل کی رضاعی بھتیجی ہے۔ واللہ اعلم!

شادی سے پہلے منگیتر سے تعلقات

] میری منگنی ہوگئی ہے، کیا مجھے اجازت ہے کہ میں اپنی منگیتر کے ساتھ علیحدگی میں گپ شپ کروں، اس کے ساتھ چائے وغیرہ پی لوں؟

[جس عورت سے نکاح کرنا جائز ہے وہ نکاح کرنے کے بعد اس کی بیوی بنتی ہے، صرف منگنی سے بیوی نہیں بنتی۔ کیوں کہ منگنی نکاح نہیں بلکہ وعدۂ نکاح ہے جو کسی وقت بھی ختم ہوسکتا ہے۔ عقد نکاح سے قبل کسی قسم کے تعلقات قائم کرنا شرعاً جائز نہیں۔ حدیث میں اس کی سخت ممانعت ہے کہ انسان کسی غیر محرم عورت سے گفتگو، گپ شپ، نظر بازی، یا خلوت گزینی کے ذریعہ لطف اندوز ہو۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’کوئی آدمی، کسی عورت کے ساتھ اس کے محرم کے بغیر خلوت اختیار نہ کرے اور کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔‘‘ 2

سیدنا عمر t سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ e نے فرمایا ہے:

’’جب کوئی آدمی کسی اجنبی عورت کے ساتھ علیحدگی میں ہوتا ہے تو ان دونوں میں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔‘‘ 3

صورت مسئولہ میں سائل کو اپنی منگیتر سے خلوت اختیار کرنے کی شرعاً اجازت نہیں، البتہ نکاح سے پہلے اسے ایک نظر دیکھنے میں چنداں قباحت نہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

’’جب تم میں سے کوئی عورت کو پیغام نکاح بھیجے تو پھر اگر وہ اس کے داعیہ نکاح یعنی شکل وصورت کو دیکھنا چاہے تو دیکھ لے۔‘‘ 4

اس حدیث کے راوی سیدنا جابر t حدیث کو بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں: ’’پھر میں نے ایک لڑکی کے لیے پیغام نکاح بھیجا، میں اس کے لیے چھپا کرتا تھا حتی کہ میں نے اسے دیکھ لیا جس سے مجھے اس کے ساتھ نکاح کرنے کی رغبت ہوئی

! مسلم، الرضاع:۳۵۸۳۔ @ ترمذی، الجہاد:۳۰۰۶۔

ترمذی، الادب: ۲۷۹۶۔ $ ابو داؤد، النکاح:۲۰۸۲۔

چنانچہ میں نے اس سے شادی کر لی۔‘‘

اس دیکھنے سے مراد اتفاقاً اچٹتی نظر سے دیکھنا ہے جیسا کہ سیدنا جابر t نے خود بیان کیا ہے، لیکن ہماری تہذیب نو نے اسے غلط رنگ دیا ہے۔ ہمارے ہاں نوجوان لڑکے لڑکی کا اس بہانے تنہائی میں ملاقاتیں کرنا، سیر وتفریح کے لیے جانا، خریداری کرنا، کسی پارک میں چائے پینا، گپ شپ کرنا یا فون پر گھنٹوں باتیں کرتے رہنا، شریعت اس امر کی اجازت نہیں دیتی۔ قبل از نکاح اس طرح کی ملاقاتیں حرام ہیں کیوں کہ قبل از نکاح منگیتر ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی ہوتے ہیں۔ لہٰذا سوال میں ذکر کردہ اشیاء حرام اور ناجائز ہیں۔ واللہ اعلم!

عورت کا ولی کے بغیر نکاح نہیں

] میں ایک لڑکے سے اس کی اسلام پسندی کی وجہ سے محبت کرتی تھی اور اس سے نکاح پر آمادہ تھی لیکن میرے والد اس پر راضی نہ تھے، میں نے عدالتی نکاح کر لیا، اب والد صاحب اس نکاح پر راضی ہیں۔ کیا ایسا نکاح صحیح ہے؟

[جمہور اہل علم کا موقف ہے کہ عورت کے نکاح کے لیے ولی اور سرپرست کا ہونا اور اس کا اجازت دینا بنیادی شرط ہے، کیوں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے عورت کے ولی کو عقد نکاح کے بارے میں مخاطب کیا ہے، اگر نکاح کا معاملہ ولی کے بجائے عورت کے ہاتھ میں ہوتا تو اس کے نکاح میں ولی کو مخاطب کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

امام بخاری a نے اس سلسلہ میں متعدد آیات کا حوالہ دیتے ہوئے ایک عنوان بایں الفاظ ذکر کیا ہے:

’’مَنْ قَالَ لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِي‘‘ ’’جس شخص کا یہ موقف ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔‘‘ 1

صحیح احادیث میں اس امر کی صراحت ہے کہ سرپرست کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔

چنانچہ سیدنا ابوموسیٰ اشعری t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ’’ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔‘‘ 2

سیدہ عائشہ r سے مروی ایک حدیث میں مزید وضاحت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ’’جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا اس کا نکاح باطل ہے۔‘‘ یہ کلمات آپ نے تین مرتبہ دہرائے۔‘‘ 3

بہرحال عورت خواہ کنواری ہو یا شوہر دیدہ، ولی کی اجازت اور رضامندی کے بغیر اس کا نکاح صحیح نہیں۔ اس بناء پر جو لڑکی والدین سے بغاوت کر کے گھر سے بھاگ جاتی ہے اور ان کی اجازت کے بغیر عدالتی نکاح کر لیتی ہے تو اس کا نکاح صحیح نہیں، خواہ اس سے اولاد ہی کیوں نہ پیدا ہو جائے۔ والدین کو بھی چاہیے کہ اگر انہیں کوئی اچھا نیک رشتہ ملتا ہے تو محض ضد کی وجہ سے اس میں رکاوٹ نہ بنیں۔ صورت مسئولہ میں چونکہ نکاح کے وقت والد کی رضامندی نہ تھی، اس لیے یہ نکاح صحیح نہیں۔ اگر والد بعد میں راضی ہو جاتا ہے تو علیحدگی اختیار کرنے کے بعد مشرقی روایات کے مطابق دوبارہ نکاح کیا جائے، چونکہ پہلا نکاح صحیح نہیں تھا اس لیے میاں بیوی دونوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اس گناہ کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں اور اس کے حضور سچی توبہ کریں۔

! بخاری، النکاح، باب نمبر ۳۷۔ @ ابود اؤد، النکاح: ۲۰۸۵۔ # مسند امام احمد، ج۶، ص ۴۷۔

واضح رہے کہ جو عورت اپنا نکاح خود کرتی ہے اور اپنے ولی کی رضامندی حاصل نہیں کرتی، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ بدکار ہے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''کوئی عورت کسی دوسری عورت کا نکاح نہ کرے، اور نہ ہی کوئی عورت اپنا نکاح کرے، بلاشبہ وہ عورت بدکار ہے جس نے اپنا نکاح خود کرلیا۔'' 1

اللہ تعالیٰ ہمیں شریعت کی خلاف ورزی سے محفوظ رکھے۔ آمین!

شادی شدہ زانی کی سزا

] قرآن مجید میں بدکاری کرنے والا مرد ہو یا عورت، اس کی سزا سو کوڑے ہیں، لیکن ہمارے ہاں اہل علم اسے رجم کرنے کا کہتے ہیں۔ رجم کی سزا قرآن کی صریح نص کے خلاف ہے۔ براہ کرم اس کے متعلق وضاحت کریں۔

[بلاشبہ قرآن میں زنا کی سزا بایں الفاظ بیان ہوئی ہے:

﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ 2

''زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنیوالے مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔''

لیکن رسول اللہ e نے تخصیص فرمائی ہے کہ مذکورہ قرآنی حکم ان بدکاروں کے لیے ہے جن کی شادی نہیں ہوئی کیوں کہ شادی شدہ جوڑے کے لیے رجم کی سزا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ e نے سیدنا ماعز بن مالک t کے متعلق فرمایا: جبکہ انہوں نے زنا کا اعتراف کرلیا تھا: ''اسے لے جاؤ اور رجم کردو۔'' 3

چنانچہ آپ e کے حکم مطابق اسے رجم کردیا گیا۔ 4

قبیلہ جہینہ کی ایک عورت کے متعلق بھی آپ نے رجم کرنے کا حکم دیا تھا جو شادی شدہ تھی اور زنا کی مرتکب ہوئی تھی، حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''رسول اللہ e نے اس کے متعلق حکم دیا تو اس کے کپڑے کس کر باندھ دیئے گئے پھر اس کے متعلق حکم دیا تو اسے رجم کردیا گیا پھر آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔'' 5

اپنے نوکر کے ساتھ بدکاری کرنے والی شادی شدہ عورت کے متعلق بھی رسول اللہ e کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

''انیس! صبح اس کی بیوی کے پاس جانا اگر وہ اعتراف کرلے تو اسے رجم کردینا۔'' 6

سیدنا علی t نے ایک شادی شدہ عورت کو رجم کی سزا دے کر فرمایا کہ میں نے اسے رسول اللہ e کی سنت کے مطابق رجم کیا ہے۔'' 7

! ابن ماجہ، النکاح:۱۸۸۲. @ النور: ۲.

مسلم، الحدود: ۴۴۲۰. $ مسلم، الحدود:۴۴۳۱.

% مسلم، الحدود:۴۴۳۳. ^ مسلم، الحدود:۱۴۳۵.

& بخاری، الحدود:۶۸۱۲.

سیدنا عمر t نے مدینہ طیبہ میں منبر پر کھڑے ہو کر تمام صحابہ کرام y کے سامنے خطبہ دیا، جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد e کو حق کے ساتھ مبعوث کیا اور آپ پر کتاب نازل فرمائی، اللہ تعالیٰ نے آپ e پر جو نازل فرمایا اس میں رجم کی آیت بھی تھی، ہم نے اسے پڑھا، یاد کیا اور سمجھا۔ رسول اللہ e نے رجم کی سزا دی اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کی سزا دی، مجھے ڈر ہے کہ لوگوں پر ایک لمبا زمانہ گزر جائے گا تو کوئی کہنے والا کہے گا کہ ہم اللہ کی کتاب پر رجم کا حکم نہیں پاتے تو وہ لوگ ایسے فرض کو ترک کرنے سے گمراہ ہو جائیں گے جسے اللہ نے نازل کیا ہ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں رجم کا حکم عورتوں اور مردوں میں سے ہر ایک پر برحق ہے جس نے زنا کیا اور وہ شادی شدہ ہو۔'' 1

رضاعی بہن سے نکاح

] میری ایک لڑکی سے شادی ہوئی، کافی عرصہ ہم اکٹھے رہے ہیں، اب پتہ چلا ہے کہ میں نے بیوی کی بہن کے ساتھ اس کی ماں کا دودھ پیا ہے، ایسے حالات میں کیا میری بیوی میرے لیے حرام ہے؟

[ہمارے ہاں برصغیر میں بچوں کو دوسری عورتوں سے دودھ پلانے کے متعلق مختلف حالات ہیں، اہل عرب کی ایک ضرورت تھی کہ وہ اپنے بچوں کو دیہاتی ماحول میں رکھتے اور وہاں کی دیہاتی عورت سے دودھ پلاتے جبکہ ہمارے ہاں اس قسم کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ اتفاق سے کسی دوسری عورت سے دودھ پینے کا واقعہ پیش آ جاتا ہے، تاہم دودھ پلانے کے متعلق درج ذیل حقائق کو سامنے رکھنا ہوگا:

☆ دودھ پینے کی وجہ سے جو حرمت ثابت ہوتی ہے وہ دو چیزوں پر موقوف ہے:

ا۔ دودھ بچے کی عمر دو سال مکمل ہونے سے پہلے پلایا گیا ہو، دو سال کے بعد دودھ پینے کے احکام مختلف ہیں تاہم اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

☆ دودھ پینے والے بچے کا تعلق پلانے والی عورت کے تمام رشتے داروں سے قائم ہو جائے گا یعنی دودھ پلانے والی عورت کا خاوند، دودھ پینے والے بچے کا باپ، خاوند کا بھائی، اس کا چچا، عورت کا بھائی اس کا ماموں اور عورت کی اولاد بچے کے بہن بھائی متصور ہوں گے جبکہ عورت کا صرف اس بچے سے تعلق قائم ہو گا جسے اس نے دودھ پلایا ہے۔ اس کے باقی رشتے داروں کے ساتھ عورت کا کوئی تعلق نہیں ہو گا۔

صورت مسئولہ میں اگر واقعی یہ ثابت ہو جائے کہ لڑکے نے اپنی بیوی کی بہن کے ساتھ اس کی ماں کا دودھ پیا ہے۔ دودھ بھی ایک دو دفعہ نہیں بلکہ پانچ مرتبہ پیا ہے، تو ایسے حالات میں فوراً ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں کیوں کہ یہ نکاح صحیح نہیں۔ اسی طرح کا واقعہ سیدنا عقبہ بن حارث t سے پیش آیا تھا تو رسول اللہ e نے ان کے درمیان تفریق کرا دی تھی۔ 2

! مسلم، الحدود:۴۴۱۸۔ @ بخاری، العلم:۸۸۔

سگریٹ پینے والے خاوند سے طلاق کا مطالبہ

] میرا خاوند سگریٹ پیتا ہے جو میرے لیے انتہائی ناگواری کا باعث ہے، وہ اس کی وجہ سے دمہ کی بیماری سے دوچار ہے، میں نے کئی مرتبہ اسے سمجھایا لیکن وہ باز نہیں آتا، کیا ایسے حالات میں طلاق کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟

[سگریٹ نوشی حرام ہے کیوں کہ تمبا کو خبیث اشیاء سے ہے، اطباء نے اس کے بے شمار نقصانات سے ہمیں آگاہ کیا ہے حتی کہ وزارت صحت نے بھی اسے مضرصحت قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ e کے اوصاف بایں الفاظ بیان کیے ہیں:

﴿يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ﴾ 1

''وہ ان پر پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔''

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کے لیے کیا کچھ حلال کیا گیا ہے؟ آپ فرما دیں تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں۔'' 2

جب تمبا کو خبیث ہے تو اس کے حرام ہونے میں کیا شبہ ہے، لہٰذا اللہ عزوجل اور اس کے رسول e کی اطاعت کے پیش نظر اس کا ترک ضروری ہے۔ ہم سائلہ کو وصیت کرتے ہیں کہ وہ حکمت عملی کے ساتھ اپنے خاوند کو سمجھاتی رہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی رہے کہ وہ اسے ترک کردینے کی توفیق دے۔ بار بار کہنے کے باوجود وہ اس پر اصرار کرتا ہے اور سگریٹ نوشی سے باز نہیں آتا تو ایسے خاوند سے خلاصی حاصل کرنے کے لیے طلاق کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا جائے، جلد بازی سے کام نہ لیا جائے۔ واللہ اعلم!

باپ کا بیٹی کو نکاح پر مجبور کرنا

] میرے باپ نے میری بہن کا نکاح اس کی مرضی کے بغیر کردیا ہے جبکہ بہن سے کوئی رابطہ نہیں کیا گیا، نکاح فارم پر بھی میری والدہ نے دستخط کیے ہیں، اس طرح یہ کاروائی مکمل کی گئی ہے۔ کیا شرعی طور پر ایسا نکاح صحیح ہے؟

[نکاح کے لیے بنیادی طور پر دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ لڑکی، رضامند ہو اور دوسرا یہ کہ ولی کی اجازت ہو۔ لڑکی کی رضامندی کے متعلق رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''کنواری عورت کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر نہ کیا جائے۔'' 3`

بلکہ ایک دوسری روایت میں ہے کہ کنواری عورت سے اس کا باپ اس کے نفس کے متعلق اجازت حاصل کرے۔ 4

اختلاف کے وقت یہ حدیث نص صریح کی حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا اس پر عمل ضروری ہے، باپ کا زبردستی اپنی بیٹی کا کسی ایسے شخص سے نکاح کردینا جسے وہ نہ چاہتی ہو حرام اور ناجائز ہے، ایسے حالات میں نکاح نہیں ہوتا۔

! الاعراف:۱۵۷. @ المائدہ:۴.

بخاری، النکاح:۵۱۳۶. $ مسلم، النکاح:۱۴۲۱.

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے ایسے نکاح کر مردود قرار دیا تھا۔ 1

پھر سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی نے نکاح فارم پر دستخط بھی نہیں کیے بلکہ اس کی والدہ نے یہ کام کیا ہے، ایسے حالات میں اس قسم کے نکاح کو کیسے صحیح قرار دیا جا سکتا ہے؟ واللہ اعلم!

مانع حمل گولیوں کا استعمال

] شادی کے بعد کچھ عورتیں مانع حمل گولیاں استعمال کرتی ہیں تاکہ انہیں جلدی حمل نہ ٹھہرے، کیا اس مقصد کے لیے مانع حمل ادویات کا استعمال جائز ہے؟ کتاب وسنت کے حوالے سے اس کی وضاحت فرمائیں۔

[مانع حمل گولیوں کے استعمال کی مختلف صورتیں ہیں، بعض صورتوں میں چند شرائط کے ساتھ اسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے، تاہم اکثر صورتوں میں ایسی ادویات کا استعمال حرام اور ناجائز ہے۔ ان گولیوں کے استعمال کی ناجائز صورتیں حسب ذیل ہیں:

☆ کوئی عورت حمل کے مسئلہ کو مستقل طور پر ختم کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے تاکہ اسے کبھی بھی حمل نہ ٹھہرے تو ایسا کرنا بالکل ناجائز اور حرام ہے۔ یہ برتھ کنٹرول کی وہ صورت ہے جس کی دین اسلام میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔

☆ کچھ عورتیں اپنے حسن و جمال کو برقرار رکھنے کے لیے ایسی ادویات استعمال کرتی ہیں جو حمل کے لیے رکاوٹ ہوتی ہیں، کیوں کہ حمل سے ان کا حسن متاثر ہوتا ہے، ایسا کرنا بھی ناجائز ہے۔

☆ ہمارے ہاں ایک نعرہ چلتا ہے ''بچے دو ہی اچھے'' اس نعرے کی ترویج کے لیے مانع حمل گولیوں کا استعمال جائز نہیں۔

☆ کچھ عورتیں زیادہ بچوں کی پیدائش پر فکرمند ہوتی ہیں کہ وہ کہاں سے کھائیں گے، ان کی تعلیم کا بندوبست نہیں ہوگا۔ یہ سوچ بھی ایک مسلمان کی شان کے خلاف ہے۔ اس انداز فکر کے پیش نظر مانع حمل تدابیر اختیار کرنا بھی جائز نہیں۔

مانع حمل گولیوں کے استعمال کی ایک جائز صورت حسب ذیل ہیں:

کسی عورت کو بہت جلد حمل ٹھہر جاتا ہے، اس کے بچوں کے درمیان وقفہ بہت کم ہوتا ہے، جس کی وجہ سے بچوں کی صحت اور نگہبانی متاثر ہوتی ہے، خود عورت کی صحت بھی کثرت حمل کی متحمل نہیں ہوتی، بعض اوقات حمل کا یہ تسلسل ہلاکت کا باعث بھی بن سکتا ہے، ایسی عورت مناسب وقفہ کے لیے دو شرائط کے ساتھ مانع حمل گولیاں استعمال کر سکتی ہے:

☆ اسے پیشگی خاوند سے اجازت لینا ہوگی۔ ☆ ان کے استعمال سے صحت اور جان کو خطرہ نہ ہو۔

ان شرائط کے ساتھ مانع حمل گولیاں استعمال کر سکتی ہے، اس کے جواز کی دلیل، رسول اللہ e کے عہد مبارک میں صحابہ کرام y کا اپنی بیویوں اور لونڈیوں سے عزل کرنا ہے۔ واللہ اعلم!

عدت وفات کے لوازمات

] میرے والد وفات پا گئے ہیں، میری والدہ عدت وفات کے لوازمات کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتی

! بخاری، النکاح:۵۱۳۸.

ہیں، اس کی وضاحت فرما دیں۔

[احادیث کے مطابق جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے، اسے عدت وفات کو پورا کرنا ہوگا اور اس کے لوازمات بھی پورے کیے جائیں گے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ 1

''تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن عدت میں رکھیں۔''

اگر بیوہ حاملہ ہو تو اسے وضع حمل تک عدت گزارنا ہوگی، خواہ وضع حمل جلدی ہو جائے یا اسے دیر لگ جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔'' 2

اس کے لوازمات یہ ہیں:

☆ عورت، دوران عدت شدید ضرورت کے علاوہ گھر سے باہر نہ نکلے۔ مثلاً بیماری کی وجہ سے ہسپتال جانا، کرایہ پر مکان میں رہائش ہو اور کرایہ دینے کی مالی استطاعت نہ ہو، سرکاری ملازمت کی شکل میں زیادہ چھٹی مل نہ سکتی ہو، گھر کا ماحول خراب ہو، وہاں اس کی عزت و ناموس کو خطرہ ہو۔ وغیرہ

☆ عورت، عدت کے ایام میں خوبصورت لباس زیب تن نہ کرے، اسے سادہ لباس پہننا چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ عورت دوران عدت رنگ دار، سرخ و بھڑکیلے کپڑے نہ پہنے، نہ سرمہ لگائے اور نہ خوشبو استعمال کرے۔ 3

☆ عورت، دوران عدت، کسی طرح کی خوشبو استعمال نہ کرے، ہاں ایام مخصوصہ سے فراغت کے بعد خوشبو استعمال کر سکتی ہے، جیسا کہ اس کی صراحت حدیث میں ہے۔

☆ اسے زیورات سے بھی اجتناب کرنا ہوگا۔ وہ زیورات ہار کی شکل میں ہوں یا کنگن کی صورت میں حتی کہ گھڑی اگر زیب و زینت کے لیے ہے تو اسے بھی اتار دینا چاہیے البتہ ٹائم دیکھنے کی نیت سے اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

☆ میک اپ کا جتنا بھی سامان ہے اس کے استعمال سے بھی پرہیز کیا جائے حتی کہ دوران عدت سرمہ بھی نہیں لگانا چاہیے۔ البتہ عام استعمال کی اشیاء استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ مثلاً پانی اور صابن استعمال کیا جا سکتا ہے، بہرحال جو چیزیں خوبصورتی کے لیے استعمال کی جاتی ہیں وہ سب ناجائز ہیں۔ بوقت ضرورت گفتگو کرنے، ٹیلی فون سننے میں کوئی حرج نہیں۔ واللہ اعلم!

حاملہ عورت کو طلاق دینا

] میرے خاوند نے مجھے حالت حمل میں طلاق دی، کیا اس حالت میں طلاق ہو جاتی ہے؟ اگر طلاق ہو جاتی ہے تو

! البقرہ:۲۳۴. @ الطلاق:۴. # مسلم، الجنائز:۹۳۸.

رجوع کی کیا صورت ہے؟

] حالت حمل میں طلاق ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ e نے سیدنا ابن عمر t سے فرمایا، جب انہوں نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی تھی، آپ نے فرمایا: ''اسے طہر یا حمل کی حالت میں طلاق دو۔'' 1

اللہ تعالیٰ نے حالت حمل میں دی ہوئی طلاق کی عدت وضع حمل رکھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ 2

''حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ اپنا حمل جنم دے دیں۔''

حاملہ عورتوں کی عدت بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دوران حمل طلاق دی جا سکتی ہے اور یہ طلاق بھی نافذ ہے، اگر وضع حمل سے پہلے رجوع کر لیا جائے تو تجدید نکاح کی ضرورت نہیں اور اگر بچہ جنم دینے کے بعد صلح کا پروگرام بنا ہے تو تجدید نکاح کے ساتھ رجوع ہو سکے گا۔ کیوں کہ وضع حمل کے بعد نکاح ختم ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم!

بیک وقت تین طلاقیں دینا

] میں نے اپنی بیوی کو بحالت طیش وغضب ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دی ہیں، یعنی میں نے لفظ طلاق تین بار استعمال کیا ہے، اب میں نہایت پریشان اور نادم ہوں، ایسے حالات میں اگر کوئی متبادل حل ہو تو بتائیں تاکہ دونوں خاندان پراگندہ ہونے سے بچ جائیں۔

[مسئلہ طلاق بڑی نزاکت کا حامل ہے لیکن ہم لوگ اس سلسلہ میں بہت لاپرواہ واقع ہوئے ہیں۔ معمولی گھریلو ناچاقی کی وجہ سے اپنے ترکش سے طلاق کا تیر نکال پھینکتے ہیں بلکہ یکبارگی طلاق ثلاثہ دینا ہمارا معمول بن چکا ہے، حالانکہ کتاب وسنت کے مطابق طلاق دینے سے قبل چار مراحل سے گزرنا چاہیے جو حسب ذیل ہیں:

☆ وعظ ونصیحت: بیوی کو سمجھایا جائے اور طلاق کی سنگینی سے آگاہ کیا جائے۔

☆ ان کا بستر الگ کر دیا جائے، سمجھ دار عورت کے لیے خواب گاہ سے اس کی علیحدگی بہت گراں ہوتی ہے۔

☆ معمولی مار پیٹ: انہیں ہلکی پھلکی مار پیٹ کی جائے، اس کے چہرے پر نہ مارا جائے، اس سے سزا نہیں بلکہ عار دلانا مقصود ہوتا ہے۔

☆ رشتے داروں کے ذریعے ثالثی کا اہتمام کیا جائے تاکہ مابہ النزاع کو افہام وتفہیم سے حل کیا جائے۔

سب سے آخر میں طلاق کا مرحلہ آتا ہے، وہ بھی ایک طلاق دے کر اسے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ بیک وقت تین طلاقیں دینے کا طریقہ رسول اللہ e کو انتہائی ناپسند تھا، آپ نے اس انداز سے طلاق دینے کو اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل اور مذاق قرار دیا ہے۔ 3

! مسلم، الطلاق:٣٦٥٢.   @الطلاق: ٤.   # نسائی ، الطلاق : ٣٤٣٠.

البتہ کتاب وسنت کی رو سے ایک مجلس میں دی ہوئی بیک وقت تین طلاقیں دینے سے ایک ہی رجعی طلاق واقع ہوتی ہے بشرطیکہ طلاق دینے کا پہلا یا دوسرا موقع ہو۔ دلائل حسب ذیل ہیں:

۱: سیّدنا ابن عباس w روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ e کے عہد نبوت، سیّدنا ابوبکر t کے زمانہ خلافت اور سیّدنا عمر t کے ابتدائی دو سالہ دور حکومت میں تین طلاقیں، ایک طلاق کا حکم رکھتی تھیں، لیکن کثرت طلاق کی وجہ سے سیّدنا عمر t نے کہا کہ لوگوں نے اس معاملہ میں جلدی کی جس میں ان کے لیے نرمی اور آسانی تھی، اگر میں اسے نافذ کردوں تو بہتر ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اسے نافذ کردیا۔ 1

تاہم سیّدنا عمر t کا یہ اقدام شرعی نہیں بلکہ تعزیری تھا، کیونکہ آپ t عمر کے آخری حصہ میں اپنے اس فیصلہ پر اظہار افسوس فرمایا کرتے تھے، جیسا کہ حافظ ابن قیم a نے محدث ابوبکر الاسماعیلی کی تصنیف مسند عمر کے حوالہ سے لکھا ہے۔ 2

۲: سیّدنا ابن عباس w کہتے ہیں کہ سیّدنا رکانہ بن عبد یزد t نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں لیکن اس کے بعد بہت افسردہ ہوئے، رسول اللہ e نے ان سے پوچھا کہ تم نے اسے طلاق کس طرح دی تھی؟ عرض کیا تین مرتبہ۔ آپ e نے دوبارہ پوچھا: ''ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دی تھیں؟'' عرض کیا ہاں! آپ e نے فرمایا: ''پھر یہ ایک ہی طلاق ہوئی ہے، اگر تم چاہو رو رجوع کرسکتے ہو۔'' راوی حدیث سیّدنا ابن عباس w کے بیان کے مطابق انہوں نے رجوع کرکے اپنا گھر آباد کرلیا تھا۔ 3

اس حدیث کے متعلق حافظ ابن حجر a لکھتے ہیں:

''ہذا الحدیث نص فی المسألۃ، لا یقبل التأویل.'' 4

''یہ حدیث مسئلہ طلاق ثلاثہ کے متعلق ایک فیصلہ کن نص قطعی کی حیثیت رکھتی ہے جس کی اور کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی۔''

پاکستانی علماء احناف نے بھی دلائل کے پیش نظر ان احادیث کے مطابق فتویٰ دیا ہے، چنانچہ مولانا پیر کرم شاہ، مولانا عبدالحلیم قاسمی، مولانا حسین علی واں بھچراں، مولانا احمد الرحمٰن اسلام آباد اور پروفیسر محمد اکرم ورک برسرفہرست ہیں، ان کے فتاویٰ کی تفصیل ''ایک مجلس میں تین طلاق'' نامی کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ بہرحال ان حقائق کی روشنی میں ایک باغیرت مسلمان کے لیے گنجائش ہے کہ اگر اس نے ایک ہی مجلس میں تین طلاق دی ہیں تو وہ دوران عدت بلا تجدید نکاح رجوع کرسکتا ہے اور اگر عدت گزر چکی ہے تو بھی تجدید نکاح سے اپنا گھر آباد کیا جاسکتا ہے۔ قرآن وحدیث کا یہی فیصلہ ہے، اس کے علاوہ ہمارے ہاں رائج الوقت عائلی قوانین اور دیگر اسلامی ممالک میں بھی یہی فتویٰ دیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

! صحیح مسلم، الطلاق : ۱۴۷۲.　　@ اغاثۃ اللھفان، ج۱، ص ۳۳۶.

مسند امام احمد : ج۴، ص ۱۲۳ تحقیق احمد شاکر.　　$ فتح الباری : ج۹، ص ۳۶۲.

منگنی کی شرعی حیثیت

] کیا منگنی نکاح کے قائم مقام ہے کہ اسے کسی معقول عذر کی وجہ سے نہ توڑا جاسکتا ہو؟ کیا منگنی کے بعد لڑکا اپنی منگیتر سے بات چیت کرسکتا ہے اور علیحدگی میں بیٹھ کر اس کے ساتھ گپ شپ کرسکتا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[ہمارے معاشرہ میں منگنی وعدۂ نکاح ہے، بذات خود نکاح یا نکاح کے قائم مقام نہیں کہ اسے کسی معقول عذر کی بناء پر توڑا نہ جاسکتا ہو۔قرآن میں بیوہ عورت یا وہ جسے وقفہ وقفہ سے تین طلاقیں مل چکی ہوں، ان کے متعلق فرمایا:

﴿وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَ لٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ﴾ 1

''اگر تم ایسی عورتوں کو اشارۃً پیغام نکاح دو یا اپنے دل میں پوشیدہ ارادہ کرلو، دونوں صورتوں میں تم پر کوئی گناہ نہیں، اللہ جانتا ہے کہ تم انہیں دل میں یاد رکھتے ہولیکن تم ان سے کوئی خفیہ معاہدہ نہ کرو، جو بات کرنا ہومعروف طریقے سے کرومگر جب تک ان کی عدت نہ گزرجائے عقد نکاح کا عزم نہ کرو۔''

اس آیت کریمہ میں خِطْبَةِ النِّسَآءِ (پیغام نکاح) اور عُقْدَةَ النِّكَاحِ (عقد نکاح) کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے، بیوہ عورت سے اشارے کے طور پر منگنی کی بات تو کی جاسکتی ہے مثلاً: ''میرا کہیں شادی کرنے کا ارادہ ہے۔'' یا ''میں کسی نیک عورت کی تلاش میں ہوں۔'' لیکن عقد نکاح کا عزم منع ہے۔اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خطبۃ النکاح اور عقد نکاح میں فرق ہے۔احادیث میں بھی اس فرق کوملحوظ رکھا گیا ہے کہ مخطوبہ یعنی جس سے نکاح کرنا ہے (جسے منگیتر کہا جاتا ہے) اسے نکاح سے پہلے ایک نظر دیکھا جاسکتا ہے۔جیسا کہ حدیث میں ہے، رسول اللہ e نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی کسی عورت کو پیغام نکاح دے تو اگر ممکن ہوتو اس کی وہ چیز دیکھ لے جو اس کے نکاح کی داعی ہے۔'' 2

اس حدیث میں بھی خطبہ نکاح اور نکاح کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے، شریعت میں اپنی منگیتر کو اچٹتی نظر سے دیکھنے کی اجازت ہے لیکن جن چیزوں کا سوال میں ذکر کیا گیا ہے یہ ہماری درآمد شدہ تہذیب نو کا شاخسانہ ہے کہ اس بہانے نوجوان لڑکے، لڑکیاں باہمی ملاقات کرتے ہیں، سیر وتفریح کے لیے نکلتے ہیں، خریداریاں کرتے ہیں، کسی پارک میں بیٹھ کر گپ شپ کر کے محظوظ ہوتے ہیں، شریعت ان کی قطعاً روادار نہیں۔قبل از نکاح اس طرح کے میل ملاقات حرام اور ناجائز ہیں۔جب تک نکاح نہیں ہوجاتا منگیتر ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی ہوتے ہیں۔منگنی سے کوئی لڑکا کسی اجنبی لڑکی کا شوہر نہیں بنتا کہ ستر

! البقرہ:۲۳۵.   @ ابو داوٗد، النکاح:۲۰۸۲.

وحجاب کی شرعی پابندیاں ختم ہو جائیں، لہٰذا منگنی ہونے کے بعد کھلی گفتگو، آزادانہ گپ شپ کرنا اور علیحدگی میں میل ملاقات کرنا شرعاً حرام اور ناجائز ہے۔ واللہ اعلم!

خلع کب لیا جائے؟

] میری شادی کو چار سال ہو چکے ہیں، میرے میاں مجھ میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، میں کئی مرتبہ ان سے طلاق کا مطالبہ کر چکی ہوں لیکن وہ مجھے آباد بھی نہیں کرتے اور مجھے طلاق بھی نہیں دیتے۔ شریعت میں میرے لیے اس سے خلاصی کی کوئی صورت ہے؟

[نکاح کے بعد اللہ تعالیٰ نے خاوند کو یہ اختیار دیا ہے کہ اگر بیوی سے نباہ ممکن نہ ہو تو اسے طلاق دے کر فارغ کر دے، لیکن اگر عورت پر ظلم ہو رہا ہو اور خاوند اسے طلاق بھی نہ دے اور اس کے ساتھ حسن معاشرت کا بھی مظاہرہ نہ کرے تو اسے اپنے خاوند سے خلاصی حاصل کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ اس طرح خلاصی حاصل کرنے کو شرعی اصطلاح میں خلع کہا جاتا ہے کہ وہ کچھ دے دلا کر اپنے خاوند سے فراغت حاصل کر لے۔ خلع کی کئی ایک وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یعنی اگر عورت اپنے شوہر کو اس کی شکل وصورت، اس کی سیرت وکردار، یا عمر میں بڑا یا کمزور ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتی ہو اور اسے اندیشہ ہو کہ ایسے حالات میں خاوند کی فرمانبرداری میں اس کا حق ادا نہیں کر سکے گی تو اس کے لیے جائز ہے کہ مال وغیرہ بطور فدیہ دے کر اس سے علیحدگی اختیار کر لے۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

☆ خلع پر میاں بیوی راضی ہوں اور گھر میں ہی معاملہ طے کر کے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لیں۔

☆ اگر ان کا باہمی اتفاق نہ ہو سکے تو حاکم وقت کے ذریعے بیوی اپنے خاوند سے علیحدگی حاصل کر سکتی ہے لیکن بلاوجہ عورت کا اپنے خاوند سے علیحدگی کا مطالبہ کرنا حرام ہے۔

چنانچہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جو عورت بھی کسی معقول وجہ کے بغیر اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرتی ہے تو اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے۔''1

رسول اللہ e نے سیدنا ثابت بن قیس t اور ان کی بیوی کے درمیان خلع کروایا تھا۔ جب اس نے شکایت کی تھی کہ یا رسول اللہ e! مجھے اپنے خاوند سے اس کے دین واخلاق کے متعلق کوئی شکایت نہیں، البتہ میں اسلام میں رہتے ہوئے اس کی ناشکری کو ناپسند کرتی ہوں۔

رسول اللہ e نے فرمایا:

''کیا تو حق مہر میں دیا ہوا باغ واپس کر سکتی ہو؟''

! ابو داؤد، الطلاق:۲۲۲۶.

اس نے عرض کیا ''جی ہاں''۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ''اے ثابت! اپنا باغ لے کر اسے آزاد کردو۔'' 1

خلع کی صورت میں صرف حق مہر ہی واپس کرنا ہوتا ہے اور خاوند بھی اس سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

صورت مسئولہ میں سائلہ کو چاہیے کہ فیملی کورٹ سے رجوع کرے اور عدالت کے ذریعے اپنے خاوند سے خلاصی حاصل کر لے، لیکن اس کے لیے اپنا حق مہر خاوند کو واپس کرنا ہوگا۔ خلع کے فیصلے کے بعد ایک حیض آنے کے بعد عقد ثانی کرنے کی مجاز ہے۔ واللہ اعلم!

طلاق کے بعد بیوی کے حقوق

] مجھے میرے خاوند نے طلاق دے دی ہے، جبکہ میرا ایک سال کا شیر خوار بچہ بھی ہے۔ میرے خاوند نے ابھی تک مجھے حق مہر بھی نہیں دیا اور مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ مجھے بتایا جائے کہ طلاق کے بعد میرے خاوند کے ذمے کون کون سے حقوق ہیں؟

[طلاق کی دو صورتیں حسب ذیل ہیں:

☆ خاوند نے بیوی کو پہلی یا دوسری طلاق دی ہے، اس صورت میں اگر عدت ختم نہیں ہوئی تو بیوی کا نان نفقہ اور رہائش کا بندوبست خاوند کے ذمے ہیں کیوں کہ طلاق دیتے ہی نکاح ختم نہیں ہوتا بلکہ عدت ختم ہونے تک نکاح برقرار رہتا ہے، عدت ختم ہونے کے بعد نکاح ختم ہو جاتا ہے۔

☆ خاوند نے بیوی کو تیسری طلاق دی ہے تو اس صورت میں طلاق دیتے ہی نکاح ختم ہو جاتا ہے، البتہ بیوی کو عقد ثانی کے لیے عدت گزارنا ہوتی ہے، ایسے حالات میں بیوی کا نان ونفقہ یا رہائش کا بندوبست خاوند کے ذمے نہیں۔ کیوں کہ وہ اس کی بیوی نہیں رہی، البتہ وہ بچہ جو والدہ کے پاس ہے، اس کے دودھ پلانے کی اجرت اسے ادا کرنا ہوگی، ماں اس زیر پرورش بچے کا معاوضہ بھی اپنے سابقہ شوہر سے وصول کر سکتی ہے۔ اگر ان کے پاس رہائش نہیں تو رہائش کا بندوبست بھی خاوند کے ذمے ہے۔ باقی رہا حق مہر وہ تو خاوند کے ذمے واجب الادا ہے، اسے ہر صورت میں ادا کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے۔ واللہ اعلم!

نکاح کے موقع پر دیا گیا زیور

] حق مہر کی کم از کم مقدار کیا ہے؟ نیز ہمارے معاشرہ میں شادی کے موقع پر سسرال کی طرف سے لڑکی کو زیور دیا جاتا ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟ کیا اسے مہر میں شامل کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس کی واپسی کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

! بخاری، الطلاق: ۵۲۷۳.

[مہر، اس مال کو کہتے ہیں جو نکاح کے وقت یا اس کے بعد عورت کو ازدواجی تعلقات کے عوض کے طور پر دیا جاتا ہے، قرآن وسنت کے مطابق اس کی ادائیگی ضروری ہے۔ اگر موقع پر ادا کر دیا جائے تو اسے مہر معجّل اور اگر بعد میں کسی وقت ادا کرنا پڑے تو مہر مؤجل کہتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ﴾ 1

’’تم عورتوں کو ان کے حق مہر خوشی خوشی ادا کرو۔‘‘

ہاں اگر بیوی اپنی خوشی سے معاف کر دے تو اس کی ادائیگی ضروری نہیں، قرآن کریم میں اس کی صراحت ہے۔ مہر کے کم از کم یا زیادہ سے زیادہ کی مقدار مقرر نہیں، خاوند اپنی استطاعت کے مطابق ایک خزانہ بھی بطور حق مہر دے سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ﴾ 2

’’اگر تم نے ان عورتوں میں سے کسی کو خزانہ بھی دیا ہو تو طلاق کے وقت تم اسے واپس لینے کے مجاز نہیں ہو۔‘‘

معمولی سے معمولی چیزیں بھی مہر میں دی جا سکتی ہیں جیسا کہ ایک شخص سے رسول اللہ e نے فرمایا: ’’تلاش کرو، اگرچہ لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔‘‘ 3

کچھ بھی پاس نہ ہو تو تعلیم القرآن کو ہی حق مہر مقرر کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ e نے ایک شخص سے فرمایا تھا: ’’جو تمہیں قرآن کا کچھ حصہ یاد ہے میں نے اس کے عوض شادی کر دی۔‘‘ 4

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ کم از کم یا زیادہ سے زیادہ حق مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں۔

شادی کے موقع پر سسرال کی طرف سے لڑکی کو جو زیور دیا جاتا ہے، اگر نکاح کے موقع پر اس کے حق مہر ہونے کی صراحت کر دی جائے تو اسے مہر میں ہی شامل کیا جائے گا، اس کی واپسی کا مطالبہ شرعاً جائز نہیں۔ اگر مہر کی صراحت نہ ہو بلکہ خاوند کی طرف سے بطور تحفہ دیا جائے تو بھی وہ بیوی کی ملکیت ہو گا، اس کا واپس لینا بھی جائز نہیں۔ اگر شوہر نے بیوی کو زیور استعمال کے لیے دیا ہے تو وہ زیور شوہر کا ہی شمار ہو گا البتہ بیوی کو صرف اسے استعمال کرنے کا حق ہو گا، اس کی واپسی کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر زیور دیتے وقت کسی چیز کی صراحت نہ تھی تو معاشرتی طور پر برادری کے رواج کے مطابق فیصلہ ہو گا کہ خاندانی طور پر ایسے موقع پر زیور کس غرض سے دیا جاتا ہے۔ بہرحال انسانی وقار اور شرافت کے خلاف ہے کہ بیوی کو کوئی چیز دے کر پھر اس کی واپسی کا مطالبہ کیا جائے۔ واللہ اعلم!

! النساء:۴.   @ النساء:۲۰.

بخاری، النکاح:۵۰۸۷. $ مسلم، النکاح:۱۴۲۵.

عدالتی خلع کی حیثیت

] پچھلے دنوں اسلامی نظریاتی کونسل نے عدالتی خلع کے متعلق کچھ سفارشات حکومت کو پیش کی ہیں کہ مروجہ عدالتی خلع میں شوہر کی رضامندی کے بغیر عدالت یک طرفہ ڈگری جاری کرتی ہے جو کہ درست نہیں۔ اس سفارش کے متعلق شرعی ہدایات کیا ہیں؟ اس کے متعلق ہماری رہنمائی کریں۔

[اللہ تعالیٰ نے نکاح کے موقع پر خاوند بیوی کی رضامندی کو بنیادی حیثیت دی ہے، اسلام میں ایسے نکاح کی کوئی گنجائش نہیں جس میں مرد اور عورت کی رضامندی شامل نہ ہو۔ اسی طرح اگر نکاح کے بعد مرد و زن میں ایسا اختلاف ہو جائے جس کا کوئی حل نظر نہ آئے تو اسلام نے اس کا متوازن طریقہ سے حل پیش کیا ہے۔ وہ اس طرح کہ خاوند کے لیے طلاق کا طریقہ تجویز کیا ہے اور تفریق کے لیے عورت کو خلع کا حق دیا ہے۔ خلع کے ذریعے عورت اپنے شوہر کو حق مہر واپس کر کے اس سے علیحدگی حاصل کر سکتی ہے، اس خلع کی دو اقسام حسب ذیل ہیں:

☆ اپنے گھر میں ہی معاملہ کو حل کر لیا جائے اور عورت کے مطالبہ پر خاوند اپنی بیوی سے حق مہر وصول کر کے اسے آزاد کر دے۔

☆ اگر شوہر اس پر رضامند نہ ہو تو عورت عدالت سے رجوع کر کے اپنا حق خلع حاصل کر لے۔ اس سلسلہ میں قاضی کا فیصلہ شرعی حیثیت رکھتا ہے جس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے:

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ 1

''اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں میاں بیوی حدود الٰہی پر قائم نہ رہیں گے تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ طے ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی اختیار کر لے، یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدیں ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔''

حدیث میں اس کی وضاحت آتی ہے کہ سیدنا ثابت بن قیس t کی بیوی رسول اللہ e کے پاس آئی، اور عرض کیا یارسول اللہ e! میں ثابت بن قیس پر دینداری اور اخلاق میں کوئی عیب نہیں لگاتی مگر میں یہ نہیں چاہتی کہ مسلمان رہتے ہوئے اس کی ناشکری میں مبتلا ہوں۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ''جو باغ اس نے تمہیں دیا تھا اسے واپس کرتی ہو؟''

وہ کہنے لگی: ''جی ہاں'' اس نے باغ واپس کر دیا تو آپ e نے ثابت بن قیس t کو حکم دیا اور اس نے بیوی کو جدا کر دیا۔'' 2

اس حدیث کے مطابق رسول اللہ e نے بحیثیت قاضی سیدنا ثابت بن قیس t سے اس کی رضامندی کے متعلق

! البقرہ: ۲۲۹.　　　@ بخاری، الطلاق:۵۰۷۶.

دریافت نہیں فرمایا بلکہ عورت کی ناپسندیدگی اور حق مہر کی واپسی پر شوہر کو جدا کرنے کا پابند کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورتیں عدالتی دباؤ کے ساتھ اپنے حق خلع کو شوہر پر نافذ کر دینے کی مجاز ہیں اور اس سلسلہ میں شوہر کی رضامندی ضروری نہیں۔ واللہ اعلم!

طلاق بذریعہ موبائل

] میں نے اپنی بیوی کو موبائل فون پر بذریعہ میسج طلاق دی، طلاق کے ایک دن بعد رجوع کر لیا، جرگہ نے لڑکی کو صلح کے لیے دس دن کی مہلت دی، لیکن وہ صلح کے لیے آمادہ نہ ہوئی، میں نے اس کے بعد رابطہ نہیں کیا۔ ایسے حالات میں کیا طلاق ہو چکی ہے؟

[ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ ہم نے طلاق کو بازیچہ اطفال بنا رکھا ہے، رسول اللہ e نے اس انداز اخلاق کو بنظر تحسین نہیں دیکھا۔

چنانچہ سیدنا ابو موسیٰ اشعری t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انہوں نے اللہ کے قوانین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے، آدمی اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ میں نے تجھے طلاق دی، میں نے تجھ سے رجوع کر لیا، میں نے تجھے طلاق دی۔'' 1

صورت مسئولہ میں بھی اسی طرح کا معاملہ ہے، موبائل فون سے بذریعہ میسج طلاق دی، پھر اگلے دن رجوع کر لیا جبکہ لڑکی اس کے گھر آباد ہونے کے لیے تیار نہیں۔ بلاشبہ نکاح کے بعد طلاق دینے کا اختیار خاوند کو ہے جبکہ سیدنا عبد اللہ بن عباس W سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''طلاق دینا تو اسی کا حق ہے جس نے پنڈلی کو پکڑا۔'' 2

''پنڈلی پکڑنا'' ان بے تکلفانہ تعلقات کی طرف اشارہ ہے جو خاوند اور بیوی میں ہوتے ہیں، اس سے مراد خاوند ہے، اس نے اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے طلاق دی ہے اور اس طرح طلاق ہو جاتی ہے۔ چنانچہ طلاق کے بعد رجوع کرنا بھی اس کا حق ہے، بشرطیکہ آباد کرنے کا ارادہ ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا﴾ 3

''ان کے شوہر تعلقات درست کرنے پر آمادہ ہوں تو وہ دوران عدت انہیں پھر اپنی زوجیت میں واپس لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

سائل نے طلاق دی پھر رجوع کر لیا، اب مطلقہ بیوی اس کی زوجیت میں واپس آ چکی ہے، اگر وہ اپنے خاوند سے خلاصی چاہتی ہے تو اسے خلع لینے کا اختیار ہے لیکن یہ اقدام کسی معقول وجہ سے ہونا چاہیے کیوں کہ بلا وجہ خلع لینا بھی سنگین جرم ہے۔

جیسا کہ حدیث میں ہے:

! بیہقی، ج۷، ص:۳۲۲. @ ابن ماجہ، الطلاق:۲۰۸۱.
البقرہ: ۲۲۸.

''جس عورت نے بغیر سخت مجبوری کے اپنے خاوند سے طلاق مانگی، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ 1

صورت مسئولہ میں طلاق اور رجوع دونوں شریعت کے مطابق ہیں، عورت کو چاہیے کہ جہاں تک خلع سے بچ کر گھر بسانا ممکن ہو، اس کی کوشش کرے۔ اسی طرح مرد کو بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حتی الوسع طلاق جیسے اقدام سے اجتناب کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم!

نابالغہ کا نکاح

] کچھ خاندان اپنی بچی کا چھوٹی عمر میں نکاح کر دیتے ہیں، جو آئندہ عائلی زندگی میں کئی ایک خرابیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ کیا شرعاً ایسا جائز ہے، اگر بچی بالغ ہو کر اس نکاح پر راضی نہ ہو تو شریعت میں اس کا کیا حل ہے؟ اس مسئلہ کے متعلق وضاحت سے تحریر کریں۔

[نکاح کے وقت لڑکی کو عاقل اور بالغ ہونا چاہیے تاہم یہ ضروری نہیں بلکہ چھوٹی عمر میں بھی بچی کا نکاح کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ سیدہ عائشہ r کا بیان ہے کہ رسول اللہ e نے ان سے نکاح کیا جبکہ ان کی عمر چھ سال تھی اور جب رخصتی ہوئی تو ان کی عمر نو سال تھی اور وہ رسول اللہ e کے پاس نو سال تک رہیں۔ 2

اس حدیث کی شرح لکھتے ہوئے علامہ شوکانی a فرماتے ہیں: ''باپ کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح بلوغت سے پہلے کر دے۔'' 3

حافظ ابن حجر a نے اس بات پر علماء امت کا اجماع نقل کیا ہے۔ 4

اس مسئلہ میں صرف ابن شبرمہ کا اختلاف نقل کیا گیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ قبل از بلوغ نکاح جائز نہیں اور رسول اللہ e کا سیدہ عائشہ r سے نکاح آپ کی خصوصیت پر محمول ہے، لیکن اس اختلاف کی بنیاد کسی دلیل پر نہیں اور اسے رسول اللہ e کی خصوصیت قرار دینا بھی غلط ہے کیوں کہ اس کی کوئی دلیل نہیں۔ علماء امت نے اسے عموم پر ہی محمول کیا ہے۔ چنانچہ سرخیل محدثین امام بخاری a نے اپنی صحیح میں اس کے متعلق بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''آدمی کا اپنی چھوٹی عمر کی اولاد کا نکاح کرنا۔'' 5

پھر انہوں نے ایک قرآنی آیت سے اس مسئلہ کا استنباط کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالّٰٓـِٔیْ یَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ﴾ 6

''(مطلقہ کی عدت تین ماہ ہونے کا حکم) ان کا بھی ہے جنہیں ابھی حیض نہ آیا ہو۔''

! ابوداوٗد، الطلاق:۲۲۲۶.

@ بخاری، النکاح:۵۱۵۹.

نیل الاوطار:ج۶،ص۲۵۲.

$ فتح الباری، ج۹، ص۲۳۸.

% بخاری، النکاح، باب نمبر ۳۸.

^ الطلاق:۴.

یعنی کم سنی میں نکاح ہونے کے بعد اگر طلاق ہو جائے تو ایسی بچی کی عدت بھی تین ماہ ہے، اس سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صغر سنی میں نکاح جائز ہے۔ ہاں اگر بالغ ہو کر بچی اس نکاح پر راضی نہ ہو تو شریعت نے خیار بلوغ کے ذریعے اسے خلاصی کا حق دیا ہے۔ لیکن یہ خیار بلوغ عرصہ دراز تک قائم نہیں رہتا، بلکہ اگر کوئی نابالغ بچی اپنے سرپرست کے کیے ہوئے نکاح کو ناپسند کرتی ہے تو اسے چاہیے کہ سن تمیز وشعور کو پہنچتے ہی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دے، بصورت دیگر طرفین کی خاموشی سے رضامندی ہی تصور ہو گی اور خیار بلوغ ساقط ہو جائے گا۔ یہ بھی یاد رہے کہ صرف خیار بلوغ کے استعمال سے نکاح فسخ نہیں ہوتا بلکہ اس سلسلہ میں عدالت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ اگر عدالت تک رسائی نہ ہو تو سرکردہ آدمیوں پر مشتمل پنچائیت میں اپنا معاملہ پیش کر دیا جائے جب تک اپنی ناپسندیدگی کے اظہار کے بعد عدالت یا پنچائیت فیصلہ نہ کرے نکاح فسخ نہیں قرار دیا جا سکتا، کیوں کہ اس کے حق کو لازم کرنے اور فریق ثانی کو اس کے حق سے محروم کر دینے کا اختیار صرف عدالت یا اس کے قائم مقام کو ہے۔ واللہ اعلم!

ولیمہ کی شرعی حیثیت

] ولیمے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس کی مقدار کے متعلق بھی وضاحت کریں۔ نیز بتائیں کہ ولیمہ نکاح کے فوراً بعد کیا جا سکتا ہے یا اس کے لیے میاں بیوی کو اکٹھا ہونا ضروری ہے، کتاب وسنت کے مطابق جواب دیں۔

[ولیمے کا لغوی معنی اجتماع ہے لیکن اس سے مراد میاں بیوی کا جمع ہونا ہے، اس اعتبار سے ولیمہ، شادی کے بعد کی دعوت کے لیے استعمال ہوتا ہے، عمومی طور پر کسی دوسری ضیافت کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ ولیمے کے متعلق درج ذیل حدیث پیش کی جاتی ہے:

سیدنا انس t کا بیان ہے کہ سیدنا عبد الرحمن بن عوف t ایک دفعہ رسول اللہ e کے پاس اس حالت میں آئے کہ ان کے اوپر زرد رنگ کی خوشبو تھی، رسول اللہ e نے اس کے متعلق پوچھا تو بتایا کہ میں نے ایک انصاری خاتون سے شادی کی ہے۔ رسول اللہ e نے پوچھا کہ کتنا مہر دیا ہے؟ عرض کیا ایک گٹھلی کی مقدار سونا بطور حق مہر دیا ہے۔ آپ e نے فرمایا: ولیمہ کرو، خواہ ایک بکری ہی کیوں نہ ہو۔'' 1

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نکاح کرنے والے کو ولیمہ کا اہتمام کرنا چاہیے لیکن یہ اہتمام اس کی مالی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ مالی حیثیت اگر اچھی ہے تو کم از کم ایک بکری ضرور ذبح کی جائے، اگر مالی حیثیت مستحکم نہیں تو اس سے کم کا ولیمہ کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ خود رسول اللہ e نے دوران سفر صرف کھجور اور ستو سے ولیمہ کیا تھا۔ 2

ولیمے کے اہتمام میں اس بات کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ نکاح کا اعلان عام ہو جائے، اس کا وقت کیا ہے؟ سیدنا عبد الرحمن بن عوف t کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ولیمہ رخصتی کے بعد کیا جائے۔ رسول اللہ e نے جب سیدہ زینب r سے نکاح

! بخاری، مناقب الانصار: ۳۷۶۱۔ @ مسلم، النکاح: ۱۳۶۵۔

کیا تھا تو آپ e نے ولیمہ نکاح کے اگلے دن کیا تھا جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے۔ 1

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منکوحہ کو گھر لانے کے بعد دعوت ولیمہ کی جائے لیکن اس کے لیے میاں بیوی کا ملاپ شرط نہیں۔ واللہ اعلم!

کیا شادی غربت کا علاج ہے؟

] ہمارے ہاں واعظین ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے فاقہ کی شکایت کی تو رسول اللہ e نے اسے شادی کرنے کا حکم دیا۔ کیا واقعی شادی کرنے سے غربت دور ہو جاتی ہے؟

[سوال میں ذکر کردہ روایت سیدنا جابر t سے مروی ہے۔ 2

لیکن یہ روایت محدثین کرام کے قائم کردہ معیار صحت پر پوری نہیں اترتی، کیوں کہ اس کی سند میں ایک راوی ابوعثمان سعید بن محمد بن ابوموسیٰ المدنی ہے۔ حافظ ابن جوزی نے اس راوی کو کتاب الضعفاء والمتروکین میں ذکر کیا ہے۔ 3 حافظ ذہبی a نے اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: ''اس حدیث کی کوئی حیثیت نہیں۔'' 4

بہر حال جمہور محدثین نے اس روایت پر جرح کی ہے لہٰذا یہ روایت مردود ہے، البتہ قرآن مجید میں اس امر کا اشارہ ضرور ملتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآىِٕكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ﴾ 5

''تم میں سے جو لوگ مجرد ہیں ان کے نکاح کر دو اور اپنے لونڈی، غلاموں کے بھی جو نکاح کے قابل ہوں، اگر وہ محتاج ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے انہیں غنی کر دے گا۔''

لیکن اس کا قطعاً مطلب یہ نہیں کہ جو بھی محتاج شادی کرے گا تو شادی کے بعد وہ مال دار ہو جائے گا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بسا اوقات انسان نکاح کے بعد احساس ذمہ داری کی وجہ سے پوری طرح محنت کرنے لگتا ہے جو پہلے نہیں کرتا۔ بعض اوقات بیوی کسب معاش کے سلسلہ میں اس کی معاون بن جاتی ہے، کبھی بیوی کے والدین اس سلسلہ میں اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں، کبھی مرد کے لیے کمائی کی ایسی راہیں کھل جاتی ہیں جس کا پہلے وہم وگمان نہیں ہوتا۔ گویا پیدا ہونے والے بچے اپنا رزق اپنے ساتھ لاتے ہیں جس کا ذریعہ ان کا والد بنتا ہے۔

بہر حال یہ خیال سراسر غلط ہے کہ شادی کرتے ہی انسان مالدار ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک روایت بھی بیان کی جاتی ہے جس کی تردید انتہائی ضروری ہے کیوں کہ یہ بے اصل اور خود ساختہ ہے۔ اس روایت کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ e کے

! بخاری، النکاح:۵۱۶۶. @ تاریخ بغداد: ج۱، ص۳۶۵.
ج۳، ص:۳۲۵ $ میزان الاعتدال،ج۲، ص۱۵۶.
% النور:۳۲.

پاس ایک آدمی آیا اور اس نے اپنی غربت کا شکوہ کیا، رسول اللہ e نے اسے شادی کرنے کا حکم دیا، اس نے شادی کی اور پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں تو پہلے سے بھی زیادہ غریب ہو گیا ہوں، رسول اللہ e نے اسے دوسری شادی کرنے کا حکم دیا، وہ اور زیادہ غریب ہو گیا تو آپ e نے اسے تیسری شادی کرنے کا حکم دیا، لیکن اس کی غربت میں مزید اضافہ ہو گیا تو رسول اللہ e نے اسے چوتھی شادی کرنے کا حکم دیا جب اس نے چوتھی شادی بھی کر لی تو اس کی غربت ختم ہو گئی اور وہ امیر ہو گیا۔"

یہ روایت بالکل من گھڑت، خود ساختہ اور جھوٹی ہے، اسے اسلام اور اس کے نظام تعدد ازواج پر چوٹ کرنے کے لیے کسی منچلے نے وضع کیا ہے۔ ہمارے واعظین کو چاہیے کہ وہ ایسی روایات بیان کرنے سے اجتناب کیا کریں۔ واللہ اعلم!

شادی کے موقع پر چھوہارے پھینکنا

] ہمارے ہاں نکاح کے موقع پر چھوہارے پھینکے جاتے ہیں، حاضرین انہیں لوٹتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ایسا کرنا سنت ہے۔ کتاب وسنت سے اس کا کوئی ثبوت ہو تو وضاحت فرما دیں۔

[شادی کے موقع پر چھوہارے وغیرہ لٹانا ناجائز ہے کیوں کہ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی تحقیر ہوتی ہے اور انہیں پاؤں تلے روندا جاتا ہے۔ اس لیے ایک مسلمان کو ایسے کاموں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں جو احادیث بیان کی جاتی ہیں وہ خود ساختہ اور موضوع ہیں، ان میں چند ایک حسب ذیل ہیں:

☆ سیدہ عائشہ e کا بیان ہے کہ رسول اللہ e نے ایک عورت سے شادی کی اور لوگوں نے آپ کے سر پر عجوہ کھجوریں لٹائیں۔

اس روایت میں ایک راوی سعید بن سلام کذاب ہے اور یہ اس کی روایت کردہ باطل حدیث ہے۔ 1

اس راوی کے متعلق امام بخاری a فرماتے ہیں کہ یہ احادیث وضع کرتا تھا۔

امام احمد a کہتے ہیں کہ یہ کذاب راوی ہے۔

امام حاتم a کا کہنا ہے کہ یہ منکر الحدیث ہے۔ 2

☆ سیدہ عائشہ r سے ایک دوسری روایت بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ e ایک انصاری کی شادی میں شریک ہوئے تو وہاں میوے اور شیرینی پھینکی گئی۔ رسول اللہ e نے انہیں لوٹنے کا حکم دیا۔ مزید فرمایا کہ میں نے تمہیں بوقت جنگ لشکر کی لوٹ مار سے منع کیا تھا، اس سے منع نہیں کیا۔

اس روایت میں بھی ایک راوی بشر بن ابراہیم انصاری ہے جو خود ساختہ روایات بیان کرنے کا عادی ہے۔

! الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ: نمبر ۱۲۴.

@ لسان المیزان، ج۳، ص۳۰.

امام طبرانی نے اس روایت کو المعجم الاوسط میں بیان کیا ہے اور اس کی سند کو مجہول قرار دیا ہے۔ 1

ابن عدی کہتے ہیں کہ بشر بن ابراہیم انصاری میرے نزدیک ان لوگوں سے ہے جو موضوع احادیث بیان کرتے ہیں۔ 2

اس کے علاوہ اور بھی احادیث بیان کی جاتی ہیں جن کی استنادی حیثیت انتہائی کمزور ہے۔ ایسی احادیث سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔ بہرحال شادی بیاہ کے موقع پر ایسی رسوم سے اجتناب ضروری ہے جن پر عمل کرنے سے تحقیر کا پہلو نمایاں ہو۔ اللہ تعالیٰ صحیح احادیث پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

عورت کا طلاق نامہ پھاڑ دینا

] میں نے اپنی بیوی کو بذریعہ تحریر طلاق ارسال کی لیکن اس نے وصول کر کے اسے پھاڑ دیا۔ میری بیوی کو محلے کی کسی عورت نے بتایا کہ اس طرح طلاق نہیں ہوتی کیوں کہ تو نے اسے قبول نہیں کیا۔ کیا یہ درست ہے؟

[ہمارے ہاں بچوں کی دیکھ بھال اور نکاح و طلاق کے معاملہ میں ''دین خواتین'' رائج ہے۔ ان کے مشوروں کی بہت اہمیت ہے اور انہیں مانا جاتا ہے۔ جیسا کہ صورت مسئولہ میں محلہ کی ایک خاتون نے طلاق کے متعلق مشورہ دیا ہے کہ اگر بیوی طلاق نامہ کو پھاڑ دے تو وہ طلاق بے کار اور لغو ہو جاتی ہے کیوں کہ عورت نے اسے قبول نہیں کیا۔ حالانکہ طلاق دینا خاوند کا حق ہے۔ اس کے نافذ ہونے کے لیے یہی شرط ہے کہ خاوند عاقل و بالغ ہو اور اپنے عزم و ارادہ سے صراحت کے ساتھ اس لفظ کو استعمال کرے۔ اس کے نافذ ہونے کے لیے بیوی کے علم میں ہونا ضروری نہیں۔

چنانچہ ابن قدامہ لکھتے ہیں: ''اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاق لکھی کہ میری طرف سے تجھے طلاق ہے تو فوراً طلاق واقع ہو جائے گی خواہ بیوی کو یہ تحریر پہنچے یا نہ پہنچے۔'' 3

اس لیے اگر کسی نے اپنی بیوی کو طلاق لکھی اور اسے روانہ کیا یا اسے حوالہ ڈاک تو کر دیا لیکن وہ کہیں راستہ میں گم ہو گئی یا وہ بیوی کے پاس پہنچی لیکن اس نے وصولی سے انکار کر دیا یا وصول کرنے کے بعد اسے پھاڑ دیا یا اس کے والدین میں سے کسی نے کہہ دیا کہ ہم اسے نہیں مانتے، ان تمام صورتوں میں طلاق ہو جائے گی کیوں کہ طلاق دینا خاوند کا حق ہے جو اس نے استعمال کیا ہے۔ عرب شیوخ بھی یہی کہتے ہیں۔

چنانچہ ابن عثیمین a سے کسی نے پوچھا کہ ایک آدمی اپنی بیوی سے لمبے عرصے تک غائب رہا، اس دوران اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، جس کا علم صرف اسے ہی ہے اور اگر وہ اپنی بیوی کو نہ بتائے تو کیا یہ طلاق ہو جائے گی؟ تو شیخ محترم نے جواب دیا: ''اس طرح طلاق واقع ہو جائے گی اگرچہ وہ اپنی بیوی کو اس کے متعلق آگاہ نہ کرے۔ اگر کوئی آدمی یہ کہہ دے کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو ایسا کرنے سے اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی خواہ بیوی کو اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ اگر

! الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ:۱۲۴۔ @ الموضوعات لابن جوزی: ج۲، ص۲۶۵۔
مغنی لابن قدامہ:ج۱، ص ۵۰۵۔

بیوی کو تین حیض گزر جانے کے بعد علم ہو تو اس کی عدت بھی پوری ہو چکی ہو گی۔ حالانکہ اسے اس کا علم ہی نہ تھا۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی فوت ہو جائے اور اس کی بیوی کو خاوند کی وفات کا علم چار ماہ دس دن گزرنے کے بعد ہو تو اس کے ذمے کوئی عدت وفات نہیں۔ اس لیے کہ اس کی مدت عدت تو پہلے گزر چکی ہے۔ 1

صورت مسئولہ میں خاوند نے اپنی بیوی کو طلاق بذریعہ تحریر ارسال کر دی لیکن بیوی نے اسے وصول نہ کیا، اس صورت میں طلاق ہو جائے گی۔ محلے کی عورت کا مشورہ کہ اس طرح طلاق نہیں ہوتی، شریعت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ واللہ اعلم

مسئلہ طلاق

] میری شادی چھ سال قبل ہوئی تھی، میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ اس عرصہ کے دوران میرے شوہر نے وقفہ وقفہ سے تین مرتبہ طلاق دی اور رجوع کر لیا۔ اب چوتھی مرتبہ غصہ میں آکر مجھے دس مرتبہ طلاق کا لفظ کہا، میں نے اپنے والدین سے اس کا تذکرہ کیا تو خاوند نے صاف انکار کر دیا۔ ایسے حالات میں میرے لیے شریعت کا کیا حکم ہے؟

[شادی کے بعد شریعت نے شوہر کو طلاق کے متعلق صرف تین اختیارات دیئے ہیں۔ پہلی دو طلاق کے بعد رجوع کا حق باقی رہتا ہے جبکہ تیسری طلاق کے بعد یہ حق بھی ختم ہو جاتا ہے۔

طلاق کے متعلق درج ذیل باتیں قابل ذکر ہیں جنہیں پیش نظر رکھنا چاہیے۔

☆ طلاق دینے کے فوراً بعد نکاح نہیں ٹوٹتا، بلکہ عدت ختم ہونے تک نکاح باقی رہتا ہے، اس لیے دوران عدت بلا تجدید نکاح رجوع کیا جا سکتا ہے اور عدت گزارنے کے بعد نئے نکاح کے ساتھ اپنا گھر آباد کیا جا سکتا ہے، نئے نکاح کے لیے سرپرست کی اجازت، بیوی کی رضامندی، حق مہر اور گواہوں کی موجودگی ضروری ہے۔

☆ دوسری طلاق کے بعد بھی مذکورہ بالا طریق کار برقرار رہے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ﴾ 2

"طلاق (رجعی) دو بار ہے پھر یا تو سیدھی طرح اپنے پاس رکھا جائے یا پھر بھلے طریقہ سے اسے رخصت کر دیا جائے۔"

یعنی ایسی طلاق جس کے بعد رجوع کرنے کا حق باقی رہتا ہے اسے اللہ تعالیٰ نے دو تک محدود کر دیا ہے۔

☆ جب تیسری طلاق دے دی جائے تو خاوند کے لیے حق رجوع ختم ہو جاتا ہے، اس طلاق کے بعد دوران عدت یا عدت کے بعد عام حالات میں رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے۔ پھر عدت کا تعین تین طرح سے کیا جا سکتا ہے:

ا۔ اگر بیوی حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے خواہ وہ طلاق کے اگلے دن یا چھ ماہ بعد بچے کو جنم دے۔

ب۔ اگر حمل نہیں اور اسے کسی وجہ سے حیض بھی نہیں آتا تو ایسی عورت کی عدت تین قمری مہینے ہے۔

! فتاویٰ نکاح و طلاق، ص:۴۲۸۔ @ البقرہ: ۲۲۹۔

ج۔ اگر عورت کو حیض آتا ہے تو وہ تین مرتبہ حیض آنے تک دوران عدت رہے گی۔

بہر حال تیسری مرتبہ طلاق دینے سے حق رجوع تو ختم ہو جاتا ہے البتہ مطلقہ عورت کو عقد ثانی کرنے کے لیے عدت کے ایام پورے کرنا ہوں گے۔ دوران عدت عقد ثانی ناجائز ہے۔

صورت مسئولہ میں بقول عورت اس کے خاوند نے اسے وقفہ وقفہ سے تین طلاق دی ہیں اور چوتھی مرتبہ اس نے دس مرتبہ اسے لفظ طلاق کہہ دیا ہے۔ لیکن طلاق کے متعلق ضروری ہے کہ خاوند اس کا اعتراف کرے یا اس کے دستخطوں کے ساتھ تحریر موجود ہو یا پھر گواہ موجود ہوں جن کے سامنے اس نے طلاق دی ہے۔ اگر وہ طلاق کا اعتراف نہیں کرتا اور گواہ بھی موجود نہیں ہیں تو اس سلسلہ میں عورت کی بات کا قانونی لحاظ سے اعتبار نہیں ہوگا بلکہ خاوند کی بات کو مانا جائے گا۔ حقیقت کے اعتبار سے اگر عورت سچی ہے لیکن خاوند اسے تسلیم نہیں کرتا تو عورت کو چاہیے کہ وہ اپنے حق مہر کی قربانی دے کر ایسے خاوند سے خلع لے لے اور اس کے ساتھ رہ کر ناجائز زندگی گزارنے سے اجتناب کرے۔ واضح رہے کہ اگر عورت کا بیان مبنی بر حقیقت ہے تو تیسری طلاق کے بعد معاملہ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دس مرتبہ لفظ طلاق کہنا لغو اور فضول ہے کیوں کہ ایسے حالات میں عورت محل طلاق نہیں۔ واللہ اعلم!

شوہر کا بیوی کو چھوڑ جانا طلاق نہیں

] میں شادی شدہ ہوں لیکن میرے شوہر کا میرے ساتھ رویہ صحیح نہیں ہے، وہ مجھے گھر میں چھوڑ کر کئی کئی مہینے باہر رہتا ہے، وہ منہ سے کچھ نہیں کہتا اور نہ ہی طلاق کا اشارہ کرتا ہے، کیا بیوی کو اس طرح چھوڑ جانا طلاق شمار ہوگا؟

[طلاق کا ایک ضابطہ ہے، صرف نیت کرنے سے طلاق نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لیے دو چیزوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے:

☆ اپنی زبان سے دوٹوک الفاظ میں لفظ طلاق استعمال کرے۔

☆ اپنے قلم سے تحریری طور پر اپنی بیوی کو طلاق دے۔

اپنی بیوی کو گھر اکیلے چھوڑ جانے سے طلاق نہیں جب تک وہ زبان یا تحریر سے طلاق نہ دے اور طلاق دینے کا اختیار بھی خاوند کو ہے، جیسا وہ اپنے اختیار کو زبانی یا تحریری طور پر استعمال کرے گا تو طلاق ہو گی بصورت دیگر طلاق نہیں ہوتی۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ طلاق دیتے ہی نکاح ختم نہیں ہوتا جب تک اس کی عدت پوری نہ ہو جائے۔ کیوں کہ دوران عدت، طلاق کے بعد وہ عورت بدستور بیوی رہتی ہے عدت گزر جائے تو تجدید نکاح سے گھر آباد کیا جا سکتا ہے۔ تیسری مرتبہ طلاق دینے سے معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد رجوع کی کوئی صورت نہیں رہتی، بہر حال بیوی کو گھر چھوڑ جانا اگرچہ اخلاقی طور پر معیوب ہے لیکن اس سے طلاق نہیں ہوتی ہے۔ واللہ اعلم!

نکاح کے لیے ایجاب وقبول

] سسرال کے اصرار پرلڑکی کے نکاح کا ایجاب وقبول بذریعہ فون ہوا تاکہ بیرون ملک جانے کے لیے سفری دستاویزات تیار کی جاسکیں، لیکن ابھی نکاح فارم پرلڑکے کے دستخط نہیں ہوئے تھے کہ باہمی اختلاف ہوگیا، کیا اس طرح نکاح ہوجاتا ہے؟ اگر ہوجاتا ہے تو خلاصی کی کیا صورت ہوگی؟

[نکاح کی بنیادی شرط تو ایجاب وقبول ہے، اس کے علاوہ کچھ شرائط حسب ذیل ہیں:

☆ ولی کی اجازت ☆ گواہوں کی موجودگی ☆ حق مہر کا ہونا

اگر مجلس نکاح میں ایجاب وقبول ہو چکا ہے، اگرچہ فون پر ہی ہو اس سے نکاح مکمل ہو چکا ہے۔ نکاح فارم پر لڑکے کے دستخط ایک قانونی تقاضا ہے جسے پورا کیا جاتا ہے، اگر دستخط ہونے سے پہلے باہمی اختلاف ہوجاتا ہے تو اس سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، شرعی طور پر یہ دونوں اب میاں بیوی بن چکے ہیں۔ اب خلاصی کی دو صورتیں حسب ذیل ہیں:

☆ لڑکے سے طلاق لی جائے۔

جیسا کہ حدیث میں ہے: ''طلاق کا حق اسی کو ہے جو پنڈلی کو پکڑتا ہے۔'' (پنڈلی پکڑنے کو بطور کنایہ استعمال کیا گیا ہے، اس سے مراد خاوند ہے۔ خاوند سے طلاق لے کر ہی خلاصی ممکن ہے۔) 1

☆ اگر لڑکا طلاق نہیں دیتا تو خلاصی کی دوسری صورت خلع ہے، جس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ میاں بیوی رضامندی سے خلع پر اتفاق کرلیں اور بیوی نے اگر حق مہر وصول کرلیا ہے تو وہ خاوند کو واپس کردے۔

۲۔ اگر باہمی رضامندی سے خلع پر اتفاق نہیں ہوتا تو عدالت کے ذریعے خلع لیا جائے، لڑکی کی طرف سے فیملی کورٹ میں خلع کے لیے درخواست دی جائے۔ پھر جس تاریخ کو فیصلہ ہو تو اسے شرعی خلع تصور کیا جائے گا اور لڑکی آزاد ہوجائے گی۔ اس لیے گواہوں کی موجودگی میں لڑکی کا یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ ''میں نے تم سے خلع لے لیا۔''

بہرحال ایسے معاملات سنجیدگی کے ساتھ سرانجام دیئے جائیں، اسے کھیل اور تماشہ نہ بنایا جائے۔

میسج کے ذریعے طلاق

] میرے خاوند نے مجھے sms کے ذریعے طلاق دی ہے، کیا شرعی طور پر اس طلاق کا اعتبار کیا جائے گا، جبکہ اس نے زبانی طور پر مجھے کچھ نہیں کہا۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

[عقد نکاح کے بعد طلاق دینا خاوند کا حق ہے، وہ بوقت ضرورت جب چاہے اسے استعمال کرسکتا ہے، اسے زبانی طور پر ہی نہیں بلکہ تحریری طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''طلاق صرف اس کا حق ہے جس نے پنڈلی کو تھام رکھا ہے۔'' 2

! ابن ماجہ، الطلاق: ۲۰۸۱۔ @ ابن ماجہ، الطلاق: ۲۰۸۱۔

طلاق کے لیے عورت کی رضامندی بھی ضروری نہیں، کیوں کہ طلاق کے کلی اختیارات صرف خاوند کے پاس ہیں، بلکہ اگر کسی وجہ سے طلاق کا علم عورت کو نہ ہوتو بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔میسج کے ذریعے طلاق دینا تحریری طور پر طلاق دینا ہے۔ جب اس امر کی تصدیق ہو جائے کہ طلاق کا میسج واقعی اس کے خاوند کا ارسال کردہ ہے تو اس سے طلاق ہو جاتی ہے، بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شرارت کے طور پر کسی کی بیوی کو طلاق sms روانہ کر دیتا ہے۔ اس بناء پر اس کی تصدیق ضرور ہونی چاہیے کہ واقعی عورت کے خاوند نے ہی یہ میسج روانہ کیا ہے۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ایک مجلس میں متعدد میسج روانہ کرنے سے ایک ہی طلاق ہوگی اور اگر وقفہ وقفہ سے میسج روانہ کیے ہیں، مثلاً ہفتہ یا مہینے کے بعد تو ہر میسج سے طلاق ہو جائے گی۔ اس مقام پر بھی تصدیق کی جائے کہ وقفہ وقفہ سے واقعی اس کے خاوند نے sms روانہ کیے ہیں یا نیٹ ورک کے ذریعے خود بخود میسج آتے رہے ہیں۔ کیوں کہ ایسا ممکن ہے، اگر نیٹ ورک کے ذریعے خود بخود sms کی ترسیل وقفہ وقفہ سے ہوتی ہے تو اس سے ایک طلاق واقع ہوگی۔ انہیں متعدد علاقوں پر محمول نہیں کیا جائے۔ بہر حال طلاق زبانی ہو یا تحریری، وہ تحریر قلم سے ہو یا sms کے ذریعے، ان سے طلاق ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم!

انٹرنیٹ کے ذریعے نکاح

] ہمارے ہاں انٹرنیٹ کے ذریعے ایک نکاح ہوا، لڑکی والوں کے ہاں لڑکا موجود نہیں تھا، البتہ اس کے عزیز و اقارب موجود تھے، اس کی بھی تصویر سکرین پر نمایاں تھی اور ایجاب وقبول بھی اس نے ہی کیا ہے، کیا اس طرح شرعی طور پر نکاح ہو جاتا ہے؟

[شریعت نے معاشرہ کو پاک صاف رکھنے کے لیے سنت نکاح کو اجاگر کیا ہے، اس کے متعلق رسول اللہ e کے ارشاد گرامی ہے: ''نکاح نگاہ کو نیچا اور شرمگاہ کی حفاظت کرتا ہے۔''1

اس نکاح کی کچھ شرائط حسب ذیل ہیں:

☆ میاں بیوی کا تعین ہو اور وہ دونوں اس پر رضامند ہوں۔
☆ عورت کے سرپرست کی اجازت اور رضامندی شامل ہو۔
☆ مجلس نکاح میں دو عادل گواہ موجود ہوں۔
☆ مہر بھی موجود ہو اور باقاعدہ نکاح کا اعلان ہو۔

اگر یہ شرائط پائی جائیں تو نکاح شریعت کے مطابق صحیح اور درست ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی شرط مفقود ہو تو شرعاً نکاح صحیح نہیں ہوگا۔ دلہے کا مجلس نکاح میں ہونا شرط نہیں ہے، اگر کسی طریقہ سے وہ خود یا اس کا وکیل ایجاب وقبول کرتا ہے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ انٹرنیٹ کے ذریعے اگرچہ وہ ذاتی طور پر مجلس نکاح میں موجود نہیں ہوتا لیکن وہ بات چیت کر

! بخاری، النکاح: ۵۰۶۶.

سکتا ہے بلکہ اس کی نقل وحرکت اور تصویر بھی نیٹ پر آتی ہے۔لڑکی والے بھی اسے پہچانتے ہیں کہ یہ وہی شخص ہے جس سے ہماری بچی کا نکاح ہورہا ہے۔سیدہ ام حبیبہ r جب ہجرت کر کے سرزمین حبشہ روانہ ہوئیں تو وہاں ان کا خاوند عبید اللہ بن جحش مرتد ہوگیا اور نصرانی بن گیا۔اسی حالت میں اسے موت آگئی۔سیدہ ام حبیبہ r کی عدت ختم ہونے کے بعد شاہ حبشہ نجاشی t نے اسے پیغام نکاح بھیجا کہ رسول اللہ e آپ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔چنانچہ ان کی رضامندی سے شاہ حبشہ t نے آپ کا نکاح رسول اللہ e سے کروادیا اور اپنی طرف سے انہیں حق مہر ادا کر دیا۔ 1

رسول اللہ e اس مجلس نکاح میں موجود نہیں تھے، اس کے باوجود آپ کا نکاح سیدہ ام حبیبہ r سے ہوا پھر انہیں شرجیل بن حسنہ t کے ہمراہ مدینہ طیبہ روانہ کر دیا گیا، بہرحال نیٹ پر نکاح صحیح ہے بشرطیکہ اس میں نکاح کی شرائط پائی جائیں۔واللہ اعلم!

سہاگ رات دو رکعت پڑھنا

] ہمارے ہاں دیندار طبقے میں مشہور ہے کہ سہاگ کی رات میاں بیوی دو رکعت ادا کریں، اس کے متعلق شرعی ہدایات کیا ہیں؟ کیا احادیث میں اس کی کوئی دلیل ملتی ہے؟ اس مسئلہ کو وضاحت سے بیان کریں۔

[سہاگ کی رات میاں بیوی کا دو رکعت پڑھنا، اس کے متعلق تلاش بسیار کے باوجود رسول اللہ e سے مروی کوئی صحیح حدیث ہمیں دستیاب نہیں ہوسکی، البتہ بعض صحابہ کرام y نے سہاگ رات بیوی کے پاس جاتے وقت دو رکعت پڑھی ہیں۔ 2

اس رات شرعی ہدایت یہ ہے کہ بیوی کی پیشانی پکڑ کر حسب ذیل دعا پڑھے: ((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ خَیْرَھَا وَخَیْرَ مَا جَبَلْتَھَا عَلَیْہِ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّھَا وَمِنْ شَرِّ مَا جَبَلْتَھَا عَلَیْہِ)) ے اللہ! میں اس کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور اس خیر کا بھی جس پر تو نے اسے پیدا کیا ہے اور اس کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اس شر سے بھی جس پر تو نے اسے پیدا کیا ہے۔'' 3

یقیناً ہر فرد اور ہر ہر چیز میں خیر و برکت اس وقت ہوسکتی ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس میں مقدر فرمائی ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ اس کا سوال کیا جائے اور کسی چیز یا شخص میں پایا جانے والا شر بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے اور اس سے تحفظ کا سوال بھی اللہ تعالیٰ ہی سے ہونا چاہیے۔خاص طور پر بیوی کا معاملہ تو بہت ہی اہم ہے کیوں کہ وہ بھی زندگی کی گاڑی کا ایک پہیہ ہے، تقابل کے طور پر بیوی بھی اپنے شوہر کے متعلق اللہ تعالیٰ سے خیر و برکت کی دعا اور اس کے شر سے پناہ مانگ سکتی ہے، اگرچہ حدیث میں اس کی صراحت نہیں۔اگر خاوند کو اندیشہ ہو کہ ایسا کرنے سے بیوی اس سے نفرت کرے گی کہ اس میں شر ہے جس سے پناہ مانگی جارہی ہے تو مذکورہ دعا کو آہستہ پڑھ لے۔

! ابو داؤد، النکاح:۲۰۸۶۔ @ مصنف عبد الرزاق، ج۶، ص۹۱۔
ابو داؤد، النکاح:۲۱۶۰۔

بہر حال ہمارے دیندار طبقہ میں دو رکعت پڑھنے کا رجحان کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ دعا مسنون ضرور پڑھنی چاہیے۔ واللہ اعلم!

طلاق کی مشروعیت اور اس کے اسباب

] عام طور پر طلاق کے متعلق ایک حدیث بیان کی جاتی ہے: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔'' اس حدیث کی کیا حیثیت ہے؟ کیا کسی وجہ سے بیوی کو طلاق دی جا سکتی ہے اور اس کے کیا اسباب ہیں؟

[کسی معقول وجہ کی بناء پر اپنی بیوی کو طلاق دینا ایک مباح امر ہے، رسول اللہ e نے بھی اپنی ایک بیوی کو طلاق دی تھی اور پھر رجوع کر لیا تھا۔ 1

اسی طرح سیدنا عبد اللہ بن عمر t کو اپنی بیوی سے محبت تھی لیکن سیدنا عمر t کو ان کا اس کے ساتھ رہنا پسند نہ تھا، انہوں نے اس بات کا تذکرہ رسول اللہ e سے کیا تو آپ e نے سیدنا عبد اللہ بن عمر t کو بلایا اور فرمایا: ''عبد اللہ اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔'' چنانچہ انہوں نے طلاق دے دی۔ 2

ایسا نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ e کوئی ایسا حکم ارشاد فرمائیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مکروہ اور ناپسندیدہ ہو۔ سوال میں ذکر کردہ حدیث کو امام ابوداؤد a نے کتاب الطلاق میں بیان کیا ہے، امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے، اور علامہ ذہبی a نے اس کی توثیق کی ہے۔ 3

مگر امام ابوحاتم، دارقطنی اور بیہقی a نے اسے مرسل قرار دیا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے علامہ البانی a نے اس روایت کو ضعیف ابی داؤد میں درج کیا ہے۔ شاید کراہت کی وجہ ان اسباب کی کراہت ہے جن کے پیش نظر اس ہتھیار کو استعمال کیا جاتا ہے۔

طلاق دینے کے جائز اسباب حسب ذیل ہیں:

☆ خاوند اور بیوی کے درمیان عدم موافقت، وہ اس طرح کہ کسی ایک کی طرف سے دوسرے کے لیے دل میں کوئی نرم گوشہ نہ ہو یا پھر دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہوں۔

☆ عورت کا بدخلق ہونا، نیکی اور خیر کے کاموں میں شوہر کی اطاعت نہ کرنا۔

☆ خاوند کا بدکردار ہونا، بیوی پر ظلم وستم کرنا، اس کے ساتھ ناانصافی کرنا اور اس کے حقوق ادا نہ کرنا۔

☆ دونوں میں سے کسی ایک یا دونوں کا کسی گناہ میں ملوث ہونا جس کی بناء پر ان کے حالات اس قدر کشیدہ ہو جائیں کہ طلاق ہو جائے۔

! مستدرک الحاکم، الطلاق:۲۷۸۴.   @ ابو داؤد، الطلاق:۲۲۸۳.

ترمذی، الطلاق:۱۱۹۸.

☆ بیوی کے ساس اور سسر کے ساتھ معاملات خراب ہوں اور وہ ان کے ساتھ حکمت کے ساتھ پیش نہ آ سکے۔

اس طرح کئی دوسرے اسباب بھی ہو سکتے ہیں۔اہل علم نے طلاق کو پانچ اقسام میں تقسیم کیا ہے:

☆ جائز...... یہ اس وقت ہے جب اس کی ضرورت پیش آئے۔

☆ مکروہ...... وہ طلاق ہے جو بلا وجہ دی جائے۔

☆ مستحب...... وہ ہے جو بیوی کے طلب کرنے پر دی جائے۔

☆ واجب...... اس وقت ہے جب طلاق نہ دینے میں بیوی کا نقصان ہو۔

☆ حرام...... اس وقت ہے جب شریعت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دی جائے، جیسا کہ دوران حیض طلاق دینا۔

بہر حال طلاق دینا جائز امر ہے، لیکن یہ جائز نہیں کہ خاوند اپنی بیوی کو کسی معقول وجہ کے بغیر طلاق دے۔ واللہ اعلم!

طلاق دینے کا حق صرف مرد کو ہے

] میری شادی دس سال قبل ہوئی، کسی وجہ سے میرا اپنے سسر سے اختلاف ہوا تو میرے سسر نے اپنے بیٹے کی طرف سے مجھے طلاق دے دی، کیا شوہر کے علاوہ کسی بھی دوسرے مرد کو طلاق دینے کا حق ہے؟ وضاحت فرما دیں۔

[طلاق میں اصل تو یہی ہے کہ اس کا اختیار شوہر کے ہاتھ میں ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ﴾ 1

''اے نبی! (اپنی امت سے کہہ دو) جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت میں طلاق دو۔''

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''طلاق صرف اس کا حق ہے جس نے پنڈلی کو تھام رکھا ہے۔'' 2

اس سے مراد شوہر ہے، اللہ کی عظیم حکمت ہے کہ اس نے یہ معاملہ خاوند کے سپرد کیا ہے۔

اس کی وجوہات حسب ذیل معلوم ہوتی ہیں:

☆ مرد قوت عقل اور معاملات کے نتائج تک رسائی حاصل کرنے میں کامل دسترس رکھتا ہے، جبکہ عورت ناقص عقل اور وسعت ادراک میں کامل نہیں۔

☆ مرد اخراجات کا ذمہ دار ہے اور اپنے خاندان کی کفالت کرنے والا ہے، اس بناء پر طلاق دینے کا حق بھی اسے دیا گیا ہے۔

☆ مہر کی ادائیگی شوہر کے ذمے ہے، اس لیے طلاق کا حق دار بھی اسی کو ٹھہرایا گیا ہے تاکہ عورت طمع اور لالچ میں نہ پڑ جائے۔

اللہ تعالیٰ کے درج ذیل فرمان میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا ﴾ 3

! الطلاق:۱.   @ ابن ماجہ، الطلاق:۲۰۸۱.

النساء:۳۴.

’’مرد، عورتوں پر حاکم ہیں۔ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر برتری دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ انہوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔‘‘

ان دلائل کا تقاضا ہے کہ طلاق صرف شوہر کے ہاتھ میں ہو یا پھر اس شخص کے ہاتھ میں جو شرعاً شوہر کا قائم مقام ہو، مثلاً شوہر نے اسے اس سلسلہ میں وکیل مقرر کیا ہو۔ صورت مسئولہ میں شوہر کے باپ کو یہ حق نہیں کہ وہ بیٹے کی طرف سے اپنی بہو کو طلاق دے۔ ہاں اگر شوہر نے اپنے باپ یعنی بیوی کے سسر کو طلاق دینے کا باضابطہ اختیار دیا ہو تو پھر اس کے طلاق دینے سے طلاق واقع ہو جائے گی۔ واللہ اعلم!

سن رسیدہ کے لیے عدت وفات

] ہماری دادی عمر رسیدہ ہیں اور ان کے شوہر بیرون ملک کسی حادثہ میں فوت ہو گئے ہیں۔ وفات کے چھ ماہ بعد دادی اماں کو اطلاع ملی، کیا اس صورت میں اس پر عدت وفات ہو گی؟ وضاحت فرما دیں۔

[اگر کسی عورت کا شوہر فوت ہو جائے تو اس پر عدت وفات ہے، جو چار ماہ دس دن ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ 1

’’تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن عدت میں رکھیں۔‘‘

شوہر کی وفات پر یہ عدت ہر بیوی پر لازم ہے خواہ وہ عمر رسیدہ ہو یا جسے مردوں کی حاجت نہیں یا وہ چھوٹی عمر والی ہے جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچی، واضح رہے کہ خاوند کی وفات کے بعد بیوی کی عدت شروع ہو جاتی ہے۔ اگر بیوی حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔ اگر بیوی کو اپنے خاوند کی وفات کا علم چھ ماہ بعد ہوا تو اس کی عدت ختم ہو چکی ہے۔ اب مزید اسے عدت گزارنے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ اسے علم ہی چھ ماہ بعد ہوا جبکہ مذکورہ عدت گزر چکی ہے۔

صورت مسئولہ میں بیوی کو چھ ماہ بعد وفات کا علم ہوا ہے اس لیے اب از سر نو عدت گزارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ واللہ اعلم!

طلاق کے لیے غیر صریح الفاظ

] میرے والد بیمار، معذور اور ستر سال کی عمر میں ہیں، انہوں نے کافی عرصہ پہلے میری والدہ کو طلاق دی، پھر رجوع کر کے گھر آباد کر لیا، اس کے کچھ عرصہ بعد پھر طلاق دی اور رجوع کر لیا، اب کچھ دنوں پہلے انہوں نے والدہ سے کہا، کہ تم آزاد ہو، ہم پریشان ہیں، کہ اگر یہ طلاق ہے تو انہیں کون سنبھالے گا، انہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ میرا مقصد یہ تھا کہ اگر تم نے میری خدمت نہیں کرنی تو اپنے گھر کے کام کاج کے لیے تم آزاد ہو۔ اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں۔

---

1 البقرہ: ۲۳۴.

] نکاح کے بعد خاوند کو تین طلاق دینے کا اختیار ہے۔پہلی اور دوسری طلاق کے بعد رجوع کی گنجائش ہوتی ہے جبکہ تیسری طلاق فیصلہ کن ہوتی ہے کہ اس کے بعد رجوع کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔سائل کے والد نے طلاق کے متعلق اپنے دو اختیارات کو استعمال کرلیا، اب تیسرے اختیار کو واضح طور پر نہیں بلکہ کنایہ کی شکل میں استعمال کیا ہے، واضح رہے کہ طلاق کی دو اقسام ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ صریح طلاق...... واضح اور دوٹوک انداز میں لفظ طلاق استعمال کیا جائے، اس صورت میں طلاق ہو جاتی ہے، انسان کی نیت وغیرہ کو نہیں دیکھا جاتا، اگر مذاق کے طور پر بھی اس لفظ کو استعمال کیا جائے تو بھی طلاق ہو جاتی ہے تاہم اگر بھول کر یا غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے یہ لفظ نکل گیا، تو ایسا کہنے سے طلاق نہیں ہوتی۔

☆ کنائی طلاق......لفظ طلاق دوٹوک انداز میں نہ کہا جائے بلکہ اشارے یا کنایہ سے کام لیا گیا ہو۔مثلاً میری طرف سے تو آزاد ہے، میری طرف سے تو فارغ ہے، تو اپنے میکے چلی جاؤ، میں تجھے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا، ایسے الفاظ استعمال کرتے وقت انسان کی نیت کو دیکھا جاتا ہے اگر نیت طلاق کی ہے تو طلاق واقع ہو گی بصورت دیگر طلاق نہیں ہو گی، کیوں کہ بعض اوقات انسان اپنی بیوی کا دماغ درست کرنے کے لیے اس قسم کے الفاظ بطور دھمکی استعمال کرتا ہے۔

رسول اللہ e نے ایک دفعہ اپنی منکوحہ ''ابنۃ جون'' کو بایں الفاظ طلاق دی تھی کہ ''تو اپنے گھر چلی جا۔'' 1

لیکن مذکورہ الفاظ سیدنا کعب بن مالک t نے اپنی بیوی سے کہے تھے اور ان کا ارادہ طلاق دینے کا نہیں تھا، اس لیے انہیں طلاق شمار نہیں کیا گیا۔ 2

صورت مسئولہ میں سائل کے والد نے اپنی بیوی سے کہا ''تو آزاد ہے'' چونکہ ستر سالہ بزرگ نے پہلے دو طلاقیں وقفے وقفے سے دی ہیں اور ان سے رجوع بھی کرلیا ہے، آثار وقرائن بتاتے ہیں کہ انہوں نے فیصلہ کن انداز میں یہ الفاظ کہے ہیں، لیکن وضاحت کردی ہے کہ میرا مقصد طلاق دینے کا نہیں تھا بلکہ میں نے یہ الفاظ اس ارادے سے کہے تھے کہ اگر تم نے میری خدمت نہیں کرنی تو اپنے گھر کے کام کاج کے لیے تم آزاد ہو، اس وضاحت کے بعد ہم کہتے ہیں کہ مذکورہ الفاظ طلاق کے لیے نہیں ہیں۔اس وضاحت کے باوجود ہم ستر سالہ بزرگ سے یہ کہنا چاہتے ہیں: ''بزرگو! آپ نے قبل ازیں دو دفعہ حق طلاق استعمال کرلیا ہے، آئندہ کے لیے بریک پر پاؤں رکھ کر زندگی کے ایام پورے کریں، اگرچہ اس عمر میں انسان کی عقل وفکر کافی حد تک زوال پذیر ہوتی ہے، آپ کے پاس آخری فیصلہ کن اختیار باقی ہے، ایسا نہ ہو کہ آپ اسے دیدہ دانستہ دوٹوک الفاظ میں استعمال کریں پھر نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔'' واللہ اعلم!

عقد نکاح کا خود بخود ختم ہونا

] میں ساؤتھ افریقہ میں ملازمت کرتا ہوں، چند دن کی چھٹی پر اپنے ملک پاکستان آیا، یہاں آ کر میں نے شادی

! بخاری، الطلاق:۵۲۵۴. @ بخاری، المغازی:۴۴۱۸.

کی، لیکن ناگزیر اسباب کی بناء پر رخصتی نہ ہو سکی، اب میں واپس جائے ملازمت پر آ چکا ہوں، مجھے بیوی کا ویزہ نہیں مل رہا، تقریباً نکاح پر ایک سال گزر چکا ہے۔ مجھے کچھ دوستوں نے کہا ہے کہ تمہارا نکاح ختم ہو چکا ہے کیوں کہ نکاح کے بعد اس کی تکمیل ضروری تھی، اب میں پریشان ہوں۔ اس سلسلہ میں میری رہنمائی کریں۔

] نکاح انسانی زندگی میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بشرطیکہ آداب وشرائط اور اس کی حدود کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے۔ نکاح کے بعد ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، نئے نئے مسائل سے واسطہ پڑتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں شریعت سے راہنمائی لی جائے۔ بصورت دیگر پریشانی انسان کا مقدر بن جاتی ہے۔

واضح رہے کہ نکاح کے صحیح ہونے کے لیے درج ذیل آداب کو ہونا ضروری ہے۔

☆ عورت کے سرپرست کی برضا ورغبت اس نکاح پر آمادگی۔

☆ بلا جبر واکراہ عورت کی رضامندی۔ زبردستی نکاح نہیں ہوتا۔

☆ ایجاب وقبول، ایجاب عورت کے سرپرست سے پیشکش کا نام ہے اور خاوند کا اس پیشکش کو منظور کرنا قبول کہلاتا ہے۔ ایجاب وقبول نکاح کے لیے رکن اعظم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆ یہ ایجاب وقبول کم از کم دو عادل گواہوں کی موجودگی میں ہو۔

ان آداب سے عقد نکاح مکمل ہو جاتا ہے، اس سے عورت بیوی اور مرد اس کا خاوند بن جاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں کے کچھ حقوق وفرائض ہیں جن کی پاسداری ضروری ہوتی ہے۔

پھر اس نکاح کے ختم ہونے کے کچھ اسباب ہیں، مثلاً:

☆ خاوند اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور عورت کی عدت ختم ہو جائے۔

☆ بیوی، اپنے خاوند سے خلع حاصل کر لے، فیصلہ خلع سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔

☆ دونوں میں سے کوئی دین اسلام سے برگشتہ ہو جائے۔

صورت مسئولہ میں عقد نکاح صحیح ہے اور اس عقد سے میاں بیوی بن چکے ہیں۔ اگرچہ بعض ناگزیر اسباب کی بناء پر رخصتی نہیں ہوئی، تاہم اس سے عقد نکاح پر کوئی منفی اثر نہیں پڑتا اور وہ اپنے اصل پر باقی ہے۔ سائل کے دوستوں نے جو کہا ہے کہ اب نکاح ختم ہو چکا ہے کیوں کہ نکاح کے بعد اس کی تکمیل نہیں ہوئی، یہ بات غلط ہے اور بے بنیاد ہے۔ البتہ جہلاء یہ کہتے ہیں کہ نکاح کے بعد اگر چھ ماہ کے اندر اندر ملاپ نہ ہو تو نکاح ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اللہ کی شریعت میں اس قسم کی شرط کا کوئی ذکر نہیں۔ اس مناسبت سے ہم یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ علم کے بغیر فتویٰ دینا گمراہی ہے جس کی ہمیں اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفاظت وامان میں رکھے۔

نکاح کے وقت حقیقی نکاح کی نیت نہیں

] میں نے ایک لڑکی سے اس کے والدین کی اجازت اور دو گواہوں کی موجودگی میں نکاح کیا، لیکن میری نیت شادی کی نہیں تھی، ہم اس کاغذی کاروائی کے ذریعے بیرون ملک جانا چاہتے تھے تاکہ وہاں جا کر وہ اور میں اپنی پسند کی شادی کرلیں، چنانچہ ہم نے بیرون ملک جا کر اپنی اپنی پسند کی شادیاں طے شدہ پروگرام کے مطابق کرلیں۔ کیا ایسا کرنا صحیح تھا؟

[اسلام میں آباد کاری کی نیت کے علاوہ کسی اور مقصد کے پیش نظر نکاح کرنا درست نہیں۔ آباد کاری میں بھی یہ نیت ہو کہ ہم نے ہمیشہ کے لیے اکٹھے رہنا ہے، کسی خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عارضی طور پر آباد کاری کی نیت کرنا بھی صحیح نہیں، دین اسلام میں جب مکمل شروط کے ساتھ ایجاب وقبول ہو جائے تو نکاح واجب ہو جاتا ہے خواہ عقد نکاح کرنے والے طرفین یا ان میں سے کوئی ایک یہ نکاح بطور کھیل و مذاق ہی کر رہا ہو، تمام سنجیدہ اہل علم کا اس پر اتفاق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نکاح وطلاق کے مسائل بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَتَّخِذُوٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا﴾ 1

''تم اللہ کے احکام و مسائل کو ہنسی اور کھیل کا ذریعہ نہ بناؤ۔''

اسی آیت کی بناء پر اللہ کے احکام کو استہزاء و مذاق کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے، رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''تین باتیں ایسی ہیں اگر کوئی ان کو حقیقت اور سنجیدگی میں کہے تو حقیقت ہیں اور اگر ہنسی اور مذاق میں کہے تو بھی حقیقت ہیں۔ نکاح، طلاق اور طلاق سے رجوع۔'' 2

اس قرآنی آیت اور حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک شرعی ذمہ داری قبول کرتے وقت یا اس سے دست بردار ہوتے وقت انسان کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر اس کے نتائج پر غور کر لینا چاہیے تاکہ بعد میں ندامت و پریشانی نہ ہو۔

صورت مسئولہ میں جب نکاح کی شرائط موجود ہیں تو یہ عقد نکاح صحیح ہے۔ اس میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ نیت نکاح کی نہیں تھی۔ ہمارے نزدیک نکاح کے وقت اس طرح کی نیت کرنا اپنی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کرنے کا ایک چور دروازہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کے احکام کے ساتھ ایک مذاق کی صورت ہے جو ایک مسلمان کی شان کے خلاف ہے۔ بہرحال سوال میں ذکر کردہ ''کاغذی کاروائی'' سے فریقین نکاح کے بندھن میں آچکے ہیں، اگرچہ ان کی نیت بیرون ملک جا کر اپنی اپنی شادیاں کرنا تھا، اگر یہی بات تھی تو والدین کو پہلے سے اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا جاتا تاکہ وہ اس کے لیے کوئی اور راستہ نکالتے، عقد نکاح کو اس کے لیے استعمال کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ڈراموں اور فلموں میں فرضی طور پر میاں بیوی کا کردار ادا کرنا بھی صحیح نہیں کیوں کہ اندیشہ ہے کہ اللہ کے ہاں ایسا کرنے سے وہ میاں بیوی ہی متصور ہوں جبکہ وہ ایسا نہیں سمجھتے اور نہ ہی اس کے مطابق باہم معاملہ کرتے ہیں۔ واللہ اعلم!

! البقرہ: ۲۳۱. @ ابو داوٗد، الطلاق:۲۱۹۴.

دو بہنوں کو نکاح میں لانا

] میرے ایک دوست کی شادی کو پندرہ سال ہو گئے ہیں۔ اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں، اس کی بیوی نے کہا ہے کہ میں اپنی ہمشیرہ کو آپ کے نکاح میں لاتی ہوں، سسرال والے بھی ایسا کرنے پر تیار ہیں، کیا دونوں بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھا جا سکتا ہے؟

[دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا حرام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ﴾ 1

''تمہارا دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، ہاں جو گزر گیا وہ گزر گیا۔''

اس آیت کی رو سے دو بہنوں کو نکاح میں اکٹھا کرنا حرام ہے۔ رسول اللہ e نے ازواج مطہرات سے فرمایا تھا: ''تم مجھے نکاح کے لیے اپنی بیٹیوں اور اپنی بہنوں کی پیشکش نہ کیا کرو۔'' 2

سیدہ ام حبیبہ r نے ایک مرتبہ رسول اللہ e سے عرض کیا، یا رسول اللہ! میری بہن جو ابوسفیان t کی بیٹی ہے، آپ اس سے نکاح کر لیں، رسول اللہ e نے فرمایا: ''کیا تم اسے پسند کرتی ہو؟''

انہوں نے عرض کیا، کیوں نہیں، میں تنہا تو آپ کی بیوی نہیں ہوں اور مجھے زیادہ پسند ہے کہ میری بہن بھی خیر و برکت میں میرے ساتھ شریک ہو جائے۔ رسول اللہ e نے فرمایا: ''وہ تو میرے لیے حلال نہیں۔'' 3

امام بخاری a نے حدیث پر درج ذیل عنوان قائم کیا ہے: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور یہ بھی حرام ہے کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں جمع کرو۔'' 4

اس آیت و احادیث سے معلوم ہوا کہ دو بہنیں (رضاعی ہوں یا حقیقی) ان سے بیک وقت نکاح حرام ہے البتہ ایک کی وفات کے بعد یا طلاق کی صورت میں عدت گزرنے کے بعد دوسری بہن سے نکاح جائز ہے۔ اگر کسی گھر میں دو بہنیں ہیں تو مذکورہ قرآنی حکم معلوم ہونے کے فوراً بعد ایک کو طلاق دے دی جائے۔

ہم حیران ہیں کہ روشن خیالی کے اس دور میں لوگ اس واضح حکم سے کیوں بے خبر ہیں؟ اولاد کی خاطر ایک حرام کام کا ارتکاب کرنا انتہائی قابل مذمت ہے۔ بہرحال دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا ناجائز اور حرام ہے۔ ایک مسلمان کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے، ہاں کسی دوسری عورت سے نکاح کیا جا سکتا ہے جو خاوند کے لیے حرام نہ ہو۔ واللہ اعلم!

عیسائی لڑکی سے شادی کرنا

] میں ایک عیسائی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، جبکہ وہ بری عادتوں اور گندی حرکتوں میں مبتلا رہ چکی ہے۔ کیا

! النساء:۲۳. @ بخاری، النکاح:۵۱۰۶.

بخاری، النکاح:۵۱۰۷. $ بخاری، النکاح، باب نمبر ۲۷.

اس کی شادی سے قبل مسلمان ہونا ضروری ہے؟ یا اپنے مذہب پر رہتے ہوئے اس کے ساتھ نکاح کیا جا سکتا ہے؟ وضاحت کریں۔

] قرآن کریم نے اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ؗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝﴾ 1

''اور جو لوگ تم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں، ان کی پاک دامن عورتیں بھی حلال ہیں جبکہ تم ان کے مہر ادا کرو، اس طرح کہ تم ان سے با قاعدہ نکاح کرو، ایسا نہیں کہ تم ان سے اعلانیہ زنا کرو یا پوشیدہ بدکاری کرو، منکرین ایمان کے اعمال ضائع اور آخرت میں وہ خسارہ پانے والوں سے ہیں۔''

اس آیت کریمہ میں اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے اور اسے چند شرائط کے ساتھ مشروط بھی کیا گیا ہے، جو حسب ذیل ہیں:

☆ ایک تو اس کے پاکدامن ہونے کی قید ہے جو اکثر اہل کتاب عورتوں میں مفقود ہے جیسا کہ سوال میں بھی اسے ذکر کیا گیا ہے۔

☆ ایمان و اخلاق کو بچانے کی تنبیہ بھی ہے، اگر اہل کتاب عورت سے نکاح کرنے میں ایمان اور اخلاق کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اس سے اجتناب کیا جائے۔ آج کل اہل کتاب عورتوں سے نکاح کرنے میں ایمان کو شدید خطرات لاحق ہوتے ہیں، وہ محتاج بیان نہیں ہیں۔ ایک مسلمان کے لیے ایمان بچانا شرط ہے، ایک جائز کام کے لیے اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالنا عقل مندی نہیں ہے۔ اس لیے ہم نصیحت کرتے ہیں کہ لڑکی کو پہلے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جائے، اسلام گزشتہ تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ اس آلائش سے بھی پاک ہو جائے گی جس کا سوال میں ذکر کیا گیا ہے۔ اسلام کے بعد اس سے شادی کرنے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہے گا۔ بصورت دیگر ایسی اہل کتاب لڑکی سے شادی کرنا جائز نہیں جو فسق و فجور اور علانیہ بدکاری میں مبتلا ہے۔ ایسے حالات میں اسے مسلمان کرنا انتہائی ضروری ہے تا کہ وہ گناہ کی آلائشوں سے پاک صاف ہو جائے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ آج کل اہل کتاب ویسے بھی اپنے دین سے بیگانہ بلکہ بے زار دماغی ہیں، اس حالت میں کیا وہ واقعی اہل کتاب میں شمار ہو سکتے ہیں؟

دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا

] میں نے اپنی بیوی سے دوسری شادی کرنے کے متعلق کہا تو اس نے قانون کا حوالہ دیا کہ تم میری اجازت کے

---

1 المائدہ:۵.

بغیر دوسری شادی نہیں کر سکتے۔ کیا شریعت میں واقعی دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری ہے؟

[جب کوئی شخص مالی اور جسمانی طور پر دوسری شادی کی نیت رکھتا ہے تو اسے عدل وانصاف برقرار رکھنے کی شرط کے ساتھ دوسری شادی کرنے کی اجازت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾ 1

''اور عورتوں میں سے جو بھی تمہیں پسند ہوں، ان سے نکاح کر لو، دو دو، تین تین اور چار چار سے لیکن اگر تمہیں عدل نہ کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے۔''

لیکن یہ بات اپنی جگہ پر اٹل حقیقت ہے کہ عورت کی طبیعت بہت ہی غیرت والی ہے، وہ یہ نہیں چاہتی کہ اس کے علاوہ کوئی بھی دوسری عورت اس کے خاوند کی شریک حیات بنے، عورت کے اندر اس قسم کی غیرت کا پایا جانا قابل ملامت نہیں۔ لیکن یہ غیرت اس حد تک نہ پہنچ جائے کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیز پر اعتراض کرنا شروع کر دے۔ شریعت میں کوئی ایسی نص صریح نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری ہو۔ لیکن اخلاقی طور پر ایسا کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں پہلی بیوی کو اعتماد میں لے۔ حسن معاشرت کا تقاضا ہے کہ وہ پہلی بیوی کا خیال رکھے اور پہلی بیوی کو بھی چاہیے کہ وہ برداشت کرے اور خاوند کے لیے دوسری شادی میں رکاوٹ نہ بنے اور نہ ہی اس سے اپنی طلاق کا مطالبہ کرے۔ کیوں کہ حدیث میں ہے:

''جو کوئی عورت بلا وجہ طلاق کا مطالبہ کرتی ہے اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے۔'' 2

بہر حال خاوند کے لیے عقد ثانی کی خاطر پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری نہیں۔ واللہ اعلم!

شادی پر عورت کے تحائف

[شادی کے موقع پر عورت کو جو تحائف دیئے جاتے ہیں، اس پر حق عورت کا ہوتا ہے یا کسی اور کا؟ ہمارے ہاں عام طور پر والدین ہی اس پر قبضہ کر لیتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[شادی کے موقع پر لڑکی کو جو تحائف ملتے ہیں وہ تین طرح کے ہوتے ہیں:

۱۔ والدین کی طرف سے کچھ سامان یا تحائف ملتے ہیں۔

۲۔ عزیز و اقارب یا اس کی سہیلیاں اسے تحفے دیتی ہیں۔

۳۔ حق مہر کے علاوہ خاوند بھی انگوٹھی یا کسی اور زیور کی صورت میں تحفہ دیتا ہے۔

مذکورہ تمام قسم کے تحائف شرعی اور قانونی طور پر لڑکی کی ملکیت ہوتے ہیں، کوئی بھی دوسرا ان پر قبضہ کرنے کا مجاز نہیں، اور وہ ان تحائف کے سلسلہ میں تصرف کرنے کا پورا پورا حق رکھتی ہے۔

! النساء:۳.   @ ابو داوٗد، الطلاق:۲۲۲۶.

حدیث میں ہے:

''جو عورت بھی قبل از رخصتی حق مہر، تحائف یا وعدہ پر نکاح کرتی ہے، وہ اس کی ملکیت ہوتے ہیں۔'' 1

ان تحائف کو حیلوں بہانوں سے واپس لینا بھی بہت گناہ ہے۔

جیسا کہ حدیث میں ہے:

''تحفہ دے کر واپس لینے والا اس کتے کی طرح ہے جو قے کر کے اسے چاٹتا ہے۔'' 2

بہرحال عورت کو شادی کے موقع پر جو تحائف ملتے ہیں وہ اس کی مالک ہے، اور اسے تصرف کرنے کا پورا پورا اختیار ہے، کوئی دوسرا اس میں حق دار نہیں ہوتا۔ ہاں اگر وہ اپنے دل کی خوشی سے کسی کو دے دے تو الگ بات ہے، اس پر اس کے متعلق کوئی دباؤ وغیرہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ (واللہ اعلم)

خاوند کا انتخاب

] ایک عورت کو اپنے رفیق حیات کے انتخاب کے لیے کیا چیز دیکھنا ہوتی ہے، آج کل تو مال و متاع کو دیکھا جاتا ہے، شریعت نے نکاح کے لیے کون سے امور کی نشاندہی کی ہے؟

[شریعت میں خاوند کے انتخاب کے لیے دین اور اخلاق کو ترجیح دی گئی ہے، جہاں تک حسب ونسب اور مال و متاع کا تعلق ہے تو اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص آئے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اس سے نکاح کر دو۔'' 3

ایمان دار اور صاحب کردار خاوند کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اسے بیوی بنا کر رکھے گا، تو اچھے طریقے سے رکھے گا اور اگر چھوڑے گا تو احسان کے ساتھ چھوڑے گا۔ اس کے علاوہ دین و اخلاق سے متصف خاوند، عورت اور اس کی اولاد کے لیے بھی باعث خیر و برکت ہوگا۔ بہرحال ہمارے معاشرے میں دولت و دنیا کو دیکھا جاتا ہے جو کسی صورت میں ثمر آور ثابت نہیں ہوتا۔ اس بناء پر ہم کہتے ہیں کہ خاوند کے انتخاب کے لیے دینداری اور اچھے اخلاق کو دیکھا جائے اور دنیا کا مال و متاع، نکاح کا معیار نہیں ہونا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

مسلمان عورت کا عیسائی سے شادی کرنا

] کیا مسلمان عورت، عیسائی مرد سے شادی کر سکتی ہے جبکہ وہ اسلام میں دلچسپی رکھتا ہو اور اس نے وعدہ کیا ہو کہ شادی کے بعد وہ مسلمان ہو جائے گا؟

[مسلمان عورت کا کسی بھی کافر مرد سے شادی کرنا حرام اور ناجائز ہے، اگرچہ وہ اسلام میں رغبت رکھتا ہو اور شادی

! مسند امام احمد، ص:۱۸۲، ج۲. @ بخاری، الهبہ:۲۶۲۱.

ابن ماجہ، النکاح:۱۹۶۷.

کے بعد اس نے مسلمان ہونے کا وعدہ بھی کر رکھا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ﴾ 1

''مومن عورتیں، کافروں کے لیے حلال نہیں ہیں، اور نہ ہی یہ کافر لوگ اہل ایمان خواتین کے لیے حلال ہیں۔''

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ﴾ 2

''اپنی عورتوں کو اہل شرک کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ مومن غلام، مشرک آزاد سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں پسند ہی کیوں نہ ہو۔''

ہاں اگر وہ مسلمان ہو جائے اور اپنے آپ کو اچھا مسلمان ثابت کر دے، تو ایسے شخص سے شادی کرنا جائز ہے۔ اس کے اسلام کی جانچ پڑتال ضرور کی جائے، مبادا وہ شادی کے لیے اسلام کو بطور حیلہ استعمال کرے اور مقصد حاصل کر لینے کے بعد دوبارہ مرتد ہو جائے۔ بہرحال اہل اسلام خواتین، کفار و مشرکین سے نکاح نہیں کر سکتیں، البتہ دعوت اسلام دی جائے، اگر وہ مسلمان ہو جائیں اور پکا پکا مسلمان ہونے کا ثبوت دے دیں تو ان سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

طلاق کی نیت سے نکاح کرنا

] ایک آدمی بیرون ملک رہتا ہے اور شرمگاہ کے تحفظ کے لیے کسی عورت سے نکاح کرتا ہے، جب اس کا بیرون ملک کام مکمل ہو جاتا ہے تو اپنی منکوحہ کو طلاق دے کر فارغ کر دیتا ہے، کیا اس طرح کا نکاح جائز ہے؟

[نکاح کے مقاصد میں سے بڑا مقصد یہ ہے کہ عورت کو ہمیشہ اپنے گھر آباد رکھا جائے، لیکن اگر نکاح کرتے وقت ہی یہ نیت ہو کہ مقصد پورا ہونے کے بعد اسے فارغ کر دیا جائے گا تو ایسا کرنا حرام اور ناجائز ہے۔ اس قسم کے نکاح کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ نکاح کے وقت ہی شرط لگالی جائے کہ میں نے اپنا کام مکمل ہونے کے بعد طلاق دے دینی ہے اور یہ نکاح مشروط ہے، اس قسم کا نکاح، نکاح متعہ ہے۔

''رسول اللہ e نے خیبر کے موقع پر نکاح متعہ سے منع کر دیا تھا۔'' 3

۲۔ نکاح کے وقت شرط کا اظہار نہ کیا، اسے اپنے دل میں پوشیدہ رکھا جائے، ایسا کرنا بھی حرام اور ناجائز ہے کیوں کہ نیت میں مخفی بات بھی مشروط کردہ کی طرح ہے۔ حدیث میں ہے: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔'' 4

اس قسم کا نکاح اس بناء پر حرام ہے کہ اس میں بیوی اور اس کے خاندان کو دھوکہ دیا جاتا ہے، جبکہ رسول اللہ e نے

! الممتحنہ:۱۰.　　@ البقرہ:۲۲۱.

بخاری، النکاح:۵۵۲۳.　　$ بخاری، الوحی:۱.

فریب کاری اور دھوکہ دہی کو حرام قرار دیا ہے۔ کیا یہ آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کی بہن یا بیٹی سے ایسا سلوک کیا جائے؟ آخر یہ شخص دوسروں سے وہ سلوک کیوں کرتا ہے جسے وہ خود اپنے لیے پسند نہیں کرتا۔ بہر حال اس قسم کا نکاح شرعاً جائز نہیں۔ (واللہ اعلم)

طلاق دینے کا طریقہ

] میری بیوی، اخلاقی طور پر درست نہیں، میں اسے طلاق دینا چاہتا ہوں، اس سلسلہ میں میری راہنمائی کریں کہ طلاق کیسے اور کتنی دوں؟

[طلاق شریعت میں جائز ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے پسند نہیں کیا۔ چنانچہ ابن عمر t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''حلال کاموں میں سب سے ناپسندیدہ کام طلاق ہے۔'' 1

اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں اور طلاق ناگزیر ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ حالت طہر یا حالت حمل میں ایک طلاق دی جائے۔ جیسا کہ حضرت ابن عمر t نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی تو حضرت عمر t کے دریافت کرنے پر رسول اللہ e نے فرمایا: ''اسے کہو کہ رجوع کرے پھر اسے اس وقت طلاق دے جب وہ ایام طہر میں ہو یا حالت حمل میں ہو۔'' 2

اس انداز سے طلاق دینے کا فائدہ یہ ہوگا کہ دوران عدت رجوع کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا١ؕ﴾ 3

''ان کے خاوند اس مدت میں رجوع کر لینے کے پورے حق دار ہیں، اگر ان کا ارادہ اصلاح کا ہو۔''

اگر عورت اپنی اصلاح کر لیتی ہے اور خاوند اسے آباد کرنا چاہتا ہے تو دوران عدت بلاتجدید نکاح رجوع کر سکتا ہے جیسا کہ آیت بالا میں اس امر کی صراحت ہے۔ اگر عدت گزر جاتی ہے اور دونوں میاں بیوی اصلاح کر کے اپنا گھر آباد کرنا چاہتے ہیں تو تجدید نکاح سے دوبارہ عائلی زندگی کا آغاز ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ 4

''جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو انہیں ان کے خاوندوں سے نکاح کرنے سے مت روکو جبکہ وہ دونوں آپس میں دستور کے مطابق رضامند ہوں۔''

رسول اللہ e کے عہد مبارک میں ایک ایسا واقعہ ہوا تھا کہ طلاق کے بعد عدت گزر چکی تھی اور وہ عورت اپنے پہلے خاوند سے نکاح کرنا چاہتی تھی لیکن اس کا بھائی اس میں رکاوٹ تھا تو یہ آیت اتری پھر اس نے اپنے سابقہ خاوند سے نکاح کر لیا تھا۔ 5

! ابو داوٗد، الطلاق:۲۱۷۸۔ @ ابن ماجہ، الطلاق:۲۰۲۳۔

البقرہ:۲۲۸۔ $ البقرہ: ۲۳۲۔

% بخاری، النکاح:۵۱۲۹۔

واضح رہے کہ مطلقہ عورت کی عدت تین حیض ہے جبکہ وہ حاملہ نہ ہو، اگر حاملہ ہے تو وضع حمل تک اس کی عدت ہے۔ عدت کے ختم ہونے کے بعد نکاح ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد تجدید نکاح سے رشتہ ازواج دوبارہ بحال کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

عدت وفات کا آغاز

] میرے دوست سعودیہ میں فوت ہوئے لیکن وہ ایک ماہ بعد پاکستان میں دفن ہوئے، اب اس کی بیوی عدت وفات کس وقت سے گزارے گی، وفات کی تاریخ سے یا دفن ہونے کے وقت سے کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

[جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے، اس کی عدت کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ 1

”تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن عدت میں رکھیں، پھر جب عدت ختم کر لیں تو معروف طریقہ کے مطابق اپنے لیے جو کرنا چاہیں، اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔“

واضح رہے کہ یہ عدت وفات ہر منکوحہ عورت کے لیے ہے، جو مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ، جوان ہو یا بوڑھی البتہ حاملہ عورت اس سے مستثنیٰ ہے کیوں کہ اس کی مدت وضع حمل ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ 2

”حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔“

اگرچہ سیاق وسباق کے اعتبار سے یہ عدت مطلقہ عورت کے لیے ہے لیکن اس کے ظاہر اور عموم کا تقاضا ہے کہ ہر حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہے، وہ مطلقہ ہو یا اس کا خاوند فوت ہو گیا ہو، احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ 3

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی عدت کا آغاز خاوند کی وفات سے ہوگا اگرچہ وہ کئی ماہ بعد دفن ہو۔ اگر عورت کو اس کا علم نہیں ہو سکا حتی کہ اس کی عدت کے ایام ختم ہو گئے تو اس پر دوبارہ عدت پوری کرنا ضروری نہیں۔ صورت مسئولہ میں اگر بیوی کو اپنے خاوند کی وفات کا علم ہو گیا تھا تو اسے یوم وفات سے عدت گزارنا ہو گی، یوم دفن تک اسے مؤخر کرنا درست نہیں۔ (واللہ اعلم)

دوران عدت بیوی کو طلاق دینا

] کسی آدمی نے اپنی بیوی کو ایک طلاق دی، پھر دوران عدت دوسری طلاق دے دیتا ہے جبکہ اس نے ابھی تک رجوع نہیں کیا، آیا پہلی طلاق دینے کے بعد رجوع لازمی ہے یا رجوع کے بغیر ہی دوسری طلاق ہو جائے گی؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

! البقرہ:۲۳۴۔ @ الطلاق:۴

بخاری، التفسیر:۴۹۰۹۔

[ہمارے معاشرہ میں یہ مشہور ہے کہ طلاق دیتے ہی نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور عورت اس کی زوجیت سے فارغ ہو جاتی ہے، حالانکہ ایسا نہیں بلکہ دوران عدت وہ اس کی بیوی رہتی ہے اور اس عدت کے دوران عورت کے جملہ اخراجات بھی خاوند کے ذمے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر دوران عدت خاوند فوت ہو جائے تو مطلقہ بیوی اس کی جائیداد سے حصہ پاتی ہے۔ ہاں اگر تیسری طلاق دی جائے جس کے بعد خاوند کے لیے حق رجوع ختم ہو جاتا ہے تو ایسی طلاق ملتے ہی نکاح ختم ہو جاتا ہے لیکن عقد ثانی کے لیے عدت گزارنا ہوگی۔ بہرحال طلاق رجعی کے بعد دوران عدت عورت اپنے خاوند کی شرعاً بیوی رہتی ہے، اسی لیے شریعت نے خاوند کو دوران عدت رجوع کرنے کا حق دیا ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا﴾ 1

''اور ان کے خاوند دوران عدت رجوع کرنے کے زیادہ حق دار ہیں اگر ان کا ارادہ اصلاح کا ہو۔''

رجوع کرنے سے خاوند کا مقصد بیوی کو تنگ کرنا نہ ہو بلکہ گھر آباد کرنے کی نیت سے خاوند کو رجوع کرنے کا پورا پورا حق ہے، عورت کے سرپرست کو اس کے حق میں رکاوٹ ڈالنے کی اجازت نہیں۔

حافظ ابن کثیر a اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جب تم اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دے ڈالو تو پھر تمہیں اختیار ہے کہ دوران عدت اصلاح کی نیت سے اس سے رجوع کرو، یا اسے اپنے حال پر رہنے دو تاکہ وہ اپنی عدت پوری کر کے تمہارے نکاح سے نکل جائے۔'' 2

ہمارے رجحان کے مطابق ایک طلاق دینے کے بعد خاوند کو دوران عدت دوسری طلاق دینے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ عدت گزارنے کے بعد وہ خود بخود اس کی زوجیت سے نکل جائے گی، اگرچہ دوران عدت دی گئی طلاق شمار تو ہو جائے گی لیکن یہ کوئی اچھا اقدام نہیں۔ بہرحال یہ ایک غلط مفروضہ ہے کہ طلاق دیتے ہی نکاح ختم ہو جاتا ہے، اور بیوی اپنے خاوند سے فارغ ہو جاتی ہے، اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ دوران عدت دی گئی طلاق شمار نہیں ہوگی، یہ مؤقف قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ (واللہ اعلم)

موبائل فون کے ذریعے طلاق دینا

] میں نے اپنی بیوی کو فون کے ذریعے طلاق کا پیغام بھیجا، میری بیوی کو وقفہ وقفہ سے گیارہ مرتبہ وہ پیغام موصول ہو چکا ہے، کیا وہ ایک طلاق شمار ہوگی یا زیادہ طلاقوں کا اعتبار کیا جائے گا؟ براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[اللہ تعالیٰ نے خاوند کو تین طلاقیں دینے کا اختیار دیا ہے۔ پہلی اور دوسری طلاق کے بعد رجوع کی گنجائش ہے جس کی دو صورتیں ہیں۔ اگر دوران عدت رجوع کر لیا جائے تو تجدید نکاح کے بغیر ہی گھر آباد کیا جا سکتا ہے اور اگر عدت گزر جانے

! البقرہ:۲۲۸. @ تفسیر ابن کثیر، ص:۲۹۲، ج۱.

کے بعد رجوع کا پروگرام بنے تو تجدید نکاح سے رجوع ممکن ہے۔ اس لیے بیوی کی رضامندی، سرپرست کی اجازت، حق مہر کا تعین اور گواہوں کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر تیسری طلاق بھی دے دی جائے تو عام حالات میں رجوع نہیں ہو سکے گا تا آنکہ وہ آباد ہونے کی نیت سے کسی دوسرے خاوند کے ساتھ نکاح کرے، ملاپ کے بعد اگر وہ فوت ہو جائے یا اسے طلاق دے دے تو پہلے خاوند سے ازسرنو نکاح ہوسکتا ہے۔

صورت مسئولہ میں اگر خاوند نے ایک ہی مجلس میں متعدد مرتبہ پیغام طلاق ارسال کیا ہے تو یہ ایک ہی طلاق شمار ہو گی کیوں کہ ہمارے نزدیک ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی ہے اور اگر متعدد مجالس میں پیغام طلاق ارسال کیا ہے تو اس طرح تین طلاقیں ہی واقع ہو جائیں گی اور اب رجوع کا کوئی موقع نہیں رہا۔ (واللہ اعلم)

مسئلہ رضاعت

] میری بیوی کی گود میں ایک بیٹی ہے اور وہ اسے دودھ پلاتی ہے، ہمیں ایک نومولود بچی ملی ہے، بیوی، اپنی بیٹی کے ہمراہ اسے بھی دودھ پلاتی ہے، اس کی خواہش ہے کہ نومولود بچی جب بڑی ہو جائے تو اپنے چھوٹے بھائی سے اس کی شادی کر دے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

[قرآن کریم نے جہاں حرام رشتوں کا ذکر کیا ہے وہاں صراحت کی ہے کہ:

﴿وَ اُمَّھٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾ 1

''تمہاری وہ مائیں بھی حرام ہیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے اور تمہاری دودھ شریک بہنیں بھی حرام ہیں۔''

حدیث میں اس امر کی وضاحت ہے کہ دودھ پینے سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔ 2

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دودھ پلانے والی عورت کی نسبی اور رضاعی اولاد دودھ پینے والے بچے کے بھائی ہیں۔ اس عورت کا شوہر، اس کا باپ، اس کے خاوند کی بہنیں، اس کی پھوپھیاں، عورت کی بہنیں، اس کی خالائیں اور اس عورت کے جیٹھ، دیور، اس کے رضاعی چچا اور تایا بن جائیں گے اور اس دودھ پینے والے بچے کے نسبی بہن بھائی، دودھ پلانے والی عورت کے گھرانے پر رضاعت کی بناء پر حرام نہیں ہوں گے۔

درج بالا تفصیل کے مطابق اگر کسی عورت نے اپنی حقیقی بیٹی کے ہمراہ کسی نومولود کو بھی دودھ پلایا ہے تو وہ اس کی رضاعی بیٹی ہو گی اور اس کا تعلق اس عورت کے تمام نسبی رشتے داروں سے قائم ہو جائے گا۔ عورت کا بھائی اس نومولود کا ماموں بن جائے گا، جس طرح نسبی طور پر ماموں، اپنی نسبی بھانجی سے شادی نہیں کر سکتا، اسی طرح وہ اپنی رضاعی بھانجی سے نکاح نہیں کر سکتا۔ اگر دودھ پلانے والی عورت کا یہ خیال ہے کہ وہ اسے اپنے چھوٹے بھائی سے بیاہ دے گی، تو ایسا کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ (واللہ اعلم)

! النساء:۲۳.   @ بخاری، النکاح:۵۰۹۹.

شرعی حق مہر

] مجلس نکاح میں شرعی حق مہر کا ذکر ہوتا ہے، اس سے کیا مراد ہے، شریعت میں کم از کم حق مہر کی کیا مقدار ہے؟ وضاحت کریں۔

[شریعت مطہرہ میں حق مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں جسے شرعی مہر قرار دیا جا سکے۔ ہر وہ چیز جس کا مرد مالک ہے اسے حق مہر کے طور پر مقرر کرنا جائز ہے، خواہ اس کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔ البتہ اگر حق مہر کم ہو گا تو نکاح میں برکت اور میاں بیوی کے درمیان محبت کا باعث ہو گا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

''سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں مشقت اور خرچ کم ہو۔'' 1

ایک اور روایت بایں الفاظ ہے: ''بہترین نکاح وہی ہے جو زیادہ آسانی والا ہے۔'' 2

رسول اللہ e نے ایک تنگ دست صحابی کو لوہے کی انگوٹھی لانے کے متعلق فرمایا تھا تاکہ اسے عورت کا حق مہر مقرر کیا جا سکے۔ 3

پھر آپ نے اس کا نکاح قرآن کی چند سورتوں کے عوض کر دیا جو اسے زبانی یاد تھیں تاکہ وہ اپنے ہونے والی بیوی کو پڑھا دے۔

مہر زیادہ ہونے کی صورت میں بہت زیادہ مفاسد کا اندیشہ ہے۔ سب سے زیادہ نقصان یہ ہے کہ معاشرہ میں جوان لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی معطل ہو کر رہ جائے گی کیوں کہ ہر آدمی میں زیادہ حق مہر ادا کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ البتہ رسول اللہ e کی بیویوں کا حق مہر پانچ صد درہم تھا، جیسا کہ حضرت ابوسلمہ t کہتے ہیں کہ میں نے سیدہ عائشہ r سے رسول اللہ e کے حق مہر کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ بارہ اوقیہ اور نش تھا، میں نے عرض کیا کہ نش کیا ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''آدھا اوقیہ۔'' 4

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب t نے ایک دفعہ اپنے خطبہ میں فرمایا: ''خبردار! عورتوں کے بھاری بھاری حق مہر نہ باندھا کرو، اگر یہ چیز اللہ کے ہاں تقویٰ اور دنیا میں عزت کا باعث ہوتی تو رسول اللہ e اس میں سب سے آگے ہوئے، رسول اللہ e نے کسی بیوی یا اپنی لڑکی کا بارہ اوقیہ سے زیادہ حق مہر نہیں باندھا۔ 5

ان احادیث کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ e کے ہاں مسنون حق مہر پانچ صد درہم ہے، تاہم حسب توفیق زیادہ مہر دینے میں چنداں حرج نہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ﴾ 6

! مسند امام احمد، ص:۸۲،ج۶.

@ ابو داؤد، النکاح:۲۱۱۷.

بخاری، النکاح:۵۱۲۶.

$ ابو داؤد، النکاح:۲۱۰۵.

% ترمذی، النکاح:۱۱۱۴.

۸ النساء:۲۰.

''اور اگر تم نے ان عورتوں کو خزانہ بھی بطور حق مہر دیا ہو تو اس سے (طلاق کے وقت) کچھ واپس نہ ہو۔''

شاہ حبشہ نجاشی نے حضرت ام حبیبہ r کو نبی کریم e کی طرف سے چار ہزار درہم مہر دیا تھا۔ 1

لیکن دکھاوے اور ریاکاری کے طور پر زیادہ مہر مقرر کر لینا یا کروالینا اور پھر اسے ادا نہ کرنا یکسر غلط ہے، اسی طرح وسعت ہونے کے باوجود برائے نام مہر مقرر کرنا بھی درست نہیں۔ حق مہر کم یا زیادہ طاقت کے مطابق ہونا چاہیے اور اس کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی دوسرا کفیل بن جائے تو بھی درست ہے بلکہ نیکی میں تعاون ہے۔ (واللہ اعلم)

زیادہ افراد پر مشتمل بارات اور پر تکلف ولیمہ

] ہمارے معاشرے میں شادی کے موقع پر بہت اسراف سے کام لیا جاتا ہے، پہلے تو بارات میں بہت سے افراد کو دعوت دی جاتی ہے پھر ولیمہ کے موقع پر بھی انواع واقسام کے کھانے تیار کیے جاتے ہیں، ان کی شرعی حیثیت واضح کریں۔

[اسلام ہر کام میں اعتدال کو پسند کرتا ہے، جیسا کہ اخراجات کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴾ 2

''اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے کہ پھر ملامت کیا ہوا اور درماندہ بیٹھ جائے۔''

اس آیت کریمہ میں اخراجات کے متعلق ہدایات ہیں کہ انسان نہ تو بخل سے کام لے کہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورت پر بھی خرچ نہ کرے اور نہ اس سلسلہ میں حد سے تجاوز کرے کہ اپنی وسعت اور گنجائش کو دیکھے بغیر بے دریغ خرچ کرتا رہے۔

صورت مسئولہ انتہائی تکلیف دہ ہے، شادی یا غمی کے موقع پر اپنے عزیز واقارب اور دوست احباب کو کسی اہم مقصد کے بغیر جمع کرنا کوئی سنت نہیں، اس میں اپنی دولت مندی کا اظہار اور محض نمود ونمائش ہے۔ ایک چھوٹی سی بستی مدینہ طیبہ میں رہتے ہوئے سیدنا حضرت عبدالرحمن بن عوف t نے ایک انصاری عورت سے شادی کی لیکن کائنات میں سب سے زیادہ محبوب ہستی رسول اللہ e کو اس کے متعلق کوئی خبر نہ دی گئی، شادی کے اگلے دن رسول اللہ e نے زعفران کے زرد نشانات دیکھے تو پوچھا، عبدالرحمن! یہ کیا ہے؟

انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے ایک عورت سے شادی کر لی ہے۔

آپ نے فرمایا: ''ولیمہ کرو اگرچہ ایک بکری ہی کا ہو۔'' 3

اسلام میں بارات کا کوئی تصور نہیں، متعدد حضرات وخواتین پر مشتمل لمبی چوڑی بارات گویا ہم کوئی قلعہ فتح کرنے جارہے ہیں۔ پھر ان کی پر تکلف دعوت، بے پردگی، بے ہودگی، موسیقی، اسی طرح ولیمے میں انواع واقسام کے کھانوں کی بھرمار اور دیگر رسومات، اسلام کے مزاج کے خلاف ہیں، اس اسراف وتبذیر اور فضولیات کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ رسول اللہ e

---

! ابو داؤد، النكاح:۲۱۰۷. @ بنی اسرائیل:۲۹.

نسائی، النكاح:۳۳۷۵.

نے جب حضرت زینب r سے شادی کی تو پر تکلف ولیمہ کا اہتمام کیا جس کے متعلق حضرت انس t فرماتے ہیں: ’’رسول اللہ e نے کسی بیوی کا اس قدر ولیمہ نہیں کیا، جس قدر حضرت زینب r کا کیا تھا، اس میں، آپ نے ایک بکری کے ساتھ ولیمہ کیا۔‘‘ 1

حضرت صفیہ r بیان کرتی ہیں: ’’رسول اللہ e نے اپنی ایک بیوی کا ولیمہ دو مد جو کے ساتھ کیا۔‘‘ 2

حضرت صفیہ r کے ولیمہ پر رسول اللہ e نے صحابہ کرام y کو ستو ہی پیش فرمائے تھے۔ 3

بہرحال خوشی کے موقع پر جو تقریبات کی جاتی ہیں، ان پر ہمیں نظر ثانی کرنی چاہیے۔ (واللہ اعلم)

وظیفہ زوجیت سے پہلے طلاق

] ایک لڑکی کے کسی کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے، اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے کر دیا گیا، لڑکی نے خاوند کو اپنے پاس نہیں آنے دیا، خاوند نے احتجاج کے طور پر اگلے دن اسے طلاق دے دی، اس صورت میں لڑکی کو طلاق کی عدت گزارنا ہوگی یا نہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں؟

[وظیفہ زوجیت ادا کرنے سے پہلے طلاق دینے کی صورت میں بیوی کے لیے کوئی عدت نہیں، طلاق ملتے ہی نکاح ختم ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا﴾ 4

’’اے ایمان والو! جب تم مومن خواتین سے نکاح کرو پھر انہیں چھونے سے پیشتر طلاق دے دو تو تمہارے لیے ان کے ذمے کوئی عدت نہیں، جس کے پورا ہونے کا تم ان سے مطالبہ کرو۔‘‘

اس آیت کریمہ میں چھونے یا ہاتھ لگانے سے مراد ہم بستری کرنا ہے، لہٰذا جماع سے قبل اگر بیوی کو طلاق ہو جائے تو اس پر عدت گزارنا ضروری نہیں۔ البتہ خاوند کے فوت ہونے کی صورت میں اسے عدت وفات چار ماہ دس دن پورے کرنا ہوں گے، لیکن طلاق ملنے کی صورت میں بیوی کے ذمے کوئی عدت نہیں۔

صورت مسئولہ میں چونکہ میاں بیوی شب زفاف کے موقع پر اکٹھے ہوئے ہیں اور انہیں خلوت صحیحہ کی صورت میں وظیفہ زوجیت ادا کرنے کا موقع میسر آیا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ دونوں سے بیان حلفی لیا جائے کہ اس رات وظیفہ زوجیت ادا نہیں ہوا، صرف لڑکی کے کہنے پر فیصلہ نہ دیا جائے۔ اس بات کی تسلی کرنے کے بعد عدت نہ ہونے کا فیصلہ دیا جائے۔ البتہ ایسی صورت میں بھی خاوند کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی مطلقہ بیوی کو نصف مہر ادا کرے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

! بخاری، النکاح:۵۱۶۸.
@ بخاری، النکاح:۵۱۷۲.
# بخاری النکاح:۵۱۶۹.
$ الاحزاب:۴۹.

﴿وَ اِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَ قَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِیۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ﴾ 1

''اور اگر تم عورتوں کو اس سے پہلے طلاق دے دو کہ تم نے انہیں ہاتھ لگایا ہو لیکن تم نے ان کا حق مہر مقرر کر دیا تھا تو مقررہ مہر کا نصف دینا ہو گا۔''

یہ اس صورت میں ہے جب حق مہر طے ہو چکا تھا، اگر حق مہر طے نہیں ہوا تھا اور جماع سے پہلے طلاق دے دی تو بھی عورت کو کچھ نہ کچھ دے دلا کر رخصت کرنا چاہیے اور کچھ نہ کچھ کی مقدار طلاق دینے والے کی حیثیت کے مطابق ہو گی، اس کی وضاحت بھی قرآن مجید میں ہے۔ 2

بہر حال صورت مسئولہ میں اگر واقعی شب زفاف کے موقع پر وظیفہ زوجیت ادا نہیں ہوا تو بیوی کے ذمے کوئی عدت نہیں اور طلاق ملتے ہی نکاح ختم ہو جائے گا، نیز وہ طلاق ملنے کے فوراً بعد آگے نکاح کرنے کی مجاز ہے۔ (واللہ اعلم)

گونگے بہرے کا نکاح

] میرا بیٹا گونگا بہرہ ہے اور وہ بالغ ہو چکا ہے، میرے بھائی نے اپنی بیٹی کا رشتہ بھی دے دیا ہے، اس کے ایجاب وقبول کا کیا طریقہ ہو گا، قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

[اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا ہے، لیکن کچھ انسان ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے بعض حواس ناقص ہوتے ہیں جیسا کہ اندھا، بہرہ اور گونگا وغیرہ۔ البتہ سب لوگ حسب طاقت شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کے پابند ہیں۔

جیسا کہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن گونگے، بہرے، دیوانے اور بوڑھے لوگوں کو اللہ کے حضور پیش کیا جائے گا، تو بہرہ کہے گا: اے اللہ! تیرا دین اسلام آیا لیکن میں تو کچھ بھی نہیں سن سکتا تھا، اسی طرح دوسرے معذور بھی اپنا اپنا عذر پیش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے اپنی اطاعت کا عہد وپیمان لیں گے پھر انہیں آگ میں داخل ہونے کا حکم دیں گے، رسول اللہ e نے فرمایا: اس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر وہ اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے آگ میں چھلانگ لگا دیں گے، تو وہ ان کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جائے گی۔ 3

اس حدیث کے پیش نظر گونگے بہرے کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ حسب استطاعت اللہ کے دین کی تعلیم حاصل کرے۔ چنانچہ ہمارے ہاں ایسے معذور لوگوں کے لیے تعلیمی ادارے موجود ہیں، اشاروں کی زبان میں ان کے لیے کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ہمارے ہاں گونگے بہرے دو قسم کے ہیں۔ ا۔ تعلیم یافتہ، ۲۔ ان پڑھ۔

صورت مسئولہ میں اگر گونگا بہرہ تعلیم یافتہ ہے تو تحریر کے ذریعے ایجاب وقبول کرایا جائے اور حق مہر کی مقدار بھی بتا دی

! البقرہ: ۲۳۷. @ البقرہ: ۲۳۶.

مسند امام احمد، ص۲۴، ج۴.

جائے، اس طرح نکاح صحیح ہوگا۔ اگر تعلیم یافتہ نہیں تو اشارے وغیرہ سے اس کو بتایا جائے اور اشارہ سے ہی قبولیت کا اقرار کرالیا جائے۔

امام بخاری a نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''طلاق اور دیگر امور میں اشارہ کرنا۔'' 1 پھر چند ایک احادیث ذکر کی ہیں جن میں اشارے کو کافی خیال کیا گیا ہے۔ انہوں نے حضرت حماد کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر گونگا اپنے سر سے اشارہ کرتا ہے تو یہ کافی ہے۔ بہرحال اشارہ سے ایجاب وقبول کیا جا سکتا ہے جو نکاح کے لیے ضروری ہے، اگر ایسا کرنا ناممکن ہے تو گونگے کا کوئی بھی سرپرست اس کی طرف سے نیابۃً ایجاب وقبول کا فریضہ سرانجام دے گا۔ رسول اللہ e کا جب حضرت ام حبیبہ r سے نکاح ہوا تو حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے رسول اللہ e کی عدم موجودگی میں نکاح کر کے حضرت ام حبیبہ r کو مدینہ روانہ کر دیا تھا، اس موقع پر بھی ایجاب وقبول نیابۃً ہوا تھا۔ صورت مسئولہ میں بھی گونگے کا والد اس کی طرف سے ایجاب وقبول کرے۔ بہرحال اگر گونگے کو شعور ہے تو اس کا نکاح بھی صحیح ہوگا۔ (واللہ اعلم)

ولیمہ کیا ہے؟

] ولیمہ کی تعریف کیا ہے اور اس کی مقدار کے متعلق شرعی ہدایات کیا ہیں؟ اس کے آداب وحقوق کے متعلق کتاب وسنت کی روشنی میں آگاہی فرمائیں۔

[ولیمہ وہ کھانا ہے جسے شادی کے موقع پر مدعوین کے لیے پیش کیا جاتا ہے، وہ جانور کا گوشت ہو یا اس کے علاوہ حسب استطاعت کوئی اور چیز، اس کے فوائد میں خوشی اور اعلان نکاح کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکریہ ادا کرنے کے لیے شریعت نے اسے مشروع قرار دیا ہے۔

رسول اللہ e کا عمل بھی ہے اور آپ نے اس کے متعلق ترغیب بھی دلائی ہے، جیسا کہ عبدالرحمن بن عوف t سے آپ نے شادی کے موقع پر فرمایا تھا: ''ولیمہ کرو، خواہ ایک بکری کا ہی کرو۔'' 2

رسول اللہ e نے حضرت صفیہ r سے شادی کے موقع پر کھجور اور ستو کے ساتھ ولیمہ کیا تھا، اس وقت آپ دوران سفر تھے۔ 3

حسب حال اور حسب ضرورت اس کی مقدار میں کمی وبیشی ہو سکتی ہے، بہرحال اس میں اعتدال ضروری ہے۔

چنانچہ حضرت انس t کا بیان ہے:

''رسول اللہ e نے اپنی کسی بیوی پر اس قدر ولیمہ نہیں کیا جو سیدہ زینب r سے شادی کے موقع پر کیا تھا۔ (اس ولیمہ میں آپ نے ایک بکری ذبح کی تھی)'' 4

! بخاری، الطلاق،، باب نمر:۲۴.
@ بخاری، النکاح:۵۱۶۷.
# ترمذی، النکاح:۱۰۹۵.
$ بخاری،النکاح:۵۱۶۸.

اسی طرح کم از کم مقدار کی کوئی حد نہیں، حضرت صفیہ r سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے اپنی ایک بیوی کا ولیمہ دو مد جو سے کیا تھا۔ 1

دو مد وزن ہمارے اعشاری نظام کے مطابق ایک کلو پچاس گرام ہے۔

اس کے آداب میں سے ہے کہ دعوت ولیمہ قبول کرنا ضروری ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''جب تم میں سے کسی کو دعوت ولیمہ دی جائے تو وہ اس میں ضرور شرکت کرے۔'' 2

لیکن کھانا ضروری نہیں جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ اگر چاہے تو کھالے اور اگر چاہے تو چھوڑ دے۔ 3

تاہم اس موقع پر کوئی برائی، بے پردگی یا اختلاط مرد و زن کا اندیشہ ہے تو اگر روکنے کی طاقت ہے تو شرکت کرے، بصورت دیگر اجتناب کیا جائے۔

جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد ہے:

''تم ایسے کھانے میں شرکت نہ کرو جہاں شراب پیش کی جاتی ہو'' 4

دیگر تمام گناہوں کو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

سوتیلی والدہ کی بیٹی سے شادی کرنا

] میرے والد نے ایک عورت سے شادی کی ہے، اس کی پہلے خاوند سے ایک بیٹی ہے جو اس کے ہمراہ ہے، کیا میں اس سے شادی کر سکتا ہوں، مجھے اس میں کچھ تردد ہے، کیوں کہ وہ میرے والد کی بیوی کی بیٹی ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

[سوتیلی والدہ کی پہلے خاوند سے بیٹی وہ آپ کے والد کی ربیبہ کہلائے گی، جب آپ کے والد نے اس کی والدہ سے نکاح کر لیا اور اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم ہو گئے تو وہ لڑکی صرف والد پر حرام ہو گی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ١ٞ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ١ٞ﴾ 5

''تمہاری پرورش کردہ لڑکیاں (بھی حرام ہیں) جو تمہاری گود میں ہیں، تمہاری ان عورتوں کی جن سے تم دخول کر چکے ہو۔ ہاں اگر تم نے (نکاح کے بعد) ان سے جماع نہ کیا ہو تو تم پر (ان لڑکیوں سے نکاح کرنا) گناہ نہیں۔''

! بخاری، النکاح:٥١٧٢. @ بخاری، النکاح:٥١٧٣.
ابوداؤد، النکاح: ٣٧٤٠. $ ترمذی، الادب:٢٧٧٥.
% النساء:٢٣.

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ربیبہ صرف والد پر حرام ہے، اس کے بیٹوں پر حرام نہیں۔ وہ آپ کے والد کی بیوی کی وہ بیٹی ہے جو اس کے پہلے خاوند سے ہے اور اس کا والد کے لڑکوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس بناء پر سائل اس سے بلاتردد شادی کرسکتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿ أُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذَٰلِكُمْ ﴾ 1

''ان عورتوں کے علاوہ دیگر عورتیں تم پر حلال کردی گئی ہیں۔''

مذکورہ ربیبہ ان عورتوں میں شامل نہیں جو اس سے پہلے آیت میں بطور نص حرام کردی گئی ہیں اور نہ ہی اس کی حرمت کا ثبوت کسی حدیث سے ملتا ہے، لہٰذا ایسی عورت سے شادی کرنا جائز ہے۔

بیوہ عورت کا ولی کے بغیر نکاح کرنا

] ہمارے پڑوس میں ایک بیوہ ہے، اس کے والد عقد ثانی کے متعلق تذبذب کا شکار ہیں، اس نے کسی سے مسئلہ پوچھا تو بتایا گیا کہ بیوہ خود مختار ہے، اس کے ولی کی اجازت ضروری نہیں ہے، اس نے خفیہ طور پر کسی سے نکاح کرلیا، نکاح کے وقت وہاں صرف نکاح خواں، دولہا، وہ خود اور ایک اور آدمی موجود تھا، کیا یہ نکاح درست ہے؟ وہ خود بھی پریشان ہے کہ اس کے والد کسی دوسری جگہ شادی کرنا چاہتے ہیں، کیا دوسری جگہ پر نکاح کرنا، نکاح پر نکاح تو نہیں ہوگا، کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں؟

[دین اسلام میں کوئی بھی مسلمان عورت اپنے نکاح کا معاملہ از خود طے نہیں کرسکتی خواہ وہ بیوہ ہی کیوں نہ ہو، بلکہ اس کے نکاح کا معاملہ اس کے ولی کی وساطت سے انجام پائے گا۔ احادیث میں اس امر کی صراحت ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔

چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابوہریرہ y سے مروی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہے۔'' 2

حضرت عائشہ r سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''جس عورت نے بھی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو وہ نکاح باطل ہے، وہ نکاح باطل ہے۔'' 3

حضرت ابوہریرہ t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: کوئی عورت، کسی دوسری عورت کا نکاح نہ کرے اور نہ کوئی عورت خود اپنا نکاح کرے۔'' 4

ان احادیث کے پیش نظر ولایت کے لیے مرد کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ باپ کے بجائے ماں ولی

! النساء:۲۴.　　@ ابو داؤد، النکاح:۲۰۸۵.

ابوداؤد، النکاح:۲۰۸۳.　　$ ابن ماجہ، النکاح:۱۸۸۲.

نہیں بن سکتی اور نہ کوئی لڑکی از خود اپنا نکاح کرسکتی ہے۔ اگر باپ نہیں ہے تو چچا یا بھائی وغیرہ ولی بنے گا، اگر کوئی بھی نہیں ہے، تو حاکم وقت یا قاضی اس کا ولی ہوگا۔ بہرحال اسلامی تعلیمات میں بڑا توازن ہے کہ جن والدین نے لڑکی کو پالا پوسا، اس کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا، وہ نکاح میں بنیادی کردار ادا کرنے کے حق دار ہیں، ان کی رضامندی کے بغیر لڑکی کی شادی ناجائز ہے۔ دوسری طرف والدین کو لڑکی پر جبر کرنے اور اس کی رضامندی حاصل کیے بغیر اس کی شادی کرنے سے منع کیا گیا ہے، جن روایات میں بیوہ کو خودمختار کہا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ہونے والے خاوند کا انتخاب کرنے میں خودمختار ہے، اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ وہ اپنا نکاح کرنے میں خودمختار ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق صورت مسئولہ میں جو نکاح ولی کے بغیر ہوا ہے اس کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے، اگر اس نکاح کے متعلق کوئی کاغذی کاروائی نہیں ہوئی ہے تو اسے طلاق لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے، ہاں اگر نکاح کا باضابطہ اندراج ہوا ہے تو مستقبل میں خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے مرد سے تحریری طلاق نامہ لکھوا لیا جائے، پھر جہاں والدین نکاح کرنا چاہتے ہیں اگر عورت وہاں راضی ہے تو نکاح کردیا جائے، اس طرح وہ نکاح پر نکاح کی زد میں نہیں آئے گی۔ (واللہ اعلم)

سالی سے اپنے بیٹے کی شادی کرنا

] ایک شخص کی دو بیویاں ہیں، دوسری بیوی کے بیٹے سے اپنی سالی کی شادی کرا سکتا ہے یا نہیں، کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیں؟

[جن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے قرآن مجید نے ان کی تفصیل بیان کی ہے، ان میں سے سات نسب کی وجہ سے حرام ہیں، دو رضاعت کی وجہ سے اور چار رشتہ نکاح قائم ہونے کی بناء پر حرام ہیں، ان کی تفصیل سورۃ النساء آیت نمبر ۲۳ میں بیان ہوئی ہے، جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہیں ان میں ایک خالہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری خالائیں تم پر حرام ہیں۔

صورت مسئولہ میں اگر سالی، برخوردار کی خالہ ہے تو اس سے کسی صورت میں نکاح نہیں ہوسکتا، اگر سالی اس کی خالہ نہیں تو اس سے نکاح کرنے میں کوئی قباحت نہیں مثلاً لڑکا ایک بیوی کے بطن سے پیدا ہوا ہے اور دوسری بیوی کی بہن سے اس کا نکاح ہوسکتا ہے کیوں کہ دوسری بیوی کی بہن، باپ کی سالی تو ہے لیکن اس کے بیٹے کی خالہ نہیں ہے، لہٰذا اس نکاح کی شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے محرمات بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے:

﴿وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَآءَ ذَٰلِكُمْ﴾ 1

''ان عورتوں کے علاوہ دوسری عورتیں تمہارے لیے حلال کردی گئی ہیں۔''

دوسری بیوی کے بیٹے سے یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ بیٹا کسی پہلے خاوند سے ہو، اس صورت میں بھی پہلی بیوی کی بہن سے

---

1 النساء:۲۴.

نکاح ہوسکتا ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے خالہ سے نکاح کرنا حرام قرار دیا ہے لیکن آدمی کی ہر سالی اس کے بچوں کے لیے خالہ نہیں ہوسکتی، لہٰذا اگر اس کی سالی، بیٹے کی خالہ نہیں تو اس سے نکاح ہوسکتا ہے، کیوں کہ حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

بانجھ پن کی وجہ سے طلاق دینا

] میں اہل حدیث ہوں، اور میرا رشتہ ایک تبلیغی حنفی گھرانے میں ہوگیا، نکاح کے آٹھ ماہ بعد اس نے مجھے اس بنیاد پر طلاق دے دی کہ میں اولاد کے قابل نہ تھی، میں نے اس کی بہت منت سماجت کی لیکن میری کوئی شنوائی نہ ہوئی، کیا معاشرہ میں بانجھ عورت کی یہی عزت ہے، اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اس سلسلہ میں مجھے کتاب وسنت کی روشنی میں مطمئن کیا جائے؟

[نکاح کے متعلق رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''شوہر سے زیادہ محبت کرنے والی اور زیادہ بچوں کو جنم دینے والی عورتوں سے شادی کرو کیوں کہ میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔'' 1

اس حدیث کا سبب ورود یہ ہے کہ ایک شخص اللہ کے رسول e کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ! مجھے ایک عورت ملی ہے جو عمدہ حسب ونسب اور حسن و جمال والی ہے مگر اس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تو کیا میں اس سے شادی کرلوں؟

رسول اللہ e نے فرمایا: ''نہیں'' پھر وہ دوبارہ آیا تو آپ نے منع فرما دیا، جب وہ تیسری مرتبہ آیا تو آپ نے مذکورہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ولادت کی صلاحیت سے محروم عورت سے نکاح نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ نکاح کا اصل مقصود اولاد کا حصول ہے، اس لیے جو عورت اس وصف سے ہی محروم ہو تو اس سے نکاح کرنے کا کیا فائدہ؟ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ بانجھ عورت سے مطلق طور پر نکاح کرنا حرام ہے، کیوں کہ بعض اوقات نکاح کا مقصد حصول اولاد کے علاوہ کچھ اور بھی ہوسکتا ہے مثلاً بانجھ عورت بے سہارا ہے تو اسے سہارا دینے کے لیے نکاح کرلیا جائے یا بانجھ عورت دینی تعلیم سے آراستہ ہے تو دینی تعلیم کی نشر و اشاعت کے لیے اسے اپنے حبالہ عقد میں لے لیا جائے، ایسے حالات میں ایسی بانجھ عورت سے نکاح کرنا جائز ہی نہیں بلکہ پسندیدہ امر ہے۔

عورت کے بانجھ ہونے کا کیسے پتہ چلایا جائے؟ بیوہ عورت کے متعلق تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے مگر کنواری میں حیض نہ آنا ایک امکانی سبب تو ہوسکتا ہے مگر یقینی نہیں ہوتا، بہت زیادہ محبت کرنے والی اور بہت زیادہ بچے جننے والی، یہ صفات خاندان سے پہچانی جاتی ہیں۔

صورت مسئولہ میں نکاح ہو چکا ہے تو خاوند کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ اسے طلاق نہ دیتا بلکہ بیوی کی طرف سے دوسری شادی

! ابو داؤد، النکاح: ۲۰۵۰۔

کرنے کی پیشکش بھی ہوئی، کیوں کہ اولاد دینا یا اس سے محروم کرنا یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ﴾ 1

''آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کے لیے ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے، یا بیٹے بیٹیاں دونوں جمع کر دیتا ہے، اور جسے چاہے بانجھ کر دیتا ہے۔''

اس آیت کے پیش نظر بانجھ پن ایک غیر اختیاری امر ہے، اس میں انسانی عمل کو کوئی دخل نہیں، البتہ بعض اوقات بانجھ پن قابل علاج ہوتا ہے اور بعض اوقات نا قابل علاج ہوتا ہے، بہر حال صورت مسئولہ میں چاہیے تھا کہ خاوند اپنی بیوی کا علاج کراتا۔ اگر بانجھ پن نا قابل علاج تھا تو حصول اولاد کے لیے دوسری شادی کر لیتا، اس طرح اس کی بیوی میں یہ احساس پیدا نہ ہوتا کہ شاید معاشرہ میں میرے جیسی عورتوں کا کوئی مقام نہیں ہے یا انہیں دنیا میں کبھی کوئی سہارا نہیں مل سکے گا، ہم اس مقام پر یہ گزارش کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں کہ والدین بچیوں کا نکاح کرتے وقت ذہنی ہم آہنگی کا ضرور خیال رکھا کریں، صرف برادری کے رکھ رکھاؤ کے لیے اپنی بچیوں کو اپنے پندار نفس کی بھینٹ نہ چڑھایا جائے۔

صورت مسئولہ میں ممکن ہے کہ ذہنی تفاوت ہی کارفرما ہو کیوں کہ لڑکی اہل حدیث ہے اور خاوند تبلیغی حنفی ہے، بھلا ایک حنفی، اہل حدیث کو کیسے قبول کر سکتا ہے، اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے معاملات کو گہری بصیرت کے ساتھ حل کرنے کی توفیق دے۔ آمین!

مطلقہ بیوی کا جہیز کی واپسی کا دعویٰ

] میں نے ایک مطلقہ سے دوسری شادی کی تھی، نباہ نہ ہونے کی صورت میں میں نے اسے طلاق دے دی۔ اس کی عدت بھی پوری ہو چکی ہے، میری اس کے بطن سے پیدا ہونے والی تین سالہ بیٹی اس کے پاس ہے، اس نے عدالت میں جہیز کی واپسی اور اخراجات کا دعویٰ کر رکھا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

[مطلقہ کی دو اقسام حسب ذیل ہیں؟

☆ وہ مطلقہ جس سے دوران عدت رجوع کیا جا سکتا ہے اسے مطلقہ رجعیہ کہا جاتا ہے، اس کے جملہ اخراجات خاوند کے ذمے ہیں۔

☆ وہ مطلقہ جس سے رجوع نہیں کیا جا سکتا اور اسے مطلقہ بائنہ کہتے ہیں، تیسری طلاق کے بعد وہ بائنہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پہلی اور دوسری طلاق کے بعد جب عدت گزر جائے تو اسے بائنہ کہتے ہیں، اس صورت میں کوئی اخراجات خاوند کے ذمے نہیں ہیں۔

---

1 الشوریٰ: ۴۹ ـ ۵۰.

ہمارے معاشرہ میں طلاق کے ساتھ ہی جس طرح عورت کو دھکے دے کر نکال دیا جاتا ہے یا بعض دفعہ لڑکی والے اپنے گھر لے جاتے ہیں، یہ رواج اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

مطلقہ عورت کے احکام درج ذیل بیان کیے جاتے ہیں، تاہم اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے، کہ اسے والدین نے جہیز یا تحائف کی صورت میں جو کچھ دیا ہے وہ اس کی مالک ہے، اور اسے بہرصورت ملنا چاہیے، خاوند کا اس پر قبضہ کر لینا صحیح نہیں۔

☆ مطلقہ عورت کو تفریق کے وقت اچھی طرح فائدہ دینا تقویٰ شعار لوگوں کی علامت ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ 1

ایسے حالات میں مطلقہ عورت کے ساتھ حسن سلوک کا اہتمام کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ کاش کہ ہم اس پر عمل کریں، اس کے بے شمار معاشرتی فوائد ہیں۔

☆ مطلقہ رجعیہ، طلاق ملنے کے باوجود یعنی اپنے خاوند کی بیوی ہے، اس کے جملہ اخراجات اور رہائش وغیرہ خاوند کے ذمے ہیں، خاوند کو اس سے راہ فرار اختیار کرنے کی شرعاً اجازت نہیں۔

☆ مطلقہ بائنہ خاوند کے نکاح سے فارغ ہو جاتی ہے، اب اس کی رہائش اور اخراجات خاوند کے ذمے نہیں ہیں۔

☆ مطلقہ کے پاس اگر خاوند کے بچے ہوں تو ان بچوں کے اخراجات خاوند نے ہی ادا کرنا ہیں۔ معروف طریقہ کے مطابق وہ انہیں ادا کرنے کا پابند ہے۔

صورت مسئولہ میں خاوند کا مطلقہ بائنہ کے جہیز پر قبضہ کرنا شرعاً درست نہیں، اس کی واپسی کے لیے اس نے عدالت کی طرف رجوع کیا ہے، اس سلسلہ میں وہ حق بجانب ہے، خاوند کو چاہیے کہ وہ جہیز حق مہر اور دیگر ملنے والے تحائف واپس کرے۔ بلکہ ان کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اسے اچھے انداز سے تھوڑا بہت مال دے کر فارغ کیا جائے۔ پھر مطلقہ بیوی کے پاس اس کی تین سالہ بچی ہے، اس کے جملہ اخراجات بھی خاوند کے ذمے ہیں، بہتر ہے کہ وہ عدالتی چارہ جوئی کے بغیر ہی انہیں ادا کرتا رہے۔ واللہ اعلم!

بیوی کی رفاقت آخری خاوند سے

] میرے خاوند عرصہ آٹھ سال سے فوت ہو چکے ہیں، عدت گزارنے کے بعد مجھے اچھے رشتوں کی پیش کش ہوئی لیکن میں نے شادی نہیں کی، کیوں کہ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ قیامت کے دن بیوی اپنے آخری خاوند کے ساتھ ہوگی، اس کے متعلق وضاحت درکار ہے۔

[اگر کوئی عورت فوت ہو جائے اور اس نے اپنی زندگی میں ایک سے زیادہ شادیاں کی ہوں اور اس کے یکے بعد

1 البقرہ: ۲۴۱.

یکے بعد دیگرے متعدد خاوند ہوں تو جنت میں کس شوہر کے ساتھ ہوگی؟ اس کے متعلق اہل علم کے تین اقوال مشہور ہیں:

۱۔ ایسی خاتون اپنے ساتھ سب سے اچھا برتاؤ کرنے والے خاوند کے ساتھ ہوگی۔

اس سلسلہ میں سیدہ ام حبیبہ r سے مروی ایک حدیث بطور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''ایسی خاتون جنت میں اس شوہر کے ساتھ رہے گی جو اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوگا، کیوں کہ حسن سلوک دنیا و آخرت کی بھلائیاں سمیٹ لیتا ہے۔'' ......لیکن یہ روایت سخت ضعیف ہے کیوں کہ اس روایت کی سند میں متعدد مجروح قسم کے راوی ہیں۔

۲۔ ایسی خاتون کو جنت میں اختیار دیا جائے گا کہ وہ جس کے پاس چاہے رہے، اس موقف کو علامہ ابن عثیمین a نے اختیار کیا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے فتاویٰ میں صراحت کی ہے۔

۳۔ وہ عورت، سب سے آخری خاوند کی بیوی ہوگی بشرطیکہ وہ اللہ کی رحمت سے جنت میں پہنچ جائے۔

ہمارے نزدیک یہی موقف راجح ہے جس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

ایسی عورت اپنے آخری شوہر کی بیوی ہوگی۔ 1

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب سیدنا ابو الدرداء t فوت ہوئے اور ان کی بیوی نے عدت وفات پوری کر لی تو سیدنا معاویہ t کی طرف سے پیغام نکاح آیا، انہوں نے شادی کرنے سے انکار کر دیا اور سیدنا ابو الدرداء t کے حوالے سے رسول اللہ e کا مذکورہ بالا فرمان سنا دیا۔ مزید کہا کہ میں قیامت کے دن جنت میں اپنے شوہر ابو الدرداء t کی رفاقت پسند کرتی ہوں۔ سیدنا امیر معاویہ t نے اپنے جوابی پیغام میں لکھا: ''آپ پھر پابندی سے روزے رکھیں، اس سے آپ کی عزت و عصمت محفوظ رہے گی۔'' 2

اگرچہ اس کی سند میں بھی محدثین نے کلام کی ہے تاہم مجموعی اعتبار سے یہ قابل حجت ہے اور درج ذیل حدیث بھی اس کی تائید میں پیش کی جاتی ہے کہ ایک بار سیدنا حذیفہ t نے اپنی بیوی سے کہا: ''اگر تم چاہتی ہو کہ جنت میں میرے ساتھ رہو تو میرے بعد دوسری شادی نہ کرنا کیوں کہ جنت میں عورت اپنے آخری خاوند کے ساتھ ہوگی۔'' یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ e کی تمام بیویوں پر آپ کے بعد نکاح کرنے کی پابندی لگائی گئی تاکہ وہ جنت میں آپ کی بیویاں ہوں۔ 3

چنانچہ رسول اللہ e نے سیدہ عائشہ r سے ایک مرتبہ فرمایا تھا: ''تم دنیا و آخرت میں میری زوجہ ہو۔'' 4

اسی طرح سیدہ حفصہ r کے متعلق بھی سیدنا جبریل u نے آپ e سے کہا تھا: ''وہ جنت میں بھی آپ کی بیوی ہوں گی۔'' 5

! الاحادیث الاصحیحہ:۱۲۸۱۔

@ المعجم الاوسط: ج۳،ص۲۷۵۔

سنن بیہقی، ج۷، ص۶۹۔

$الاحادیث الصحیحہ، نمبر:۱۱۴۲۔

% صحیح الجامع الصغیر:۴۷۲۸۔

ان احادیث و آثار کے پیش نظر ہم سائلہ کو وصیت کرتے ہیں کہ اگر وہ عقد ثانی کرنا چاہے تو اس کا حق ہے اور اگر اپنے شوہر کی محبت اور حسن سلوک کے پیش نظر قیامت کے دن اس کی رفاقت میں رہنا چاہتی ہے تو نکاح ثانی نہ کرے۔ اس کی احادیث میں گنجائش ہے۔ اور دعا کرتی رہے کہ اللہ کی رحمت سے دونوں میاں بیوی جنت میں اکٹھے ہو جائیں۔ واللہ اعلم!

مرد کے لیے ولی ہونے کی شرط

] میں ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ وہ دینی علوم سے بہرہ ور ہے لیکن میرے والد اس سے اتفاق نہیں کرتے، جبکہ لڑکی کے والدین راضی ہیں، کیا نکاح میں ولی کی اجازت مرد کے لیے بھی ہے؟ وضاحت کریں۔

[شادی کے صحیح ہونے کے لیے ولی کی اجازت صرف عورت کے لیے ہے مرد کے لیے نہیں، کیوں کہ وہ نکاح کے معاملہ میں خود ہی اپنے آپ کا ولی ہے۔ اس کے لیے نکاح کرنے میں کسی دوسرے کی موافقت شرط نہیں اور نہ ہی لڑکے کے والد کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی شرعی سبب کے بغیر اسے نکاح سے روکیں۔ لیکن لڑکے کو اپنے والدین کی رضامندی کا خیال رکھنا چاہیے کیوں کہ شریعت نے اسے والدین سے حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ نکاح کے سلسلہ میں والدین کی رضامندی اچھی، بہتر اور مستقبل میں اس کے لیے بہت سود مند اور ثمر آور ہے۔ والدین سے اچھا برتاؤ کر کے نکاح کے معاملہ میں ان کی رضامندی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان کے سامنے اپنے مافی الضمیر کا اظہار اچھے انداز سے کیا جائے اور دلائل کے ساتھ انہیں قائل کیا جائے، امید ہے کہ والدین راضی ہو جائیں گے۔ اگر راضی نہ ہوں تو جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا جائے بلکہ اس سلسلہ میں کسی اچھے انسان کی خدمات بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کی جائے، ایک مومن کے لیے دعا بہت بڑا ہتھیار ہے۔ ہم برخوردار کو درج ذیل باتوں کی نصیحت کرتے ہیں۔

☆ والدین کے ساتھ احسن انداز سے بات کی جائے۔
☆ انہیں قائل کرنے کے لیے اچھا سلوک اختیار کیا جائے۔
☆ اس سلسلہ میں جلد بازی اور جذبات سے کام نہ لیا جائے۔
☆ کسی اچھے آدمی کی خدمات حاصل کی جائیں تاکہ وہ انہیں راضی کرے۔
☆ اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے کہ وہ اس نکاح کے اسباب اور ذرائع پیدا فرمائے۔

واضح رہے کہ اگر لڑکا مجنون، دیوانہ، بے عقل یا کم عقل ہے تو اس کے نکاح کے لیے ولی کا ہونا ضروری ہے لیکن اگر وہ عقل مند اور سمجھ دار ہے تو نکاح کے سلسلہ میں وہ خود مختار ہے اسے کسی ولی کی ضرورت نہیں۔ تاہم بہتر ہے کہ اس سلسلہ میں اپنے والد کو اعتماد میں لیا جائے۔ واللہ اعلم!

غصے میں طلاق دینا

] میں باہر سے تھکا ماندہ گھر آیا تو میرا شیر خوار بچہ رو رہا تھا اور میری بیوی اپنے کام کاج میں مصروف تھی، مجھے اس کی

یہ حالت دیکھ کر بہت غصہ آیا اور غصے کی حالت میں اسے طلاق دے دی۔ کیا اس طرح غصہ میں دی ہوئی طلاق ہو جاتی ہے؟

[آج کل اکثر لوگ جب طلاق دے بیٹھتے ہیں تو پھر افسوس کرتے ہوئے طرح طرح کے حیلے سے یہ فتویٰ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ طلاق واقع نہ ہو، ایک عذر اکثر یہ ہوتا ہے کہ میں نے غصے کی حالت میں طلاق دی تھی حالانکہ طلاق غصے میں ہی دی جاتی ہے۔ کوئی بھی عقل مند انسان راضی خوشی طلاق نہیں دیتا۔ اس لیے ہم پہلے غصے کی اقسام بیان کرتے ہیں پھر اصل مسئلہ سے آگاہ کیا جائے گا۔

غصے کی حالتیں حسب ذیل ہیں:

☆ ابتدائی حالت...... یہ وہ حالت ہے جس میں غصہ تو ہوتا ہے لیکن اس حالت میں انسان کے ہوش وحواس قائم رہتے ہیں، اسے علم ہوتا ہے کہ میں منہ سے کیا بات کر رہا ہوں۔

☆ انتہائی حالت...... یہ وہ حالت ہے جس میں شدید غصہ کی وجہ سے انسان کے ہوش وحواس قائم نہیں رہتے اور اسے کوئی علم نہیں ہوتا کہ میں اپنے منہ سے کیا کہہ رہا ہوں۔

☆ درمیانی حالت...... یہ وہ حالت ہے کہ غصہ کی وجہ سے عقل بالکل زائل نہیں ہوتی، تاہم یہ غصہ اس کی قوت فکر پر اس حد تک اثر انداز ضرور ہو جاتا ہے کہ اس دوران کی ہوئی کوتاہی پر بعد میں ندامت ہوتی ہے۔

پہلی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع ہو جاتی ہے کیوں کہ اس میں انسان اپنے ہوش وحواس اور عزم وارادہ سے طلاق دیتا ہے، اس قسم کا غصہ وقوع طلاق کے لیے رکاوٹ نہیں بنتا۔

دوسری حالت میں دی ہوئی طلاق بالاتفاق واقع نہیں ہوتی کیوں کہ حدیث میں ہے: ''بحالت غلاق نہ طلاق ہوتی ہے اور نہ ہی غلام کو آزادی ملتی ہے۔'' 1

امام ابوداؤد a نے غلاق کا معنی غصہ ہی کیا ہے، امام احمد بن حنبل a سے بھی یہی معنی منقول ہے۔ البتہ تیسری حالت میں دی ہوئی طلاق محل اختلاف ہے۔ ہمارا رجحان یہ ہے کہ اس درمیانی حالت میں دی ہوئی طلاق نافذ ہو جاتی ہے کیوں کہ اس حالت میں غصہ دیوانگی کی حد تک نہیں پہنچتا کہ اس حالت میں طلاق دہندہ کو مرفوع القلم قرار دیا جائے۔

صورت مسئولہ میں اگر سائل واقعی غصہ کی وجہ سے جنونی کیفیت میں تھا اور اسے معلوم نہ تھا کہ میں منہ سے کیا نکال رہا ہوں اور اس کا انجام کیا ہوگا تو ایسی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوگی۔ لیکن غصہ کی یہ حالت شاذ و نادر ہی ہوتی ہے، اگر اس کی یہ حالت نہ تھی تو طلاق واقع ہو گئی ہے۔ چونکہ ایک مرتبہ طلاق دی تھی لہٰذا دوران عدت رجوع کیا جا سکتا ہے اور عدت گزر جانے کے بعد بھی تجدید نکاح سے گھر آباد کیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم!

! ابو داؤد، الطلاق:۲۸۹۳.

لاپتہ خاوند کی بیوی کیا کرے؟

] ہم نے اپنی بچی کا نکاح ایک شخص سے کیا تھا، لیکن وہ عرصہ دو سال سے لاپتہ ہے، تاحال تلاش بسیار کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا، ہم بہت پریشان ہیں، شریعت میں اس قسم کی مشکل کا کیا حل ہے؟ آگاہ فرمائیں۔

[جو شخص گم ہو جائے اور اس کی کوئی خبر نہ ملے تو اسے مفقود الخبر کہا جاتا ہے۔ مفقود الخبر خاوند کے متعلق فقہ حنفی میں یہ حل لکھا ہے کہ اس شخص کی ۱۲۰ سال عمر ہونے تک اس کی بیوی انتظار کرے گی اس کے بعد وہ عدت وفات چار ماہ دس دن گزار کر عقد ثانی کر سکتی ہے۔ 1

اتنی طویل مدت انتظار کرنے کے بعد اسے نکاح کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تاہم اس مظلومہ پر مولانا اشرف علی تھانوی a کو ترس آیا تو انہوں نے اس کے متعلق ایک کتاب لکھی جس کا نام ''الحيلة الناجزة للحيلة العاجزة''

اس کتاب میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ فقہاء احناف کا موقف از روئے دلیل قوی اور نہایت احتیاط پر مبنی ہے، پھر فرماتے ہیں کہ کچھ متاخرین نے وقت کی نزاکت اور فتنوں پر نظر رکھتے ہوئے اس مسئلہ میں امام مالک a کے مذہب پر فتویٰ دیا ہے، امام مالک a کے نزدیک مفقود الخبر خاوند کی بیوی کو چار سال تک انتظار کرنا ہوگا پھر عدت وفات چار ماہ دس دن کے بعد اسے عقد ثانی کرنے کی اجازت ہے۔ 2

امام مالک a کے فتویٰ کی بنیاد سیدنا عمر t کا ایک فیصلہ ہے، آپ t نے فرمایا تھا:

''لاپتہ خاوند کی بیوی چار سال تک انتظار کرے گی پھر شوہر کے فوت ہونے کی عدت گزارے گی، پھر اس کے بعد اگر چاہے تو شادی کر لے۔'' 3

لیکن امام بخاری a نے وسعت نظر کے پیش نظر اس کے متعلق ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

((باب حكم المفقود فى اهله وما له))

''لاپتہ آدمی کی بیوی اور اس کے حال کے متعلق فیصلہ۔'' 4

اس کے بعد امام بخاری a نے دو مختلف اثر بیان کیے ہیں:

۱۔ سیدنا سعید بن مسیب t فرماتے ہیں کہ اگر وہ لڑائی کی صفوں میں گم ہو جائے تو ایک سال انتظار کرنے کے بعد وہ نکاح کر سکتی ہے۔

۲۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود t نے ایک لونڈی خریدی، قیمت کے ادائیگی سے قبل اس کا مالک لاپتہ ہوگیا۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود t نے ایک سال انتظار کرنے کے بعد لونڈی کی قیمت بتدریج فی سبیل اللہ خرچ کر دی، خیال یہ

!ہدایة، كتاب المفقود۔ @ حيلة ناجزه:ص۱۶۶.

بيهقى، ج۷، ص۱۶۶. $ بخارى، الطلاق، باب نمبر ۲۲.

تھا کہ فروخت کنندہ واپس آ گیا تو قیمت اسے دے دوں گا بصورت دیگر اسے اس کا اجر ملتا رہے گا۔

پھر امام بخاری a نے قیدی کے متعلق امام زہری a کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ اگر قیدی کا پتہ معلوم ہو تو اس کی بیوی کو نکاح کرنے کی اجازت نہیں، بصورت دیگر وہ ایک سال انتظار کرنے کے بعد آگے نکاح کر سکتی ہے۔ ان آثار کے بعد امام بخاری a نے یزید مولیٰ منبعث t سے مروی ایک مرفوع حدیث ذکر کی ہے کہ گری ہوئی چیز اٹھانے والا ایک سال تک اس کا اعلان کرے۔'' 1

ان آثار اور مرفوع حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری a اس مسئلہ میں اس قسم کی مظلومہ کو امام مالک a سے بھی زیادہ رعایت دینا چاہتے ہیں کہ مفقود الخبر خاوند کی بیوی ایک سال انتظار کرنے کے بعد عدت وفات گزار کر عقد ثانی کر سکتی ہے۔ دور حاضر میں میڈیا کی برق رفتاری کے پیش نظر مظلومہ کے ساتھ اس سے بھی زیادہ رعایت ہو سکتی ہے کیوں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا﴾ 2

''ان عورتوں کو تکلیف دینے کے لیے مت روکے رکھو تا کہ تم ان پر زیادتی کرو۔''

نیز فرمایا:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾

''تم ان عورتوں کے ساتھ معروف طریقہ کے مطابق زندگی بسر کرو۔'' 3

لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مفقود الخبر خاوند کی بیوی عدالت کی طرف رجوع کرے، عدالت اس خاوند کے متعلق تحقیق و تفتیش کرے گی اور پھر اس کی وفات کا سرٹیفکیٹ جاری کرے گی، اس کے بعد عدت وفات گزار کر عقد ثانی کرنے کی مجاز ہو گی۔ عدالتی چارہ جوئی کے بغیر عورت کا کوئی بھی اقدام شرعاً ناجائز ہو گا۔ بہرحال اس سلسلہ میں ہمارا رجحان یہ ہے کہ جہاں صنف نازک کو ضرر محسوس ہو تو اس کی خلاصی کے لیے بواسطہ عدالت کوئی نہ کوئی راہ تلاش کرنا ہو گی کیوں کہ اسے تکلیف دے کر روکے رکھنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔ اس سلسلہ میں امام بخاری کا موقف انتہائی وزنی اور عقل و نقل کے عین مطابق ہے۔ واللہ اعلم!

لڑکی کو ناپسندیدہ شخص سے شادی پر مجبور کرنا

] میں ایک کالج میں بی اے کی طالبہ ہوں، مجھے میرے والدین ایک ایسے شخص سے نکاح کرنے پر مجبور کرتے ہیں جو مجھے انتہائی ناپسند ہے، کیا مجھے والدین کی اطاعت کرتے ہوئے ایسے شخص سے نکاح کر لینا چاہیے؟ جسے میں پسند نہیں کرتی ہوں۔

! بخاری، الطاق:۵۲۹۲. @ البقرہ:۲۳۱.

النساء:۱۹.

[دین اسلام میں صحت نکاح کے لیے کئی ایک شرائط ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ لڑکی بھی رضامند ہو۔ جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ t سے روایت ہے، رسول اللہ e نے فرمایا:

''شوہر دیدہ کی شادی اس کے مشورہ کے بغیر نہ کی جائے اور نہ ہی کنواری لڑکی کا نکاح اس سے اجازت لیے بغیر کیا جائے۔''

صحابہ کرام y نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! اس کی اجازت کیا ہے؟

تو آپ e نے فرمایا: ''اس کی اجازت یہ ہے کہ وہ پوچھنے پر خاموش رہے۔'' 1

اس حدیث پر امام بخاری a نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:

((باب لا ینکح الاب وغیرہ البکر والثیب الابرضاھا))

''باپ یا کوئی دوسرا سرپرست کنواری اور بیوہ کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر نہ کرے۔'' 2

اس حدیث کی بناء پر اگر کوئی لڑکی کسی سے نکاح نہیں کرنا چاہتی تو اسے اس سے نکاح کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور اس اقدام پر اسے نافرمانی شمار نہیں کیا جائے گا۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ a فرماتے ہیں کہ والدین کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ اپنی بچی کا نکاح ایسے شخص سے کریں جسے وہ نہیں چاہتی، اگر وہ نکاح سے رک جاتی ہے تو وہ نافرمان شمار نہیں ہوگی۔ 3

امام بخاری a نے اس سلسلہ میں ایک مزید عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

((باب اذا زوج ابنتہٗ وہی کارہۃ فنکاحہ مردود))

''جب کوئی اپنی بیٹی کا زبردستی کہیں نکاح کر دے تو ایسا نکاح مردود ہے۔'' 4

پھر اس عنوان کو ثابت کرنے کے لیے ایک حدیث لائے ہیں کہ خنساء بنت حرام r کا نکاح ان کے باپ نے ان کی مرضی کے بغیر کر دیا تھا تو رسول اللہ e نے اس نکاح کو مسترد کر دیا تھا۔ 5

بہرحال شریعت نے افراط وتفریط کے درمیان اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے کہ نہ تو عورت کو کھلی آزادی دی ہے کہ وہ جب چاہے جہاں چاہے اپنا نکاح خود کر لے اور نہ ہی وہ اس قدر مجبور ہے کہ اس کا سرپرست جب چاہے، جہاں چاہے اس کی مرضی کے بغیر اس کا عقد کر دے، اور وہ مجبور ہو کر خاموشی سے اس کو قبول کر لے۔ صورت مسئولہ میں والدین کو چاہیے کہ وہ اپنی بچی کو اعتماد میں لیں اور اسے دلائل کے ساتھ قائل کر کے پھر اس کا نکاح کریں۔ واللہ اعلم!

! بخاری، النکاح:۵۱۳۶.
@ بخاری، النکاح، باب نمبر ۴۲.
# الاختیارات، ص:۲۴۴.
$ بخاری، النکاح، باب:۴۳.
% بخاری، النکاح:۵۱۳۸.

نکاح کی رجسٹریشن

] ملکی قوانین کے مطابق نکاح کی رجسٹریشن کروائی جاتی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر شرعی نکاح کر لیا جائے اور سرکاری طور پر اس کا اندراج نہ ہو تو کیا ایسا نکاح درست نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[نکاح ایجاب وقبول کا نام ہے، اگر یہ ایجاب وقبول دو گواہوں کی موجودگی میں ہوتا ہے اور عورت نکاح پر راضی ہو اور اس کا سرپرست بھی رضامند ہو تو اسے شرعی نکاح کہتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ خاوند اور بیوی میں نکاح سے مانع کوئی چیز نہ پائی جائے تو اس سے نکاح ہو جاتا ہے، سرکاری اندراج اور تصدیق شرائط نکاح سے نہیں ہے، البتہ شریعت نے ہمیں پابند کیا ہے کہ ہم سرکاری احکامات کی پابندی کریں بشرطیکہ وہ کتاب وسنت کے مخالف نہ ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾ 1

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بات مانو اور ان حکمرانوں کا بھی کہا مانو جو تم میں سے ہوں۔''

اس آیت کریمہ میں ''اولی الامر'' سے مراد مسلمان حکمران ہیں، ان کی اطاعت مشروط ہے۔ یعنی ان کی اطاعت صرف اس صورت میں ہوگی جب وہ اللہ اور اس کے رسول کے اطاعت کے خلاف نہ ہو، اگر خلاف ہے تو ان کی اطاعت نہ کی جائے۔ نکاح کی رجسٹریشن کرنا ایک حکومتی حکم ہے جو کتاب وسنت کے خلاف نہیں، لہٰذا اس کی پابندی ضروری ہے، اگرچہ اس کے بغیر شرعی نکاح ہو جاتا ہے لیکن آئندہ زندگی میں بہت سے حقوق اس سے وابستہ ہیں، نیز کئی ایک مفاسد کے سدباب کے لیے رجسٹریشن کرائی جاتی ہے۔

☆ حج وعمرہ کی ادائیگی، اگر میاں بیوی دونوں اکٹھے کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے تصدیق شدہ نکاح نامہ ضروری ہے۔

☆ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کے لیے بھی مصدقہ نکاح نامہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

☆ بچوں کے نام اور اس کے اندراج کے لیے میاں بیوی کا مصدقہ نکاح نامہ دکھانا پڑتا ہے۔

☆ عورت کو اگر خاوند سے خلع لینا ہے تو عدالت میں خاوند سے نکاح کو ثابت کرنے کے لیے نکاح نامہ کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ عدالت خلع کی ڈگری جاری کر سکے۔

بہرحال نکاح کی رجسٹریشن کتاب وسنت کے خلاف نہیں، اس سے راہ فرار اختیار کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ اس لیے ہمارے رجحان کے مطابق شرعی نکاح کے ساتھ اس کا اندراج بھی ضروی ہے تاکہ اس کے ذریعے اپنے حقوق کی حفاظت ہو، اس کے علاوہ تہمت وشک سے بھی محفوظ رہ سکے۔ واللہ اعلم!

نکاح حلالہ

] ہمارے معاشرہ میں کسی عورت کو اگر بیک وقت تین طلاقیں دی جائیں تو کہا جاتا ہے کہ اب حلالہ کے بعد پہلے

---

1 النساء:۵۹.

خاوند کے لیے جائز ہوگی، یہ حلالہ کیا ہوتا ہے؟ کتاب وسنت میں اس کی کوئی گنجائش ہے؟ وضاحت سے بیان کریں۔

[ہمارے ہاں حلالہ کی دو اقسام ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

شرعی حلالہ......کوئی آدمی اپنی بیوی کو وقفے وقفے کے ساتھ تین طلاق دیتا ہے، اب یہ عورت اپنے خاوند پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے، اس کے حلال ہونے کی ایک صورت قرآن کریم نے بیان کی ہے کہ وہ عورت آباد ہونے کی نیت سے کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کرے اور وہ اس سے ہم بستری کرے پھر وہ نباہ نہ ہونے کی وجہ سے طلاق دے یا فوت ہو جائے تو عدت گزارنے کے بعد پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾ 1

''اگر خاوند اپنی بیوی کو (تیسری بار) طلاق دے دے تو اب وہ عورت اس کے لیے اس وقت تک حلال نہیں جب تک وہ اس کے سوا کسی دوسرے سے نکاح نہ کرے۔''

قرآن مجید میں وارد اس لفظ نکاح کی تفسیر ہم بستری سے آتی ہے، جیسا کہ سیدہ عائشہ r سے مروی ایک حدیث میں اس کی صراحت ہے۔'' 2

یہی شرعی حلالہ ہے جس کی قرآن کریم نے اجازت دی ہے۔

رواجی حلالہ......اس کی صورت یہ ہے کہ جس عورت کو وقفے وقفے سے تین طلاق ہو جائیں تو وہ صرف اس مقصد کے پیش نظر کسی دوسرے خاوند سے نکاح کرے تاکہ وہ پہلے کے لیے حلال ہو جائے۔ اس کے ساتھ باقاعدہ ازدواجی زندگی گزارنا مقصود نہ ہو بلکہ مقصد یہ ہو کہ دوسرا خاوند خلوت کے بعد اسے طلاق دے دے گا تاکہ پہلا خاوند اس کے ساتھ نئے سرے سے نکاح کر سکے۔ اس عارضی نکاح کو رواجی حلالہ کہا جاتا ہے اسے حدیث میں لعنتی عمل قرار دیا گیا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے حلالہ کرنے والے اور حلالہ کروانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ 3

لعنت سے ''نکاح حلالہ'' یعنی رواجی حلالہ کی حرمت ثابت ہوتی ہے کیوں کہ جائز کام پر لعنت نہیں ہو سکتی۔

ایک حدیث میں حلالہ کرنے والے کو کرائے کا سانڈ قرار دیا گیا ہے۔ 4

اس لفظ سے مذکورہ عمل کی شناخت وقباحت کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح جانوروں کی نسل کشی کے لیے سانڈ لیا جاتا ہے تاکہ جفتی کر کے مادہ جانور کو حاملہ کروائے، پھر اس کے مالک کو واپس کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح حلالہ کرنے والے کو وقتی طور پر تعلق قائم کرنے کی درخواست کرتا ہے تاکہ وہ خلوت کے بعد اسے طلاق دے کر پہلے خاوند کے لیے حلال کر دے۔ جس

! البقرہ: ۲۳۰۔ @ بخاری، الشہادات: ۲۶۳۹۔

ابن ماجہ، النکاح: ۱۹۳۴۔ $ مستدرک حاکم، ج۲، ص۱۹۸۔

طرح سانڈ کرائے پر لینے والے کی ملکیت نہیں بن جاتا، اسی طرح حلالہ کرنے والا عورت سے مستقل تعلق قائم نہیں کرتا بلکہ اپنے خیال میں خاوند کی ضرورت پوری کر کے عورت سے الگ ہو جاتا ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق ایک غیرت مند انسان اس رواجی حلالہ کے چکر میں نہیں پڑتا کیوں کہ یہ بے غیرتی اور بے حیائی کا کام ہے۔ واللہ اعلم!

حق مہر میں اسراف

] ہمارے خاندان میں حق مہر بہت بڑھا چڑھا کر مقرر کیا جاتا ہے، جسے بعض اوقات آدمی ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، ایسے حالات میں کیا کیا جائے، قرآن وحدیث کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرمائیں۔

[حق مہر بڑھا چڑھا کر مقرر کرنا اسراف ہے، خصوصاً جب انسان اس کے ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اس سلسلہ میں سیدنا ابو ہریرہ t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں اخراجات کم ہوں۔'' 1

مہر کے سلسلہ میں ہمارا رجحان یہ ہے کہ وہ اس قدر رکھا جائے جو آسانی سے ادا کر دیا جائے، جب مہر زیادہ ہوگا تو بہت سے مفاسد کا ذریعہ بنے گا اور نکاح میں رکاوٹ ہوگی تو معاشرے میں انارکی پھیلے گی۔ رسول اللہ e کا اپنی بیویوں کے لیے حق مہر پانچ صد درہم سے زیادہ نہیں تھا۔

بلکہ آپ e نے نکاح کے سلسلہ میں ایک صحابی سے فرمایا تھا: کہ ''جاؤ اپنے گھر میں تلاش کرو، خواہ لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو، وہی بطور حق مہر دینے کے لیے لے آؤ۔'' 2

واضح رہے کہ دین اسلام میں مہر بیوی کا خصوصی حق ہے، جس کی ادائیگی ضروری ہے۔ اس لیے استطاعت سے زیادہ حق مہر مقرر نہیں کرنا چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ 3

''عورتوں کو ان کے مہر راضی خوشی ادا کرو۔''

سوال میں ذکر کردہ حالات کے پیش نظر بیوی اپنے خاوند کو اپنے مہر سے کچھ معاف بھی کر سکتی ہے بشرطیکہ اس پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـــًٔا مَّرِيْٓـــًٔا﴾ 4

''اگر وہ خوشی سے کچھ مہر چھوڑ دیں تو اسے راضی خوشی استعمال کر لو۔''

! ابو داؤد، النکاح:۲۱۱۷۔ @ بخاری، النکاح:۵۱۲۶۔

النساء:۴۔ $ النساء:۴۔

بہرحال حق مہر زیادہ مقرر کرنا کوئی نیک فال نہیں، ایسا کرنے سے آئندہ زندگی میں برے اثرات مرتب ہونے کا خدشہ ہے۔ لہٰذا مہر اتنا ہی مقرر کیا جائے جس کے ادا کرنے کی خاوند کی استطاعت ہو۔ واللہ اعلم!

خاندان سے باہر شادی کرنا

] میں شادی کرنا چاہتا ہوں، مجھے یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ اپنے خاندان سے باہر شادی کی جائے، کیوں کہ خاندان میں شادی کرنے سے خاندانی موروثی بیماریاں بچوں میں آجاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں شریعت کیا راہنمائی کرتی ہے؟

[رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''عورت سے چار چیزوں کی بنا پر نکاح کیا جاتا ہے، اس کے مال کی وجہ سے، حسب ونسب کی وجہ سے، حسن و جمال کی وجہ سے اور اس کے اخلاق و کردار کی وجہ سے، اے انسان! تو دیندار عورت سے شادی کرنے میں کامیابی حاصل کرلے، تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔'' 1

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دینداری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، شادی کرتے وقت اس پہلو کو دیکھا جائے کہ اخلاق و کردار اور دینداری کے اعتبار سے عورت کی حیثیت کیا ہے خواہ اس کا تعلق قریبی رشتے داروں سے ہو یا دور کے لوگوں سے، یا وہ خاندان سے باہر ہو۔ یہ اس بناء پر ہے کہ دیندار بیوی، انسان کے گھر، اس کی اولاد اور اس کے مال نیز عزت وآبرو کی زیادہ حفاظت کرنے والی ہوگی۔ چنانچہ رسول اللہ e نے اپنی لخت جگر سیدہ فاطمہ r کا نکاح سیدنا علی t سے کیا جو آپ کے قریبی رشتہ دار تھے، اس میں کوئی شک نہیں کہ موروثی صفات کا اثر بچوں پر ضرور ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ e نے اس کی طرف اشارہ فرمایا تھا جبکہ آپ نے ایک دیہاتی کو مطمئن کیا جس نے کہا تھا کہ میری بیوی نے ایک سیاہ رنگ کا بچہ جنم دیا ہے جبکہ ہم دونوں سفید رنگ کے ہیں۔ 2

جدید طب نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ خاندانی موروثی بیماریاں بچوں میں منتقل ہو جاتی ہیں، تاہم شریعت نے انہیں اتنی اہمیت نہیں دی۔ بہرحال قطع رحمی کی اجازت نہیں، شادی کے لیے دیندار خاتون کا ہی انتخاب کرنا چاہیے، اسی میں عافیت ہے۔ اگر خاندان میں ان صفات کی حامل عورت نہ مل سکے تو خاندان سے باہر رشتہ داری کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن موروثی بیماریوں کے بہانے کارگر ثابت نہیں ہوں گے۔ واللہ اعلم!

دوران حمل طلاق دینا

] میری دو سال قبل شادی ہوئی تھی، گھر میں معمولی ناچاقی کی وجہ سے میرے خاوند نے مجھے طلاق دے دی جبکہ میں اس وقت امید سے تھی، کیا ایسے حالات میں طلاق ہو جاتی ہے، ہمارے ہاں مشہور ہے کہ دوران حمل دی ہوئی طلاق نہیں ہوتی۔ وضاحت فرمائیں۔

[ہمارے معاشرہ میں یہ بات بہت مشہور ہے کہ دوران حمل دی گئی طلاق شمار نہیں ہوتی حالانکہ یہ بات درست

! بخاری، النکاح: ۵۰۹۰. @ بخاری، الطلاق: ۵۳۰۵.

نہیں۔ کیوں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل بیان کی ہے اور عدت، طلاق کے بعد ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ 1

''اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔''

یہ آیت کریمہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ دوران حمل دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے اور عدت کے اعتبار سے یہ طلاق زیادہ وسیع ہے، لہٰذا حاملہ عورت کو طلاق دینا جائز ہے، اور اس دوران دی گئی طلاق مؤثر ہو جاتی ہے۔ نیز رسول اللہ e نے سیدنا عمر t سے فرمایا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سیدنا عبداللہ بن عمر w سے کہہ دیں: ''دوران حیض دی گئی طلاق سے رجوع کرے پھر طہر یا حمل کی حالت میں اسے طلاق دے۔'' 2

واضح رہے کہ سیدنا ابن عمر w نے اپنی بیوی کو دوران حیض طلاق دی تھی، جس کی شکایت سیدنا عمر t نے رسول اللہ e سے کی تھی، اس وقت آپ e نے یہ حکم دیا۔

بہرحال دوران حمل دی گئی طلاق موثر ہو جاتی ہے اور اس کی عدت وضع حمل ہے خواہ اگلے دن ہو جائے یا چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہو۔ وضع حمل ہوتے ہی نکاح ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد اگر پہلی یا دوسری طلاق ہے تو تجدید نکاح سے گھر آباد کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ لڑکی راضی ہو اور سرپرست بھی اجازت دے نیز حق مہر بھی نیا ہوگا۔ اس کے علاوہ گواہوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔

صورت مسئولہ میں خاوند نے اپنی بیوی کو دوران حمل طلاق دی ہے، اس طرح دی ہوئی طلاق ہو جاتی ہے۔ البتہ اس کی عدت وضع حمل ہے، وضع حمل سے پہلے پہلے خاوند کو رجوع کرنے کا پورا پورا حق ہے، وضع حمل کے بعد بھی رجوع کیا جا سکتا ہے لیکن یہ تجدید نکاح سے ممکن ہوگا۔ واللہ اعلم!

ممانی سے نکاح

] میرے ماموں بہت سخت مزاج ہیں اور وہ اپنے اہل خانہ سے انتہائی بدسلوکی سے پیش آتے ہیں، میری خواہش ہے کہ میں اپنی ممانی سے نکاح کر لوں تا کہ اس کے اور بچوں کے ساتھ حسن سلوک کروں، جبکہ ممانی بھی خواہش مند ہے، اس سلسلہ میں میری راہنمائی کریں۔

[مسئلہ کی وضاحت سے پہلے چند امور کی وضاحت کرنا ضروری ہے، جو حسب ذیل ہیں:

☆ میاں بیوی کا رشتہ بہت اہم اور نزاکت کا حامل ہے، حتی الوسع فریقین کو اسے نباہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سائل کو چاہیے کہ وہ اپنے ماموں کو وعظ و نصیحت کرے اور اسے رشتہ ازواج کی نزاکت کا احساس دلائے تا کہ یہ رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔

☆ سائل کو چاہیے کہ وہ اپنی ممانی کو سمجھائے اور اسے اپنے کردار پر نظر ثانی کرنے کی ترغیب دلائے، میاں بیوی کے

! الطلاق:۴ @ مسلم، الطلاق:۱۴۷۱.

درمیان نفرت ڈالنے کی کوشش نہ کرے، کیوں کہ حدیث میں اس کے متعلق سخت وعید آئی ہے۔ رسول اللہ e فرماتے ہیں: ''وہ شخص ہم میں سے نہیں جو کسی عورت کو اس کے شوہر کے خلاف ابھارتا ہے۔'' 1

اس حدیث کے پیش نظر سائل کو چاہیے کہ وہ اس رشتے کو جوڑنے کی کوشش کرے، کسی قسم کے منفی کردار کی شرعاً اسے اجازت نہیں۔

☆ ممانی کو چاہیے کہ وہ کسی کی انگیخت میں آ کر بلاوجہ اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ نہ کرے تاکہ وہ کسی دوسرے سے نکاح کرے۔

حدیث میں ہے: ''جو عورت کسی وجہ کے بغیر اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرتی ہے اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے۔'' 2

اس حدیث کے پیش نظر سائل کی ممانی کو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور اپنے خاوند کو خوش رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ان تمہیدی گزارشات کے بعد ہم اصل مسئلہ کی وضاحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ النساء میں ان خونی، رضاعی اور سسرالی رشتوں کی فہرست بیان کی ہے، جو حرام ہیں اور ان سے نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔ 3

ان رشتوں میں ممانی کا ذکر نہیں ہے، اس لیے ممانی سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا خاوند اسے طلاق بائن دے کر اپنے آپ سے الگ کر دے اور وہ اپنی عدت کے ایام پورے کر لے۔ لیکن یہ کسی صورت میں جائز نہیں کہ سائل اپنی ممانی کو اس کے خاوند سے متنفر کرے تاکہ وہ اس سے طلاق لے کر اس کے ساتھ شادی کرے۔ واللہ اعلم!

شوہر دیدہ عورت کے لیے ولی کی ضرورت

] اگر کسی عورت کا خاوند فوت ہو جائے یا وہ مطلقہ ہو تو کیا اسے پھر عقد ثانی کے لیے ولی کی ضرورت ہے، یا وہ اپنا نکاح کرنے میں خود مختار ہے، قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

[شوہر دیدہ عورت کے نکاح کے متعلق رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''شوہر دیدہ اپنی ذات کے متعلق اپنے سرپرست کی بہ نسبت زیادہ حق دار ہے۔'' 4

ایک روایت میں ہے کہ سرپرست کو بیوہ کے معاملہ میں کوئی دخل حاصل نہیں، یعنی وہ خود مختار ہے۔ 5

اس قسم کی دیگر احادیث سے کچھ حضرات نے جو مسئلہ کشید کیا ہے کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے یا وہ مطلقہ ہو تو اسے اپنے سرپرست کی کوئی ضرورت نہیں، وہ اپنا نکاح کرنے میں خود مختار ہے۔ حالانکہ احادیث کا قطعاً یہ منشا نہیں کیوں کہ دین اسلام میں سرپرست کی اجازت صحت نکاح کے لیے بنیادی شرط ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ زندگی کے اہم فیصلے میں عورتوں پر جبر

! ابو داؤد، الطلاق:۲۱۷۵۔ @ابو داؤد، الطلاق:۲۲۲۶۔

النساء:۲۳۰۔ $ ابو داؤد، الطلاق:۲۰۹۸۔

% نسائی، النکاح:۳۲۶۵۔

نہیں کرنا چاہیے کہ بندھن کا فیصلہ ان کی رضامندی سے کرنا چاہیے بلکہ شوہر دیدہ سے بالوضاحت مشورہ لیا جائے اور جہاں وہ عندیہ دے سرپرست کو چاہیے کہ وہیں اس کا نکاح کر دے بشرطیکہ وہاں کوئی شرعی رکاوٹ نہ ہو۔ اس سلسلہ میں درج ذیل حدیث بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہ ''ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہے۔'' 1

اس روایت کو متواتر تک کہا گیا ہے، اسے رسول اللہ e سے بیان کرنے والے سیدنا ابوموسیٰ اشعری، سیدنا عبداللہ بن عباس، سیدنا جابر بن عبداللہ اور سیدنا ابوہریرہ و دیگر صحابہ کرام y ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث جس میں شوہر دیدہ کو اپنی ذات کے متعلق زیادہ حق دار قرار دیا گیا ہے ہمارے رجحان کے مطابق اس کا درج ذیل مفہوم ہے:

☆ دور جاہلیت میں اگر کسی عورت کا خاوند فوت ہو جاتا تو اس کی بیوہ کو بھی ترکہ شمار کیا جاتا تھا۔ خاوند کے ورثاء اس پر اپنا حق رکھتے تھے کہ اسے بے نکاح رہنے دیتے یا اس کی مرضی کے بغیر جہاں چاہتے نکاح کر دیتے، قرآن کریم نے وضاحت کر کے اس رسم بد کا خاتمہ کیا ہے۔ 2

رسول اللہ e نے بھی قرآن کریم میں بیان کردہ حکم کی تائید کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''شوہر دیدہ اپنی ذات کے متعلق اپنے سرپرست کی بہ نسبت زیادہ حق دار ہے۔''

اس حدیث کا قطعاً یہ مفہوم نہیں ہے کہ سرپرست کی اجازت کے بغیر وہ ازخود اپنا نکاح کر سکتی ہے۔

☆ اس حدیث کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ خاوند کے انتخاب میں وہ خود مختار ہے، سرپرست کو چاہیے کہ وہ اس کے جذبات کی پاسداری کرے اور جہاں وہ عندیہ دے وہاں نکاح کر دے۔ بہرحال دین اسلام میں انتہائی توازن و اعتدال ہے، اس میں نہ تو سرپرست کو اختیار ہے کہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے اس کا نکاح کر دے اور نہ ہی عورت مطلق العنان ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے شادی رچا لے، بلکہ سرپرست کو چاہیے کہ وہ اپنی زیردست کو اعتماد میں لے اور لڑکی کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے سرپرست کی عزت و ناموس کی پاسداری کرتے ہوئے اس کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائے۔ واللہ اعلم!

مسلمان خاتون کا عیسائی مرد سے نکاح

] ہمارے آفس میں ایک عیسائی کلرک ہے، اس کا کہنا ہے کہ ایک مسلمان لڑکی مجھ سے نکاح کرنا چاہتی ہے اور میں نے نکاح کے بعد اس کے ہاتھوں مسلمان ہونے کا وعدہ کیا ہے، کیا ایسا کرنا میرے لیے جائز ہے؟

[قرآن کریم کی صراحت کے مطابق ایک مسلمان مرد کا اہل کتاب عورت سے چند شرائط کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ 3

! ابو داؤد، النکاح: ۲۰۸۵۔ @ النساء: ۱۹۔

المائدہ: ۵۔

''اور جو لوگ تم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں ان کی پاک دامن عورتیں بھی (تمہارے لیے حلال ہیں)۔''

اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت کے ساتھ ایک تو پاک دامن ہونے کی شرط ہے جو آج کل اکثر اہل کتاب عورتوں میں مفقود ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اہل کتاب سے نکاح کرنے کی صورت میں اپنے ایمان کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد میں واضح طور پر اشارہ کیا ہے، اگر کسی مسلمان کو اہل کتاب عورت سے نکاح کرنے میں ایمان کے ضیاع کا خطرہ ہے تو یہ بہت ہی خسارے کا سودا ہے۔ دور حاضر میں ایسی عورتوں سے نکاح میں ایمان کو جو شدید خطرات لاحق ہوتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہیں، لیکن اہل کتاب مرد کا مسلمان خاتون سے نکاح کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ﴾ 1

''وہ (مومن) عورتیں ان (کافروں) کے لیے حلال نہیں اور نہ وہ (کافر) ان (مومن) عورتوں کے لیے حلال ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَٰتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ﴾ 2

''تم اپنی عورتوں کو مشرکین کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔''

صورت مسئولہ میں ایک عیسائی آدمی کا مسلمان خاتون سے نکاح نہیں ہوسکتا، اگر وہ مسلمان ہو جائے اور اپنے آپ کو اچھا مسلمان ثابت کر دے تو اس کا کسی مسلمان عورت سے نکاح کرنا جائز ہے۔ لیکن ایسے شخص کے اسلام کی جانچ پڑتال کرنا ضروری ہے کہ وہ شرک، شراب اور دیگر شرعی محرمات کو چھوڑ کر نماز، روزہ اور دیگر عبادات کو پابندی سے ادا کرتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ شادی کے بعد اسلام کو بطور حیلہ استعمال نہ کر سکے اور مقصد حاصل کرنے کے بعد وہ دوبارہ مرتد نہ ہو جائے۔ بہر حال اگر وہ مسلمان ہو جائے اور اپنے حسن اسلام کا مظاہرہ کرے تو اس کا نکاح کسی بھی مسلمان خاتون سے ہو سکتا ہے لیکن اسلام لانے کے محض وعدے پر نکاح کرنا صحیح نہیں۔ واللہ اعلم!

نکاح مسیار کی حقیقت

] آج کل بعض ممالک میں نکاح مسیار کا بہت چرچا ہے، یہ کیا ہوتا ہے اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ ہم نے سنا ہے کہ یہ نکاح متعہ کی ایک جدید شکل ہے۔ اس کے متعلق کتاب وسنت کے مطابق وضاحت کر دیں۔

[مسیار، سیر سے ماخوذ ہے، یہ مبالغہ کا صیغہ ہے، اس سے مراد زیادہ سفر کرنا ہے، اس کے ذریعے اس آدمی کی تعریف کی جاتی ہے جو ہمیشہ سفر کی حیثیت سے رہے، یا زیادہ سفر کرے۔ نکاح مسیار سے مراد ایسی شادی ہے کہ ایک عورت

! الممتحنہ:۱۰۔ @ البقرہ:۲۲۱۔

ظاہری طور پر شرعی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی مرد سے نکاح کرتی ہے اور وہ اپنے حقوق سے دستبردار ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ نان ونفقہ اور رہائش وغیرہ کا مطالبہ نہیں کرے گی۔ مرد جب چاہے آ کر اپنی جنسی تسکین پوری کر لے اور مرد باقی ذمہ داریوں سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کی کئی ایک صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً

☆ کسی مرد نے سفر کرنا ہے تو شادی کر کے عورت کو ہمراہ لے جائے۔

☆ طالب علم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہے تو اس دوران کسی سے شادی کر لے۔

☆ کسی شخص نے کاروبار کے سلسلہ میں کسی شہر میں قیام کرنا ہے تو اس دوران شادی کر لے۔

تعلیم یا سفر ختم ہوتے ہی اسے طلاق دے دے یا کبھی عارضی طور کی امید پر اپنی اس شادی کو برقرار رکھے، اس قسم کی شادی کے ذریعے بننے والے میاں بیوی اس رشتے کو اپنی ذات کی حد تک محدود رکھتے ہیں۔ فریقین میں سے کسی کو دوسرے کے رشتے داروں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسرے کے خاندان سے واقفیت نہیں ہوتی۔

دور حاضر کے علماء اس قسم کی شادی کے متعلق تین آراء رکھتے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ چونکہ اس میں شرعی شرائط پائی جاتی ہیں اس لیے یہ جائز ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیوی اپنے حقوق سے دستبردار ہو جاتی ہے، وہ خاوند سے نان ونفقہ اور رہائش کا مطالبہ نہیں کرتی، جیسا کہ سیدہ سودہ r نے اپنے حقوق سے دستبردار ہو کر سیدہ عائشہ r کو اپنی باری ہبہ کر دی تھی۔ البتہ اس میں کراہت کا پہلو یہ ہے کہ اس قسم کا نکاح مقاصد شریعت کے خلاف ہے۔

☆ اس قسم کا نکاح حرام ہے کیوں کہ اس کا مقصد صرف جنسی تسکین ہے، قرون اولیٰ میں اس قسم کے نکاح کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ نکاح مقاصد شریعت کے خلاف ہے کیوں کہ اس میں اولاد، تربیت اولاد، خاندانی حقوق وفرائض کا دور دور تک کوئی نشان نظر نہیں آتا، شریعت میں ظاہری الفاظ کے پیش نظر نہیں بلکہ مقاصد کو سامنے رکھ کر کوئی حکم لگایا جاتا ہے۔

☆ کچھ اہل علم توقف کے قائل ہیں، وہ اس کی حلت وحرمت کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرتے جیسا کہ شیخ ابن عثیمین t سے منقول ہے۔ 1

ہمارے رجحان کے مطابق اس قسم کی شادی کا تصور اسلام میں نہیں پایا جاتا، بلکہ ہمارے نزدیک یہ شادی نکاح متعہ کی ایک جدید شکل ہے جسے رسول اللہ e نے قیامت تک کے لیے حرام کر دیا ہے۔ اس قسم کا نکاح امیر لوگ غیر ممالک میں محض عیاشی اور جنسی تسکین کے لیے کرتے ہیں۔ اس کے متعلق ہمیں جو تفصیلات ملی ہیں ان کے مطابق ایک شخص کسی عورت سے معینہ مدت کے لیے شادی کرتا ہے، اگرچہ اس کا الفاظ سے اظہار نہیں کرتا، یہ بھی ہوتا ہے کہ عورت کو کچھ رقم دے کر مدت کے تعین کے بغیر شادی کرتا ہے کہ جب تک میں زیر تعلیم ہوں یا کاروبار کے سلسلہ میں یہاں مقیم ہوں یا یہاں ملازمت کرتا ہوں، اس

! صحیح فقہ السنہ، ج۳، ص۱۵۹۔

وقت تک محض جنسی تسکین کے لیے تیرے پاس آیا کروں گا۔ اسلام ایسی عارضی شادی کی اجازت نہیں دیتا جو محض تلذذ کے لیے کی جاتی ہے۔ ہماری شریعت میں نکاح کوئی ملکی رسم یا خاندانی روایت نہیں بلکہ ایک ایسا نظام ہے جو پاک بازی، افزائش نسل، باہمی پیار و محبت کی خشت اول ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ 1

''اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نکاح کے نتیجہ میں دو طرح کی رشتہ داریاں وجود میں آتی ہیں: ایک یہ کہ ہمارے ہاں عورت بہو بن کر آتی ہے، اس سے نسبی رشتہ داری وجود میں آتی ہے، دوسری یہ کہ ہماری بیٹیاں کسی کے گھر بہو بن کر جاتی ہیں تو اس سے سسرالی رشتہ داری قائم ہوتی ہے۔ پھر ان دونوں قسم کی تعلق داری سے پورا معاشرہ جڑ جاتا ہے اور ایک ہی جیسا تمدن وجود میں آتا ہے۔ مقام غور یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ مبارک نکاح اور اس کے عظیم مقاصد اور دوسری طرف نکاح مسیار، جس میں عورت خاوند کی بیوی تو ہے لیکن نہ سسر، نہ ساس، اسی طرح عورت کو خاوند کے رشتے داروں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ سوال میں سیدہ سودہ r کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس کی حقیقت یہ ہے: ''جب سیدہ سودہ بنت زمعہ r بڑی عمر کی ہو گئیں اور انہیں اندیشہ ہوا کہ رسول اللہ e انہیں چھوڑ دیں گے تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ! میرا دن عائشہ r کے لیے وقف ہے تو رسول اللہ e نے اسے قبول فرما لیا۔'' 2

ایک روایت میں ہے، سیدہ سودہ r نے اپنی باری سیدہ عائشہ r کے لیے اس لیے وقف کی تھی تا کہ اس قربانی کے ذریعے رسول اللہ e کی خوشنودی حاصل کر سکے۔ 3

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ سودہ r کو اندیشہ ہوا کہ مبادا رسول اللہ e انہیں بڑھاپے کی وجہ سے چھوڑ دیں گے تو آپ نے رسول اللہ e کی رفاقت اور آپ کی خوشنودی کی وجہ سے اپنے جذبات کی قربانی دی۔ اس حدیث کا موجودہ نکاح مسیار سے کیا تعلق ہے؟ جو سراسر مقاصد نکاح کے خلاف ہے۔ بہر حال اسلام میں اس طرح کے عارضی نکاح کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ یہ ایک نکاح متعہ کی صورت ہے جسے اسلام نے قیامت تک کے لیے حرام قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم!

! الروم:۲۱۔ @ ابو داؤد، النکاح:۲۱۳۵۔

#بخاری، الہبہ:۲۵۹۳۔

بندوق کا شکار

] میں بندوق سے پرندوں کا شکار کرتا ہوں، بعض اوقات پرندہ مرجاتا ہے، تو ایسے مرجانے والے پرندوں کو کھایا جاسکتا ہے؟ رہنمائی کریں۔

[شریعت نے شکار کے متعلق مکمل رہنمائی فرمائی ہے، اس سلسلہ میں درج ذیل باتوں کا خاص خیال رکھا جائے:

☆ بندوق چلاتے وقت بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھ کر بندوق چلائی جائے۔

حدیث میں ہے کہ جب بسم اللہ پڑھ کر تیر چھوڑا جائے تو ایسے شکار کو کھانا جائز ہے۔ 1

☆ بندوق کی گولی سے جانور کا خون نکل آئے اور اسے چوٹ کے انداز پر نہ لگے۔

حدیث میں ہے کہ ''اگر تیر نوک کے بل لگتا ہے تو مرنے کے بعد اسے کھایا جاسکتا ہے اور اگر وہ کسی اور جانب سے لگتا ہے تو پھر اسے نہ کھایا جائے۔'' 2

اگر پرندہ زندہ قابو آجائے تو اسے سنت کے مطابق ذبح کرنا ہوگا۔ یہ بھی واضح رہے کہ اگر بندوق چلاتے وقت شکاری اللہ کا نام لینا بھول گیا ہے تو ایسی صورت میں بھی شکار کو کھانا جائز ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی بھول چوک معاف فرما دی ہے۔ واللہ اعلم!

جانور کو ذبح کر کے اس کے منکے کو توڑنا

] ہمارے ہاں جب جانور کو ذبح کیا جاتا ہے تو اسے گھسیٹ کر بڑی بے دردی سے گرایا جاتا ہے پھر اسے ذبح کر کے اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر اس کا منکا توڑا جاتا ہے، نیز چھری کی نوک سے اس کی رگیں کاٹی جاتی ہیں، کیا جانور کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا جاسکتا ہے؟

[اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے ساتھ بہت ہی رحیم و شفیق ہے، اور اس نے ضروری قرار دیا ہے کہ ہر چیز کے ساتھ احسان کیا جائے بلکہ اس نے جانوروں کے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔

! بخاری، الذبائح:۵۴۸۸۔ @ نسائی، الصید:۴۲۷۰۔

چنانچہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ’’جب تم ذبح کرنے لگو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو اور ذبح کرتے وقت چھری کو تیز کر لیا کرو اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔‘‘ 1

جانور کو اچھی طرح ذبح کرنے میں درج ذیل چیزیں آتی ہیں:

☆ اسے سختی اور بے دردی سے نہ گرایا جائے۔

☆ اسے گھسیٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ کیا جائے۔

☆ جانور کے سامنے چھری کو تیز نہ کیا جائے۔

☆ اللہ کا نام لے کر جلدی جلدی ذبح کرے۔

☆ اس کا گلا اور رگیں کاٹنے میں دیر نہ کرے۔

☆ ذبح کرنے کے فوراً بعد اس کی کھال اتارنا شروع نہ کرے جب تڑپنا ختم ہو جائے تو اس کی کھال اتاری جائے۔

صورت مسئولہ میں ذبح کرتے وقت جو صورت حال ذکر کی گئی ہے اس کی شرعاً اجازت نہیں بلکہ ایسا کرنا مذکورہ بالا حدیث کی صریح خلاف ورزی ہے۔ واللہ اعلم!

قربانی کی شرعی حیثیت

] عید الاضحیٰ کی آمد آمد ہے، اہل اسلام اللہ عزوجل کے لیے جانور ذبح کریں گے، سوال یہ ہے کہ قربانی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا قربانی کرنا واجب ہے؟ اگر کوئی صاحب حیثیت قربانی نہ کرے تو کیا گناہ گار ہوگا؟ اس کی وضاحت کریں۔

[عید کے دنوں میں پالتو چوپائیوں میں سے کوئی جانور اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ذبح کرنا قربانی کہلاتا ہے۔ یہ دین اسلام کے شعائر میں سے ایک شعار ہے۔ اس کی مشروعیت، کتاب اللہ، سنت رسول اللہ e اور اہل اسلام کے اجماع سے ثابت ہے۔ اس کی شرعی حیثیت یعنی اس کے واجب یا سنت ہونے کے متعلق اہل اسلام میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء امام شافعی اور امام مالک S کا موقف ہے کہ قربانی سنت ہے جبکہ کچھ اہل علم اسے واجب قرار دیتے ہیں۔ ان میں امام ابوحنیفہ a برسرفہرست ہیں۔

ہمارے رجحان کے مطابق قربانی صاحب حیثیت کے لیے سنت موکدہ ہے۔ یعنی جو شخص قربانی کرنے کی استطاعت رکھتا ہے اس کے لیے قربانی کرنے کی بہت تاکید آئی ہے۔ لہٰذا اسے چاہیے کہ وہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی طرف سے قربانی کرے۔ چنانچہ رسول اللہ e دس سال مدینہ طیبہ میں رہے اور آپ e ہر سال قربانی کرتے تھے۔ جن احادیث سے قربانی کا وجوب کشید کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ہیں۔ اگر صحیح ہیں تو مدعا کے ثبوت کے لیے صریح نہیں ہیں۔ محدثین کرام نے تمام دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ قربانی سنت مؤکدہ ہے۔ یعنی ایک اہم اور مؤکد حکم ہے لیکن فرض یا واجب نہیں۔ تاہم

! مسلم، الذبائح : ۱۹۵۵.

استطاعت کے باوجود اس سنت مؤکدہ سے گریز کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ جیسا کہ اس کے متعلق سخت وعید وارد ہے۔ رسول اللہ e نے فرمایا:

’’جس کے پاس قربانی کرنے کی گنجائش ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے۔‘‘ 1

اگرچہ اس حدیث میں کچھ کلام ہے تاہم سیدنا ابوہریرہ t سے موقوف صحیح ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسے شخص کو نماز عید ادا کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ مقصد اسے تنبیہ کرنا ہے تاکہ وہ قربانی جیسی سنت ترک نہ کرے۔ بہرحال قربانی واجب نہیں بلکہ سنت مؤکدہ ہے۔

جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ t اور سیدنا عمر t کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہ قربانی نہیں کیا کرتے تھے۔‘‘ 2

سیدنا ابومسعود انصاری t کے متعلق حدیث میں ہے وہ فرماتے ہیں: ’’میں خوشحال ہونے کے باوجود قربانی نہیں کرتا، اس اندیشہ کے پیش نظر کے مبادا میرا پڑوسی اسے ضروری خیال کرے۔‘‘ 3 واللہ اعلم!

مشترکہ قربانی کرنے والوں پر پابندی

] میرا خاوند فوت ہو چکا ہے، میرا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے، ہم سب ایک ہی گھر میں رہائش رکھے ہوئے ہیں۔ ہم ہر سال قربانی کرتے ہیں۔ عشرہ ذی الحجہ میں بال اور ناخن نہ کاٹنے کی پابندی کن کن پر ہے؟ وضاحت کریں۔

[جس مسلمان نے قربانی کرنا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ عید کا چاند نظر آنے کے بعد اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔ جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’جب عشرہ ذوالحجہ شروع ہو جائے اور تم میں سے کوئی قربانی دینا چاہے تو وہ اپنے بالوں اور جسم سے کچھ نہ اکھاڑے۔‘‘ 4

سیدہ ام سلمہ r سے مروی دوسری روایت میں ہے: ’’جب تم ذوالحجہ کا چاند دیکھ لو اور تم میں سے کوئی قربانی دینا چاہتا ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے بالوں اور ناخنوں سے کچھ نہ کاٹے۔‘‘ 5

ان روایات کا مطلب یہ ہے کہ جس نے قربانی کرنا ہے اسے چاہیے کہ چاند نظر آنے کے بعد اپنے بالوں اور ناخنوں کو نہ کاٹے، گھر کے تمام افراد کی طرف سے ایک قربانی کافی ہوتی ہے، گویا وہ سب قربانی میں شریک ہوتے ہیں اور وہ قربانی کرنے والے شمار ہوتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ قربانی کے لوازمات کو پورا کریں اور ذوالحجہ کا چاند نظر آنے کے بعد اپنے بالوں اور ناخنوں کو نہ کاٹیں۔ واللہ اعلم!

! ابن ماجہ، الاضاحی:۳۱۲.   @ بیہقی، ص۹۷۰،۲۶۹.
مصنف عبد الرزاق، حدیث نمبر ۸۱۴۹. $ مسلم، المناسک:۱۹۷۷.
% مسلم، المناسک:۱۹۷۷.

مخنث جانور کی قربانی

] اکثر لوگ مخنث جانور کی قربانی کو ناجائز کہتے ہیں، کیا ایسا جانور ذبح کیا جا سکتا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[جاہل لوگ مخنث جانور کو ''بزرگ'' خیال کرتے ہیں اور اسے ذبح کرنا یا اس کی قربانی دینے کو ناجائز یا مکروہ کہتے ہیں۔ جبکہ کتاب وسنت میں کوئی ایسی دلیل نہیں جس کی بنا پر ایسے جانور کو ذبح کرنا ناموزوں یا قربانی کے لیے ناجائز قرار دیا جاسکے۔ تمام اہل علم خصی جانور کی قربانی کو جائز قرار دیتے ہیں، بلکہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ خود رسول اللہ e نے بھی خصی جانور کی قربانی دی ہے۔ آپ دو ایسے مینڈھوں کی قربانی دیتے جو گوشت سے بھرپور اور خصی ہوتے تھے۔ 1

جس طرح خصی ہونا کوئی عیب نہیں، اسی طرح جانور کا مخنث ہونا بھی کوئی ایسا عیب نہیں کہ جو قربانی کے منافی ہو۔ اس بناء پر ہمارا رجحان ہے کہ مخنث جانور کی قربانی دی جاسکتی ہے اور شرعی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں۔ واللہ اعلم!

قربانی کرنے والی عورت کے لیے کنگھی کرنا

] میں نے قربانی کرنا ہے، اگر میں دس دن تک بالوں میں کنگھی نہ کروں تو مجھے شدید دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کیا شرعی طور پر مجھے ان دنوں میں اپنے سر میں کنگھی کرنے کی اجازت ہے؟

[بلاشبہ جس نے قربانی کرنا ہے وہ جسم کے کسی قسم کے بال نہیں کاٹ سکتا، وہ نہ تو اپنے بال مونڈھ سکتا ہے اور نہ ہی کاٹ سکتا ہے۔ نیز اسے بال صفا پاؤڈر بھی استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ ان سب کاموں کی ممانعت حدیث سے ثابت ہے لیکن اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ وہ غسل نہیں کرسکتا اور بالوں کو دھو نہیں سکتا۔

اس بناء پر وہ عورت نہا سکتی ہے اور بالوں کو کنگھی کر کے انہیں سنوار سکتی ہے۔

اس دوران اگر بلاارادہ کچھ بال گر جاتے ہیں، تو کوئی حرج نہیں، دین اسلام میں اس قدر سختی نہیں۔ بہرحال جس عورت نے قربانی کرنا ہے، وہ غسل کرسکتی ہے، اپنے بالوں کو دھو کر ان میں کنگھی کرسکتی ہے، انہیں تیل لگانے اور سوارنے میں قطعاً کوئی حرج نہیں۔ واللہ اعلم!

اگر قربانی کا جانور ضائع ہوجائے

] میں نے قربانی کا جانور خریدا لیکن وہ کسی بیماری کی وجہ سے مر گیا، کیا اب مجھے کوئی دوسرا جانور بطور قربانی ذبح کرنا ہوگا؟ جبکہ میری مالی حالت بھی کمزور ہے۔ کتاب وسنت کی روشنی میں میرے لیے اب کیا حکم ہے؟

[اگر کسی نے قربانی کے لیے جانور خریدا لیکن وہ قربانی کے دن زندہ نہ رہا بلکہ کسی بیماری کی وجہ سے مر گیا، اگر وہ

! مسند امام احمد، ج۵، ص۱۹۶.

متبادل قربانی کرنے کی طاقت رکھتا ہے، تو اسے مرجانے والے جانور کے بدلے دوسرا جانور ذبح کرنا ہوگا۔ اسی طرح اگر اس کا جانور قربانی کے دن سے پہلے گم ہوجائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

چنانچہ رسول اللہ e نے ایک مرتبہ مسئلہ بیان فرمایا کہ ''کوئی شخص نماز عید پڑھنے سے پہلے قربانی ذبح نہ کرے۔'' یہ سن کر سیدنا ابوبردہ بن نیار t نے عرض کیا، اللہ کے رسول! میں نے اپنی قربانی جلدی قبل از وقت ذبح کردی ہے تاکہ میں اپنے اہل خانہ اور محلے دار پڑوسیوں کو جلدی گوشت کھلاؤں تو رسول اللہ e نے فرمایا: ''تجھے اور قربانی ذبح کرنا ہوگی۔'' 1

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے قربانی کا التزام کیا ہو اور اگر وہ قربانی اس سے ضائع ہوجائے بایں طور کہ نماز عید سے پہلے ذبح کردے یا قربانی کا جانور مرجائے یا گم ہوجائے تو اسے اس کے بدلے دوسری قربانی کرنا ہوگی، بشرطیکہ وہ مالی طور پر اس کی استطاعت رکھتا ہو۔ اگر وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو اسے دوسری قربانی کرنا ضروری نہیں۔ کیوں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ 2

''اللہ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ 3

''اللہ سے ڈرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔''

نیز حضرت تمیم بن حریص a کہتے ہیں کہ میں نے منیٰ میں قربانی کا جانور خریدا تو وہ کہیں گم ہوگیا، میں نے اس کے متعلق سیدنا عبداللہ بن عباس w سے مسئلہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا: ''تجھے اس کا کوئی نقصان نہیں۔'' 4

اسی طرح سیدنا ابن عمر w فرماتے ہیں: ''اگر کسی نے قربانی کے لیے اونٹ خریدا پھر وہ گم ہوگیا یا مرگیا تو اگر وہ نذر کا تھا تو اس کے بدلے دوسرا جانور ذبح کرے، اگر وہ نذر کا نہیں تھا تو اسے اختیار ہے اگر چاہے تو بدل دے اور اگر چاہے تو رہنے دے۔'' 5

ان حضرات کے فتاویٰ کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتا، اگر صاحب ثروت ہے تو اسے متبادل قربانی کرنا ہوگی جیسا کہ پہلی حدیث میں مذکور ہے۔

صورت مسئولہ میں سائل نے وضاحت کی ہے کہ اس کی مالی حالت کمزور ہے، اس لیے اسے دوسرا جانور ذبح کرنے کی

! نسائی، الضحایا:۴۳۹۹۔ @ البقرہ:۲۸۶۔
التغابن:۱۶۔ $ محلی ابن حزم، ج۷، ص۳۵۸۔
% بیہقی، ج۹، ص۲۸۹۔

ضرورت نہیں، امید ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نیت کے بدلے قربانی کے ثواب سے محروم نہیں کرے گا۔ واللہ اعلم!

کیا قربانی ایک مالی ضیاع ہے؟

] آج کل کچھ لوگوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ قربانی کا حکم صرف مکہ میں ہے اور یہ حکم بھی حجاج کرام کے لیے ہے، ہم لوگ قیمتی قربانیاں کرتے ہیں، وہ محض مالی ضیاع ہے۔ اس اعتراض کا جواب دیں۔

[قربانی کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم﴾ 1

''ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کا طریقہ مقرر کر دیا ہے تاکہ جو جانور ہم نے انہیں عطا کیے ہیں ان پر وہ اللہ کا نام لیا کریں۔''

اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام y کی شریعتوں میں اللہ کے حضور قربانی پیش کرنا ایک لازمی جزو رہا ہے، اگرچہ اس قربانی کی تفصیلات اور جزئیات میں اختلاف رہا ہے۔ رسول اللہ e نے مدنی زندگی میں قربانیاں دی ہیں اور آپ کے صحابہ کرام y نے بھی اس سنت کو زندہ رکھا۔ حتی کہ یہ مبارک عمل ہم تک پہنچا ہے۔ اس کے متعلق تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں، لیکن افسوس کہ شریعت سے بیزار لوگ اسے گوشت اور مالی ضیاع سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی کہتے ہیں کہ جتنی رقم قربانیوں پر خرچ کی جاتی ہے اتنی رقم سے محتاج لوگوں کے لیے کئی رہائشی منصوبے بنائے جاسکتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ جتنی رقم قربانی پر صرف کی جاتی ہے، اتنی رقم صدقہ میں خرچ کر دی جائے تو بہتر ہے۔ بہر حال ایسے لوگ مغربیت اور مغربی تہذیب سے مرعوب بلکہ اس کے دلدادہ اور شیدائی ہیں، اگر وہ قربانی سے کئی گنا رقم اپنی عیاشیوں پر خرچ کر دیں تو وہ ان کے نزدیک مالی ضیاع نہیں۔ لیکن قربانی میں انہیں کئی طرح کے نقصانات نظر آنے لگتے ہیں۔ بہر حال یہ لوگ محتاجوں اور بے کسوں کے ہمدرد نہیں ہیں بس ''خوئے بدرا بہانہ بسیار'' کا مصداق ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم رسول اللہ e کا ایک عمل پیش کرتے ہیں جو ان حضرات کی تردید کے لیے کافی ہے۔

سیدنا علی t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے حجۃ الوداع میں سو اونٹ بطور قربانی ذبح کیے اور مجھے حکم دیا کہ ان کا گوشت تقسیم کر دوں، میں نے سارا گوشت بانٹ دیا۔ رسول اللہ e نے ان کی جھولیں اور کھالیں بھی تقسیم کرنے کا حکم دیا جو بانٹ دی گئیں۔ 2

بہر حال قربانی، مالی ضیاع نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ واللہ اعلم!

اونٹ میں حصوں کی تعداد

] ہمیں ایک عالم دین نے بتایا ہے کہ گائے کی طرح اونٹ میں بھی سات حصے ہوتے ہیں جبکہ ایک حدیث میں

! الحج:۳۴.   @ بخاری، الحج:۱۷۱۹.

ہے کہ رسول اللہ e نے ایک مرتبہ ایک اونٹ کو دس بکریوں کے مساوی قرار دیا تھا، اس مسئلہ کی وضاحت قرآن وحدیث سے کریں۔

[جس حدیث کا سوال میں ذکر ہے کہ رسول اللہ e نے ایک اونٹ کو دس بکریوں کے برابر قرار دیا تھا وہ حسب ذیل ہیں:

''سیدنا رافع بن خدیج t بیان کرتے ہیں کہ ہم تہامہ کے علاقہ میں ذوالحلیفہ کے مقام پر تھے، ہمیں وہاں غنیمت میں اونٹ اور بکریاں ملیں تو رسول اللہ e نے مالِ غنیمت تقسیم کرتے وقت ایک اونٹ کو دس بکریوں کے برابر قرار دیا۔'' 1

اس حدیث کو قربانی میں ایک اونٹ میں دس آدمیوں کی قربانی کے جواز میں بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے لیکن یہ دلیل حسب ذیل وجوہ کی بناء پر واضح اور صریح نہیں ہے۔

☆ ممکن ہے کہ اس وقت اونٹ کم ہوں اور بکریاں زیادہ ہونے کی وجہ سے ایک اونٹ کو دس بکریوں کے برابر شمار کیا گیا ہو۔

☆ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اونٹ، عمدہ، تندرست ہوں اور بکریاں دبلی ہونے کی وجہ سے دس بکریوں کو ایک اونٹ کے مساوی قرار دیا ہو۔

اس حدیث کی وجہ سے ایک اونٹ میں دس افراد کی شرکت انتہائی محل نظر ہے، البتہ قربانی کے موقع پر ایک اونٹ میں دس افراد کے شریک ہونے کا ذکر دوسری حدیث سے ثابت ہے جس کی تفصیل ہم بیان کرتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس w بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ ایک سفر میں رسول اللہ e کے ہمراہ تھے، اس دوران عیدالاضحیٰ آ گئی تو ہم نے دس دس آدمیوں کی طرف سے ایک ایک اونٹ اور سات سات آدمیوں کی طرف سے ایک ایک گائے مشترکہ طور پر ذبح کی۔ 2

جبکہ ایک دوسری حدیث میں سیدنا جابر بن عبداللہ t سے روایت ہے کہ ہم نے حدیبیہ میں رسول اللہ e کے ہمراہ ایک اونٹ سات افراد کی طرف سے اور گائے سات افراد کی طرف سے ذبح کی۔ 3

لیکن ان دونوں احادیث میں کوئی تعارض نہیں کیوں کہ اونٹ میں دس افراد کی شراکت کا واقعہ قربانی کے موقع کا ہے، جبکہ سات افراد کی شراکت کا تعلق حج وعمرہ سے ہے، جیسا کہ روایت میں اس کی صراحت ہے کہ ایسا کرنا حدیبیہ کے موقع پر تھا۔ بعض اہل علم نے دوران سفر اونٹ کو دس قربانیوں کے برابر قرار دیا ہے جبکہ حضر میں سات کے برابر، کچھ حضرات صاحب ثروت اور مالی اعتبار سے کمزور کا فرق کرتے ہیں کہ مال دار سات شریک ہوں اور غریب حضرات دس تک شراکت کر سکتے

! ابن ماجہ، الاضاحی:۳۱۳۷۔ @ ابن ماجہ، الاضاحی:۳۱۳۱۔

صحیح مسلم، الحج:۱۳۱۸۔

ہیں۔ بہرحال یہ سب اپنے اپنے اندازے اور تخمینے ہیں، قابل وثوق بات یہی ہے کہ اونٹ میں سات کی شراکت حج وعمرہ کی ہدی میں ہے اور دس کی شراکت عام قربانی میں ہے۔ واللہ اعلم!

حاملہ جانور کی قربانی

] ہمارے ہاں حاملہ (گابھن) جانور کی قربانی کو ناپسند کیا جاتا ہے، اس کی کیا بنیاد ہے؟ کتاب وسنت کی رو سے کیا ایسے جانور کو قربانی کے طور پر ذبح کیا جا سکتا ہے، جس کے پیٹ میں بچہ ہو؟ وضاحت کریں۔

[حاملہ (گابھن) جانور کی قربانی جائز ہے کیوں کہ جانور کا حاملہ ہونا کوئی ایسا عیب نہیں کہ جس کی بناء پر قربانی کو ناجائز قرار دیا جائے۔ ایسا جانور اگر ذبح کیا جائے تو اس کے پیٹ سے برآمد ہونے والا بچہ اگر زندہ ہو تو اس کا مالک اگر چاہے تو اس بچے کو ذبح کر دے اور اگر چاہے تو ذبح نہ کرے بلکہ اسے زندہ رہنے دے۔ کیوں کہ قربانی کرنے والے نے بچے کی ماں کو قربانی کے لیے متعین کیا تھا، اس کے بچے کو نہیں۔ اس لیے قربانی کرنے والے کو اختیار دیا جائے گا۔ ہاں اگر ذبح کرنے کے بعد جانور کے پیٹ سے مردہ بچہ برآمد ہو تو ذبح کیے بغیر اسے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اس کی ماں کو ذبح کرنا ہی اس کو بچے کو کفایت کر جائے گا۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا فرمان ہے: ''بچے کا ذبح کرنا، اس کی ماں کے ذبح کرنے سے ہے۔''1

اس کی مزید وضاحت ایک روایت میں ہے، سیدنا ابوسعید خدری t بیان کرتے ہیں: ہم نے عرض کیا، اللہ کے رسول! ہم کوئی اونٹنی، گائے یا بکری ذبح کرتے ہیں تو اس کے پیٹ سے بچہ نکل آتا ہے، کیا ہم اسے کھا لیں یا پھینک دیں؟ تو آپ e نے فرمایا:

''اگر چاہو تو کھا لو، بلاشبہ اس کی ماں کا ذبح کرنا ہی اس کے لیے ذبح ہے۔''2

ہاں اگر طبعی کراہت کی وجہ سے کوئی شخص اس کا گوشت نہ کھانا چاہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بہرحال حاملہ جانور کو قربانی کے طور پر ذبح کیا جا سکتا ہے اور شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔ واللہ اعلم!

میت کی طرف سے قربانی

] میں ہر سال اپنے مرحوم باپ کی طرف سے قربانی کرتا ہوں، مجھے کچھ اہل علم حضرات نے کہا ہے کہ میت کی طرف سے مستقل قربانی صحیح نہیں۔ اس سلسلہ میں میری رہنمائی فرمائیں۔

[میت کی طرف سے قربانی کرنے کے متعلق فقہاء کرام نے حسب ذیل مختلف صورتیں ذکر کی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ میت کو اپنی قربانی میں شریک کرنا، یہ بالاتفاق جائز ہے جیسا کہ بیٹا قربانی کرتے وقت اپنے مرحوم باپ کی نیت کرے

! مسند امام احمد:ج٣،ص٣٩۔ @ ابو داؤد، الضحایا:٢٨٢٧۔

کہ اللہ تعالیٰ اسے بھی قربانی کے ثواب میں شریک کرے۔

☆ میت کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اس کی طرف سے قربانی کرنا، ایسا کرنا بھی جائز ہے، کیوں کہ وصیت پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس کے جواز میں بھی کوئی شبہ نہیں۔

☆ میت نے قربانی کی نذر مانی تھی لیکن وہ اسے پورا کیے بغیر فوت ہوگیا تو اس کی طرف سے نذر کو پورا کرتے ہوئے قربانی دی جا سکتی ہے۔

☆ میت کی طرف سے حج بدل کرنے کی صورت میں جو حج تمتع میں ہدی دی جاتی ہے، ایسا کرنا بھی بالاتفاق جائز ہے اور یہ ھدی میت کی طرف سے کی جا سکتی ہے۔

☆ میت کی طرف سے مستقل طور پر تبرکاً قربانی کرنا جیسا کہ ہمارے ہاں معمول ہے، جس کا سائل نے بھی ذکر کیا ہے۔ اس صورت میں اہل علم کا اختلاف ہے، کچھ حضرات اسے جائز کہتے ہیں اور کچھ اہل علم کے ہاں ایسا کرنا جائز نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ قربانی ایک عبادت ہے، اس کے جائز ہونے کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے، مجوزین کے ہاں جتنے بھی دلائل ہیں وہ انتہائی محل نظر ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ قربانی ایک مالی صدقہ ہے اور میت کی طرف سے مالی صدقہ بالاجماع جائز ہے، لہٰذا میت کی طرف سے قربانی بھی جائز ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دلیل انتہائی محل نظر ہے۔ کیوں کہ اس میں صدقہ پر قیاس کیا گیا ہے اور یہ قیاس مع الفارق کی ایک قسم ہے۔

چنانچہ میت کی طرف سے صدقہ کرنا احادیث سے ثابت ہے جیسا کہ سیدنا سعد بن ابی وقاص t نے اپنی والدہ کی طرف سے صدقہ کیا تھا جیسا کہ رسول اللہ e نے فرمایا تھا، جبکہ میت کی طرف سے قربانی کرنے کا کوئی ثبوت نہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ e نے قربانی کرتے وقت بایں الفاظ دعا کی تھی: ''اے اللہ! محمد، آل محمد اور امت محمد کی طرف سے قبول فرما۔'' 1

آپ کی امت میں وہ لوگ بھی تھے جو وفات پا چکے تھے، لہٰذا میت کی طرف سے قربانی جائز ہے۔

اس کے متعلق ہماری گزارشات یہ ہیں:

☆ یہ ایک دعا ہے جو رسول اللہ e نے اپنی اور امت کی قربانی سے متعلق کی ہے، میت کی طرف سے قربانی کا جواز درست نہیں، کیوں کہ ہمارے ہاں مستقل قربانی میت کی طرف سے کی جاتی ہے۔

☆ امت کی طرف سے قربانی کرنا رسول اللہ e کی خصوصیت ہے اور آپ کی امت کروڑوں کی تعداد میں ہے، اس طرح زندگان اور فوت شدگان کی طرف سے قربانی کرنے کا کوئی بھی قائل نہیں۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے صحابہ کرام y و تابعین سے اس عمل کا ثبوت نہیں ملتا، جو عمل رسول اللہ e کی خصوصیت پر محمول ہو، اس میں امت کے

---

1 مسلم، الاضاحی: ۱۹۶۷.

لیے اقتداء کرنا جائز نہیں ہوتا۔

☆ سیدنا علی t کا ایک عمل بھی اس سلسلہ میں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ دو قربانیاں کرتے تھے، ایک اپنی اور دوسری رسول اللہ e کی طرف سے جبکہ رسول اللہ e وفات پا چکے تھے۔ یہ دلیل بھی انتہائی کمزور ہے، کیوں کہ یہ روایت محدثین کے قائم کردہ معیار صحت پر پوری نہیں اترتی۔ اگر صحیح بھی ہو تو یہ ایک وصیت کی صورت ہے جیسا کہ خود سیدنا علی t نے اس کی صراحت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر اور سیدنا عثمان t سے یہ عمل ثابت نہیں۔ اسی طرح رسول اللہ e کی زندگی میں سیدہ خدیجہ r، آپ کی تین صاحبزادیاں اور آپ کے چچا سیدنا حمزہ t دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، لیکن آپ e نے ان میں سے کسی کے لیے بھی خصوصی طور پر قربانی نہیں کی۔

اس بناء پر فوت شدگان کی طرف سے الگ مستقل قربانی کا جواز انتہائی محل نظر ہے۔ اگرچہ ہمارے اکابر علماء اس کے جواز کے قائل اور فاعل ہیں۔ واللہ اعلم!

نومولود کا نام کب رکھا جائے؟

] اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بیٹا عطا فرمایا ہے، میں نے پہلے دن ہی اس کا نام عبد اللہ تجویز کر دیا ہے، میرے کچھ ساتھی کہتے ہیں کہ نام ساتویں دن رکھنا چاہیے، کیا ساتویں دن سے پہلے نام رکھنے کی ممانعت ہے؟

[نومولود کا نام رکھنے کے مسنون وقت میں اختلاف ہے، البتہ ہمارے رجحان کے مطابق ساتویں دن اس کا نام رکھنا مستحب ہے۔ جیسا کہ سیدنا سمرہ بن جندب t سے مروی ایک حدیث میں ہے:

''ہر بچہ اپنے عقیقے کی وجہ سے گروی ہوتا ہے، پیدائش کے ساتویں دن اس کا عقیقہ کیا جائے اور سر کے بال منڈوائے جائیں اور اس کا نام رکھا جائے۔'' 1

رسول اللہ e نے پہلے دن بھی نام رکھا ہے جیسا کہ سیدنا ابو موسیٰ اشعری t بیان کرتے ہیں:

''میرے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو میں اسے لے کر رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ e نے اس کا نام ابراہیم رکھا۔'' 2

امام بخاری a نے بڑی خوبصورت بات کر دی ہے کہ جس بچے کا عقیقہ نہ کرنا ہو اس کا نام پہلے دن بھی رکھا جا سکتا ہے، انہوں نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''نومولود کا پیدائش کے دن نام رکھنا، جس کا عقیقہ نہ کرنا ہو۔'' 3

بہر حال اس سلسلہ میں ہمارا رجحان یہ ہے کہ ساتویں دن چار کام کیے ہیں:

ا۔ بچے کا عقیقہ کیا جائے۔

! ابو داؤد، العقیقہ:۲۸۳۸۔ @ بخاری العقیقہ:۵۴۶۷۔

بخاری، العقیقہ، باب نمبر ۱۔

۲۔ اس کا نام رکھا جائے۔

۳۔ اس کے ختنے کیے جائیں۔

۴۔ اس کا سر منڈوایا جائے اور بالوں کے برابر چاندی صدقہ کی جائے۔

اگر کسی کا عقیقہ بوجہ غربت نہیں کرنا تو اس کا نام پہلے دن بھی رکھا جا سکتا ہے، افضل عمل یہی ہے کہ بچے کا نام ساتویں دن رکھا جائے لیکن اگر اس سے پہلے یا بعد میں نام رکھنا ہے تو اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ واللہ اعلم!

عقیقہ اور والدہ کی وفات

] اللہ تعالیٰ نے ہمیں خوبصورت بیٹا عطا فرمایا، ہم نے عقیقہ کے لیے جانور بھی خرید لیے تھے، لیکن ساتویں دن گھر میں والدہ کی وفات ہو گئی، ظاہر ہے کہ وفات کے دن کسی کو بچے کا عقیقہ کرنے کا ہوش کب ہوتا ہے۔ ہم نے عقیقہ مؤخر کر دیا۔ کیا یہ عمل کتاب و سنت کے مطابق ہے؟

[بچے کے عقیقہ کے متعلق رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''ہر بچہ اپنے عقیقہ کے عوض گروی ہوتا ہے لہٰذا ساتویں دن اس کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے۔ 1

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عقیقہ کا وقت نومولود کی پیدائش کا ساتواں دن ہے، اس سے پہلے عقیقہ مشروع نہیں، چنانچہ امام ترمذی فرماتے ہیں:

''اس حدیث کے مطابق اہل علم کا عمل یہ ہے کہ وہ ساتویں روز بچے کی طرف سے عقیقے کے جانور کو ذبح کرنا مستحب خیال کرتے ہیں۔'' 2

امام ابن قدامہ a اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں: ''ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ سنت کے مطابق ساتویں دن عقیقہ کا جانور ذبح کیا جائے۔ 3 چونکہ گھر میں عقیقے کے دن والدہ کی وفات ہو گئی ہے، لہٰذا اس دن عقیقہ کرنے پر دل آمادہ نہیں ہوتا۔ ہمارے رجحان کے مطابق بہتر یہی ہے کہ جانور ذبح کر کے گوشت تقسیم کر دیا جائے اور اللہ کی تقدیر پر خود کو راضی کر لیا جائے، لیکن اس کے باوجود دین کی بنیاد آسانی پر ہے اور قرآن میں ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ 4

''تم اللہ سے ڈرو جتنی بھی تم میں طاقت ہے۔''

نیز رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''جب میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو حسب طاقت اس پر عمل کرو۔'' 5

! سنن النسائی، العقیقہ:۴۲۲۵۔ @ ترمذی بعد حدیث:۱۵۲۲۔

مغنی لا بن قدامہ:ج۱۳،ص۳۹۶۔ $ التغابن:۱۶۔

% بخاری، الاعتصام:۷۲۸۸۔

ایسے حالات میں اگر عقیقہ مؤخر کر دیا جائے تو امید ہے کہ کوئی حرج نہیں ہوگا، نیز حدیث میں ہے: ''ساتویں، چودھویں اور اکیسویں دن عقیقہ کیا جائے۔'' 1

اگرچہ یہ روایت اسماعیل بن مسلم، ایک راوی کی وجہ سے ضعیف ہے تاہم علامہ البانی a نے مختلف شواہد کی وجہ سے صحیح قرار دیا ہے۔ 2

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مجبوری کے پیش نظر عقیقہ کو ساتویں دن سے مؤخر کیا جاسکتا ہے، تاہم افضل یہی ہے کہ ساتویں دن سادگی کے ساتھ عقیقہ کر دیا جائے۔ واللہ اعلم!

غیر مسلم کو قربانی کا گوشت دینا

] میرے پڑوسی عیسائی ہیں، کیا مجھے شرعی طور پر اجازت ہے کہ میں انہیں پڑوسی ہونے کی حیثیت سے اپنی قربانی کا گوشت دوں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

[قربانی، تقرب الٰہی کا ایک ذریعہ ہے، اس لیے بہتر ہے کہ قربانی کا گوشت صرف اہل اسلام کو ہی کھلایا جائے، اگر تالیف قلب مقصود ہے تو انہیں قربانی کا گوشت دینے میں چنداں حرج نہیں بشرطیکہ وہ اسلام کے ساتھ بغض وعناد نہ رکھتے ہوں، ویسے بھی پڑوس کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن عمرو W کے گھر میں ایک بکری ذبح کی گئی، جب وہ اپنے گھر آئے تو فرمایا: ''کیا تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کو گوشت بھیجا ہے؟''

آپ t نے یہ بات دو دفعہ دہرائی، مزید فرمایا کہ میں نے رسول اللہ e کو یہ فرماتے سنا ہے:

''سیدنا جبریل مجھے پڑوسی سے حسن سلوک کرنے کا مسلسل کہتے رہے حتی کہ میں نے خیال کیا کہ وہ اسے میرا وارث بنا دیں گے۔'' 3

اس حدیث کے پیش نظر عیسائی پڑوسی کو قربانی کا گوشت دیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم!

رات کے وقت قربانی کرنا

] ہمارے ہاں مشہور ہے کہ رات کو قربانی نہیں کرنا چاہیے، کیا اس کے متعلق احادیث میں کوئی ممانعت آئی ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

[قرآن کریم میں قربانی کے جانور ذبح کرنے کے متعلق ﴿اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ﴾ 4 آیا ہے اور حدیث میں ''ایام التشریق'' کے الفاظ ہیں۔ 5

! بیہقی: ج۹، ص۳۰۳.

@ صحیح الجامع الصغیر، نمبر ۴۰۱۱.

ترمذی، البر و الصلہ: ۱۹۴۳.

$ الحج: ۲۸.

% مسند امام احمد، ج۴، ص۸۲.

ایام کے الفاظ سے بعض اہل علم نے یہ مسئلہ کشید کیا ہے کہ رات کے وقت قربانی نہیں کرنا چاہیے، چنانچہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام اسحاق، امام ثوری s اور جمہور اہل علم کا موقف ہے کہ ایام قربانی کی راتوں میں قربانی ذبح کرنا جائز مع الکراہت ہے۔ جبکہ امام مالک اور اصحاب مالک سے منقول ہے کہ قربانی کی راتوں میں جانور ذبح کرنا جائز نہیں۔ نیز رات کے وقت ذبح شدہ قربانی کا جانور ایک گوشت والی بکری ہے جو قربانی کے لیے کافی نہیں۔'' 1

علامہ شوکانی لکھتے ہیں: ''قربانی کی راتوں میں قربانی کی ممانعت اور کراہت کا دعویٰ محتاج دلیل ہے اور مذکورہ حدیث میں ایام تشریق کے ذکر سے اگرچہ ظاہری اعتبار سے راتوں کو خارج کیا جاتا ہے، لیکن ایام کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ ان میں دن اور رات دونوں شامل ہیں۔'' 2

اس سلسلہ میں درج ذیل احادیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے:

☆ سیدنا عبداللہ بن عباس w سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے رات کے وقت قربانی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ 3

علامہ البانی اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ روایت انتہائی ضعیف ہے۔ 4 اس روایت میں سلیمان بن مسلمہ خبائری متروک ہے۔ 5

☆ حسن بصری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے رات کے وقت کھجوریں توڑنے، فصل کاٹنے اور قربانی ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے۔ 6

یہ حدیث بھی مرسل ہے کیوں کہ حسن بصری تابعی اسے صحابی کے واسطہ کے بغیر براہ راست رسول اللہ e سے بیان کرتے ہیں، نیز اس میں حفص بن غیاث کی تدلیس ہے۔ 7

ہمارے رجحان کے مطابق دس ذوالحج کی رات کے علاوہ دیگر راتوں میں قربانی کرنا جائز ہے کیوں کہ مطلق طور پر ایام کے لفظ میں دن اور رات دونوں شامل ہیں۔ البتہ دس ذوالحج کی رات اس میں شامل نہیں۔ واللہ اعلم!

قربانی کا جانور تبدیل کرنا

] میں نے قربانی کے لیے ایک مینڈھا پالا ہے لیکن میرے حالات انتہائی کمزور ہیں، کیا میں اسے فروخت کر کے اپنی ضروریات پوری کر سکتا ہوں جبکہ میرا سستی قربانی کرنے کا ارادہ ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں میری رہنمائی کریں۔

[قربانی کے لیے جو جانور نامزد کر دیا گیا ہے اسے فروخت کرنا، یا اسے تبدیل کرنا جائز نہیں۔

چنانچہ سیدنا عمر t نے ایک عمدہ بختی اونٹ بطور ھدی حرم کی طرف بھجوایا، انہیں اس کے عوض تین سو دینار پیش کیے گئے۔

! نیل الاوطار، ج۵، ص۲۱۷.
@ نیل الاوطار: ج۵، ص۲۱۷
# طبرانی کبیر:۱۱۲۹۶.
$ ضعیف الجامع:۶۰۱۷.
% نیل الاوطار: ۵،ص۲۱۷.
^ بیہقی:ج۹،ص۲۹۰.
& نیل الاوطار:ج۵،ص۲۱۷.

وہ رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے ایک عمدہ اونٹ ھدی کیا ہے اور مجھے اس کے عوض تین صد دینار دیئے جا رہے ہیں، تو کیا میں اسے بیچ کر اس کی قیمت سے دوسرا اونٹ لے لوں؟

اس پر رسول اللہ e نے فرمایا: ''نہیں اسے ہی ذبح کرو۔'' 1

اس روایت کے متعلق علماء حدیث نے کلام کیا ہے تاہم دوسری احادیث کے پیش نظر ہمارا رجحان یہ ہے کہ جب کوئی جانور بطور قربانی یا ھدی نامزد کر دیا جائے تو اسے تبدیل کرنا درست نہیں۔ کیوں کہ وہ فی سبیل اللہ وقف ہو چکا ہے اور وقف چیز کی خرید و فروخت جائز نہیں۔ واللہ اعلم!

ذبح کا طریقہ

] ہمارے ہاں قصاب جب جانور ذبح کرتا ہے تو اس کی تھوڑی سی کھال کاٹ کر اس کو چھوڑ دیتا ہے، پھر یا تو اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر اسے توڑتا ہے، یا جانور تڑپ تڑپ کر خود ہی مر جاتا ہے، ایسے حالات میں جانور ذبح ہو جائے گا، کیا اس کا گوشت کھانا جائز ہے؟

[حلال جانور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہیں، انہیں ذبح کرتے وقت ان کے آرام و سکون کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت شداد بن اوس t بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ e سے دو باتیں یاد کیں: آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض قرار دیا ہے، لہٰذا جب تم قتل کرو تو اچھے طریقہ سے قتل کرو اور جب تم کسی جانور کو ذبح کرو تو عمدہ طریقے سے ذبح کرو، ذبح کرنے والے شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی چھری تیز کرے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے۔'' 2

رسول اللہ e بھی ذبح کرنے سے قبل چھری تیز کیا کرتے تھے تاکہ جانور کو زیادہ دیر تک تکلیف میں نہ رکھا جائے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے شیطان کے ذبیحہ سے منع فرمایا ہے۔ 2

حدیث کے راوی حسن بن عیسیٰ اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اس سے مراد یہ ہے کہ ذبیحہ کی کھال کاٹ دی جائے لیکن اس کی رگیں نہ کاٹی جائیں پھر اسے یونہی چھوڑ دیا جائے حتی کہ وہ مر جائے۔'' 4

دور جاہلیت میں مشرکین ایسا ہی کرتے تھے، چونکہ شیطان نے انہیں بھڑکایا تھا جس کی وجہ سے وہ جانور کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے تھے، اس لیے اسے ''شریطۃ الشیطان'' کہا گیا ہے، یعنی یہ شیطان کا ذبیحہ ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق اس طرح جانور حلال نہیں ہوگا، اسے استعمال کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ جانوروں کو ذبح کرنے کے سلسلہ میں صرف اپنی سہولت ہی کو پیش نظر نہ رکھا کریں اور جانوروں کو قصاب کے رحم و کرم پر نہ چھوڑا کریں بلکہ خود ذبح کریں یا اچھے تجربہ کار، ماہر قصاب کا انتخاب کریں تاکہ شریعت

! ابو داؤد، المناسک:۱۷۵۶. @ صحیح مسلم، الصید:۱۹۵۵.
مسند امام احمد ص:۲۸۹ ج۱. $ ابو داؤد الضحایا:۲۸۲۶.

کے مطابق جانور کو ذبح کیا جائے۔(واللہ اعلم)

مقروض شخص کا قربانی کرنا

] ہمارے بھائی مقروض ہیں اور وہ قربانی کرنا چاہتے ہیں، انہیں کسی نے بتایا ہے کہ آپ کے لیے قربانی کے بجائے قرض اتارنا ضروری ہے۔آپ قرض اتاریں اور قربانی نہ کریں، اس کے متعلق قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[قربانی کے متعلق رسول اللہ e کا ارشاد ہے:

''جس کے پاس قربانی کرنے کی گنجائش ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو اسے چاہیے کہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے۔'' 1

اس حدیث سے بظاہر قربانی کا وجوب ثابت ہوتا ہے لیکن دوسرے دلائل کے پیش نظر جمہور اہل علم کا موقف ہے کہ قربانی کرنا سنت موکدہ ہے۔ یعنی ایک اہم اور مؤکد حکم ہے۔ استطاعت کے باوجود اس سنت مؤکدہ سے گریز کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قربانی نہ کرنے والا مسلمانوں کی اجتماعی خوشی میں شریک ہونے کا حق نہیں رکھتا۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے نماز عید پڑھنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اسے تنبیہ کرنا ہے کہ استطاعت کے باوجود وہ اسے ترک نہ کرے۔

شریعت اسلامیہ میں تلاش بسیار کے باوجود ہمیں ایسی کوئی دلیل نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ مقروض شخص قربانی نہیں کرسکتا یا قرض لے کر قربانی نہیں کی جاسکتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ قرض لینے کے بعد اسے جلد از جلد اتارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

''ابن آدم کی جان قرض کی وجہ سے معلق رہتی ہے تا آنکہ سے ادا کر دیا جائے۔'' 2

اسی طرح ایک آدمی رسول اللہ e کے پاس آیا اور عرض کرنے لگا، یا رسول اللہ! اگر میں لڑتے لڑتے اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں تو مجھے کیا اجر ملے گا؟

رسول اللہ e نے فرمایا: ''تجھے جنت ملے گی، جب وہ واپس جانے لگا تو آپ نے فرمایا: جبریل u نے ابھی ابھی میرے کان میں کہا ہے کہ ایسے حالات میں قرض معاف نہیں ہوگا۔'' 3

قرض کے متعلق اس قدر وعید شدید کے باوجود اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اگر مقروض شخص قربانی کرے گا تو اس کی قربانی قبول نہیں ہوگی، بلکہ قربانی ایک ایسی عبادت ہے جس پر رسول اللہ e نے دوام فرمایا ہے اور اس کے متعلق امت کو بہت ترغیب دلائی ہے۔ پھر قرض کی دو اقسام ہیں: ایک قرض وہ ہوتا ہے جو کاروبار کے لیے لیا جاتا ہے۔ اس قسم کے قرض میں آئی چلائی ہوتی رہتی ہے لہٰذا اس قسم کا قرض قربانی میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ دوسرا قرض وہ ہے جو گھریلو ضروریات کے لیے لیا جاتا ہے اور قرض خواہ کی طرف سے اسے پابند نہیں کیا گیا کہ اسے فوراً ادا کیا جائے بلکہ اس کی طرف سے ڈھیل ہوتی ہے کہ

! ابن ماجہ، الاضاحی:۳۱۲۳. @ مسند احمد، ج۲،ص۵۰۱.

مسند احمد، ج۳، ص۳۲۵.

جب استطاعت ہو اسے ادا کر دیا جائے۔ یہ قربانی کے لیے رکاوٹ کا باعث نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں گھریلو ضروریات کے لیے لیا ہوا قرض جس کے متعلق قرض خواہ کی طرف سے پابندی ہوتی ہے کہ اسے عید سے قبل ادا کرنا ہے ایسے قرض کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ وہ قربانی کی بجائے اپنا قرض اتارے۔

ہمارے رجحان کے مطابق اگر مقروض شخص قربانی جیسی عبادت کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کر سکتا ہے تو اسے ضرور ایسا کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنے خزانہ غیب سے قرض اتارنے کی کوئی سبیل پیدا کر دے۔ واللہ اعلم!

جانور کو ذبح کرنا

] کیا جانور ذبح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے چھری سے ہی ذبح کیا جائے، نیز اگر حلال جانور بے قابو ہو جائے تو اسے کیسے ذبح کیا جا سکتا ہے؟ کتاب اللہ اور سنت رسول e میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

[ذبح کرتے وقت دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے:

پہلی یہ ہے کہ اس پر اللہ کا نام لیا جائے یعنی بسم اللہ اکبر کہا جائے۔

دوسری یہ کہ اس کا خون نکلنا اور خون نکلنے کا مقام جانور کا حلق ہے، اسے اس حد تک کاٹ دیا جائے کہ نرخرہ اور رگ گلو کھل جائے۔ ذبح کے لیے تیز دھاری دار آلے کا ہونا ضروری ہے، وہ پتھر، لکڑی اور بانس کی پھانگ وغیرہ بھی ہو سکتی ہے۔ چونکہ چھری کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جاتا ہے، اس لیے عام حالات میں ذبح کے وقت چھری کو ہی کام میں لانا چاہیے، اگر چھری نہ مل سکے تو کوئی بھی تیز دھاری دھار آلہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ امام بخاری a نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جس سے بھی خون بہہ جائے ذبح کیا جائے، خواہ وہ بانس کی پھانگ ہو یا پتھر کی دھار یا لوہے کا آلہ۔''

پھر انہوں نے ایک حدیث بیان کی ہے کہ مدینہ کے آس پاس ایک لڑکی بکریاں چرا رہی تھی، اس نے ایک بکری کو دیکھا جو مرنے کے قریب تھی، اس نے جلدی سے ایک پتھر توڑا اور اس کی دھار سے اسے ذبح کر دیا، رسول اللہ e نے اسے کھانے کی اجازت دی۔'' 1

حضرت رافع بن خدیج t کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کل ہم دشمن سے ملیں گے لیکن ہمارے پاس چھریاں نہیں ہیں کیا ہم پتھر سے یا لاٹھی کے تیز چھٹے سے ذبح کر سکتے ہیں؟

تو آپ نے فرمایا: جو چیز بھی خون بہا دے اور اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو تو اسے کھا لو۔ 2

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ذبح کے لیے چھری کا ہونا ضروری نہیں بلکہ کسی بھی دھاری دار تیز آلہ سے ذبح کیا جا سکتا ہے۔

اگر کوئی حلال جانور ہے بے قابو ہو جائے تو وہ شکار کے حکم سے ہے، اسے کسی مقام سے زخمی کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق ہم جانوروں کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

! بخاری، الذبائح: ۵۵۰۱۔ @ ابو داؤد، الضحایا: ۲۸۲۱۔

☆ وہ جانور جو ہمارے قابو میں ہیں جنہیں ہم ایک خاص طریقہ سے ذبح کر سکتے ہیں، اس قسم کے ذبح کو ''ذبح اختیاری'' کہا جاتا ہے، اسے حلق سے ذبح کرنا ہوگا۔

☆ وہ جانور جو ہمارے قابو میں نہیں مثلاً جنگلی جانور، ہرن وغیرہ یا گھریلو جانور جو بھاگ نکلے یا وہ جانور جو کسی تنگ جگہ میں گر جائے، اس قسم کے جانوروں کا ذبح ''ذبح اضطراری'' ہے اور ان کا تمام جسم ہی مقام ذبح ہے، اسے جسم کے کسی بھی حصہ سے ذبح کیا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ e کے دور میں ایک واقعہ پیش آیا کہ اونٹ بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک آدمی نے اسے تیر مارا تو اس نے اُسے روک لیا، رسول اللہ e نے فرمایا: ''ان جانوروں میں بھی بدک کر بھاگنے والے ہوتے ہیں، جیسے دیگر وحشی جانور، ان جانوروں میں سے جو اس طرح کرے، اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جائے۔ 1

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو گھریلو جانور بے قابو ہو جائے اور وحشی بن جائے تو اسے شکار کی طرح نشانہ مار کر ذبح کیا جاسکتا ہے یا اسے زخمی کر کے قابو کر لیا جائے پھر بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر گلے پر چھری پھیر کر اسے ذبح کر لیا جائے۔ بہر حال چھری اصل مقصود نہیں بلکہ ہر تیز دھاری دار آلہ سے ذبح کیا جاسکتا ہے، نیز جو جانور ہمارے قابو میں نہ ہو اس کے جسم کا ہر حصہ مقام ذبح ہے، جہاں سے جسم کو چھید کر کے خون بہایا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، پھر اسے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ واللہ اعلم

کیا قربانی کرنا دولت کا ضیاع ہے؟

] عید الاضحیٰ کی آمد آمد ہے، منکرین حدیث قربانی کے عمل پر اعتراض کرتے ہیں کہ لاکھوں جانوروں کو ذبح کر کے پیسے کا ضیاع کیا جاتا ہے، بلکہ یہ جانوروں کی نسل کشی ہے۔ اگر یہ دولت رفاہی کاموں میں صرف کی جائے تو بہت لوگوں کا بھلا ہوگا۔ اس قسم کے اعتراضات کا جواب درکار ہے۔

[قرآن کریم کا طالب علم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ قربانی سیدنا ابراہیم u کی ایک عظیم یادگار ہے جسے ختم نہیں کیا گیا بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے اسے باقی رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴾ 2

''ہم نے اسے بعد میں آنے والوں کے لیے باقی رکھا۔''

جب قربانی کے عمل کو اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم u کے بعد آنے والوں کے لیے باقی رکھا ہے اور وہ اسے جذبہ اخلاص اور محبت وشوق سے بجالاتے ہیں تو اسے دولت کا ضیاع، حیوانات کی نسل کشی قرار دینا چہ معنی دارد؟

یہ قربانی، اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

! بخاری، الذبائح:۵۵۰۹.　　@ الصافات: ۱۰۸.

﴿وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ﴾ 1

”قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے شعائر بنایا۔“

جو انسان، اللہ کی ان نشانیوں کی عظمت وتوقیر کو بجالاتا ہے، اس کا دل تقویٰ سے بھرا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝﴾ 2

”جو لوگ اللہ کے شعائر کی تعظیم کرتے ہیں، ان کے دل تقویٰ سے لبریز ہیں۔“

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ e نے دس سال مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا اور قربانی کے عمل کو ہر سال دہراتے رہے اور کبھی اس کا ناغہ نہیں کیا۔

چنانچہ سیدنا عبد اللہ بن عمر w کا بیان ہے: ”رسول اللہ e نے دس سال مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا اور ہر سال قربانی کرتے تھے۔“ 3

قربانی کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دسویں ذوالحجہ کو چار کام کیے جاتے ہیں، جمرات کو کنکریاں مارنا، قربانی کرنا، سر منڈوانا اور بیت اللہ کا طواف کرنا۔ نیز صفا مروہ کی سعی کرنا ہے۔ لیکن اس دن کا نام ”یوم النحر“ یعنی قربانی کا دن رکھا گیا ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

”آج کے دن تمام اعمال میں سے افضل عمل قربانی کرنا ہے۔“ 4

رسول اللہ e کے پاس جب مال غنیمت کے طور پر حیوانات آتے تو آپ e انہیں فروخت کر کے ان کی قیمت صحابہ کرام y میں تقسیم نہیں کرتے تھے بلکہ قربانی کرنے کے لیے انہیں بانٹ دیتے تھے۔ لیکن افسوس کہ مغرب زدہ لوگ اس مبارک عمل کو روپے پیسے کا ضاع قرار دے رہے ہیں، حالانکہ یہ لوگ جب اپنی کوٹھیاں بناتے ہیں تو دس دس لاکھ یہ اپنے باتھ روم پر لگا دیتے ہیں جبکہ یہ دولت کا ضیاع ہے۔ جہاں تک ان جانوروں کی نسل کشی کا تعلق ہے تو تجربہ اس سوچ کے خلاف ہے کیوں کہ بکری ایک وقت میں ایک یا دو بچے جنم دیتی ہے لیکن لاکھوں جانور ذبح ہونے کے باوجود ہم ان بکریوں کے ریوڑ دیکھتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک کتیا ایک وقت میں چھ چھ، سات سات بچے جنتی ہے لیکن کبھی ان کتوں کا ریوڑ نہیں دیکھا گیا۔ حالانکہ انہیں کوئی ذبح نہیں کرتا اور نہ ہی ان کی قربانی دی جا سکتی ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ قربانی کے اس عمل سے لاکھوں خاندانوں کا رزق وابستہ ہے۔ جیسا کہ درج ذیل تفصیل پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے۔:

☆ لوگ دیہاتوں میں ان جانوروں کو پالتے ہیں، پھر انہیں قربانی کے موقع پر فروخت کرنے کے لیے شہروں میں لاتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ان کی روزی کا بندوبست کرتا ہے۔

! الحج:۳۶.　　@ الحج:۳۲.

جامع ترمذی، الاضاحی:۱۵۰۷.　　$ ترمذی، الاضاحی:۱۴۹۳.

☆ ان جانوروں کو ٹرکوں کے ذریعے لایا جاتا ہے، اس سے ٹرکوں والوں کو آمدنی ہوتی ہے ان کا سلسلہ معاش چلتا ہے۔

☆ انہیں شہری لوگ خریدتے ہیں اور دس دس، بیس بیس دن انہیں چارہ کھلاتے ہیں۔ چارے والے سینکڑوں افراد کا رزق اس سے وابستہ ہے۔

☆ قصاب انہیں ذبح کر کے روزی کماتے ہیں اور مزدوری حاصل کر کے وہ کئی کئی مہینوں کا رزق اپنے اہل خانہ کے لیے جمع کر لیتے ہیں۔

☆ قربانیوں کے گوشت کو محفوظ کر کے غریب ممالک کو بھیجا جاتا ہے، سعودی عرب میں ایسا ہی ہوتا ہے پھر پوری دنیا اس گوشت سے لطف اندوز ہوتی ہے۔

☆ ان کا چمڑا کس قدر بابرکت ہے جو غرباء و مساکین کے لیے وقف ہوتا ہے، غرباء و مساکین اسے فروخت کر کے اپنی ضروریات زندگی خریدتے ہیں۔

☆ ان چرمہائے قربانی سے دینی اداروں کی بھی سرپرستی ہوتی ہے، وہ ان کے ذریعے سال بھر کی ضروریات زندگی خریدتے ہیں۔

☆ جو لوگ کھالیں خریدتے ہیں وہ انہیں ان فیکٹریوں کو بیچتے ہیں، جہاں چمڑے کی مصنوعات تیار ہوتی ہیں، وہاں پہننے کے لے موزے، جیکٹیں، بیگ، پرس اور جوتے وغیرہ تیار ہوتے ہیں، پھر یہ مصنوعات بازار میں آ جاتی ہیں، الغرض سینکڑوں لوگوں کا کاروبار اس سے وابستہ ہوتا ہے۔

قربانی پر اعتراض کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ اس کے تمام پہلوؤں پر غور کریں۔ محض اعتراض برائے اعتراض کی روش کر کے ہٹ دھرمی سے باز آ جائیں۔ واللہ اعلم!

قربانی کے بجائے جانور کی قیمت صدقہ کرنا

] آج کل کچھ لوگوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مسلمان ایک دن میں ہزاروں جانور ضائع کر دیتے ہیں، ان کی بجائے ان جانوروں کی قیمت اگر فقراء اور مساکین میں خرچ کر دی جائے تو اس سے غربت ختم ہو سکتی ہے۔ اس اعتراض کا شافی جواب درکار ہے۔

[سوال میں مذکور اعتراض دراصل ایسے لوگوں کی طرف سے ہے، جو مغربیت اور مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر اس کے دلدادہ ہیں، ان کے اعتراضات کئی طرح کے ہوتے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

☆ قربانی صرف مکہ مکرمہ میں حجاج کرام ہوتے ہیں، دیگر مقامات پر قربانی کا حکم نہیں ہے۔

☆ جتنی رقم قربانیوں پر خرچ کی جاتی ہے، اتنی رقم رفاہی منصوبوں پر لگائی جائے۔

☆ قربانی کرنے سے گوشت اور مال کا ضیاع ہے، جو ایک مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔

دراصل ان لوگوں کو محتاجوں اور غریبوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی، اگر کوئی ایسا منصوبہ بن جائے جس میں غریبوں سے ہمدردی کا پہلو نمایاں ہو تو یہ حضرات خود کبھی اس فنڈ میں کچھ دینا گوارا نہیں کریں گے۔ ان کی اصل غرض صرف یہ ہے کہ قربانی نہ کرنے کے باوجود بھی وہ مسلمانوں کی نگاہوں میں بخیل اور کنجوس نہ خیال کیے جائیں حالانکہ قرآن مجید کے مطابق قربانی ہر امت میں رہی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے لیے ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار رہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ﴾ 1

”ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کا ایک طریقہ مقرر کر دیا ہے تاکہ جو جانور ہم نے انہیں عطا کیے ہیں، وہ ان پر اللہ کا نام لیا کریں۔“

ان شعائر کی تعظیم صرف قربانی کے جانور ذبح کرنے سے ہوتی ہے، ان کی رقم کسی دوسرے مصارف پر خرچ کرنے سے یہ جذبہ قطعاً پیدا نہیں ہوتا۔ یہ خطیر رقم عبادت اور قربانی کے تصور ہی سے خرچ ہو سکتی ہے۔ اس بناء پر قربانی دینے کے لیے رقم خرچ کرنا کوئی مالی ضیاع نہیں ہے بلکہ قربانی کے دن ذبح کرنا اور خون بہانا ہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ قربانی کرنا ایسی عبادت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نماز کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝٢﴾ 2

”آپ اپنے رب کے لیے نماز پڑھیں اور قربانی کریں۔“

ہمارے رجحان کے مطابق کوئی بھی دوسری عبادت قربانی کے قائم مقام نہیں ہو سکتی، پھر یہ عمل رسول اللہ e کی مدنی زندگی سے لے کر آج تک متواتر چلا آ رہا ہے۔ اس کے مشروع ہونے پر ہر دور کے علماء اور عوام کا اجماع رہا ہے۔ اگر قربانی کی قیمت، قربانی کرنے سے افضل ہوتی تو کم از کم کسی دور میں اس پر عمل ضرور ہونا چاہیے تھا۔ رسول اللہ e اور صحابہ کرام y کا قربانی کرنے پر استمرار اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قربانی کی قیمت صدقہ کرنا قربانی کے قطعاً برابر نہیں چہ جائیکہ وہ اس سے افضل ہو۔ اس کے علاوہ ایک مرتبہ رسول اللہ e کے عہد مبارک میں قربانی کے وقت بھوک کے آثار پیدا ہوئے تو اس وقت بھی آپ نے قربانی کی قیمت صدقہ کرنے کے متعلق نہیں کہا، بلکہ قربانی کے عمل کو برقرار رکھا اور قربانی کا گوشت لوگوں میں تقسیم کرنے کی ترغیب دی۔ آپ e نے حکم دیا کہ قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ رکھا جائے بلکہ اسے غرباء اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ بعد میں رسول اللہ e نے اس پابندی کو ختم کر دیا۔ 3

! الحج: ۳۴.   @ الکوثر: ۲.

بخاری، الذبائح: ۵۵۶۹.

دنیاوی اعتبار سے بھی ہم اس قربانی کا جائزہ لیتے ہیں تو حسب ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:

☆ قربانی کے عمل سے بہت سے غریبوں کا معاش وابستہ ہے۔ مثلاً غریب لوگ قربانی کے جانور پالتے ہیں اور متمول حضرات مہنگے داموں اسے خرید لیتے ہیں۔

☆ چرم کا کاروبار کرنے والوں کا بھی قربانی کی کھالیں ایک بہترین ذریعہ معاش ہے۔ بہت سے غریب لوگ چرم کی فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں اور روزی کماتے ہیں۔

☆ قربانی کے دنوں میں جانور ذبح کرنے، کھال اتارنے اور گوشت بنانے والوں کا کاروبار بھی عروج پر ہوتا ہے، یہ کام کرنے والے بھی غریب ہوتے ہیں۔

☆ قربانی کی کوئی چیز بھی ضائع نہیں ہوتی حتی کہ ان کی آنتیں وغیرہ بھی کام آتی ہیں، غریب لوگ انہیں جمع کر کے بھی روزی کماتے ہیں۔

یہ سب قربانی کی برکتیں ہیں، اس کی حکمت یہ ہے کہ اس سے ایک مقدس فریضے اور عظیم عہد کی تجدید ہوتی ہے۔ اگر مغربی تہذیب سے مرعوب حضرات کا فلسفہ مان لیا جائے تو حج کو موقوف کرنا پڑے گا، کیوں کہ اس میں بھی اربوں روپے ضائع ہوتے ہیں، روزہ بھی ترک کرنا پڑے گا کیوں کہ اس سے جسمانی کمزوری اور قوت کار میں کمی آتی ہے۔ اسی طرح نماز اور زکوۃ بھی چھوڑنا ہوں گے۔

بہرحال ہمارے نزدیک قربانی ایک ایسی عبادت ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ اس سے جو جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ دوسری عبادات سے پیدا نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم!

قربانی اور اس کے عیوب

] مسلمان ہر سال، اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے ہزاروں جانور اللہ کی راہ میں قربان کیے جاتے ہیں، کتاب وسنت کی روشنی میں وہ کون کون سے عیوب ونقائص ہیں جن کی موجودگی میں قربانی کا جانور قربانی کے قابل نہیں رہتا؟ تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔

[اس میں کوئی شک نہیں کہ قربانی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ قربانی کا جانور موٹا تازہ، خوبصورت اور ہر قسم کے عیب اور نقص سے پاک ہو، اگرچہ اللہ تعالیٰ کو قربانی کا گوشت و پوست نہیں پہنچتا بلکہ اللہ تعالیٰ کو دل کا تقویٰ پہنچتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾ 1

''اللہ تعالیٰ کو قربانی کے جانوروں کا نہ تو گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون بلکہ اللہ تعالیٰ کو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔''

---

1 الحج:۳۷.

اس آیت کی روشنی میں اخلاص کے ساتھ قربانی کرنے کی رہنمائی ملتی ہے۔ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ قربانی کا جانور موٹا، عمدہ، قیمتی ہونا چاہیے اور وہ ہر قسم کے عیب اور نقص سے بھی پاک ہونا چاہیے۔

رسول اللہ e نے چند ایک نقائص کی نشاندہی کی ہے جن کی موجودگی میں قربانی کا جانور، قربانی کے قابل نہیں رہتا۔

چنانچہ سیدنا براء بن عازب t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''چار قسم جانور قربانی میں کفایت نہیں کرتے، کانا جانور جس کا کانا پن واضح ہو، بیمار جانور جس کی بیماری ظاہر ہو، لنگڑا جانور، جس کا لنگڑا پن نمایاں ہو اور وہ جانور جو ہڈی ٹوٹنے سے اتنا کمزور ہو چکا ہو کہ اس میں گودا نہ رہا ہو۔'' 1

جانور کی خوبصورتی اس کے کان اور آنکھ سے ہوتی ہے، اس لیے رسول اللہ e نے ان میں ہلکا سا عیب بھی قبول نہیں فرمایا۔ چنانچہ آنکھ کے متعلق درج ذیل عیوب قابل قبول نہیں ہیں:

☆ وہ جانور جس کی ایک آنکھ کی بینائی ختم ہو چکی ہو۔

☆ وہ جانور جس کی دونوں آنکھیں ختم ہو چکی ہوں۔

☆ بعض اوقات بظاہر دونوں آنکھیں درست ہوتی ہیں لیکن ان میں بینائی نہیں ہوتی، ایسا جانور قربانی کے قابل نہیں رہتا۔

اسی طرح کان کے متعلق درج ذیل عیوب کی احادیث میں صراحت آئی ہے۔

☆ مقابلہ:......جس جانور کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو۔

☆ مدابرہ:......جس جانور کا کان جڑ سے کٹا ہوا ہو۔

☆ خرقاء:......جس جانور کے کان میں سوراخ ہو۔

بعض اوقات فارم میں رکھے ہوئے جانوروں کے کان میں سوراخ کر کے اس میں کڑا ڈال دیا جاتا ہے تاکہ علامت کے طور پر کوئی نشانی اس میں آویزاں کر دی جائے، ایسا جانور بھی قربانی کے قابل نہیں رہتا۔ چنانچہ خرقاء کے متعلق حدیث میں وضاحت ہے کہ وہ جانور جس کے کان میں بطور علامت کوئی سوراخ کر دیا جائے۔ 2

☆ شرقاء:......وہ جانور جس کا کان چیرا ہو۔

دم بھی جانور کی خوبصورتی میں شامل ہے لہٰذا دم کٹا جانور بھی ممنوع ہے۔ 3

سینگ کی حیثیت کان جیسی نہیں، اس میں تھوڑا بہت نقص گوارا کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ حضرت علی t سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ e نے ٹوٹے ہوئے سینگ والے جانور کی قربانی سے منع فرمایا ہے۔ 4

! ابوداؤد، الضحایا:۴۳۷۷۔ @مسند امام احمد، ج۱،ص۱۰۸۔

نسائی، الضحایا:۴۳۷۷۔ $ ابوداؤد، الضحایا:۲۸۰۵۔

راوی حدیث نے سیدنا حضرت سعید بن مسیب سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ''اس سے مراد وہ جانور ہے جس کا نصف یا نصف سے زیادہ سینگ کٹا ہوا ہو۔'' 1

چنانچہ سیدنا علی t سے ایک آدمی نے روایت کیا کہ اگر کسی جانور کا سینگ ٹوٹا ہوا ہو تو کیا اسے بطور قربانی ذبح کیا جا سکتا ہے؟ تو آپ t نے فرمایا: ''اس میں کوئی حرج نہیں۔'' 2

اس سے مراد بھی نصف سے کم سینگ ٹوٹا ہوا ہو۔ اگر اس سے زیادہ ہے تو ایسے جانور کو بطور قربانی ذبح کرنے سے اجتناب کیا جائے۔ بعض لوگ پیدائش کے وقت ہی اس کے سینگ ختم کر دیتے ہیں، اس قسم کے جانور سے بھی پرہیز کرنا چاہیے، ہاں اگر قدرتی طور پر کسی جانور کے سینگ نہ ہوں تو ایسا جانور جائز ہے۔ واللہ اعلم!

ذبح کرنے کا طریقہ

] ہمارے ہاں جب کوئی جانور ذبح کیا جاتا ہے تو اکثر لوگ اسے ذبح کرنے کے بعد اس کی گردن کو پیچھے کی طرف موڑ کر جھٹکے سے اس کا منکا توڑ دیتے ہیں۔ پھر چھری کی نوک سے اس کی بقایا رگیں کاٹ دی جاتی ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[جانور کو ذبح کرنے کے متعلق ہم افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ذبح کرتے وقت آناً فاناً جانور کی شہ رگ کاٹ دی جاتی ہے۔ پھر اس کی گردن پچھلی جانب موڑ کر اس کا منکا توڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد چھری کی نوک سے حرام مغز کی بتی کو بھی کاٹ دیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے سے خون زیادہ تر جسم کے اندر ہی رہ جاتا ہے جو انسان کی صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ بلکہ بہنے والا خون جسے دم مسفوح کہا جاتا ہے اگر جسم کے اندر ہی رہ جائے تو ایسا جانور نیم حرام کے زمرہ میں آتا ہے۔ اسی طرح بعض لوگ ذبح کرتے ہوئے جانور کی کھال اور معمولی سا حلق کاٹتے ہیں، اس کی پوری رگیں نہیں کاٹتے، جس کی وجہ سے جانور تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔ اسے حدیث میں ''شریطۃ الشیطن'' یعنی شیطان کا ذبیحہ کہا گیا ہے۔ اس کی تفسیر بایں الفاظ کی گئی ہے:

''ذبیحہ کی کھال کاٹ دی جائے مگر رگیں نہ کاٹی جائیں، پھر اسے یونہی چھوڑ دیا جائے حتی کہ وہ مر جائے۔'' 3

یہ روایت اگرچہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہے، تاہم اس طرح کا ذبح کیا ہوا حلال نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ایسا کرنا ذبح کے اصولوں کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں ذبح کے لیے ''ذَكَّيْتُمْ'' کا لفظ آیا ہے، اس سے مراد جانور کو اس طرح ذبح کرنا ہے کہ اس کی جان جلد از جلد بسہولت نکل جائے، اس کا تعلق چھری کی تیزی اور اس کے استعمال میں چابک دستی سے ہے۔ جانور

! نسائی، الضحایا: ۴۳۸۲۔ @ مسند امام احمد: ج۱، ص۹۵۔
ابو داؤد، الضحایا: ۲۸۲۶۔

کی کھال کاٹنے کے بعد تھوڑا سا حلق کاٹنا یا گردن موڑ کر اس کا منکا توڑنا اسے تکلیف در تکلیف میں مبتلا کرنا ہے۔ بلکہ چاہیے کہ جانور کو ذبح کرنے کے بعد اس کا تمام خون نکل جائے پھر ٹھنڈا ہو کر بے حس وحرکت ہو جانے تک اس کی کھال اتارنے میں جلدی نہ کی جائے۔ جبکہ حرام مغز کاٹ دینے سے جسم دم مسفوح سے پوری طرح پاک نہیں ہوتا، کیوں کہ حرام مغز کے ذریعے دماغ اور جسم کا رابطہ قائم رہتا ہے اور اس کے ذریعے بہنے والے خون کی نجاست سے جسم پاک ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ ذبح کے وقت جلد کاٹنے کے بعد درج ذیل رگیں کاٹی جائیں۔

☆ حلقوم:...... اس سے مراد سانس کی رگ ہے، اس کے کاٹنے سے سانس لینے کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

☆ مری:...... کھانے پینے کی نالی، اس کے ذریعے چارہ اور پانی وغیرہ معدہ میں جاتا ہے، اس کے کاٹنے سے کوئی غذا وغیرہ معدہ میں نہیں جا سکتی، اسے بھی کاٹنا چاہیے۔

☆ الودجان:...... اس سے مراد وہ دو رگیں جو حلقوم اور مری کے اردگرد ہوتی ہیں، ان کے ذریعے خون گردش کرتا ہے، اس کے کاٹنے سے دم مسفوح نکل جاتا ہے۔

ان کے بعد گردن کی ہڈی کا جوڑ ہوتا ہے، یہی وہ جوڑ ہے جسے گردن پیچھے کی طرف موڑ کر کھولا جاتا ہے اور اسے ہم منکا ٹوٹ جانے سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھر سفید دھاگے کی طرح حرام مغز روئی کی بتیوں کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اس کے کٹ جانے سے جسم اور دماغ کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ ذبح کرتے وقت صرف گردن کی ہڈی تک کاٹنا چاہیے، حرام مغز کو کاٹنا ذبح کے اصولوں کے خلاف ہے۔ چنانچہ امام بخاری a نے اپنی صحیح میں ایک عنوان "نحر اور ذبح کا بیان" قائم کیا ہے۔ انہوں نے اس کے تحت سیدنا عبداللہ بن عمر W کے متعلق لکھا ہے کہ وہ حرام مغز کاٹنے سے منع کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ جانور کو اس کی گردن کی ہڈی تک کاٹ کر چھوڑ دیا جائے تا آنکہ وہ ختم ہو جائے۔ امام بخاری a نے سیدنا عطاء بن ابی رباح a کے حوالے سے لکھا ہے کہ ذبح کرتے وقت جانور کی رگیں کاٹنا ہوتی ہیں، میں ان کے ساتھ حرام مغز کو کاٹنا اچھا خیال نہیں کرتا۔ 1

مزید برآں یہ ہے کہ جن جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے، ان کی تین اقسام ہیں:

☆ وہ جانور جنہیں آسانی کے ساتھ زمین پر لٹایا جاتا ہے، جسے بھیڑ بکری اور گائے وغیرہ۔

☆ وہ جانور جنہیں آسانی کے ساتھ زمین پر نہیں لٹایا جا سکتا جیسے اونٹ وغیرہ۔

☆ وہ بے قابو جانور جسے نہ زمین پر لٹایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے کھڑا کیا جا سکتا ہے۔

پہلی قسم کے جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے، اس شرعی ذبح کی تین اقسام ہیں:

ا۔ چھری پھیرتے وقت بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھا جائے اور جانور کو قبلہ رو لٹایا جائے۔

! بخاری، الذبائح، باب نمبر ۲۳.

۲۔ ذبح کرنے والا شخص مسلمان یا اہل کتاب سے ہو اور ذبح کرنے کی نیت سے چھری چلائے۔

۳۔ شرعی طریقہ سے ذبح کرتے وقت جانور کی شہہ رگ اور دوسری رگیں کاٹ دی جائیں۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''جب تم ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو۔'' 1

اچھی طرح ذبح کرنے کا مطلب حسب ذیل ہے:

۱۔ انسان، جانور کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے، اسے گھسیٹتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ پر نہ لے جائے۔

۲۔ اسے سختی اور بے دردی کے ساتھ زمین پر نہ گرائے۔

۳۔ جانور کے سامنے چھری تیز نہ کرے اور تیز چھری کے ساتھ اسے ذبح کرے۔

۴۔ ذبح کرتے وقت تقرب الی اللہ کی نیت کرے اور اسے قبلہ رخ لٹا کر بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھ کر ذبح کرے۔

۵۔ نہایت چابک دستی کے ساتھ جلدی جلدی اس کی رگیں کاٹ دے۔

۶۔ اسے دوسرے جانوروں کے سامنے ذبح نہ کرے اور ذبح کرنے کے فوراً بعد کھال اتارنا شروع نہ کرے بلکہ اس کے ٹھنڈا ہو جانے کا انتظار کرے۔

دوسری قسم کے جانور:......جنہیں آسانی کے ساتھ زمین پر نہیں لٹایا جا سکتا۔ مثلاً اونٹ وغیرہ، انہیں نحر کیا جاتا ہے، جس کا طریقہ حسب ذیل ہے:

۱۔ اونٹ کا اگلا بایاں گھٹنا باندھ کر اسے تین ٹانگوں پر کھڑا کر دیا جائے۔

۲۔ سینے کی طرف ہنسلی کے پاس نرم جگہ پر کوئی تیز دھار آلہ مثلاً چھری، چاقو، نیزہ یا برچھی ماری جائے، پھر تیز آلہ کو دائیں بائیں حرکت دی جائے تاکہ سوراخ کھلا ہو کر خون جلدی بہہ جائے۔

۳۔ جب اونٹ نڈھال ہو کر گر جائے تو ٹھنڈا ہونے پر اس کی کھال اتاری جائے اور گوشت بنایا جائے۔ قرآن حکیم میں ہے:

﴿فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا﴾ 2

''تم ان اونٹوں کو کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو، جب وہ پہلو کے بل گر جائیں تو ان کا گوشت کھاؤ۔''

سیدنا عبداللہ بن عمر w ایک ایسے شخص کے پاس سے گزرے جس نے اونٹ ذبح کرنے کے لیے اسے زمین پر بٹھا رکھا تھا، یہ حالت دیکھ کر آپ نے فرمایا: ''اس کا گھٹنا باندھ کر اسے کھڑا کرو یہی رسول اللہ e کی سنت ہے۔ 3

سیدنا جابر t کا بیان ہے کہ رسول اللہ e اور آپ کے صحابہ کرام y اونٹ کی بائیں ٹانگ باندھ کر اسے نحر کرتے

! صحیح مسلم، الصید والذبائح:۱۹۵۵۔ @ الحج:۳۶۔

بخاری، الحج:۱۷۱۳۔

تھے جبکہ وہ اپنی باقی ٹانگوں پر کھڑا ہوتا تھا۔ 1

واضح رہے کہ اونٹ کو نحر کرتے وقت بھی بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھ کر نیزا یا برچھی ماری جائے۔

تیسری قسم کا جانور:...... جب بے قابو ہو کر وحشیانہ حرکتیں کر رہا ہو، اسے نہ تو زمین پر لٹایا جا سکے اور نہ ہی کھڑا کیا جا سکے تو بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر جسم کے کسی بھی حصہ کو تیر یا کسی تیز دھار آلہ سے زخمی کر دیا جائے تاہم یہ بھی ذبح کی طرح ہے، اس طرح اگر وہ ختم ہو جاتا ہے، تو وہ حلال ہے اور اس کا گوشت کھایا جا سکتا ہے۔

چنانچہ سیدنا رافع بن خدیج t بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ رسول اللہ e کے ہمراہ سفر میں تھے کہ اچانک ایک اونٹ بدک کر بھاگ نکلا اور ہمارے قابو میں نہ آ رہا تھا۔ اس دوران ایک آدمی نے اسے تیر سے مارا تو اُس نے اسے روک دیا۔ اس کے متعلق رسول اللہ e نے فرمایا: ''یہ اونٹ بھی بعض اوقات جنگلی جانوروں کی طرح بے قابو ہو کر بھاگ نکلتے ہیں، لہٰذا ان میں سے جو بھی تمہارے قابو سے باہر ہو جائیں تو ان کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرو۔'' 2

اسی طرح اگر کوئی جانور کنویں میں گر جائے تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا ہے، اس کا ذبح کرنا یہی ہے کہ جسم کے کسی بھی حصہ سے بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر کسی تیز دھار آلہ سے خون نکال دیا جائے، اس کا زخمی کرنا ہی ذبح کرنا ہے۔ واللہ اعلم!

نیز ذبح کرنے کے لیے دن رات، مرد یا عورت کی کوئی پابندی نہیں۔ نیز آلہ ذبح کے لیے چھری کا ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ کسی تیز دھار آلہ مثلاً چاقو، بانس کی پھونک، پتھر اور شیشہ وغیرہ سے ذبح کیا جا سکتا ہے یعنی جس چیز سے خون بہایا جا سکے، اس کے ساتھ بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر ذبح کیا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''جو چیز خون کو بہا دے اور جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو تو اس جانور کو کھا لو، ہاں آلہ ذبح دانت اور ناخن نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ دانت ہڈی ہے اور ناخن اہل حبشہ کی چھری ہے۔'' 3

اہل حبشہ بڑے وحشیانہ طریقہ سے جانور ذبح کرتے تھے، چھوٹے موٹے جانور یا پرندے کو منہ میں لے کر دانتوں سے اس کی گردن کاٹ دیتے تھے یا پھر اپنے ناخنوں کو بڑھا لیتے اور ان سے چھری کا کام لیتے تھے اس لیے رسول اللہ e نے ان دونوں چیزوں سے ذبح کرنے کی ممانعت فرما دی۔

سیدنا کعب بن مالک t کا بیان ہے، کہ ایک عورت نے تیز دھار پتھر کے ساتھ بکری کو ذبح کر دیا، جب رسول اللہ e سے اس کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے اسے کھانے کا حکم دے دیا۔ 4

! ابو داوٗد، المناسک:۱۷۶۷۔ @ بخاری، الذبائح:۵۵۱۴۔

بخاری، الذبائح والصید:۵۵۴۳۔

$ بخاری، الوکالہ:۲۳۰۴۔

اس حدیث سے دو مسائل معلوم ہوئے:

۱۔ جانور کو صرف چھری سے ہی نہیں بلکہ ہر تیز دھار آلہ سے ذبح کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ عورت بھی جانور ذبح کر سکتی ہے خواہ وہ کسی حالت میں ہو۔

جانور کو قبلہ رخ لٹانا چاہیے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمر W اس جانور کا گوشت تناول فرمانا ناپسند کرتے تھے جسے قبلہ رخ کیے بغیر ذبح کیا جاتا تھا۔ 1 واللہ اعلم!

! مصنف عبد الرزاق، حدیث نمبر:۸۵۸۵.

قومی امانت

] کچھ لوگ سرکاری جنگلات سے چوری لکڑیاں کاٹ لاتے ہیں اور اسے اپنے لیے حلال کہتے ہیں، اسی طرح سرکاری بجلی، گیس اور پانی وغیرہ اپنے استعمال میں لاتے ہیں اور اس کا بل ادا نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ مال ہمارے ہیں اور ہمیں ان کے استعمال کی اجازت ہے، کیا واقعی ان کی بات درست ہے؟

[شخصی امانت میں خیانت بہت سنگین جرم ہے۔ رسول اللہ e نے امانت میں خیانت کرنے کو نفاق کی علامت قرار دیا ہے۔ 1

لیکن جو قومی امانت ہے اس میں خیانت کرنا بہت بڑا جرم ہے، رسول اللہ e کے دور میں ایک غلام جو رسول اللہ e کا خدمت گزار تھا، اس نے غنیمت کے مال میں سے ایک اونی چادر لے لی، وہ رسول اللہ e کے اونٹ سے پالان اتار رہا تھا کہ اسے نامعلوم طرف سے تیر آن لگا جس سے وہ مر گیا، لوگوں نے اسے دیکھ کر کہا: ''اسے جنت مبارک ہو۔'' یہ سن کر رسول اللہ e نے فرمایا: ''ہرگز نہیں! مجھے اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! بلاشبہ وہ چادر جو اس نے خیبر کے روز تقسیم سے پہلے غنیمت میں سے اٹھائی تھی، وہ اس پر آگ بن کر بھڑک رہی ہے۔ لوگوں نے جب یہ سنا تو کوئی ایک تسمہ لے آیا اور کوئی دو تسمے، یہ تسمے انہوں نے رسول اللہ e کے حوالے کرنا چاہے، آپ نے فرمایا: یہ تسمہ آگ کا ہے اور یہ دو تسمے آگ کے ہیں۔'' 2

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قومی امانتوں کا معاملہ انتہائی سخت اور انتہائی نازک ہے، اجازت کے بغیر جنگلات کی لکڑیاں کاٹنا، بجلی یا گیس یا نہری پانی استعمال کرنا، اللہ کے ہاں بہت بڑے عقاب کا باعث ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ غنیمتوں کی تقسیم کے بعد ایک آدمی بالوں سے تیار کردہ ایک لگام لے کر آیا اور کہا یا رسول اللہ! یہ ہمیں غنیمت میں ملی تھی، رسول اللہ e نے اس سے پوچھا کیا تو نے بلال t کو منادی کرتے سنا تھا؟

اس نے کہا جی ہاں! سنا تھا۔

! صحیح بخاری، الایمان:۳۳۔ @ ابو داوٗد، الجهاد:۲۷۱۔

آپ نے فرمایا کہ اس وقت تجھے یہ مال لانے میں کیا رکاوٹ تھی، اس نے عذر و معذرت کی لیکن آپ نے فرمایا:

''اب تم اسے اپنے پاس رکھو، قیامت کے دن لے آنا، وہاں حساب ہوگا، میں اسے تجھ سے ہرگز قبول نہیں کرتا۔'' 1

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ قومی خزانے کا سلسلہ کس قدر نازک ہے، ہم اسے شیر مادر سمجھ کر ہضم کر جاتے ہیں اور اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں۔ اسی طرح جو قومی خزانہ سے قرض لیتے ہیں پھر اسے واپس نہیں کرتے، ان کے ساتھ بھی قیامت کے دن بہت برا حشر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس قسم کی رسوائی سے محفوظ رکھے۔ آمین!

خواتین کا دعوتی پروگرام

] ہمارے مدرسہ میں طالبات پڑھتی ہیں، ہم انہیں دعوت وارشاد کی ٹریننگ دینے کے لیے مدرسہ کی گاڑی پر گرد و نواح میں خواتین کے دعوتی پروگرام کراتی ہیں جبکہ ڈرائیور اکیلا ہوتا ہے، اس کے ساتھ کوئی محرم عورت نہیں ہوتی، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

[کسی مرد کے لیے جائز نہیں کہ وہ اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی اختیار کرے، ہاں اگر عورت کے ساتھ کوئی محرم رشتہ دار موجود ہو تو پھر ایسا کرنے میں چنداں حرج نہیں۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''عورت کے پاس کوئی غیر محرم مرد نہ جائے الا یہ کہ اس کے ساتھ محرم موجود ہو۔'' 2

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''خبردار! کوئی مرد، کسی عورت کے ساتھ تنہائی اختیار نہ کرے، اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو ان میں تیسرا ساتھی شیطان ہوتا ہے۔'' 3

ان احادیث میں جس خلوت وتنہائی سے منع کیا گیا ہے، وہ عام ہے۔ خواہ گھر میں ہو یا بازار میں، گاڑی میں ہو یا ویسے کسی جگہ پر جانا ہو، اس لیے اگر عورت اکیلی ہے تو اس کا ڈرائیور کے ساتھ مدرسہ کی گاڑی پر سفر کرنا جائز نہیں۔ ہاں اگر گاڑی میں دو یا اس سے زیادہ عورتیں ہیں تو پھر چنداں حرج نہیں کیوں کہ اس وقت خلوت نہیں رہتی، لیکن اس کے لیے بھی درج ذیل دو شرائط ہیں:

☆ گاڑی کا ڈرائیور متدین ہو اور کسی فتنہ میں مبتلا ہونے سے بے خوف ہو۔

☆ وہ عورتیں اس کے ساتھ اتنی مسافت پر نہ جائیں جسے عرف عام میں سفر کہا جاتا ہو۔

ان شرائط کی موجودگی میں شہر کے اندر یا اس کے قرب وجوار میں دعوتی پروگرام منعقد کیا جا سکتا ہے جبکہ خواتین با حجاب اور عفت وحیا کو لازم پکڑنے والی ہوں۔ اس قدر احتیاط کے باوجود بھی خیر و برکت اسی میں ہے کہ اس سے بھی اجتناب کیا جائے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ، رسول اللہ e ایک مرتبہ اعتکاف کرتے ہوئے مسجد میں تھے کہ حضرت صفیہ r آپ

! ابو داؤد، الجہاد: ۲۷۱۲۔ @ صحیح بخاری، جزاء الصید: ۱۸۶۲۔

ترمذی، الفتن: ۲۱۶۵۔

کے پاس آئیں، جب رات دیر ہوگئی تو آپ انہیں راستے پر لگانے کے لیے باہر نکلے، اس دوران آپ کے دوصحابہ کرام y نے آپ کو دیکھا تو وضاحت فرمائی کہ یہ میری بیوی صفیہ ہے، جب صحابہ کرام y پر یہ وضاحت گراں گزری تو آپ نے فرمایا: ''شیطان، انسان کے رگ وریشے میں خون کی طرح سرایت کر جاتا ہے مجھے اندیشہ ہوا کہ تمہارے دلوں میں کوئی ایسی بات نہ ڈال دے جو تمہارے لیے اچھی نہ ہو۔'' 1

اس حدیث کے پیش نظر ہمیں ہر کام سے گریز کرنا چاہیے جس میں شکوک وشبہات کا اندیشہ ہو، اگرچہ مذکورہ شرائط کے ساتھ جواز کا پہلو موجود ہے۔ (واللہ اعلم)

عورتوں سے اختلاط

] ہمارے ہاں بازاروں میں عورتیں عریاں یا نیم عریاں لباس پہن کر آتی ہیں، کیا ایسے حالات میں ایک مسلمان آدمی وہاں جاسکتا ہے، جہاں اختلاط مرد وزن کا پورا پورا امکان ہوتا ہے؟

[جس مقام پر مرد وزن کا اختلاط ہو یا اس کا امکان ہو تو ایک دیندار آدمی کو وہاں جانے سے گریز کرنا چاہیے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ١ٞ۫ وَ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ١ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا١ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ١ٚ وَ اَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ۝۲۳﴾ 2

''جب موسیٰ u مدین کے چشمے پر پہنچے تو دیکھا کہ لوگوں کی ایک جماعت وہاں جانوروں کو پانی پلا رہی ہیں اور دو عورتیں الگ کھڑی اپنے جانوروں کو روکے ہوئے دکھائی دیں۔ موسیٰ u نے پوچھا کہ تمہارا کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے بتایا جب تک یہ چرواہے واپس نہ لوٹ جائیں، ہم پانی نہیں پلاتیں اور ہمارے والد بہت بڑی عمر کے بوڑھے ہیں۔''

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورتیں، اختلاط مرد وزن سے کس قدر گریز کرتی تھیں، انہوں نے مردوں میں گھس کر پانی پلانے کی قطعاً کوشش نہیں کی۔

ہاں درج ذیل شرائط کے ساتھ ایسے بازار میں جانا جائز ہے:

☆ وہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے، اس جذبہ سے وہاں جائے۔
☆ جاتے وقت اپنی نظروں کو جھکائے رکھے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔
☆ فتنہ اور اس کے اسباب وذرائع سے خود کو بچائے رکھے۔
☆ اپنے دین اور عزت وناموس کی حفاظت کا پورا پورا اہتمام کرے۔

! بخاری، الاعتکاف: ۲۰۳۵.   @ القصص: ۲۳.

☆ شر اور فساد کے وسائل سے دور بھاگے اور ان کے قریب ہی نہ جائے۔

مذکورہ بالا شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے بازار میں جانا جائز ہے جہاں عورتیں عریاں یا نیم عریاں لباس پہنے ہوئے ہوں اور اپنے حسن کی نمائش کے لیے بے تاب ہوں، ایسے حالات میں برائی کی روک تھام کے لیے وہاں جانا جائز ہے۔ حدیث میں ہے:

''لوگ جب برائی دیکھتے ہیں اور اسے روکتے نہیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ، اس برائی کی سزا میں انہیں بھی شامل کرلے۔'' 1

ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کے لیے ایسے بازاروں میں جائے جہاں محض فساد و شر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

عورت کا ملازمت کرنا

] میری بیٹی کالج میں پڑھاتی ہے، بعض اوقات اسے لڑکوں کی کلاس لینا پڑتی ہے لیکن وہ انہیں باپردہ ہو کر پڑھاتی ہے، ایسے حالات میں اس کا ملازمت کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟

[اللہ تعالیٰ نے مرد و زن کے دائرہ کار کی تقسیم کچھ اس طرح کی ہے کہ عورت کو اندرون خانہ ذمہ داری سونپی ہے تاکہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے شوہر کی خدمت اور بچوں کی تربیت کرسکے اور آدمی کی بیرون خانہ ذمہ داری ہے کہ اخراجات کے لیے بھاگ دوڑ کرے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾ 2

''مرد عورتوں پر حاکم ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور اس وجہ سے کہ مرد حضرات اپنا مال خرچ کرتے ہیں''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد کو معاشی ذمہ داری پورا کرنے کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے، لیکن ہمارا معاشرہ الٹی سمت پر چل نکلا ہے۔ عورت کا کالج میں ملازمت کرنا چنداں قباحت نہیں رکھتا، لیکن اس کا لڑکوں کو پڑھانا کئی ایک فتنوں پر پیش خیمہ ہو سکتا ہے، اگرچہ وہ باپردہ ان کو پڑھانے کا التزام کرے۔

ہمیں اس مقام پر رسول اللہ e کی ایک حدیث بہت یاد آتی ہے جو دور حاضر کی عکاسی کرتی ہے۔

رسول اللہ e نے فرمایا: قیامت کے قریب سلام مخصوص لوگوں کو کیا جائے گا، تجارت پھیل جائے گی، حتی کہ عورت تجارت میں اپنے خاوند کی مدد کرے گی اور رشتے ناطے توڑے جائیں گے۔ 3

! ابن ماجہ، الفتن: ۲۰۰۵۔ @ النساء: ۳۴۔

مسند امام احمد، ص ۴۲۰، ج ۱۔

اس حدیث کے پیش نظر صورت مسئولہ میں سائل کو غور کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

غیر مسلم کو سلام کا جواب

] میں ایک فیکٹری میں ملازم ہوں، میرے ساتھ کچھ عیسائی بھی کام کرتے ہیں، وہ میل ملاقات کے وقت مجھے سلام کہتے ہیں، کیا انہیں جواب دیتے وقت ''وعلیکم السلام'' کہا جا سکتا ہے؟ نیز میں انہیں سلام کہہ سکتا ہوں؟ اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

[بوقت ملاقات سلام کہنا ہم مسلمانوں کا شعار ہے، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ حق ہے کہ جب وہ ملے تو اسے سلام کہا جائے۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''مسلمان کا دوسرے پر حق ہے کہ جب وہ اس سے ملاقات کرے تو سلام کرے۔'' 1

اس کے علاوہ ''السلام علیکم'' دعائیہ کلمات بھی ہیں، جس کے معنی ہے ''تم پر سلامتی ہو'' اس بناء پر غیر مسلم کو ''السلام علیکم'' نہیں کہنا چاہیے، حدیث میں اس کی صراحت ہے۔

چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا: یہود و نصاریٰ کو تم سلام کرنے میں پہل نہ کرو۔'' 2

امام نووی a نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''اہل کتاب کو ابتدائی طور پر سلام کرنے کی ممانعت ہے۔'' اگر وہ سلام کریں تو انہیں ''وعلیکم السلام'' کہنے کی بجائے صرف ''وعلیکم'' کہا جائے، اس امر کی بھی حدیث میں صراحت ہے۔

سیدنا انس t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا: جب اہل کتاب تمہیں سلام کریں تو جواب میں صرف یہ کہو ''وعلیکم'' تم پر بھی ہو۔''

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد سلام کے وقت بد دعا کی نیت کرتے تھے، یعنی وہ ''السام علیکم'' کہتے تھے، جس کا معنی ہے: ''تم پر موت واقع ہو۔'' اس کے جواب میں ''وعلیکم'' کہا جائے کہ جو تم ہمارے لیے مانگتے ہو وہی تم پر ہو۔ اس لیے ان احادیث کی روشنی میں انہیں نہ تو ''السلام علیکم'' کہا اور نہ ہی ان کے سلام کے جواب میں وعلیکم السلام کہا جائے بلکہ ''وعلیکم'' کہہ کر جواب دیا جائے۔ واللہ اعلم!

موبائل کا استعمال آداب مجلس کے منافی

] ہمارے ہاں اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک مجلس میں بڑی علمی باتیں ہو رہی ہوتی ہیں لیکن کچھ حضرات اپنے موبائل کے ساتھ مصروف رہتے ہیں، کال کر رہے ہیں، یا سن رہے ہیں، کیا ایسا کرنا آداب مجلس کے خلاف نہیں؟ وضاحت کریں۔

[مجلس کے بہت سے آداب ہیں، اس کا ایک اہم ادب یہ ہے کہ پوری توجہ کے ساتھ بات کو سنا جائے اور اچھے انداز سے اپنی بات کی جائے، کسی ایسے کام میں مصروف نہیں ہونا چاہیے جو بات سننے یا کرنے میں خلل انداز ہو، ایسا کام کرنا

!مسلم، السلام: ۵۶۵۱۔ @ مسلم، السلام: ۵۶۶۱۔

رسول اللہ e کی تعلیمات کے خلاف ہے، ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔

چنانچہ سیدنا ابن عباس t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے ایک مرتبہ انگوٹھی بنوائی اور اسے پہن لیا، پھر آپ e نے فرمایا: ''جب سے میں نے اسے پہنا ہے، یہ میری توجہ کو آپ لوگوں سے ہٹا دیتی ہے، ایک نظر اس کو دیکھتا ہوں اور دوسری نظر آپ کو دیکھتا ہوں۔''......سیدنا ابن عباس t کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ e نے اس انگوٹھی کو پھینک دیا۔ 1

اس حدیث کے پیش نظر انسان کے لیے یہ بات انتہائی معیوب ہے کہ وہ کسی علمی مجلس میں بیٹھا ہو اور غور وفکر کے ساتھ بات سننے یا سنانے کی بجائے اپنے موبائل کے ساتھ کھیلتا رہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنے موبائل کو بند کر کے مجلس میں بیٹھے، آداب مجلس کا خیال رکھے اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس سے اس کا یا مجلس کا وقار مجروح ہوتا ہو۔ واللہ اعلم

والدہ سے صلہ رحمی

] میری والدہ بات بات پر مجھے لعن طعن کرتی رہتی ہیں، بعض اوقات تو بد دعائیں دینا شروع کر دیتی ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسے چھوڑ کر کہیں دور چلا جاؤں تا کہ اس کی طعن و تشنیع سے محفوظ رہوں، کیا شرعاً اس کی اجازت ہے؟

[والدین کی خدمت اور فرمانبرداری فرض ہے، اگر وہ سنگ دلی اور سختی کا مظاہرہ کریں تو اولاد کو چاہیے کہ وہ صبر سے کام لیں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ سوال میں ذکر کردہ آزمائش سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا فرمائے گا۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا﴾ 2

''جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے پریشانیوں سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔''

ایک شخص نے رسول اللہ e سے عرض کیا، اللہ کے رسول! میں اپنے رشتے داروں سے صلہ رحمی کرتا ہوں مگر وہ قطع رحمی کرتے ہیں، میں ان سے حسن سلوک کرتا ہوں مگر وہ برا سلوک کرتے ہیں، یہ سن کر رسول اللہ e نے فرمایا:

''اگر تمہارا طرز عمل اس طرح ہے تو آپ ان کے چہروں پر گرم راکھ ڈال رہے ہو، جب تک اس پر قائم رہو گے تو اللہ کی طرف سے ایک معاون فرشتہ آپ کی مدد کرتا رہے گا۔'' 3

سائل کو ہماری نصیحت ہے کہ وہ ماں کی کڑوی کسیلی باتیں سن کر صبر کرے اور ان کی خدمت میں کسی قسم کی کمی نہ کرے۔ واللہ اعلم!

خاوند کے لیے وگ کا استعمال

] میرے بال لمبے نہیں جبکہ میرا خاوند لمبے بالوں کو پسند کرتا ہے اور مجھے وگ استعمال کرنے پر مجبور کرتا ہے، کیا خاوند کی اطاعت کرتے ہوئے مصنوعی بال استعمال کر سکتی ہوں تا کہ میرے بال دیکھنے میں خوبصورت معلوم ہوں اور خاوند کو

! مسند احمد، ج۵، ص۱۵۸۔ @ الطلاق: ۲۔

مسلم: البر والصلہ:۲۵۵۸۔

خوش کرسکوں۔

] میاں بیوی کا ایک دوسرے کے لیے اس انداز میں بن سنور کر رہنا جو تعلقات کی مضبوطی کا ذریعہ ہو بڑا مستحسن امر ہے،لیکن اسلامی حدود و قیود میں رہتے ہوئے ایسا کرنا چاہیے،اگر خاوند کی اطاعت میں اللہ کی نافرمانی ہوتی ہو تو اس صورت میں اللہ کی اطاعت مقدم ہوگی۔جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہونی چاہیے۔'' 1

اس کا مطلب یہ ہے کہ خاوند کی اطاعت اللہ، اور اس کے رسول e کی اطاعت کے تابع ہے۔

صورت مسئولہ میں خاوند کی اطاعت کرتے ہوئے وگ کا استعمال کرنا جائز نہیں کیوں کہ ایسا کرنا رسول اللہ e کی نافرمانی ہے۔

چنانچہ سیدہ اسماء بنت ابی بکر r بیان کرتی ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا اللہ کے رسول! میری بیٹی کی نئی نئی شادی ہوئی ہے اور بیماری کی وجہ سے اس کے سر کے بال جھڑ گئے ہیں۔کیا اس کے بالوں کے ساتھ نئے بال لگا دوں؟

رسول اللہ e نے فرمایا:''اللہ تعالیٰ نے بالوں میں پیوند لگانے والی اور لگوانے والی پر لعنت کی ہے۔'' 2

ایک روایت میں ہے کہ بیٹی کا خاوند چاہتا ہے کہ اس کے بال لمبے ہوجائیں تو رسول اللہ e نے یہ کام کرنے والی اور کروانے والی کو بہت برا بھلا کہا۔ 3

اس کے علاوہ مصنوعی بالوں کا استعمال غیر مسلم عورتوں کی ایجاد ہے اور انہوں نے ہی اسے بطور زینت شہرت دی ہے حتی کہ یہ ان کا خصوصی فیشن بن گیا ہے۔ایک مسلمان عورت کا وگ کو استعمال کرنا اور اس کے ساتھ مزین ہونا اگرچہ اپنے خاوند کے لیے ہی کیوں نہ ہو، کافر عورت سے مشابہت ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:''جو شخص کسی قوم کی مشابہت کرے وہ انہی میں سے ہوگا۔'' 4

لہٰذا ایک مسلمان عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے خاوند کو خوش کرنے کے لیے وگ استعمال کرے پھر اس کے استعمال سے کافر عورتوں کی مشابہت بھی ہوتی ہو۔واللہ اعلم!

دورخاپن کی مذمت

] میں کچھ لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ میرے ساتھ گفتگو کرتے وقت دوغلی پالیسی اختیار کرتے ہیں، کیا مجھے اپنے حالات میں خاموش رہنا چاہیے یا انہیں اس عادت کے متعلق آگاہ کردینا چاہیے، کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

! مسند احمد، ج۵،ص۶۶.
@ بخاری، اللباس:۵۹۳۴.
# بخاری، اللباس: ۵۹۳۵.
$ مسند احمد، ج۲،ص۵۰.

[ایک انسان اپنی مطلب برآوری کے لیے کسی انسان کے سامنے اس کی تعریف کرتا ہے، پھر دنیوی مقصد حاصل کرنے کے لیے مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے لیکن لوگوں کے سامنے اس کی عدم موجودگی میں مذمت اور عیب جوئی کرتا ہے تو اسے دورخہ پن یا دوغلی پالیسی کہا جاتا ہے، لوگوں سے دورخی گفتگو کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''تم لوگوں میں بدتر دورخے آدمی کو پاؤ گے جو ان کے پاس ایک چہرے کے ساتھ آتا ہے جبکہ دوسروں کے پاس دوسرے چہرے سے جاتا ہے۔'' 1

ایسے آدمی کا راز ایک نہ ایک دن فاش ہو جاتا ہے اور وہ معاشرہ میں بدنام ہو کر رہتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ایسی عادت بد سے خود کو بھی محفوظ رکھیں اور دوسروں کو بھی بچنے کی تلقین کریں۔ جس انسان کے اندر یہ خصلت ہو اس سے خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ اس پر خاموش نہ رہا جائے بلکہ اسے آگاہ کیا جائے تاکہ لوگ آئندہ اس سے نفرت نہ کریں اور از راہ احتیاط اس کی صحبت سے دور نہ ہو جائیں۔ اگر وہ اس نصیحت سے فائدہ اٹھا کر توبہ کر لے تو ٹھیک، بصورت دیگر دوسروں کو اس سے آگاہ کیا جا سکتا ہے، اگرچہ اس کی عدم موجودگی میں ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا کرنا غیبت نہیں جیسا کہ امام بخاری a نے ایک عنوان قائم کیا ہے:

((باب ما یجوز من اغتیاب اہل الفساد والریب۔))

''فسادی اور اہل شک کی غیبت جائز ہے۔'' 2

پھر آپ e نے سیدہ عائشہ r سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ e بیان کی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ e سے اندر آنے کی اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا:

''اسے اندر آنے کی اجازت دے دو، یہ قبیلے کا برا آدمی ہے۔''

جب وہ اندر آیا تو رسول اللہ e نے اس کے ساتھ بڑے اخلاق اور نرمی سے گفتگو فرمائی، میں نے عرض کیا، اللہ کے رسول! آپ نے اس کے متعلق پہلے تو یہ فرمایا تھا کہ یہ قبیلے کا برا آدمی ہے پھر اس کے ساتھ بڑی نرم گفتگو فرمائی، آپ نے فرمایا: ''اے عائشہ! بے شک بدترین آدمی وہ ہے جسے لوگ اس کے بدکلامی سے بچنے کے لیے چھوڑ دیں۔'' 3

بہر حال دورخا پن بہت بری عادت ہے اور جس انسان کے اندر یہ خصلت پائی جائے اسے آگاہ کرنا چاہیے اور دوسروں کو بھی اس سے مطلع کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

عورتوں کا مردوں کو دیکھنا

] مردوں کے لیے تو ممانعت ہے کہ عورتوں کو نہ دیکھیں، کیا عورتیں، جب بازار جاتی ہیں تو مردوں کو دیکھ سکتی ہیں یا نہیں؟ اسی طرح ٹی وی پر غیر محرم مردوں کی تصاویر دیکھنے کے متعلق کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

! بخاری، الادب: ۹۰۵۸۔ @ بخاری، الادب، باب نمبر ۴۸۔

بخاری، الادب: ۶۰۵۴۔

] اس میں کوئی شک نہیں کہ بلاوجہ عورتوں کو دیکھنا منع ہے، بلکہ قرآن نے مردوں کو ایسے حالات میں اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ﴾ 1

''مسلمان مردوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔''

اسی طرح عورتوں کو بھی غض بصر کا حکم ہے، اس سے بعض اہل علم نے استدلال کیا ہے کہ جس طرح مردوں کے لیے عورتوں کو دیکھنا منع ہے اسی طرح عورتوں کے لیے بھی مردوں کو دیکھنا ممنوع ہے۔

لیکن ہمارے رجحان کے مطابق اس میں کچھ تفصیل ہے، کہ عورتیں اگر مردوں کو شہوت اور لطف اندوزی سے دیکھتی ہیں تو فتنہ وفساد کے پیش نظر ایسا کرنا حرام اور ناجائز ہے لیکن اگر نیت میں فتور نہیں تو عورتیں، مردوں کو دیکھ سکتی ہیں۔ جیسا کہ سیدہ عائشہ r اہل حبشہ کو کھیلتے ہوئے اور جہادی مشقیں کرتے ہوئے دیکھتی تھیں اور رسول اللہ e نے آپ r کو اس حالت پر باقی رہنے دیا۔ 2

امام بخاری a نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:

((باب نظر المراة الى الحبش ونحوہم من غير ربة۔))

''عورت اہل حبشہ (اجنبی حضرات) کو دیکھ سکتی ہے بشرطیکہ کسی قسم کے فتنے کا اندیشہ نہ ہو۔'' 3

ہمارے ہاں خواتین بازار میں باپردہ چلتے پھرتے مردوں کو دیکھتی ہیں، اس صورت میں اگرچہ مرد حضرات عورتوں کو نہیں دیکھ پاتے مگر عورتیں انہیں دیکھ رہی ہوتی ہیں، لیکن امام بخاری a کے قائم کردہ عنوان کے مطابق شرط یہ ہے کہ دیکھنے میں فتنہ وشہوت کا وجود نہ ہو، اگر ایسا ہے تو ٹی وی اور سرراہ مردوں کو دیکھنا حرام اور ناجائز ہے۔ واللہ اعلم!

گھر کی خاص باتیں دوسروں کو بتانا

] میں نے ایک عورت سے شادی کی ہے لیکن وہ گھر کی خاص باتیں اپنی ایک سہیلی کو فون پر بتاتی رہتی ہے، میں نے اس سلسلہ میں بہت کوشش کی ہے لیکن وہ باز نہیں آتی، اس کے متعلق قرآن وحدیث میں کیا حکم ہے وضاحت کریں؟

[اس میں شک نہیں کہ کچھ عورتوں میں یہ عادت پائی جاتی ہے کہ وہ گھر کی خاص باتیں اور ازدواجی زندگی کے متعلق اپنی سہیلیوں کو آگاہ کرتی رہتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی شریعت میں ایسا کرنا حرام اور ناجائز ہے۔ کسی بھی عورت کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے گھر کے راز یا شوہر کے ساتھ اپنے معاملات کو کسی کے سامنے ظاہر کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ 4

! النور: ۳۰۔ @ بخاری، النکاح: ۵۲۳۶۔

بخاری، النکاح، باب نمبر ۱۱۵۔ $ النساء: ۳۴۔

''فرمانبردار عورتیں، خاوند کی عدم موجودگی میں اپنی نگہداشت رکھنے والی ہوتی ہیں۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کی تعریف کی ہے بلکہ انہیں اطاعت گزار اور فرمانبردار قرار دیا ہے، جو خاوند کی عدم موجودگی میں اپنے راز دوسروں کو نہیں بتاتیں۔ رسول اللہ e نے ایسی عورتوں کو بہت برے الفاظ سے یاد کیا ہے جو گھریلو راز دوسروں کو بتاتی ہیں۔ رسول اللہ e نے فرمایا: ''بے شک قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقام ومرتبے کے لحاظ سے سب سے بدترین شخص وہ ہوگا جو بیوی کے پاس جاتا ہے اور وہ عورت بھی اس سے لطف اندوز ہوتی ہے پھر وہ اس عورت کا راز لوگوں میں پھیلاتا ہے۔'' 1

یہ وعید عورتوں کے لیے بھی ہے، لہٰذا اس عادت بد سے باز رہنا چاہیے، ویسے بھی اخلاقی اعتبار سے یہ بہت گھٹیا حرکت ہے، اللہ تعالیٰ اس سے ہمیں محفوظ رکھے۔ (آمین)

سابقہ خاوند کے باپ سے پردہ

] میرا کسی سے نکاح ہوا، دو سال کے بعد اس نے مجھے طلاق دے دی، میرے سابقہ خاوند کے والد بعض اوقات گھر آجاتے ہیں، کیا اس سے مجھے پردہ کرنا ہوگا؟ کتاب وسنت کے مطابق راہنمائی کریں۔

[جب کوئی عورت کسی سے نکاح کرتی ہے تو وہ اس کی بیوی بن جاتی ہے اور مرد کا باپ عورت کا سسر کہلاتا ہے، پھر وہ سسر اس کا مستقل طور پر محرم بن جاتا ہے خواہ بیٹا اپنی بیوی کو طلاق ہی کیوں نہ دے دے۔ نکاح کی وجہ سے مندرجہ ذیل رشتے حرام ہو جاتے ہیں:

☆ جس عورت سے والد نے نکاح کر لیا ہو، وہ عورت خاوند کے بیٹوں پر حرام ہو جاتی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ﴾ 2

''اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا ہو۔''

والد کے علاوہ دادا، پڑدادا کی منکوحہ بھی حرام ہو جاتی ہے۔

☆ بیوی کی والدہ سے بھی نکاح حرام ہے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ﴾ 3

''اور (تم پر حرام ہیں) تمہاری بیویوں کی مائیں۔''

! مسلم، النکاح:۱۴۳۷۔ @ النساء:۲۲۔

النساء:۲۳۔

بیوی کی ماں یعنی ساس کے علاوہ اس کی نانی وغیرہ بھی حرام ہو جاتی ہے اور یہ حرمت مجرد نکاح کرنے سے آجاتی ہے خواہ رخصتی نہ بھی ہو۔

☆ ربیبہ یعنی بیوی کی پہلے خاوند سے بیٹی، اس کی حرمت کے لیے ضروری ہے کہ سوتیلا باپ، اپنی بیوی سے ہم بستری کر چکا ہو، صرف نکاح کرنے سے حرمت نہیں آئے گی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ٘ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ٘﴾ 1

''اور (تم پر حرام ہیں) تمہاری پرورش کردہ لڑکیاں جو تمہاری گود میں ہیں، تمہاری ان عورتوں سے جن سے تم ہم بستر ہو چکے ہو اور اگر تم نے ہم بستری نہیں کی تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔''

☆ بیٹے کی بیوی یعنی بہو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ حَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ٘﴾ 2

''اور تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں بھی تم پر حرام ہیں۔''

اس میں پوتوں کی بیویاں بھی شامل ہیں۔

عورت صرف عقد نکاح کی بناء پر مرد کی بیوی بن جاتی ہے، جب کسی عورت کا نکاح ہو جاتا ہے تو خاوند کے باپ پر وہ حرام ہو جاتی ہے، خواہ وہ اسے طلاق ہی کیوں نہ دے دے۔

صورت مسئولہ میں جب عورت کا نکاح ہوا تو خاوند کے باپ سے پردہ ختم ہو جاتا ہے، یہ تعلق دائمی طور پر قائم رہتا ہے، خواہ اس کا خاوند فوت ہو جائے یا وہ اسے طلاق دے دے۔ اس بناء پر سابقہ شوہر کا باپ، اس کا محرم ہے، اس سے نکاح نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس سے پردہ کرنے کی ضرورت ہے۔ (واللہ اعلم)

غیبت کی ایک جائز صورت

] ہم عام طور پر اپنی مجالس میں حکمرانوں کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں جبکہ غیبت سے متعلق بہت وعید آئی ہے، ہمارا اس طرح حکمرانوں کو برا بھلا کہنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟

[غیبت کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾3

! النساء:۲۳. @ النساء:۲۳. # الحجرات: ۱۲.

''تم میں کوئی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، یقیناً تم اسے ناپسند کرتے ہو تو پھر اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔''

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے عذاب قبر کی ایک وجہ غیبت کرنا بتایا ہے۔ 1

غیبت کی قباحت بیان کرنے کے بعد امام بخاری a نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔

((باب ما یجوز من اغتیاب اہل الفساد والریب))

''مفسد اور شریر لوگوں کی غیبت کرنا جائز ہے۔''

اس عنوان سے مقصود لوگوں کو ان کے کردار سے خبردار کرنا ہے تاکہ دوسرے مسلمان ان کے شر سے محفوظ رہیں۔ امام بخاری a نے اس عنوان کو ثابت کرنے کے لیے یہ حدیث بیان کی ہے۔

''ایک شخص نے رسول اللہ e کے ہاں آنے کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا: اسے اجازت دے دو، یہ فلاں قبیلے کا بدترین انسان ہے۔ جب وہ شخص رسول اللہ e کے پاس آیا، تو آپ نے بڑے نرم لہجے میں اس کے ساتھ گفتگو فرمائی۔ حضرت عائشہ r نے عرض کیا یا رسول اللہ! پہلے آپ نے اس شخص کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کیا، پھر اس کے ساتھ نرم گفتگو فرمائی، آپ نے فرمایا: وہ آدمی بدترین ہے جس کی بدکلامی کے ڈر سے لوگ اسے چھوڑ دیں۔'' 2

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص علی الاعلان فسق و فجور اور ظلم و تعدی کا مرتکب ہو، اس کی غیبت کرنا جائز ہے۔

امام بخاری a نے اس حدیث سے درج ذیل عنوان ثابت کیا ہے، اس لیے اگر کوئی شخص اپنی مجلس میں حکمرانوں کی برائی کرتا ہے، یا ان کے گندے کردار سے پردہ اٹھاتا ہے تو ایسا کرنا وہ غیبت نہیں جو حرام ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں وعید اور سنگینی آئی ہے۔ (واللہ اعلم)

ازدواجی راز افشا کرنا

] میری بیوی، ہمارے مابین ازدواجی راز دوسری عورتوں کو بتاتی ہے، کئی بار میں نے اسے منع کیا ہے، لیکن وہ باز نہیں آتی، اس کے متعلق شرعی حکم واضح کریں؟

[کچھ عورتوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ گھر کی باتیں یا ازدواجی راز دوسری عورتوں کو بتاتی ہیں، یہ نازیبا حرکت، حرام اور ناجائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نیک بیویوں کی بایں الفاظ تعریف کی ہے:

﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ 3

! بخاری ، الادب:۶۰۵۲۔ @ بخاری، الادب،:۶۰۵۴۔

النساء:۳۴۔

''نیک فرمانبردار بیویاں خاوند کی عدم موجودگی میں اللہ کی حفاظت سے نگہداشت رکھنے والی ہوتی ہیں۔''

سوال میں جوصورت حال بیان ہوئی ہے وہ شریعت میں انتہائی ناپسندیدہ حرکت ہے۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''قیامت کے دن اللہ کے ہاں لوگوں میں سے بدترین درجہ اس شخص کا ہوگا جو اپنی بیوی سے ملتا ہے اور وہ اس سے ملتی ہے اور پھر وہ اس کے راز افشاء کرتا ہے۔'' 1

یہی حکم بیوی کا ہے، اسے چاہیے کہ اگر خاوند میں کوئی کوتاہی ہے تو اسے آگاہ کرے، دوسروں کو بتانا، اس کی خیانت کرنا ہے جو شرعا جائز نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

لڑکی والوں کی طرف سے رشتے کی پیشکش

] عام طور پر لڑکیوں کی شادی کے معاملہ میں اس امر کا انتظار کیا جاتا ہے کہ لڑکے والوں کی طرف سے پیغام میں پہل ہو، اس انتظار میں اچھے سے اچھے رشتے ضائع ہوجاتے ہیں، اس سلسلہ میں ہماری شریعت کیا رہنمائی کرتی ہے؟

[لڑکی والوں کی طرف سے اس بات کا انتظار کرنا کہ دوسری طرف سے پہل ہو ایک فطرتی بات ہے لیکن اسے حد سے بڑھانا کسی طور پر مناسب نہیں۔ اگر کسی کی لڑکی جوان اور شادی کے قابل ہوچکی ہے اور اسے کوئی مناسب رشتہ نظر آتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ خود یا کسی کے ذریعے پیغام نکاح میں ابتداء کرے۔

چنانچہ امام بخاری a نے ایک عنوان بایں طور پر قائم کیا ہے:

((باب عرض الانسان ابنتہٗ او اختہ علی اہل الخیر))

''کسی انسان کا اپنی بیٹی یا بہن کا رشتہ اہل خیر سے پیش کرنا۔'' 2

پھر سیدنا عمر t کا واقعہ بیان کیا ہے کہ جب ان کی دختر سیدہ حفصہ r بیوہ ہوگئیں تو انہوں نے ان کا رشتہ حضرت عثمان t کو پیش کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں اس معاملہ میں غور وفکر کروں گا، آخر کار انہوں نے جواب دیا تو سیدنا عمر t نے سیدنا ابوبکر t سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو میں اپنی بیٹی حفصہ r کا تم سے نکاح کردوں؟

سیدنا ابوبکر t خاموش رہے اور انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ سیدنا عمر t کہتے ہیں کہ مجھے ان کے عدم التفات کی وجہ سے سیدنا عثمان t کی نسبت زیادہ غصہ آیا۔ ابھی چند دن گزرے ہوں گے کہ خود رسول اللہ e نے سیدہ حفصہ r سے نکاح کا پیغام بھیج دیا تو میں نے آپ سے اپنی بیٹی حفصہ کا نکاح کردیا۔ 3

اسی طرح سیدہ ام حبیبہ r نے بھی اپنی بہن کا رشتہ از خود رسول اللہ e کو پیش کیا تھا تاکہ ان کی بہن بھی ان کے ساتھ خیر وبرکت میں شریک ہو، اس پر آپ e نے فرمایا کہ

! صحیح مسلم، النکاح: ۳۵۴۲. @ بخاری، النکاح، باب نمبر ۳۴.

بخاری، النکاح: ۵۱۲۲.

''تم اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح کرنے کی پیشکش مجھے نہ کیا کرو۔'' 1

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اگر لڑکی والوں کی طرف سے رشتے کی پیش کش کوئی ذلت یا رسوائی کا باعث ہوتی تو رسول اللہ e منع فرما دیتے، لہٰذا اس سلسلہ میں اعتدال کو برقرار رکھنا چاہیے۔ اگر مناسب رشتہ نظر آتا ہے تو خود یا کسی کے ذریعے اس کی پیش کش کی جا سکتی ہے، شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی ذلت ہے۔ واللہ اعلم!

ولادت کے وقت بیوی کو تحفہ دینا

] میری دو بیویاں ہیں، کسی بیوی کے ہاں بچے کی پیدائش پر میں اسے تحفہ دیتا ہوں، تو کیا میرے لیے ضروری ہے کہ میں دوسری بیوی کو بھی اس طرح کا تحفہ دوں تا کہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہوں؟ اس سلسلہ میں شریعت کیا حکم دیتی ہے؟

[جس شخص کی دو یا زیادہ بیویاں ہیں تو ان کے درمیان عدل و انصاف کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے، اگر وہ اس میں کوتاہی کرتا ہے تو قیامت کے دن اس کے متعلق باز پرس ہوگی۔

اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ میلان رکھتا ہو تو وہ قیامت کے دن ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو مفلوج ہوگا۔'' 2

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری معاشرتی برتاؤ میں کمی کوتاہی نہ کرے۔ البتہ قلبی میلان اگر کسی طرف زیادہ ہے تو امید ہے کہ اس پر باز پرس نہیں ہوگی۔

صورت مسئولہ میں اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہیں تو ان میں سے اگر ایک بچہ جنم دیتی ہے تو اسے تحفہ دیا جا سکتا ہے اور ایسے حالات میں دوسری کو تحفہ دینا ضروری نہیں۔ کیوں کہ جب اس کے ہاں بچہ پیدا ہوگا تو اسے بھی تحفہ دیا جائے گا اور اس وقت دوسری کو کچھ نہیں ملے گا۔ البتہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ تحفہ دینے میں مساوات کرنا ضروری ہے۔ یعنی تحائف میں برابری ہونی چاہیے، لیکن اگر وہ سمجھتا ہے کہ دوسری کو تحفہ نہ دینے میں شر و فساد کا اندیشہ ہے جیسا کہ عورتوں میں رقابت کے جذبات پائے جاتے ہیں تو پھر دونوں کو تحفہ دے تا کہ آئندہ زندگی میں کوئی مشکل کا شکار نہ ہو، ایسا کرنے سے محبت یگانگت بھی پیدا ہوگی اور تالیف قلب کا اظہار بھی ہوگا۔ واللہ اعلم!

عورتوں کی پہلی صف

] میں نے ایک حدیث میں پڑھا ہے کہ عورتوں کی بہترین صف آخری اور بدترین پہلی ہے، اس کا کیا مطلب ہے، کیوں کہ احادیث میں تو صف اول کی اہمیت بیان ہوئی ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

[جس حدیث کا سوال میں حوالہ دیا گیا ہے، اس کا مکمل متن حسب ذیل ہے، رسول اللہ e نے فرمایا: ''مردوں

! بخاری، النکاح: ۵۱۰۱. @ مسند احمد، ج۲،ص۴۷۱.

کی پہلی صف بہترین صف ہے اور کم تر آخری صف، نیز عورتوں کی بہترین صف وہ ہے جو سب سے آخر میں ہو اور کم تر وہ ہے جو پہلی ہو۔ 1

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مردوں کے لیے نمازوں کے لیے گھروں سے باہر نکلنا مطلوب ہے، اس لیے ان کے لیے صف اول میں جگہ پانا زیادہ فضیلت کا باعث ہے مگر عورتوں کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ اپنے گھروں میں ٹکی رہیں تاہم نماز کے لیے ان کا مسجد میں آنا جائز ہے تو عورت عین وقت پر گھر سے نکلتی ہے اور کم از کم وقت گھر سے باہر گزارتی ہے اسے اجر وفضیلت کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ ایسی عورت میں آخری صفوں میں جگہ پاتی ہے اور جو عورت پہلے آتی ہے اور عورتوں کی صف اول میں جگہ پاتی ہے وہ زیادہ وقت گھر سے باہر رہتی ہے، اس لیے اجر وفضیلت کے اعتبار سے اسے کمتر قرار دیا گیا ہے۔ نیز مردوں کی آخری صف، عورتوں سے قریب ہوتی ہے اور عورتوں کی پہلی صف مردوں کے قریب ہوتی ہے، اس لیے بھی ان دونوں صفوں کو کمتر درجے کی صف قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ مردوں کی پہلی صف اور عورتوں کی آخری صف ایک دوسرے سے دور ہوتی ہے، اور وہاں توجہ بٹنے کا اندیشہ نہیں ہوتا، اس لیے ان کا اجر زیادہ ہے۔

یہ اس صورت میں ہے جب مرد اور عورتیں اکٹھے نماز ادا کر رہے ہوں، لیکن جب عورتوں کی صفیں مردوں سے دور ہوں یا کسی دیوار کی وجہ سے مردوں سے الگ ہوں تو اس صورت میں راجح یہ ہے کہ عورتوں کی پہلی صف کو آگے ہونے اور قبلہ سے زیادہ قریب ہونے کی بناء پر افضل قرار دیا جائے جیسا کہ احادیث میں صف اول کی فضیلت آئی ہے۔ واللہ اعلم!

شادی کے بعد اپنی تعلیم مکمل کرنا

] جب میری شادی ہوئی تو میں میٹرک میں زیر تعلیم تھی، نکاح کے وقت یہ شرط طے پائی تھی کہ مجھے کم از کم ایف اے تک تعلیم مکمل کرنا ہوگی اور اب مجھے اس کی اجازت نہیں دی جا رہی، اس سلسلہ میں شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

[قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ e کی متبادل بیویوں کے جو اوصاف بیان کیے ہیں ان کا تعلق اخلاق و کردار سے ہے، تعلیم و تعلم سے نہیں، وہ اوصاف یہ ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓىِٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓىِٕحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا۰۰﴾ 2

”بعید نہیں کہ اگر نبی تم سب بیویوں کو طلاق دے دے تو اللہ اسے ایسی بیویاں تمہارے بدلے میں عطا فرما دے جو تم میں سے بہتر ہوں، سچی مسلمان، با ایمان، اطاعت گزار، توبہ گزار، عبادت گزار اور روزہ دار ہوں۔“

درج بالا تمام اوصاف کا تعلق کردار سے ہے اور یہی ایک نیک بیوی کا زیور ہے جس سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا چاہیے، باقی رہا نکاح کے وقت شرط، شرائط کا معاملہ اگر وہ کتاب وسنت سے متصادم نہیں ہیں تو ان کا پورا کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ

! ابو داؤد، الصلوٰۃ:۶۷۸۔ @ تحریم:۵۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

’’جن شرائط کے نتیجہ میں تم نے عورتوں کی شرمگاہوں کو حلال ٹھہرایا ہے۔انہیں پورا کرنا لائق تر ہے۔‘‘ 1

اس حدیث کے پیش نظر جب نکاح کے موقع پر تکمیل تعلیم کی شرط لکھی گئی تھی اور خاوند نے اس پر برضاو رغبت قبول کیا ہے تو اسے پورا کرنا ضروری ہے، کیوں کہ یہ شرط کتاب وسنت سے متصادم نہیں۔ اگر خاوند اس شرط کو پورا نہیں کرتا تو عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے۔ تاہم اس سلسلہ میں ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اس طرح کی معمولی باتوں کو خاندانی اختلاف کا باعث نہیں بنانا چاہیے، ایسے مسائل کو آپس میں مل بیٹھ کر حل کیا جا سکتا ہے۔ بہتر تعلیم ایک زیور ہے لیکن کردار، اس سے زیادہ خوبصورت زیور ہے۔ اخلاق وکردار کے ساتھ مرد وزن کو آراستہ ہونا چاہیے اور علم کی برتری بھی صرف اس لیے ہے کہ وہ عمل وکردار کا پیش خیمہ ہو۔ واللہ اعلم!

اجنبی عورت سے بات کرنا

] اجنبی عورتوں سے بات کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ بوقت ضرورت اگر ان سے بات کرنا پڑے تو اس کی کیا حدود وشرائط ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[دین اسلام میں ہر اس کام سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے جو حرام کی طرف لے جائے یا اس کے قریب کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری روحانی ماؤں کے متعلق فرمایا ہے:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾ 2

’’اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم پرہیزگاری اختیار کرو تو نرم لہجے سے بات نہ کرو، مبادا جس کے دل میں روگ ہو، وہ کوئی برا خیال کرے، ہاں قاعدہ کے مطابق گفتگو کرو۔‘‘

اس طرح کی دیگر آیات کے پیش نظر اہل علم نے اجنبی عورت سے بات چیت کرنے کے کچھ ضوابط بیان کیے ہیں تاکہ فتنہ وفساد کا سد باب ہو، وہ شرائط حسب ذیل ہیں:

- ☆ مرد، اجنبی عورت تک اس کے محرم یا پھر اپنی محرم عورت کے ذریعے بات نہ پہنچا سکتا ہو۔
- ☆ یہ گفتگو خلوت وتنہائی میں نہ ہو تاکہ کسی فتنے میں مبتلا نہ ہو جائیں۔
- ☆ بات چیت کسی جائز اور مباح کام کے لیے ہو، فضول اور بے فائدہ کام کے لیے نہ ہو۔
- ☆ باہمی کلام کرنے سے کسی فتنے کا اندیشہ نہ ہو۔
- ☆ عورت کی طرف سے گفتگو میں نرم اور لوچ دار لب ولہجہ نہ ہو۔

! بخاری، النکاح: ۵۱۵۱.   @ الاحزاب: ۳۲.

☆ گفتگو کے دوران عورت اپنی چادر اور چاردیواری کے تحفظ کا پورا خیال رکھے۔

☆ یہ بات چیت حسب ضرورت ہو، ضرورت سے زیادہ کسی صورت میں نہ ہو۔

ان شرائط وضوابط کی پابندی کرنے کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی نصیحت کرتے ہیں کہ ایک مسلمان کو فتنے میں مبتلا کر دینے والے اسباب سے بچ کر رہنا چاہیے اور اس سلسلہ میں انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ واللہ اعلم!

بیوی کے معاملات میں غیر شوہر کی مداخلت

] شریعت میں خاوند کے چھوٹے بڑے بھائیوں کے کیا حقوق ہیں، جن کا پورا کرنا مجھ پر لازم ہے۔ کیا وہ میرے کمرے میں اجازت کے بغیر آ جا سکتے ہیں؟ نیز انہیں اس بات کی اجازت ہے کہ میری ازدواجی زندگی میں دخل اندازی کریں؟ اس سلسلہ میں بہت پریشان ہوں، میری رہنمائی کریں۔

[اللہ تعالیٰ نے شادی کے بعد بیوی پر خاوند کا حق اور اس کی اطاعت واجب کی ہے، اور بیوی پر خاوند کی نافرمانی حرام ہے، خاوند کے چھوٹے بہن بھائیوں کا حق یہ ہے کہ ان پر دست شفقت رکھیں، ان کی ضروریات کا خیال رکھیں، البتہ بڑے بھائیوں سے شرعی پردہ کریں، ان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بڑے بھائی کی بیوی سے بدسلوکی کریں اور اس کے کمرے میں بلا اجازت گھس آئیں یا اس کی ازدواجی زندگی میں مداخلت کریں۔ بلکہ ان کے لیے ضروری ہے کہ محرم کی موجودگی کے بغیر کمرے میں نہ آئیں تاکہ غیر محرم کے ساتھ خلوت نہ ہو سکے، کیوں کہ اس قسم کی خلوت حرام اور ناجائز ہے۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''تم عورتوں کے پاس جانے سے احتراز کرو، ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ! ادیور کے متعلق کیا حکم ہے؟ آپ e نے فرمایا کہ دیور تو موت ہے۔'' 1

''دیور تو موت ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں سے زیادہ اس کا فتنے میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے اس لیے کہ عورت کے پاس جانا اور اس سے خلوت کرنا اس کے لیے دوسروں کی نسبت آسان اور ممکن ہے اور اس کے گھر میں ہونے کی وجہ سے اس پر کوئی انکار بھی نہیں کرتا۔ لیکن اگر اجنبی ہو تو اس کے لیے یہ ممکن نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ حدیث میں ''حمو'' کا لفظ آیا ہے، اس سے مراد خاوند کے آباؤ اجداد اور اولاد و احفاد کے علاوہ دوسرے رشتہ دار بھی ہیں۔ مثلاً بھائی، بھتیجے، چچا اور چچا کے بیٹے وغیرہ ان سب کے لیے جائز نہیں کہ وہ ازدواجی تعلقات میں مداخلت کریں یا آپ اور آپ کے خاوند کے مخصوص معاملات میں دخل اندازی کریں۔ ہاں اگر یہ حضرات کسی شرعی کام کا کہیں یا غیر شرعی کام سے بچنے کا کہیں تو ان کی بات کو ماننا ضروری ہے، خواہ وہ قریبی رشتہ دار ہو یا کوئی دوسرا۔

بہر حال بیوی پر خاوند کی اطاعت اور فرمانبرداری ضروری ہے اور خاوند کے وہ رشتہ دار جو اس کی بیوی کے لیے غیر محرم کی

! بخاری، النکاح: ۵۲۳۲.

حیثیت رکھتے ہیں ان سے پردہ کرنا بھی ضروری ہے بشرطیکہ وہ حد بلوغ کو پہنچ جائیں اور ایسے غیر محرم رشتے داروں کو چاہیے کہ وہ گھر میں آئیں تو اجازت لے کر آئیں، اگر کوئی چیز لینا ہو تو پردے کی اوٹ سے لیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے احکامات ہیں جن پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں ان پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ (آمین!)

لمبے ناخن رکھنا

] میں نے شوقیہ طور پر اپنے بائیں ہاتھ کے ناخن بڑھا رکھے ہیں، کیا ایسا کرنا گناہ ہے۔ ایسے لمبے ناخنوں کی موجودگی میں نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[ہمارا دین اسلام، دین فطرت ہے، کیوں کہ یہ انسان کے فطری تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ مونچھیں کترانے، داڑھی بڑھانے، مسواک کرنے، وضو کرتے وقت ناک میں پانی چڑھانے، کلی کرنے، ختنے کرانے، ناخن تراشنے، زیر ناف بال مونڈنے، بغلوں کی صفائی کرنے، استنجاء کرنے اور بدن کی مختلف ہڈیوں کے جوڑ دھونے کو اسلام نے امور فطرت میں شمار کیا ہے۔ گویا ان کی صفائی کا اہتمام، انسانی طبع کا تقاضا ہے اور ان میں سستی کا مظاہرہ گندگی پھیلانے کا باعث ہے۔ ان امور فطرت میں ناخن کاٹنا بھی شامل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ناخن نجاست اور میل کچیل کو جمع رکھنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں، اس لیے انہیں تراشنے اور صاف رکھنے کا حکم ہے۔ ناخن بڑھے ہوئے ہوں تو دیکھنے میں بھی برے لگتے ہیں۔ لمبے ناخن رکھنا، انسانی فطرت سے بغاوت اور انبیاء o کی سنت سے روگردانی کرنا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی انسان غیر ضروری بالوں کی صفائی کرنا چھوڑ دے، ہاتھ منہ کو بھی نہ دھوئے۔ ناخن بڑھانا انسانی شیوہ نہیں بلکہ حیوانی خصلت ہے، اس لیے شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ رسول اللہ e کا حکم گرامی ہے:

''پانچ چیزیں فطری ہیں، مونچھوں کا کاٹنا، بغلوں کے بال اکھیڑنا، ناخن تراشنا، بال صاف کرنا اور ختنہ کرنا۔'' 1

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین شکل و صورت میں پیدا کیا ہے، حیوانات کے ساتھ اس کی مشابہت اللہ تعالیٰ کو انتہائی ناپسند ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ بڑے ناخن کسی کو یا اپنے آپ کو زخمی کر سکتے ہیں۔ اس لیے فطرت سلیمہ کا تقاضا ہے کہ انہیں بڑھایا نہ جائے بلکہ زائد ناخن تراش دیئے جائیں۔ شریعت نے ان فطری امور کے لیے زیادہ سے زیادہ چالیس دن مقرر فرمائے ہیں۔

چنانچہ حضرت انس t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے ان فطری امور کی صفائی کے لیے یہ مدت مقرر کی ہے کہ ہم چالیس دن سے زیادہ نہ گزرنے دیں۔ 2

بدذوقی کی انتہاء یہ ہے کہ آج کل بازار سے مصنوعی ناخن لے کر ان پیدائشی ناخنوں کے ساتھ لگا دیئے جاتے ہیں، تاکہ دیکھنے میں زیادہ لمبے نظر آئیں۔ بہرحال شریعت نے انہیں کاٹنے کا حکم دیا ہے، اگر صفائی کا خیال رکھا جائے تو لمبے ناخنوں کی موجودگی میں نماز تو ہو جائے گی لیکن ناخن بڑھانے کا گناہ اپنی جگہ پر قائم رہے گا جو ایک مسلمان کے شایان شان نہیں۔

! نسائی، الطہارۃ: ۱۰۔ @ مسلم، الطہارۃ: ۲۵۸۔

کھانے کے وقت تسمیہ

] کھانا وغیرہ کھاتے وقت ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' پڑھنا چاہیے یا صرف ''بسم اللہ'' ہی کافی ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن وحدیث میں کیا صراحت ہے، وضاحت سے لکھیں۔

[ہمیں شریعت نے اس امر کا پابند کیا ہے کہ ہر کام کرتے وقت، اللہ کا نام لیا جائے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ اللہ کے نام کی برکت سے وہ کام بھی بابرکت ہوجاتا ہے۔

چنانچہ سیدنا عمر بن ابی سلمہ t سے روایت ہے کہ انہیں رسول اللہ e نے فرمایا تھا: ''کھانا کھانے کے آغاز میں اللہ کا نام لو، دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔'' 1

لیکن ہمارے رجحان کے مطابق پہلا معنی یعنی ''بسم اللہ'' کہنا ہی درست ہے کیوں کہ اس حدیث کو ایک دوسری روایت میں اس امر کی صراحت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''بچے! جب تم کھانا کھاؤ تو بسم اللہ کہو۔'' 2

علامہ البانی a اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''دوسری روایات میں جو اطلاق تھا، اس کی وضاحت اس روایت میں ہے، کھانے کے وقت اللہ کا نام لینے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ صرف ''بسم اللہ'' کہا جائے، جس کی تائید حدیث نمبر ۱۹۶۵ سے بھی ہوتی ہے، اس بات کو اچھی طرح یاد کرلو کیوں کہ یہ ان لوگوں کے نزدیک انتہائی اہمیت کی حامل ہے جو سنت کی تکریم کرتے ہیں اور اس پر کسی قسم کے اضافے کو جائز خیال نہیں کرتے۔'' 3

سیدہ عائشہ r سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''تم میں سے جب کوئی کھانا کھائے تو بسم اللہ کہے۔ اگر ابتداء میں کہنا بھول جائے تو یاد آنے پر ''بِسْمِ اللہِ اَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ'' کہے۔ 4

حافظ ابن حجر a لکھتے ہیں کہ تسمیہ کے طریقہ کے متعلق صریح ترین روایت یہی ہے۔ 5

ان احادیث وآثار کا تقاضا ہے کہ کھانے کے آغاز میں ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کی بجائے ''بسم اللہ'' کہنے پر اکتفاء کیا جائے۔ واللہ اعلم!

تجارت کے بغیر کسی کے گھر سے کھانا

] سورت نساء کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارت کے بغیر کسی کے گھر سے کھانا پینا باطل طریقہ سے کھانا ہے، اس کا کیا مطلب ہے، کیا تجارت کے علاوہ اگر کوئی دعوت کرتا ہے، تو اسے قبول نہیں کرنا چاہیے؟

[سوال میں جس آیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ حسب ذیل ہے:

! مرقاۃ: ج۴،ص۳۶۰۔ @ طبرانی کبیر، ج۹،ص۱۴۔

ارواء الغلیل، ج۷، ص۳۱۔ $ مسند امام احمد، ج۶،ص۲۰۸۔

%فتح الباری، ج۶، ص۵۲۱۔

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ ﴾ 1

''ایمان والو! تم اپنے مال آپس میں باطل طریقہ سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تمہاری آپس کی رضامندی سے تجارت ہو۔''

اس آیت کریمہ کے نازل ہونے کے بعد بعض صحابہ کرام y نے یہی خیال کیا تھا کہ تجارت کے بغیر کسی کے ہاں کھانا باطل طریقہ سے کھانا ہے، یعنی ایسا کھانا ناجائز ہے۔

جیسا کہ حضرت ابن عباس W کا بیان ہے: ''جب یہ آیت اتری تو لوگ (صحابہ کرام) ایک دوسرے کے ہاں کھانا کھانے میں حرج محسوس کرنے لگے تھے۔'' 2

لیکن ایسی بات نہیں کیوں کہ مذکورہ آیت میں تو ناجائز طریقوں سے ایک دوسرے کا مال غصب اور ہڑپ کرنا بیان کیا گیا ہے۔، کھانا کھانے کا ذکر نہیں۔

چنانچہ ایک دوسری آیت میں اس کی مزید وضاحت ہے: ''تم پر کوئی حرج نہیں کہ اپنے گھروں سے کھانا کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا ان گھروں سے جن کی چابیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوستوں کے گھروں سے۔'' 3

اس آیت نے وضاحت کر دی ہے کہ تم تجارت کے بغیر بھی ایک دوسرے کے گھر سے کھانا کھا سکتے ہو اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس میں صرف یہ شرط ہے کہ وہ کھانا حلال ہو اور اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اسی طرح اگر کوئی دعوت کرتا ہے، تو اس کی دعوت کو قبول کرنے اور اس کے ہاں کھانا تناول کرنے میں چنداں حرج نہیں۔ (واللہ اعلم)

ربیبہ کا محرم

] ایک آدمی نے کسی عورت سے نکاح کیا جبکہ پہلے خاوند سے ایک لڑکی بھی اس عورت کے ہمراہ تھی، اب میاں بیوی عمرہ کرنا چاہتے ہیں، کیا پہلے خاوند کی لڑکی ان کے ہمراہ عمرہ کے لیے جا سکتی ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[محرم کے بغیر عورت کو سفر کی اجازت نہیں۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''کوئی بھی عورت محرم کے بغیر ہرگز سفر نہ کرے۔'' 4

اہل علم نے محرم کے لیے پانچ شرائط بیان کی ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ مرد ہو، ۲۔ مسلمان ہو، ۳۔ بالغ ہو، ۴۔ عاقل ہو، ۵۔ وہ اس عورت پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو۔

وہ رشتہ دار جن سے وقتی طور پر نکاح حرام ہے، وہ عورت کے محرم نہیں بن سکتے مثلاً بہنوئی اور خالو وغیرہ۔ لہٰذا عورت کا

! النساء: ۲۹.
@ ابو داؤد، الاطعمہ؛۳۷۵۳.
# النور: ۶۱.
$بخاری، الجہاد: ۳۰۰۶.

ایسے رشتہ داروں کے ہمراہ سفر کرنا جائز نہیں۔ صورت مسئولہ میں عورت کے پہلے خاوند کی لڑکی حالیہ خاوند کی ربیبہ ہے جس سے اس کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ١٘ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ١٘﴾ 1

''اور (تم پر حرام ہیں) تمہاری وہ پرورش کردہ لڑکیاں جو تمہاری گود میں ہیں، تمہاری ان عورتوں سے جن سے تم ہم بستری کر چکے ہو، ہاں اگر تم ان سے ہم بستری نہیں کی تو پھر تم پر کوئی گناہ نہیں۔''

اس مقام پر قرآن مجید میں ''ربیبہ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ربیبہ، بیوی کی اس بیٹی کو کہتے ہیں جو پہلے خاوند سے ہو۔ اس کے حرام ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ خاوند اس بیوی سے وظیفہ زوجیت ادا کر چکا ہو، بصورت دیگر صرف نکاح کرنے سے وہ اس پر حرام نہیں ہوگی۔ بہرحال ''ربیبہ'' محرمات سے ہے اور اس کی ماں کا خاوند، اس کا محرم بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ خاوند نے ربیبہ کی ماں سے ہم بستری کر لی ہو۔ ربیبہ سے نکاح حرام ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ e کو کسی زوجہ محترمہ نے کہا کہ آپ حضرت ام سلمہ r کی بیٹی جو ابوسلمہ r سے ہے، اس سے نکاح کرنا چاہتے ہیں، تو آپ نے فرمایا تھا: ''وہ تو میری ربیبہ ہے، اس سے میں کیونکر نکاح کر سکتا ہوں۔ اگر وہ ربیبہ نہ بھی ہوتی تب بھی وہ میرے لیے حرام تھی کیوں کہ اس کے باپ ابوسلمہ کو اور مجھے ثوبیہ نے دودھ پلایا ہے۔'' 2

چونکہ ربیبہ سے نکاح حرام ہے اور آدمی اپنی ربیبہ کا محرم بن سکتا ہے، اس بناء پر اگر میاں بیوی دونوں عمرہ پر جانا چاہتے ہیں تو ان کے ہمراہ منکوحہ کی بیٹی جو خاوند کی وجہ سے ہے عمرہ پر جا سکتی ہے۔ شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔ واللہ اعلم!

منہ بولے بھائی سے پردہ

] ہم چھ بہنیں ہیں، ہمارا کوئی بھائی نہیں، والد محترم نے اپنا بھتیجا لے کر اس کی پرورش کی۔ اب وہ جوان ہے، وہ ہمارے ہاں بھائیوں کی طرح رہا، کیا ہمیں اس سے پردہ کرنا ہوگا۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہم بہنوں کے لیے کیا حکم ہے؟

[عرب معاشرہ میں ہمیں یہ رواج تھا کہ جسے منہ بولا بیٹا بنا لیا جاتا اسے اپنے حقیقی بیٹے کی مانند قرار دیا جاتا تھا، اسے وراثت میں حصہ دیا جاتا تھا اور نقلی باپ کے نام سے ولدیت لکھی جاتی۔ اس رسم کی اصلاح ضروری تھی، چنانچہ اس سلسلہ میں قرآنی آیات نازل ہوئیں تو متعدد مشکلات سامنے آئیں، اس سلسلہ میں ایک واقعہ کتب حدیث میں منقول ہے۔

حضرت عائشہ r بیان کرتی ہیں کہ حضرت حذیفہ t نے حضرت سالم t کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا اور حضرت سالم t ایک انصاری عورت کے آزاد کردہ غلام تھے، جب یہ آیات نازل ہوئیں: ''ان منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کے نام سے پکارا کرو، اللہ کے ہاں یہی انصاف کی بات ہے۔'' 3

! النساء:٢٣. @ بخاری، النکاح:٥١٠٦. # الاحزاب: ٥.

ان آیات کے نزول کے بعد حضرت حذیفہ کی بیوی سہلہ بنت سہیل رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ! سالم کو ہم نے اپنے بچوں کی طرح پالا ہے وہ ہمارے ہاں گھر میں رہا کرتا تھا اور مجھے گھریلو لباس میں دیکھا کرتا تھا اب اِس کے متعلق قرآنی آیات نازل ہوئی ہیں۔ ہمارے لیے مسئلہ بنا ہوا ہے، رسول اللہ a نے فرمایا: تم اسے پانچ مرتبہ دودھ پلا دو وہ تمہاری اولاد کی طرح ہو جائے گا۔ 1

صورت مسئولہ میں بھی اسی طرح کا پیچیدہ مسئلہ ہے، چاہیے تھا کہ اسے دودھ پلا کر اپنا رضاعی بیٹا لیا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ ایسے حالات میں شریعت کا ضابطہ یہ ہے: خاوند کا بھتیجا جب بالغ ہو جائے تو بیوی کو اس سے پردہ کرنا ہوگا، اسی طرح خاوند کی بیوی کو بھی اس سے پردہ کرنا ہوگا، اس کے گھر میں رہنے سے کئی ایک دوسری مسائل بھی بن سکتے ہیں۔ اب اس کا حل یہ ہے کہ کسی بیٹی کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا جائے اور ان کے لیے الگ کسی مکان میں رہنے کا بندوبست کر دیا جائے، اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

ایک معاشرتی برائی

] ہمارے ہاں کچھ خاندان ایسے ہیں، جو اپنی بیٹیوں کو غیر محرم مردوں کے سامنے جانے، ان سے بات چیت کرنے کی اجازت دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہمارے دل صاف ہیں، شرم وحیا تو دل میں ہوتا ہے، اس قسم کے کردار کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

[شریعت میں ایسا کرنا سخت منع ہے، جس خاندان میں یہ رواج ہے کہ ان کی عورتیں غیر محرم مردوں کے ساتھ کھلے عام بات کرتی ہیں، انہیں اس اقدام سے باز رہنا چاہیے، غیر محرم مردوں کے سامنے اپنے بدن یا کپڑوں کی نمائش کسی صورت میں جائز نہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ 2

''آپ مسلمان خواتین سے کہہ دیں، کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، نیز اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جو ظاہر ہو۔''

اس آیت کا تقاضا ہے کہ عورت کسی بھی غیر محرم کے سامنے اپنی زینت کو ظاہر نہیں کر سکتی۔ باقی رہا دلوں کی صفائی کا معاملہ تو اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ﴾ 3

''جب تم نبی کریم e کی بیویوں سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کے پیچھے سے طلب کرو، تمہارے اور ان کے

! مسند امام احمد، ص: ۷۰۱. ج: ۶. @ النور:۳۱.

الاحزاب:۵۳.

دلوں کے لیے کامل پاکیزگی یہی ہے۔‘‘

اس آیت کریمہ میں دلوں کی پاکیزگی اس امر کو قرار دیا گیا ہے کہ پردہ کیا جائے اور اس کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے مرد اور عورت دونوں کے دل ریب وشک سے اور ایک دوسرے کے ساتھ فتنے میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہیں گے، ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم e کو حکم دیا ہے۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ﴾ 1

’’کہ اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر چادریں لٹکا لیا کریں، اس سے بہت جلد ان کی شناخت ہو جایا کرے گی پھر وہ ستائی نہ جائیں گی۔‘‘

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پردے کا حکم علماء کا ایجاد کردہ نہیں جیسا کہ آج کل بعض لوگ باور کراتے ہیں یا اس پردے کو قرار واقعی اہمیت نہیں دیتے۔ جیسا کہ سوال میں بعض خاندانوں کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے بلکہ پردہ کرنا اللہ کا حکم ہے اور قرآن کریم کی واضح نص سے ثابت ہے، اس سے اعتراض، انکار اور بے پردگی پر اصرار انسان کو کفر تک پہنچا سکتا ہے۔ افسوس کہ دور حاضر میں بے پردگی عام ہو گئی ہے بلکہ عورتیں عریانی اور نیم برہنگی کو تہذیب کی علامت قرار دے کر اس پر فخر کرتی ہیں۔ بہر حال ہمیں ہر حالت میں شریعت کی پابندی کرنا چاہیے۔ خاندانی روایات کی قرآن وحدیث کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔ (واللہ اعلم)

سالگرہ منانا اور کیک کاٹنا

] بچے کی پیدائش کے بعد جب اس کی ولادت کا دن دوبارہ آتا ہے تو سالگرہ منائی جاتی ہے، اس موقع پر سالگرہ کا کیک کاٹا جاتا ہے اور تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا ہے۔ خوشی ومسرت کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کے متعلق شرعی حیثیت واضح کریں۔

[اہل اسلام کے ہاں اس انداز سے سالگرہ منانا مستحسن امر نہیں ہے، یہ سالگرہ جواز کی نسبت بدعت کے زیادہ قریب ہے، مغربی لوگ اس طرح سے سالگرہ مناتے ہیں اور کیک وغیرہ کاٹتے ہیں۔ مسلمان کو ایسے مواقع پر اہل مغرب کی مخالفت کا حکم ہے۔ اگر کوئی اس کا اہتمام ثواب سمجھ کر کرتا ہے تو اس کے ناجائز ہونے میں کوئی شک نہیں۔ کیوں کہ رسول اللہ e نے بچوں کی ولادت یا آئندہ یوم ولادت کے وقت سالگرہ منانے کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔ لہٰذا ہمیں بھی ایسے کاموں سے اجتناب کرنا چاہیے جنہیں رسول اللہ e کے بعد تین افضل صدیوں میں نہیں کیا گیا۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جو اس میں سے نہ ہو تو وہ مردود ہے۔‘‘ 2

ایک حدیث بایں الفاظ منقول ہے:

! الاحزاب:۵۹.   @ صحیح بخاری، الصلح:۲۶۹۷.

’’جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کے بارے میں ہمارا امر نہ ہوتو وہ بھی مردود ہے۔‘‘ 1

بہرحال بچوں کی سالگرہ کو اگر دینی رنگ نہ بھی دیا جائے تو بھی مغربی تہذیب سے تعلق کی بناء پر اسے اختیار کرنا اور اس کے متعلق خصوصی اہتمام کرنا ایک مسلمان کی شان کے خلاف ہے۔(واللہ اعلم)

گھر میں ضرورت سے زیادہ بستر رکھنا

] میں نے ایک حدیث میں پڑھا ہے کہ گھر میں تین بستر ہونے چاہیے اگر کسی گھر میں چوتھا بستر ہوتو وہ شیطان کے لیے ہے جبکہ بعض اوقات گھر میں بستروں کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، ایسے حالات میں مذکورہ حدیث کا مفہوم کیا ہے؟ وضاحت کریں۔

[سوال میں ذکر کردہ حدیث کا متن اس طرح ہے:’’ایک بستر آدمی کے لیے، ایک بستر اس کی بیوی کے لیے، تیسرا مہمان کے لیےاور چوتھا شیطان کے لیے ہے۔‘‘ 2

اس حدیث پر امام نووی a نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:’’ضرورت سے زائد لباس اور بستر رکھنا مکروہ ہے۔‘‘

ہمارے رجحان کے مطابق اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ غیر ضروری بستر رکھنے کی ممانعت ہے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں نکاح کے موقع پر سینکڑوں کی تعداد میں گرمی اور سردی کے بستر بیٹی کو جہیز میں دیئے جاتے ہیں۔ یہ محض نمود ونمائش اور اسراف وتبذیر ہے، اتنے ڈھیروں بستر غیر ضروری ہے۔ ہاں جس کے بغیر گزارا ہی نہیں مثلاً سردی گرمی سے بچاؤ کے لیے اشیاء رکھنا، اس کی قطعاً ممانعت نہیں۔ ایک گھر میں افراد زیادہ ہیں یا بچوں کی کثرت ہے تو ان کی ضرورت کے لیے تین سے زیادہ بستر رکھے جا سکتے ہیں۔بعض ایسے گھر بھی ہوتے ہیں جہاں بکثرت مہمان آتے ہیں، ایسے گھر میں بھی بستر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ ناگہانی طور پر انہیں استعمال کیا جا سکے۔بعض اوقات کسی پڑوسی کو بھی بستر کی ضرورت پڑسکتی ہے، اسے بھی دیا جا سکتا ہے۔ بہرحال حدیث میں غیر ضروری بستر رکھنے کی کراہت کا ذکر ہے۔جیسا کہ امام نووی a نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بہرحال ضرورت کے لیے تین سے زیادہ بستر رکھے جا سکتے ہیں، لیکن ضروریات کو بنیاد بنا کر فضولیات کا دروازہ نہ کھولا جائے۔ گھر میں ضرورت سے زیادہ بستر رکھنا ہی شیطانی حرکت ہے جس کی طرف حدیث میں واضح اشارہ کیا گیا ہے۔ بہرحال اہل خانہ اس بات کا خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ انہیں کتنے بستروں کی ضرورت ہے، سردی اور گرمی کے اعتبار سے ان میں کمی بیشی بھی ہوسکتی ہے۔(واللہ اعلم)

کیا سابقہ سسر محرم ہے؟

] میرے خاوند نے مجھے طلاق دے دی ہے، ایسے حالات میں میرے سسر کی کیا حیثیت ہے؟ کیا مجھے اس سے پردہ کرنا چاہیے یا وہ بدستور میرا محرم رہے گا؟ کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا وضاحت ہے؟

! صحیح مسلم، الاقضیہ:۱۷۱۸۔ @ مسلم، اللباس:۲۰۸۴۔

[قرآن کریم نے محرمات کے ذکر میں فرمایا ہے:

﴿وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ﴾ 1

''تم پر حرام ہیں تمہارے حقیقی بیٹوں کی بیویاں۔''

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ صرف عقد نکاح سے خاوند کا باپ اپنی بہو کا محرم بن جاتا ہے، اور اس سے کسی صورت میں نکاح نہیں ہوسکتا، خواہ خاوند نے اسے طلاق ہی کیوں نہ دے دی ہو۔ علمائے کرام نے نکاح کی وجہ سے درج ذیل عورتوں کو حرام قرار دیا ہے:

☆ جس سے والد نے نکاح کرلیا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ 2

''ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے آباؤ اجداد نے نکاح کیا ہو۔''

بیوی کی والدہ:...... داماد کے لیے اس کی خوش دامن حرام ہو جاتی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ﴾ 3

''اور تم پر حرام ہیں تمہاری بیویوں کی مائیں۔''

☆ ربیبہ:...... بیوی کی پہلے خاوند سے پیدا ہونے والی لڑکی، یہ اس وقت حرام ہوگی جب مرد نے اس کی ماں سے مباشرت کر لی ہو، اگر ہم بستری نہیں ہوئی تو اس صورت میں وہ حرام نہیں ہوگی۔ قرآن میں ہے:

﴿وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ 4

''تم پر حرام ہیں تمہاری پرورش کردہ لڑکیاں جو تمہاری گود میں ہیں، تمہاری ان عورتوں سے جن سے تم مباشرت کر چکے ہو، اگر تم نے ان سے ہم بستری نہیں کی تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔''

☆ بیٹے کی بیوی:...... بہو بھی حرام ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ﴾ 5

''اور تمہارے حقیقی بیٹوں کی بیویاں بھی تم پر حرام ہیں۔''

بہرحال نکاح کے بعد سسر ہمیشہ کے لیے محرم بن جاتا ہے، خواہ خاوند نے بیوی کو طلاق دے دی ہو۔ واللہ اعلم

! النساء: ٢٣.
@ النساء:٢٢.
# النساء:٢٣.
$ النساء:٢٣.
% النساء:٢٣.

منہ بولا بیٹا محرم بن سکتا ہے؟

] میں نے کچھ عرصہ قبل ایک لاوارث بچے کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا، جب میں اسے گھر لائی تو وہ دو سال کا تھا، میں نے اسے اپنا دودھ نہیں پلایا، اب وہ جوان ہے اور غلط صحبت کی وجہ سے مرزائی ہو چکا ہے، کیا وہ میرے لیے محرم کی حیثیت رکھتا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

[لاوارث بچوں کو منہ بولا بیٹا بنانا اور پھر اس سے حقیقی بیٹوں جیسا سلوک کرنا، یعنی بالغ ہونے کے بعد اس سے پردہ نہ کرنا، باقی رشتے داروں کے ساتھ اسے محرم کی حیثیت دینا، ہماری شریعت نے اس کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی، بلکہ اس رسم کو ختم کرنے کے لیے کئی ایک اقدامات کیے ہیں۔ لاوارث بچوں کے ساتھ تعاون اور ہمدردی ایک الگ موضوع ہے، لیکن اسے حقیقی بیٹے کا نام دینا اور محرم کی حیثیت سے بے پردہ اس کے سامنے آنا اس کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں۔ محرم کے لیے درج ذیل تعلقات میں سے کوئی ایک تعلق قائم ہونا چاہیے۔

۱۔ خونی رشتہ:......وہ باپ، بھائی یا بیٹا وغیرہ ہو یعنی اس کے ساتھ کوئی خونی تعلق ہو۔

۲۔ سسرالی رشتہ:......اس کے ساتھ نکاح ہو جائے یا سسرالی رشتہ قائم ہو جائے۔ مثلاً خاوند یا سسر وغیرہ۔

۳۔ رضاعی رشتہ:......اسے دو سال کی عمر کے دوران کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پلا دیا جائے۔

صورت مسئولہ میں سائلہ نے جس لاوارث بچے کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا ہے، اس کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ قائم نہیں ہوا، جس کے پیش نظر اسے محرم قرار دیا جا سکے۔ اس کے ساتھ نہ تو کوئی نسبی تعلق ہے اور نہ ہی رضاعی، نیز اس کے ساتھ جوان ہونے کے بعد کوئی سسرالی رشتہ بھی قائم نہیں ہوا۔ ایسے حالات میں اسے اپنے گھر میں رکھنا بھی جائز نہیں۔ لیکن وہ مرتد ہو کر مرزائی بن چکا ہے تو پھر اس کے ساتھ تعلق کیوں کر جائز ہو سکتا ہے؟

ہمارے رجحان کے مطابق کسی لاوارث کو منہ بولا بیٹا بنانا محض ایک تکلف ہے اور اسے حقیقی بیٹے کا مقام دینا پھر نسبی طور پر اسے خاندان میں شامل کر کے اپنے نام پر ولدیت لکھوانا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔ اس سے پردہ نہ کرنا کئی ایک قباحتوں کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے، جیسا کہ ہمارے سامنے اس طرح کے کئی ایک واقعات بھی ہیں۔ لہٰذا ایسے لاوارث بچے کا سہارا ضرور بننا چاہیے اور مالی طور پر اس کا تعاون بھی کرنا چاہیے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا کرنے سے اپنے ہاں اجر و ثواب سے نوازے گا لیکن اسے حقیقی بیٹے کا مقام نہ دیا جائے۔

سجدہ تلاوت کا حکم

] سجدہ تلاوت کی شرعی حیثیت کیا ہے، اگر سجدہ تلاوت کسی وجہ سے چھوڑ دیا جائے تو کیا اس پر گناہ لازم آئے گا؟ اس کی وضاحت درکار ہے۔

[شرعی طور پر سجدہ تلاوت کی بہت اہمیت ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ درج ذیل حدیث سے بخوبی لگایا جا سکتا

ہے؛حضرت ابوہریرہ t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جب ابن آدم کسی آیت سجدہ کی تلاوت کرتا ہے اور پھر سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا اور دور ہو جاتا ہے اور کہتا ہے: ہائے میری ہلاکت! ابن آدم کو سجدے کا حکم ملا تو اس نے سجدہ کرلیا، اس لیے اسے جنت مل گئی اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا تو میں نے انکار کردیا، اس لیے مجھے جہنم میں ڈالا جائے گا۔'' 1

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ تلاوت چھوڑ دینا کسی صورت میں مناسب نہیں۔ جب انسان آیت سجدہ پڑھے خواہ وہ زبانی پڑھے یا دیکھ کر، نماز کے اندر ہو یا باہر، ہر حالت میں اسے سجدہ تلاوت کرنا چاہیے۔سجدہ اہم ضرور ہے لیکن اسے واجب نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ حضرت عمر t سے ثابت ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ منبر پر سورۂ نحل کی تلاوت کی، حتی کہ سجدہ والی آیت کو پڑھا تو نیچے اترے اور سجدہ کیا، آپ کے ہمراہ لوگوں نے بھی سجدہ کیا، پھر اگلے جمعہ بھی سورۂ نحل تلاوت کی، جب آیت سجدہ تلاوت کی تو فرمانے لگے:

''اے لوگو! ہم سجدہ پر مشتمل آیات کی تلاوت کرتے ہیں جس نے سجدہ کرلیا تو اس نے درست کام کیا اور جس نے سجدہ نہ کیا اس پر کوئی حرج نہیں اور حضرت عمر t نے سجدہ نہ کیا، مزید فرمایا: ''بلاشبہ! اللہ تعالیٰ نے ہم پر سجدہ تلاوت فرض نہیں کیا بلکہ اسے ہماری صوابدید پر چھوڑا۔'' 2

اس حدیث پر امام بخاری a نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: اس شخص کا بیان جو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ تلاوت واجب نہیں کیا ہے۔ 3

اس کے بعد آپ نے کچھ آثار بیان کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ تلاوت واجب نہیں۔ واضح رہے کہ حضرت عمر t نے سورۂ نحل میں سجدہ نہ کرنے کا عمل صحابہ کرام y کی موجودگی میں کیا لیکن کسی نے بھی ان کی تردید نہیں کی۔اس کے علاوہ یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت زید بن ثابت t نے سورۂ نجم کی تلاوت رسول اللہ e کی موجودگی میں کی پھر سجدہ تلاوت والی آیت بھی پڑھی لیکن آپ نے سجدہ نہ کیا، اگر سجدہ تلاوت واجب ہوتا تو رسول اللہ e اسے سجدہ کرنے کا حکم دیتے۔ 4

بہرحال آیت سجدہ کی تلاوت پر سجدہ کرنا اہم ہے لیکن ضروری نہیں۔ (واللہ اعلم)

غیر مسلم کے تحفے قبول کرنا

] میرے پڑوس میں ایک عیسائی رہتا ہے اور وہ مجھے کبھی کبھار کوئی تحفہ دیتا ہے، اسی طرح میں بھی رواداری کے طور پر اسے ہدیہ دے دیتا ہوں۔ ہمارا یہ عمل کتاب وسنت کی روشنی میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

[تحفہ دینے اور لینے میں باہمی محبت پیدا ہوتی ہے، کفار ومشرکین سے ہمیں دلی محبت رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔

! صحیح مسلم، الایمان:۲۴۴.　　@ صحیح بخاری، سجود القرآن:۱۰۷۷.

بخاری باب نمبر ۱۰، کتاب السجود۔　　$ صحیح بخاری، سجود القرآن: ۱۰۷۳.

اس لیے کافروں اور مشرکوں سے آزادانہ طور پر تحائف کے تبادلہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہاں اگر کوئی شرعی یا سیاسی مصلحت ہو تو ہدیہ لینے دینے میں چنداں حرج نہیں۔ مثلاً کسی کسی کافر سے امید ہو کہ اس کے ساتھ موافقت سے وہ قریب ہوگا اور اسلام قبول کرلے گا۔ چنانچہ امام بخاری a نے اس سلسلہ میں عنوان قائم کیے ہیں:

ا۔ مشرکین سے ہدیہ قبول کرنا۔ 1 ۲۔ مشرکین کو ہدیہ پیش کرنا۔ 2

ان عناوین کو ثابت کرنے کے لیے امام بخاری a نے چند ایک احادیث کا حوالہ دیا ہے۔ مثلاً

☆ ایلہ کے بادشاہ نے رسول اللہ e کو ایک سفید خچر بطور ہدیہ بھیجا اور آپ نے تبادلے کے طور پر ایک ریشمی چادر اسے عنایت فرمائی۔ 3

☆ ایک یہودی عورت نے رسول اللہ e کو زہر آلود بکری کا گوشت پیش کیا تو آپ e نے اسے قبول فرمایا اگرچہ آپ کو اس کا نقصان ہوا تھا۔ 4

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار و مشرکین کے تحائف درج ذیل شرائط کے ساتھ قبول کیے جاسکتے ہیں:

☆ ہدیہ دینے یا قبول کرنے کا مقصد انہیں اسلام کے قریب کرنا ہو یا وہاں کی مصلحت ہو۔

☆ کفار و مشرکین کے خصوصی تہوار کے ساتھ اس کا تعلق نہ ہو۔

☆ ان سے دلی محبت کا اظہار قطعاً مقصود نہ ہو۔

اگر کفار و مشرکین سے کوئی خطرہ ہو یا وہ ان سے برسر پیکار رہتے ہوں تو ایسے حالات میں ان سے ہدایا لینا یا انہیں تحائف پیش کرنا درست نہیں جیسا کہ ایک حدیث میں رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''مجھے مشرکین کے عطایا قبول کرنے سے منع کردیا گیا ہے۔'' 5

صورت مسئولہ میں درج بالا تفصیل کے مطابق پڑوسی سے معاملہ کیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم!

ابو عیسیٰ کنیت رکھنا

] میرے ماموں مرحوم عالم دین تھے، انہوں نے اپنی کنیت ''ابو عیسیٰ'' رکھی تھی۔ ایک اور عالم دین نے مجھے بتایا کہ ابو عیسیٰ کنیت رکھنا منع ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ e نے اس سے منع فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی رہنمائی درکار ہے۔

[کنیت عرف عام میں کسی بھی رشتے دار کے تعلق کو ظاہر کرکے پکارنے کا نام ہے۔ جیسے ابو عبد اللہ، یعنی عبد اللہ کا باپ اور یہ ام اور ابو کے حوالے سے کسی بھی شخص کے نام پر اختیار کی جاسکتی ہے خواہ وہ حقیقت کے اعتبار سے ابھی ماں یا باپ

! البخاری، الہبہ، باب نمبر ۲۸۔ @ بخاری، الہبہ:۲۹۔

بخاری، الزکوٰۃ:۱۴۸۱۔ $ بخاری، الہبہ؛۲۶۱۷۔

% ابو داوٗد، الامارہ:۳۰۵۷۔

نہ ہو۔ جیسا کہ سیدنا انس t کے بھائی ابوعمیر تھے۔ حالانکہ وہ عمیر کے والد نہ تھے بلکہ ابھی چھوٹی عمر کے تھے، بہر حال باعزت طرز تخاطب کے لیے اسلام سے قبل معاشرہ میں کنیت کا رواج تھا۔ جسے اسلام نے برقرار رکھا۔ بعض اوقات کنیت اصل نام پر غالب آجاتی ہے کہ اصل نام محو ہو جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ بڑے بیٹے کے نام پر کنیت رکھی جائے۔ اگر بیٹی ہے تو اس کے نام پر بھی کنیت رکھی جاسکتی ہے۔ رسول اللہ e کا بڑا بیٹا قاسم تھا، اس لیے رسول اللہ e نے اپنی کنیت ابوالقاسم رکھی تھی۔ چونکہ سیدنا عیسیٰ u کا باپ نہیں تھا، اس لیے مشہور ہے کہ ابوعیسیٰ کنیت نہیں رکھنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ e کے پاس ایک آدمی آیا جس کی کنیت ابوعیسیٰ تھی تو آپ e نے فرمایا: ''عیسیٰ کا باپ نہیں تھا لہٰذا تجھے اپنی کنیت بدلنا ہوگی۔''

لیکن یہ روایت محدثین کے معیار صحت پر پوری نہیں اترتی کیوں کہ اس میں تدلیس پائی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور روایت بھی پیش کی جاتی ہے کہ سیدنا عمر t نے اپنے بیٹے کو سزا دی تھی جس نے اپنی کنیت ابوعیسیٰ رکھی تھی۔ 1

لیکن ہمارے ہاں رجحان کے مطابق ابوعیسیٰ کنیت رکھنے میں چنداں حرج نہیں کیوں کہ سیدنا مغیرہ بن شعبہ t کی کنیت رسول اللہ e نے خود ابوعیسیٰ رکھی تھی، اس کی صراحت ابوداؤد کی مذکورہ بالا روایت میں ہے۔ محدثین میں سے امام ترمذی کی کنیت بھی ابوعیسیٰ ہے تاہم اس سے احتراز بہتر ہے تاکہ سیدنا عیسیٰ u کا شرف لفظی طور پر بھی محفوظ رہے اور کسی کو شبہ نہ ہو کہ سیدنا عیسیٰ u کے بھی باپ تھے۔ واللہ اعلم!

بلاقصد قسم اٹھانا

] میں اپنے دوست سے ملاقات کے لیے اس کے گھر گیا، اس نے مہمان نوازی کے طور پر مجھے جوس پیش کیا، اس کے اصرار پر میں نے کہا، اللہ کی قسم! میں نہیں پیتا، یہ بات ارادہ کے بغیر میری زبان سے سرزد ہوئی، اس کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟

[شریعت میں قسم کی حسب ذیل دو اقسام ہیں:

☆ انسان بات بات میں عادت کے طور پر ارادے کے بغیر قسم اٹھاتا رہتا ہے۔ مثلاً اللہ کی قسم ہے، اللہ کی قسم ایسا نہیں ہے۔ اسے یمین لغو کہتے ہیں۔ اس پر کوئی مواخذہ یا کفارہ نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ﴾ 2

''اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں میں لغو قسم پر مواخذہ نہیں کرے گا۔''

☆ انسان اپنے عزم و ارادہ سے جانتے بوجھتے ہوئے قسم کھاتا ہے، اس کے آگے دو اقسام ہیں: ایک یہ ہے کہ انسان کسی کو دھوکہ اور فریب دینے کے لیے قسم اٹھائے، اسے یمین غموس کہتے ہیں، یہ کبیرہ گناہ ہے جیسا کہ حدیث میں صراحت ہے۔ 3

! ابو داوٗد، الادب: ۴۹۶۳۔ @ المائدہ: ۸۹۔

بخاری، الایمان: ۶۱۷۵۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ e سے یمین غموس کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا:

''جس کے ذریعے کسی مسلمان کا مال اڑایا جائے اور وہ اس میں جھوٹا بھی ہو۔'' 1

اس کی تلافی دو چیزوں سے ممکن ہے، جس آدمی کا حق غصب کیا ہے، وہ واپس کیا جائے اور اللہ تعالیٰ سے صدق دل کے ساتھ معافی مانگی جائے اس پر کوئی کفارہ وغیرہ نہیں۔ دوسری قسم یہ ہے کہ انسان اپنی بات میں پختگی پیدا کرنے کے لیے عزم و ارادہ کے ساتھ قسم اٹھائے، مثلاً میں فلاں کے گھر نہیں جاؤں گا، مجھے اللہ کی قسم ہے۔ اسے قسم معقدہ کہتے ہیں، اس کے متعلق شرعی حکم یہ ہے کہ مخالف کام میں اگر کسی شرعی ضابطے کی خلاف ورزی ہوتی ہو تو اپنی قسم کو توڑ دے اور اس کا کفارہ دے۔

جب کہ حدیث میں ہے:

''جب تم کسی کام پر قسم اٹھاؤ پھر اگر اس کے مخالف کام کو بہتر سمجھو تو بہتر کام کر لو اور قسم کا کفارہ ادا کرو۔'' 2

اگر کسی نے اس قسم کی قسم اٹھاتے وقت ان شاء اللہ بھی کہہ دیا تو اس پر کفارہ نہیں۔

جیسا کہ حدیث میں ہے، رسول اللہ e نے فرمایا:

''جس نے قسم اٹھاتے وقت ان شاء اللہ کہہ دیا اس پر قسم توڑنے کا کفارہ نہیں۔'' 3

صورت مسئولہ میں سائل نے عزم و ارادہ کے بغیر قسم اٹھائی ہے لہٰذا اس میں کوئی کفارہ نہیں۔

نیز یہ قسم ماضی سے متعلق ہے، ہاں اگر مستقبل سے متعلق قسم اٹھاتا ہے اور وہ بھی اپنے دل کے عزم و ارادہ سے تو پھر قسم کا کفارہ دے کر اسے توڑا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم!

فحش فلمیں دیکھنے پر مجبور کرنا

] میرے میاں سگریٹ نوشی میں مبتلا ہیں اور بلیو پرنٹ فحش فلمیں دیکھنے کے عادی ہیں اور مجھے بھی انہیں دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر میں نہ دیکھوں تو طلاق کی دھمکی دیتے ہیں۔ ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟

[اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے آپ اور اہل و عیال کو جہنم سے بچانے کی فکر کریں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ 4

''اے ایمان والو! اپنے آپ اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔''

رسول اللہ e نے بیوی اور اولاد کو خاوند کی رعایا بنایا ہے اور ان کی نگہداشت کا حکم دیا ہے اور قیامت کے دن اسے اپنی رعایا کے متعلق جواب دینا ہوگا۔

! بخاری، استتابۃ المرتدین: ۶۹۲۰. @ بخاری، الایمان: ۶۶۲۲.
مستدرک حاکم $ التحریم: ۶.

سیدنا معقل بن یسار t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے جسے بھی کسی رعایا کا حکمران بنایا اور وہ ان کی خیر خواہی نہیں کرتا تو وہ جنت کی خوشبو بھی حاصل نہیں کر سکے گا۔'' 1

خاوند کا گندی فلمیں دیکھنا اور سگریٹ نوشی کرنا بہت بڑا گناہ ہے، بیوی کو چاہیے کہ وہ ایسے کاموں میں اس کی اطاعت نہ کرے۔ بلکہ اچھے انداز میں اسے وعظ ونصیحت کرے۔ اگر وہ برائی کو ترک کر دے تو خاوند کے لیے بہتر اور بیوی کے لیے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ اگر وہ اس سے انکار کر دے اور گناہ پر اصرار کرے تو ایسے خاوند سے چمٹے رہنا اللہ کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ اگر وہ طلاق دیتا ہے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ عورت کو استقامت دکھانے پر خود نعم البدل عطا فرمائے گا۔ واللہ اعلم!

اعلیٰ تعلیم اور شادی

] میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے کرتے عمر کی اس حد کو پہنچ چکی ہوں کہ مجھے اب شادی کی کوئی رغبت نہیں رہی اور ہمارا مادی پہلو بھی کسی کو ہم سے شادی کرنے کی ترغیب نہیں دیتا، اس سلسلہ میں آپ ہمیں کیا نصیحت کرتے ہیں؟

[سب سے پہلے تو میری تمام والدین سے گزارش ہے کہ وہ اپنی بچیوں کو اس قدر اعلیٰ تعلیم دلوانے میں مصروف نہ رکھیں کہ وہ شادی کی عمر سے گزر کر مایوسی کی دہلیز پر جا بیٹھیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ تحریم میں رسول اللہ e کی متبادل بیویوں کے درج ذیل اوصاف بیان کیے ہیں، ان میں کہیں بھی اعلیٰ تعلیم یا عالمہ فاضلہ کا ذکر نہیں ملتا۔

(۱) سچی مسلمان (۲) ایمان دار (۳) فرمانبردار (۴) توبہ گزار (۵) عبادت گزار (۶) روزے دار 2

اتنی تعلیم ضروری ہونی چاہیے جو مذکورہ بالا اوصاف میں ممد ومعاون ہو۔

دوسری گزارش سائلہ سے ہے کہ وہ عجز وانکسار کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں گڑگڑا کر التجا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایسا خاوند مقدر کر دے جو اخلاق و دینداری کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہو۔ جب انسان صدق دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہوگا اور دعا کے آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، قبولیت کی رکاوٹوں کو دور کر کے دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے مایوس نہیں کرتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ﴾ 3

''تم مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔''

اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا درج ذیل فرمان مدنظر رکھنا چاہیے:

''جان لو کہ ناپسندیدہ چیزوں پر صبر کرنے میں بہت سی خیر و برکت ہے کیوں کہ اللہ کے ہاں مدد صبر کے ساتھ

!بخاری، الاحکام: ۷۱۵۰. @ تحریم: ۵.

المؤمن: ۶۰.

خوشحالی، بدحالی کے ساتھ اور آسانی، تنگی کے ساتھ وابستہ ہے۔'' 1

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سائلہ کی مشکلات کو حل فرمائے تا کہ دنیا و آخرت میں اسے کامیابی نصیب ہو۔

نہار منہ پانی پینا

] مجھے ایک پوسٹر ملا ہے جس میں نہار منہ پینے کی ممانعت بیان کی گئی ہے۔ اس میں ایک حدیث کا حوالہ ہے کہ رسول اللہ e نے نہار منہ پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔ وہ حدیث کیسی ہے اور اس کی استنادی حیثیت واضح کریں۔

[جس حدیث کا سوال میں حوالہ دیا گیا ہے وہ سیدنا ابوسعید خدری t سے مروی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جس نے نہار منہ پانی پیا، اس کی طاقت کم ہو جائے گی۔'' 2

لیکن یہ حدیث انتہائی ضعیف اور ناقابل اعتبار ہے کیوں کہ یہ اُس معیار پر پوری نہیں اترتی جو صحت حدیث کے لیے محدثین کرام نے قائم کیا ہے۔ حدیث کے صحیح ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے نقل کرنے والے ثقہ اور قابل اعتبار ہوں۔ چنانچہ علامہ ہیثمی نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی محمد بن مخلد الرعینی ضعیف ہے۔ 3

محدث العصر علامہ البانی a نے اس حدیث کے متعلق لکھا ہے: ''یہ حدیث انتہائی ضعیف ہے۔'' 4

اس کی جو وجہ بیان کی جاتی ہے وہ حسب ذیل ہے:

> ''جو زیادہ ہنستا ہے وہ بے عزت ہو کر رہ جاتا ہے، جو زیادہ مذاق کرتا ہے اس کا رعب ختم ہو جاتا ہے، جو طنز و مزاح کا عادی ہے اس کا وقار جاتا رہتا ہے۔ جو نہار منہ پانی پیتا ہے اس کی قوت گھٹ جاتی ہے، باتونی آدمی کثرت سے غلطیاں کرتا ہے، جس کی بکثرت غلطیاں ہوں، اس کے گناہ زیادہ ہو جاتے ہیں اور جس کے گناہ زیادہ ہوں وہ آگ کے لائق ہے۔'' 5

اس حدیث کے متعلق بھی علامہ ہیثمی a لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں چند ایسے آدمی ہیں جو غیر معروف ہیں، لہٰذا یہ حدیث ناقابل اعتبار ہے۔ 6

اس کی وضاحت علامہ البانی a نے کی ہے کہ اس کی سند میں ابو امیہ دیلی اور اس کا استاد فر بن واصل غیر معروف ہیں لہٰذا اس کی سند اندھیرے پر اندھیرا ہے۔ 7

البتہ اطباء حضرات کی آراء بیان کی جاتی ہیں کہ نہار منہ پانی پینے سے جوڑوں کے درد میں اضافہ ہو جاتا ہے جبکہ کچھ علماء اس کے بہت فوائد بیان کرتے ہیں، لیکن اس سلسلہ میں مروی احادیث صحیح نہیں ہیں۔ واللہ اعلم!

! مسند احمد، ج۱، ص۳۰۸۔ @ المعجم الاوسط للطبرانی: ج۱، ص۲۷۵۔

مجمع الزوائد، ج۵، ص۸۷۔ $ الاحادیث الضعیفہ، ج۱۳، ص۶۹، نمبر ۶۰۳۲۔

% المعجم الاوسط نمبر: ۶۷۰۱۔ ^ مجمع الزوائد: ج۱۰، ص۳۰۲۔

& سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ: ج۱۳، ص۷۰۔

سسرالی رشتے کا احترام

] میں آج کل ایک الجھن کا شکار ہوں، اس سلسلہ میں آپ کی رہنمائی درکار ہے۔ میرے خاوند میرے والدین کا احترام نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات تو انتہائی بدتمیزی کرتے ہیں، جس سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے، شریعت میں اس کا کیا حل ہے؟

[شریعت مطہرہ نے جہاں بیوی کو پابند کیا ہے کہ وہ اپنے خاوند کا احترام کرے، اس کی عزت و وقار کو ٹھیس نہ پہنچائے، وہاں خاوند کو بھی کہا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اچھے طریقے سے بود و باش اختیار کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ 1

''اپنی بیویوں سے حسن معاشرت کا مظاہرہ کرو۔''

اس آیت کریمہ میں بیوی کے والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ شامل ہے کیوں کہ ان سے حسن سلوک کرنے سے بیوی خوش ہو گی۔ سسرال والوں کو تکلیف نہیں دینا چاہیے کیوں کہ انہیں تکلیف دینے سے بیوی کو تکلیف ہو گی۔ ویسے بھی بیوی کا باپ ایک اعتبار سے خاوند کا بھی باپ ہے۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ انسان کے تین باپ ہوتے ہیں اور تینوں کا ادب و احترام کرنا خاوند کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے سسر کا اس طرح احترام کرے جس طرح اپنے والد کا کرتا ہے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''وہ بہترین چیز جس کی وجہ سے کسی کی عزت کی جائے، اس کی بیٹی یا بہن ہے۔'' 2

کسی کو بیٹی یا بہن کا نکاح دینا بہت بڑا احسان ہے، لہٰذا بیوی کے باپ اور اس کے بھائی کا احترام ضروری ہے۔ اسی طرح بیوی کی والدہ کا احترام بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس سے نکاح حرام کیا گیا ہے اور اس سے پردہ نہیں رکھا گیا۔ جب بیوی دیکھے کہ خاوند نے اس کے والدین کے حق میں کچھ کوتاہی کی ہے جیسا کہ صورت مسئولہ سے معلوم ہوتا ہے تو اسے چاہیے کہ اپنے خاوند کو اچھے انداز سے سمجھائے، اگر والدین میں کوئی ایک یا دونوں خاوند کے حق میں کوئی غلطی کرتے ہیں تو عورت کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور اپنے والدین کو ادب و احترام کے ساتھ وعظ و نصیحت کرنا چاہیے۔

واضح رہے کہ اگر والدین بیٹی کو کوئی حکم دیں جو خاوند کے حکم کے خلاف ہو تو خاوند کے حکم کو مقدم سمجھا جائے اور والدین کو ایسے معاملات میں غور و فکر کرنا چاہیے اور قطعاً اسے اپنی عزت و انانیت کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ اس لیے کہ خاوند کا حق زیادہ بڑا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ والدین کی نافرمانی کی جائے اور ان کے حقوق نہ ادا کیے جائیں۔ سائلہ کو چاہیے کہ وہ نماز پنجگانہ کے بعد دعا کے ہتھیار کو استعمال کرے اور نہایت صبر و تحمل سے کام لے۔ اللہ تعالیٰ آسانی پیدا فرمائے گا۔

! النساء:۱۹۔ @ ابو داؤد، النکاح:۲۱۲۹۔

راستہ تنگ کرنا

] آج کل اگر کسی گھر میں فوتگی ہو جائے یا نکاح کی تقریب ہو تو وہ آنے جانے والے راستہ کے دونوں طرف قناتیں لگا کر اسے بند کر دیتے ہیں، جس سے لوگوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے، اس طرح راستہ روکنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

[دین اسلام میں ہر وہ عمل اچھا اور مطلوب ہے، جس سے عام انسانوں کو فائدہ پہنچے، ضروری نہیں کہ وہ فائدہ صرف مسلمانوں تک محدود ہو، بشرطیکہ اس عمل سے اسلام کے کسی دوسرے حکم کی مخالفت نہ ہوتی ہو۔ مثلاً راستہ سے تکلیف دہ چیز کو دور کرنا ایک ایسا عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''چالیس خصلتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان ثواب کی نیت سے کسی ایک کو بھی عمل میں لے آئے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کریں گے۔ ان میں سے ایک راستہ سے تکلیف دہ چیز کا دور کرنا ہے۔'' 1

اسی طرح آپ e کا ارشاد گرامی ہے کہ ''ایمان کے کئی ایک شعبے ہیں، ان میں سے سب سے معمولی راستے سے تکلیف دہ چیز کا دور کرنا ہے۔'' 2

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''ایک آدمی جس نے کوئی بھی نیکی کا کام نہیں کیا تھا، اس نے راستہ سے ایک کانٹے دار ٹہنی دور کر دی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ عمل قبول کر لیا اور اس کی وجہ سے اسے جنت میں داخل فرما دیا۔'' 3

الغرض راستے کی رکاوٹ خواہ کسی طرح کی ہی ہو اور اسے دور کرنا ایمان کا حصہ اور بخشش کا سامان ہے اور اس کے برخلاف راستے میں رکاوٹ ڈالنا، ناجائز، حرام اور بھاری گناہ ہے۔ لیکن ہم لوگ اسے معمولی خیال کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات ایسی حرکت کو اپنا حق خیال کرتے ہیں مثلاً:

☆ کسی دینی پروگرام کے وقت آنے جانے کا راستہ بند کر دیا جاتا ہے۔

☆ تقریب یا خوشی کے موقع پر قناتیں لگا کر راستہ میں رکاوٹ ڈال دی جاتی ہے۔

☆ احتجاج کرتے وقت سڑکوں اور راستوں کو بلاک کر دیا جاتا ہے۔

حالانکہ زندگی کے تمام معاملات میں اللہ اور اس کے رسول e کی اطاعت کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں بلکہ انسانوں کے ساتھ حسن سلوک اور اچھا رویہ اختیار کرنا بھی واجب ہے۔ واضح بنیادی امور سے صرف نظر کرنے کے باعث نیکی کے عظیم کام بھی بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص راستے کا حق ادا نہ کرنا بہت بڑا جرم ہے۔

! بخاری، الہبہ: ۲۶۳۱۔ @ ابن ماجہ، السنہ: ۵۷۔

بخاری، المظالم: ۲۴۷۲۔

جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’جو خیمہ لگانے میں تنگی کرے یا راستے میں رکاوٹ ڈالے تو اس کا کوئی جہاد نہیں۔‘‘ 1

یہ وعید اس وقت بیان فرمائی جب آپ کے جانثاروں نے جہاد سے واپسی پر ایک جگہ پر خیمے لگانے میں بہت تنگی کا مظاہرہ کیا اور راستہ بند کر دیا تو رسول اللہ e نے ایک منادی کرانے والے کو تعینات کیا جس نے لوگوں کو مذکورہ بالا سخت وعید پر مشتمل الفاظ کا اعلان کیا۔‘‘ 2

ان احادیث کے پیش نظر ہمیں چاہیے کہ راستہ میں رکاوٹ ڈالنے سے اجتناب کریں، کیوں کہ ایسا کرنا بہت بڑا گناہ اور ناجائز وحرام ہے۔ واللہ اعلم!

نومولود کا اچھا نام رکھنا

] دین اسلام میں زندگی گزارنے کے لیے مکمل ہدایات موجود ہیں، نومولود کا نام رکھنا بھی زندگی کا ایک حصہ ہے، اس کے متعلق شرعی ہدایات کیا ہیں، کتاب وسنت کی روشنی میں ان کی وضاحت کر دیں؟

[ہمارا معاشرہ مغربی تہذیب سے بہت متاثر ہے، کچھ لوگ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اہل مغرب کے ناموں پر اپنے بچوں کے نام رکھنا پسند کرتے ہیں، حالانکہ ان میں اکثر نام مہمل بلکہ ان سے غیر سنجیدگی ٹپکتی ہے، کچھ تو ہنسی اور مذاق کا ذریعہ ہوتے ہیں، جبکہ ہماری اسلامی تہذیب میں اچھے، ذومعنی اور خوبصورت نام رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

چنانچہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’قیامت کے دن، تمہیں تمہارے باپوں کے نام سے پکارا جائے گا، اس لیے تم اچھے نام رکھا کرو۔‘‘ 3

اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ پسندیدہ عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں۔

جیسا کہ حدیث میں ہے:

’’بے شک تمہارے ناموں میں سے اللہ کے ہاں پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں۔‘‘ 4

چونکہ عبداللہ اور عبدالرحمن جیسے ناموں میں اللہ تعالیٰ کی طرف عبودیت کی نسبت اور اس کا اظہار ہے، تو اس بندے کے لیے بڑی سعادت کی بات ہے کہ اٹھتے بیٹھتے وقت اس عالی نسبت سے پکارا جائے۔

رسول اللہ e اس بات کو بھی پسند کرتے تھے کہ انبیاء اور صالحین کے ناموں پر اپنے بچوں کے نام رکھے جائیں۔ جیسا کہ خود آپ نے اپنے لخت جگر کا نام ’’ابراہیم‘‘ رکھا تھا۔ 5

! مسند امام احمد، ج۳،ص۴۴۰۔ @ ابو داؤد، الجهاد:۲۶۲۹۔
ابو داؤد، الادب:۴۹۴۸۔ $ مسلم، الاداب:۲۱۳۲۔
%بخاری، الادب:۶۱۹۴۔

اس سلسلہ میں آپ کا ارشاد گرامی بھی کتب احادیث میں مروی ہے۔آپ نے فرمایا:

''تم انبیاء کے ناموں پر اپنے بچوں کے نام رکھا کرو۔'' 1

حضرت سعید بن مسیب h فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نام انبیاء کرام y کے نام ہیں۔ 2

حافظ ابن قیم a لکھتے ہیں کہ جب حضرات انبیاء کرام تمام انسانوں کے سردار اور اخلاق وکردار کے اعلیٰ نمونہ ہیں اور ان کے نام بھی بہترین ہیں۔اس لیے رسول اللہ e نے اپنی امت کو انبیاء o کے نام تجویز کرنے کی ترغیب دی ہے۔ 3

رسول اللہ e نے اہل کتاب کے متعلق فرمایا:

''بلاشبہ وہ لوگ اپنے انبیاء اور اپنے سے پہلے لوگوں کے ناموں پر نام رکھتے تھے۔'' 4

کچھ ایسے نام ہیں جو اسلامی تہذیب کے خلاف ہیں، ان سے اجتناب کرنا چاہیے، برے ناموں کے اصول حسب ذیل ہیں:

۱۔ توحید کے منافی: ایسے ناجائز کام ہیں، جن میں شرک کا شائبہ اور ان میں غیر اللہ کے لیے بندگی کا اظہار ہو جیسے عبد العزی، عبد الکعبہ وغیرہ۔

۲۔ کسی بزرگ کی طرف منسوب نام: کچھ لوگ جو اولاد سے محروم ہوتے ہیں وہ نذر مانتے ہیں کہ ہمارے ہاں بچہ پیدا ہوا تو ہم بزرگوں کی طرف منسوب کریں گے، ایسا نام بھی حرام ہے، جیسے پیراں دتا، غوث بخش اور غلام فرید وغیرہ۔

۳۔ تزکیہ نفس اور ذاتی نیکوکاری کی نمائش: ایسے نام جن میں ذاتی ستائش یا تزکیہ نفس یا برتری کا معنی نمایاں ہو، ایسے ناموں سے احتراز کرنا چاہیے، جیسے برہ، متقی وغیرہ۔

۴۔ نافرمانی کا معنی نمایاں ہو: ایسے نام جن میں بغاوت، سرکشی اور نافرمانی کے معنی ہوں، ان کا انتخاب بھی مکروہ ہے جیسے عاص اور عاصیہ وغیرہ۔

بہرحال ایسے ناموں سے گریز کیا جائے، جو مزاج توحید کے خلاف ہوں، جن سے تذلیل اور غیر سنجیدگی مترشح ہو، جو مذاق کا ذریعہ، ان سے بدخلقی اور بدمزاجی کی بو آتی ہو، یا انسانی عظمت و وقار کے خلاف ہوں۔

ایسے نام بھی ممنوع ہیں جو یہود و نصاریٰ کے ناموں سے مشابہت رکھتے ہوں اور وہ بے معنی ہوں۔کافر بادشاہوں کے نام رکھنا بھی حرام ہیں مثلاً چنگیز خان، نوشیرواں، تیمور اور کسریٰ وغیرہ۔

اسی طرح معاشرہ میں برے اور کرپٹ لوگوں کے ناموں سے اجتناب کیا جائے، اگر کوئی دانستہ یا نادانستہ طور پر ناپسندیدہ نام رکھ لیتا ہے تو اسے اچھے نام سے بدل دینا ضروری ہے۔جیسا کہ رسول اللہ e برا نام بدل دیتے تھے۔جیسا کہ درج ذیل

! ابو داؤد، الادب: ۴۹۵۰. @ مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث نمبر: ۲۶۴۳.

زاد المعاد، ص: ۳۱۲، ج۲. $ صحیح مسلم، الآداب: ۲۱۳۵.

حقائق سے معلوم ہوتا ہے:

☆ زینب کا نام برہ تھا، رسول اللہ e نے اس کا نام زینب تجویز فرمایا۔

☆ حضرت عمر t کی بیٹی کا نام عاصیہ تھا، رسول اللہ e نے اس کا نام جمیلہ رکھا۔

☆ احرم نامی شخص کا نام زرعہ رکھا گیا تھا۔ 1

چونکہ برے ناموں کے اثرات ان کی شخصیت پر مرتب ہوتے ہیں بلکہ ان کی اولاد میں بھی سرایت کر سکتے ہیں لہٰذا برے ناموں کو بدلنے میں ہی عافیت ہے۔ (واللہ اعلم)

! ابو داوٗد، الادب:۴۹۵۴.

مسجد میں نکاح کرنا

] ہمارے معاشرہ میں مذہبی گھرانے مسجد میں نکاح کرنے کا اہتمام کرتے ہیں اور اسے مسنون عمل قرار دیتے ہیں۔کیا واقعی مسجد میں نکاح کرنا سنت سے ثابت ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

[اسلام میں عقد نکاح کے لیے کسی جگہ کی تخصیص کتاب وسنت سے ثابت نہیں، جہاں بھی آسانی ہو اور لوگ جمع ہو سکتے ہوں نکاح کیا جا سکتا ہے۔ البتہ فواحش ومنکرات کے اڈوں سے اجتناب کرنا ضروری ہے، جس طرح دیگر مقامات پر نکاح کیا جا سکتا ہے اسی طرح مسجد میں بھی نکاح کرنا جائز ہے بلکہ بہتر ہے کیوں کہ مسجد کے احترام کے پیش نظر یہ مجلس نکاح کئی قباحتوں سے محفوظ رہتی ہے، لیکن اسے مسنون عمل قرار دینا محل نظر ہے۔

اس سلسلہ میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے: ''اس نکاح کا اعلان کرو اور اس کا انعقاد مساجد میں کرو۔'' 1

یہ روایت انتہائی کمزور ہے کیوں کہ اس کی سند میں عیسیٰ بن میمون نامی راوی ضعیف ہے۔ امام ترمذی نے حدیث بیان کر کے اس کے ضعف کی وضاحت کی ہے کہ عیسیٰ بن میمون انصاری راوی حدیث میں کمزور قرار دیا جاتا ہے، امام بیہقی نے بھی یہ حدیث بیان کر کے اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ 2

علامہ البانی a نے اس حدیث پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ 3

البتہ اس حدیث کا پہلا حصہ یعنی ''تم اس نکاح کا اعلان کرو۔'' صحیح ہے کیوں کہ دوسری روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن زبیر t سے یہ فقرہ مرفوعاً ثابت ہے۔ اس کی صراحت صحیح ابن حبان حدیث نمبر ۱۲۸۵ میں ہے۔ واللہ اعلم!

مساجد میں سماجی تقاریب کا انعقاد

] ہمارے ہاں شادی کی تقاریب شادی ہال میں ہوتی ہیں، کچھ دیندار اور مذہبی رجحان رکھنے والے حضرات اسے

! ترمذی، النکاح:۱۰۸۹۔ @ بیہقی، ج۷،ص۲۹۰۔
سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ، ج۲،ص:۴۰۹۔

مساجد میں منعقد کرتے ہیں، کھانے وغیرہ کا اہتمام بھی مسجد میں ہوتا ہے، مساجد میں اس قسم کی سماجی تقاریب کی شرعی حیثیت واضح کریں۔

[بلاشبہ، دین اسلام میں مساجد کی بہت اہمیت وافادیت ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''اللہ عزوجل کے نزدیک سب سے پسندیدہ مقامات مساجد ہیں۔'' 1

ان کی تعمیر اللہ کا ذکر کرنے، نماز پڑھنے اور تلاوت قرآن کے لیے کی جاتی ہے۔

جیسا کہ سیدنا انس t بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی دیہاتی نے مسجد میں پیشاب کر دیا تو آپ e نے اسے بلا کر فرمایا:

''یہ جو مساجد ہیں انہیں پیشاب اور گندگی سے آلودہ نہیں کرنا چاہیے، یہ تو اللہ تعالیٰ کے ذکر، نماز اور قرأت قرآن کے لیے ہیں۔'' 2

اس مرکزی مقصد کے علاوہ دیگر مقاصد کے لیے بھی انہیں استعمال کیا جا سکتا ہے امام بخاری a نے اس سلسلہ میں رہنمائی کی ہے کہ دیگر کون سے مقاصد ہیں جن کے لیے مسجد کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

☆ عسکری تربیت 3

☆ خیمہ برائے مریض 4

☆ محفل نعت خوانی 5

☆ سستانے کے لیے لیٹنا 6

☆ علمی مجالس 7

☆ تادیبی کاروائی 8

مسجد میں نکاح بھی پڑھا جا سکتا ہے لیکن اسے مسنون نکاح قرار دینا اور اس کے لیے باقاعدہ تحریک چلانا محل نظر ہے۔ اس سلسلہ میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے جسے محدثین عظام نے قابل حجت قرار نہیں دیا۔ امام ترمذی h ''اعلان نکاح'' کے عنوان میں بیان کرتے ہیں کہ نکاح کا اعلان کرو اور مساجد میں اس نکاح کا اہتمام کیا جائے۔ 9

اس روایت میں عیسیٰ بن میمون ایک راوی ہے جسے محدثین کرام نے ضعیف قرار دیا ہے، خود امام ترمذی h نے اسے ضعیف کہا ہے۔ امام بیہقی h نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔ 0

! مسلم، المساجد:۱۵۲۸۔ @ مسلم، الطہارۃ:۱۶۶۱۔

بخاری، الصلوٰۃ:۴۵۴۔ $ بخاری، الصلوٰۃ:۴۶۳۔

% بخاری، الصلوٰۃ:۴۵۳۔ ^ بخاری، الصلوٰۃ:۴۷۵۔

& بخاری،الصلوٰۃ:۴۷۴۔ * بخاری، الصلوٰۃ:۴۶۱۔

) ترمذی، النکاح:۱۰۸۹۔ (بیہقی، ج۷، ص۲۹۰۔

البتہ اعلان والی بات صحیح اور ثابت ہے، اس اعلان نکاح کا مطلب یہ ہے کہ ایجاب وقبول اہل اسلام کی مجلس میں کیا جائے، اس کے لیے دعوت ولیمہ کا اہتمام کیا جائے تاکہ عام لوگوں کو اس کا علم ہو جائے کہ فلاں شخص کا نکاح فلاں خاتون سے ہوا ہے۔ اس طرح ناجائز تعلقات کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔

روایت کا مذکورہ یہ حصہ صحیح سند سے ثابت ہے جیسا کہ علامہ البانی a نے اس کی وضاحت کی ہے۔ 1

غالباً امام ترمذی h نے پہلے جملے کی وجہ سے اسے حسن قرار دیا ہے کیوں کہ اس کی تائید سیدنا عبداللہ بن زبیر t سے مروی ایک روایت سے ہوتی ہے۔ 2

علامہ البانی a نے بھی اس امر کی وضاحت کی ہے۔ 3

ہمارے رجحان کے مطابق مسجد میں نکاح پڑھانے کی اجازت ہے لیکن اسے سنت کا درجہ دینا درست نہیں۔ کیوں کہ اس عمل کے مسنون ہونے کی روایت صحیح سند سے ثابت نہیں۔ 4

لیکن اس کے لیے بھی شرط ہے کہ مسجد کے تقدس کو مجروح نہ کیا جائے، فوٹو گرافی اور فلم بندی سے اجتناب کرتے ہوئے سادگی کے ساتھ اس فریضہ کو مسجد میں ادا کیا جا سکتا ہے۔

البتہ تقریب میں کھانے پینے اور دیگر سماجی و معاشرتی رسوم کے لیے گھر، ہوٹل، ریسٹورینٹ، کھلے میدان، میرج ہال اور کھلی گلی میں اہتمام کیا جائے، مساجد میں عقیقہ، ختنہ، سالگرہ اور بارات وغیرہ کی تقاریب نہیں ہونی چاہییں، کیوں کہ ایسا کرنا ان کے تقدس کے خلاف اور ادب واحترام کے منافی ہے۔ البتہ کسی مسافر، معتکف اور ضرورت مند کی مہمان نوازی مسجد میں کی جا سکتی ہے۔ واللہ اعلم!

مسجد میں تھوکنا

] حدیث میں ہے کہ مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا گناہ کا کفارہ یہ ہے کہ اسے دفن کر دیا جائے۔ اس حدیث کا حوالہ درکار ہے نیز بتائیں کہ مسجد میں تھوکا جا سکتا ہے جبکہ ہماری مساجد تو بہت خوبصورت ہوتی ہیں؟

[ابتدائے اسلام میں مساجد کچی تھیں اور ان کے صحن میں مٹی یا ریت وغیرہ ہوتی تھی جن میں تھوک لینا اور پھر اسے مٹی یا ریت میں چھپا دینا ممکن تھا جبکہ آج کل مساجد پختہ اور ان کے فرش بھی پختہ ہیں۔ جن پر بہترین چٹائیاں یا قالین بچھے ہوئے ہیں۔ ایسے حالات میں مساجد کے در و دیوار پر تھوکنا سخت گناہ اور مساجد کی بے حرمتی ہے۔ رسول اللہ e نے ایسے لوگوں پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے جو مساجد کے تقدس کو اس طرح پامال کرتے ہیں۔ سوال میں جو حدیث ذکر کی گئی ہے اسے سیدنا انس t نے بایں الفاظ بیان کیا ہے:

! ارواء الغلیل، ج۷، ص۵۰.　　@ ترتیب صحیح ابن حبان: ج۷، ص۱۴۷.

آداب الزمان: ص۹۷.　　$ الاحادیث الضعیفہ، ج۲، ص۴۱۰، حدیث نمبر ۹۷۸.

’’مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اوراس گناہ کا کفارہ یہ ہے کہ اسے دفن کر دیا جائے۔‘‘ 1

اگر کسی مجبوری کی بناء پر مسجد میں تھوکنے کی نوبت آجائے تو مذکورہ حدیث کے پیش نظر اس کا تدارک اور کفارہ یہ ہے کہ اسے دفن کر دیا جائے۔لیکن ہمارے ہاں مساجد پختہ ہوتی ہیں تو اب تدارک کی صورت یہ ہے کہ اسے دفن کرنے کی بجائے اسے اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے اور مسجد کے فرش کو صاف کر کے وہاں خوشبو وغیرہ لگا دی جائے تاکہ وہاں کسی قسم کی ناگواری نہ ہو۔بعض احادیث میں ہے کہ اگر دوران نماز بلغم آجائے تو اسے بائیں جانب یا بائیں پاؤں تلے تھوک لیا جائے۔ 2

ہمارے مخصوص حالات کے پیش نظر دوران نماز اگر نمازی اس قسم کے حالات سے دوچار ہو جائے تو اسے چاہیے کہ رومال یا ٹشو پیپر کو استعمال کرے۔اگر اس کے پاس کوئی کپڑا نہیں تو اسے نگل لے، بہرحال عام حالت میں مسجد میں تھوکنے سے گریز کرنا چاہیے۔مساجد کا احترام کرنا انتہائی ضروری ہے۔ان میں ہر اُس کام سے اجتناب کیا جائے اور جو دوسروں کی ناگواری کا باعث ہے۔ واللہ اعلم!

حوروں کا حق مہر

] میں ایک دن مسجد کی صفائی کر رہا تھا کہ مسجد کے ایک بزرگ بیان فرمانے لگے کہ مسجد کی صفائی کرنا اوراس کا کوڑا کرکٹ باہر پھینکنا حوروں کا حق مہر ہے، اس کے متعلق ایک حدیث مروی ہے، اس کے متعلق وضاحت درکار ہے۔

[مساجد کا ادب یہ ہے کہ انہیں ظاہر اور باطن ہر لحاظ سے صاف ستھرا اور پاک رکھا جائے۔جیسا کہ سیدہ عائشہ r بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ e نے ہمیں حکم دیا: ’’محلوں میں مسجدیں بنائی جائیں اور انہیں پاکیزہ، صاف ستھرا اور معطر رکھا جائے۔‘‘ 3

مسجد کی صفائی کرنا بہت پسندیدہ عمل ہے، چنانچہ ایک صحابیہ نے مسجد کی صفائی کو اپنا معمول بنایا ہوا تھا، تو رسول اللہ e نے اس کی قبر پر جا کر اس کا جنازہ پڑھا تھا۔ 4

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ’’مجھے میری امت کے ثواب اور نیکیاں دکھائی گئیں، حتی کہ ایک تنکا بھی جو کوئی مسجد سے نکالتا ہے یہ بھی نیکیوں میں شامل تھا۔‘‘ 5

مسجد کے ماحول کو گندا کرنا اوراس میں گندگی پھیلانا بہت بڑا گناہ ہے۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ’’مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اوراس کا کفارہ اسے دفن کر دینا ہے۔‘‘ 6

چنانچہ رسول اللہ e نے ایک امام مسجد کو امامت سے صرف اس لیے معزول کر دیا تھا کہ اس نے مسجد کی دیوار پر تھوک

! بخاری، الصلوٰۃ:۵۱۳ @ بخاری، الصلوٰۃ:۴۱۳۔

ابوداؤد، الصلوٰۃ:۴۵۵۔ $ بخاری، الصلوٰۃ:۴۱۵

% ابو داؤد، الصلوٰۃ:۴۶۱۔ ^ بخاری، الصلوٰۃ:۴۱۵۔

کر اسے گندگی سے آلودہ کر دیا تھا، آپ نے اس کی سنگینی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ’’اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول e کو ایذا پہنچائی ہے۔‘‘ 1

رسول اللہ e نے مزید فرمایا کہ ’’امت کے برے اعمال میں سے ایک یہ عمل ہے کہ کوئی انسان مسجد میں بلغم پڑی دیکھے اور اسے دفن نہ کرے۔‘‘ 2

بہرحال دین اسلام میں مساجد کی صفائی کو بہت اہمیت دی گئی ہے، لیکن اس سلسلہ میں ذکر کردہ جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے، کہ مسجد کی صفائی کرنا حوروں کا حق مہر ہے، یہ خود ساختہ اور بناوٹی روایت ہے۔

امام ابن جوزی a نے اس موضوع پر لکھی گئی ایک کتاب ’’الموضوعات‘‘ میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس میں عبدالواحد بن زید نامی ایک راوی متروک ہے۔ نیز اس میں بہت سے ایسے راوی ہیں جن کی سیرت و کردار کے متعلق کوئی علم نہیں یعنی وہ مجہول ہیں۔ 3

اس سلسلہ میں ایک دوسری روایت جسے ہیثمی a نے معجم طبرانی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ مساجد سے چیتھڑے اور تنکے وغیرہ اٹھا کر باہر پھینکنا حوروں کا حق مہر ہے۔ 4

علامہ موصوف خود ہی اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں کئی ایک ایسے راوی ہیں جو مجہول اور لاپتہ ہیں۔

علامہ البانی a نے بھی اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ 5

بہرحال، مساجد کی صفائی اور نظافت کے متعلق متعدد صحیح احادیث کے ہوتے ہوئے اس طرح کی بناوٹی اور خود ساختہ احادیث کا سہارا نہیں لینا چاہیے۔ واللہ اعلم

مسجد میں گم شدہ حیوانات کا اعلان کرنا

] ہمارے گاؤں کے باسیوں کی یہ عادت ہے کہ جب ان میں سے کسی کی بکری یا گائے گم ہو جاتی ہے تو مسجد میں آ کر سپیکر میں اس کا اعلان کیا جاتا ہے، کیا مسجد میں اس طرح کے اعلانات جائز ہیں؟

[مساجد، اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں، جنہیں اس لیے تعمیر کیا جاتا ہے کہ ان میں اس کی عبادت اور اس کا ذکر کیا جائے۔

جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’مساجد تو اللہ کے ذکر، نمازوں کی ادائیگی اور تلاوت قرآن کے لیے بنائی جاتی ہیں۔‘‘ 6

اس لیے ان میں خرید و فروخت اور گم شدہ چیزوں کے متعلق اعلان کرنا منع ہے بلکہ اس کے متعلق بہت سخت وعید ہے۔

! ابو داوٗد، الصلوٰۃ: ۴۸۱.
@ مسلم، المساجد: ۱۲۳۳.
# سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ، ج۹، ص۱۷۲.
$ مجمع الزوائد، ج۲، ص۹.
% سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ، ج۴، ص۱۷۰.
۸ صحیح مسلم، الطہارۃ: ۶۶۱.

رسول اللہ e فرماتے ہیں:

''اگر کوئی مسجد میں اپنی گم شدہ چیز کو تلاش کرتا ہے یا اس کا اعلان کرتا ہے، تو اس کا جواب بایں الفاظ دیا جائے:
اللہ وہ چیز تجھے واپس نہ کرے! کیوں کہ مساجد کی تعمیر اس کام کے لیے نہیں کی گئیں۔ 1

بلکہ ایک حدیث میں ہے کہ خود رسول اللہ e نے مذکورہ بالا حدیث پر عمل کیا۔

چنانچہ حضرت بریدہ بن حصیب t بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ e نے نماز ادا فرمائی تو نماز کے بعد ایک آدمی بولا:

''مجھے کون سرخ اونٹ کی اطلاع دے گا؟''

رسول اللہ e نے فرمایا: ''تجھے وہ اونٹ نہ ملے، مسجدیں تو جس کام کے لیے بنی ہیں اسی کے لیے ہی بنی ہیں۔'' 2

اس بددعا کا مقصد اس قسم کے اعلانات سے ناپسندیدگی کا اظہار ہے، یہ بھی تنبیہ کا ایک اسلوب ہے۔ بہر حال اس قسم کے اعلانات مسجد کے تقدس اور احترام کے منافی ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ اہل محلہ باہمی تعاون سے مسجد سے باہر اس قسم کے اعلانات کرنے کا بندوبست کریں جیسا کہ بعض دیہاتوں میں ہم نے خود اس امر کا مشاہدہ کیا یا کسی دوکاندار سے طے کر لیا جائے کہ وہ اس قسم کے اعلانات کے متعلق تھوڑا بہت معاوضہ لے کر اس کا اہتمام کرے۔ (واللہ اعلم)

مسجد میں گم شدہ بچے کا اعلان

] مسجد میں گم شدہ بچوں کا اعلان کرنا جائز ہے یا نہیں، والدین جو بچے کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے اگر مسجد میں اعلان کر دیا جائے تو کیا حرج ہے؟

[مسجد میں کسی بھی گم شدہ چیز کا اعلان کرنا شرعاً منع ہے کیوں کہ مساجد اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں، اس طرح کے اعلانات عبادت کے منافی ہیں۔

حضرت ابوہریرہ t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جو کوئی کسی آدمی کو مسجد میں اپنی گم شدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنے تو اسے یوں جواب دے: کہ اللہ کرے وہ چیز تجھے واپس نہ ملے۔ کیوں کہ مساجد اس مقصد کے لیے نہیں بنائی گئیں۔'' 3

ایسے حالات میں والدین سے ہمدردی کرنے کی یہ صورت ہونی چاہیے کہ مسجد سے باہر کس حجرہ میں الگ سپیکر کا انتظام کر دیا جائے جو اس طرح کے اعلانات کے لیے وقف ہو، بہر حال مساجد میں کسی قسم کی گم شدہ چیز کا اعلان کرنا منع ہے۔ لہٰذا اسے

! صحیح مسلم، المساجد: ۱۲۶۰۔ @ ابن ماجہ، المساجد: ۷۶۵۔
مسلم المساجد: ۵۶۸۔

ایک جذباتی مسئلہ بنانے کے بجائے اس امتناعی حکم پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

مسجد میں نماز جنازہ

] کیا مسجد میں نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے، کچھ لوگ اس امر کا انکار کرتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[مسجد میں نماز جنازہ کی ادائیگی جائز ہے۔لیکن افضل یہ ہے کہ مسجد سے باہر جنازہ گاہ میں جنازے کی نماز ادا کی جائے کیوں کہ اکثر وبیشتر رسول اللہ e کے عہد مبارک میں نماز جنازہ مسجد سے باہر جنازگاہ میں پڑھی جاتی تھی۔

امام بخاری a نے اس سلسلہ میں ایک عنواں بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''جنازگاہ اور مسجد میں دونوں جگہ جنازہ ادا کرنا درست ہے۔'' 1

امام بخاری a کے نزدیک جنازگاہ اور مسجد دونوں کا حکم ایک ہے۔

چنانچہ جنازگاہ میں جنازہ پڑھنے کی صراحت موجود ہے لہٰذا مسجد میں بھی اس کی ادائیگی صحیح ہے۔ 2

اس کے علاوہ احادیث میں اس امر کی بھی صراحت ہے کہ مسجد میں جنازہ پڑھا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت عائشہ r سے مروی ہے انہوں نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! رسول اللہ e نے بیضاء کے دونوں بیٹوں کی نماز جنازہ مسجد میں ادا کی تھی۔'' 3

امام ابوداؤد a نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:

((باب الصلاة على الجنازة فى المسجد))

''مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا درست ہے۔'' 4

اس حدیث میں ان لوگوں کی تردید ہے جو میت کو ناپاک کہتے ہیں یا جو اوہام کا شکار ہو جاتے ہیں کہ مبادا اس سے کوئی آلائش نکل آئے، اس لیے ان کے نزدیک مسجد میں جنازہ جائز نہیں ہے۔ یہ ان کا گمان ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ رسول اللہ e سے مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا ثابت ہے جیسا کہ حضرت عائشہ r سے مروی حدیث میں ذکر ہوا ہے، اس کے علاوہ حضرت ابوہریرہ t سے مروی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جس نے کسی میت کا جنازہ مسجد میں ادا کیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔'' 5

حافظ ابن حجر a نے مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر t نے سیدنا ابوبکر t کی نماز

! صحیح بخاری، الجنائز، باب نمبر ۶۰. @فتح الباى، ص۲۵۴،ج۳.
صحیح مسلم، الجنائز:۹۷۳. $ ابو داؤد، الجنائز:۵۰.
% ابو داؤد، الجنائز:۳۱۹۱.

جنازہ مسجد میں ادا کی تھی اور حضرت صہیب t نے سیدنا عمر t کا جنازہ بھی مسجد میں پڑھا تھا۔ 1

ان روایات کے پیش نظر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا اور جو لوگ اسے ناجائز کہتے ہیں وہ بے بنیاد اور لایعنی اوہام کا شکار ہیں، اگرچہ ہمارے نزدیک جنازہ مسجد سے باہر جنازہ گاہ میں پڑھنا افضل ہے کیوں کہ رسول اللہ e اور دیگر صحابہ کرام سے اکثر و پیشتر نماز جنازہ مسجد سے باہر جنازہ گاہ میں پڑھنا ہی ثابت ہے۔ (واللہ اعلم)

عورتوں کا مسجد میں نماز ادا کرنا

] کچھ عورتیں مسجد میں بڑے شوق سے نماز ادا کرتی ہیں، کیا عورتوں کا مسجد میں آنا جائز ہے، اگر وہ اپنے گھر میں نماز ادا کریں تو کیا اس کی اجازت ہے؟

[مرد حضرات کا مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنا ضروری ہے، البتہ عورتوں کے لیے جائز ہے کہ وہ مسجد میں آئیں اور نماز باجماعت ادا کریں، بشرطیکہ مسجد میں پردے کا اہتمام ہو اور یہ خود بھی مسجد میں سادگی کے ساتھ آئیں، ممکن ہے کہ نماز باجماعت ادا کرنے سے انہیں اضافی ثواب مل جائے لیکن رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے کہ عورتوں کا گھر میں نماز ادا کرنا بہتر ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

”اپنی عورتوں کو مساجد میں جانے سے مت روکو اگرچہ ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں۔“ 2

حضرت عبداللہ بن عمر t سے مروی حدیث میں مزید وضاحت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: عورت کی اپنے گھر کے اندر پڑھی ہوئی نماز، صحن میں پڑھی جانے والی نماز سے افضل ہے اور گھر کے اندرونی خاص کمرے میں نماز بیرونی کمرے میں ادا کی گئی نماز سے افضل ہے۔ 3

بہرحال عورتوں کو اگر مسجد میں نماز پڑھنے کا شوق ہو تو سادگی کے ساتھ مسجد میں آئیں اور نماز باجماعت ادا کریں، اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ خاوند کو اس جذبہ خیر کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے تاہم اگر عورت اپنے گھر میں نماز پڑھنے کا اہتمام کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ (واللہ اعلم)

قسم کے لیے مسجد میں جانا

] ہمارے ہاں جس شخص کے متعلق کوئی شک و شبہ ہو اور اس سے صفائی لیتے وقت اسے مسجد میں لے جاتے ہیں، وہاں وضو کرانے کے بعد اس سے قسم لی جاتی ہے یا فریق مخالف کو کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن پر رکھی ہوئی رقم اٹھا لے، ایسے کاموں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ وضاحت فرما دیں۔

[زمان و مکان کی تخصیص سے اصل قسم میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لیے جہاں عدالت ہے، اسی جگہ مدعی علیہ سے

! فتح الباری، ص۲۵۵،ج۳۔ @ ابو داؤد، الصلوٰۃ:۵۶۷۔

ابوداؤد، الصلوٰۃ:۵۷۰۔

قسم لے کر فیصلہ کر دیا جائے، قسم لینے کے لیے نہ کسی خاص وقت کا انتظار کیا جائے اور نہ ہی کسی مقدس جگہ کے انتخاب کا اہتمام کیا جائے۔ امام بخاری a کا بھی یہی موقف ہے۔

چنانچہ انہوں نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔ ''مدعی علیہ اسی جگہ قسم اٹھائے جہاں اس پر قسم واجب ہوئی تھی، کسی بھی دوسری جگہ منتقل نہ کیا جائے۔'' 1

امام بخاری a نے دلیل کے طور پر سیدنا زید بن ثابت t کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کا اور عبد اللہ بن مطیع کے درمیان ایک مکان کے متعلق جھگڑا تھا، مروان بن الحکم نے سیدنا زید بن ثابت t کو منبر پر آ کر قسم اٹھانے کے متعلق کہا تو انہوں نے منبر پر آنے سے انکار کر دیا، اور فرمایا کہ'' میں اس کے لیے اپنی جگہ پر ہی قسم اٹھاؤں گا۔'' پھر انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے قسم اٹھانا شروع کر دی۔ 2

نیز آپ نے سیدنا اشعث بن قیس t کے ایک واقعہ سے بھی استدلال کیا ہے۔ جبکہ ان کا ایک یہودی سے کسی چیز کے متعلق جھگڑا تھا، وہ اس مقدمے کو رسول اللہ e کے پاس لے گئے تو آپ e نے فرمایا: ''اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے دو گواہ لاؤ یا پھر یہودی قسم اٹھائے گا۔'' 3

رسول اللہ e نے یہودی کے قسم لینے کے بارے میں کسی خاص جگہ کی تخصیص نہیں فرمائی اور نہ ہی آپ نے یہودی سے تورات ہاتھ میں لے کر قسم اٹھانے کا اہتمام کیا۔

البتہ حافظ ابن حجر a کہتے ہیں کہ قسم میں شدت پیدا کرنے کے لیے کسی خاص جگہ مثلاً مدینہ میں منبر نبوی، مکہ میں حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان اور دیگر مقامات میں مسجد کے اندر یا کسی خاص وقت جیسا کہ عصر کے بعد یا جمعہ کے دن قسم لینے کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ جمہور اہل علم کا یہی موقف ہے۔ 4

لیکن امام بخاری a کا موقف دلائل کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہے اور ہمارا بھی یہی رجحان ہے کہ قسم لینے کے لیے وضوء کرانا، پھر مسجد میں لے جانا محض تکلف ہے، اگر کوئی سچا ہے تو ہر جگہ پر اللہ سے ڈرے گا اور اگر جھوٹا ہے تو وہ مسجد کے تقدس کی بھی پرواہ نہیں کرے گا۔ اسی طرح رقم لینے یا دینے کا معاملہ ہے، اس کے لیے شرعی طریقہ تو یہ ہے کہ مدعی اپنے دعویٰ کے لیے گواہ پیش کرے، بصورت دیگر مدعی علیہ سے قسم لے کر معاملہ ختم کر دیا جائے۔ اس کے لیے رقم کو قرآن پر رکھنا کہ اگر کوئی سچا ہے تو قرآن پر رکھی ہوئی رقم کو اٹھا لے، ہمارے نزدیک یہ تکلفات ہیں، قرآن کریم اس لیے نہیں اترا کہ قسموں اور رقموں میں استعمال کیا جائے۔ ہمارے نزدیک ایسا کرنے سے قرآن کا تقدس مجروح ہوتا ہے۔ واللہ اعلم!

! بخاری، الشهادات، باب نمبر ٢٣.

@ بخاری، الشهادات، تعليقا قبل حديث نمبر ٢٦٧٣.

بخاری، الشهادات: ٢٦٦٩.

$ فتح الباری، ج٥، ص٢٥٠.

مسجد میں محفل حمد و نعت

] کچھ لوگ مسجد میں محفل حمد و نعت کا پروگرام کرتے ہیں، کیا مسجد میں شعر پڑھنے کی اجازت ہے؟ جبکہ مساجد تو عبادت کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں، اس کے متعلق قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں، کہ ایسا کرنا جائز ہے؟

[اس میں کوئی شک نہیں کہ مساجد اللہ کے ذکر اور نماز کی ادائیگی کے لیے بنائی جاتی ہیں، جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''مساجد تو اللہ کے ذکر اور نماز کے لیے تعمیر کی گئی ہیں۔'' 1

لیکن کچھ ثانوی مقاصد ہیں جن کے لیے مساجد کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ سید الفقہاء امام بخاری a نے اپنی صحیح میں چند ایک مقاصد کی نشاندہی بھی کی ہے، ان میں سے ایک درج ذیل ہے: ''مسجد میں شعر پڑھنا۔'' 2

لیکن یہ اجازت ہر قسم کے اشعار پڑھنے سے متعلق نہیں بلکہ ایسے اشعار کے لیے ہے جو اسلام اور اہل اسلام کے دفاع پر مشتمل ہوں یا اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور رسول اللہ e کی سیرت وصورت کو ان میں بیان کیا گیا ہو۔

جیسا کہ سیدنا حسان بن ثابت t اسلام کی خوبیاں اور مخالفین اسلام کے حملوں کا جواب دینے کے لیے مسجد نبوی e میں اشعار پڑھتے تھے۔ خود رسول اللہ e نے سیدنا حسان بن ثابت t سے فرمایا تھا:

''اے حسان! میری طرف سے ان مشرکین کو جواب دو، اللہ تعالیٰ تمہاری روح القدس سے مدد فرمائے۔'' 3

چنانچہ سیدنا حسان بن ثابت t مسجد نبوی میں اپنا کلام پیش کرتے، بلکہ ایک روایت میں صراحت ہے کہ رسول اللہ e مسجد نبوی میں سیدنا حسان بن ثابت t کے لیے خود منبر رکھواتے، جس پر وہ کھڑے ہو کر مشرکین کی ہجو کرتے تھے۔ 4

بلکہ ایک دن سیدنا حسان بن ثابت t مسجد نبوی میں اشعار پڑھ رہے تھے کہ سیدنا عمر t کا وہاں سے گزر ہوا، آپ نے سیدنا حسان t کو گھور کر دیکھا اور ناگواری کا اظہار کیا، سیدنا حسان t نے فوراً کہا کہ ''میں تو مسجد نبوی میں آپ سے زیادہ مرتبے والی شخصیت (آپ e) کی موجودگی میں شعر پڑھا کرتا تھا۔'' پھر آپ نے سیدنا ابو ہریرہ t کی طرف التفات کر کے ان سے شہادت طلب کی تو انہوں نے بھی آپ کی تائید کی۔ 5

ممکن ہے کہ سیدنا عمر t کے سامنے وہ حدیث ہو جس میں مسجدوں میں شعر پڑھنے سے منع کیا گیا ہے کہ ایک حدیث میں اس حکم امتناعی کی صراحت ہے۔ 6

! ابن ماجہ، الطہارۃ:۵۲۹۔
@ بخاری، الصلوٰۃ، باب نمبر ۶۸۔
# صحیح بخاری، الادب:7152۔
$ ترمذی، الادب:۲۸۴۶۔
% بخاری، بدء الخلق:۳۲۱۲۔
۸ ترمذی، الصلوٰۃ:۳۲۲۔

ہمارے رجحان کے مطابق مسجد میں اس قسم کے اشعار پڑھنے کی اجازت نہیں جو اسلام اور اہل اسلام کے خلاف ہوں یا دور جاہلیت کی یادگار، عشقیہ مضامین اور فحش گوئی پر مشتمل ہوں یا قوالی کی طرز پر بدعات و رسومات کی نشر و اشاعت کے لیے انہیں پڑھا جائے۔ البتہ ایسے اشعار مسجد میں پڑھے جا سکتے ہیں جو درج بالا عیوب سے پاک ہوں، وہ بھی اس حد تک کہ مسجد کو غزل خانہ نہ بنایا جائے یا تمام اہل مسجد شعر گوئی میں مصروف نہ ہو جائیں۔

صورت مسئولہ میں حمد و نعت اگر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور رسول e کی مدح و تعریف پر مشتمل ہو تو اس طرح کی محافل مسجد میں قائم کی جا سکتی ہیں۔ اگر درج بالا عیوب اس پر حاوی ہیں تو اندرون مسجد ہی نہیں بیرون مسجد بھی اس کا انعقاد محل نظر ہے۔ واللہ اعلم!

مسجد میں دوسری جماعت کرانا

] ہماری مسجد میں چند نوجوان ہر روز صبح کی نماز کے بعد دیر سے آتے ہیں اور اپنی الگ جماعت کرواتے ہیں۔ ان کی یہ عادت ہے، کیا اس طرح دوسری جماعت کروائی جا سکتی ہے؟ نیز کیا اس عمل کو عادت کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے؟ وضاحت کریں۔

[ہمارے ہاں عام طور پر دو طرح کی مساجد ہوتی ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ بازار، مارکیٹ، کارخانے، اسٹیشن، بس اسٹینڈ، پٹرول پمپ یا کسی گزرگاہ میں مسجد بنائی جاتی ہے، جہاں کوئی امام مقرر نہیں ہوتا، وہاں لوگ گروہ در گروہ آتے ہیں۔ کچھ فرداً فرداً نماز پڑھ کر چلے جاتے ہیں جبکہ کچھ لوگ جماعت کا اہتمام کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی مساجد میں اگر ایک نماز کے لیے وقفے وقفے کے ساتھ متعدد جماعتیں ہو جائیں تو بلا کراہت جائز اور مباح ہے اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ اس قسم کی مساجد میں وقفہ وقفہ سے متعدد جماعتیں ہو سکتی ہیں۔

۲۔ دوسری وہ مساجد ہیں جو کسی محلے، گاؤں یا شہر میں بنائی جاتی ہیں اور ان میں باقاعدہ ایک امام تعینات ہوتا ہے جو بروقت جماعت کا اہتمام کرتا ہے۔ اذان کا بندوبست بھی وہاں ہوتا ہے، ایسی مساجد میں تکرار جماعت کی دو صورتیں ممکن ہیں:

☆ اتفاقاً دو یا تین یا زیادہ آدمی اس وقت مسجد میں آ گئے جب باضابطہ جماعت ہو چکی تھی تو وہ فرداً فرداً پڑھنے کی بجائے جماعت کا اہتمام کر لیں تو اس کے جواز میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔

سیدنا ابو سعید خدری t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے ایک شخص کو مسجد میں اکیلے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

''کیا کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اس پر صدقہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ نماز ادا کرے۔'' 1

امام ترمذی نے اس حدیث پر بایں طور پر عنوان قائم کیا ہے:

''جس مسجد میں ایک بار باجماعت نماز ہو چکی ہو، اس میں جماعت کا بیان۔''

! نیل الاوطار، ج۳،ص ۱۷۱.

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عارضہ کی وجہ سے جماعت نہ پا سکے تو ایسے چند افراد کو باجماعت نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر چہ کچھ اہل علم کا خیال ہے کہ اجتماعیت اور پہلی جماعت کی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لیے دیر سے آنے والے حضرات نماز اکیلے ہی پڑھیں، یہ موقف اپنی جگہ پر درست اور قرین قیاس ہے، لیکن باجماعت ادا کرنے کے جواز میں بھی کوئی شبہ نہیں۔

جیسا کہ امام بخاری a نے تعلیقاً بیان کیا ہے، کہ سیدنا انس t ایک ایسی مسجد میں آئے جس میں نماز ادا کی جا چکی تھی تو انہوں نے وہاں باجماعت نماز ادا کی۔'' 1

☆ ایک صورت یہ ہے کہ جو سوال میں بیان کی گئی ہے کہ چند نوجوان ہر روز دیر سے مسجد میں آتے ہیں اور اپنی الگ جماعت کرواتے ہیں۔ اس اقدام کو کسی صورت میں مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ ایسا کرنا جماعتی استحکام اور اجتماعیت کو توڑنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح ہماری دینی مجلسوں میں دیکھا جاتا ہے کہ نماز باجماعت ہو رہی ہوتی ہے لیکن کچھ حضرات اپنے کام یا فضول باتوں میں مصروف رہتے ہیں، جب اصل جماعت ہو جاتی ہے تو وہ اپنی ''مثنیٰ'' جماعت کرواتے ہیں، بعض اوقات تو اس طرح کی متعدد جماعتیں بیک وقت ہوتی نظر آتی ہیں، اس قسم کی جماعت کو کوئی بھی صاحب بصیرت اہل علم اچھا نہیں کہے گا۔ ہمیں نماز باجماعت کی نزاکت کا خیال رکھنا چاہیے۔ اہل علم کو چاہیے کہ وہ ایسے خام نوجوانوں کی تربیت کریں تاکہ جماعتی اتحاد پارہ پارہ نہ ہو۔ اصل جماعت کے ساتھ شامل ہونے کی کوشش کرنی چاہیے، اصل جماعت سے دانستہ پیچھے رہنا پھر اپنی جماعت کرانا انتہائی محل نظر ہے۔ واللہ اعلم!

اہل قبلہ کون ہیں؟

] اہل علم عام طور پر اپنی گفتگو اور تحریر میں اہل قبلہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اس بات کی وضاحت کریں کہ اہل قبلہ سے کون لوگ مراد ہیں؟

[عقیدہ طحاویہ میں اہل قبلہ کی اصطلاح کو استعمال کرتے ہوئے لکھا ہے: ''ہم اہل قبلہ کو مسلمان اور مومن کہتے ہیں، جب تک وہ رسول اللہ e کی تعلیمات کا اعتراف اور تصدیق کرتے رہیں گے۔''

اس کی شرح میں ہے کہ اہل قبلہ سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اسلام کا دعوے دار اور نماز کے لیے قبلہ کی طرف منہ کرتا ہے۔ 2

اس وضاحت کی بنیاد درج ذیل حدیث ہے جسے سیدنا انس بن مالک t نے بیان کیا ہے:

''جو شخص ہماری طرح نماز پڑھے، ہمارے قبلے کی طرف منہ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ ایسا مسلمان ہے جسے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ حاصل ہے۔'' 3

! بخاری،ا لاذان، قبل حدیث:۶۴۴.　　@ شرح عقیدہ طحاویہ:۴۲۷.

بخاری، الایمان:۳۹۱.

اس حدیث میں بیان کردہ تین چیزوں کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے اہل قبلہ کا لقب اختیار کیا گیا ہے، ویسے لغوی طور پر اہل قبلہ کے حسب ذیل دو معنی ہیں:

☆ کعبہ مشرفہ کو قبلہ سمجھنے والا ☆ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے والا

اصولیین کے ہاں اس کی اصطلاحی تعریف یہ ہے: ''اہل قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو تمام ضروریات دین کو تسلیم کرنے پر متفق ہوں۔''

ضروریات دین سے مراد وہ احکام و مسائل ہیں جن کا حصہ شریعت ہونا نظر و استدلال کے بغیر ہی تمام خواص و عوام کے ہاں مسلمہ ہو، جیسے نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، روزے رکھنا اور حج کرنا وغیرہ۔

تمام اہل اسلام کے ہاں اس کی حیثیت و اہمیت مسلمہ ہے، کسی کو بھی ان سے انکار نہیں۔ خواص سے مراد علماء دین اور ان کی صحبت پانے والے عوام کہلاتے ہیں۔ علماء حضرات کی صحبت و رفاقت سے جو دور رہتے ہیں انہیں ضروریات دین معلوم کرنے کے لیے غور و فکر اور نظر و استدلال کی ضرورت رہتی ہے۔ قرآن کریم نے اسی قسم کے عوام کے متعلق فرمایا ہے؛

﴿ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ﴾ 1

''یہ صحرائی لوگ کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے متعلق یہ احکامات زیادہ ہیں کہ وہ اس دین کی حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔''

درج بالا وضاحت کی روشنی میں ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی کلمہ گو مسلمان اسلامی ماحول سے دور اور اہل علم کی صحبت سے محروم ہونے کی بناء پر کسی دینی ضرورت سے نافہمی، بے خبری اور غفلت سے انکار کر دے تو اسے اہل قبلہ سے خارج نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کی جہالت کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

بہر حال ضروریات دین کو ماننے والا اہل قبلہ ہے اور جو شخص ضروریات دین کا انکار کرتا ہے، وہ اہل قبلہ نہیں رہتا۔ واللہ اعلم!

نوٹ:...... ہم نے اہل قبلہ اور ضروریات دین کی تشریح اپنی شرح بخاری حدیث نمبر ۳۹۱ کے تحت کی ہے، مذکورہ فتویٰ اس کا خلاصہ ہے۔

تمام مساجد میں ایک ہی وقت اذان

] وزارت مذہبی امور پاکستان کا پروگرام ہے کہ اسلام آباد کی تمام مساجد میں ایک ہی وقت اذان دی جائے اسے اتحاد اور یک جہتی کی علامت قرار دیا جا رہا ہے۔ کیا شریعت میں اس امر کی گنجائش ہے کہ تمام مساجد میں ایک ہی وقت میں اذان دی جائے؟

[وزارت مذہبی امور اور پاکستان کی طرف سے اتحاد و یکجہتی کا جذبہ نہایت قابل قدر اور لائق تعریف ہے، لیکن

1 التوبہ:۹۷.

ہمارے یہاں مختلف مکاتب فکر پائے جاتے ہیں، ان میں فکری ہم آہنگی انتہائی ضروری ہے۔فکری ہم آہنگی کے بغیر تمام مساجد میں ایک ہی وقت میں اذان دینے سے اتحاد ویکجہتی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔

ہمارے رجحان کے مطابق درج ذیل آیات کو محور بنا کر مختلف مسالک میں فکری ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

☆ اختلاف کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ قطعی ہوگا۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ﴾ 1

''تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔''

☆ متنازعہ امور میں قرآن وسنت کی طرف رجوع کیا جائے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ﴾ 2

''اگر کسی معاملہ میں تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول e کی طرف پھیر دو۔''

☆ پیروی صرف اس امر کی ہونی چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ﴾ 3

''جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔''

اگر مذکورہ بالا آیات کو محور بنا کر اتحاد ویکجہتی کی کوشش کی جائے تو امید ہے کہ یہ کوشش سود مند اور ثمر آور ثابت ہوگی بصورت دیگر اختلافات میں مزید اضافہ ہوگا۔

پھر تمام مساجد میں بیک وقت اذان دینے سے مسائل حل نہیں ہوں گے کیوں کہ رسول اللہ e کے عہد مبارک میں ایسا نہیں تھا کہ مدینہ طیبہ کی تمام مساجد میں ایک ہی وقت میں اذان ہوتی ہو بلکہ مختلف مساجد میں اذان اور جماعت میں تھوڑا فرق تھا۔جیسا کہ درج ذیل واقعات سے معلوم ہوتا ہے:

☆ سیدنا جابر t کا بیان ہے کہ سیدنا معاذ بن جبل t نماز عشاء رسول اللہ e کے ہمراہ ادا کرتے پھر اپنی قوم کے ہاں تشریف لاتے اور انہیں نماز عشاء پڑھاتے۔'' 4

حافظ ابن حجر a لکھتے ہیں کہ سیدنا معاذ بن جبل t بنی سلمہ کی مسجد کے امام تھے، اور وہ رسول اللہ e کے ساتھ نماز عشاء باجماعت ادا کرتے، پھر اپنی قوم کی امامت کراتے تھے۔'' 5

! الشوریٰ:۱۰.
@ النساء:۵۹.
# الاعراف:۳.
$ بخاری، الاذان:۷۱۱.
% فتح الباری، ج۲،ص۲۵۶.

☆ سیدنا براء بن عازب t کا بیان ہے کہ جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تو ایک شخص نے مسجد نبوی میں رسول اللہ e کے ہمراہ نماز عصر ادا کی پھر وہ نکلا اور انصار کے پاس سے گزرا جو نماز عصر بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ادا کر رہے تھے تو اس نے کہا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ e کے ہمراہ نماز پڑھی ہے اور آپ e کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا ہے۔''

چنانچہ یہ سن کر وہ لوگ کعبہ رخ ہو گئے، حالانکہ نماز عصر کے رکوع میں تھے۔ 1

رسول اللہ e کے صحابہ کرام y بھی ایسا کرتے تھے کہ اپنی مسجد میں نماز باجماعت فوت ہو جاتی تو وہ دوسری مساجد میں جا کر نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ جیسا کہ درج ذیل واقعات سے معلوم ہوتا ہے:

☆ سیدنا حذیفہ t اگر اپنی مسجد میں نماز باجماعت ادا نہ کر سکتے تو دوسری مساجد کا رخ کرتے اور وہاں باجماعت نماز ادا کرتے۔ 2

☆ سیدنا اسود t کی نماز باجماعت رہ جاتی تو آپ کسی دوسری مسجد میں جا کر نماز باجماعت ادا کرتے۔ 3

☆ سیدنا سعید بن جبیر a اگر کسی مسجد میں جاتے جہاں جماعت ہو چکی ہوتی تو آپ کسی دوسری مسجد کی اذان سنتے تو وہاں جا کر نماز باجماعت ادا کرتے۔ 4

ان احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ قرون اولیٰ میں اذان دینے کا ایک وقت نہیں تھا بلکہ مختلف مساجد میں اذان دینے کے اوقات بھی مختلف ہوتے تھے، اس لیے تمام مساجد میں ایک وقت اذان دینا محل نظر ہے۔ واللہ اعلم!

عورتوں کا مسجد میں نماز عید ادا کرنا

] ہمارے گاؤں کے مرد حضرات کھلے میدان میں نماز عید ادا کرتے ہیں جبکہ خواتین مسجد میں نماز عید پڑھتی ہیں اور خطیب صاحب کی بیوی انہیں نماز پڑھاتی ہے، خطیب صاحب کا کہنا ہے کہ سیدہ عائشہ r خواتین کی جماعت کرواتی تھیں، اس مسئلہ کے متعلق وضاحت سے لکھیں۔

[عیدین، خوشی و مسرت اور اظہار شوکت اسلام کے لیے ہوتی ہے، ان میں مردوں اور عورتوں سب کو حاضری کا حکم دیا جاتا ہے۔ عوام الناس کے نزدیک بھی عیدین میں بلاوجہ شریک نہ ہونے والے کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ عیدین میں خواتین کی شرکت سے ملت کی عظمت، اجتماعیت اور اتحاد و یکجہتی کا اظہار ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ نماز نہ پڑھنے والی عورتوں کو بھی حاضری کی تاکید کی گئی ہے تاکہ عیدین کے دیگر مقاصد پورے ہو سکیں۔ اس لیے عورتیں خواہ جوان ہوں یا بوڑھی، کنواری ہوں یا بیوہ، حائضہ ہوں یا طاہرہ انہیں عیدگاہ ضرور جانا چاہیے اور کم از کم مسلمانوں کی دعا میں شرکت کرنا چاہیے۔

! بخاری، اخبار الاحاد: ۷۲۵۲۔ @ مصنف ابن ابی شیبہ: ج۳، ص۲۰۵۔

بخاری، الآذان، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ: ۳۰۔ $ مصنف عبد الرزاق، ج۱، ص۵۱۵۔

جیسا کہ سیدہ ام عطیہ r بیان کرتی ہیں: ’’ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم جوان لڑکیوں اور حائضہ عورتوں کو بھی عیدین میں ساتھ لے کر نکلیں تا کہ وہ بھی مسلمانوں کے امور خیر اور دعاؤں میں شریک ہوں، البتہ حائضہ عورتیں نماز گاہ سے الگ رہیں۔‘‘ 1

سیدہ ام عطیہ r نے رسول اللہ e سے دریافت کیا کہ جب ہم میں سے کسی کے پاس چادر نہ ہو اور اس وجہ سے وہ (نماز عید کے لیے) نہ جاسکے تو کیا اس پر کوئی حرج ہے رسول اللہ e نے فرمایا:

’’اس کی سہیلی اُسے اپنی چادر پہنا دے۔‘‘ 2

اس کی سہیلی سے چادر لینے کے دو مفہوم بیان کیے ہیں:

☆ ’’اپنی سہیلی سے چادر عاریۃً لے لے اور عید گاہ ضرور جائے۔

اس کی تائید ایک دوسری روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

’’اس کی بہن اسے عاریۃً اپنی چادر دے دے۔‘‘ 3

☆ ’’اگر چادر بڑی ہو تو اس کا کچھ حصہ اپنی سہیلی کو اوڑھا دے۔‘‘...... چنانچہ اس کی تائید بھی ایک روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

’’اس کی سہیلی اسے اپنی چادر کا ایک حصہ اوڑھا دے۔‘‘ 4

حضرت حفصہ بنت سیرین a نے سیدہ ام عطیہ r سے سوال کیا، حائضہ عورتیں بھی عیدگاہ جائیں؟

تو سیدہ ام عطیہ r نے جواب دیا: ’’کیا حج پر جانے والی عورت میدان عرفات، مزدلفہ اور منی میں حاضر نہیں ہوتی۔‘‘ 5

حافظ ابن حجر a نے اس مسئلہ کے متعلق صحابہ کرام y کا اجماع نقل کیا ہے۔ 6

خواتین عیدگاہ میں شرکت کے لیے درج ذیل امور کو پیش نظر رکھیں:

☆ راستہ میں ایک طرف ہو کر چلیں، مردوں کے ساتھ ان کا اختلاط نہیں ہونا چاہیے۔

☆ باپردہ اور سادہ لباس پہن کر عیدگاہ آئیں اور خوشبو وغیرہ نہ لگائیں۔

☆ ظاہری زیبائش سے گریز کریں اور عیدگاہ میں ذکر الٰہی میں خود کو مصروف رکھیں۔

☆ شوروغل کرنے والے شرارتی بچوں کو ہمراہ نہ لائیں۔

خود رسول اللہ e اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو عیدگاہ جانے کا حکم دیتے تھے۔ 7

بلکہ آپ ہر عورت کو عیدگاہ جانے کا تاکیدی حکم دیتے تھے۔ 8

! بخاری، العیدین:۹۸۱.
@ بخاری، الحیض: ۳۴.
# ترمذی،ابواب الصلوٰۃ:۵۳۹.
$ ابو داؤد، الصلوٰۃ:۱۱۳۶.
% بخاری، الحیض:۳۲۴.
^ فتح الباری، ج۲،ص۶۰۶.
& مسند احمد، ج۱، ص۲۳۱.
* بیہقی، ج۳، ص۳۰۶.

ان تمام احادیث کا تقاضا ہے کہ عورتوں کو گھروں یا مساجد میں الگ نماز عید پڑھنے کی بجائے عید گاہ میں ہی مسلمانوں کے ہمراہ نماز عید ادا کرنی چاہیے۔سوال میں خطیب نے سیدہ عائشہ r کا حوالہ دیا ہے کہ وہ خواتین کی جماعت کراتی تھیں اس حدیث کا نماز عید سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ تو عام نمازوں کے متعلق ہے کہ گھر میں وہ خواتین کی نماز باجماعت کا اہتمام کرتی تھیں، بلکہ سیدہ عائشہ r تو مسجد میں عورتوں کی شرکت کے متعلق فرماتی تھیں: ''اگر رسول اللہ e یہ صورتحال دیکھ لیتے جو آج کل عورتوں نے اختیار کی ہے تو انہیں مسجدوں میں آنے سے منع فرمادیتے جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا تھا۔'' 1

اگرچہ حقیقت واقعہ ہمارے اس دور میں از حد ناگفتہ بہ ہے لیکن رسول اللہ e کا فرمان اور اللہ کی شریعت کو بالادستی حاصل ہے۔ بہرحال خطیب کا مسجد میں عورتوں کی نماز عید کا اہتمام کرنا اور اس کی بیوی کا نماز عید پڑھانا انتہائی محل نظر ہے۔ اگرچہ اس کے مقاصد کچھ اور ہوسکتے ہیں لیکن انہیں چاہیے کہ وہ اس سلسلہ میں شریعت کی آڑ نہ لیں۔ واللہ اعلم!

! ابوداؤد، الصلوٰۃ:۵۶۹.

رنج والم اور پریشانی کا علاج

]میں اکثر پریشان اور رنج والم میں مبتلا رہتا ہوں، میری عبادات بھی اس وجہ سے بے کیف ہیں، نماز میں بھی بے اطمینانی کی کیفیت طاری رہتی ہے، مجھے اس کیفیت کو دور کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ براہ کرم کوئی وظیفہ یا دعا تحریر کر دیں۔

[قرآن مجید نے اہل ایمان کے لیے سکون قلب کا جو نسخہ تجویز کیا ہے۔ وہ اللہ کا ذکر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴾1

''یاد رکھو! اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو سکون ملتا ہے۔''

اس کے ذکر سے مراد اس کی عبادت، تلاوت قرآن، نوافل، تسبیحات اور دعا و مناجات ہے جو اہل ایمان کے دلوں کی خوراک اور ان کے ارواح کی غذا ہے۔ رسول اللہ e نے گھبراہٹ و بے اطمینانی کے مواقع پر معوذات پڑھنے کی تلقین ہے، اس سے مراد قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ' قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھنا ہے، ان سورتوں کو پڑھنے کا معمول بنا لیا جائے تو امید ہے کہ بے سکونی اور بے اطمینانی ختم ہو جائے گی۔

چنانچہ سیدنا عقبہ بن عامر t بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ رسول اللہ e کے ہمراہ مقام جحفہ اور ابواء کے درمیان چل رہا تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ بہت تیز آندھی چلنے لگی اور رات بے حد اندھیری تھی تو رسول اللہ eمعوذتین قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھنے لگے اور فرمایا: ''اے عقبہ! ان دونوں سورتوں کو پڑھا کرو، ان سا تعوذ کسی نے نہیں پڑھا۔'' 2

یہ دونوں باعث حفظ و امان ہیں، ان کا پڑھنا بھی بہت آسان اور سہل ہے۔ رسول اللہ e کا معمول تھا کہ آپ ان کے ساتھ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ملا کر پڑھتے اور دونوں ہاتھوں پر پھونک مار کر اپنے تمام جسم پر پھیرتے تھے۔ پھر یہ عمل ہر رات جب بستر پر آتے تو کرتے تھے۔

اس کے ساتھ اگر آیت الکرسی کو ملا لیا جائے تو شیطان کے شر سے بچنے کے لیے یہ آیت بھی اکسیر ہے، احادیث میں اس کے پڑھنے کی بہت فضیلت آئی ہے۔

! الرعد:۲۸.　　@ ابوداؤد، الوتر:۱۴۶۳.

سورہ فاتحہ تو ہر مصیبت وبلا سے رہائی اور فلاح وکامرانی کا سرچشمہ ہے۔

سائل کو چاہیے کہ وہ سورہ فاتحہ، آیت الکرسی اور معوذات پڑھ کر خود ہی دم کیا کرے، امید ہے کہ سوال میں ذکر کردہ کیفیت دور ہو جائے گی، باذن اللہ تعالیٰ!

بے وضو دعا کرنا

] بعض اوقات میں رات کو دو بجے بیدار ہو جاتی ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا شروع کر دیتی ہوں، حالانکہ میں نے وضو نہیں کیا ہوتا، کیا بے وضو دعا کی جا سکتی ہے؟

[بے وضوء دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ بحالت جنابت بھی دعا کی جا سکتی ہے، کیوں کہ دعا کے لیے طہارت شرط نہیں، بلکہ دعا کا ہر انسان ہر وقت محتاج رہتا ہے۔ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے دعا کے لیے طہارت کو شرط نہیں رکھا، لیکن طہارت اور وضو کے ساتھ دعا کے قبول ہونے کی زیادہ امید کی جا سکتی ہے، خصوصاً سجدہ کی حالت میں دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب سجدے میں ہوتا ہے لہٰذا اس حالت میں کثرت سے دعا کیا کرو۔'' 1

بہر حال دعا کے لیے باوضو ہونا شرط نہیں، انسان بے وضو دعا کر سکتا ہے، اگر باوضو اور طہارت کی حالت میں دعا کی جائے تو بہتر ہے۔ (واللہ اعلم)

دعا میں اضافہ

] سعودیہ میں اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ دوران نماز رکوع کے بعد جب اٹھتے ہیں تو دعا میں ربنا ولک الحمد کے بعد والشکر کا لفظ بڑھا دیتے ہیں، کیا دعا ماثورہ میں اس قسم کا اضافہ جائز ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیا جائے۔

[رسول اللہ e سے منقول دعاؤں میں ترمیم واضافہ درست نہیں، جیسا کہ حضرت براء بن عازب t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے مجھے سوتے وقت پڑھنے کے لیے ایک دعا کی تعلیم دی، جس میں یہ الفاظ تھے: ((امنت بکتابک الذی انزلت ونبیک الذی ارسلت))

''میں تیری اس کتاب پر ایمان لایا جو تو نے اتاری اور اس نبی کو مانا جسے تو نے بھیجا۔''

میں نے اسے یاد کر لیا، جب اسے دوبارہ سنایا تو ''نبیک'' کے بجائے ''رسولک'' کے الفاظ پڑھ دیئے۔ رسول اللہ e نے مجھے اس تبدیلی سے منع کرتے ہوئے فرمایا: نہیں، نہیں وہی الفاظ پڑھو جس کی میں نے تمہیں تعلیم دی تھی یعنی

1صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۴۸۲.

رسولک کی بجائے نبیک ہی پڑھو۔ 1

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اذکار وادعیہ میں ترمیم واضافہ کرنا شرعا درست نہیں۔ اس لیے نمازی جب رکوع سے اپنا سر اٹھائے تو وہی دعا پڑھے جو رسول اللہ e سے منقول ہے، اپنی طرف سے اس میں ''والشکر'' کا اضافہ نہ کرے۔ اس موقع پر رسول اللہ e سے چار طرح کے الفاظ منقول ہیں:

۱۔ ربنا ولک الحمد

۲۔ ربنا لک الحمد

۳۔ اللھم ربنا ولک الحمد

۴۔ اللھم ربنا لک الحمد

رکوع کے بعد سر اٹھا کر مذکورہ بالا چار صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو اختیار کرے، ان میں والشکر کے الفاظ کسی حدیث میں نہیں آئے۔ اس بناء پر ہمارا رجحان یہ ہے کہ اس مقام پر اپنی طرف سے کسی لفظ کا اضافہ کرنے کی بجائے صرف انہی الفاظ پر اکتفاء کیا جائے جو رسول اللہ e سے منقول ہیں، اسی میں خیر و برکت اور ثواب کی امید کی جاسکتی ہے۔ اپنی طرف سے رسول اللہ e کی تعلیم فرمودہ دعا یا ذکر میں اضافہ کر کے ثواب کی امید رکھنا عبث ہے، ہمیں اذکار و دعاؤں میں اس پہلو کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن اس کے متعلق ہماری باز پرس ہو۔ (واللہ اعلم)

سیدنا ابو ہریرہ t کے لیے دعا

] سیدنا ابو ہریرہ t کا واقعہ کس حدیث میں ہے کہ وہ کھجوریں لے کر رسول اللہ e کے ہاں آئے اور آپ سے ان میں برکت کے لیے دعا کرنے کی فرمائش کی، وہ کھجوریں کافی دیر تک استعمال کرتے رہے۔ اس حدیث کی نشاندہی کر دیں۔

[سیدنا ابو ہریرہ t سے مروی اس واقعہ کی تفصیل حسب ذیل ہے:

''وہ کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے سامنے کھجوریں رکھتے ہوئے عرض کیا، اللہ کے رسول! ان میں خیر و برکت کی دعا فرما دیں۔ آپ e نے دعا فرمانے کے بعد مجھے کہا: ''انہیں اٹھاؤ اور اپنے توشہ دان میں ڈال لو، جب تمہیں ضرورت پڑے تو اس میں ہاتھ ڈال کر کھجوریں نکال لینا، انہیں زمین پر ڈھیر نہ کرنا'' اللہ تعالیٰ نے ان میں اتنی برکت ڈالی کہ میں نے کئی وسق اللہ کی راہ میں خرچ کیں اور انہیں خود بھی کھائیں اور دوسروں کو بھی کھلائیں۔ میں نے اس توشہ دان کو اپنی کمر سے باندھ رکھا تھا اور وہ میرے پاس ہی رہتا تھا۔ افسوس کہ جس دن سیدنا عثمان t کی شہادت ہوئی تو وہ میری کمر سے ٹوٹ کر کہیں گر گیا۔'' 2

! بخاری، الوضو:۲۴۷۔ @ جامع ترمذی، مناقب: ۳۳۳۹۔

امام احمد بن حنبل a نے بھی اس روایت کو بیان کیا ہے۔ 1

سیدنا ابوہریرہ t انتہائی خوش قسمت ہیں کہ رسول اللہ e نے ان کے لیے کئی ایک مواقع پر خیر و برکت کی دعا فرمائی تھی۔

دفن کے بعد قبر پر اجتماعی دعا

] ہمارے ہاں میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر میت کے لیے اجتماعی دعا کی جاتی ہے، اس پر کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس کا قرآن و حدیث میں کوئی ثبوت نہیں، کتاب و سنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرما دیں۔

[یہ مسنون عمل ہے کہ دفن کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر میت کے لیے استغفار اور ثابت قدمی کی دعا کی جائے کیوں کہ قبر میں میت کو زندہ کر کے بٹھایا جاتا ہے اور اس سے سوال و جواب ہوتا ہے، یہ دعا اس کے لیے ثابت قدمی کی ہوتی ہے۔ قبر سے یا قبرستان سے چالیس قدم دور آ کر دعا کرنا قرآن و حدیث سے ثابت نہیں۔ احادیث میں دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر میت کے لیے دعا کرنے کے متعلق ہے جیسا کہ سیدنا عثمان بن عفان t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e جب میت کی تدفین سے فارغ ہوتے تو وہاں کھڑے رہتے پھر فرماتے: ''اپنے بھائی کے لیے دعا استغفار کرو اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے ثابت قدمی کا سوال کرو کیوں کہ اب اس سے سوال و جواب ہوں گے۔'' 2

اس حدیث میں جمع کا صیغہ آیا ہے لہٰذا یہ دعا اجتماعی ہے انفرادی نہیں، حضرات صحابہ کرام y کا بھی یہی معمول تھا۔ چنانچہ ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں، ''جب سیدنا عبد اللہ بن عباس w، سیدنا عبد اللہ بن سائب t کو دفن کر کے فارغ ہوئے تو لوگ ان کے پاس کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کھڑے ہو کر سیدنا عبد اللہ بن سائب t کے لیے دعا فرمائی۔'' 3

مصنف عبد الرزاق میں ایک عنوان بایں الفاظ ہے: ''دفن سے فراغت کے بعد میت کے لیے دعا کرنا۔''...... پھر انہوں نے اس سلسلہ میں چند آثار کا حوالہ دیا ہے۔ 4

سیدنا عمرو بن عاص t نے بھی اپنے بیٹے کو اس امر کی وصیت کی تھی کہ میری قبر پر اتنی دیر تک کھڑے رہنا، جتنی دیر میں اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جاتا ہے۔'' 5

قبولیت دعا کے آداب

] میں نماز پنجگانہ ادا کرتی ہوں، لیکن مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میری دعا قبول نہیں ہوتی، بارہا ایسا تجربہ کیا ہے، نماز کے بعد میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں، لیکن وہ شرف قبولیت سے محروم رہتی ہے، اس سلسلہ میں میری رہنمائی فرمائیں۔

[دعا کے سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ دعا بذات خود عبادت ہے، اور اس سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا

! مسند امام احمد، ج:۲، ص:۳۵۲.   @ ابوداؤد، الجنائز: ۳۲۲۱.

بیہقی، ج ۳، ص ۵۰۹. $ مصنف عبد الرزاق: ج۳، ص ۵۰۹.

% مسلم، الایمان:۳۲۱.

ہے، دعا کا نتیجہ اگر سامنے نہ آئے تو عبادت رائیگاں نہیں ہوتی، دعا کی قبولیت کے چند ایک مدارج حسب ذیل ہیں:

☆ تقرب الٰہی کے ساتھ وہ شرف قبولیت سے نوازی جاتی ہے اور اس کا مقصود مل جاتا ہے۔

☆ مقصود نہیں ملتا بلکہ دعا کی برکت سے کسی شر یا مصیبت کو دور کر دیا جاتا ہے۔

☆ اس دعا کے اجر وثواب کو روز قیامت کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے ہاں محفوظ کر لیتے ہیں۔ (اس کی صراحت ایک حدیث میں بھی ہے۔) 1

بہر حال جو انسان ایمان ویقین کے ساتھ اللہ سے دعا کرتا ہے وہ کسی خسارے میں نہیں رہتا، البتہ شرف قبولیت کے لیے کچھ آداب وشرائط حسب ذیل ہیں:

☆ قبولیت کی امید کے ساتھ دعا کرنی چاہیے۔ اللہ کی رحمت سے ناامید ہونا جائز نہیں۔

☆ دعا کرتے وقت حد سے تجاوز نہ کرے اور ایسی دعا نہ کرے جو شرعاً جائز نہ ہو۔

☆ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کی جائے کیوں کہ ایسی چیزیں شرعاً حلال نہیں ہے۔

☆ دعا کرتے وقت کسی قسم کی بدعقیدگی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

☆ دعا کرنے والے کا لباس اور کھانا پینا مال حلال سے ہو، مال حرام بھی قبولیت دعا کے لیے رکاوٹ کا باعث ہے۔

قبولیت دعا کے لیے ایسے اوقات کا انتخاب کیا جائے جن کے متعلق رسول اللہ e نے صراحت کی ہے کہ ان میں دعا قبول ہوتی ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:

☆ اذان اور اقامت کے درمیان ☆ بارش کے وقت

☆ فرض نماز کے بعد ☆ دوران سجدہ

خاص طور پر رات کے آخری حصہ میں بھی دعا ضرور قبول ہوتی ہے، تہجد کا اہتمام کیا جائے اور اس وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے۔ واللہ اعلم!

فوت شدہ کو مرحوم ومغفور کہنا

] آج کل اخبارات میں فوت شدگان کے لیے مرحوم ومغفور کے الفاظ لکھے جاتے ہیں جن سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ جنتی ہیں، کیا ایسا لکھنا یا کہنا جائز ہے؟ شریعت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[مرنے والے کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے، ہاں اگر قرآنی آیت یا صحیح حدیث سے ہمیں کسی کے جنتی یا جہنمی ہونے کا علم ہو جائے تو الگ بات ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم نے ابولہب کے جہنمی ہونے کا قطعی فیصلہ کیا ہے، اسی طرح احادیث میں عشرہ مبشرہ کو جنتی ہونے کی

! مسند احمد، ج:۳، ص:۱۸.

بشارت دی گئی ہے۔ ان کے علاوہ کسی دوسرے کے متعلق قطعی طور پر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

جیسا کہ سیدہ ام علاء r نے سیدنا عثمان بن مظعون t کے متعلق کہا تھا: ’’اے ابو سائب! محمد پر اللہ کی رحمت ہو! تیرے متعلق میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے ضرور عزت دی ہوگی۔‘‘

یہ سن کر رسول اللہ e نے فرمایا: ’’تجھے اس کے متعلق کیا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ضرور عزت دی ہے، اسے موت آ چکی ہے میں اس کے لیے رحمت کی امید کرتا ہوں، قطعی طور پر تو مجھے اپنے متعلق بھی علم نہیں ہے۔‘‘ 1

اس سے معلوم ہوا کہ قطعی طور پر کسی کے متعلق یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مغفور و مرحوم ہے، البتہ اگر نیت دعا کی ہے تو ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ جیسا کہ ہم کسی کے لیے a یا غفر اللہ لہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، اس سے مراد کسی کے مرحوم و مغفور ہونے کی خبر دینا نہیں بلکہ اس کے لیے دعائیہ کلمات ہیں جو استعمال کیے جا سکتے ہیں، اور زبان میں اختصار کے پیش نظر مرحوم دعا کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے۔ واللہ اعلم!

تیزیٔ نظر کے لیے ایک غلط وظیفہ

] پڑھے لکھے علماء کرام نظر کی تیزی کے لیے درج ذیل وظیفہ بتاتے ہیں، وظائف کی کتابوں میں بھی لکھا ہوتا ہے: ’’فَکَشَفْنَا عَنْکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ‘‘ اسے سات مرتبہ پڑھ کر انگلیوں کے پوروں پر پھونک ماری جائے پھر انہیں آنکھوں پر پھیر لیا جائے تو ایسا کرنے سے بینائی تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے متعلق وضاحت کریں۔

[درج بالا وظیفہ سورت ق کی آیت نمبر ۲۲ کا ایک حصہ ہے، پوری آیت ترجمہ سمیت حسب ذیل ہے: ﴿لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾ ’’بلاشبہ تو اس (قیامت کے) دن سے غافل رہا تو آج ہم نے تیری آنکھوں سے پردہ اٹھا دیا ہے اور آج تیری نظر خوب تیز ہے۔‘‘

قرآن و حدیث کے مطابق خود دم کرنا اور کسی بزرگ سے دم کروانا دونوں طرح جائز اور مباح ہے۔ رسول اللہ e خود دم کرتے تھے اور حسن اور حسین r کو بھی دم کرتے تھے۔ شرعی دم کے لیے یہ شرائط ہیں کہ وہ کسی قرآنی آیت اور حدیث پر مشتمل ہو یا کم از کم کوئی ایسی عبادت پر مشتمل ہو جو اپنے اندر کسی جامع معنی پر مشتمل ہو اور اس میں شرکیہ الفاظ اور مہمل عبارت نہ ہو۔ پھر اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ معنوی طور پر اس کا اس بیماری کے ساتھ گہرا تعلق ہو جس کے لیے دم یا وظیفہ کیا جا رہا ہے۔ اس وضاحت کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ درج بالا آیت کریمہ کا آنکھوں کی بینائی اور نظر کی تیزی کے ساتھ کیا تعلق ہے جبکہ اس کا سیاق و سباق ایک ایسے شخص کے متعلق ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول e کے فرمان سے لاتعلق اور بے خبر رہا، بلکہ وہ دنیا کی دلفریبی میں لگن اور مست رہا، جب قیامت کے دن محاسبے کا ذکر ہوتا تو فوراً اس کا انکار کرتا، اس پر عمل کرنا تو در کنار ایسی بات سننا بھی گوارا نہ کرتا، اسے قیامت کے دن کہا جائے گا: ’’آج ہم نے تیری آنکھوں کے سامنے سے غیب

! بخاری، الجنائز: ۱۲۴۳.

کے پردے اٹھا دیئے ہیں اور آج تجھے خوب نظر آ رہا ہے کہ وہ سب کچھ یہاں موجود ہے جس کی خبر انبیاء o دیتے تھے اور اب تجھے وہ تمام باتیں ٹھیک نظر آ رہی ہیں جن سے تو جان بوجھ کر غافل بنا رہا۔''

قارئین کرام! آیت کے مفہوم پر غور کریں، اس کا نظر کی تیزی کے ساتھ کیا تعلق ہے کہ اسے بینائی کے لیے بطور وظیفہ پڑھا جائے؟

ہمارے ہاں اس طرح کے دیگر دم اور وظیفے چلتے ہیں جنہیں جاہل عملیات والے اختیار کیے ہوتے ہیں۔ مثلاً:

☆ جائز اور ناجائز اسقاط حمل کے لیے درج ذیل آیت دم، وظیفے یا تعویذ کے طور پر دی جاتی ہے: ﴿وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ﴾ (الانشقاق: ۴) ''اور جو کچھ زمین کے اندر ہے اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی۔''

☆ بچوں کی پیدائش روکنے کے لیے درج ذیل آیت لکھ کر تعویذ لٹکانے کے لیے دیا جاتا ہے:

﴿قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ﴾ 1

''حکم دیا گیا اے زمین! تو اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان اب تو تھم جا۔''

آخر ان آیات کا اسقاط حمل اور افزائش نسل کو روکنے کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اس بناء پر ہم کہتے ہیں کہ بیمار اور مصیبت زدہ حضرات ایسے جاہل عاملین سے ہوشیار رہیں، مبادا بیماری اور مصیبت دور کرتے کرتے اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ ہمارے نزدیک اس طرح کے وظائف جہالت پر مبنی ہیں، ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

میت کے لیے اجتماع اور اجتماعی دعا

] ہمارے ہاں فوتگی کے تیسرے دن قل خوانی وغیرہ کو بدعت کہا جاتا ہے جبکہ ہمارے علاقہ میں اسے بدعت کہنے والوں کے ہاں یہ رسم چلی آ رہی ہے کہ میت کے مرنے کے تین چار دن بعد مسجد میں میت کے عزیز و اقارب اور دیگر لوگ اکٹھے ہوتے ہیں، پھر موت اور عذاب قبر کے متعلق خطاب ہوتا ہے، اس کے بعد میت کے لیے اجتماعی دعا کی جاتی ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں ایسا کرنے کی حیثیت واضح کریں۔

[واضح رہے کہ دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں کسی وقت بھی ترمیم و اضافہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ صورت مسئولہ میں جس رسم کا ذکر کیا گیا ہے کہ میت کے مرنے کے تین چار دن بعد مسجد میں اکٹھے ہونا اور تقریر کے بعد میت کے لیے اہتمام کے ساتھ اجتماعی دعا کرنا پھر کھانا کھانے کا بندوبست کرنا یہ سب رواجی چیزیں ہیں، شریعت میں ان کا کوئی ثبوت نہیں اور نہ ہی قرون اولیٰ میں اس کا کوئی ذکر ملتا ہے۔ بلکہ صحابہ کرام y ایسی باتوں سے اجتناب کرتے تھے۔ چنانچہ سیدنا جریر بن عبد اللہ البجلی t فرماتے ہیں: ''مخصوص مقام پر اہتمام کے ساتھ بیٹھے رہنے اور اہل میت کی طرف سے آنے والے مہمانوں کے لیے کھانے کا اہتمام کرنے کو صحابہ کرام y نوحہ شمار کرتے تھے۔'' 2

! هود: ۴۳.   @ مسند امام احمد: ج۲، ص: ۲۰۴.

اس قسم کا تعزیتی اجتماع درست نہیں، میت کے گھر والوں کے لیے تو کھانا تیار کیا جانا چاہیے لیکن جب دور و نزدیک سے لوگ آ کر تعزیت کے نام پر مہمان بن بیٹھتے ہیں تو کھانا تیار کرنے والے کو ان سب کے لیے کھانا تیار کرنا ہوتا ہے جو ایک ناروا بوجھ ہے۔ اس طرح کے اجتماع کو نوحہ سے تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ نوحہ میں بھی عورتوں کا اجتماع ہوتا ہے اور اس اجتماع کا مقصد سوائے اظہار افسوس کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ جبکہ یہ مقصد اس طرح جمع ہوئے بغیر بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ بلکہ ہمارے نزدیک تو تعزیت کے لیے تین دن کی تحدید بھی درست نہیں بلکہ جب بھی موقع ملے تو تعزیت کی جا سکتی ہے۔ رسول اللہ e نے سیدنا جعفر طیار t کی شہادت پر ان کے اہل خانہ سے تین دن کے بعد تعزیت فرمائی تھی جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے۔ 1

علامہ البانی a فرماتے ہیں کہ ''تعزیت کے لیے دو باتوں سے اجتناب کرنا چاہیے:

☆ گھر یا مسجد میں کسی خاص مقام پر تعزیت کے لیے اجتماع کرنا۔

☆ اہل بیت کی طرف سے آنے والے مہمانوں کے لیے کھانے کا اہتمام کرنا۔ (احکام الجنائز)

صورت مسئولہ میں دونوں باتوں کا اہتمام ہوتا ہے کہ تعزیت کے لیے مسجد میں اجتماع ہوتا ہے اور آنے والوں کے لیے کھانے کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے، یہ دونوں باتیں محل نظر ہیں۔

ہمارے نزدیک بریلوی حضرات کا فوتگی کے تیسرے دن قل خوانی کا اہتمام اور اہل حدیث حضرات کا مسجد میں تقریر اور اس کے بعد میت کے لیے اجتماعی دعا کا اہتمام اور کھانے وغیرہ کا بندوبست، ان دونوں میں اصولی طور پر کوئی فرق نہیں۔ یہ سب حیلے بہانے ہیں جو مروجہ رسوم و بدعات کو مشرف با اسلام کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔

تعزیت سے مراد اہل میت کو صبر کی تلقین، ان کے لیے دعا خیر اور میت کے لیے دعا مغفرت کرنا ہے۔ اس کے لیے کسی دن یا جگہ کی تعین قطعاً درست نہیں۔ تعزیت کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جس کسی کی جہاں کہیں میت کے کسی قریبی رشتہ دار سے ملاقات ہو وہاں تعزیت کر لے یا اگر کسی اہل میت کے ہاں جائے تو تعزیت کر کے واپس آ جائے۔ وہاں بلا ضرورت اخبار بینی کے لیے بیٹھ رہنا پھر وہاں رشتے داروں اور ہمسایوں کا مجمع رہنا خلاف سنت ہے۔

چنانچہ علامہ نووی لکھتے ہیں:

''تعزیت کے لیے اہتمام کے ساتھ بیٹھنا امام شافعی h اور ان کے اصحاب نے اسے ناپسند کیا ہے کہ اہل بیت ایک خاص مقام پر جمع ہوں اور تعزیت کرنے والے وہاں جمع ہوں، بلکہ اہل بیت کو چاہیے کہ وہ اپنے کام کاج میں مصروف ہوں، وہاں ان سے تعزیت کر لی جائے۔ اس میں مردوں اور عورتوں کے اجتماع میں کوئی فرق نہیں۔ بہر حال یہ اجتماع محل نظر ہے۔'' 2

! مسند امام احمد، ج۱، ص :۱۷۵۔ @ المجموع، ج۵، ص:۳۰۶۔

علماء حضرات کو چاہیے کہ ایسے اجتماعات میں تقریر کرنے کی بجائے، اہل بیت کو اس کی قباحت وشناعت سے آگاہ کریں بلکہ اس سلسلہ میں وہاں شریک ہونے کی بجائے صاف صاف کلمہ حق کہنے کا فریضہ ادا کریں۔ واللہ اعلم!

خارش کا دم اور علاج

] مجھے بہت پرانی خارش ہے، جسم پر سیاہ دھبے پڑھ چکے ہیں، میں اس سے بہت تنگ ہوں، علاج معالجہ بہت کیا ہے لیکن آرام نہیں آتا، اس سلسلہ میں میری رہنمائی کریں۔ کوئی دم وغیرہ تجویز کریں، یا کوئی نسخہ بتائیں تاکہ مجھے اس موذی مرض سے نجات مل جائے۔

[ہماری یہ کتاب دینی مسائل کے لیے ہے، علاج معالجہ کے لیے کسی مستند حکیم یا تجربہ کار ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے، تاہم درج ذیل دعائیں، احتیاطی تدابیر اور علاج سے خارش جیسے موذی مرض سے چھٹکارا ممکن ہے، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سائل کو شفاء کاملہ وعاجلہ عنایت فرمائے۔

☆ سیدنا عثمان بن ابو العاص t نے رسول اللہ e سے شکایت کی کہ میں نے جب سے اسلام قبول کیا ہے جسم میں ایک درد سا محسوس کرتا ہوں تو رسول اللہ e نے فرمایا کہ درد کی جگہ پر ہاتھ رکھ کر تین مرتبہ بسم اللہ پڑھیں سات مرتبہ یہ دعا کریں:

((اَعُوْذُ بِعِزَّةِاللهِ وَقُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُوْا وَاُحَاذِرُ))!

یہ عمل کرنے سے ان کا درد ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔

☆ صبح وشام درج ذیل وظیفہ پڑھنے سے بھی ہر قسم کی تکلیف سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے:

((بِسْمِ اللهِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِہٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ)) 2

☆ سیدہ عائشہ r فرماتی ہیں کہ جب کسی کو زخم لگتا یا پھنسی پھوڑا نکل آتا تو آپ e شہادت کی انگلی پر لعاب دہن لگاتے اور اسے زمین پر رکھ کر درج ذیل دعا پڑھتے:

((بِسْمِ اللهِ تُرْبَةُ اَرْضِنَا بِرِیْقَةِ بَعْضِنَا لِیُشْفٰی سَقِیْمُنَا بِاِذْنِ اللهِ))3

پھر اس انگلی کو زخم یا پھوڑے پر لگاتے، سائل خود بھی یہ عمل کرسکتا ہے۔

☆ احتیاطی تدابیر یہ ہیں کہ موٹے اور کھردرے کپڑے کے استعمال سے اجتناب کیا جائے، نرم دھاگے میں بنا ہوا کوئی لباس استعمال کیا جائے جیسا کہ سیدنا عبدالرحمن بن عوف t اور سیدنا زبیر بن العوام t کو خارش کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا تو

! مسلم، السلام: ۲۲۰۲۔ @ مسلم، الذکر والدعا: ۲۷۰۹۔

صحیح بخاری، الطب: ۵۷۴۶۔

رسول اللہ e نے انہیں ریشم کالباس پہننے کا مشورہ دیا تھا۔ 1

☆ نیم کے پتوں کو پانی میں جوش دے کر ڈیٹول کے صابن سے روزانہ غسل کیا جائے امید ہے کہ جلدی امراض میں اس سے افاقہ ہوگا۔

درج ذیل نسخوں کو استعمال کیا جائے اور مستقل مزاجی کے ساتھ انہیں استعمال کیا جائے۔

☆ مہندی کے خشک پتوں کو باریک پیس کر گھی میں ملائیں اور خارش زدہ مقام پر اسے لگائیں۔

☆ لیموں کا پانی ایک تولہ، عرق گلاب دو تولہ اور روغن چنبیلی تین تولہ، ان تینوں کو اچھی طرح حل کریں اور مالش کریں۔

☆ چولہے کی مٹی اور دیسی اجوائن ہم وزن لیں اور انہیں باریک کر کے یک جان کریں، پھر اسے ترش دہی میں ملائیں اور جسم پر لگائیں۔

اس کے علاوہ بازار سے خارش کے لیے مختلف لوشن بھی دستیاب ہیں، کسی ڈاکٹر سے مشورہ کر کے انہیں استعمال کرنے سے بھی فائدہ ہوگا۔ ان شاء اللہ!

نماز اشراق اور اس کی فضیلت

] ہمارے والد محترم کا معمول تھا کہ وہ نماز فجر پڑھ کر مسجد میں ہی رہتے، اللہ کا ذکر کرتے، پھر نماز اشراق پڑھ کر گھر واپس آتے اور فرماتے کہ اس عمل سے حج وعمرہ کا ثواب ملتا ہے۔ اب میں نے سنا ہے کہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث کمزور ہے۔ وضاحت فرمائیں۔

[نماز اشراق کی اہمیت اور اس کی فضیلت سے تو انکار ممکن نہیں۔ جیسا کہ سیدنا ابوذر t بیان کرتے ہیں:

''صبح ہوتی ہے تو تمہارے انگ انگ پر صدقہ لازم ہوگیا ہوتا ہے اور ہر روز ایسے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی ہر نماز، روزہ، حج، تسبیح، تکبیر اور تحمید صدقہ ہوتی ہے۔ رسول اللہ e نے یہ اعمال صالحہ شمار کرنے کے بعد فرمایا: ''تمہیں ان سب سے اشراق کی دو رکعت کفایت کرتی ہیں۔'' 2

اس کے مزید اجر وثواب کے متعلق مختلف احادیث مروی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''جو شخص نماز فجر باجماعت ادا کرتا ہے، پھر مسجد میں طلوع آفتاب تک بیٹھا اللہ کا ذکر کرتا رہتا ہے، بعد ازیں اس نے دو رکعت ادا کیں تو اس کے لیے حج اور عمرے کی مانند ثواب ہے۔'' 3

امام ترمذی a نے اس حدیث کو حسن غریب قرار دیا ہے، اگرچہ اس کی سند میں ابوظلال نامی راوی ہے جس کے متعلق محدثین نے کلام کیا ہے لیکن امام ترمذی a نے خود ہی اس راوی کے متعلق فرمایا ہے: ''میں نے اس کے متعلق امام

ابخاری، اللباس: ۵۸۳۹. @ مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۷۲۰.

ترمذی، ابواب الصلوۃ: ۵۸۶.

بخاری a سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا: هو مقارب الحديث۔‘‘

محدثین کے ہاں یہ اصطلاح ایسے راوی کے قبول ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے، اس حدیث کے شواہد ہیں جس کی بناء پر اسے قابل عمل قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً سیدنا ابوامامہ t سے بھی روایت اسی فضیلت کے ساتھ مروی ہے۔

حافظ منذری a نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔

امام العصر علامہ البانی a نے اس حدیث کو قابل عمل قرار دیا ہے۔ 1

بہر حال اشراق کی مذکورہ فضیلت احادیث سے ثابت ہے، اسے ضعیف قرار دینا منہ زوری ہے۔ واللہ اعلم!

! صحیح الجامع، حدیث نمبر ۶۳۴۶.

مردوں کے لیے مہندی کا استعمال

] کیا مرد حضرات ہاتھ پاؤں پر مہندی لگا سکتے ہیں؟ ہمارے ہاں شادی بیاہ کے موقع پر مرد بھی مہندی لگاتے ہیں، اس کے متعلق وضاحت درکار ہے۔

[مہندی سے ہاتھ پاؤں رنگنا عورتوں کی زینت ہے، مردوں کو ایسی زینت سے منع کیا گیا ہے جسے عورتیں استعمال کرتی ہوں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e کے پاس ایک ایسا ہیجڑہ لایا گیا جس نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں پر مہندی لگا رکھی تھی، رسول اللہ e نے پوچھا: ''اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟''

عرض کیا گیا یا رسول اللہ e! اسی طرح یہ عورتوں سے مشابہت اختیار کرتا ہے۔

رسول اللہ e نے یہ سن کر فرمایا کہ اسے مدینہ کی آبادی سے نکال کر نقیع کے علاقہ میں چھوڑ آؤ۔

لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ e! ہم اسے قتل نہ کر دیں؟

رسول اللہ e نے فرمایا: ''مجھے نمازی حضرات کو قتل کرنے سے منع کر دیا گیا ہے۔'' 1

راوی ابو اسامہ بیان کرتے ہیں کہ نقیع، مدینہ طیبہ سے ایک جانب جگہ کا نام ہے جو بقیع سے الگ ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مہندی لگانا عورتوں کی زینت ہے اور مرد حضرات کو اس کی اجازت نہیں۔ اس ممانعت کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوئی ہے جسے حضرت انس t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے مرد حضرات کو زعفران لگانے سے منع کیا ہے۔ 2

حافظ ابن حجر a لکھتے ہیں: ''مردوں کو ہاتھ اور پاؤں رنگنے کی ممانعت ہے ہاں بطور دواء مہندی استعمال کی جا سکتی ہے۔'' 3

بطور دواء استعمال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گرمی یا آگ سے جلنے کی وجہ سے ہاتھ اور پاؤں پر چھالے بن جائیں تو زخموں پر مہندی لگانے میں چنداں حرج نہیں، لیکن بطور فیشن مہندی کے ساتھ اپنے ہاتھ اور پاؤں رنگنا مردوں کے لیے جائز نہیں لہٰذا شادی کے موقع پر مرد حضرات کو مہندی کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم!

! ابوداؤد، الادب:۴۹۲۸. @ صحیح بخاری، اللباس:۵۸۴۶.

فتح الباری: ص۳۶۷، ج۱۰.

چھوٹی بچیوں کو غیر شرعی لباس پہنانا

] ہمارے ہاں خواتین چھوٹی بچیوں کو مختصر لباس پہنا دیتی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ یہ بچیاں مکمل لباس پہننے کی مکلف نہیں ہیں، کیا ایسا کرنا درست ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

[ہمارے رجحان کے مطابق خواتین کا یہ طریقہ درست نہیں، کیوں کہ اگر بچیوں کو بچپن میں مختصر لباس پہننے کی عادت پختہ ہوگئی تو بڑی عمر میں انہیں مکمل لباس پہننے میں دشواری آسکتی ہے، اس لیے ماؤں کو چاہیے کہ وہ اپنی بچیوں کی صحیح تربیت کریں اور انہیں ایسا لباس پہنائیں جو شرع کے مطابق ہو۔

جیسا کہ صحابیات کے متعلق احادیث میں ہے کہ وہ عاشوراء کا روزہ رکھنے کی عادت ڈالنے کے لیے شیر خوار بچوں کو دن کے اوقات میں دودھ نہیں پلاتی تھیں بلکہ انہیں کھلونوں میں مصروف رکھتی تھیں تا کہ انہیں روزہ رکھنے کی عادت پڑ جائے۔ 1

خواتین کو چاہیے کہ وہ اس پہلو کو نظر انداز نہ کریں اور بچیوں کی تربیت پر خاص توجہ دیں۔ واللہ اعلم!

عورتوں کے لیے سونا پہننا

] کیا عورتیں سونے کے زیورات پہن سکتی ہیں، ہمارے ہاں کچھ اہل علم کا کہنا ہے کہ عورتیں سونے کے زیورات نہیں پہن سکتیں، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں۔

[عورتوں کو سونے کے زیورات سے زینت حاصل کرنا جائز ہے، قرآن کریم میں اس کے متعلق واضح اشارہ ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴾ 2

''کیا جو زیورات میں پرورش پائے اور گفتگو کرتے وقت صاف بات نہ کر سکے۔ (وہ اللہ کی اولاد بننے کے قابل ہے؟)''

اللہ تعالیٰ کے اس عمومی فرمان میں عورتوں کے لیے سونا پہننا جائز ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ کیوں کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے زیور کو عورت کے خاص وصف کے طور پر بیان کیا ہے خواہ وہ زیور سونے کا ہو یا کسی اور قیمتی دھات کا۔ رسول اللہ e نے اس امر کی وضاحت فرمائی ہے، چنانچہ حضرت علی t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے ایک مرتبہ ریشم کو اپنے دائیں ہاتھ میں اور سونے کو اپنے بائیں ہاتھ میں لے کر فرمایا: ''یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں کے لیے حرام ہیں۔'' 3

ایک روایت میں وضاحت ہے کہ یہ دونوں میری امت کی عورتوں کے لیے جائز ہیں۔ 4

اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعری t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں

! صحیح بخاری، الصوم:۱۹۶۰۔ @ الزخرف:۱۸۔
ابوداؤد، اللباس:۴۰۵۷۔ $ ابوداؤد، اللباس:۳۵۹۵۔

کے لیے حلال کیا گیا ہے جب کہ مردوں کے لیے حرام ہے۔'' 1

امام ابن ماجہ a نے اس قسم کی احادیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:

((باب لبس الهرير والذهب للنسآء))

''عورتوں کے لیے ریشم اور سونا پہننا۔'' 2

مذکورہ احادیث و آثار کے پیش نظر عورتوں کے لیے سونے کے زیورات زیب تن کرنا جائز ہے لیکن ہمارے رجحان کے مطابق اس سلسلہ میں میانہ روی اختیار کی جائے کیوں کہ زیادہ زیورات پہننے سے فخر و تکبر کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے غرباء کا دل بھی دکھتا ہے، اس لیے زیورات کی بہتات اور کثرت سے اجتناب کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم!

عورت کا اپنے بال کٹوانا

] ہمارے بازاروں اور گلی کوچوں میں بیوٹی پارلر بنے ہوئے ہیں، جہاں عورتیں مغربی تہذیب کی نقالی کرتی ہوئی اپنے بالوں کی کٹنگ کرواتی ہیں، بعض مقامات پر یہ کام مرد حضرات کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ازواج مطہرات کے ایک عمل کا حوالہ دیا جاتا ہے، براہ کرم اس کی وضاحت کر دیں۔

[ہمارے رجحان کے مطابق عورت کے لیے بال کٹوانے کے پانچ مقاصد سامنے آتے ہیں:

☆ کسی بیماری کے پیش نظر بالوں کو کٹوایا یا منڈوایا جائے۔

☆ مردوں کی مشابہت اختیار کرتے ہوئے بال کٹوائے یا ترشوائے جائیں۔

☆ مغربی تہذیب و ثقافت کو اپناتے ہوئے اپنے بالوں کو ہلکا کروایا جائے۔

☆ دوسروں کو دکھانے اور خوبصورت نظر آنے کے لیے بال کٹوائے جائیں۔

☆ اپنے خاوند کے لیے زیب و زینت کے طور پر اس فیشن کا اختیار کیا جائے۔

جہاں تک پہلے مقصد کی بات ہے تو بیماری کی وجہ سے ایسا کیا جا سکتا ہے، اس میں کوئی ممانعت نہیں۔

جیسا کہ سیدہ میمونہ r نے حج کے موقع پر بیماری کی وجہ سے اپنے سر کے بال منڈوا دیئے تھے۔ 3

مردوں کی مشابہت اختیار کرتے ہوئے بالوں کا کٹوانا یا منڈوانا جائز نہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ e نے ان عورتوں پر لعنت کی ہے جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔ 4

مغربی تہذیب و ثقافت کو اپناتے ہوئے بالوں کو ہلکا کرنے کی بھی شرعاً اجازت نہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ''جو کسی قوم

! سنن نسائی: النزنية:٥١٥.   @ ابن ماجہ، اللباس باب نمر ١٩.

الاحسان برتیب صحیح ابن حبان: ج٧، ص١٧٢، حدیث نمبر:٤١٢٢.

$ صحیح بخاری، اللباس:٥٨٨٥.

کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ قیامت کے دن انہی میں سے اٹھایا جائے گا۔'' 1

اس حدیث کے پیش نظر مسلمانوں کو غیر مسلموں کا لباس، وضع قطع اور ان کی تہذیب و ثقافت اختیار کرنا حرام ہے۔ اپنے خاوند کے لیے زیب و زینت کے طور پر اسے اختیار کرنا بھی محل نظر ہے کیوں کہ خواتین اسلام نے ایسے فیشن اختیار نہیں کیے ہیں اور ان کی شرعاً اجازت نہیں ہے خواہ وہ اپنے خاوند کو خوش کرنے کے لیے ہی کیوں نہ ہوں۔

دوسروں کو دکھانے اور خوبصورت نظر آنے کے لیے بھی ایسا کرنا درست نہیں۔

اس سلسلہ میں ازواج مطہرات کے جس عمل کا حوالہ دیا جاتا ہے اس کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت ابو سلمہ بن عبدالرحمن، سیدہ عائشہ W سے غسل جنابت کے متعلق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ازواج مطہرات اپنے بالوں سے (کچھ کاٹ) لیتی تھیں حتی کہ وہ وفرہ کی مانند ہوتے تھے۔'' 2

اس حدیث میں لفظ ''يأخذن'' استعمال ہوا ہے، اس کا معنی ضروری نہیں کہ کاٹنا ہی ہو، بلکہ مسائل طہارت کی مناسبت سے اس کا معنی اپنے بالوں کے خاص انداز میں جوڑا بنانا ہے، عورتیں عام طور پر غسل کے موقع پر ایسا کرتی ہیں، اس وقت بال وفرہ کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ حدیث میں کاف تشبیہ کے طور پر استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ بال وفرہ نہیں تھے بلکہ دیکھنے میں وفرہ معلوم ہوتے تھے۔ واضح رہے کہ ''وفرہ'' وہ بال ہوتے ہیں جو کانوں تک آجائیں، بالوں کی اس قسم کے اوصاف مردوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں، عورتوں کے لیے یہ اوصاف نہیں ہوتے۔

اگر اس لفظ کا معنی کاٹنا بھی کر لیا جائے تو بھی فیشن کے طور پر ایسا کرنا ثابت نہیں ہوتا کیوں کہ ازواج مطہرات نے رسول اللہ e کی وفات کے بعد اپنے بالوں کو کانوں تک کاٹا، انہوں نے سادگی اور ترک زینت کے طور پر ایسا کیا تھا تاکہ کلی طور پر نکاح کے اسباب و دواعی کو ختم کر دیا جائے۔ کیوں کہ رسول اللہ e کی وفات کے بعد ازواج مطہرات کو آگے عقد ثانی کرنے کی اجازت نہ تھی جیسا کہ قرآن کریم میں اس کی صراحت ہے۔ 3

بہر حال اس حدیث سے نوجوان عورتوں کے بالوں کا فیشن کشید کرنا کئی ایک طرح سے محل نظر ہے:

☆ اس کی بنیاد اظہار زیب و زینت اور بے پردگی پر ہے۔

☆ اس سے مقصود مغربی عورتوں کی نقالی ہے۔

☆ یہ کام مردوں سے کرایا جاتا ہے جو سراسر بے حیائی اور بے غیرتی ہے۔

ہم اس کی کسی طور پر اجازت دینے کے روادار نہیں ہیں۔ کیوں کہ اس کی آڑ میں مغربی تہذیب و ثقافت کو پھلنے پھولنے کا موقع دینا ہے۔ اس حدیث میں صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ''وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو گیا اور وہ شادی کروانے سے

! ابوداود، اللباس: ۴۰۳۱. @ مسلم، الحيض: ۳۲۰.

الأحزاب: ۵۳.

بالکل ناامید ہو وہ ایسا کرسکتی ہے جیسا کہ ازواج مطہرات نے کیا تھا، لیکن اسے نوجوان عورتوں کے لیے بطور فیشن ایسا کرنے کی اجازت دینا مغربی تہذیب کی آبیاری کرنا ہے۔''

بہر حال ہمارے خطباء حضرات کو اس کی قباحت اور شناعت کو مؤثر انداز میں بیان کرنا چاہیے تاکہ ہماری خواتین اس قسم کے فیشن کا شکار نہ ہوں جس کی بنیاد کافر عورتوں کی نقالی اور مغربی تہذیب ہے۔ واللہ اعلم!

عورت کا لباس

] آج کل لڑکیاں جو لباس زیب تن کرتی ہیں وہ دائیں بائیں طرف سے کھلا ہوتا ہے اور پنڈلی کا کچھ حصہ بھی ننگا ہوتا ہے، ایسے لباس کے متعلق کتاب وسنت کی کیا ہدایات ہیں؟ وضاحت سے لکھیں۔

[رسول اللہ e کے عہد مبارک میں عورتیں ایسی لمبی قمیص پہنتی تھیں جو پاؤں کی طرف سے ٹخنوں تک اور ہاتھوں کی طرف سے ہتھیلیوں تک ہوتی تھیں، عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ کامل شرم وحیاء کا مظاہرہ کرے اور ایسا لباس زیب تن کرے جو اس کے تن بدن کو پوری طرح ڈھانپ لے۔

جیسا کہ رسول اللہ e نے سیدہ ام سلمہ r کے سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ اگر عورت کے پاؤں مردوں کے لباس سے ایک بالشت زیادہ لٹکانے پر ننگے رہتے ہوں تو عورتیں اپنا لباس ایک ہاتھ مزید لٹکا لیا کریں، اس سے زیادہ نہ لٹکائیں۔ 1

اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو پاؤں کی پشت سمیت پورے جسم کو ڈھانپ کر رکھنا چاہیے، خاص طور پر جب کھلے مقامات میں نکلے تو پردے کا خوب اہتمام کرنا چاہیے۔ اسے چاہیے کہ وہ رسول اللہ e کے درج ذیل فرمان کا مصداق نہ بنے، آپ e نے فرمایا:

''اہل جہنم کی دو قسمیں ایسی ہیں جنہیں میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔ ایک تو وہ لوگ جن کے پاس گائے کی دموں جیسے کوڑے ہوں گے، جن کے ساتھ وہ لوگوں کو ماریں گے۔ دوسرے ایسی عورتیں جنہوں نے لباس تو پہنا ہوگا اس کے باوجود وہ ننگی ہوں گی۔ مائل کرنے والی اور مائل ہونے والی، ان کے سر بختی اونٹوں کی کوہانوں جیسے ہوں گے، وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گی اور نہ ہی اس کی خوشبو پاسکیں گی! حالانکہ جنت کی خوشبو بہت دور دراز کی مسافت سے آتی ہوگی۔'' 2

ان احادیث کی بناء پر عورتوں کو ایسا لباس پہننا چاہیے جس سے ان کی پردہ داری مجروح نہ ہو۔ واللہ اعلم!

سر کو کھلا رکھنے کا قانون

] میں ایک ایسے ملک میں رہائش پذیر ہوں جہاں عورتوں کو پردہ کرنے اور خاص طور پر سر ڈھانپنے سے روک دیا گیا ہے، عدم تعمیل کی صورت میں سکول سے اخراج اور ملازمت سے برخاستگی ہوسکتی ہے، ایسے حالات میں ہمیں کیا حکم ہے؟

! ترمذی، اللباس: ۱۷۳۱. @ مسلم، اللباس الزینۃ: ۲۱۲۸.

[ایسا ملک جہاں عورت کی چادر اور چار دیواری کا تحفظ نہ ہو وہاں سے ہجرت کر کے کسی ایسے ملک میں رہائش رکھی جائے جہاں اس قسم کے سیاہ قانون نہ ہوں۔ بلاشبہ حکمرانوں کی اطاعت ضروری ہے، جیسا کہ درج ذیل آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے۔

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ﴾ 1

''اسے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ e کا کہا مانو اور اپنے اولی الامر کی بھی بات مانو۔''

اس آیت کریمہ میں ''اولی الامر'' سے مراد ملک کے حکمران ہیں لیکن ان کے لیے فعل امر ''اطیعوا'' ذکر نہیں فرمایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی اطاعت، اللہ اور رسول اللہ e کی اطاعت کے تابع ہے، اگر ان کا حکم اللہ اور اس کے رسول e کے حکم کے مخالف ہو تو اس صورت میں ان کی بات سننے اور عمل کرنے کے ہرگز لائق نہیں۔ اس کی مزید وضاحت رسول اللہ e کے ارشاد گرامی سے بھی ہوتی ہے۔ آپ e فرماتے ہیں: ''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہوتی۔'' 2

ہمارے رجحان کے مطابق ایسے ملک میں رہائش رکھنا ہی درست نہیں جہاں کتاب وسنت سے متصادم قوانین ہیں، ایسے حالات میں کسی دوسرے ملک میں رہائش رکھ لی جائے۔ اگر وہاں رہنا ناگزیر ہو تو حتی المقدور کتاب وسنت پر عمل کیا جائے، یہ قانون گھر سے باہر نکلتے وقت ہوگا، عورتیں اپنے گھروں میں رہیں۔ باقی رہی تعلیم تو ایسی تعلیم کے حصول سے اجتناب کرنا چاہیے جس کے لیے کسی گناہ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہو۔ عورتوں کے لیے اتنی تعلیم ہی کافی ہے جس کی دنیوی اور دینی طور پر انہیں ضرورت ہو، اتنی تعلیم گھر کی چار دیواری میں رہتے ہوئے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے ایسے سکول میں داخل ہونا جہاں شریعت کی مخالفت کی جاتی ہو اس سے گریز کیا جائے۔ بہرحال ناجائز کاموں میں حکمرانوں کی اطاعت ضروری نہیں، ملازمت کا بہانہ بنا کر شریعت کی خلاف ورزی کرنا ہمارے نزدیک عذر لنگ ہے۔ واللہ اعلم!

شرعی حجاب

] شرعی حجاب کیا ہے؟ میں نے ایک عورت سے شادی کی ہے، خاندانی روایات کے مطابق وہ اپنے بہنوئی سے پردہ نہیں کرتی، اس کا کہنا ہے کہ چہرے کا چھپانا شرعی حجاب سے خارج ہے۔ نیز وہ بہنوئی سے پردہ کرنا ضروری خیال نہیں کرتی، اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی فرمائیں۔

[شرعی حجاب کا مطلب یہ ہے کہ عورت ان تمام اعضاء کو ڈھانپ کر رکھے جن کا چھپانا شریعت نے ضروری قرار دیا ہے، جن اعضاء کو ڈھانپنا ضروری ہے ان میں چہرہ برسرفہرست ہے کیوں کہ چہرہ ہی فتنے اور رغبت کا محل ہے۔ اس بناء پر عورت کا اجنبی لوگوں سے اپنا چہرہ چھپانا شرعی حجاب ہے۔

سیدہ عائشہ r بیان فرماتی ہیں کہ ایام حج میں قافلے ہمارے پاس سے گزرتے تھے اور ہم رسول اللہ e کے ہمراہ

! النساء:۵۹.   @ مسند احمد: ج۵، ص۶۶.

حالت احرام میں ہوتی تھیں، جب وہ ہمارے قریب آتے تو ہم میں سے ہر ایک اپنی چادر اپنے سر سے لٹکا کر چہرے پر ڈال لیتی اور جب وہ گزر جاتے تو ہم اپنے چہروں سے چادریں اوپر کر لیتیں۔ 1

نیز فاطمہ بنت منذر r بیان کرتی ہیں کہ ہم حالت احرام میں اپنے چہرے ڈھانپا کرتی تھیں اور سیدہ اسماء بنت ابوبکر W بھی ہمارے ساتھ ہوتی تھیں۔ 2

مستدرک حاکم میں ہے کہ ہم مردوں سے اپنے چہروں کا پردہ کرتی تھیں۔ 3

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چہرے کا پردہ ضروری ہے اور یہ شرعی حجاب میں شامل ہے، کتاب وسنت، اقوال صحابہ اور اقوال علماء اسلام سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ غیر مردوں کے سامنے عورتوں پر تمام جسم اور چہرے کا پردہ واجب ہے۔ نیز بہنوئی بھی غیر محرم ہے، اس سے پردہ بھی ضروری ہے خواہ خاندانی روایات اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ ہمارے لیے تو حجت شریعت ہے، اس کے لیے اپنی خاندانی روایات کو چھوڑا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اظہار زینت کی اجازت صرف محرم رشتے داروں کے سامنے دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ﴾

''عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر اپنے خاوندوں کے سامنے۔'' 4

اس آیت کریمہ میں ان محرم رشتے داروں کی فہرست ہے جن کے سامنے عورت اپنی زینت کا اظہار کر سکتی ہے، ان میں بہنوئی نہیں ہے لہٰذا اس سے بھی پردہ کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم!

سفید بالوں کو رنگنا

] کیا داڑھی یا سر کے سفید بالوں کو رنگنا ضروری ہے؟ کچھ لوگ سفید بالوں کو یونہی چھوڑ دینے کی بہت تردید کرتے ہیں اور انہیں یہود ونصاریٰ کی علامت قرار دیتے ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

[سفید بال، قابل تکریم ہیں، رسول اللہ e نے انہیں مسلمان کا نور قرار دیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

''رسول اللہ e نے بڑھاپے کے سفید بالوں کو اکھاڑنے سے منع فرمایا اور فرمایا کہ یہ مسلمان کا نور ہے۔'' 5

سیدنا انس t اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ آدمی اپنے سر اور داڑھی کے سفید بالوں کو اکھاڑے۔ 6

البتہ سفید بالوں کو رنگنا مستحب ہے جیسا کہ رسول اللہ e نے فتح مکہ کے موقع پر سیدنا ابوبکر صدیق t کے والد گرامی کو دیکھ کر فرمایا تھا: ''اس کے بالوں کی سفیدی کو کسی دوسرے رنگ میں تبدیل کرو لیکن سیاہ رنگ سے اجتناب کرو۔'' 7

! ابوداود، المناسک:۱۸۳۳.
@ موطا امام مالک، ج۱، ص۳۲۸.
# مستدرک حاکم، ج۱، ص۴۵۴.
$ النور:۳۱.
% الترغیب، اللباس:۶۰۹۲.
^ مسلم، الفضائل: ۲۳۴۱.
& مسلم، اللباس:۵۵۰۹.

نیز رسول اللہ e نے فرمایا: ''یہود ونصاریٰ خضاب نہیں لگاتے تم ان کی مخالفت کرو۔'' 1

اگر چہ تاکید اسی بات کی ہے کہ داڑھی اور سر کے سفید بالوں کو سیاہی کے علاوہ کسی بھی دوسرے رنگ میں رنگا جائے لیکن انہیں سفید رکھنا بھی جائز ہے۔ جیسا کہ سیدنا انس t کا بیان ہے کہ ''رسول اللہ e نے اپنے بالوں کو نہیں رنگا کیوں کہ چند سفید بال آپ کی داڑھی، کنپٹی میں تھے۔ نیز تھوڑے سے سفید بال آپ e کے سر مبارک میں بھی تھے۔'' 2

چند ایک صحابہ کرام [بھی ایسے تھے جن کی داڑھی اور سر کے بال سفید تھے۔ جیسا کہ امام شعبی a بیان کرتے ہیں: ''میں نے سیدنا علی t کو دیکھا کہ ان کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے۔'' 3

سیدنا عبداللہ بن عمرو w کے سر اور داڑھی کے بال بھی سفید تھے۔ 4

سیدنا عمران بن حصین t کے متعلق بھی روایات میں ہے کہ ان کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ 5

ان احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ سفید بالوں کو رنگنا مستحب ہے، البتہ اگر کوئی سفید رکھتا ہے تو اس میں بھی جواز کا پہلو ہے۔ واللہ اعلم!

! بخاری، اللباس: ۵۸۹۹.	@ مسلم، الفضائل: ۲۳۴۱.

# مصنف ابن ابی شیبہ: ج۸، ص۲۵۶.	$ طبقات ابن سعد: ج۷، ص۱۲.

% طبقات ابن سعد: ج۵، ص۲۹.

حقوق اللہ اور حقوق العباد

] واعظین اکثر بیان کرتے ہیں کہ حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے جب تک اسے صاحب حق معاف نہ کرے اور حقوق اللہ، اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہیں، اب سوال یہ ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تعیین کس طرح کی جائے گی؟

[اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے اسے شرعی احکام کو بجالانے کا مکلف ٹھہرایا ہے، ان شرعی احکام کی بجا آوری سے مقصود اگر معاشرہ کی عام مصلحت ہے تو ایسے شرعی احکام کو حقوق اللہ اور اگر کوئی خاص مصلحت ہے تو ایسے احکام کو حقوق العباد کا نام دیا جاتا ہے۔بعض دفعہ ایک شرعی حکم میں اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں کا حق جمع ہو جاتا ہے لیکن اس میں اللہ کا حق غالب ہوگا جب کہ اس کے برعکس کسی حکم میں بندے کے حق کو غلبہ ہوتا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

حقوق اللہ:...... وہ حق جس کا تعلق عام منفعت سے ہو اور کسی کے ساتھ مخصوص نہ ہو، اسے معاشرے کا حق بھی کہا جاتا ہے، اس کی اہمیت اور عمومی نفع کے پیش نظر اسے تمام لوگوں کے پروردگار کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس قسم کے حق کو کوئی انسان ساقط نہیں کرسکتا اور نہ ہی اسے چھوڑنے یا اس کے خلاف کوئی اقدام کرنے کی اجازت ہے۔مندرجہ ذیل چیزیں حقوق اللہ میں شامل ہیں:

- ☆ خالص عبادات: ان سے مراد وہ افعال ہیں جن سے مقصود رضا الٰہی، معاشرہ کا قیام اور اس کی اصلاح کے لیے انتظام و انصرام ہے۔جیسے ایمان، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد وغیرہ۔ان عبادات سے مقصود ایسی مصلحتوں کا حصول ہے جن کا نفع معاشرہ کی طرف لوٹتا ہے۔
- ☆ ایسی عبادات جن کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے ساتھ دوسرے انسانوں کی کفالت کا بوجھ بھی شامل ہوتا ہے، جیسے صدقۂ فطر۔اسے ادا کرنے والا محتاج پر خرچ کرنے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے۔یعنی یہ عبادت کسی دوسرے محتاج کی وجہ سے اس پر فرض ہے جب کہ عبادات خالصہ میں ایسا نہیں ہوتا۔
- ☆ قابل عشر زمینوں کی پیداوار سے مخصوص حصہ ادا کرنا، اس میں عبادات کا پہلو بھی ہے کہ زمین کی پیداوار سے دسواں یا بیسواں حصہ بطور زکوٰۃ وصول کیا جاتا ہے اور معاشرے میں غرباء پر تقسیم کیا جاتا ہے اور اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا کا

حصول ہے۔

☆ عقوبات کاملہ: اس سے مراد وہ سزائیں ہیں جن میں سزا کے علاوہ کوئی دوسرا پہلو مدنظر نہیں ہوتا۔

مثلاً ایسی سزائیں جو شریعت نے معاشرے کی اصلاح کے لیے مقرر کی ہیں۔ جیسے چوری اور شراب نوشی کی سزا وغیرہ۔ انہیں حدود بھی کہتے ہیں اور یہ کسی کے ساقط کرنے سے ساقط نہیں ہوتیں۔

☆ ناقص سزائیں جیسے قاتل کو اس کی وراثت سے محروم کیا جاتا ہے، یہ ایک منفی سزا ہے جس میں قاتل کو اس کی نئی جائیداد سے محروم رکھا جاتا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا حق ہے کیوں کہ تمام وارث اپنی رضا مندی سے قاتل کو وراثت میں شامل کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔

☆ مختلف کفارات جن میں بدنی سزا اور عبادت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ مثلاً قسم توڑنے کا کفارہ وغیرہ، اس میں اللہ کی نافرمانی کرنے پر سزا بھی ہے اور اس میں عبادت کا مفہوم بھی ہے کہ ان کی وجہ سے کفارہ ادا کیا جاتا ہے۔

☆ ایسے حقوق جو خود بخود قائم ہوتے ہیں اور اس میں مکلف کی ذمہ داری کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً مال غنیمت سے پانچویں حصے کی ادائیگی وغیرہ۔ یہ حق اللہ تعالیٰ کا ذاتی ہے اور ابتداء ہی سے اس کے لیے ہے۔

حقوق العباد:...... اس سے مراد وہ حقوق ہیں جن کی ادائیگی سے کسی خاص فرد کی مصلحت مقصود ہوتی ہے۔ مثلاً کسی کا نقصان کرنے پر اس کا تاوان اور قرض و دین وغیرہ، اس کی ادائیگی میں دوسرے شخص کی مصلحت ہوتی ہے اور اگر وہ چاہے تو اسے معاف بھی کر سکتا ہے۔ کیوں کہ انسان اپنے حقوق میں جیسے چاہے تصرف کر سکتا ہے۔

☆ کچھ ایسے حقوق ہیں جن میں بندے اور اللہ کا حق شامل ہوتا ہے لیکن اس میں اللہ کا حق غالب ہوتا ہے اسے کسی طور پر ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے حد قذف ہے، کسی پر جھوٹا الزام لگانے پر اسے جاری کیا جاتا ہے۔ اس کی سزا دینے میں عام مصلحت ہے کہ معاشرہ برائی سے پاک ہو جاتا ہے، اس اعتبار سے یہ اللہ کا حق ہے اور دوسرے اعتبار سے جس شخص پر تہمت لگائی جاتی ہے اس کی خاص مصلحت بھی ہوتی ہے کہ اس کی شرافت وعفت کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے عار کو دور کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بندے کا حق ہے۔ تاہم اس میں اللہ تعالیٰ کا حق غالب ہے، کیوں کہ کسی کے معاف کر دینے سے یہ معاف نہیں ہوتی۔

☆ کچھ ایسے حقوق بھی ہیں جن میں بندے اور اللہ دونوں کا حق شامل ہے لیکن ان میں بندے کا حق غالب ہوتا ہے وہ چاہے تو اسے معاف کر سکتا ہے جیسا کہ دانستہ قتل کرنے کی صورت میں قاتل سے قصاص لیا جاتا ہے۔ اس قصاص میں عمومی مصلحت بھی ہے کہ معاشرہ میں امن وسکون ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ اللہ کا حق ہے اور ایک دوسرے اعتبار سے قصاص لینے میں ایک خاص فرد کی مصلحت بھی پوری ہوتی ہے کہ مقتول کے ورثاء کو تسکین ہوتی ہے۔ لیکن اس میں بندے کے حق کو غلبہ دیا گیا ہے کہ وہ قصاص معاف کر کے دیت لینے پر راضی ہو جائے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ ﴾ 1

''اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔ ہاں جس کسی کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے تو اسے بھلائی کی اتباع کرنا چاہیے اور آسانی کے ساتھ دیت ادا کرنی چاہیے۔ تمہارے رب کی طرف سے یہ تخفیف اور رحمت ہے۔''

اس تفصیل سے حقوق اللہ اور حقوق العباد معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ واللہ اعلم!

شوہر کے کہنے پر والدین سے قطع تعلقی

] میرے شوہر کا کسی بات پر میرے والد سے اختلاف ہوا۔ اب میرے شوہر میرے والد سے گفتگو نہیں کرتے، بلکہ مجھے بھی قطع تعلقی پر مجبور کرتے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں مجھ پر اپنے شوہر کی اطاعت ضروری ہے؟

[اللہ تعالیٰ نے گھر پر زندگی گزارنے کے لیے بیوی پر خاوند کو حاکم بنایا ہے، اس بناء پر ضروری ہے کہ خاوند کی اطاعت کی جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۚ ﴾ 2

''مرد عورتوں پر حاکم ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے پر برتری دی ہے اور اس وجہ سے کہ مرد، عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔''

اس اطاعت میں چند ایک اشیاء کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً:

☆ بیوی کو خاوند کی اطاعت میں اللہ تعالیٰ سے اجروثواب حاصل ہوگا۔

☆ مرد کو بھی چاہیے کہ وہ بیوی کے حقوق کا خیال رکھے اور حسن سلوک سے پیش آئے۔

☆ خاوند کی اطاعت بھلے کاموں میں ہوگی، اللہ کی نافرمانی کی صورت میں اس کی اطاعت ضروری نہیں۔

اس بناء پر خاوند اگر ایسی بات کا حکم دیتا ہے جس کے ماننے میں اللہ کی نافرمانی ہوتی ہو تو بیوی کو چاہیے کہ وہ اس بات کا انکار کردے۔ جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں۔'' 3

ایسے حالات میں بیوی پر فرض ہے کہ وہ اچھے انداز سے اپنے خاوند کو سمجھائے کہ قطع تعلقی حرام ہے اور اس کے متعلق قرآن وحدیث میں سخت وعید آئی ہے۔ دلائل کے ساتھ اس کی قباحت وشناعت کو بیان کرے، خاص طور پر والد سے قطع تعلقی

! البقرہ:۱۷۸.　　@ النساء:۳۴.

مسند امام احمد: ج۵، ص۶۶.

تو انتہائی کبیرہ گناہ ہے۔ بیوی کو خاوند کے کہنے پر اپنے والد سے قطع تعلقی کی اجازت نہیں دی جاسکتی، اس سلسلہ میں کسی عالم دین کی مدد لی جاسکتی ہے جو خاوند کو سمجھائے اور اسے اللہ تعالیٰ کا خوف دلائے اور اسے رسول اللہ e کے اس فرمان کا حوالہ دے: ’’اطاعت وفرمانبرداری تو بھلے کاموں میں ہوتی ہے۔‘‘ 1

بہرحال والدین سے قطع تعلقی بھلا کام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ لہٰذا ایسے معاملات میں خاوند کی بات نہ مانی جائے۔ واللہ اعلم!

صرف ایک بیٹے کو ہبہ دینا

] میرے والد محترم بیمار ہوئے، انہوں نے بیماری کی حالت میں اپنے بڑے بیٹے کو ایک دکان ہبہ کر دی۔ اس کے بعد اسی مرض میں ان کا انتقال ہوگیا، اب دوسرے بیٹے اعتراض کرتے ہیں کہ اس دکان کو بھی ترکہ میں شامل کیا جائے جب کہ بڑا بیٹا اس پر قابض ہے اور دینے کے لیے تیار نہیں، اس کے متعلق رہنمائی فرمائیں۔

[باپ اور اولاد کا رشتہ بہت نازک اور قریبی ہوتا ہے، اس میں معمولی سی خرابی بھی بہت بڑے مفاسد کا باعث بن سکتی ہے۔ اس بناء پر شریعت کی طرف سے ہدایت کی گئی ہے کہ بچوں میں مساوات سے کام لیا جائے تاکہ کسی کو احساس محرومی نہ ہو۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے متعلق عدل وانصاف سے کام لیا کرو۔‘‘ 2

صرف بڑے بیٹے کو عطیہ دینے سے دوسرے بھائیوں میں اس بھائی اور باپ کی خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں، اس لیے اسلام نے حکم دیا ہے کہ عطیہ دینا ہے تو بیٹے بیٹی کی تمیز کیے بغیر سب کو برابری کے اصول کے مطابق دیا جائے۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ سیدنا بشیر بن سعد t اپنے بیٹے نعمان بن بشیر t کو رسول اللہ e کے پاس لے گئے اور عرض کیا، یارسول اللہ! میں نے اپنے بیٹے کو اپنا ایک غلام بطور عطیہ دیا ہے۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ’’کیا تو نے اپنے سب بیٹوں کو عطیہ دیا ہے؟‘‘

سیدنا بشیر t نے عرض کیا، یارسول اللہ! نہیں۔ میں نے ایسا نہیں کیا، تو آپ e نے فرمایا: ’’پھر اسے بھی واپس کرو۔‘‘ 3

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: مجھے اس قسم کے ظلم پر گواہ نہ بناؤ کیوں کہ میں ظلم کی گواہی نہیں دیتا۔‘‘ 4

ویسے بھی مرض الموت میں انسان کو مالی معاملات کے متعلق ایسے تصرفات کی اجازت نہیں۔ جن سے دوسروں کے حقوق متاثر ہوتے ہوں۔ جیسا کہ سوال میں ہے، ایسا کرنے سے دوسرے بیٹوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس دکان کو ترکہ میں شامل

! بخاری، الاحکام:۷۱۴۵. @ بخاری، الہبہ:۲۵۸۷.
نسائی، النحل:۳۷۰۳. $ بخاری، الشہادات:۲۶۵۰.

کیا جائے گا جو باپ نے مرض الموت میں بڑے بیٹے کو ہبہ کی۔ بہر حال باپ کو اپنی اولاد میں مساوات کرنے کا حکم ہے۔ یاد رہے کہ یہ مساوات مالی معاملات میں ہے، محبت، پیار اور ضروریات میں مساوات نہیں ہو سکتی۔ مثلاً کھانے پینے، پہننے، تعلیم اور نکاح کے اخراجات سب کے برابر نہیں ہو سکتے، یہ ضرورت کے مطابق ہوں گے، اسی طرح دلی تعلقات فرمانبردار اور اطاعت گزار کے ساتھ ہوں گے۔ اس میں بھی مساوات ناممکن ہے۔ واللہ اعلم!

خاوند کی اطاعت اور اس کی حدود

] میری شادی کو ابھی چھ ماہ ہوئے ہیں، میں جب قرآن مجید کی تلاوت کرتی ہوں، تو میرا خاوند کہتا ہے کہ میرے ساتھ بیٹھ کر T.V دیکھو، انکار کرنے پر مجھے طلاق کی دھمکی دیتا ہے، ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے تاکہ اللہ کے ہاں مجھے باز پرس نہ ہو؟

[اللہ تعالیٰ نے گھر میں خاوند کو بیوی کا حاکم بنایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾ 1

''مرد عورتوں پر حاکم ہیں، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر برتری دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ مرد حضرات اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔''

اس آیت کی روشنی میں بیوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے خاوند کی اطاعت اور فرمانبرداری کرے اور اس اطاعت کے لازم ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو سبب بیان کیے ہیں:

☆ مردوں میں عائلی ذمہ داری نبھانے کی زیادہ قوت و قدرت ہے۔
☆ مرد، عورت کے تمام اخراجات برداشت کرنے کا مکلف ہے۔

لیکن اس اطاعت میں دو چیزوں کا خیال رکھنا ہوگا:

☆ عورت کو خاوند کی اطاعت کرنے میں اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب ملے گا۔
☆ خاوند کی اطاعت کسی حرام یا نافرمانی کے کام میں نہیں ہوگی، کیوں کہ اللہ کی معصیت میں کسی بھی مخلوق کی اطاعت کی جا سکتی۔ رسول اللہ e کا ارشاد ہے: ''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔'' 2

اس بناء پر اگر خاوند اپنی بیوی کو کوئی حرام کام کرنے کا کہتا ہے اور اس کے نہ کرنے پر طلاق کی دھمکی دیتا ہے تو اس صورت میں زیادتی اور ظلم ہے جو خاوند کے لیے جائز نہیں۔ اسے اچھے انداز سے سمجھایا جا سکتا ہے اور دلائل کے ساتھ حرام کام کے متعلق اسے خوف دلایا جا سکتا ہے لیکن افسوس کہ جب ہم نے خاوند سے اس سلسلہ میں رابطہ کیا تو اس نے وضاحت کی کہ میں اسے یہ کہتا ہوں کہ ''پیغام T.V ہمارا چینل ہے، اس میں تجوید کے ساتھ قرآن سیکھنے کے پروگرام آتے ہیں۔ آپ اکیلی

! النساء:۳۴. @ مسند امام احمد، ج۵، ص۶۶.

قرآن پڑھنے کی بجائے میرے ساتھ بیٹھ کر قرآن پڑھنے کے پروگرام دیکھیں۔‘‘

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ بیوی کا محض پروپیگنڈا ہے، اسے چاہیے کہ خاوند کی بات کو مانے اور اس کے ساتھ بیٹھ کر پیغام T.V دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ فحش مناظر نہ دیکھے جائیں جو پیغام T.V پر آتے ہی نہیں ہیں۔ واللہ اعلم!

خدمت میں ماں کا حق

] خدمت میں ماں کے تین حصے اور باپ کا ایک حصہ رکھا گیا ہے، یہ امر عام معاملات کے خلاف ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ وضاحت سے بیان کریں؟

[اس میں کوئی شک نہیں کہ دین اسلام میں خوش گزاری کے لیے ماں کے حق کو تین مرتبہ اور باپ کے حق کو ایک مرتبہ بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ t کا بیان ہے کہ ایک شخص رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا: ’’میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟

رسول اللہ e نے فرمایا: ’’تیری ماں‘‘

اس نے عرض کیا: ’’پھر کون؟‘‘

آپ نے فرمایا: ’’تیری ماں‘‘

اس نے پھر عرض کیا ’’اس کے بعد کون؟‘‘

آپ نے فرمایا: ’’تیری ماں‘‘

اس نے عرض کیا، اس کے بعد کس کا حق ہے؟

آپ نے فرمایا: ’’تیرے باپ کا حق ہے۔‘‘ 1

ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ’’تیری ماں، پھر تیری ماں، اس کے بعد تیرا باپ، پھر جو شخص تجھ سے زیادہ قریب ہو وہ تیرے حسن سلوک کا حق دار ہے۔‘‘ 2

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں کی خدمت کا حق باپ سے بڑھ کر ہے، کیوں کہ رسول اللہ e نے ماں کے حق کو تین مرتبہ اور باپ کے حق کو ایک بار بیان کیا ہے۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ماں نے حمل، وضع حمل، دودھ پلانے، دودھ چھڑانے اور پرورش و پرداخت کے متعلق باپ کے مقابلہ میں زیادہ تکلیف اٹھائی ہے اور اس سلسلہ میں بہت صعوبتوں اور مشقتوں کو برداشت کیا ہے۔ قرآن کریم میں بھی اس کا ایک واضح اشارہ ملتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

! بخاری، الادب: ۵۹۷۱.　　@ مسلم، البر والصلہ: ۲۵۹۸.

﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ۭ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۭ ﴾ 1

''ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اس کی ماں نے اسے تکلیف سے پیٹ میں اٹھائے رکھا اور تکلیف سے اسے جنم دیا۔''

بہر حال انسان کو چاہیے کہ ماں کے حق خدمت کو فراموش نہ کرے اور خدمت گزاری کو اپنے لیے سعادت خیال کرے۔ واللہ اعلم!

قرض کی عدم ادائیگی

] میرے والد گرامی نے جائز ضروریات کے لیے کسی سے کچھ قرض لیا تھا، کوشش کے باوجود اسے ادا نہ کر سکے اور اب وفات پا چکے ہیں، ان کی اتنی جائیداد بھی نہیں جسے فروخت کر کے اسے اتارا جائے اور میں بھی مالی طور پر بہت کمزور ہوں، اس سلسلہ میں بہت فکر مند رہتا ہوں، براہ کرم میری رہنمائی کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

[شریف انسان کے لیے قرض لے کر ضروریات کو پورا کرنا کوئی اچھا کام نہیں۔ خود رسول اللہ e اکثر اوقات قرض کے بوجھ اور اس کی سختی سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ 2

رسول اللہ e نے قرض کی سنگینی کو بایں الفاظ میں بیان کیا ہے۔

آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا: ''تم خودکشی نہ کرو۔''

صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! ''ہمارا خودکشی کرنا کیسے ہے؟''

آپ نے فرمایا: ''قرض کے ساتھ'' 3

یعنی قرض لینا گویا خودکشی کرنا ہے۔

حضرت عمر t اکثر فرمایا کرتے تھے کہ قرض سے دور رہا کرو کیوں کہ اس کی ابتداء غم اور انتہا تنگ دستی اور ناداری ہے۔ 4

حافظ ابن حجر a نے اسلاف کے حوالے سے لکھا ہے کہ قرض لینے سے عدم ادائیگی پر جو غم پریشانی آتی ہے وہ عقل کا کچھ حصہ بھی لے جاتی ہے جو پھر واپس نہیں آتا۔ 5

اس قدر سنگینی کے باوجود اگر کوئی ضرورت مند قرض لیتا ہے اور کوشش کے باوجود اسے ادا نہیں کر سکتا جب کہ اس کی نیت میں کوئی فتور نہیں تو شاید اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی نجات کا سبب پیدا کر دے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے، رسول اللہ e نے فرمایا: ''جو شخص ادائیگی کی نیت سے لوگوں کے مال (بطور قرض) لیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ادا کرنے کی توفیق دیتا ہے اور جو

! الاحقاف:۱۵۔ @ بخاری الدعوات:۶۳۶۳۔

مستدرک حاکم: ص۲۶، ج۲۔ $ مؤطا امام مالک، الوصیۃ باب جامع القضاء۔

% فتح الباری: ص۱۴۷، ج۱۱۔

شخص مال برباد کرنے کی نیت سے لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے برباد کردیتے ہیں۔'' 1

اگر دنیا میں ادا نہ کرسکا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے رسوانہیں کریں گے جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مقروض کو بلائیں گے اور اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا، اور اسے کہا جائے گا: ''اے ابن آدم! تو نے قرض کس لیے لیا اور تو نے لوگوں کے حقوق کیوں ضائع کیے۔'' وہ جواب دے گا: اے میرے رب! تجھے علم ہے کہ میں نے قرض لیا لیکن میں نے اسے کھانے پینے اور پہننے میں صرف نہیں کیا اور نہ ہی کہیں اور برباد کیا لیکن مجھ پر تو آگ یا چوری یا کاروباری خسارہ کی مصیبت آئی تھی، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرے بندے نے سچ کہا ہے، آج میں اس کا قرض ادا کرنے کا زیادہ حق دار ہوں پھر اللہ تعالیٰ کسی چیز کو اپنے ہاں حاضر کریں گے اور اسے میزان کے ایک پلڑے میں رکھ دیں گے، تو اس کی نیکیاں، برائیوں کے مقابلے میں زیادہ ہوجائیں گی، اس طرح وہ اللہ کی رحمت سے جنت میں داخل ہوجائے گا۔'' 2

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے وقوف عرفہ کے دن اپنی امت کی مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، آپ کو اللہ کی طرف سے جواب دیا گیا کہ میں نے ظالم کے علاوہ سب کو بخش دیا۔ کیوں کہ میں ظالم سے مظلوم کا حق ضرور وصول کروں گا۔ رسول اللہ e نے عرض کیا: ''یا رب! اگر تو چاہے تو مظلوم کو جنت سے کچھ دے دے اور ظالم کو معاف کردے۔'' چنانچہ اس دن آپ کی یہ دعا قبول نہ ہوئی، صبح کو جب رسول اللہ e مزدلفہ میں تھے، آپ نے یہی دعا دوبارہ عرض کی تو آپ کی دعا کو شرف قبولیت سے نوازا گیا۔ 3

اس حدیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے تاہم بطور متابعت اور شاہد کے پیش کی جاسکتی ہے۔

بہر حال صورت مسئولہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اگر مبنی برحقیقت ہے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایسے مفلوک الحال کی نجات کا کوئی ذریعہ پیدا فرمادیں گے۔ اس کے باوجود ہم کہتے ہیں کہ قرض لینے کے متعلق انتہائی احتیاط سے کام لیا جائے اور اگر کسی مجبوری کے وقت لینا ہی پڑے تو اس کی ادائیگی کے لیے فکر مند ہونا چاہیے۔ جب بھی حالات سازگار ہوں اسے ادا کردیا جائے، اسے ٹال مٹول کے حوالے نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کا معاملہ کرے اور مقروض حضرات کے حال پر رحم وکرم فرمائے۔ آمین!

بیوی کے والدین کی عزت

] میں شادی کے بعد ایک ذہنی تکلیف میں مبتلا ہوں کہ میرے شوہر، میرے والدین کا احترام نہیں کرتے بلکہ ان

! بخاری،الاستقراض:۲۳۸۷.
@ مسند امام احمد: ص۱۵۷، ج۳.
# ابن ماجہ، المناسک،۳۰۱۳.

کا نام بڑی حقارت سے لیتے ہیں، بعض اوقات سوچتی ہوں کہ ایسے خاوند کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دوں۔ اس سلسلہ میں میری رہنمائی کریں۔

[والدین کا اولاد پر بہت احسان ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان سے حسن سلوک کو فرض قرار دیا ہے۔ بیوی کے ذمے خاوند کا بھی بہت حق ہے بلکہ خاوند کا حق سب حقوق سے بڑا ہے، لہٰذا ان دونوں کے حقوق میں سے کسی ایک کے حق میں بھی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ جب بیوی دیکھے کہ اس کا خاوند اس کے والدین کے حق میں کوتاہی کا مرتکب ہوا ہے تو اس کے اسباب پر غور کرنا چاہیے، اگر والدین کا اس میں قصور ہے تو بڑے ادب واحترام کے ساتھ والدین سے بات کرنی چاہیے اور اگر خاوند کی غلطی ہے تو اپنے خاوند کو اچھے انداز سے سمجھانا چاہیے اور اسے باور کرایا جائے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ 1

''اور تم اپنی بیویوں کے ساتھ اچھے طریقے سے بودوباش اختیار کرو۔''

اس آیت کریمہ میں بیوی کے والدین کے ساتھ بھی حسن سلوک کرنا شامل ہے کیوں کہ اس سے بیوی خوش ہوگی اور بیوی کے والدین کو تکلیف نہیں دینا چاہیے کیوں کہ انہیں برا بھلا کہنے سے بیوی کو بھی تکلیف ہوگی۔ حدیث میں ہے: اور وہ بہترین چیز جس کی وجہ سے کسی کی عزت کی جائے، اس کی بیٹی یا بہن ہے۔ 2

کسی کو بیٹی یا بہن کا نکاح دینا بہت بڑا احسان ہے، اس حدیث کے پیش نظر بیوی کے ماں باپ اور بھائی کا احترام لازم ہے۔ بیوی کا باپ، خاوند کا باپ ہے، اس کا احترام اسی طرح ضروری ہے کہ جس طرح حقیقی باپ کا احترام کیا جاتا ہے۔

عام طور پر آدمی کے تین باپ ہوتے ہیں جو واجب الاحترام ہیں: پہلا حقیقی والد، دوسرا استاد، اور تیسرا سسر۔ اسی طرح بیوی کی والدہ کا بھی احترام ضروری ہے، اس بناء پر تو اس سے نکاح حرام کر دیا گیا ہے اور اس سے پردہ نہیں رکھا گیا۔ بہر حال اس سلسلہ میں عورت کو انتہائی فراست اور عقل مندی سے کام لینا ہوگا، جذبات میں آ کر کوئی بھی غلط اقدام نقصان دہ ہے۔ ہاں اگر والدین اپنی بیٹی کو کوئی حکم دیں اور خاوند نے بھی اسے کسی بات کے متعلق کہا جو والدین کے حکم کے مخالف ہے تو اس صورت میں خاوند کا حکم مقدم کیا جائے کیوں کہ شریعت میں خاوند کا حق زیادہ بڑا ہے۔ لیکن اس کا یہ معنی نہیں کہ والدین کی نافرمانی کی جائے اور نہ ہی ان کے حقوق ادا کئے جائیں، خاوند کے حق کو مقدم رکھنا صرف تعارض کی صورت میں ہے۔ واللہ اعلم!

حرام کمائی سے اخراجات پورے کرنا

] میری شادی ایسے خاوند سے ہوئی ہے جو بینک میں ملازمت کرتا ہے، جب کہ بینک میں سودی کاروبار ہوتا ہے، جس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ میں اس سلسلہ میں بہت پریشان ہوں، مجھے اس بات کا علم ہے کہ حرام کھانے پینے سے عبادت قبول نہیں ہوتی، میرے لیے ایسے حالات میں کیا حکم ہے؟

! النساء:۱۹.　　　　@ نسائی، النکاح:۳۳۵۵.

[والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ بیٹیوں کا رشتہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ ان کے گزراوقات کے لیے ذرائع کیا ہیں۔ دین اسلام میں رشتہ کے لیے دین اور کردار کو معیار بنایا گیا ہے۔ اچھی ملازمت اور روپے پیسے کی ریل پیل کو قطعاً نہ دیکھا جائے۔ روزی رساں اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جہاں حرام کمائی کے ذرائع ہوں، وہاں رشتے ناطے کرنے سے اجتناب کیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رزق حلال کا عبادت کی قبولیت میں بہت دخل ہے۔ حرام مال، عبادت کے قبولیت میں رکاوٹ کا باعث ہے جیسا کہ متعدد احادیث میں اس کی وضاحت ہے۔

اس وضاحت کے بعد ہم صورت مسئولہ کا جائزہ لیتے ہیں۔

شرعی اعتبار سے خاوند کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بیوی کے لیے کھانے پینے، لباس، رہائش اور دیگر اخراجات زندگی کا بندوبست کرے۔ ایسے حالات میں بیوی پر کوئی ذمہ داری نہیں کہ وہ اپنے اخراجات کا خود کوئی متبادل بندوبست کرے، اگرچہ خاوند کی کمائی حرام ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ صورت مسئولہ میں مذکور ہے۔ ایسی صورت میں خاوند کی حرام کمائی کا بیوی کی عبادت پر کوئی منفی اثر نہیں ہوگا کیوں کہ وہ اس کی طاقت نہیں رکھتی، اللہ تعالیٰ بھی طاقت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا۔ البتہ بیوی اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل اشیاء کا خیال رکھے:

☆ اپنے خاوند کی حرام کمائی کو بقدر ضرورت ہی استعمال کرے، ضرورت سے زیادہ کے استعمال سے اجتناب کرے۔

☆ اگر وہ تعلیم یافتہ ہے تو گھر میں بچوں کو ٹیوشن وغیرہ پڑھائے اور اگر ہنر مند ہے تو سلائی کڑھائی سے گزر اوقات کا بندوبست کرے، وہ اس طرح تھوڑے سے حلال مال پر قناعت کرے اور حلال کمائی کی برکات بتائے، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں خاوند کو حرام کمائی سے باز رہنے کی توفیق نواز دے اور وہ اس سے توبہ کرلے۔

☆ وہ کثرت سے دعا اور استغفار کرنے کا معمول بنائے، امید ہے کہ کثرت استغفار سے اللہ تعالیٰ خزانہ عیب سے رزق حلال کا بندوبست کردے گا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کا وعدہ کیا ہے اور رسول اللہ e نے بھی کثرت استغفار پر رزق حلال کی کشادگی کی بشارت دی ہے۔

خطیب کا حاضرین کو سلام کہنا

] اکثر خطباء حضرات کو دیکھا گیا ہے کہ وہ خطبہ شروع کرنے سے قبل حاضرین کو السلام علیکم کہتے ہیں، کیا اس عمل کی کوئی دلیل ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[خطیب کا جمعہ سے قبل حاضرین کو سلام کہنا مستحب عمل ہے۔

چنانچہ امام بیہقی a نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''جب امام منبر پر چڑھے تو بیٹھنے سے قبل لوگوں کو سلام کہے۔''

پھر انہوں نے حضرت جابر t سے مروی رسول اللہ e کا ایک عمل نقل کیا ہے، حضرت جابر t فرماتے ہیں کہ رسول اللہ e جب منبر پر چڑھتے تو حاضرین کو سلام کہتے۔ 1

پھر انہوں نے حضرت ابن عمر t سے مروی ایک روایت بھی بیان کی ہے کہ رسول اللہ e جب منبر کے قریب آتے تو آس پاس بیٹھنے والوں کو سلام کہتے اور جب منبر پر چڑھتے تو حاضرین کی طرف منہ کر کے لوگوں کو سلام کہتے۔ 2

حضرت جابر t سے مروی مذکورہ روایت کو امام ابن ماجہ a نے بھی اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔ 3

یہ روایات سند کے اعتبار سے کچھ کمزور ہیں، لیکن دیگر شواہد و متابعت کی بناء پر کم از کم اصل عمل کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے کچھ معاصرین نے شرح السنۃ کی تحقیق کرتے ہوئے حاشیہ میں دیگر شواہد ذکر کیے ہیں جو مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں موجود ہیں۔ نیز انہوں نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر w کے متعلق بھی لکھا ہے کہ رسول اللہ e کے بعد یہ دونوں حضرات اس پر عمل کرتے تھے۔ 4

نیز امام بیہقی a نے حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر y اور حضرت عمر بن عبدالعزیز a کا یہی عمل نقل کیا ہے۔ 5

علامہ البانی a مرحوم نے مذکورہ روایت کو حسن قرار دیا ہے۔ 6

ہمارے رجحان کے مطابق ان مرویات و آثار کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خطیب کو جمعہ سے قبل سلام کہنا مستحب و مندوب ہے۔ واللہ اعلم!

نمازی بیوی اور بے نماز خاوند

] بیوی مستقل طور پر نماز کی پابند ہے لیکن خاوند مستقل طور پر پکا بے نماز ہے حتیٰ کہ عیدین کی نماز بھی نہیں پڑھتا، کیا ایسے حالات میں نکاح میں تو کوئی فرق نہیں پڑتا، قرآن وحدیث کی روشنی میں ایسے رشتہ کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

[جو انسان مستقل طور پر بے نماز ہے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

جیسا کہ حضرت جابر بن عبداللہ t سے مروی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''بلا شبہ آدمی کو کفر و شرک کے ساتھ ملا دینے والی چیز نماز کو چھوڑ دینا ہے۔'' 7

حضرت عبادہ بن صامت t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے ہمیں وصیت فرمائی: ''اللہ کے ہاں کسی کو شریک نہ

! بیہقی: ص۲۰۴، ج۳.
@ بیہقی: ص۲۰۶، ج۳.
# ابن ماجہ، اقامۃ الصلوٰت:۱۱۰۹.
$ شرح السنۃ: ص۲۴۲، ج۴.
% بیہقی: ص۲۰۵، ج۳.
^ الاجوبۃ النافعۃ: ص۵۸.
& صحیح مسلم، الایمان:۸۲.

بناؤ خواہ تمہیں کاٹ دیا جائے یا جلا دیا جائے یا سولی پر لٹکا دیا جائے اور جان بوجھ کر نماز ترک نہ کرو کیوں کہ جو شخص جان بوجھ کر اسے ترک کرتا ہے وہ ملت سے خارج ہو جاتا ہے۔'' 1

حضرت بریدہ بن حصیب t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''ہمارے اور ان کے درمیان نماز کا عہد ہے، جس نے اسے ترک کر دیا اس نے کفر کیا۔'' 2

صحابہ کرام کا اس امر پر اتفاق تھا کہ تارک صلوٰۃ دائرہ اسلام سے خارج ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن شقیق a فرماتے ہیں کہ اصحاب محمد e نماز کے علاوہ کسی عمل کے ترک کو کفر قرار نہیں دیتے تھے۔ 3

کتاب وسنت کے مذکورہ دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ تارک صلوٰۃ کافر ہے، ایسے حالات میں ایک مسلمانوں خاتون کا اس کے ہاں رہنا شرعاً درست نہیں۔ اگر کوئی شخص بالکل نماز نہیں پڑھتا حتیٰ کہ عیدین بھی نہیں پڑھتا تو ضروری ہے کہ اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے اگر وہ توبہ کر کے نماز شروع کر دے تو صورت مسئولہ میں ان کا میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا درست ہے، اگر وہ توبہ نہیں کرتا اور اپنی نماز نہ پڑھنے کی روش پر قائم ہے تو ایسے حالات میں ان کے درمیان علیحدگی کرا دی جائے کیوں کہ اسلام اور کفر یکجا جمع نہیں ہو سکتے۔ واللہ اعلم!

ماں کا بیٹے کو گالیاں دینا

] میرا باپ فوت ہو چکا ہے اور میں اہل حدیث ہوں، میری والدہ اہل حدیث ہونے کی پاداش میں مجھے گالیاں دیتی رہتی ہیں اور میرے لیے بددعائیں بھی کرتی ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسے چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں۔ ایسے حالات میں مجھے والدہ کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟

[والدہ کا مذکورہ رویہ ظلم ہے اور اللہ تعالیٰ نے ظلم کو حرام کیا ہے۔

حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میرے بندو! میں نے اپنے آپ پر ظلم کو حرام قرار دیا ہے اور اسے تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے۔ لہٰذا تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔'' 4

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے کہ ''ظلم، قیامت کے دن بہت سے اندھیروں اور تاریکیوں کا سبب بنے گا۔'' 5

ان احادیث کی روشنی میں ہم والدہ سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرے اور اپنی اولاد کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور ان سے تعلقات کو درست رکھے تا کہ وہ ان حقوق کو خوش اسلوبی سے ادا کریں جو ان پر عائد ہوتے ہیں۔

اس تمہیدی گفتگو کے بعد ہم بیٹے سے کہتے ہیں کہ والدہ کے رویے پر صبر کرے اور اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کی امید

! مجمع الزوائد: ص۲۱۶، ج۴۔ @ مسند امام احمد: ص۳۴۶، ج۵۔
ترمذی، الایمان:۲۶۲۲۔ $ مسلم، البر والصلہ:۲۵۷۷۔
% مسند امام احمد: ج۲، ص۱۳۷۔

رکھے، نیز اس کی خدمت میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے کیوں کہ والدین اگر کافر بھی ہوں تب بھی ان کا حق خدمت ساقط نہیں ہوتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ﴾ 1

''اگر تیرے والدین تجھے میرے ساتھ شرک کرنے پر آمادہ کریں جس کا تجھے علم نہیں تو ان کا کہا مت مانو، البتہ دنیا کے معاملات میں ان کے ساتھ حسن کرتے رہو۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ والدین کی خدمت اور ان سے حسن سلوک کرتے رہنا چاہیے، اگرچہ ماں کا رویہ قطع رحمی والا ہے لیکن اولاد کو صلہ رحمی میں کسی قسم کی کمی روا نہیں رکھنا چاہیے۔ ایک شخص رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا، یا رسول اللہ! میرے کچھ رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں تو ان سے صلہ رحمی کرتا ہوں، لیکن وہ انتہائی بدسلوکی سے پیش آتے ہیں، میں ان سے حسن سلوک کرتا ہوں لیکن وہ مجھ سے بدسلوکی کرتے ہیں۔

یہ سن کر رسول اللہ e نے فرمایا: ''اگر تمہارا طرز عمل اسی طرح ہے جس طرح تو نے بیان کیا ہے تو گویا تو ان چہروں پر گرم راکھ ڈالتا ہے اور جب تک تو اس حالت پر قائم رہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک معاون فرشتہ ان کے مقابلے میں تیری مدد کرتا رہے گا۔'' 2

اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا درج ذیل فرمان بھی پیش نظر رکھنا چاہیے:

''صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو بدلے میں صلہ رحمی کرے، بلکہ صلہ رحمی کرنے والا تو وہ ہے کہ جب اس کے ساتھ قطع رحمی کا معاملہ کیا جائے تو وہ صلہ رحمی کرلے۔'' 3

ان احادیث کی روشنی میں ہم بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنی والدہ کے ساتھ صلہ رحمی کرتا رہے اور اس کی خدمت میں کوتاہی نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کوئی بہترین صورت ضرور پیدا کرے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ﴾ 4

''جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا تو وہ اس کے لیے مصائب وآلام سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کردے گا اور اسے ایسی جگہ سے رزق فراہم کرے گا جہاں سے اسے وہم وگمان بھی نہ ہوگا۔''

میرا خاوند میری پرواہ نہیں کرتا

] میرے شوہر انتہائی نیک سیرت اور پارسا ہیں، لیکن میرے ساتھ ان کا رویہ صحیح نہیں، ہمیشہ ترش روئی سے پیش آتے ہیں اور سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں ان سے علیحدگی اختیار کرلوں یا صبر کرکے ان کے ساتھ رہوں؟

! لقمان:۱۵۔ @ صحیح مسلم، البر والصلہ:۲۵۵۸۔
بخاری، الادب:۵۹۹۱۔ $ الطلاق:۳، ۴۔

] خاوند کے لیے ضروری ہے کہ وہ اہل خانہ سے اخلاق فاضلہ کا مظاہرہ کرے اور حسن معاشرت کو اپنائے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ 1

''اور ان بیویوں سے حسن معاشرت اختیار کرو۔''

اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا واضح ارشاد ہے، آپ e نے فرمایا: ''تم میں سے بہترین وہ شخص ہے جو اپنے گھر والوں سے اچھا سلوک کرتا ہے اور میں اپنے اہل خانہ کے لیے تم سب سے بہتر ہوں۔'' 2

نیز رسول اللہ e نے فرمایا:

''ایمان والوں میں کامل ترین مومن وہ ہے جو اخلاق و کردار میں سب سے اچھا ہو اور تم میں سے اچھے وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لیے اچھے ہیں۔'' 3

ایسے حالات میں ہم سائلہ کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ خاوند کی زیادتی پر صبر کرے اور اپنے گھر کو کسی حالت میں نہ چھوڑے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ حالات درست کر دے گا، جیسا کہ اس نے اہل ایمان سے وعدہ کر رکھا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ 4

''اور صبر کرو! بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

ایسے حالات کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بایں الفاظ رہنمائی فرمائی ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا﴾ 5

''جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کی کوئی راہ پیدا کر دے گا۔''

میاں بیوی کے بہتر تعلقات کے نتیجے میں بچے بھی اچھے اخلاق اور اچھی عادات سیکھتے ہیں اور بڑے ہو کر معاشرے کے لیے بلکہ خود والدین کے لیے بھی رحمت ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر میاں بیوی کے تعلقات خوشگوار نہیں ہیں تو بچوں پر اس کا برا اثر ہوتا ہے اور بری عادات سیکھ کر والدین کے لیے مصیبت کا باعث ہوتے ہیں اور معاشرے میں بھی وہ فتنہ و فساد پیدا کرتے ہیں۔ اس بناء پر ہم میاں کو بھی نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنے رویے پر نظر ثانی کرے اور اپنے گھریلو حالات کو پر سکون گزارنے کی کوشش کرے۔ واللہ اعلم!

! النساء:۱۹. @ ابن ماجہ، النکاح:۱۹۷۷.

مسند امام احمد: ج۲، ص۴۷۳. $ الانفال: ۴۶.

% الطلاق:۳.

بیوی کے اخراجات

] میری شادی کو تین سال ہوئے ہیں لیکن میرے میاں اخراجات کے سلسلہ میں بہت کنجوس ہیں بلکہ وہ جو کچھ دیتے ہیں وہ نہ دینے کے مترادف ہے۔کیا شادی کے بعد عورت کے اخراجات کی ذمہ داری خاوند پر نہیں؟

[معاشرتی طور پر یہ بات معروف ہے کہ شادی کے بعد اخراجات کی ذمہ داری خاوند پر عائد ہوتی ہے، والدین اس قسم کی ذمہ داری سے فارغ ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ﴾ 1

''خوش حال کو چاہیے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق خرچہ دے اور تنگ دست بھی اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے۔''

اس قرآنی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شادی کے بعد اہل خانہ کا خرچہ اور ان کی ضروریات کو پورا کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے۔

چنانچہ سیدنا معاویہ بن حیدہ t بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم پر بیوی کا کیا حق ہے؟ تو آپ e نے فرمایا: ''جب تم خود کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ اور جب خود لباس پہنو تو اسے بھی پہناؤ۔'' 2

اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر جو برتری اور فضیلت دی ہے اس کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ ''وہ ان پر اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔'' 3

اس کی فضیلت بھی بہت ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ e فرماتے ہیں: ''جب آدمی اپنے اہل خانہ پر ثواب کی نیت سے خرچ کرے تو یہ اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔'' 4

حتیٰ کہ اگر خاوند اپنی بیوی کو پانی پلاتا ہے تو اس پر بھی اسے اجر ملتا ہے۔

چنانچہ سیدنا عرباض بن ساریہ t بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ e کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''آدمی جب اپنی بیوی کو پانی پلاتا ہے تو اس پر بھی اسے اجر دیا جاتا ہے۔'' میں یہ حدیث سن کر اپنے گھر آیا اور اپنی بیوی کو پانی پلا کر اسے یہ حدیث بیان کی اور کہا کہ میں نے یہ بات رسول اللہ e سے سنی ہے۔ 5

اس کے ساتھ ساتھ بیوی کو یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ خاوند پر اسی حساب سے خرچ واجب ہے جس قدر اس میں طاقت ہے اور جس سے گھر کے اخراجات پورے ہو جائیں۔محض دوسری عورتوں کو دیکھ کر اپنے خاوند سے ناجائز مطالبات نہ کرے۔کیوں کہ رسول اللہ e نے اس حرکت کو ہلاکت قرار دیا ہے۔

جیسا کہ درج ذیل حدیث میں ہے: ''بنی اسرائیل کی ابتدائی ہلاکت یہ تھی کہ ایک تنگ دست کی بیوی اسے لباس اور

! الطلاق:۷.
@ مسند امام احمد: ج۳، ص۴۲۶.
# النساء:۳۴.
$ بخاری، الایمان:۵۵.
% صحیح الترغیب:۱۹۶۳.

زیورات کے متعلق اتنی تکلیف دیتی تھی جتنی مال دار کی بیوی مطالبات کرتی ہے۔'' 1

اس حدیث کی روشنی میں بیگمات کو بھی چاہیے کہ وہ قناعت اور صبر کی خوگر ہوں۔ واللہ اعلم!

بیوی کے لیے رہائش کا بندوبست

] میری شادی کو پانچ برس ہو چکے ہیں، ہم اپنے سسرال کے گھر میں رہتے ہیں اور اکٹھے ہی کھاتے پیتے ہیں جب کہ مجھے رہائش کا یہ انداز پسند نہیں، کیا میں اپنے خاوند سے الگ رہائش کا مطالبہ کرسکتی ہوں؟

[ہمارے ہاں برصغیر میں بعض مجبوریوں کی بناء پر شادی کے بعد والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ اکٹھے رہنے کا رواج ہے جو بعض اوقات ناگفتہ بہ حالات کا باعث بن جاتا ہے۔ اگر والدین بوڑھے ہوں، نیز بہن بھائی بھی چھوٹے ہوں جن کی دیکھ بھال کرنا ضروری ہو تو کسی حد تک قابل برداشت ہے۔ لیکن جوان بہن بھائیوں کی موجودگی میں کئی ایک قباحتیں ہیں۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ e کا درج ذیل ارشاد گرامی ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

آپ فرماتے ہیں: ''عورتوں کے ہاں کھلے بندوں آنے جانے سے پرہیز کرو۔''

یہ سن کر ایک انصاری نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ خاوند کے عزیز و اقارب کے متعلق بتائیں کہ ان کے لیے کیا حکم ہے؟

تو آپ e نے فرمایا: ''خاوند کے عزیز و اقارب تو موت ہیں۔'' 2

اس حدیث کے پیش نظر خاوند کے بھائی کے ساتھ اس کی بیوی کی خلوت جائز نہیں۔ ہاں اگر وہ چھوٹے ہوں تو ان کی دیکھ بھال کرنے میں چنداں حرج نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خاوند کو پابند کیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ حسن معاشرت کے ساتھ رہے:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ 3

''ان بیویوں کے ساتھ بھلے طریقہ سے زندگی بسر کرو۔''

اس حسن معاشرت کا تقاضا ہے کہ اس کے لیے رہائش کا معقول بندوبست کرے، اگر گھر بڑا ہے تو بیوی کے لیے الگ کمرے کا انتظام کیا جائے جہاں ہر چیز کا الگ بندوبست ہو، یعنی وہاں خلوت اور فتنے فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ البتہ عورت کے سسر اور ساس اگر بوڑھے ناتواں ہیں اور وہ اپنے بیٹے کے محتاج ہیں، وہاں کوئی دوسرا ان کی خدمت کرنے والا نہیں تو ایسے حالات میں عورت کو چاہیے کہ وہ ان کی خدمت کر کے ثواب دارین حاصل کرے۔ امید ہے کہ ایسا کرنے سے ان کی دعائیں اس کے شامل حال ہوں گی اور اللہ تعالیٰ اس کے نتیجے میں وسعت پیدا فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق دے۔ آمین!

! الاحادیث الصحیحہ: ۵۹۱.   @ صحیح مسلم، السلام: ۲۱۷۲.

النساء: ۱۹.

بیوی کا بلا اجازت گھر سے نکلنا

] میں اپنی بیوی سے بہت تنگ ہوں، وہ میری اجازت کے بغیر پڑوسیوں کے گھر چلی جاتی ہے اور وہاں باتوں میں مشغول ہو جاتی ہے، میں نے بہت دفعہ اسے سمجھایا ہے لیکن وہ میرا کہنا نہیں مانتی اس سلسلہ میں ہماری شریعت کیا رہنمائی کرتی ہے؟

[خاوند، بیوی کی باہمی موافقت کے بغیر معاشرہ پر سکون نہیں رہ سکتا، اگر دونوں کی مساوی حیثیت ہو تو موافقت کا امکان بہت کم ہوتا ہے، اس لیے شریعت میں بیوی کو خاوند کے تابع کیا گیا ہے۔ یعنی وہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے خاوند کی ہر طرح سے اطاعت و فرمانبرداری کرے تاکہ یہ معاشرہ جنت نظیر بن سکے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ e سے جب سوال ہوا کہ کون سی عورت بہتر ہے تو آپ e نے فرمایا: ’’وہ عورت کہ جب خاوند اسے دیکھے تو اُسے خوش کر دے اور جب اسے کوئی حکم دے تو وہ اس کی بجا آوری کرے۔ نیز اپنے نفس اور مال میں اس کی مخالفت نہ کرے جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔‘‘ 1

ایک حدیث میں رسول اللہ e نے خاوند کی اطاعت کو بایں الفاظ واضح فرمایا:

’’اگر وہ اسے حکم دے کہ زرد پہاڑ سے سیاہ پہاڑ کی طرف اور سیاہ پہاڑ سے سفید پہاڑ کی طرف پتھر منتقل کر دے تو اسے چاہیے کہ وہ ایسا ہی کرے۔‘‘ 2

ان احادیث کے پیش نظر بیوی کو چاہیے کہ وہ اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہ جائے حتی کہ اپنے پڑوسیوں کے گھر جانے کی بھی اجازت نہیں۔ الا یہ کہ خاوند نے اس کی واضح طور پر یا عرفی اجازت دی ہو۔ عرفی اجازت کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کو یہ معلوم ہو کہ وہ کسی پڑوس کے گھر جائے تو شوہر اسے نہیں روکے گا۔ ہم بیوی کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ خاوند کی اطاعت کر کے اپنی زندگی کو خوشگوار بنائے اور اس کی نافرمانی کر کے اس دنیا کو جہنم زار بنانے کی کوشش نہ کرے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ’’جو عورت اس حال میں فوت ہو کہ اس کا شوہر اس پر راضی تھا تو وہ جنت میں داخل ہوگی۔‘‘ 3

نذر کی جہت تبدیل کرنا

] میں نے نذر مانی تھی کہ اگر میرا کام ہو جائے تو میں مسجد میں نلکا لگواؤں گا، میرا وہ کام ہو گیا ہے لیکن میرے پڑوسی کے گھر میں پانی کا بندوبست نہیں، کیا میں اس کے گھر میں واٹر پمپ لگوا دوں تو کیا میری نذر پوری ہو جائے گی؟

[پہلی بات تو یہ ہے کہ اس طرح مشروط نذر کو شریعت میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

بلکہ رسول اللہ e کا ارشاد ہے:

! نسائی، النکاح:۳۲۳۳۔ @ مسند امام احمد: ج۶، ص۷۶۔

ترمذی، الرضاع:۱۱۶۱۔

”نذر، تقدیر کونہیں بدل سکتی، اس کی وجہ سے صرف بخیل سے کچھ مال نکالا جاتا ہے۔“ 1

بہر حال اگر کوئی مشروط نذر مانتا ہے تو اسے کام پورا ہونے پر بجالانا ضروری ہوتا ہے، تاہم اگر کوئی انسان اس طرح نذر مانتا ہے پھر دیکھتا ہے کہ کوئی دوسری چیز اس سے افضل اور اس کی ضرورت زیادہ ہے تو اس صورت میں جہت بدلی جاسکتی ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک شخص رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا: میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے مکہ فتح کر دیا تو میں بیت المقدس میں نوافل ادا کروں گا۔

اس پر آپ نے فرمایا: ”تم بیت اللہ میں نوافل پڑھ لو۔“

اس آدمی نے پھر اپنی بات دہرائی تو آپ نے وہی جواب دیا، اس نے تیسری مرتبہ اپنی بات کا اعادہ کیا تو آپ نے فرمایا: ”پھر جیسے تیری مرضی ہے، اس کے مطابق کر لے۔“ 2

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ادنیٰ درجے کی نذر کو اگر اعلیٰ درجے کی نذر سے بدل لے تو ایسا کرنا جائز ہے۔

صورت مسئولہ میں اگر مسجد میں نلکے کی ضرورت نہیں لیکن پڑوسی اس کا زیادہ حق دار ہے تو پڑوسی کے گھر میں واٹر پمپ لگانے میں کوئی حرج نہیں۔ امید ہے کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم!

باپ پر خرچ کرنا

] میرا بیٹا سرکاری ملازم ہے اور معقول تنخواہ لیتا ہے، اس کے علاوہ اسے سرکاری طور پر بہت سی مراعات بھی حاصل ہیں، لیکن وہ مجھے کچھ نہیں دیتا جب کہ میں ضرورت مند ہوں، اس سلسلہ میں میرے حقوق کی وضاحت کریں۔

[والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا ایک اہم فریضہ ہے، یہ فریضہ خدمت گزاری اور ان پر خرچ کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ بیٹا اگر شادی شدہ ہے تو اپنے ضرورت مند والد کو اس قدر دے کہ وہ کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو، باپ کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ حسب ضرورت بیٹے سے مال کا مطالبہ کرے۔

کیوں کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ”بلاشبہ پاکیزہ مال جسے تم کھاتے ہو وہ ہے جو تم نے کھایا اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے۔“ 3

اس حدیث کی روشنی میں بیٹے کا فرض ہے کہ وہ اپنے ضرورت مند والد کی ضروریات کو پورا کرے خواہ بیٹا شادی شدہ کیوں نہ ہو اور اس پر اپنے خاندان کی کفالت کرنا بھی ہو۔ قرآن کریم نے کافر والدین سے بھی دنیاوی معاملات میں حسن سلوک کی تلقین کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

! بخاری، الایمان والنذور:۶۶۹۳۔ @ ابوداؤد، الایمان والنذور:۳۳۰۵۔

ابوداؤد، الاجارہ:۳۵۲۸۔

﴿وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا﴾ 1

''دنیا میں اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔''

اس آیت کی روشنی میں اولاد پر واجب ہے کہ وہ اپنے والدین کی کفالت کریں اور اسے اپنی سعادت خیال کریں اور والدین کو بھی بغیر کسی اجازت کے اپنی اولاد کی کمائی سے اپنی لازمی اور بنیادی ضروریات پوری کرنے کا حق حاصل ہے لیکن اس معاملہ میں افراط وتفریط نہیں ہونا چاہیے۔ اولاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے والدین کی ضروریات کا خیال رکھیں اور والدین کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کی کمائی کو بے دردی سے خرچ کر کے اسے اجاڑنے کی کوشش نہ کریں۔

صورت مسئولہ میں بیٹا صاحب حیثیت ہے اور شادی شدہ ہونے کی صورت میں بھی اپنے والد کی ضروریات کا خیال رکھنا اس کا اخلاقی فرض ہے، اسے چاہیے کہ وہ اس کی خدمت گزاری میں کوتاہی سے کام نہ لے بلکہ اسے خوش کرنے کی پوری پوری کوشش کرے۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''رب کی رضامندی والد کی رضا میں ہے اور رب کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔'' 2

بیٹے کو چاہیے کہ وہ اپنے والد سے حسن سلوک کرے اور اس کی ضروریات کا خیال رکھے۔

بیوی بچوں پر خرچ کرنا

] میرے میاں دین دار اور صاحب ثروت ہیں، صدقہ وخیرات بہت کرتے ہیں، لیکن اہل خانہ اور اپنے بچوں پر خرچ کرنے پر وسعت سے کام نہیں لیتے، بس واجبی سا خرچہ دیتے ہیں جس سے بس گزر اوقات ہی ہوتا ہے، کیا ایسا رویہ شریعت میں جائز ہے؟

[اللہ تعالیٰ نے مرد کو گھر کا سربراہ اس لیے قرار دیا ہے کہ وہ گھر کے اخراجات کو برداشت کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ 3

''مرد، عورتوں کے سربراہ ہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر برتری دی ہے اور اس لیے بھی کہ وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔''

اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرد کو گھریلو اخراجات برداشت کرنا چاہئیں اور یہ اس کی ذمہ داری ہے۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمائی ہے: ''کشادگی والے کو اپنی کشادگی سے خرچ کرنا چاہیے اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا

! لقمان:۱۵۔ @ ترمذی، البر والصلہ:۱۸۹۹۔
النساء:۳۴۔

گیا ہو اسے بھی چاہیے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اسے دے رکھا ہے اس میں سے حسب توفیق خرچ کرے۔'' 1

حدیث میں اپنے اہل خانہ پر خرچ کرنے کی بہت فضیلت آئی ہے رسول اللہ e کا فرمان ہے: ''زیادہ فضیلت والا دینار وہ ہے جسے کوئی شخص اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے۔'' 2

سیدنا ابن مسعود t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''جب آدمی اپنے اہل خانہ پر ثواب کی نیت سے خرچ کرتا ہے تو یہ اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔'' 3

رسول اللہ e نے سیدنا سعد بن ابی وقاص t سے فرمایا تھا: ''تو کوئی بھی چیز اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرے تو تجھے اس پر اجر وثواب ملے گا حتیٰ کہ وہ چیز جو تو اپنی بیوی کے منہ میں ڈالے۔'' 4

ان آیات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنے آپ اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا چاہیے اور ان پر خرچ کرنا اس کی ذمہ داری ہے نیز اس میں کنجوسی سے کام نہ لے۔ اتنا ضرور خرچ کرے جتنا واجب ہے لیکن اسراف سے پرہیز کرے۔ بیگمات کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے خاوندوں کو بلاوجہ اخراجات کے سلسلہ میں تنگ نہ کریں۔ بہر حال افراط وتفریط سے اجتناب کرتے ہوئے میانہ روی کے ساتھ گھر کے اخراجات پورے کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے اور اسے یہ ذمہ داری نبھانا چاہیے۔

لے پالک سے پردہ

] میں نے ایک یتیم بچے کو گود لیا اور اس کی پرورش کی، اب وہ بلوغت کے قریب ہے، کیا بالغ ہونے کے بعد مجھے اس سے پردہ کرنا ہوگا یا بیٹا ہونے کی حیثیت سے میں اس سے پردہ نہ کروں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[اگر کوئی عورت اپنے بھائی یا بہن کا لڑکا لے کر اس کی پرورش کرتی ہے تو بالغ ہونے کے بعد اس سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ وہ اس کا بھتیجا یا بھانجا ہے۔ ان سے پردہ کرنا ضروری نہیں جیسا کہ قرآن کریم میں اس امر کی صراحت کی ہے۔ 5

اگر ان کے علاوہ کوئی اور یتیم بچہ گود میں لیا ہے تو بالغ ہونے کے بعد اس پر پردہ کرنا ضروری ہے، اگرچہ ایسا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے تاہم اللہ کا حکم سمجھ کر یہ کام کرنا چاہیے۔

!الطلاق:۷. @ مسلم، الزکاۃ:۹۹۴.
بخاری، الایمان:۵۵. $ بخاری، الجنائز:۱۲۹۵.
% النور:۳۱.

اگر اس نے دو سال کی عمر میں بچے کو پانچ مرتبہ دودھ پلا دیا ہے تو پھر وہ بچہ اس کا رضاعی بیٹا ہے اور اس کی بیٹیوں کا رضاعی بھائی ہے، ایسی صورت میں اس سے پردہ کرنا ضروری نہیں۔

چنانچہ سیدنا عروہ t بیان کرتے ہیں کہ انہیں سیدہ عائشہ r نے بتایا: ''جب ان کے رضاعی چچا جن کا نام افلح تھا آئے اور گھر آنے کی اجازت طلب کی تو میں نے اسے اجازت نہ دی اور اس سے پردہ کر لیا، رسول اللہ e کو اس کے متعلق علم ہوا تو آپ e نے فرمایا: اس سے پردہ نہ کرو اس لیے کہ دودھ پلانے سے وہ حرمت ثابت ہوتی ہے جو نسب کی وجہ سے ہوتی ہے۔'' 1

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اجنبی بچے کو اگر دودھ پلا دیا جائے تو اس سے پردہ ختم ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ دو سال کی عمر میں کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پلایا جائے۔ اگر ایسا نہیں تو لے پالک بچہ جب جوان ہو جائے تو گھر میں جو خواتین یا جوان لڑکیاں ہیں انہیں اس سے پردہ کرنا چاہیے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اپنی کسی لڑکی کا اس سے نکاح کر دیا جائے، ایسے حالات میں بھی پردے کی پابندی ختم ہو جاتی ہے۔ بصورت دیگر لے پالک نوجوان ہونے کے بعد گھر میں رکھنا اور اس سے پردہ نہ کرنا کئی ایک خرابیوں کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم!

قسم اٹھاتے وقت ان شاء اللہ کہنا

] قسم اٹھاتے وقت اگر ان شاء اللہ کہہ دیا جائے تو اس کا کیا فائدہ ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[سیدنا عبداللہ بن عمر w سے مروی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''جس شخص نے قسم اٹھاتے وقت ان شاء اللہ کہہ لیا تو وہ حانث نہیں ہوگا۔'' 2

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی قسم اٹھاتے وقت ان شاء اللہ کہہ لیتا ہے پھر وہ اگر قسم کو پورا نہ کر سکے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں۔

مثلاً یوں کہے: ''اللہ کی قسم! میں ان شاء اللہ یہ کام ضرور کروں گا، پھر وہ اگر کام نہ کر سکے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں۔ اس لیے مذکورہ بالا حدیث کے پیش نظر قسم اٹھاتے وقت ان شاء اللہ ضرور کہنا چاہیے تاکہ قسم کو پورا نہ کر سکنے کی صورت میں کفارہ ادا کرنے سے بچ جائے۔ نیز ایسا کرنے سے قسم کو پورا کرنے میں سہولت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم!

''ان شاء اللہ'' کو ''انشاء اللہ'' لکھنا

] میں نے تحریری طور پر کسی کو اپنا وعدہ کرنے کا یقین دلایا اور آخر میں ''انشاء اللہ'' لکھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ

! مسلم، الرضاع: ۱۴۴۴. @ ابوداؤد، الادب: ۳۲۶۲.

’’انشاء اللہ‘‘ نہیں بلکہ ’’ان شاء اللہ‘‘ لکھا کرو۔ کیوں کہ ان دونوں الفاظ کے الگ الگ معنی ہیں، اس کی وضاحت مطلوب ہے۔

] اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں الفاظ میں گرائمر کے اعتبار سے بہت فرق ہے اور انہیں الگ الگ معنی دینے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۝﴾1

’’ہم نے ہی ان حوروں کو پیدا کیا ہے۔‘‘

قرآن کریم میں اس لفظ کا ماضی اور مضارع بھی استعمال ہوا ہے، جس کا معنی ’’پیدا کرنا ہے۔‘‘ اب ’’انشاء اللہ‘‘ کی ترکیب کے حسب ذیل دو معنی ہیں:

☆ اگر مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے تو اس کا معنی ’’اللہ تعالیٰ کا پیدا کرنا۔‘‘

☆ اگر اس مصدر کی نسبت مفعول کی طرف ہے تو اس کا معنی ’’اللہ کو پیدا کرنا‘‘ ہے جو انتہائی غلط ہے بلکہ سوء ادبی اور کفر ہے۔

لفظ ’’ان شاء اللہ‘‘ میں ’’ان‘‘ شرطیہ ہے اور ’’شاء‘‘ ماضی جس کا معنی چاہنا ہے، اس جملے کا معنی ’’اگر اللہ نے چاہا‘‘ یعنی کسی کام کو یہ لفظ کہہ کر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے حوالے کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ ترکیب استعمال ہوئی ہے جیسا کہ گائے ذبح کرنے کے سلسلہ میں سیدنا موسیٰ u کی قوم نے کہا تھا:

﴿وَ اِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝﴾2

’’اگر اللہ نے چاہا تو ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔‘‘

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ’’ان شاء اللہ‘‘ کی ترکیب استعمال ہوئی ہے وہاں ’’ان‘‘ کو الگ اور ’’شاء‘‘ کو الگ لکھا گیا ہے۔ یعنی ’’ان‘‘ کو ’’شاء‘‘ کے ساتھ ملا کر نہیں لکھا۔ اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ ہمارے ہاں جو ’’انشاء اللہ‘‘ اکٹھا لکھا جاتا ہے یہ غلط ہے اور الگ الگ لکھنا چاہیے۔ واللہ اعلم!

نذر کا پورا کرنا

] میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا اور نذر مانی تھی کہ اگر میں اچھے نمبروں میں پاس ہوگئی تو مسلسل دو ماہ کے روزے رکھوں گی۔ اللہ کی مہربانی سے میں اچھے نمبر لے کر پاس ہوگئی ہوں، لیکن نذر کا پورا کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے، اس کا کیا حل ہے؟

] اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے جو نذر ماننے کے بعد اسے پورا کرتے ہیں۔ ارشاد

! الواقعہ:۳۵. @ البقرہ:۷۰.

باری تعالیٰ ہے:

﴿يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا﴾ 1

''وہ اپنی نذر کو پورا کرتے ہیں اور ایسے دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس کا انجام بہت بھیانک ہے۔''

جب کہ بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ e نے نذر ماننے سے منع فرمایا ہے کیوں کہ یہ تقدیر کو نہیں روک سکتی۔ 2

محدثین کرام نے اس آیت کریمہ اور حدیث مذکور میں یوں تطبیق دی ہے کہ نذر کی دو اقسام حسب ذیل ہیں:

☆ نذر مطلق:...... انسان اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کسی عبادت کی نذر مان لے۔ مثلاً میں صدقہ کرنے کی ذمہ داری اٹھاتا ہوں۔ چنانچہ سیدنا عمر t نے دور جاہلیت میں ایک رات کا اعتکاف کرنے کی نذر مانی تھی۔ 3

☆ نذر معلق:...... مشروط طور پر اچھا کام کرنے کی نذر ماننا۔ مثلاً یوں کہا جائے کہ ہمارے بیمار کو شفا ہوئی تو میں اتنا صدقہ کروں گا۔ اس قسم کی نذر کو رسول اللہ e نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ تاہم اس کا پورا کرنا ضروری ہوتا ہے، اگر اسے پورا کرنے کی ہمت نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ قسم کا کفارہ دے کر فارغ ہو جائے۔

جیسا کہ سیدنا عقبہ بن عامر t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''نذر کا کفارہ، قسم کا کفارہ ہے۔'' 4

صورت مسؤلہ میں طالبہ کو چاہیے کہ وہ قسم کا کفارہ دے دے اور قسم کا کفارہ یہ ہے کہ دس مساکین کو درمیانے درجے کا کھانا کھلا دے یا انہیں لباس دے دے۔ اگر ان کی ہمت نہیں ہے تو تین دن کے مسلسل یا متفرق روزے رکھ لے لیکن آئندہ ایسے معاملات میں احتیاط کرنی چاہیے کہ کوئی ایسا کام اپنے ذمے نہ لیا جائے جسے پورا کرنے کی ہمت نہ ہو۔ واللہ اعلم!

نابینا سے پردہ

] میں نے بچپن میں ایک نابینا سے قرآن مجید حفظ کیا، اب میں شادی شدہ ہوں، بعض اوقات انہیں ملنے کے لیے جاتی ہوں تو کیا مجھے ان سے پردہ کرنا چاہیے جب کہ انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ قرآن وحدیث کے مطابق جواب مطلوب ہے۔

[شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے اساتذہ سے میل ملاقات اور رابطہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن عورت کو ملاقات کے وقت خلوت ممنوع ہے۔

جیسا کہ حدیث میں ہے: ''کوئی آدمی کسی عورت کے محرم کے بغیر اس کے ساتھ خلوت نہ کرے۔'' 5

! الدہر:۷.	@ مسند امام احمد: ج۲، ص۴۲۱.

# بخاری، الاعتکاف:۲۰۴۲.	$ مسلم، الایمان:۱۶۴۵.

%بخاری، النکاح:۵۲۳۳.

بلکہ ایک روایت میں صراحت ہے کہ ''ایسے حالات میں ان کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے۔'' 1

ان احادیث کی روشنی میں ہم کہتے ہیں کہ عورت اگر کسی غیر محرم سے ملاقات کرنا چاہتی ہے تو اپنے بھائی، باپ، بیٹے یا خاوند کی معیت میں کرے، محرم کے بغیر ملاقات کرنا جائز نہیں۔ شریعت اسلامیہ میں فتنہ وفساد کی روک تھام کے لیے خواتین کو پردے کا حکم دیا ہے تاکہ عورت کے محاسن اور فتنہ خیز اعضاء دوسروں کی آزمائش اور امتحان کا ذریعہ نہ بنیں، جب کہ نابینا انسان کوئی چیز نہیں دیکھ سکتا۔

ہمارے رجحان کے مطابق عورت نابینا شخص کے سامنے اپنا چہرہ ننگا کرسکتی ہے اگرچہ بہتر ہے کہ وہ ایسے حالات میں بھی بے حجاب نہ ہو کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا ہے۔

نابینا سے پردہ کے متعلق اہل علم کا ایک دوسرا موقف بھی ہے کہ عورت کو ان حضرات سے بھی پردہ کرنا چاہیے، وہ اس سلسلہ میں درج ذیل رواتب پیش کرتے ہیں۔

سیدہ ام المؤمنین ام سلمہ r بیان کرتی ہیں کہ میں رسول اللہ e کی خدمت میں موجود تھی اور سیدہ میمونہ r بھی وہیں تھیں، اس دوران میں سیدنا ابن ام مکتوم t آ گئے اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہمیں پردے کے احکام دے دیئے گئے تھے۔ رسول اللہ e نے فرمایا: ''اس سے پردہ کرو۔'' ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا یہ نابینا نہیں ہے؟ ہمیں دیکھتا نہیں اور پہچانتا بھی نہیں۔

تو آپ e نے فرمایا: ''کیا تم بھی نابینا ہو؟
کیا تم اسے نہیں دیکھتی ہو۔'' 2

امام ترمذی a نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ 3

یہ روایت اگر صحیح ہے تو اس کی توجیہ امام ابوداؤد a نے بایں الفاظ کی ہے: ''سیدنا ابن ام مکتوم t سے پردہ کا جو حکم دیا گیا ہے وہ صرف ازواج مطہرات کے لیے خاص تھا، عام مسلمان خواتین کے لیے یہ ضروری نہیں۔'' 4

قرآن کریم کی بھی صراحت ہے:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ 5

''ازواج مطہرات عام مسلمان خواتین کی طرح نہیں ہیں۔''

! مسند امام احمد، ج۱، ص۱۸۔ @ ابوداود، اللباس:۱۴۱۲۔
ترمذی، الادب:۲۷۷۸۔ $ ابوداود، حدیث نمبر:۴۱۱۲۔
% الاحزاب:۳۲۔

لیکن ہمارے رجحان کے مطابق یہ روایت ضعیف ہے، جیسا کہ محدث العصر علامہ البانی a نے اس کی ضعیف ہونے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ 1

پھر یہ حدیث ایک دوسری صحیح حدیث کے خلاف ہے جس سے رسول اللہ e نے سیدہ فاطمہ بنت قیس r کو ان کے چچا زاد سیدنا ابن ام مکتوم t کے ہاں عدت گزارنے کے متعلق فرمایا تھا، کیوں کہ نابینا شخص ہے اور تو اس کے ہاں اپنے زائد اور فالتو کپڑے اتار سکتی ہو۔ 2

بہر حال صورت مسئولہ میں ہم سائلہ کو فتویٰ دیتے ہیں کہ وہ اپنے استاد کے ہاں جا سکتی ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ کوئی محرم ہو اور ان سے پردہ کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ واللہ اعلم!

! سلسلہ الاحادیث الضعیفہ: ج۱۲، ص۸۹۹. @ مسلم، الطلاق:۱۴۸۰.

رات کی آخری تہائی کی فضیلت

] احادیث میں رات کی آخری تہائی کی فضیلت آئی ہے، اس کی تعین گھنٹوں میں کیسے ہوسکتی ہے، اس سلسلہ میں میری راہنمائی کریں؟

[شرعی اعتبار سے رات، غروب آفتاب سے شروع ہوتی ہے اور طلوع فجر تک رہتی ہے، طلوع فجر کے بعد رات ختم ہو جاتی ہے، چونکہ رات کا دورانیہ مختلف ہوتا ہے، اس لیے گھنٹوں میں اس کی تعیین ممکن نہیں، البتہ اس کی پہچان ہر انسان کے لیے ممکن ہے۔ وہ اس طرح کہ غروب آفتاب کے بعد طلوع فجر تک کے وقت کو تین حصوں میں تقسیم کرلیا جائے، پہلے دو حصے چھوڑ کر آخری حصہ وہ رات کی آخری تہائی ہے، اس کی حدیث میں واقعی بہت فضیلت آئی ہے۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ ہر رات کے آخری تہائی حصہ میں آسمان دنیا پر اترتے ہیں اور فرماتے ہیں: کون ہے جو مجھے پکارے، میں اس کی حاجت برآوری کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مغفرت طلب کرے میں اسے معاف کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مانگے میں اسے عطا کروں؟'' 1

بندہ مومن کو چاہیے کہ وہ ان مبارک لمحات کو غنیمت خیال کرے، وہ اس وقت ضرور اپنے اللہ کے ساتھ مناجات میں مصروف ہو اگرچہ تھوڑے سے وقت میں ہو، ممکن ہے کہ اسے اللہ کی طرف سے فضل عظیم میسر آجائے۔ شاید اسے اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا کچھ حصہ مل جائے اور اس کی دعائیں شرف قبولیت سے نواز دی جائیں۔ اللہ تعالیٰ ان مبارک ساعتوں میں عاجزی اور انکساری کے ساتھ دست سوال دراز کرنے کی توفیق دے۔ آمین!

ابو القاسم کنیت رکھنا

] میں نے ایک کتاب پر اس کے مؤلف کا نام ''ابو القاسم محمد'' پڑھا ہے، جبکہ حدیث میں اس کی ممانعت ہے، اس کی وضاحت کریں۔

! صحیح بخاری۔

] بلاشبہ حدیث میں ابو القاسم کنیت رکھنے کی ممانعت ہے۔

چنانچہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''میرا نام رکھو لیکن میری کنیت نہ رکھو۔'' 1

اس حدیث کا پس منظر حضرت جابر t اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک آدمی کے گھر بچہ پیدا ہوا تو اس نے اس کا نام قاسم رکھا، دوسرے لوگوں نے کہا کہ ہم تجھے ابو القاسم کی کنیت سے یاد نہیں کریں گے تا آنکہ رسول اللہ e سے اس کی تصدیق نہ کر لیں، جب انہوں نے رسول اللہ e سے پوچھا تو آپ نے مذکورہ حدیث بیان کی۔

محدثین نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ ابو القاسم کنیت رکھنے کی ممانعت رسول اللہ e کی زندگی تک تھی، یعنی آپ کی زندگی میں یہ کنیت اختیار کرنا جائز نہیں تھا۔ اس کی ممانعت کے لیے یہ واقعہ پیش آیا کہ رسول اللہ e ایک مرتبہ بازار میں تھے کہ ایک شخص نے ابو القاسم کہہ کر آواز دی، آپ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو آواز دینے والے نے کہا کہ میں نے آپ کو آواز نہیں دی بلکہ میں نے تو فلاں شخص کو آواز دی ہے۔ اس واقعہ کے بعد رسول اللہ e نے یہ کنیت رکھنے سے منع کر دیا۔ 2

رسول اللہ e کی زندگی کے بعد ابو القاسم کنیت رکھنے کے متعلق حضرت علی t سے ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر آپ کے بعد میرے ہاں بچہ پیدا ہو تو کیا میں اس کا نام اور کنیت آپ کے نام اور کنیت پر رکھ سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں۔'' 3

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ e کی زندگی کے بعد آپ کا نام اور آپ کی کنیت ابو القاسم رکھنے میں چنداں حرج نہیں۔ اس مسئلے کے متعلق مزید تفصیل فتح الباری میں دیکھی جا سکتی ہے جو حافظ ابن حجر a نے بخاری حدیث نمبر ۶۱۸۸ کے تحت بیان کی ہے۔

سیر و تفریح کے لیے غیر مسلم ممالک کا سفر

] اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ہم مسلمان سیر و تفریح کے لیے کسی کافر ملک کا انتخاب کرتے ہیں، کیا سیر و سیاحت کے لیے ایسے ممالک میں جانا جائز ہے جہاں غیر مسلم لوگوں کی حکومت ہو؟

] کفار کے ممالک کی طرف بوقت ضرورت سفر کرنا جائز ہے، لیکن اس کے لیے تین شرائط کا پایا جانا ضروری ہے جو حسب ذیل ہیں:

☆ اس کے پاس شرعی علم اس قدر ہو کہ وہ کفار کے شکوک و شبہات کا شافی جواب دے سکے۔

☆ اس پر دینی رنگ اس قدر غالب ہو کہ غیر مسلم لوگوں کی تہذیب سے متاثر نہ ہو سکے۔

☆ اسے سفر کرنے کی کوئی حقیقی ضرورت ہو جو اسلامی ممالک میں پوری نہ ہو سکتی ہو۔

! بخاری، الادب: ۶۱۸۸۔ @ فتح الباری، ص ۷۰۲، ج ۱۰۔

ابوداؤد، الادب: ۴۹۶۷۔

اگر مذکورہ شرائط کسی میں نہیں پائی جاتیں تو اسے غیر مسلم ممالک کا سفر نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس میں اس کے اخلاق و کردار کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ ہاں اگر علاج یا تعلیم وغیرہ کے حصول کے لیے غیر مسلم ممالک میں جانا ہے جو اپنے ملک میں حاصل نہ ہوسکتی ہو تو مذکورہ شرائط کے ساتھ سفر کرنے میں چنداں حرج نہیں۔ جہاں تک سیر وتفریح اور سیاحت کا تعلق ہے تو اس کے لیے مسلم ممالک میں بہت سے تفریحی مقامات ہیں جنہیں دیکھا جاسکتا ہے لہٰذا اگر انسان کے پاس فرصت کے لمحات میسر ہوں اور وہ سیر وسیاحت کا شوق پورا کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے مسلم ممالک کا رخ کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

عورت کا رحم نکال دینا

] ہمارے ہاں فیشن کے طور پر جب کسی عورت کے ہاں دو تین بچوں کی پیدائش ہو جاتی ہے تو کمزوری کے بہانے اس کا رحم نکال دیا جاتا ہے تاکہ وہ آئندہ بچہ جنم دینے کے قابل نہ رہے، کیا شرعی طور پر ایسا کرنا جائز ہے؟

[دین اسلام (اگر بچوں کی تربیت کا اہتمام کیا جائے تو) افزائش نسل کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''تم ایسی عورتوں سے شادی کرو جو بہت محبت کرنے والی اور بہت بچے جننے والی ہو، کیوں کہ میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کرنے والا ہوں۔'' 1

حدیث میں بیان کردہ عورتوں کی صفات خاندانی عرف سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔ بیوہ عورتوں کے متعلق تو پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اولاد کے قابل نہیں اور کنواری عورت کو ایام نہ آنا ایک امکانی سبب ہوسکتا ہے، ویسے کنواری لڑکیوں میں یہ اوصاف عمومی طور پر فطرتاً پائے جاتے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد صورت مسئولہ میں ہمارا رجحان یہ ہے کہ اگر عورت واقعی مجبور ہے اور رحم نکالے بغیر اس کا علاج ناممکن ہے مثلاً رحم پھٹ جاتا ہے یا مسلسل بچوں کو جنم دینے کی وجہ سے آئندہ اس کی جان کو خطرہ ہے تو ایسے حالات میں رحم کو نکالا جاسکتا ہے تاکہ امکانی حد تک اس کا علاج ہو سکے لیکن عام حالات میں ایسا کرنا جائز نہیں۔ جیسا کہ آج کل مغربی تہذیب سے متاثر فیشن زدہ خواتین منصوبہ بندی کی غرض سے مستقل طور پر نس بندی کرا لیتی ہیں یا ان کا رحم نکال دیا جاتا ہے۔ ویسے بھی معاشرتی طور پر یہ کئی ایک اخلاقی کمزوریوں اور طبی طور پر کئی بیماریوں یا الجھنوں کا باعث ہوسکتا ہے، اس لیے کسی خاص مجبوری کی وجہ سے ایسا کیا جاسکتا ہے لیکن عام حالات میں اس کی کھلے بندوں اجازت دینا اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔ (واللہ اعلم)

خواب کی حقیقت

] کچھ اہل علم خواب کی حقیقت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ نیند کے وقت انسان کی روح نکل جاتی ہے اور کسی دوسری روح سے ملاقات کرتی ہے، دوران ملاقات جو کچھ ہوتا ہے وہی انسان خواب میں دیکھتا ہے، کیا خواب کی مذکورہ حقیقت

1ابو داؤد، النکاح: ۲۰۵۰۔

درست ہے، وضاحت کریں؟

] ہمارے نزدیک خواب سے مراد ایسا علم ہے جو اکثر اوقات کسی مثال کے ذریعے نیند کی حالت میں حاصل ہوتا ہے۔ جو کچھ انسان خواب میں دیکھتا ہے وہ درحقیقت مثال ہوتی ہے، اس مثال کے ذریعے انسان کو سمجھانا یا پیش آمدہ آزمائش پر اسے خبردار کرنا ہوتا ہے۔

سوال میں جو خواب کی حقیقت بیان کی گئی ہے وہ علی الاطلاق صحیح نہیں کیوں کہ بعض دفعہ انسان دن میں سو جاتا ہے پھر خواب میں کسی سے بات چیت کرتا ہے۔

بعض دفعہ مار پیٹ کی نوبت بھی آتی ہے اور اس کی چیخ وپکار بھی سنائی دیتی ہے، جبکہ جس کے ہاتھوں اس کی پٹائی ہوتی ہے وہ اس وقت سویا ہوا نہیں ہوتا کہ اس کی روح نکل کر اس کی روح سے محو گفتگو ہو یا اس کی مار کٹائی میں مصروف ہو۔ اس لیے علی الاطلاق یہ کہنا مشکل ہے کہ خواب دیکھنے والے کی روح نکل کر دوسرے انسان کی روح سے مل جاتی ہے، ایسے معلوم ہوتا ہے کہ خواب میں نظر آنے والا انسان محض عکس اور مثال ہوتا ہے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات انسان ایک خواب دیکھتا ہے تو بیداری کے عالم میں اس کی حقیقت ہو بہو دیکھ لیتا ہے۔

جیسا کہ حضرت عائشہ r، رسول اللہ e کے ابتدائی دور نبوت کے خوابوں کو بیان کرتی ہیں: ''آپ جو کچھ خواب میں دیکھتے وہ سپیدہ سحر کی طرح نمودار ہو جاتا۔'' 1

قریب قیامت کے وقت اہل ایمان کے خوابوں کی یہی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ ان کا خواب ویسے ہی ظاہر ہوگا جیسا کہ نیند میں دیکھا گیا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ e کا فرمان ہے:

''آخری زمانہ میں مومن کے خواب جھوٹے نہیں ہوں گے۔'' 2

حضرت ابو ہریرہ t سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''جب زمانہ قریب ہو جائے تو مومن کا خواب جھوٹا نہیں ہوگا اور تم میں سے خواب کے اعتبار سے سچا وہ شخص ہوگا جو گفتگو اور بات کرنے میں سب سے سچا ہوگا۔'' 3

اس حدیث کے پیش نظر ہمیں قولی اور عملی طور پر سچائی کو اختیار کرنا چاہیے تاکہ ہمارے خواب بھی سچائی پر مبنی ہوں اور خیالات کی پراگندگی سے محفوظ رہیں۔ (واللہ اعلم)

! بخاری، بدء الوحی:۳۔ @ ترمذی، ابواب الرؤیا:۲۲۹۱۔

مسلم، الرؤیا:۲۲۶۳۔

کیرم بورڈ اور لڈو کھیلنا

] ہمارے معاشرہ میں جب کسی کے پاس وقت فارغ ہوتو وہ لڈو اور کیرم کھیلنے میں اپنا وقت گزارتا ہے، کیا دین اسلام میں اس قسم کے کھیل کھیلے جاسکتے ہیں؟

[کھیل کا اصل مقصد ذہنی آرام اور جسمانی ورزش ہوتا ہے، جس کھیل میں یہ مقصد پورا نہ ہوتا ہو اسے کھیلنے کی اجازت نہیں۔ احادیث میں اس قسم کے کھیلوں کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

چنانچہ حضرت بریدہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''جس نے نردشیر کھیلا، اس نے گویا اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت اور خون سے آلودہ کیا۔'' 1

عربی زبان میں نرد کا معنی ''تعبۃ الطاولۃ'' کیا گیا ہے، وہ کھیل جو لکڑی کے تختے پر کھیلا جائے۔ اس میں کیرم بورڈ، سنوکر، شطرنج اور لڈو وغیرہ تمام فضول کھیل آجاتے ہیں۔ ایک بندۂ مومن کی شان کے خلاف ہے کہ وہ ایسے فضول کھیلوں سے خود کو آلودہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے بندوں کا ایک وصف بیاں الفاظ بیان کیا ہے:

﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ 2

''رحمن کے بندے جب کسی لغو اور بے فائدہ چیز کے پاس سے گزرتے ہیں تو باعزت طور پر گزر جاتے ہیں۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ بندۂ مومن لغو اور فضول کھیلوں کو عمل میں لانا تو درکنار بلکہ وہ ایسے کھیلوں کی طرف دیکھنے کا بھی روادار نہیں اور وہاں سے شرافت کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں اس قسم کے کھیل کے متعلق رسول اللہ e کا ارشاد ہے: ''جس نے چوسر کھیلا، اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔'' 3

ہمارے رجحان کے مطابق شرعی طور پر ایسے تمام کھیل ناجائز ہیں، جو وقت اور سرمائے کے ضیاع کا باعث ہوں۔ اگر جائز کھیلوں میں بھی وقت ضائع ہوتا ہو تو وہ بھی ناجائز قرار پائیں گے۔ بہرحال جس شریعت میں ''چوسر'' کھیلنے کی اجازت نہیں، اس میں کرکٹ جیسے کھیل کی اجازت کس طرح ہوسکتی ہے جس میں بڑی بے دردی سے بے شمار لوگوں کا وقت ضائع ہوتا ہو؟

اس کھیل میں نماز، روزے کی کوئی پروا نہیں ہوتی، نیز یہ کھیل جوئے جیسی بدترین لعنت کا سبب اور ذریعہ بن چکا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے فضول کھیل، مسلمان کی شان کے خلاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے کھیلوں سے دور رکھے جس کا کوئی دینی، دنیوی، ذہنی یا جسمانی فائدہ نہ ہو۔ (واللہ اعلم)

کبوتر بازی اور تیتر بازی

] میرے ایک دوست نے ہزاروں روپے کے سیاہ تیتر خرید کر رکھے ہیں، اس کا مقابلہ زیادہ بولنے کے لحاظ سے

! صحیح مسلم، الشعر: ۲۲۶۰.   @ الفرقان: ۷۲.

ابوداؤد، الادب: ۴۹۳۸.

ہوتا ہے، اسے شراب پلا کر مقابلے میں رکھا جاتا ہے، جو تیتر زیادہ دیر تک بولتا رہے وہ جیت جاتا ہے،بعض اوقات اس میں شرط بھی لگائی جاتی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

] پرندوں کو کسی جائز مقصد کے لیے پالنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کے کھانے پینے اور دیگر حقوق کا خیال رکھا جائے۔ جیسا کہ حضرت انس t کے چھوٹے بھائی ابوعمیر نے ایک سرخ چڑیا گھر میں رکھی ہوئی تھی وہ اس سے کھیلا کرتے تھے، وہ مرگئی تو رسول اللہ e بطور مزاح اسے کہا کرتے تھے: ''اے ابوعمیر! نغیر کو کیا ہوگیا؟'' 1

اگر اس طرح چڑیا یا پرندہ گھر میں رکھنا منع ہوتا تو رسول اللہ e منع کر دیتے۔ اگر پرندے وقت کے ضیاع کا باعث ہوں تو انہیں پالنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

صورت مسئولہ میں تیتر کے متعلق وضاحت کی گئی ہے کہ اسے شراب پلا کر مقابلے میں لایا جاتا ہے اور جو زیادہ دیر تک بولتا رہے وہ مقابلہ جیت جاتا ہے، اس کے ناجائز ہونے میں کیا شبہ ہے؟

چنانچہ حضرت ابوہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے ایک آدمی کو کبوتر کا پیچھا کرتے دیکھا تو فرمایا: ''ایک شیطان دوسرے شیطان کا پیچھا کر رہا ہے۔'' 2

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کبوتر بازی، بٹیر بازی، تیتر بازی اور مرغ لڑانا وغیرہ سب فضول اور ناجائز مشاغل ہیں۔ اگر ان کے مقابلوں میں شرط لگائی جائے، جس میں ہارنے والا، جیتنے والے کو کوئی چیز یا نقد رقم ادا کرے تو یہ جوا ہے جسے قرآن کریم نے حرام، نجس اور شیطانی عمل قرار دیا ہے۔ بہرحال ہر وہ مشغلہ جس کو جائز حد سے زیادہ اہمیت دی جائے اور اس سے وقت یا رقم ضائع کی جائے، وہ ممنوع اور ناجائز ہے۔ مذکورہ حدیث میں رسول اللہ e نے کبوتر بازی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اسے شیطانی کام سے تعبیر کیا ہے۔ کبوتر کو شیطان اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے مفاسد کی وجہ سے شیطان خوش ہوتا ہے۔ کبوتر بازی کی طرح بٹیر بازی، پتنگ بازی بھی فضول اور خطرناک مشغلہ ہے۔ ایک مسلمان کو ایسے کاموں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ایسے کاموں کے حرام ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ ایسے کاموں میں مشغول ہو کر وقت ضائع کرتے ہیں حتی کہ نماز کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ اگر کبوتروں، تیتروں اور بٹیروں کو تجارت یا گھر کی زینت کے لیے رکھا جائے تو جائز ہے بشرطیکہ ان کے دانے، کھانے، پینے کا خیال رکھا جائے۔ مقابلہ بازی کے لیے رکھنا شرعی طور پر جائز نہیں۔ (واللہ اعلم)

نبیذ کیا ہوتا ہے؟

] احادیث میں نبیذ کا ذکر بکثرت آتا ہے کہ رسول اللہ e اسے نوش کرتے تھے، یہ نبیذ کیا ہے؟ اس کی وضاحت کریں۔

[نبیذ تازہ اور خشک دونوں قسم کے پھلوں سے تیار کیا جاتا ہے، بازار میں ہر قسم کے پھل کا جوس دستیاب ہے، یہ

! بخاری، الادب:۶۲۰۳. @ ابن ماجہ، الادب:۳۷۶۵.

بھی نبیذ ہی کی ایک قسم ہے۔ رسول اللہ e کے دور میں جو نبیذ تیار کیا جاتا تھا اس کی صورت یہ تھی:

''کسی بھی خشک پھل (منقی یا چھوہارے) کو پانی میں ڈال دیا جاتا، جب وہ نرم ہو جاتا تو پھل کو ہاتھوں سے مسل کر کسی کپڑے سے اس کا پانی نچوڑ لیا جاتا تاکہ پھل کا پھوگ الگ ہو جائے، پھل کے اثر والا نچڑا ہوا پانی نبیذ کہلاتا ہے، یہ ذائقہ دار اور مقوی ہوتا ہے۔''

اسے نوش کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں نشہ پیدا نہ ہو، اس کی علامت یہ ہے کہ اس میں جھاگ پیدا ہو جائے یا ذائقہ میں ترشی محسوس ہونے لگے تو ایسے حالات میں اسے پینا درست نہیں۔ درست حالت میں جو نبیذ ہوتا ہے اسے گرمیوں میں ایک دن اور سردیوں میں تین دن تک پینے کی اجازت ہے کیوں کہ زیادہ دیر تک پڑا رہنے کی وجہ سے اس میں نشہ آنے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ r کا بیان ہے کہ ہر مشروب پیا جا سکتا ہے مگر نشہ میں نہ آؤ۔ 1

بلکہ حضرت ابن عباس t سے ایک آدمی نے پوچھا: ''میں میٹھا نبیذ نوش کرتا ہوں، تو پینے کے بعد میرے پیٹ میں گڑ گڑ ہوتی ہے، حضرت ابن عباس t نے فرمایا کہ ایسی نبیذ مت نوش کرو، اگرچہ وہ شہد سے زیادہ میٹھا ہو۔'' 2

مقصد یہ ہے کہ مشروب مشکوک ہو تو اسے مت پیا جائے، اگرچہ اس کا ذائقہ صحیح ہو اور ظاہری طور پر اس میں نشہ بھی نہ ہو۔ ہاں اگر نبیذ میں ترشی پیدا ہو رہی ہو تو اگر اس میں مزید پانی ملا کر اسے ختم کیا جا سکتا ہو تو اسے نوش کرنے کی اجازت ہے لیکن بہت زیادہ ترش ہو جانے یا نشہ آور ہونے کی صورت میں ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ (واللہ اعلم)

لقب فاروق

] کچھ حضرات کہتے ہیں کہ حضرت عمر t کو رسول اللہ e نے ''فاروق'' کا لقب نہیں دیا، بلکہ یہ لقب انہیں یہودیوں کی طرف سے ملا تھا، اس کی کیا حیثیت ہے؟ وضاحت سے لکھیں۔

[تاریخ و رجال کی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر t کا لقب فاروق خود رسول اللہ e نے ہی رکھا تھا، جیسا کہ حافظ ابن حجر a، حضرت عمر بن خطاب t کے حالات میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب t نے خود فرمایا:

''رسول اللہ e نے میرے اسلام قبول کرنے کے دن میرا نام فاروق رکھا۔'' 3

اسی طرح شرح بخاری میں لکھتے ہیں؛ ''حضرت عمر t کے لقب فاروق پر علماء کا اتفاق ہے۔'' 4

معروف مؤرخ امام ابن اثیر a لکھتے ہیں:

''رسول اللہ e نے حضرت عمر t کا لقب ''فاروق'' خود منتخب فرمایا تھا۔'' 5

! نسائی، الاشربہ:۵۶۸۲۔ @ نسائی، الاشربہ:۵۶۹۴۔

الاصابہ، ص۲،۵۱۲۔ $ فتح الباری، ص۳۳،ج۷۔

% الکامل، س۱۵۱، ج۴۔

علامہ قسطلانی a لکھتے ہیں: ''حضرت عمر t کا لقب، فاروق خود رسول اللہ e کا تجویز کردہ ہے۔'' 1
البتہ مؤرخین نے صیغہ تمریض کے ساتھ اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر t کا لقب 'فاروق' اہل کتاب نے رکھا تھا، جو اس موقف کے کمزور ہونے کی علامت ہے۔ اگر اہل کتاب نے بھی یہ لقب رکھا ہو تو بھی اس میں کیا قباحت ہے بلکہ یہ تو حضرت عمر t کی بلندی شان ہے کہ دشمنان اسلام بھی آپ کے اس لقب کو تسلیم کرتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

شراب کا اجازت نامہ

] شراب نوشی حرام ہے لیکن حکومت اس کی خرید و فروخت کے اجازت نامے جاری کرتی ہے، کیا اسلام میں اس طرح کا اقدام کیا جا سکتا ہے کہ وہ حرام کام کے لیے پرمٹ جاری کرے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں اس اقدام کی وضاحت کریں۔

[قرآن کریم نے شراب کو ناپاک اور شیطانی عمل قرار دیا ہے اور اس سے اجتناب کی تلقین کی ہے، لہٰذا حکومت کی طرف سے اس کے اجازت نامے جاری کرنا ناجائز اور حرام ہیں۔ شراب کے متعلق رسول اللہ e کے تاثرات حضرت انس t نے بیان کیے ہیں: ''رسول اللہ e نے شراب کے سلسلہ میں دس لوگوں پر لعنت فرمائی ہے، شراب کشید کرنے والا، جس کے لیے کشید کی جائے، پینے والا، اٹھانے والا جس کی خاطر اٹھائی جائے، پلانے والا، فروخت کرنے والا، اس کی قیمت کھانے والا، اسے خریدنے والا اور جس کے لیے خریدی گئی ہے، سب لعنتی ہیں۔'' 2

شراب پینا حرام اور قابل تعزیر جرم ہے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صرف شراب پینے والا ہی مجرم نہیں بلکہ اس کے کاروبار سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھنے والا بھی نہ صرف گناہ گار ہے بلکہ اللہ کی رحمت سے دور اور ملعون ہے۔ اس کی کمائی بھی حرام ہے کیوں کہ شراب ایک ایسی لعنت ہے جس کے برے اثراب پورے معاشرہ کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ لہٰذا شریعت کی رو سے اس کی خرید و فروخت کے لیے پرمٹ جاری کرنا ناجائز اور حرام ہے، اسلام اس طرح کے اقدامات کی قطعاً حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ دین اسلام تو ایسے اقدامات کے متعلق اس قدر حساس ہے کہ اگر حلال چیزیں بھی حرام مقاصد کے لیے فروخت کی جائیں تو وہ بھی ناجائز اور حرام قرار پاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت عمران بن حصین t کا بیان ہے کہ رسول اللہ e نے جنگ و جدال کے دنوں میں اسلحہ کی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے۔ 3

اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے کاموں سے اجتناب کی توفیق دے۔ آمین

بخار کے لیے ٹھنڈا پانی

] عام طور پر جس آدمی کو بخار ہو اسے ٹھنڈے پانی سے نہانے کا مشورہ دیا جاتا ہے، بعض اوقات ایسا کرنے سے نقصان بھی ہوتا ہے، کیا یہ کسی حدیث سے ثابت ہے؟ اس حدیث کا حوالہ دیں۔

! ارشاد الساری، ص ۹۸، ج۶. @ مسند امام احمد، ص۲۵، ج۲.
بیہقی، ص۳۲۷، ج۵.

[صفراوی بخار میں ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا بہت مفید ہے۔آج کل شدید بخار کی حالت میں اطباء حضرات بھی مریض کے سر پر برف کی ٹھنڈی پٹیاں رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں اور مریض کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پانی سے دھونے کی تلقین کرتے ہیں۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''بخار جہنم کی بھاپ کی وجہ سے ہوتا ہے، لہٰذا تم پانی سے ٹھنڈا کرو۔'' 1

مختلف صحابہ کرام سے متعدد احادیث مروی ہیں کہ رسول اللہ e نے بخار کے لیے ٹھنڈا پانی تجویز کیا، لیکن ایسا کرنا اس بخار میں فائدہ مند ہوتا ہے جو گرمی کی وجہ سے ہو۔ کیوں کہ رسول اللہ e نے اہل حجاز اور اس کے گردونواح میں رہنے والوں کو یہ علاج بتایا تھا، انہیں بکثرت گرمی سے بخار ہوتا تھا، اس لیے آپ نے ان کے لیے ٹھنڈے پانی کا استعمال تجویز کیا۔ ان احادیث میں بخار کو ٹھنڈا کرنے کا طریقہ بیان نہیں ہوا۔

البتہ حضرت اسماء بنت ابی بکر t کے پاس جب کوئی بخار زدہ مریضہ آتی تو وہ اس کے سینے پر پانی ڈالا کرتی تھیں۔ 2

چونکہ حضرت اسماء r، حضرت عائشہ r کی بڑی ہمشیرہ تھیں اور اکثر رسول اللہ e کے پاس آیا جایا کرتی تھیں، اس لیے وہ دوسروں کی نسبت زیادہ جانتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تجویز کردہ علاج رسول اللہ e کا بتایا ہوا ہے۔

بہر حال جس شخص کو گرمی کی وجہ سے بخار ہو، اس کے لیے نہانا مفید ہے۔ جدید طب میں بھی برف کے ٹھنڈے پانی سے اس کا علاج کیا جاتا ہے، اور مریض کی پیشانی، اس کے ہاتھ پاؤں پر ٹھنڈی پٹیاں رکھی جاتی ہیں، لہٰذا بخار والے مریض کو اس ''علاج نبوی'' سے استفادہ کرنا چاہیے، امید ہے کہ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ (واللہ اعلم)

جب رسول اللہ e مرض الموت میں مبتلا تھے اس وقت آپ خود بھی سات مشکیزوں کا پانی منگوا کر اس میں نہائے تھے۔ (بخاری)

غیر مسلم ٹیچر سے تعلقات

] میرے ساتھ کچھ ٹیچر عیسائی ہیں جو سکول میں پڑھاتے ہیں، بعض اوقات ان کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے کا موقع آتا ہے، پارٹی کے وقت ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے ان کے استعمال شدہ برتن بھی استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ اس سلسلہ میں رہنمائی کریں کہ ہم ان سے کس قسم کے تعلقات رکھ سکتے ہیں اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھا پی سکتے ہیں؟

[عام طور پر تعلقات کی چار اقسام حسب ذیل ہیں:

☆ موالات:...... یہ ایسا باہمی تعلق ہے، جس میں ایک دوسرے کے لیے محبت کے جذبات ہوتے ہیں، اس قسم کا تعلق مسلمانوں کا باہمی طور پر ہونا چاہیے، غیر مسلم کے ساتھ یہ تعلق جائز نہیں۔

☆ مواسات:...... دینی عقائد سے قطع نظر محض انسانی ہمدردی کے طور پر ایک دوسرے سے خیر خواہی اور غم خواری کرنا، یہ کفار

! بخاری، الطب:۵۷۲۳.   @ بخاری، ا لطب:۵۷۲۴.

کے ساتھ جائز ہے بشرطیکہ وہ مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوں۔

☆ مدارات:...... ظاہری طور پر خوش اخلاقی سے پیش آنا، کفار کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی شرعی فائدہ ہو۔ مثلاً انہیں اسلام کی طرف مائل کرنا یا ان کے شر سے محفوظ رہنا۔

☆ معاملات:...... کاروبار، تجارت یا ملازمت کرنا، اسی طرح کسی غیر مسلم کو گھر کی صفائی کے لیے تنخواہ پر رکھنا وغیرہ، اگر کوئی شرعی حرج نہ ہو تو غیر مسلم کے ساتھ معاملات کیے جا سکتے ہیں۔

اس وضاحت کے بعد ہمارا دین اسلام، انسانیت سے نفرت نہیں سکھاتا، انسان ہونے کے ناطے سے دوسرے انسانوں سے ہمدردی اور حسن سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔ دور حاضر میں اس طرح کی ضرورت عام ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلم اداروں میں یا اس کے برعکس کام کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ انہیں دفاتر میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پینا پڑتا ہے۔ بلکہ ایک دوسرے کے برتن استعمال کرنے کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔ غیر مسلم اگر صفائی اور نظافت کا خیال رکھتا ہے تو اس کے ساتھ کھانے پینے میں چنداں حرج نہیں۔ اگر قابل اعتماد ہے تو اس سے کھانا پکوایا بھی جا سکتا ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق ایک مسلمان کو غیر مسلم کے ساتھ ایک میز پر کھانا جائز ہے۔ ضرورت پڑنے پر ایک پلیٹ میں کھایا بھی جا سکتا ہے۔ البتہ انہیں ہمیشہ کے لیے ہم نوالہ، ہم پیالہ بنانا دینی مصلحت کے خلاف اور ناجائز ہے۔

صورت مسئولہ میں اگر کوئی مسلمان ٹیچر کسی غیر مسلم کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتا ہے یا کسی پارٹی میں ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا ہے تو شرعی طور پر اس میں کوئی حرج نہیں۔ واللہ اعلم!

سر کے بال زمین میں دفن کرنا

] میں نے ایک حدیث میں پڑھا تھا کہ جب رسول اللہ e کے لخت جگر سیدنا ابراہیم u پیدا ہوئے تو آپ نے اس کا سر منڈوایا اور بالوں کو زمین میں دفن کر دیا۔ کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟ نیز اس روایت کا حوالہ درکار ہے۔

[یہ روایت البدایہ والنہایہ میں ہے، اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے: ''جب سیدہ ماریہ قبطیہ r نے رسول اللہ e کے بیٹے ابراہیم t کو جنم دیا تو رسول اللہ e نے پیدائش کے ساتویں دن اس کا عقیقہ کیا، سر منڈوایا اور سر کے بالوں کے برابر مساکین میں چاندی تقسیم کی۔ پھر آپ کے حکم سے ان بالوں کو زمین میں دفن کر دیا گیا، رسول اللہ e نے ان کا نام ''ابراہیم'' رکھا۔'' 1

یہ روایت واقدی مشہور کذاب کی وجہ سے منسوخ ہے، البتہ اس میں ساتویں دن عقیقہ کرنا، بال منڈوانا اور اس کے برابر چاندی صدقہ کرنا دوسری احادیث سے ثابت ہے۔ البتہ سر کے بالوں کو زمین میں دفن کر دینے کا مسئلہ صحیح نہیں، لہٰذا روایت کے اس حصے پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم!

! البدایہ والنہایہ: ج۵، ص۲۶۴۔

عورتوں کے لیے اللہ کا سایہ

] حدیث میں ہے کہ سات خوش قسمت حضرات ایسے ہیں جنہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا سایہ نصیب ہوگا۔ یہ اعزاز صرف مردوں کے لیے ہے یا عورتیں بھی یہ فضیلت حاصل کر سکتی ہیں؟

[قیامت کے دن جن خوش قسمت حضرات کو اللہ کا سایہ ملے گا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ انصاف کرنے والے حکمران۔

۲۔ وہ نوجوان جو اپنے رب کی عبادت میں پروان چڑھے۔

۳۔ وہ شخص جس کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہے۔

۴۔ وہ دو شخص جو اللہ کے لیے دوستی کریں، جمع ہوں تو اس کے لیے اور جدا ہوں تو بھی اس کے لیے۔

۵۔ وہ شخص جسے کوئی خوبرو اور معزز خاتون برائی کی دعوت دے اور وہ کہہ دے ''میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔''

۶۔ وہ شخص جو اس قدر پوشیدہ طور پر خیرات دیتا ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو پتہ نہیں چلتا کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔

۷۔ وہ شخص جو خلوت میں اللہ کو یاد کرے تو بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں۔

یہ اعزاز صرف مردوں کے لیے خاص نہیں بلکہ عورتیں بھی اس میں شامل ہیں، حتی کہ وہ عورت جو اپنے گھر کی مالکہ ہے اور اپنے گھر میں عدل و انصاف کرتی ہے، بچوں پر ظلم نہیں کرتی، متعلقین میں سے کسی کی حق تلفی نہیں کرتی، بلکہ ہمہ وقت عدل و انصاف کو مقدم سمجھتی ہے وہ ''انصاف کرنے والے حکمران'' میں شامل ہوگی۔

مسجد کے ساتھ دل کا اٹکا رہنا، اس سے مراد نماز کا انتظار کرنا ہے۔ اسی طرح برائی کی دعوت کو ٹھکرانے والی عورت اور پوشیدہ طور پر بہت زیادہ صدقہ وخیرات کرنے والی اور خلوت میں اللہ کو یاد کر کے آنسو بہانے والی عورتیں بھی اللہ کے فضل و کرم سے عرش الٰہی کے سایہ کی حق دار ہوں گی۔ ان شاء اللہ۔ واللہ اعلم!

منہ کے بل لیٹنا

] کچھ لوگ سوتے وقت منہ کے بل لیٹ جاتے ہیں، کیا شرعی طور پر اس طرح لیٹنا جائز ہے؟ ہمارے خطیب صاحب نے ایک دن خطبہ جمعہ میں اس کی ممانعت بیان کی تھی، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرما دیں۔

[ہمارا دین اسلام تمام شعبہ ہائے زندگی میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ رسول اللہ e نے ہمیں سونے کے آداب سے آگاہ کیا ہے۔ آپ نے امت کو ہدایت فرمائی ہے، کہ سونے سے پہلے نماز والا وضو کر لیا جائے پھر بستر کو اپنی چادر کے پلو سے جھاڑا جائے۔ مبادا اس پر کوئی نقصان دہ چیز آ گئی ہو۔ پھر دائیں کروٹ پر لیٹ کر مسنون دعائیں پڑھی جائیں۔ بہتر یہ ہے کہ دعا کے بعد کوئی گفتگو نہ کی جائے۔ جب نیند سے بیدار ہو تو بھی مسنون دعا پڑھے۔ اس کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ سونے

کے آداب سے ہے کہ منہ کے بل نہ لیٹا جائے۔ جدید طب میں بھی اس کی ممانعت ہے کیوں کہ ایسا کرنے سے معدہ کی کارکردگی مجروح ہوتی ہے۔

چنانچہ سیدنا طہفہ غفاری t کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے رسول اللہ e نے مسجد میں پیٹ کے بل سوئے ہوئے پایا تو مجھے اپنے قدم مبارک سے ٹھوکا دیا اور فرمایا: ''اس انداز سے کیوں سوتے ہو؟ سونے کا یہ انداز اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔'' 1

سیدنا ابوذر غفاری t بیان کرتے ہیں کہ میں مسجد میں پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا، میرے پاس سے رسول اللہ e گزرے تو مجھے قدم مبارک سے ٹھوکا دیا اور فرمایا: ''پیارے جندب! اس طرح لیٹنا اہل جہنم کا انداز ہے۔'' 2

ایک روایت میں ہے کہ سیدنا طہفہ t مسجد میں پھیپھڑے کی تکلیف کی وجہ سے اوندھے لیٹے ہوئے تھے، انہوں نے دیکھا کہ کسی نے انہیں اپنے پاؤں سے حرکت دی ہے اور کہا: ''اس طرح سونا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔'' ...... وہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا تو وہ رسول اللہ e تھے۔ 3

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ پیٹ کے بل سونا شرعی طور پر جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم!

استحقاق سے کم نمبر دینا

] میں نے ایف اے کے امتحان میں بہت محنت کی پڑھائی میں رات دن ایک کر دیا، امتحانات کے موقع پر بہت اچھے پرچے ہوئے لیکن جب رزلٹ سامنے آیا تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا، میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور استحقاق سے کم نمبر دیئے گئے ہیں۔ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

[حدیث قدسی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اے میرے بندو! بے شک میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام قرار دیا ہے اور تمہارے درمیان بھی اسے حرام کر دیا ہے، لہٰذا تم آپس میں ظلم نہ کیا کرو۔'' 4

استحقاق کے مطابق نمبر نہ دینا یا استحقاق سے بڑھ کر خاص مقاصد کے پیش نظر کسی کو زیادہ نمبر دینا دونوں طرح ظلم ہے، ہر حق دار کو اس کا حق دینا ہی عدل و انصاف ہے لیکن بعض اوقات طالب علم غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ ممتحن کے ذہن میں سوال کا ایک مخصوص جواب ہوتا ہے، اگر طالب علم اس کے مطابق جواب دے گا تو وہ مطلوبہ نمبروں کا حق دار ہوگا بصورت دیگر اسے محروم کر دیا جائے گا۔ جبکہ طالب علم اپنے ذہن کے مطابق سوال کا جواب دیتا ہے جو ممتحن کے جواب کے مطابق نہیں ہوتا، اس صورت میں نمبروں کا کم آنا ظلم نہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ امتحان کے لیے جس ممتحن کا انتخاب کیا جاتا ہے، اس سے سوالات مع جوابات لیے جاتے ہیں۔ وہ ادارہ میں محفوظ ہوتے ہیں، اس کے باوجود اگر کوئی طالب عالم مطمئن نہیں ہوتا تو اپنے

! ابن ماجہ، الادب:۳۷۲۳. @ ابنماجہ، الادب:۳۷۲۴.

ابوداؤد، الادب،:۵۰۴۰. $ مسلم، البر والصلہ:۶۵۷۲.

جوابات کی دوبارہ جانچ پڑتال کروا سکتا ہے۔ لہٰذا استحقاق سے کم نمبر دینے کا فیصلہ کرنے میں جلدی نہیں کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم!

فتنے سے بچاؤ کی تدابیر

] آج ہر طرف فتنے پھیلے ہوئے ہیں، ان کی لپیٹ میں ہمارا پورا معاشرہ ہے، قرآن و حدیث میں ان فتنوں سے بچاؤ کی کیا تدابیر بیان ہوئی ہیں؟ ان کی وضاحت فرمائیں۔

[دور حاضر کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ عام لوگ بے دین ہو کر اپنی خواہشات کے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور دنیا کے وقتی فوائد حاصل کرنے کے لیے اپنے دین کو فروخت کر رہے ہیں، کتاب و سنت کی روشنی میں ان فتنوں سے بچاؤ کی درج ذیل تدابیر ہیں۔

☆ ان فتنوں سے کنارہ کشی کرنے کی کوشش کی جائے کیوں کہ ان میں مقناطیس کی طرح ایسی کشش ہوگی کہ دلچسپی لینے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیں گے۔ جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''جس نے ان فتنوں کی طرف جھانکا تو فتنے اس کی طرف مائل ہوں گے۔'' 1

☆ تقویٰ اختیار کرنے سے بھی فتنوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا﴾ 2

''جو انسان اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے آزمائشوں سے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے۔''

☆ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ پر کامل توکل اور بھروسہ کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ 3

''جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے گا اللہ تعالیٰ اسے کافی ہوگا۔''

☆ توبہ و استغفار کرنا بھی ایسے فتنوں سے بچاؤ کا بہترین ذریعہ ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ 4

''اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کو عذاب نہیں دے گا جو استغفار کرنے والے ہوں۔''

☆ صبر کا اہتمام کیا جائے اور اللہ تعالیٰ سے ان فتنوں سے پناہ مانگی جائے۔ رسول اللہ e بھی مختلف فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے جیسا کہ متعدد احادیث میں اس کی صراحت ہے۔ واللہ اعلم!

زلزلے کیوں آتے ہیں؟

] ماہ اکتوبر ۲۰۱۵ء کے بعد سے زلزلے بہت آ رہے ہیں، اخبارات میں ان کے متعلق خبریں آتی رہتی ہیں، ان کی

! ابو داؤد، الفتن: ۴۲۶۴.
@ الطلاق: ۲.
# الطلاق: ۳.
$ الانفال: ۳۳.

کیا وجوہات ہیں، ہمیں ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے محفوظ رہ سکیں۔

] اللہ تعالیٰ گناہوں کی پاداش میں زمین پر رہنے والے لوگوں کو مختلف قسم کے عذاب سے دوچار کرتا ہے تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور گناہوں سے باز آجائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝﴾ 1

''ہم انہیں عذاب اکبر سے پہلے ہلکے عذاب کا مزہ چکھاتے ہیں تاکہ وہ ہماری طرف لوٹ آئیں۔''

دنیا میں عذاب کی ایک شکل زلزلوں کا آنا بھی ہے، رسول اللہ e نے زلزلوں کی کثرت قرب قیامت کی علامت قرار دیا ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''قیامت قائم نہ ہوگی حتی کہ علم اٹھا لیا جائے گا، زلزلے بکثرت آئیں گے، وقت کم ہوتا جائے گا، فتنوں کا ظہور ہوگا اور قتل و غارت عام ہوگی یہاں تک کہ تمہارے ہاں مال و دولت کی بہتات ہوگی۔'' 2

یہ زلزلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں تنبیہ ہے کہ ہم گناہوں سے باز آجائیں اور اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزاریں، یہ تو دنیا کے زلزلے ہیں جو دنیا کے نظام کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں جو قیامت کا زلزلہ ہے وہ بہت سخت اور سنگین ہوگا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ ۚ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا﴾ 3

''اے لوگو! اپنے رب سے ڈر جاؤ، بلاشبہ قیامت کا زلزلہ ایک حادثہ عظیم ہوگا، جس دن تم اسے دیکھو گے کہ تمام دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی اور حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے۔''

ہمارے نزدیک ان دنوں زلزلوں کی کثرت قیامت کی علامتوں میں سے ہے، اور ان میں ہمارے لیے بہت تنبیہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم گناہوں سے باز آجائیں۔

زانی شخص کا توبہ کے بغیر مرنا

] ایک شخص اپنی زندگی میں زنا کرتا رہا، اسے دنیا میں کوئی سزا نہ ملی اور وہ توبہ کے بغیر مر گیا تو وہ روز قیامت اس کی مغفرت کی امید کی جا سکتی ہے یا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں سزا پاتا رہے گا، کتاب و سنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں؟

[جو شخص اپنی زندگی میں زنا کا ارتکاب کرتا رہے اور اسی پر استمرار کرتے ہوئے مر جائے، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق معاملہ کرے گا اگر وہ چاہے تو اسے معاف کر دے اور اگر چاہے تو اسے سزا دے کر اس جرم سے پاک

! السجدہ:۲۱۔ @ بخاری، الاستسقاء:۱۰۳۶۔
الحج:۱، ۲۔

کردے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ 1

''یقیناً اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرے گا اور اس کے علاوہ دوسرے گناہوں کو اگر چاہے تو معاف کر دے۔''

متواتر احادیث میں ہے کہ گناہ گار موحدین کو جہنم سے نکال لیا جائے گا، جیسا کہ حضرت عبادہ بن صامت t بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ e کی خدمت میں تھے، آپ نے فرمایا: ''تم ان باتوں پر میری بیعت کرو گے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرو گے، چوری کا ارتکاب نہیں کرو گے، بدکاری کے مرتکب نہیں ہو گے اور نہ ہی اپنی اولاد کو قتل کرو گے، جھوٹا بہتان بھی نہیں لگاؤ گے نیز نیکی کے معاملات میں نافرمانی نہیں کرو گے۔''

آپ نے سلسلہ میں کلام جاری رکھتے ہوئے مزید فرمایا:

''تم میں سے جو ان باتوں کو پورا کرے گا تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے، اور جو شخص ان میں سے کسی گناہ کا ارتکاب کرے اور اسے دنیا میں سزا مل جائے تو وہ سزا اس کے لیے کفارہ ہو گی اور جس نے ان میں سے گناہ کا ارتکاب کیا پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی کی تو وہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اگر چاہے تو اسے معاف کر دے اور اگر چاہے تو اسے سزا دے۔'' 2

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جو انسان دنیا میں زنا کرتا رہا، اور اسے دنیا میں سزا نہ ملی بلکہ وہ توبہ کے بغیر مر گیا تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ اپنی مشیت کے مطابق معاملہ کرے گا، اگر چاہے تو اسے معاف کر دے اور اگر چاہے تو اسے سزا دے کر اس گناہ سے پاک کر دے، امید ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لیے جہنم میں نہیں رکھے گا۔ (واللہ اعلم)

سینگی کے ذریعے علاج

] آج کل بعض اطباء مختلف بیماریوں کا علاج سینگی لگا کر کرتے ہیں اور اسے مسنون قرار دیتے ہیں، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں۔

[موت اور بڑھاپے کے علاوہ ہر بیماری کا علاج موجود ہے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''اللہ تعالیٰ نے جو بھی بیماری پیدا کی ہے، اس کے لیے علاج کا بندوبست کیا ہے۔'' 3

بیماریوں کا علاج مختلف ادویات سے کیا جاتا ہے، اس کے مختلف طریقے اختیار کیا جاتے ہیں، ان میں ایک سینگی کے ذریعے علاج کرنا ہے۔

! النساء:۴۸. @ بخاری، الایمان:۱۳.

بخاری، الطب:۵۶۷۸.

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''شفا تین چیزوں سے ہے: سینگی کے نشتر، شہد نوش کرنے اور آگ سے داغ دینے میں، لیکن اپنی امت کو آگ کے ذریعے داغنے سے منع کرتا ہوں۔'' 1

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سینگی کے ذریعے علاج کرنا بہت مفید ہے۔ رسول اللہ e نے خود بھی اس کے ذریعے علاج کرایا چنانچہ آپ نے دردسر کی وجہ سے ایک موقع پر سینگی لگوائی جبکہ آپ احرام کی حالت میں تھے۔

چنانچہ حضرت ابن عباس t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے دردشقیقہ کی وجہ سے ''لحی جمل'' نامی ایک چشمے پر اپنے سر میں سینگی لگوائی جبکہ آپ حالت احرام میں تھے۔ 2

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سینگی لگوا کر علاج کرانا مفید اور مسنون ہے۔ لیکن معالج سمجھ دار اور تجربہ کار ہونا چاہیے جو یہ جانتا ہو کہ کس مرض کے لیے جسم کے کس حصے پر سینگی لگانی چاہیے۔ غلط جگہ پر یا نہ جاننے والے سے سینگی لگوانا نقصان کا باعث ہوسکتا ہے۔

جیسا کہ حضرت معمر فرماتے ہیں: ''میں نے سینگی لگوائی تو میرا حافظہ جاتا رہا، حتی کہ مجھے دوران نماز فاتحہ پڑھتے وقت بھی لقمہ دیا جاتا تھا، انہوں نے اپنی کھوپڑی پر سینگی لگوائی تھی۔'' 3

دراصل جسم کے کسی حصہ میں خون کا دباؤ بڑھ جانے یا اس میں جوش آ جانے کی صورت میں جلد کو نشتر کے ساتھ گود کر خاص انداز سے گندا خون نکال دیا جاتا ہے، عربوں کے ہاں یہ طریقہ علاج معروف تھا، اب مغربی ہسپتالوں میں اس سے استفادہ کیا جا رہا ہے، ہمارے ہاں بھی یہ طریقہ علاج رائج ہے، اس سے استفادہ کرنا چاہیے، یہ مفید اور مسنون ہے لیکن اس کے لیے کسی ماہر فن کا انتخاب کیا جائے۔

مردہ مچھر اور مکھی کا حکم

] اگر دودھ یا پانی میں مکھی یا مچھر گر کر مر جائے تو اس کا کیا حکم ہے، جبکہ قرآن کریم نے مردار کو حرام قرار دیا ہے، اس کی قرآن وحدیث کی رو سے وضاحت کر دیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزاء خیر دے۔

[بلاشبہ قرآن کریم کی نص کے مطابق مردار حرام ہے اور مردار نجس ہوتا ہے کیوں کہ رسول اللہ e نے مردار کے چمڑے کو پاک کرنے کا طریقہ بتایا ہے کہ اسے رنگا جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اسے دباغت نہ دی جائے تو وہ نجس ہے۔ اس پر علماء امت کا اجماع ہے لیکن مردار کے نجس ہونے سے وہ مردار مستثنیٰ ہے جس میں بہنے والا خون نہ ہو جیسے مکھی، کیڑے مکوڑے، چیونٹی اور مچھر وغیرہ۔ ان میں اتنا خون نہیں ہوتا جو زمین پر بہنے لگے۔

! بخاری، الطب: ۵۶۸۱. @ بخاری، الطب: ۵۷۰۰.

ابو داؤد، الطب: ۳۸۶۰.

اس طرح کے حشرات اور کیڑے مکوڑے مر جائیں تو وہ نجس نہیں۔

جیسا کہ رسول اللہ e نے مکھی کے متعلق فرمایا ہے: ’’جب مکھی تم میں سے کسی کے مشروب میں گر جائے تو اسے ڈبو کر نکالا جائے کیوں کہ اس کے پر میں بیماری اور دوسرے میں شفا ہوتی ہے۔ 1

بعض روایات میں کھانے میں گرنے کے الفاظ بھی ہیں۔ 2

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مکھی جب سالن، پانی، دودھ یا چائے وغیرہ میں گر جائے تو کھانے پینے کی چیز کو ضائع کر دینا جائز نہیں بلکہ اسے استعمال میں لانا جائز ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قسم کا مردار نجس ہے۔ مچھر، شہد کی مکھی، چیونٹی اور دیگر حشرات کو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر a لکھتے ہیں:

’’یہ حدیث اس امر پر بطور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ قلیل پانی ایسی چیز کے گرنے سے پلید نہیں ہوتا، جس میں اتنا خون نہیں جو بہنے والا ہو کیوں کہ رسول اللہ e ایسی چیز کو ڈبونے کا حکم نہیں دیتے، جس کے گرنے سے پانی پلید ہو جاتا ہو۔‘‘ 3

لہٰذا مچھر، مکھی وغیرہ گرنے اور مرنے سے کوئی چیز پلید نہیں ہوتی۔ (واللہ اعلم)

عمر رسیدہ عورت سے مصافحہ کرنا

] میری ایک چچا زاد بہن ہے جس کی عمر تقریباً ستر سال ہے، کیا میں ملاقات کے وقت اس کا سر چوم سکتا ہوں اور اس سے مصافحہ کر سکتا ہوں؟ کیوں کہ وہ بوڑھی اور عمر رسیدہ ہے۔ کیا اس حالت میں پردے کے متعلق کچھ نرمی ہو سکتی ہے؟

[بوڑھی اور از کار رفتہ عورتوں کے متعلق قرآن کریم نے پردے میں کچھ تخفیف بایں الفاظ بیان کی ہے:

﴿وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ١ؕ وَ اَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ١ؕ﴾ 4

’’وہ بوڑھی عورتیں جنہیں نکاح کی امید اور خواہش نہ ہو اگر وہ اپنے کپڑے اتار رکھیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وہ اپنا بناؤ سنگھار ظاہر کرنے والی نہ ہوں، اگر اس سے بھی احتیاط تو ان کے لیے بہت بہتر ہے۔‘‘

کپڑے اتار دینے کا مطلب وہ بڑی چادر یا برقعہ وغیرہ اتارنا ہے جو دیگر کپڑوں کے اوپر بطور پردہ پہنا جاتا ہے۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اپنی زینت اور بناؤ سنگھار کا اظہار مقصود نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنی جنسی کشش کھو جانے کے باوجود بناؤ سنگھار کے ذریعے اپنی جنسیت کو نمایاں کرنے کے مرض میں مبتلا ہو تو اسے تخفیف پردہ کے حکم سے مستثنیٰ قرار دیا

! صحیح بخاری، بدء الخلق: ۳۳۲۰. @ ابن ماجہ، الطب: ۳۵۰۴.

فتح الباری، ص ۳۰۹، ج ۱۰. $ النور: ۶۰.

جائے گا اور اسے مکمل پردہ کرنا ہوگا۔ جہاں تک بوڑھی عورتوں کے سر کا بوسہ لینا اور ان سے مصافحہ کرنے کی بات ہے تو شریعت میں اس کی قطعاً اجازت نہیں۔

رسول اللہ e کا ارشادگرامی ہے: ''میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا ہوں۔'' 1

یہ حکم بوڑھی اور غیر بوڑھی تمام عورتوں کو شامل ہے، بشرطیکہ وہ غیر محرم ہوں۔

سیدہ عائشہ r کا بیان ہے: ''اللہ کی قسم! رسول اللہ e کے ہاتھ نے کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو چھوا تک نہیں۔'' 2

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی بھی عمر رسیدہ عورت کے سر کا بوسہ لینا اور اس سے مصافحہ کرنا جائز نہیں۔ البتہ زبانی طور پر احوال پرسی کرنے میں چنداں حرج نہیں۔ واللہ اعلم!

مصنوعی تنفس سے زندہ رکھنا

] میری والدہ ایک ہسپتال میں زیر علاج ہے، ایک ماہ سے جدید طبی آلات کے ذریعے اس کے سانس کی آمدورفت کو بحال رکھا جارہا ہے، لیکن وہ مسلسل بے ہوش ہے، کسی سے بات چیت کرنے کے قابل نہیں، ایسے حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

[جدید طبی آلات نے جہاں ہمیں علاج معالجہ کی سہولیات مہیا کی ہیں، وہاں ہمیں کئی ایک پریشانیوں اور ذہنی الجھنوں میں بھی مبتلا کر دیا ہے، اس کی مثال پیش آمدہ سوال ہے۔ ایک طرف جدید طبی آلات کے ذریعے دل کی دھڑکن اور سانس کی آمدورفت کو برقرار رکھا جاتا ہے اگرچہ وہ ذہنی طور پر مر چکا ہوتا ہے۔ دوسری طرف ہمارا یہ حال ہے کہ جدید طب مریض کو طویل مدت تک ناقابل برداشت تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھنا چاہتی اور اسے باوقار طور پر مرنے کا حق دیتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مریض کو ادویات یا کسی ٹیکے کے ذریعے ختم کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام میں ہر قسم کا قتل منع ہے، ہاں چند جرائم ایسے ہیں جن کی وجہ سے اسے قتل کیا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص طویل بیماری کی وجہ سے خود کو ختم کرنا چاہتا ہے ہم اس پر رحم کرکے قتل کر دیتے ہیں تو ایسا کرنا اسلام کی نظر میں خودکشی اور قتل ہے جس کے نتائج دنیا اور آخرت میں بہت ہی بھیانک ہیں۔

صورت مسئولہ کے متعلق ہمارا رجحان یہ ہے کہ ڈاکٹر حضرات کو مریض کی زندگی بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ اس سلسلہ میں جدید طبی آلات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور معاون حیات مشینی آلات بھی سودمند ثابت ہوسکتے ہیں۔ اگر صحت کی بحالی یقینی ہو یا کم از کم اس کی توقع اور امید ہو تو سانس کی آمدورفت کو بذریعہ جدید آلات قائم رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن جس شخص کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے اور اسے ہوش میں لانا ممکن نہیں تو ایسے مریض کو محض سانس کی آمدورفت کے ذریعے ''زندہ'' رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس صورت میں مریض کی دھڑکن ہی قائم رہتی ہے اور بحالی صحت کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ ایسا مریض حقیقت میں مر چکا ہوتا ہے، صرف فنی طور پر مصنوعی تنفس کے ذریعے اسے ''زندہ'' رکھا جارہا ہے، اس کا کوئی

! ابن ماجہ، الجہاد:۲۸۷۴.   @ ابوداؤد، الخراج:۲۹۴۱.

فائدہ نہیں۔ ایسے مریض کے مصنوعی آلات کو ختم کر دیا جائے تاکہ اللہ تعالیٰ خود اس کے متعلق فیصلہ کر دے۔ اس سلسلہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ کسی متنفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔'' 1 بحالی صحت کی امید نہ ہونے کے باوجود اس کے سانس کی آمدورفت یا دل کی دھڑکن کو جدید آلات کے ذریعے برقرار رکھنا ہمارے نزدیک تکلیف مالا یطاق ہے اور ایک فضول حرکت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی آزمائشوں سے محفوظ رکھے جو ہمارے دین و دنیا کے لیے نقصان دہ ہوں۔ (واللہ اعلم)

نذر کا پورا کرنا

] میں نے نذر مانی تھی کہ اگر میری بیٹی امتحان میں اچھی پوزیشن سے پاس ہوئی تو میں دو ماہ کے روزے رکھوں گی، لیکن چند دن روزہ رکھنے سے معلوم ہوا کہ میں اسے پورا نہیں کرسکوں گی، اب میرے لیے شریعت میں کیا حل ہے؟ وضاحت فرمائیں؟

[دین اسلام میں نذر کی دو اقسام ہیں: ☆ نذر مطلق ☆ نذر مشروط

☆ نذر مطلق یہ ہے کہ انسان کسی قسم کی شرط کیے بغیر اللہ کے لیے کام کرنے کی نذر مان لے، جیسا کہ حضرت عمران کی بیوی نے نذر مانی تھی کہ:

﴿إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا﴾ 2

''اے اللہ! میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں، وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہوگا۔''

اللہ تعالیٰ نے ایسے بندوں کی تحسین فرمائی ہے جو اس قسم کی نذر کو پورا کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُوفُونَ بِالنَّذْرِ﴾

''یہ میرے وہ بندے ہیں جو نذر پوری کرتے ہیں۔'' 3

☆ نذر مشروط یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے سودا بازی کرتا ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں اللہ کے لیے یہ کام کروں گا۔ جیسا کہ صورت مسئولہ میں مشروط نذر مانی گئی ہے۔ اس قسم کی نذر کے متعلق رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''ایسی نذر نہ مانا کرو کیوں کہ نذر تقدیر کے معاملہ میں کوئی فائدہ نہیں دیتی، البتہ اس کے ذریعے ایک بخیل سے مال نکال لیا جاتا ہے۔'' 4

اس قسم کی نذر کے متعلق حکم یہ ہے کہ اگر پورا کرنے کی استطاعت نہ ہو تو اتنا کفارہ دے دیا جائے جتنا قسم کا ہوتا ہے۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''نذر کا کفارہ، قسم کے کفارے کی طرح ہے۔'' 5

! البقرہ:۲۸۶.
@ آل عمران:۳۵.
# الدہر:۷.
$ مسلم، النذور:۴۲۴۱.
% مسلم، النذور:۴۲۵۳.

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ''جس نے کسی ایسی چیز کی نذر مانی جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا تو اس کا کفارہ قسم کے کفارہ کی طرح ہے۔'' 1

سیدنا عقبہ بن عامر t کی بہن نے نذر مانی تھی کہ وہ پیدل حج کرے گی تو اس کے متعلق رسول اللہ e نے فرمایا کہ ''وہ سوار ہو کر حج کرے یا اپنی نذر کا کفارہ دے دے۔'' 2

قسم کا کفارہ یہ ہے کہ دس مساکین کو اوسط درجے کا کھانا کھلایا جائے یا انہیں لباس دیا جائے یا ایک غلام آزاد کیا جائے جو ان کی استطاعت نہیں رکھتا وہ تین دن کے روزے رکھ لے۔'' 3

صورت مسئولہ میں اس وضاحت کے مطابق عمل کیا جائے۔ واللہ اعلم!

محبت کا علاج

] میں تعلیم یافتہ غیر شادی شدہ خاتون ہوں، میں اپنے دل میں ایک پابند شریعت لڑکے کے متعلق نرم گوشہ رکھتی ہوں اور اس سے شادی کی خواہش مند ہوں، لیکن مصنوعی معاشرتی دیواریں اس خواہش کے آگے کھڑی ہیں، اس سلسلہ میں میری رہنمائی کریں۔

[والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو معاشرے کے برے اثرات سے محفوظ رکھنے کی بھرپور کوشش کریں اور ان کی دنیا بنانے کے ساتھ ساتھ ان کی آخرت سنوارنے کی بھی سعی کریں بلکہ اسے ہر کام پر ترجیح دیں۔ اگر حادثاتی طور پر ان کی کسی سے محبت ہو جاتی ہے اور اس محبت میں کوئی دینی نقصان نہ ہو تو ان کے جذبات کا احترام کریں کیوں کہ کسی سے محبت اور نفرت دونوں غیر اختیاری ہوتی ہیں۔ انہیں مختلف حربوں سے دبانے کی بجائے ان کا رخ صحیح سمت کی طرف پھیر دینا چاہیے تا کہ ان کا رخ شرعی ممنوعات کی طرف نہ ہو جائے۔ اگر کسی مرد اور عورت کا ایک دوسرے کی طرف میلان ہو جاتا ہے تو ناجائز تعلقات قائم کرنے کی بجائے نکاح کا تعلق قائم کر لینا بہتر ہے۔ دل میں نرم گوشہ رکھنے والوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے عدالت کا دروازہ نہ کھٹکھٹائیں بلکہ وہ اپنے والدین کو اعتماد میں لیں۔ نکاح کی دیگر شرائط یعنی ولی کی اجازت، حق مہر، ایجاب وقبول اور گواہوں کی موجودگی کا اہتمام بھی کیا جائے۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''آپس میں محبت رکھنے والوں کے لیے نکاح جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی گئی۔'' 4

احادیث میں اس حدیث کا پس منظر بایں الفاظ بیان ہوا ہے: ایک شخص رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا، یا رسول اللہ! میرے زیر نگرانی ایک یتیم لڑکی پرورش پا رہی ہے، اس کے لیے دو رشتے آئے ہیں، ان میں سے ایک مال دار شخص ہے اور دوسرا فقیر بے نوا کا، ہماری خواہش ہے کہ اس کا نکاح مال دار سے کریں لیکن اس کا میلان تنگدست کی

! ابو داؤد، الایمان والنذور:۳۳۲۲۔ @ ابو داؤد، الایمان والنذور:۳۳۰۳۔
المائدہ:۸۹۔ $ ابن ماجہ، النکاح:۱۸۴۷۔

طرف ہے۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ''باہم محبت کرنے والے مرد وعورت کے لیے نکاح جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی گئی۔'' 1

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بچی اور بچے کے ذاتی رجحانات اور میلانات کا خیال رکھنا چاہیے، نکاح کے سلسلہ میں ان پر کوئی رشتہ ٹھونسا نہ جائے، اس سلسلہ میں برادری اور مال ودولت کو قطعاً معیار نہ بنایا جائے۔

لینز کا استعمال

] آج کل بازار میں مختلف رنگوں کے لینز دستیاب ہیں، جو نظر اور بینائی کے علاوہ استعمال ہوتے ہیں، خصوصاً خواتین اپنے کپڑوں کے ساتھ ملتے جلتے لینز استعمال کرتی ہیں، اس کے متعلق شرعی حکم کی وضاحت کریں۔

[لینز دور حاضر کی بہت مفید ایجاد ہے، اور اسے دو طرح سے استعمال کیا جاتا ہے:

☆ نظر اور بینائی کے لیے پہلے عینک استعمال ہوتی تھی، اب اسی نمبر کے لینز مل جاتے ہیں۔ انہیں آنکھ کے اندرونی حصے کے ساتھ چپکا لیا جاتا ہے۔ اس طرح عینک کا متبادل ہے، اس مقصد کے لیے لینز استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ ایسا کرنا ایک ضرورت ہے اور اس کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔

☆ لینز کو بطور فیشن بھی استعمال کیا جاتا ہے، خاص طور پر خواتین تقریبات کے موقع پر اپنے سوٹ کے ساتھ رنگت کے اعتبار سے ملتے جلتے لینز استعمال کرتی ہیں۔ اس کے متعلق ہمارا رجحان یہ ہے کہ نظر کی ضرورت کے بغیر بھی انہیں استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن اگر گراں قیمت ہیں تو ان کے استعمال سے گریز کرنا بہتر ہے کیوں کہ یہ اسراف ہے جس کی شریعت میں اجازت نہیں نیز اس میں تدلیس اور دھوکہ دہی بھی ہے کیوں کہ آنکھ کو اس کے مظہر حقیقی کے علاوہ ظاہر کیا جاتا ہے، عرب کے مایہ ناز عالم دین شیخ صالح العثیمین a فرماتے ہیں: ''اس کے استعمال کے لیے کسی ماہر امراض چشم سے مشورہ کیا جائے، اگر نظر پر اثر انداز ہوتے ہوں تو ایسے لینز استعمال نہیں کرنے چاہییں کیوں کہ جو چیز بدن کو نقصان دیتی ہے اس کا استعمال درست نہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ 2

''تم خود کو ہلاک نہ کرو۔''

اگر کوئی ماہر ڈاکٹر اس کے متعلق کہتا ہے کہ اس کے استعمال سے نظر پر کوئی اثر نہیں پڑے گا تو پھر بھی غور کیا جائے کہ ان کے استعمال سے آنکھیں چوپایوں جیسی تو نظر نہیں آتیں مثلاً خرگوش یا بلی کی آنکھوں جیسی نظر آئیں تو بھی ان کے استعمال سے گریز کیا جائے کیوں کہ ایسا کرنے سے حیوانات سے مشابہت ہوتی ہے جسے قرآن نے بطور مذمت بیان کیا ہے۔ یہ بہت بری

! سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ:ج۳،ص۱۹۷۔ @ النساء:۲۹۔

بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور وہ حیوانات سے مشابہت کرتا پھرے۔لیکن اگر حیوانات سے مشابہت نہیں ہوتی بلکہ محض رنگت کی تبدیلی مقصود ہے تو اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ 1

بہر حال عورتوں کے لیے اگر چہ نظر کے علاوہ دیگر ضروریات کے لیے ان کے استعمال کی گنجائش ہے بشرطیکہ اسراف اور ریاکاری مقصود نہ ہو۔لیکن بہتر ہے کہ اس سے بھی اجتناب کیا جائے۔ واللہ اعلم!

روحانی معالجوں کی حیثیت

] میرے والد گرامی ایک نفسیاتی مریض ہیں، ہم نے بہت علاج کرایا مگر افاقہ نہیں ہوا، ہمیں ایک عورت کے پاس جانے کا مشورہ دیا گیا ہے جو اس قسم کے مریضوں کی تشخیص، مریض اور اس کی والدہ کا نام پوچھا کرتی ہے، کیا ہمیں اس کے پاس جانا چاہیے؟

[انسان کو اپنی صحت سے پہلے اپنے ایمان کی فکر کرنا چاہیے۔سوال میں ذکر کردہ عورت کے پاس بغرض تشخیص یا علاج جانا اپنے ایمان کو خیر باد کہنا ہے کیوں کہ اس کا تعلق ان کاہنوں سے ہے جو علم غیب کا دعویٰ کرتے ہیں اور علاج کرنے یا مرض بتانے کے لیے شیاطین سے کام لیتے ہیں۔ رسول اللہ e نے اس قسم کے کاہنوں کے پاس جانے سے منع فرمایا ہے۔ آپ e کا ارشاد گرامی ہے:''جو شخص کسی نجومی یا کاہن کے پاس آئے پھر اس کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کرے تو اس نے اس شریعت کا انکار کیا جو حضرت محمد e پر نازل ہوئی ہے۔'' 2

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایسے شخص کی چالیس دن کی نماز قبول نہیں کی جاتی۔ رسول اللہ e کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

> ''جو شخص کسی نجومی کے پاس آئے اور اس سے کسی چیز کے بارے میں دریافت کرے تو چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ 3

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ایسے لوگوں کے پاس جانا شرعاً جائز نہیں بلکہ ناگواری اور انکار واجب ہے۔ اس قسم کے ''روحانی معالجوں'' کی بات ماننا اور ان کی تصدیق کرنا بھی ناجائز ہے۔ (واللہ اعلم)

موبائل میں گھنٹی کے بجائے قرآنی آیات کی آواز

] ہمارے ہاں کچھ موبائل ایسے ہیں کہ جب فون دوسرے سے ملایا جاتا ہے تو گھنٹی کے بجائے قرآنی آیات پڑھنے کی آواز آتی ہے، کیا موبائل میں قرآنی آیات داخل کی جا سکتی ہیں؟

[موجودہ دور میں موبائل کی ایجاد انتہائی سود مند ہے، اس کا اہم فائدہ یہ ہے کہ انسان رابطے میں رہتا ہے، لیکن اس کے غلط استعمال نے ہمارے معاشرہ میں بہت سے مفاسد پھیلا دیئے ہیں۔ موبائل میں قرآنی آیات داخل کرنا درست نہیں

! صحیح فقہ السنہ: ج٣، ص٧٠۔ @ ابو داؤد، الکہانۃ: ٣٩٠٤۔

مسلم، السلام: ٢٢٣٠۔

کیوں کہ اس سے درج ذیل مفاسد جنم لیتے ہیں۔

☆ قرآن کریم کو ایک حقیر دنیوی مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔
☆ قرآن کریم ایک انقلابی کتاب ہے اور اس سے عملی طور پر معاشرہ میں صالح انقلاب مقصود ہے، جبکہ موبائل میں انہیں داخل کرنا اس عظیم مقصد کے برعکس ہے۔
☆ بعض اوقات آیات کو سننے کے بجائے انہیں درمیان میں ہی قطع کرنا پڑتا ہے جو کہ قرآن کریم کی انتہائی بے ادبی ہے۔
☆ بعض اوقات انسان لیٹرین میں ہوتا ہے کہ اچانک موبائل میں قرآنی آیات نشر ہونا شروع ہو جاتی ہیں جو کہ قرآنی ادب واحترام کے منافی ہے
☆ ہمارے اسلاف قرآن کریم کو دنیاوی اغراض ومقاصد کے لیے انتہائی ناپسند کرتے تھے۔

اس لیے ہمارے رجحان کے مطابق اپنے موبائل میں سادہ گھنٹی کی آواز ہی سیٹ کر لی جائے اور قرآنی آیات کے داخل کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

گھٹی دینے والے کے کردار کا اثر

] جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسے کسی نیک اور بزرگ آدمی سے گھٹی دلوائی جاتی ہے۔ کیا گھٹی دینے والے کے کردار کا اثر بچے پر ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے بچہ بھی نیک سیرت اور اچھے چال چلن کا حامل ہوتا ہے؟ اس کی وضاحت فرمادیں۔

[بچے کی پیدائش کے بعد اسے گھٹی دینا ایک مستحب عمل ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ کھجور وغیرہ لے کر کوئی صالح آدمی اسے اپنے منہ میں چبا کر پھر اسے نومولود کے تالو پر لگا دے۔ اس سے مراد برکت کا حصول ہوتا ہے اور اس سے نیک فال بھی لی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بچے کو نیک سیرت اور خوش اخلاق بنا دے۔

چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری t بیان کرتے ہیں کہ میرے ہاں بچہ پیدا ہوا تو میں لے کر رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوا، رسول اللہ e نے اس کا نام ابراہیم رکھا اور اسے کھجور کے ساتھ گھٹی دی۔

نیز اس کے لیے خیر وبرکت کی دعا فرمائی، پھر اسے میرے حوالے کر دیا۔ 1

اسی طرح رسول اللہ e نے حضرت عبداللہ بن زبیر w کو بھی کھجور کی گھٹی دی تھی اور اس کے لیے خود برکت کی دعا فرمائی تھی۔ 2

ان احادیث کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ گھٹی دینے والا نیک اور صالح انسان ہونا چاہیے تا کہ وہ بچے کی خیر وبرکت کی دعا کرے۔ اس سے یہ نیک شگون بھی لی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بچے کو بزرگ کی طرح نیک اور اچھے کردار کا حامل بنا دے۔ لیکن احادیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ گھٹی دینے سے نومولود کی عادات اس بزرگ جیسی بن جاتی ہیں جس سے اسے

! بخاری، العقیقہ:۵۴۶۷.   @ بخاری:۵۴۶۹.

گھٹی دی جاتی تھی۔ اس خام فکر کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ اگر بچہ ضدی اور بداخلاق ہو تو خاندان والے گھٹی دینے والے کو ہدف طعن بناتے اور اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ نومولود کے اچھے یا برے ہونے میں والدین کی تربیت کا اثر تو ہو سکتا ہے لیکن گھٹی دینے سے کسی بزرگ کے اچھے اثرات نومولود میں سرایت نہیں کرتے، ہاں اس کی دعا کے اثرات ہو سکتے ہیں۔

ہم آخر میں اس بات کی وضاحت کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں کہ ''ہمدرد گھٹی'' شرعی گھٹی کے قائم مقام نہیں ہو سکتی کیوں کہ ہمدرد گھٹی تو پیٹ کی صفائی کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے شرعی گھٹی کے لیے کسی نیک مرد یا نیک عورت کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اگر موقع پر کوئی نیک بندہ نہ مل سکے تو بچے کو نیک انسان کے پاس لے جانا بھی مشروع ہے، جیسا کہ درج بالا احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔ واللہ اعلم!

ریشم کا استعمال

] ہمارے ہاں تقریبات میں مرد حضرات ریشمی لباس پہنتے ہیں، اس کے متعلق وضاحت درکار ہے، کیا کتاب و سنت میں اسے پہننے کی اجازت ہے؟

[بلاشبہ ریشم کا استعمال مردوں کے لیے حرام اور عورتوں کے لیے جائز ہے۔ کیوں کہ مردوں کی مردانگی کے خلاف ہے کہ وہ عورتوں جیسی نرم و نازک زینت استعمال کریں۔ جیسا کہ رسول اللہ e نے اس کی صراحت فرمائی ہے آپ e کا فرمان ذیشان ہے:

''سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لیے حلال کیا گیا ہے جبکہ مردوں پر حرام ہے۔'' 1

جو انسان یعنی مرد حضرات دنیا میں اسے استعمال کریں گے انہیں آخرت میں اس سے محروم کر دیا جائے گا۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں اس سے محروم ہو گا۔'' 2

ایک روایت میں ہے کہ جو لوگ اسے دنیا میں استعمال کرتے ہیں، ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ 3

ریشمی گدے استعمال کرنے کی بھی ممانعت ہے، احادیث میں اس کی بھی صراحت ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔ 4

البتہ کسی دوسرے کپڑے پر ٹکڑوں کی شکل میں جائز ہے۔

چنانچہ سیدنا معاویہ t سے مروی ہے کہ رسول اللہ e نے ٹکڑوں کی شکل میں اسے استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔ 5

اس کی وضاحت دوسری احادیث میں ہے کہ دو تین انگلی کے برابر استعمال کی اجازت ہے۔ 6

یعنی قلیل مقدار میں ریشم کی لائنیں یا چھوٹی چھوٹی پٹیاں ہوں تو جائز ہے، اسی طرح خارش وغیرہ کی وجہ سے اسے مرد

! نسائی، الزینہ: ۵۱۵۱. @ بخاری، اللباس: ۵۸۳۲.

بخاری، اللباس: ۵۸۳۵. $ بخاری، اللباس: ۵۸۳۷.

% نسائی، الزینہ: ۲۱۵۲. ^ بخاری، اللباس: ۵۸۲۹.

حضرات پہن سکتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ e نے سیدنا عبدالرحمن بن عوف t اور سیدنا زبیر t کو اجازت دی تھی۔ 1

ان احادیث کے پیش نظر مرد حضرات کو تقریبات میں یا اس کے علاوہ ریشم پہننے کی اجازت نہیں ہے البتہ ریشمی کپڑا تحفہ کی صورت میں مردوں کو دیا جا سکتا ہے تا کہ اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کو اپنے استعمال میں لائیں جیسا کہ رسول اللہ e نے سیدنا عمر t کو ریشمی قبا عنایت فرمائی تھی۔ 2

یا اپنی عورتوں کو اسے پہننے کے لیے دے دے جیسا کہ رسول اللہ e نے سیدنا علی t کو ایک ریشمی جوڑا دیتے ہوئے فرمایا تھا: ''میں نے تمہیں یہ جوڑا اس لیے دیا ہے کہ اسے پھاڑ کر خواتین کی اوڑھنیاں بنا لو۔'' 3

بہر حال مرد حضرات کو ریشمی لباس پہننے سے گریز کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم!

امام کے پیچھے قرآن کھول کر کھڑے ہونا

] ہمارے ہاں رمضان میں کچھ مقتدی امام کے پیچھے قرآن پکڑ کر کھڑے ہوتے ہیں تا کہ وہ امام کے ساتھ پڑھتے جائیں اور جب امام بھول جائے تو اسے لقمہ دے سکیں، کیا قرآن وحدیث کی رو سے ایسا کرنا جائز ہے؟

[ہمیں چاہیے کہ نماز تراویح کے لیے کسی پختہ حافظ کا بندوبست کریں، اگر حافظ دوران جماعت بکثرت بھولتا ہے تو اچھے سامع کا بندوبست کر دیا جائے، جسے قرآن اچھی طرح یاد ہو، لیکن اگر کسی سامع کا انتظام نہیں ہوتا اور حافظ بکثرت بھولتا ہے تو اس کے پیچھے قرآن لے کر کھڑا ہونا جائز ہے تا کہ اسے مناسب وقت پر اچھے انداز سے لقمہ دیا جا سکے، لیکن امام کے پیچھے کئی مقتدی حضرات کا قرآن لے کر کھڑے ہونا تا کہ وہ امام کے ساتھ ساتھ قرآن پڑھتے جائیں ایسا کرنا درست نہیں۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے مختلف انداز میں کتاب وسنت کی مخالفت ہوتی ہے، جو حسب ذیل ہیں:

☆ نمازی حالت قیام میں دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کے اوپر نہیں رکھ سکتا۔

☆ ایسا کرنے سے بلا ضرورت بکثرت حرکت کرنا پڑتی ہے جو نمازی کو نماز سے غافل کر دیتی ہے۔
مثلاً قرآن مجید کھولنا، اسے بند کرنا، پھر اسے بغل یا جیب میں رکھنا۔

☆ نمازی دوران نماز سجدہ کی جگہ پر نظر نہیں رکھ سکتا جبکہ دوران نماز ایسا کرنا سنت اور افضل ہے کہ وہ سجدہ گاہ پر نظر رکھے۔

☆ ایسا کرنے سے نمازی کا خشوع وخضوع بھی متاثر ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کا دل بھی حاضر نہیں ہوتا جو انتہائی ضروری ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق دوران نماز ایسا کرنا درست نہیں، انتظامیہ کو چاہیے کہ وہ اس کا کوئی متبادل انتظام کرے۔ واللہ اعلم!

بھتہ وصول کرنا

] بعض دیہاتوں بلکہ عام گزرگاہوں سے گزرنے والوں سے بھتہ وصول کیا جاتا ہے، اگر کوئی نہ دے تو اس پر جبر

! بخاری، اللباس:۵۸۳۹.   @ مسلم، اللباس:۵۴۱۹.

بخاری، الھبہ:۲۶۱۴.

وتشدد کیا جاتا ہے۔اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ نیز حکومتی ٹیکس کی بھی وضاحت کریں کہ یہ جائز ہے؟

] حکومت کو چاہیے کہ وہ حکومتی معاملات چلانے کے لیے خود ایسے ذرائع پیدا کرے جو حکومت چلانے میں معاون ثابت ہوں۔ ہاں اگر کوئی حکومت کسی ہنگامی ضرورت سے دوچار ہے اور اس کے ذرائع اس ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہیں تو پھر وہ مناسب مقدار میں ٹیکس لگا سکتی ہے، لیکن عوام سے ٹیکس وصول کر کے اسے حکمرانوں اور افسران کے اللوں تللوں میں خرچ کرنا سراسر زیادتی وظلم ہے جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اس لیے حکومت کو چاہیے کہ وہ اپنے اخراجات پر نظر ثانی کرے اور ناجائز مصارف کو ختم کرے۔ لیکن مصارف میں کمی نہ کرنا اور عوام پر اندھا دھند ٹیکس عائد کرنا صریحاً ظلم ہے جس کا کوئی جواز نہیں۔

سوال میں جو صورت حال ذکر کی گئی ہے کہ شہروں، دیہاتوں اور گزرگاہوں سے گزرنے والوں سے بھتہ وصول کیا جاتا ہے، اس کے حرام یا ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ چنانچہ سیدنا عقبہ بن عامر t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''چونگی اور بھتہ لینے والا جنت میں نہیں جائے گا۔'' 1

اگرچہ یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے، کیوں کہ اس میں ایک راوی محمد بن اسحاق مدلس ہے اور اپنے استاد یزید بن ابی حبیب سے ''عن'' سے بیان کرتا ہے۔ محدثین کے ہاں اس قسم کا انداز روایت کے کمزور ہونے کی طرف اشارہ ہے تاہم اس کے باوجود ظلم وزیادتی کسی طور پر بھی جائز نہیں۔ مالی بے ضابطگی کے حرام ہونے پر دیگر بے شمار دلائل ہیں، اس لیے بھتہ خوروں کو اپنے کردار پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔

ہمارے رجحان کے مطابق شرعی اور حکومتی ضابطہ سے ہٹ کر کسی قسم کا بھتہ لینا حرام، ظلم اور کبیرہ گناہ ہے جو قیامت کے دن بھیانک نتائج سامنے لائے گا، وہاں نیکیاں دے کر اور برائیاں اپنے کھاتے میں ڈال کر حساب برابر کیا جائے گا۔ لہٰذا بہت مہنگا سودا ہے، ایک مسلمان کو اس کردار ناہنجار سے اجتناب کرنا چاہیے کیوں کہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے اور حقوق العباد میں کوتاہی کرنا ایک سنگین جرم ہے۔ واللہ اعلم!

رسول اللہ e کا دیدار

] ہمیں اپنے رسول اللہ e سے محبت ہے، کیا خواب میں ہمیں رسول اللہ e کی زیارت ہو سکتی ہے، یا قیامت کے دن ہم اپنے رسول e کو دیکھ سکیں گے؟ اس کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

] اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد e کو ایسی عظمت عطا کی ہے کہ ہر انسان آپ کو دیکھنے کی طلب اور تڑپ رکھتا ہے، یہ بھی آپ سے محبت کی ایک علامت ہے۔ جن حضرات نے رسول اللہ e کو بحالت ایمان دیکھا اور اسی ایمان پر انہیں موت آئی وہ صحابہ کرام y ہیں، جن کے متعلق رسول اللہ e نے فرمایا: ''میرے صحابہ، میری امت کی حفاظت کا ذریعہ

! ابو داؤد، الامارہ:۲۹۳۷.

ہیں، جب میرے صحابہ جاتے رہیں گے تو میری امت میں دو چیزیں (بدعات وآفات) آ جائیں گی جن کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔'' 1

ہمارے لیے اس دنیا میں اب رسول اللہ e کی زیارت ممکن نہیں، لیکن آپ کی زیارت کا شوق اور شدید حرص ہے، یہ بھی آپ سے محبت کی نشانی ہے۔

جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

''میری امت میں سے مجھ سے بہت زیادہ محبت کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو میرے بعد آئیں گے، ان میں ہر کوئی یہ پسند کرے گا کہ وہ اپنے اہل و مال کو قربان کر کے مجھے دیکھ لے۔'' 2

رسول اللہ e کا درج ذیل ارشاد گرامی ہمارے لیے مژدہ جاں ہے:

''اس شخص کے لیے بشارت ہے جس نے بحالت ایمان مجھے دیکھا اور اس شخص کے لیے سات مرتبہ بشارت ہے جس نے مجھے نہیں دیکھا لیکن وہ مجھ پر ایمان لایا۔'' 3

رسول اللہ e کی زیارت عالم رنگ و بو میں بحالت بیداری ہمارے لیے ممکن نہیں البتہ خواب میں آپ کی زیارت ممکن ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا، اس لیے جو مجھے خواب میں دیکھتا ہے وہ حقیقت میں مجھ ہی کو دیکھتا ہے۔'' 4

اس حدیث کے پیش نظر رسول اللہ e کو خواب میں دیکھنا بہت بڑی سعادت ہے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ رسول اللہ e سے محبت کرنے والے اور آپ کی زیارت کا شوق رکھنے والے کو آپ کے حلیہ مبارک کی معرفت حاصل ہو، اس بناء پر آپ کے حلیہ مبارک کے متعلق معلومات رکھنا صرف حسن عقیدت ہی نہیں بلکہ ایک شرعی تقاضا بھی ہے، اگر ہم نے نیک اعمال کیے اور رسول اللہ e پر درود و سلام پڑھنے میں بخل سے کام نہ لیا تو امید ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے حبیب e کی زیارت سے ضرور بہرہ ور فرمائے گا۔

حافظ قرآن کی سفارش

] میں ایک دینی تقریب میں شامل ہوا، وہاں ایک بچے نے قرآن مجید حفظ کیا تھا، ایک عالم دین نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ حافظ قرآن اپنے دس رشتے داروں کی سفارش کرے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی، کیا یہ حدیث ہے؟ اگر ہے تو اس کی کیا حیثیت ہے؟ وضاحت کریں۔

[کتب حدیث میں، مذکورہ حدیث بایں الفاظ مروی ہے، سیدنا علی t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے

! مسلم، فضائل الصحابہ:۶۳۶۶۔ @ مسلم، الجنہ:۷۱۴۵۔
مسند امام احمد: ج۴،ص۱۰۶۔ $ مسند امام احمد، ج۱،ص۳۶۱۔

فرمایا: ''جس نے قرآن پڑھا اور اسے حفظ کیا، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا، اور اس کے گھر والوں میں سے دس ایسے افراد کے حق میں (حافظ قرآن) کی سفارش قبول کرے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی۔'' 1

امام ترمذی a نے بھی اس حدیث کو بیان کیا ہے لیکن اس میں مزید درج ذیل الفاظ ہیں: ''اس نے قرآن کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانا۔'' 2

امام ترمذی a خود اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''یہ حدیث غریب ہے، اس کی دوسری کوئی سند نہیں۔ نیز مذکورہ سند صحیح نہیں کیوں کہ اس کی سند میں حفص بن سلیمان نامی ایک راوی ہے جو فن حدیث میں کمزور ہے۔''

واضح رہے کہ مذکورہ راوی، امام عاصم کے مشہور راوی حفص بن سلیمان ہیں جن کی روایت قرآن حکیم ہمارے ہاں برصغیر میں مشہور و متداول ہے۔ اس کے متعلق امام بخاری a فرماتے ہیں: ''محدثین نے اسے ترک کر دیا ہے۔'' 3

امام نسائی نے بھی اسے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ 4

اگر کسی نے اسے ثقہ کہا ہے تو فن قرأت میں اسے قابل اعتماد کہا گیا ہے، بہرحال حدیث میں اس کی مرویات قابل حجت نہیں ہیں۔

اس حدیث کے دوسرے راوی کثیر بن زاذان ہیں جن کے متعلق امام ابو حاتم رازی اور امام ابو زرعہ رازی فرماتے ہیں: ''شیخ مجهول'' یہ بھی مجہول شیخ ہیں۔ 5

امام العصر علامہ البانی a نے بھی اس روایت کو سخت ضعیف قرار دیا ہے۔ 6

بہرحال ہمارے واعظین کو چاہیے کہ وہ روایات کی چھان پھٹک کے بعد انہیں بیان کیا کریں۔ واللہ اعلم

شادی سے پہلے اعلیٰ تعلیم کی تکمیل

] میرے رشتے کے لیے بات مکمل ہو چکی ہے لیکن لڑکی کے سرپرست کا کہنا ہے کہ لڑکی نے بھی مزید چند سال زیر تعلیم رہنا ہے تاکہ وہ اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کر لے جبکہ اس کی عمر تقریباً ۲۵ سال ہو چکی ہے، کیا یہ شادی نہ کرنے کا شرعی عذر بن سکتا ہے؟

[دور حاضر میں اتنی تعلیم تو ضرور ہونی چاہیے کہ انسان لکھنا پڑھنا جان لے۔ قرآن مجید، اس کی تفسیر، احادیث اور اس کی تشریحات سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہو جائے، لیکن اس سے زیادہ تعلیم شادی میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ ہمارے رجحان کے مطابق جب اسباب زواج اور مناسب رشتہ میسر آ جائے تو اعلیٰ تعلیم کا حصول شادی میں رکاوٹ نہ بننے دیا جائے کیوں کہ نکاح میں بے شمار فوائد اور مصلحتیں ہیں جن سے رسول اللہ e نے ہمیں آگاہ فرمایا ہے۔ رسول اللہ e کا ارشاد ہے:

! ابن ماجہ:۲۱۶۔ @ ترمذی، فضائل القرآن:۲۹۰۵۔
كتاب الضعفاء:۵۰۔ $ كتاب الضعفاء:۱۳۴۔
% الجرح والتعديل: ج۷،ص۱۵۱۔ ۸ ضعيف الترغيب:ج۱،ص۴۳۲۔

''نکاح نگاہوں کو نیچا رکھنے والا اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والا ہے۔'' 1

نیز نکاح کرنے سے نصف دین کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ e کا فرمان ہے:

''جب بندہ شادی کر لیتا ہے تو وہ نصف دین مکمل کر لیتا ہے، اب اسے باقی نصف میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے۔ 2

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ e کی متبادل بیویوں کے جو اوصاف بیان کیے ہیں، ان میں اخلاق و کردار کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ وہاں اعلیٰ تعلیم کا دور، دور تک نشان دکھائی نہیں دیتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓىِٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓىِٕحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا۝﴾ 3

''اگر پیغمبر تمہیں طلاق دے دیں تو بہت جلد ان کا رب انہیں تمہارے بدلے تم سے بہتر بیویاں عنایت فرمائے گا، جو مسلمان، صاحب ایمان، فرمانبردار، توبہ کرنے والی، عبادت گزار اور روزہ رکھنے والی ہوں گی۔''

ان احادیث و آیات کے پیش نظر ہم لڑکیوں کے سرپرست حضرات سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اعلیٰ تعلیم دلوانے کا بہانہ بنا کر لڑکیوں کی شادی میں تاخیر نہ کریں، تعلیم کا سلسلہ تو ساری عمر جاری رکھا جا سکتا ہے۔ بوقت نکاح بھی خاوند سے تعلیم مکمل کرنے کی شرط لگائی جا سکتی ہے کہ جب تک وہ بچوں کی مصروفیت میں نہیں پڑتی، سال دو سال تک تعلیمی سلسلہ جاری رکھا جا سکتا ہے، نیز ہم اس تاخیر کے نتائج سے بھی آگاہ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ''جب تمہیں ایسا شخص پیغام نکاح دے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اس سے نکاح کر دو۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بہت فساد برپا ہو گا۔'' 4

بہرحال جب لڑکی بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کے متعلق دیر نہیں ہونی چاہیے، اعلیٰ تعلیم کا بہانہ درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

کیا امت کا اختلاف باعث رحمت ہے؟

] برصغیر میں مذہبی اختلافات بہت زیادہ ہیں، اس اختلاف کو تحفظ دینے کے لیے ایک حدیث کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔'' کیا واقعی یہ حدیث ہے اور اس سے مذہبی اختلافات کو برقرار رکھا جا سکتا ہے؟

[اختلاف ہمیشہ راہ حق سے انحراف کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس انحراف کا منبع بغض و عناد ہوتا ہے۔ امت مسلمہ میں جب تک یہ انحراف نہیں آیا، یہ امت اپنے اصل پر قائم رہی اور اختلافات کی نحوست سے بھی اس کا دامن آلودہ نہ ہوا، لیکن

! بخاری، النکاح:۵۰۶۶. @ شعب الایمان:ص۳۸۲.

التحریم:۵. $ ترمذی، النکاح:۱۰۸۴.

اندھی تقلید اور بدعات و رسومات نے حق سے گریز کا جو راستہ کھولا تو اس سے اختلافات کا دائرہ پھیلتا ہی چلا گیا حتی کہ اب اتحاد امت ایک ناممکن چیز بن کر رہ گیا ہے۔ پھر اس اختلاف کو برقرار رکھنے کے لیے احادیث کا سہارا لیا گیا جیسا کہ سوال میں مذکور ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء o کی بعثت کا مقصد ہی اختلافات کو ختم کرنا بیان کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ﴾ 1

''لوگ ایک ہی گروہ تھے، اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر مبعوث کیا اور ان کے ساتھ ہی سچی کتابیں نازل فرمائیں تا کہ لوگوں کے ہر اختلافی امر کا فیصلہ ہو جائے۔''

مذہبی اختلافات کو برقرار رکھنے کے لیے جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے اس کے متعلق محدث العصر علامہ البانی a فرماتے ہیں:

''یہ حدیث صحیح نہیں بلکہ بے بنیاد اور باطل ہے۔ علامہ سبکی اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ میں اس حدیث کی سند پر مطلع نہیں ہو سکا، اس کی سند صحیح تو کجا ضعیف یا موضوع سند بھی دستیاب نہیں ہو سکی۔'' 2

یہ حدیث بے اصل ہونے کے باوجود قرآن کے بھی خلاف ہے کیوں کہ قرآن میں اتحاد و اتفاق کی ترغیب دی گئی ہے اور اختلافات سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ﴾ 3

''ان لوگوں سے نہ ہو جاؤ، جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود بھی کئی گروہوں میں بٹ گئے، ہر گروہ اس چیز پر مگن ہے جو اس کے پاس ہے۔''

آج ملت اسلامیہ کا بھی یہی حال ہے کہ وہ مختلف مذہبی گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، اس کا ہر فرقہ اسی زعم میں مبتلا ہے کہ وہ حق پر ہے حالانکہ حق پر صرف ایک گروہ ہے جس کی پہچان رسول اللہ e نے بایں الفاظ کی ہے:

''وہ میرے اور میرے صحابہ کرام y کے طریقے پر چلنے والا ہوگا۔''

اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ 4

''آپس میں اختلافات نہ کرو، ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا بھی اکھڑ جائے گی، صبر کا دامن تھامے رکھو، یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

! البقرہ:۲۱۳.　　@ صفۃ الصلوٰۃ:۵۹.
الروم:۳۲.　　$ الانفال:۴۶.

اس آیت میں اختلافات رکھنے کی تردید کی گئی ہے اور سختی سے ان سے منع کیا گیا ہے، لیکن ہمارے مذہبی طبقے اس اختلاف کو ایک بے اصل حدیث کے ذریعے باعث رحمت قرار دے رہے ہیں۔ فالی اللہ المشتکیٰ !

بہر حال ہمیں حکم ہے کہ ہم کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامے رکھیں اور مذہبی اختلافات کو ختم کر کے ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔ نیز مذکورہ حدیث کے سہارے اپنے اختلافات پر ڈٹے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ واللہ اعلم !

بچے کو دودھ پلانے کی حیثیت

] اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک خوبصورت بیٹا عطا فرمایا ہے، اب ہمارے گھر میں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ آیا ماں کو ضروری ہے کہ وہ نومولود کو دودھ پلائے یا فیڈر کے ذریعے کوئی دوسرا دودھ بھی پلایا جا سکتا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ a فرماتے ہیں کہ ''جب کوئی عورت کسی کے عقد میں ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے نومولود کو دودھ پلائے۔''

اس کے متعلق شیخ ابن عثیمین a لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلام کی بات انتہائی وزنی معلوم ہوتی ہے، ہاں اگر میاں بیوی دونوں اس بات پر اتفاق کر لیں کہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلایا جائے، تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ اہل عرب کے ہاں اس کا رواج تھا۔ لیکن اگر خاوند اپنی بیوی کو دودھ پلانے کا پابند کرتا ہے تو بیوی کو چاہیے کہ وہ اس کی پابندی کرے۔ 1

قرآن وحدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیوی اپنے بچے کو دودھ پلائے اور بلاوجہ اس سے گریز نہ کرے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ 2

''مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی عذر مانع نہیں تو نومولود کو ضرور دودھ پلانا چاہیے، ہاں اگر اسے دودھ نہیں آیا یا دودھ تو ہے لیکن وہ مضر صحت ہے تو اس صورت میں وہ معذور ہے۔ اگر والدہ بلاوجہ اپنا دودھ نومولود کو نہیں پلاتی تو اللہ تعالیٰ اس حکم عدولی پر ناراض ہوتا ہے بلکہ رسول اللہ e نے اس کے متعلق بہت سخت وعید سے ہمیں آگاہ کیا ہے۔ رسول اللہ e فرماتے ہیں: ''میں ایک دن سویا ہوا تھا کہ میرے پاس دو فرشتے آئے اور مجھے مختلف مناظر دکھانے کے لیے لے گئے، میں نے چند عورتوں کو دیکھا، جن کی چھاتیوں کو سانپ ڈس رہے ہیں، میں نے دریافت کیا یہ کون سی عورتیں ہیں تو انہوں نے کہا کہ یہ وہ عورتیں ہیں جو اپنا دودھ اپنے بچوں کو نہیں پلاتی تھیں۔'' 3

! شرح ممتع: ج۱۳، ص۵۱۷۔ @ البقرہ: ۲۳۳۔
صحیح ابن خزیمہ: ج۳، ص۲۳۷۔

پھر دودھ پلانے کے بے شمار طبی اور معاشرتی فوائد ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بچے اور ماں کے درمیان محبت کا رشتہ مضبوط ہوتا ہے اور ماں چھاتی کے کینسر سے محفوظ رہتی ہے۔ واللہ اعلم!

جس کے باپ کا علم نہ ہو

] میرے بھائی کے ہاں اولاد نہیں اور انہیں ہسپتال سے ایسا بچہ ملا جس کے باپ کا علم نہ تھا، وہ اسے اپنے گھر لایا اور اس کی بیوی نے اسے دودھ پلا دیا۔ اب اس کی ولدیت کا معاملہ ہے، ہمیں اس سلسلہ میں کیا کرنا چاہیے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں رہنمائی کریں۔

[ہمارے معاشرہ میں منہ بولے بیٹے کا معاملہ انتہائی سنگین ہے، ہم اس سلسلہ میں بہت افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ قرآن کریم میں جس کے بچے کے باپ کا علم نہ ہو، اس کے متعلق واضح ہدایات ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾ 1

''اگر تمہیں لے پالک کے حقیقی باپ کا علم نہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور دوست ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ بیٹا سمجھنے کے بجائے اسے اپنا بھائی اور دوست خیال کیا جائے، اسے بیٹے کا مقام نہ دیا جائے۔ اگر کوئی ایسے لے پالک کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے تو وہ قرآن کریم کی واضح طور پر خلاف ورزی کرتا ہے۔ ایسے لے پالک کے متعلق حدیث میں بہت سخت وعید ہے۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ''جس نے جانتے بوجھتے ہوئے اپنے آپ کو غیر باپ کی طرف منسوب کیا، اس نے کفر کا ارتکاب کیا۔'' 2

شریعت نے اس کا مناسب حل اس طرح نکالا ہے کہ جو شخص لے پالک بناتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنی بیوی کا دودھ اسے پلا دے۔ جیسا کہ حضرت ابو حذیفہ t نے حضرت سالم t کو اپنا بیٹا بنایا تھا، تو اس سلسلہ میں آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ e نے حضرت حذیفہ t کی بیوی سے فرمایا کہ تم اسے دودھ پلا کر اپنا رضاعی بیٹا بنا لو۔ 3

چنانچہ اس نے دودھ پلا کر اسے اپنا بیٹا بنا لیا اور ان کے پردے سے متعلق مسئلہ ختم ہوگیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ دودھ پلانے سے بھی وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو خون اور نسب سے حرام ہوتے ہیں۔ 4

صورت مسئولہ میں سائل کے بھائی نے بھی ایسا ہی کیا ہے، لے پالک کو اپنی بیوی کا دودھ پلا دیا ہے اس لیے وہ اس کا رضاعی باپ بن چکا ہے۔ کاغذات میں ولدیت کے خانہ میں اپنا نام لکھوا سکتا ہے لیکن بریکٹ میں (رضاعی) لکھنا ہوگا تاکہ کسی قسم کا اشتباہ نہ رہے۔ تاہم قانونی طور پر سقم باقی رہے گا کہ شناختی کارڈ بناتے وقت نادرا والے رضاعی باپ کو باپ نہیں

! الاحزاب:۵.
@ بخاری، المناقب:۳۵۰۸.
# ابوداؤد، النکاح:۲۰۶۱.
$ ابوداؤد، کتاب النکاح:۲۰۵۵.

مانتے۔حکومت کو اس مسئلے کا کوئی قانونی حل نکالنا چاہیے کہ ولدیت کے خانہ میں نگران، پرورش کنندہ اور رضاعی باپ کا اضافہ ہونا چاہیے تاکہ اس سلسلہ میں کسی کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ بہرحال شرعی طور پر جس کی بیوی نے بچے کو دودھ پلا دیا ہے وہ بچے کا رضاعی باپ ہے۔ (واللہ اعلم)

لے پالک کی نسبت

] میں قطر میں رہائش پذیر ہوں اور میرے ہاں کوئی اولاد نہیں۔ میں اپنے بھائی کا نوزائیدہ بیٹا اپنے ساتھ قطر لے جانا چاہتا ہوں، وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کے ب فارم اور پاسپورٹ میں اپنی ولدیت لکھاؤں، کیا شرعی طور پر اس میں کوئی قباحت تو نہیں؟

[رسول اللہ e نے سیدنا زید بن حارثہ t کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تو لوگ اس زید بن محمد کہہ کر پکارتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس غلط رسم کی اصلاح فرمائی اور اس کے متعلق قرآن مجید میں ذیل کی آیات نازل ہوئیں:

﴿وَ مَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ۝ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ﴾ 1

”اللہ تعالیٰ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے حقیقی بیٹے نہیں بنایا۔ یہ تو تمہارے منہ کی باتیں ہیں مگر اللہ حقیقی بات کہتا ہے اور وہی صحیح راہ دکھاتا ہے، تم ان (منہ بولے بیٹوں کو) ان کے باپوں کے نام سے پکارا کرو۔“

چنانچہ حدیث میں صراحت ہے کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو لوگوں نے سیدنا زید t کو زید بن محمد کی بجائے زید بن حارثہ کہنا شروع کر دیا۔ 2

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کو اس کے حقیقی باپ کی نسبت سے ہی پکارنا چاہیے، لہٰذا سائل کو شرعاً یہ اجازت نہیں کہ نوزائید کا ب فارم یا پاسپورٹ بنانے کے لیے اس کی اصل ولدیت کی بجائے اپنی ولدیت لکھا دے۔

مذکورہ بالا آیت میں جس طرح عام اہل ایمان کو حکم ہے کہ وہ کسی شخص کو اس کے حقیقی باپ ہی کی طرف منسوب کریں، اس کی نسبت کسی دوسرے شخص کی طرف نہ کریں۔ اس طرح یہ بھی حکم ہے کہ کوئی شخص خود بھی اپنے آپ کو اپنے حقیقی باپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص یا کسی دوسری قوم کی طرف منسوب نہ کرے، کیوں کہ ایسا کرنا کبیرہ گناہ ہے۔

چنانچہ سیدنا ابوذر t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ”جس نے دوسرے شخص کو جان بوجھ کر اپنا باپ بنایا وہ کافر ہو گیا اور جو شخص اپنے آپ کو کسی دوسری قوم کا فرد بنائے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنا لے۔“ 3

ہاں اگر کوئی کسی برخوردار کو پیار سے بیٹا یا بیٹی کہہ دے یا کسی کا احترام ملحوظ رکھ کر کسی بزرگ کو باپ یا کسی بزرگ عورت کو

! الاحزاب:۴،۵۔ @ صحیح بخاری، التفسیر:۴۷۸۲۔

بخاری، المناقب:۳۵۰۸۔

ماں کہہ دے تو اس میں کوئی حرج والی بات نہیں۔ حرج اس وقت ہو گا جب کسی کو بیٹا یا بیٹی کہے اور اس کے فرائض اور حقوق بھی اپنے ذمے لے لے۔

جیسا کہ صورت مسئولہ سے معلوم ہوتا ہے اور سائل نومولود کی ولدیت کی بجائے اپنا نام لکھنا چاہتا ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس نومولود کو اپنا حقیقی بیٹا قرار دینا چاہتا ہے، لہٰذا اس اقدام سے گریز کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم!

اماں حلیمہ سعدیہ کا اسلام

] رسول اللہ e کی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ کے متعلق علماء کا کیا موقف ہے؟ کیا انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا؟ قرآن وحدیث اور تاریخ سے کیا ثابت ہے؟

[اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ e جب پیدا ہوئے تو دودھ پلانے کے لیے اماں حلیمہ سعدیہ کا انتخاب کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت خیر و برکت سے نوازا، البتہ ان کے مسلمان ہونے کے متعلق اختلاف ہے۔

چنانچہ حافظ ابن قیم a لکھتے ہیں: ''رسول اللہ e کے رضاعی والدین کے اسلام لانے کے متعلق علمائے امت میں اختلاف ہے۔'' 1

امام منذری a لکھتے ہیں کہ رسول اللہ e کی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہ نے اسلام قبول کر لیا تھا، وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ سے احادیث بیان کی ہیں۔ 2

حافظ ابن عبد البر a اور امام ابن اثیر a نے انہیں صحابیات میں شامل کیا ہے، انہوں نے اپنی تالیفات الاستیعاب اور اسد الغابہ میں اس بات کی صراحت کی ہے، حافظ ابن حجر a نے بھی ان کے اسلام لانے کو ترجیح دی ہے۔ 3

لیکن احادیث میں اس قسم کی کوئی صراحت نہیں، ابو الطفیل کہتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ e کو دیکھا کہ آپ جعرانہ میں گوشت تقسیم کر رہے تھے، اس دوران ایک بڑھیا آئی اور رسول اللہ e کے قریب ہوئی تو آپ نے اس کے لیے چادر بچھا دی، لوگوں نے بتایا کہ یہ بڑھیا آپ کی رضاعی والدہ ہیں۔'' 4

لیکن یہ روایت قابل حجت نہیں کیوں کہ اس میں عمار بن ثوبان اور ان کا پوتا جعفر بن یحییٰ دونوں مجہول ہیں۔

بہر حال اگرچہ احادیث میں ان کے اسلام کا ذکر نہیں لیکن تاریخ میں ان کے اسلام لانے کی صراحت ہے۔ واللہ اعلم!

ٹخنوں کے نیچے کپڑا لٹکانا

] ٹخنوں کے نیچے کپڑا لٹکانے کی احادیث میں سخت وعید ہے، اس کی وجہ کیا ہے بعض دفعہ اٹھتے وقت اچانک ایسا ہو جاتا ہے، کیا یہ بھی مذکورہ وعید کی زد میں آتا ہے؟ اس کی وضاحت کر دیں۔

! زاد المعاد: ج۱، ص۸۳.
@ مختصر ابی داوٗد، ج۸، ص۴۰.
# الاصابۃ: ج۷، ص۸۸.
$ ابو داوٗد، الادب: ۵۱۴۴.

[مرد حضرات کے لیے، چادر، شلوار پینٹ وغیرہ ٹخنوں سے لٹکانا انتہائی قبیح اور گناہ کا کام ہے جو قبولیت عبادات پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔ نماز اور غیر نماز ہر حال میں اس سے احتراز ضروری ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق اس کی حسب ذیل دو اقسام ہیں، اور ہر قسم کی الگ الگ وعید ہے۔

☆ ایک انسان عادت کے طور پر ایسا کرتا ہے، اس کی سزا یہ ہے کہ جو کپڑا ٹخنوں سے نیچے ہوگا وہ انسان کو آگ میں لے جائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے رسول اللہ e نے فرمایا: ''مومن کا ازار اس کی نصف پنڈلی تک ہونا چاہیے اور اگر وہ نصف پنڈلی اور ٹخنوں کے درمیان ہو تو بھی اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو اس کے نیچے ہوگا وہ آگ میں لے جاتا ہے۔'' 1

☆ دوسری قسم یہ ہے کہ انسان فخر و مباہات اور تکبر کے طور پر ایسا کرتا ہے تو ایسے شخص کی طرف اللہ تعالیٰ نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا جو تکبر کے طور پر اپنا ازار گھسیٹتا ہے۔'' 2

بلکہ رسول اللہ e نے فرمایا کہ ایک آدمی تکبر کے طور پر اپنا تہبند گھسیٹتا تھا، اس وجہ سے اسے زمین میں دھنسا دیا گیا اور وہ قیامت کے دن تک زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔ 3

رسول اللہ e نے اس عمل کو تکبر کی علامت قرار دیا ہے، آپ نے ایک شخص کو وعظ کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''ٹخنوں سے نیچے اپنا کپڑا لٹکانے سے پرہیز کرنا، کیوں کہ یہ تکبر ہے اور اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' 4

درج ذیل چار حضرات اس وعید سے مستثنیٰ ہیں:

☆ جس آدمی کا پیٹ بڑا ہو اور کمر کبڑی ہو، کوشش کے باوجود اس کی چادر ڈھلک کر ٹخنوں سے نیچے آجاتی ہو۔

☆ انسان بے خیالی میں اٹھتا ہے تو اس دوران اس کی چادر ٹخنوں سے نیچے ہوجاتی ہے، ایسا انسان بھی قابل مواخذہ نہیں۔

☆ کسی انسان کے ٹخنوں پر پھوڑے یا زخم ہیں، وہ انہیں چادر سے ڈھانپتا ہے تو وہ بھی اس عذر کی بناء پر معذور ہے۔

☆ عورتیں بھی اس سے مستثنیٰ ہیں کیوں کہ انہیں حکم ہے کہ وہ اپنے چادریں ٹخنوں سے نیچا رکھیں۔

ان احادیث کے پیش نظر مرد کو چاہیے کہ وہ اپنے لباس اور صفات کا اظہار کرے کیوں کہ کپڑے کا ٹخنوں سے نیچے کرنا تکبر کی علامت ہے۔

جیسا کہ امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب t نے اشارہ کیا ہے۔ آپ t نے ایک آدمی کو دیکھا جس کی چادر ٹخنوں سے نیچے تھی تو آپ نے اسے اپنے پاس بلا کر پوچھا کہ ''کیا تجھے حیض آتا ہے؟'' اس نے عرض کیا یا امیر المؤمنین! کیا آدمی کو بھی حیض آتا ہے تو آپ t نے فرمایا: ''تو اپنی چادر کو ٹخنوں سے نیچے کر کے کیوں چلتا ہے؟''...... پھر آپ t نے اس کی چادر کو نیچے

! ابو داؤد، اللباس:۴۰۹۳.　@ بخاری، اللباس:۵۱۸۸.

بخاری، الاحادیث الانبیاء:۳۴۸۵.　$ ابو داؤد، اللباس:۴۰۸۴.

سے کاٹ دیا۔ 1

بہر حال مرد حضرات کو اس سے گریز کرنا چاہیے، آج ہم غفلت کی وجہ سے اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں جبکہ یہ ایک کبیرہ گناہ ہے۔ واللہ اعلم!

عاشوراء محرم اور توسیع طعام

] میرے ایک پڑوسی اہل حدیث ہیں، انہوں نے دسویں محرم کو اپنے گھر میں اچھے اور اعلیٰ قسم کے کھانوں کا اہتمام کیا، اس نے مجھے بتایا کہ ایسا کرنے کا شرعی طور پر حکم دیا گیا ہے اور ایسا کرنے سے سارا سال رزق میں فراخی رہتی ہے، اس کے متعلق وضاحت درکار ہے۔

[ہمارے معاشرہ میں عاشوراء محرم کو دو وجہ سے کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ چونکہ اس دن سیدنا حسین t کی مظلومانہ شہادت ہوئی تھی، اس لیے ان کے نام کی سبیلیں لگائی جاتی ہیں اور نذر و نیاز کے طور پر دیگیں پکائی جاتی ہیں، اس کی شرعا کوئی گنجائش نہیں اور نہ ہی ہمارے اسلاف نے اس مقصد کے لیے کھانوں کا اہتمام کیا ہے۔

☆ دوسری وجہ یہ ہے جیسا کہ سائل نے ذکر کیا ہے، اس دن گھر میں اعلیٰ پکوان کا اہتمام اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ سارے گھر میں فراخی رزق ہو، اس کی بنیاد ایک بے اصل اور من گھڑت روایت ہے جس کی تفصیل درج ذیل بیان کی جاتی ہے:

''سیدنا عبد اللہ بن مسعود t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''جو شخص عاشوراء کے دن فراخی کے ساتھ اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ پورا سال اسے رزق میں فراخی عطا کرتا ہے۔''

سفیان ثوری a بیان کرتے ہیں کہ ہم اس کا تجربہ کر چکے ہیں، ہم نے اسے اسی طرح پایا ہے۔ صاحب مشکوۃ نے اس روایت کو امام رزین کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ 2

مؤلف مشکوۃ نے مزید لکھا ہے کہ امام بیہقی a نے اپنی تالیف شعب الایمان میں سیدنا عبد اللہ بن مسعود t، سیدنا ابوہریرہ t، سیدنا ابوسعید t اور سیدنا جابر t سے بیان کیا اور جملہ روایات کو انہوں نے ضعیف قرار دیا ہے۔ 3

جب ہم نے امام بیہقی a کی تالیف شعب الایمان کی طرف رجوع کیا تو حسب ذیل صورت حال سامنے آئی۔

☆ سیدنا عبد اللہ بن مسعود t سے مروی اس حدیث میں درج ذیل ضعیف راوی پائے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے یہ روایت قابل استدلال نہیں: جعفر بن محمد بن کزال...... علی بن مہاجر البصری...... ہیصم بن شداخ الوراق۔

تفصیل کے لیے شعب الایمان حدیث نمبر ۳۵۱۳ دیکھیں۔

! مصنف ابن ابی شیبہ: ج۵،ص۱۶۷۔ @ مشکوٰۃ، الزکاۃ: ۱۹۲۶۔

مشکوٰۃ، الزکاۃ: ۱۹۲۷۔

☆ سیدنا ابوہریرہ t سے مروی حدیث بھی ضعیف ہے، کیوں کہ اس میں درج ذیل ضعیف راوی موجود ہیں:

حسن بن علی اہوازی مجہول ہے، اس کے حالات نہیں ملتے۔ حجاج بن نصیر اور محمد بن ذکوان دونوں ضعیف ہیں۔ اس بناء پر یہ روایت بھی ناقابل حجت ہے۔

☆ سیدنا ابوسعید خدری t کی روایت میں بھی درج ذیل راوی ناقابل حجت ہیں:

ایوب بن سلیمان ضیاء...... اس سے ایک مجہول آدمی روایت کرتا ہے۔...... علامہ ہیثمی نے بھی اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ 1

☆ سیدنا جابر t سے مروی حدیث بھی ناقابل استدلال ہے، اس کی سند کو خود امام بیہقی a نے کمزور کہا ہے۔ 2

اس میں درج ذیل راوی کمزور ہیں:

محمد بن یونس الکدیمی...... عبداللہ بن ابراہیم الغفاری...... عبداللہ بن ابی بکر

بہرحال اس روایت میں جملہ مروی روایات کمزور اور ناقابل استدلال ہیں۔

چنانچہ امام ابن تیمیہ a لکھتے ہیں: ''دس محرم کو خاص کھانا پکانا، اس میں توسیع کرنا من جملہ ان بدعات و منکرات سے ہے جو نہ تو رسول اللہ e کی سنت سے ثابت ہیں نہ خلفائے راشدین سے اور نہ ہی ائمہ مسلمین میں سے کسی نے اس کو مستحب خیال کیا ہے۔'' 3

صاحب مشکوۃ نے امام سفیان ثوری a کا اس سلسلہ میں ایک تجربہ بیان کیا ہے، اس پر ہماری گزارش ہے کہ احادیث کی صحت کے لیے محدثین نے اصول و ضوابط بیان کیے ہیں، کسی کے تجربہ کی بنیاد پر کسی روایت کو صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال ہمارے ہاں یہ معمول خیر القرون کے بعد ایجاد ہوا ہے جو کسی طرح بھی دین کا حصہ نہیں۔ واللہ اعلم!

عورت کے لیے حلاوت ایمان

] میری شادی کو تین سال ہو چکے ہیں، شادی سے پہلے اپنے والدین کے ہاں مجھے عبادت کرتے وقت عجیب لذت محسوس ہوتی تھی، شادی کے بعد تقریباً ایک سال تک یہی کیفیت برقرار رہی۔ اب مجھے اس کی حلاوت محسوس نہیں ہوتی، براہ کرم اس سلسلہ میں میری رہنمائی کریں۔

[عبادات میں لذت محسوس ہونا اللہ کی طرف سے ایک خاص عطیہ ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے۔ البتہ رسول اللہ e نے چند ایسے امور کی نشاندہی ضرور کی ہے جو حلاوت ایمان کا باعث ہیں، چنانچہ آپ e کا ارشاد گرامی ہے: ''جس شخص میں تین خصلتیں ہوں گی وہ ایمان کی شیرینی پا لے گا۔ جس کو اللہ اور اس کے رسول پوری دنیا سے زیادہ محبوب

! مجمع الزوائد: ج۳، ص۱۸۹۔ @ شعب الایمان: ج۷، ص۳۷۵۔
فتاویٰ ابن تیمیہ: ج۲، ص۳۵۴۔

ہوں اور جوشخص کسی بندے سے محبت کرے تو صرف اللہ عزوجل کے لیے کرے اور جوشخص کفر سے نکلنے کے بعد کفر کی طرف لوٹنے کو اس طرح برا سمجھے گویا اسے آگ میں ڈالا جارہا ہے۔'' 1

حلاوت ایمان کے متعلق ایک اور حدیث بایں الفاظ مروی ہے:

''اس شخص نے ایمان کا مزہ چکھ لیا جو اللہ تعالیٰ سے از روئے رب ہونے کے راضی ہو گیا، جس نے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کرلیا اور حضرت محمد e کو بحیثیت رسول کے تسلیم کرلیا۔'' 2

واضح رہے کہ یہ نعمت اس خوش نصیب کو ملتی ہے جس کے ایمان نے اس کے یقین کو طاقتور کر دیا ہو اور اس کا نفس مطمئن ہو گیا ہو۔ نیز اس کا سینہ کھل گیا ہو اور ایمان و یقین اس کے گوشت و پوست میں سرایت کر چکا ہو۔ اس قسم کے باکمال اور خوش نصیب لوگ حلاوت ایمانی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

سائلہ کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ٹٹولے کہ اس کا ایمان کس نوعیت کا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے خاوند کے تعلقات پر بھی نظر ثانی کرے کیوں کہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کو اس حلاوت میں بہت دخل ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے، سیدنا معاذ بن جبل t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''کوئی عورت، حلاوت ایمان سے ہمکنار نہیں ہوسکتی حتی کہ وہ اپنے خاوند کے حقوق کی پاسداری کرے۔'' 3

سیدنا عمران بن حصین t بیان کرتے ہیں کہ میری پھوپھی ایک مرتبہ اپنی کسی ضرورت کے لیے رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوئیں، جب وہ فارغ ہوگئیں تو رسول اللہ e نے انہیں فرمایا: ''کیا تو شادی شدہ ہے؟''

انہوں نے عرض کیا جی ہاں۔

آپ نے فرمایا: ''تو اس کی خدمت گزاری کس طرح کرتی ہے؟''

عرض کیا: میں اس کے متعلق کوئی کوتاہی نہیں کرتی الا یہ کہ میں عاجز ہو جاؤں۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ''تم تو اس کے مقابلہ میں اپنی قدر و قیمت کو پہچان سکتی ہو، کیوں کہ وہ تیرے لیے جنت بھی ہے اور دوزخ بھی۔'' 4

اس کا مطلب یہ ہے کہ خاوند کی خدمت اور اطاعت گزاری تیرے لیے جنت اور اس کے حقوق سے روگردانی اور بغاوت تیرے لیے جہنم کا سامان ہے۔

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ e نے خاوند کی حیثیت کو بایں الفاظ نمایاں کیا ہے۔ ''اگر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی

! بخاری، الایمان:۲۱۔ @ مسلم، الایمان:۱۵۱۔

صحیح الترغیب والترھیب، حدیث نمبر:۱۹۳۹۔ $ مسند امام احمد:ج۴،ص۳۴۱۔

دوسرے کوسجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو کہتا کہ وہ خاوند کو سجدہ کرے۔'' 1

سیدنا زید بن ارقم t سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ e نے خاوند کے حقوق کے سلسلہ میں فرمایا ہے: ''بیوی اپنے رب تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی نہیں کرسکتی تا آنکہ وہ اپنے خاوند کے حقوق کی ادائیگی کرے۔'' 2

سیدنا عبداللہ بن عمر w سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ e نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اس عورت کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھتے جو اپنے خاوند کی ناپاس گزار ہوتی ہے۔'' 3

عبادات میں حلاوت و لذت تو بہت دور کی بات ہے، خاوند کی نافرمان اور سرکش بیوی کی نماز اُس کے سر سے اوپر نہیں چڑھتی۔

جیسا کہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

''دو آدمیوں کی نماز ان کے سر سے اوپر نہیں چڑھتی: ایک وہ غلام جو آقا سے بھاگا ہو تا آنکہ وہ لوٹ آئے۔ دوسری وہ عورت جس کا خاوند ناراض ہو تا آنکہ وہ راضی ہو جائے۔'' 4

بیگمات اگر عبادات میں لذت کی طالب ہیں تو انہیں شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے خاوندوں کی اطاعت کرنا ہوگی۔

قسم اور اس کا کفارہ

] میں نے اپنی بیوی سے جھگڑتے ہوئے قسم اٹھائی کہ آئندہ میں تیرے ساتھ کبھی اچھا برتاؤ نہیں کروں گا۔ اب مجھے احساس ہوا ہے کہ میں نے غلط کام کیا ہے، اس کی تلافی کیونکر ہوسکتی ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں میری اس الجھن کو حل کریں۔

[قرآن کریم نے اس انداز سے قسم اٹھانے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا﴾ 5

''اپنی قسموں کے لیے اللہ تعالیٰ کے نام کو ایسی ڈھال نہ بناؤ کہ تم فلاں نیکی کا کام نہیں کروگے۔''

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اچھا کام نہ کرنے کی قسم اٹھا کر اللہ کے نام کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔ یعنی برائی کے کاموں میں اللہ تعالیٰ کا نام استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کسی نے ایسا کیا ہے تو اسے چاہیے کہ اپنی قسم توڑ ڈالے اور اس کا کفارہ ادا کرے۔

جیسا کہ حدیث میں ہے سیدنا عبدالرحمن بن سمرہ t کو رسول اللہ e نے حکم دیا تھا کہ اگر تو کسی بات پر قسم اٹھائے پھر اس کے خلاف کرنا بہتر خیال کرے تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کرو اور اس کام کو کر گزرو جسے تم بہتر خیال کرتے ہو۔ 6

قسم توڑنے کے بعد اس کے کفارے کی تفصیل قرآن مجید میں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

! ترمذی، الرضاع:۱۱۵۹۔

@ صحیح الترغیب والترہیب:۱۹۴۳۔

مستدرک الحاکم:ج۲،ص۱۹۰۔

$ مستدرک الحاکم، ج۴،ص۱۷۳۔

% البقرہ:۲۲۴۔

۸ بخاری، الایمان والنذور:۶۶۲۲۔

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ﴾ 1

''قسم کا کفارہ یہ ہے کہ دس مساکین کو اوسط درجہ کا کھانا کھلایا جائے جو تم اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو، یا ان کے لباس کا بندوبست کیا جائے یا ایک غلام آزاد کرنا ہے اور جسے یہ میسر نہ ہو وہ تین دن روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم اٹھا کر اسے توڑ دو۔''

صورت مسئولہ میں سائل کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرے اور تفصیل بالا کے مطابق قسم توڑنے کا کفارہ دے دے۔

واضح رہے کہ آج غلام آزاد کرنے کا رواج نہیں۔

لہٰذا اب قسم کے کفارہ کی تین متبادل صورتیں ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

☆ اپنی حیثیت کے مطابق دس مساکین کو درمیانے درجے کا کھانا کھلایا جائے یا اس کی رقم انہیں دے دی جائے، یہ رقم ایک یا دو یا تین مساکین کو دی جا سکتی ہے۔

☆ دس مساکین کو لباس پہنا دیا جائے۔

☆ اگر کھانا کھلانے یا لباس پہنانے کی حیثیت نہیں رکھتا تو تین دن کے روزے رکھے جائیں۔ یہ تین روزے اکٹھے بھی رکھے جا سکتے ہیں اور انہیں متفرق طور پر بھی رکھا جا سکتا ہے۔ آیت کریمہ میں اس کی گنجائش موجود ہے۔ واللہ اعلم!

ایک روایت کی تحقیق

] خطباء حضرات رسول اللہ e کی جانشینی کے سلسلہ میں ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میرے بعد آنے والے خلفاء پر رحم فرمائے، جو میری احادیث کو بیان کرتے ہیں۔ اس روایت کی تحقیق مقصود ہے، وضاحت فرما دیں۔

[احادیث کو سننا، انہیں یاد کرنا، پھر انہیں آگے بیان کرنا اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے جو اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے، بلاشبہ رسول اللہ e نے ایسے سعادت مند حضرات کے لیے خوش وخرم رہنے کی دعا فرمائی ہے۔

آپ e کا فرمان ہے: ''اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ اور شاداب رکھے جس نے ہم سے کوئی حدیث سنی پھر اسے یاد کیا حتی کہ اسے آگے بیان کر دیا۔'' 2

اس سلسلہ میں اور بھی بہت سی احادیث کتب حدیث میں مروی ہیں، لیکن سوال میں ذکر کردہ حدیث صحیح نہیں، کیوں کہ وہ محدثین کے قائم کردہ صحت کے اصولوں پر پوری نہیں اترتی۔ مذکورہ روایت سیدنا علی t سے مروی ہے کہ رسول اللہ e نے

! المائدہ: ۸۹.

@ ابو داؤد، العلم: ۳۶۶۰.

فرمایا: ''اے اللہ! میرے بعد آنے والے میرے خلفاء (جانشینوں) پر رحم فرما جو میری سنت کو اور میری احادیث کو بیان کریں گے اور لوگوں کو ان کی تعلیم دیں گے۔'' 1

اس روایت کی سند میں احمد بن عیسیٰ نامی ایک راوی بے بنیاد احادیث بیان کرنے والا ہے۔

چنانچہ امام دارقطنی a نے اسے کذاب کہا ہے۔ 2

قاضی حسن بن عبدالرحمن رامہرمزی نے اپنی کتاب ''الھدی الفاصل'' کا آغاز ہی اس حدیث سے کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں سیدنا علی t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''اے اللہ! میرے خلفاء پر رحم فرما، ہم نے عرض کیا کہ آپ کے خلفاء کون ہیں؟

تو آپ e نے فرمایا: ''جو میری احادیث اور سنت کو بیان کریں گے اور لوگوں کو ان کی تعلیم دیں گے۔'' 3

امام ذہبی a نے احمد بن عیسیٰ کے ترجمہ میں بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے: ''یہ حدیث باطل ہے۔'' 4

حافظ ابن حجر a نے بھی امام ذہبی a کے اس تبصرہ کو برقرار رکھا ہے۔ 5

محدث العصر امام ناصر الدین البانی a نے بھی اس روایت کو باطل اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔ 6

ہمارے خطباء حضرات کو چاہیے کہ احادیث بیان کرتے وقت ان کی صحت وضعف کو ضرور مدنظر رکھیں۔

عشق کے متعلق ایک روایت

] عشق کے متعلق ایک روایت بیان کی جاتی ہے، کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''جسے عشق ہوا مگر وہ پاک دامن رہا، اسے چھپائے رکھا اور مر گیا تو وہ شہادت کی موت مرا۔''......اسے کشتگان عشق بیان کرتے ہیں، اس کی حیثیت بیان کر دیں۔

[اس میں کوئی شک نہیں کہ ''عشق'' ایک عربی لفظ ہے، جس کا معنی محبت کی زیادتی ہے، اس سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ عشق، محبت کی بگڑی ہوئی صورت ہے اور جنون کی قسم ہے۔

اور عشقہ، اس زرد رنگ کی بوٹی کو کہا جاتا ہے جو درخت سے لپٹ جاتی ہے، فرط محبت کی وجہ سے عاشق کو اس بوٹی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہ ایک نامناسب اور نازیبا لفظ ہے جس کا پورے قرآن اور ذخیرہ احادیث میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔

سیدنا یوسف u پر جب عزیز مصر کی بیوی فریفتہ ہوئی تو زنان مصر نے بھی اس کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں کیا، بلکہ قرآن کریم نے اس کے درج ذیل الفاظ ذکر فرمائے ہیں:

﴿قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا﴾ 7

! مجمع الزوائد، ۱، ص۱۲۶.

@ کتاب الضعفاء والمتروکین، ص:۵۳.

المحدث الفاصل: ص۱۶۳.

$ میزان الاعتدال، ج۱، ص۱۲۷.

% لسان المیزان: ج۱، ص۲۴۱.

^ الاحادیث الضعیفہ: ج۲، ص۲۴۷.

& یوسف: ۳۰.

''یوسف u کی محبت اس کی دل کی گہرائی میں اتر چکی ہے۔''

جس روایت کا سوال میں ذکر ہوا ہے وہ خود ساختہ اور موضوع ہے، اس کے متعلق دو روایات ہیں، دونوں ہی بناوٹی ہیں۔محدثین کرام نے اس کے متعلق تصریح کی ہے، دونوں روایات کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

ا۔ ''جس نے عشق کیا لیکن خود کو پاک دامن رکھا، پھر مر گیا تو وہ شہید ہے۔''

۲۔ ''جس نے عشق کیا اور اسے چھپائے رکھا، مگر وہ پاک دامن رہا اور صبر کیا تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا اور جنت میں داخل کرے گا۔''

یہ دونوں روایات تاریخ بغداد میں ہیں، خطیب بغدادی کی ذکر کردہ ہیں۔ 1

ملا علی قاری نے ان کے خود ساختہ ہونے کی صراحت کی ہے۔ 2

جرح اور تعدیل کے امام یحییٰ بن معین a اس کے راوی سوید بن سعید کے متعلق فرماتے ہیں: ''اگر میرے پاس گھوڑا اور نیزہ ہوتا تو میں اس کے خلاف جہاد کرتا۔'' 3

اللہ تعالیٰ کے ہاں شہادت کی دو اقسام ہیں:

ایک شہادت خاص وہ جو میدان کارزار میں اللہ کے راستہ میں جان دینے سے حاصل ہوتی ہے۔

دوسری شہادت عام ہے جس کی سات انواع حدیث میں بیان ہوئی ہیں۔

چنانچہ امام بخاری a نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ ذکر کیا ہے:

((باب الشهادة سبع سوى القتل))

''اللہ کی راہ میں قتل کے علاوہ بھی سات انواع کی شہادت ہے۔'' 4

پھر آپ نے ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا کہ ''شہید پانچ قسم کے ہیں: طاعون میں مرنے والا، پیٹ کی بیماری سے مرنے والا، غرق ہو کر مرنے والا، دیوار کے نیچے دب کر مرنے والا اور پانچواں جو اللہ کی راہ میں شہید ہو جائے۔'' 5

امام بخاری a نے عنوان میں دوسری روایات کی طرف اشارہ کیا ہے، جن میں قتل فی سبیل اللہ کے علاوہ دیگر شہادات کو بیان کیا گیا ہے، وہ حسب ذیل ہیں: ''جل کر مرنے والا، نمونیہ کی بیماری میں مرنے والا، حالت حمل میں مرنے والی عورت۔'' 6

مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت اس سمندر کی طرح ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔

چنانچہ مندرجہ بالا کیفیات سے مرنے والا شہادت کی موت حاصل کر لیتا ہے بشرطیکہ وہ اس کیفیت پر راضی ہو اور کوئی

! تاریخ بغداد: ج۵،ص۱۵۶۔ @ الموضوعات:۱۲۳۔

زاد المعاد:ج۲،ص۲۷۷۔ $ بخاری، الجهاد، باب نمبر:۳۰۔

% بخاری، الجهاد؛۲۸۲۹۔ ^ ابن ماجہ، الجهاد:۲۸۰۳۔

حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔لیکن سب سے افضل شہید وہ ہے جو میدان کارزار میں کام آئے، ان انواع شہادت میں کشتہ عشق کو شمار نہیں کیا گیا۔ بہر حال مذکورہ روایت بناوٹی، خود ساختہ اور بے اصل ہے، کسی بھی امام حدیث نے اس حدیث کے صحیح ہونے کی گواہی نہیں دی۔ کہا جاتا ہے کہ عشق اعلیٰ درجہ کی محبت کا نام ہے جس میں کسی اور کی شرکت کو گوارہ نہیں کیا جاتا بلکہ بعض بد باطن اسے ''توحیدی'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ حالانکہ کوئی غیرت مند اس لفظ کو اپنی ماں، بہن، بیٹی کے ساتھ لگانا گوارا نہیں کرتا، ہر انسان کو اپنی ماں سے طبعی محبت ہوتی ہے لیکن کوئی اپنی ماں کا عاشق کہلانا پسند نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ ایسی گندی محبت سے ہمیں محفوظ رکھے۔ آمین!

پھانسی کی سزا

] قتل ناحق ایک سنگین جرم ہے لیکن ہمارے ہاں عدالتی نظام میں اس کی سزا پھانسی دینا ہے، کیا قرآن وحدیث کی روشنی میں قتل ناحق کی سزا پھانسی دینا صحیح ہے؟ قرون اولیٰ میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے تو اس کی نشاندہی کریں۔

[واقعی قتل ناحق بہت گھناؤنا جرم ہے اور اس جرم کا مرتکب قابل رحم نہیں۔ اگر کسی کا قاتل ہونا ثابت ہو جائے تو سزا کے طور پر قصاص واجب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى﴾ 1

''اے ایمان والو! قتل کے مقدمات میں تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے۔''

قصاص کا مطلب ہے کہ جان کے بدلے جان لینا، لیکن اس امت پر قصاص کے سلسلہ میں کچھ تخفیف کی گئی ہے۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ﴾ 2

''پھر قاتل کو اس کا بھائی قصاص معاف کر دے تو معروف طریقہ سے خون بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے اور قاتل بہتر طریقہ سے یہ رقم مقتول کے ورثاء کو ادا کر دے۔ یہ دیت کی ادائیگی تمہارے پروردگار کی طرف سے رخصت اور اس کی رحمت ہے۔''

دراصل یہود پر اللہ تعالیٰ نے قصاص فرض کیا تھا اور ان میں عفو کا قانون نہیں تھا اور نصاریٰ کو صرف عفو کا حکم تھا، ان میں قصاص نہیں تھا۔ اس امت پر اللہ تعالیٰ نے آسانی اور مہربانی فرمائی کہ دونوں باتوں کی اجازت دی۔

چنانچہ رسول اللہ e نے فرمایا کہ ''مقتول کے ورثاء کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے، خواہ وہ خون بہا لے لیں یا قصاص کے مطابق قتل کر دیں۔'' 3

! البقرہ:۱۷۸۔ @ البقرہ: ۱۷۸۔ # بخاری، الدیات: ۶۸۸۰۔

رسول اللہ e قصاص کے بجائے عفو کو زیادہ پسند کرتے تھے، آپ خود بھی معاف کرتے اور اپنے صحابہ کرام y کو بھی معاف کر دینے کی تلقین کرتے تھے۔ قبل ازیں ذکر کردہ آیت کریمہ میں بھی مقتول کے وارث کو قاتل کا بھائی کہہ کر نہایت لطیف طریقہ سے اس سے نرمی اختیار کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ یعنی وہ قصاص معاف کر کے دیت لے لے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام میں قتل تک کا مقدمہ بھی قابل راضی نامہ ہے۔ بہرحال اسلام میں قاتل کے لیے تین صورتوں میں سے ایک کا سامنا کرنا پڑے گا:

☆ مقتول کے ورثاء قصاص لینے پر اصرار کریں، تو اسے جان دینا پڑے گی۔

☆ قصاص معاف کر دیں اور دیت لینا پسند کریں، اس صورت میں خون بہا دینا ہوگا۔

☆ قصاص اور دیت دونوں معاف کر دیں، یہ سب کچھ ورثاء کی صوابدید پر موقوف ہے۔

ہماری معلومات کی حد تک رسول اللہ e کی زندگی میں قتل کے صرف دو مقامات پیش ہوئے تھے:

☆ ایک آدمی قتل ہو گیا تو رسول اللہ e نے قاتل کو مقتول کے وارث کے حوالے کر دیا، قاتل کہنے لگا، یا رسول اللہ! اللہ کی قسم میرا قتل کرنے کا ارادہ نہ تھا، رسول اللہ e نے مقتول کے وارث سے فرمایا: ''اگر یہ سچا ہوا اور تو نے اسے قتل کر دیا تو تجھے دوزخ میں جانا ہوگا۔'' یہ سن کر مقتول کے وارث نے قاتل کو چھوڑ دیا۔'' 1

☆ مدینہ طیبہ میں ایک لڑکی چاندی کے زیورات پہن کر باہر نکلی تو ایک یہودی نے اس سے چھیننے کے لیے اس کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل دیا، پھر وہ پکڑا گیا اور اعتراف جرم کرنے کے بعد اس کا سر بھی دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل دیا گیا۔ 2

قصاص کے سلسلہ میں رسول اللہ e کی واضح ہدایت ہے، رسول اللہ e نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کر دیا ہے، لہٰذا جب تم قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور جب تم ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو۔'' 3

قاتل سے قصاص کا مطلب اس کی روح کو نکالنا ہے، اس حدیث کے پیش نظر کسی بھی اچھے اور مہذب طریقے سے روح کو نکال دیا جائے گا۔

سعودی عرب میں سزائے موت کا نفاذ تلوار کے ذریعے ہوتا ہے، تلوار سے قاتل کا سر قلم کر دیا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں بھی اس کے لیے مہذب طریقہ رائج ہے۔ امریکہ میں زہریلے ٹیکے کے ذریعے سزائے موت دی جاتی ہے جبکہ برطانیہ میں بجلی کے کرنٹ کے ذریعے اس کا نفاذ کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں پھانسی کا طریقہ انتہائی جاہلانہ اور سفاکانہ ہے، اس پر مستزاد یہ ہے کہ قاتل کو کئی سالوں تک جیل میں قید کی سزا دی جاتی ہے جو انتہائی تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتی ہے، یہ سزا بھی قصاص پر

! ترمذی، الدیات:۱۴۰۷.   @ بخاری، الدیات:۶۸۷۷.

مسلم، الصید والذبائح:۵۰۵۵.

زیادتی اور ظلم ہے۔ سولی پر اسے قیاس نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ سولی میں اس کی کوئی مشابہت نہیں جس کی ہم آئندہ کبھی وضاحت کریں گے۔ ان شاء اللہ!

بیوی کا الگ اکاؤنٹ

] میں گرلز کالج میں پڑھاتی ہوں، کیا میرے لیے ضروری ہے کہ میں اپنی تنخواہ اپنے خاوند کے اکاؤنٹ میں رکھوں؟ اگر میں اپنی آمدنی کے لیے بنک میں اپنا الگ اکاؤنٹ کھلواتی ہوں تو ایسا کرنا شرعی طور پر جائز ہے؟ اس سلسلہ میں میری رہنمائی کریں۔

[اس سلسلہ میں ہم بطور تمہید گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے گھریلو اخراجات کا ذمہ دار خاوند کو ٹھہرایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾ 1

’’مرد حضرات، عورتوں پر نگران اور ذمہ دار ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر برتری دی ہے۔ نیز وہ اپنے مال سے خرچ کرتے ہیں۔‘‘

اس آیت سے معلوم ہوا کہ گھر کے جملہ اخراجات برداشت کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے، ایسی صورت حال کے پیش نظر عورت کو ملازمت یا معاشی طور پر خود کفیل ہونے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ بلکہ اسے گھر میں رہتے ہوئے اپنے بچوں کی تربیت پر توجہ دینا چاہیے۔

ایک دوسری حقیقت کی طرف بھی ہم اشارہ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ نکاح کے بعد سب سے اہم امر یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان جو رشتہ قائم ہوا ہے اسے مضبوط سے مضبوط تر کرنے کی کوشش کی جائے، اس کے لیے ہر وہ کام کر لینا چاہیے جو اس تعلق کی پختگی کا باعث ہو اور ہر اس کام کو قربان کر دیا جائے جو اس تعلق کی خرابی کا باعث ہو۔ اس سلسلہ میں اگر میاں بیوی میں سے کسی کو اپنے مفادات یا حقوق کی قربانی دینا پڑے تو اس سے دریغ نہ کیا جائے۔

اس تمہیدی گفتگو کے بعد ہم اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو دور جاہلیت کے مختلف ظلم وستم سے نکال کر اسے حقوق ملکیت سے نوازا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ﴾ 2

’’مردوں کے لیے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا، اسی طرح عورتوں کے لیے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا۔‘‘

اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کو جو مال وراثت سے ملتا ہے یا اسے کوئی چیز ہبہ کی جاتی ہے یا وہ اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کماتی ہے وہ اس کی مالک ہے اور وہ اس میں تصرف کرنے کا پورا حق رکھتی ہے۔ وہ اپنی دولت اپنے خاص اکاؤنٹ میں رکھ

! النساء: ۳۴.   @ النساء: ۳۲.

سکتی ہے۔ خاوند کو شرعی طور پر کوئی حق نہیں کہ وہ اس کے مال پر زبردستی قبضہ کر لے یا وہ مشترکہ اکاؤنٹ میں رکھنے پر مجبور کرے۔ البتہ عورت کے اخلاق کریمانہ سے امید کرنا چاہیے کہ وہ اپنے غریب خاوند کے ساتھ دست تعاون بڑھائے اور گھر کے اخراجات میں اپنا حصہ ڈالے، اس سے گھر کا نظام بھی خوش اسلوبی سے چلے گا اور باہمی تعلقات بھی مضبوط ہوں گے، پھر بچوں پر بھی اس کا خوشگوار اثر ہوگا۔ واللہ اعلم!

ہر خواب قابل تعبیر نہیں ہوتا

] میں نے خواب دیکھا کہ مجھے دو آدمی اس طرح نچوڑ رہے ہیں جس طرح گیلے کپڑے کو نچوڑا جاتا ہے اور مجھ سے خون ٹپکتا ہے، جب میں نے یہ خواب دیکھا تو مارے ڈر کے میری آنکھ کھل گی، میں بہت پریشان ہوں، اس خواب کی کیا تعبیر ہے؟

[قارئین کرام! ہم اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا یہ کالم خوابوں کی تعبیر کے لیے نہیں اور نہ ہی ہمیں اس سلسلہ میں کوئی تجربہ ہے۔ خوابوں کی تعبیر مستقل ایک فن ہے، جس کے لیے بہت محنت اور مطالعہ کی ضرورت ہے۔ جبکہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں بلکہ ہم نے یہ کالم صرف دینی رہنمائی کے لیے شروع کیا ہے، اس لیے دینی رہنمائی کے لیے ہم سے رابطہ کیا جائے۔

اس وضاحت کے بعد گزارش ہے کہ خواب سے ہر انسان کو واسطہ پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خوشخبری اور بشارت دینے کے لیے خوابوں کا سلسلہ جاری فرمایا ہے۔ بعض اوقات کہ خواب تنبیہ اور خبردار کرنے کے لیے بھی آتے ہیں تاکہ انسان آئندہ آنے والی آزمائش میں پورا اترنے کے لیے خود کو تیار کرے۔ بعض خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی اور وہ شیطان کے طرف سے محض ڈرانے اور پریشان کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ بسا اوقات خوابوں کے آنے میں انسان کے مزاج کا بھی دخل ہوتا ہے۔ انسان، چار اخلاط سے مرکب ہے، یعنی خون، بلغم، صفراء اور سوداء میں سے کسی کا غلبہ ہو جائے تو مختلف خوابوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، ایسے خوابوں کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔

رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے کہ خواب تین طرح کے ہوتے ہیں:

☆ اچھے خواب، اللہ کی طرف سے خوشخبری اور بشارت کے حامل ہوتے ہیں۔

☆ شیطانی خواب، جو انسان کی پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔

☆ خیالات کا عکس وہی خواب میں نظر آجاتا ہے۔ 1

خواب کی آخری دو اقسام قابل تعبیر نہیں ہیں، انسان کو خواہ مخواہ اس قسم کے خواب دیکھ کر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے رجحان کے مطابق سوال میں بیان کردہ خواب شیطانی ہے جیسا کہ رسول اللہ e سے ایک شخص نے عرض کیا، میں نے

! مسلم، الرویا: ۲۲۶۳.

خواب دیکھا کہ میرا سر کچل دیا گیا ہے اور میں اس کے پیچھے بھاگ رہا ہوں، رسول اللہ e نے یہ خواب سن کر فرمایا: ’’خواب میں اپنے ساتھ شیطان کے کھیلنے کی کسی کو خبر نہ دے۔‘‘ 1

اس طرح کا پریشان کن خواب دیکھنے والے کو درج ذیل کام کرنے چاہئیں۔

۱۔ تین دفعہ بائیں طرف تھوتھو کرے اور اس قسم کے خواب سے اللہ کی پناہ مانگے۔

۲۔ جس پہلو پر لیٹا ہے وہ پہلو بدل لیا جائے۔

۳۔ اگر ممکن ہو تو اس وقت وضو کر کے نماز شروع کر دے۔ نیز انسان کو چاہیے کہ سوتے وقت وضو کر کے آخری تین سورتیں پڑھ کر خود پر دم کر کے سوئے، امید ہے کہ ایسا کرنے سے برے خواب نہیں آئیں گے۔ (واللہ اعلم)

لے پالک بیٹے کی نسبت

] میرے ایک دوست کی شادی کافی عرصہ سے ہوئی ہے، اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اپنے سالے کا بیٹا بوقت پیدائش ہی لے لیا اور اس بچے کی ولدیت کی جگہ اپنا نام لکھوا دیا۔ گزشتہ سال اس بیٹے کی شادی کی تو اصل ولدیت کے بجائے اپنا نام ہی لکھوایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں وہی بیٹا اس دوست کی جائیداد کا وارث قرار پائے گا، کیا شریعت متبنیٰ بیٹے کو حقیقی بیٹا ظاہر کرنے کی اجازت دیتی ہے؟

[دین اسلام میں قدرتی طور پر جو رشتہ اور نسب قائم ہوتا ہے اس کی بہت اہمیت ہے، اس کے مقابلہ میں مصنوعی اور بناوٹی رشتوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ دور جاہلیت میں لے پالک بیٹوں کو حقیقی بیٹا خیال کیا جاتا تھا، ابتدائے اسلام میں یہی طریقہ رائج تھا۔ چنانچہ رسول اللہ e نے حضرت زید بن حارثہ t کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا اور لوگ انہیں زید بن حارثہ کے بجائے زید بن محمد کہہ کر پکارتے تھے، قرآن کریم نے اس امر کی اصلاح کرتے ہوئے درج ذیل آیت نازل فرمائی:

﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ مَوَالِیْكُمْ ؕ﴾ 2

’’لے پالکوں کو ان کے حقیقی باپوں کی طرف نسبت کر کے بلاؤ، اللہ کے نزدیک پورا انصاف یہی ہے۔ اگر تمہیں ان کے حقیقی باپوں کا علم ہی نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور دوست ہیں۔‘‘

اس آیت کا واضح مطلب یہ ہے کہ کسی بھی لے پالک بیٹے کو حقیقی بیٹے کا مقام دینا اور حقیقی بیٹا ظاہر کرنا شرعاً جائز نہیں، بلکہ اسے اپنے اصلی باپ کی طرف منسوب کرنا چاہیے۔

صورت مسئولہ میں سائل کے دوست نے غلط کام کیا ہے کہ اپنے سالے کے بیٹے کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور اس کی ولدیت کی جگہ اپنا نام لکھوایا ہے پھر شادی کے موقع پر بھی ایسا کرنا انتہائی محل نظر ہے۔ شریعت میں اگر کوئی اپنے اصل باپ کو چھوڑ کر کسی بھی دوسرے کی طرف خود کو منسوب کرتا ہے، تو اس پر بہت سخت وعید ہے۔

! مسلم، الرویاء:۲۲۶۸۔ @ الاحزاب:۵۔

جیسا کہ حضرت ابن عباس w سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کی طرف نسبت کرے، اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔'' 1

بلکہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور ابوبکرہ t سے روایت ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''جو شخص جان بوجھ کر اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف اپنی نسبت کرتا ہے اس پر جنت حرام ہے۔'' 2

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایسا شخص جنت کی خوشبو سے بھی محروم کر دیا جائے گا حالانکہ اس کی خوشبو پانچ سو میل کے فاصلے سے محسوس ہوتی ہے۔ 3

لہٰذا لے پالک اور اسے بیٹا بنانے والے کو اپنے موقف پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ (واللہ اعلم)

نا تمام بچے کا نام رکھنا

] اگر حمل کی مدت مکمل ہونے سے قبل بچہ ضائع ہو جائے تو کیا ایسے نا تمام بچے کا نام رکھنا چاہیے؟ نیز اس طرح کے بچے، قبرستان میں دفن کیا جائے یا گھر میں ہی اسے دفنا دیا جائے؟ کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا ہدایات ملتی ہیں؟

[احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ حمل کی مدت جب چار ماہ ہوتی ہے تو اس میں روح پھونکی جاتی ہے، اس کے بعد اگر مدت مکمل ہونے سے پہلے حمل ساقط ہو جائے تو اسے نا تمام بچہ کہا جاتا ہے۔ شریعت میں ایسے بچے کے متعلق احکام بیان ہوئے ہیں کہ ایسے بچے کا جنازہ پڑھا جا سکتا ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے: ''نا تمام بچے کی نماز جنازہ پڑھی جائے اور اس کے والدین کے لیے مغفرت اور رحمت کی دعا کی جائے۔ 4

ایسے بچے کو قبرستان میں ہی دفن کیا جائے گا، گھر یا کسی دوسری جگہ دفن کرنے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ کتاب وسنت کے مطابق مردوں کو قبرستان میں دفن کرنا ہی مشروع ہے۔ عوام الناس میں یہ بات مشہور ہے کہ نا تمام مردہ بچے کا نام بھی رکھنا چاہیے تاکہ قیامت کے دن اس کی نشاندہی ہو سکے، یہ محض دین خواتین کا حصہ ہے، کتاب وسنت میں ہمیں ایسے نا تمام بچے کا نام رکھنے کے متعلق کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔ لہٰذا ایسے بچے کا نام رکھنا درست نہیں اور جن روایات میں اس کا نام رکھنے کی صراحت ہے وہ خود ساختہ اور نا قابل اعتبار ہیں۔

جیسا کہ محدث العصر علامہ البانی a نے ایسی روایات کی نشاندہی کی ہے۔ ان میں سے ایک حسب ذیل ہے: ''اپنے نا تمام مردہ بچوں کا نام رکھا کرو کیوں کہ وہ قیامت کے دن تمہارے لیے اجر وثواب کا باعث ہیں۔ 5

! ابن ماجہ، الحدود:۲۶۰۹۔ @ بخاری، المغازی:۴۳۲۷۔

مسند امام احمد، ص۱۹۴،ج۲۔ $ ابوداؤد، الجنائز:۳۱۸۰۔

% سلسلہ الاحادیث الضعیفہ، رقم:۲۰۰۶۔

علامہ البانی a نے اسے معجم ابن عساکر کے حوالے سے بیان کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ اس روایت میں ایک بختری بن عبید راوی متہم بالکذب اور وضاع راوی ہے۔ لہٰذا یہ روایت خود ساختہ اور من گھڑت ہے۔ 1

اس سلسلہ میں حضرت عائشہ r سے مروی ایک روایت بھی بیان کی جاتی ہے، وہ فرماتی ہیں:

''رسول اللہ e سے میرا ایک حمل ضائع ہو گیا تو آپ نے اس نا تمام بچے کا نام عبداللہ رکھا اور میری کنیت اسی وجہ سے ام عبداللہ رکھی گئی۔''

یہ روایت بھی موضوع ہے چنانچہ ابن جوزی a لکھتے ہیں کہ ''یہ حدیث من گھڑت ہے۔'' 2

ہمارے رجحان کے مطابق نا تمام مردہ بچوں کا نام رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، نیز انہیں قبرستان میں ہی دفن کرنا چاہیے۔

گناہ دیکھ کر خاموش رہنا

] میں کالج میں زیر تعلیم ہوں، بعض دفعہ میری ہم جماعت کسی دوسری لڑکی کی غیبت میں مصروف ہوتی ہیں، میں مارے شرم کے ان کو کچھ نہیں کہہ سکتی اور ان سے علیحدہ بھی نہیں ہو سکتی، جبکہ میری خواہش ہوتی ہے کہ انہیں ایسے کام سے باز رہنا چاہیے، ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟

[اللہ کی نافرمانی اور گناہ کا کام دیکھ کر خاموش رہنے کی بجائے معصیت اور نافرمانی کرنے والوں کو اس کے انجام بد سے آگاہ کرنا چاہیے اور انہیں سمجھانا چاہیے اگر وہ باز آجائیں، تو ٹھیک، بصورت دیگر انہیں چھوڑ کر ان سے الگ ہو جانا چاہیے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ﴾ 3

''اور جب آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیات میں کجی اور عیب جوئی کرتے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جائیں تا آنکہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں۔''

ایک دوسری آیت میں ہے:

﴿اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ یُكْفَرُ بِهَا وَ یُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖۤ ؗۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ﴾ 4

''جب تم کسی اہل مجلس کو دیکھو جو اللہ کی آیات کا کفر کرتے اور مذاق اڑاتے ہیں تو اس مجلس میں مت بیٹھو تا آنکہ وہ اس کے علاوہ دوسری باتیں نہ کرنے لگیں بصورت دیگر تم انہی جیسے ہو گے۔''

آج کل اپر طبقہ، فیشن ایبل اور مغرب زدہ خواتین میں بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے، شادی بیاہ اور سالگرہ کے موقع پر بھی اس

! سلسلة الاحاديث الضعيفه، ج۵، ص۱۹. @ الموضوعات، ج۲، ص۹.

الانعام:۶۸. $ النساء:۱۴۰.

طرح کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں، کہ وہاں رسول اللہ e کے احکامات اور معمولات کا مذاق اڑایا جاتا ہے اگر دل میں ایمان کی رمق باقی ہو تو قرآن کریم کی موجودہ وعید سے انسان کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے:

’’تم میں سے جو شخص بھی برائی کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روک دے، اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی شناعت بیان کردے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اسے دل سے برا خیال کرے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔‘‘ 1

رسول اللہ e نے یہ بھی فرمایا:

’’جس قوم میں گناہ کیے جا رہے ہوں پھر وہ انہیں روکنے کی قدرت رکھنے کے باوجود بھی انہیں منع نہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب میں مبتلا کردے گا۔‘‘ 2

اللہ تعالیٰ ان احکام پر عمل کی توفیق دے۔

خوبصورتی کے لیے ابرو کے بال اتارنا

] کیا عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے ابرو کے بال اتار دے جو اس کی بدصورتی کا باعث ہوں؟

[ایسا کرنا حرام اور ناجائز ہے بلکہ کبیرہ گناہ ہے۔ اس عمل پر رسول اللہ e نے لعنت فرمائی ہے۔

جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود t نے اس امر کی صراحت کی ہے۔ 3

البتہ کچھ بال غیر معتاد ہوتے ہیں، ایسے بال جو جسم کے ان حصوں پر اگ آئیں جہاں عام طور پر بال نہیں اگتے۔ مثلاً عورتوں کی مونچھیں اگ آئیں یا ان کے رخساروں پر بال آجائیں تو ایسے بالوں کو اتارنے میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ یہ خلاف عادت ہیں اور چہرے کے لیے بدنمائی کا باعث ہیں۔ جہاں تک ابرو کا تعلق ہے تو ان کا باریک یا پتلا ہونا یا گھنا ہونا یہ سب کچھ امر معتاد ہے اور ایسے بالوں سے تعرض کرنے کی شرعاً اجازت نہیں۔ یہ ایسا عیب نہیں کہ انسان کو اس کے ازالے کی ضرورت پیش آئے، ہاں اگر بال اس قدر بڑھ جائیں جو آنکھوں میں تکلیف کا باعث ہوں تو انہیں کاٹا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم!

مانع حیض ادویات کا استعمال

] فریضہ حج کی آمد آمد ہے، اس کے متعلق خواتین کو ایک مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کہ وطن واپسی کی سیٹ کنفرم ہوتی ہے، وہ اکیلی سفر بھی نہیں کرسکتیں، دوسری طرف وہ ایام حج میں عارضہ ایام سے دوچار ہو جاتی ہیں، کیا ایسے حالات میں مانع حیض ادویات کا استعمال شرعاً جائز ہے تاکہ کسی قسم کی مشکلات سے دوچار نہ ہوں؟

! ابو داؤد: ۱۱۴۰۔ @ ابو داؤد: ۴۳۳۸۔
بخاری، اللباس: ۵۹۳۹۔

[بلاشبہ ایام کے متعلق عورتوں کی مشکلات ایک ایسے سمندر کی طرح ہیں جس کا کوئی کنارہ نہ ہو، تاہم اس طرح کی مشکلات روز اول ہی سے خواتین کو آتی رہی ہیں، اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ شریعت میں اس کا حل موجود ہے۔
سیدہ عائشہ r کا بیان ہے کہ ہم حج کے ارادہ سے عازم مکہ ہوئے، جب ہم صرف مقام پر پہنچے تو مجھے ایام آ گئے، رسول اللہ e میرے پاس آئے تو میں شدت افسوس سے رو رہی تھی۔

رسول اللہ e نے فرمایا: ''یہ تو وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بنات آدم پر لکھ دیا ہے۔ تم طواف بیت اللہ کے علاوہ حج کے تمام اعمال ادا کرتی رہو۔'' 1

چنانچہ حضرت عائشہ r نے ایام سے فراغت کے بعد طواف افاضہ کر لیا اور جاتے وقت عمرہ بھی ادا کیا جیسا کہ دیگر احادیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔ 2

اسی طرح روانگی کے موقع پر طواف وداع سے قبل حضرت صفیہ r کو یہ عارضہ پیش آ گیا تو رسول اللہ e نے دریافت فرمایا: ''کیا اس نے طواف افاضہ نہیں کیا؟''

جواب دیا گیا کہ انہوں نے طواف افاضہ تو کر لیا ہے، آپ نے فرمایا کہ ان کے لیے طواف وداع ضروری نہیں، اسے ہمارے ساتھ مدینہ روانہ ہونا چاہیے۔'' 3

یعنی حائضہ عورت سے طواف وداع ساقط ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق خون حیض کا خروج ایک طبعی معاملہ ہے، اسے روکنا کئی ایک جسمانی عوارض کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے اور اس کے منفی اثرات عورت کے لیے انتہائی نقصان دہ ہیں۔ ہمارے علم کے مطابق عورتوں کے دماغی امراض خون حیض کی بندش کی بناء پر ہوتے ہیں، اس لیے خواتین کو چاہیے کہ وہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہیں، صبر و استقامت سے کام لیں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اجر و ثواب سے محروم نہیں کرے گا۔ اگر کبھی ایسی ضرورت سے دوچار ہونا پڑے جہاں مانع حیض ادویات کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو جیسا کہ سوال میں ذکر کیا گیا ہے تو درج ذیل تین شرطوں کے ساتھ انہیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جسمانی طور پر کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو کیوں کہ بلاوجہ اپنے جسم کو عوارض کے حوالے کرنا درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

۲۔ ایسی ادویات کا استعمال خاوند کی اجازت سے کرنا چاہیے کیوں کہ حصول اولاد خاوند کا حق ہے اور اس حق میں رکاوٹ پیدا کرنا شرعاً جائز نہیں۔

۳۔ ان کے استعمال میں شرعی ضرورت کا ہونا ضروری ہے جیسا کہ سوال میں ضرورت شرعی کا ذکر ہے۔

! بخاری، الحیض:۲۹۴۔ @ بخاری، الحیض:۳۱۶۔
بخاری، الحیض:۳۲۸۔

بلا وجہ ان کا استعمال جائز نہیں، یا غیر شرعی ضرورت پیدا کر کے اس کا جواز پیدا کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر a نے مسند سعید بن منصور کے حوالے سے حضرت ابن عمر W کے متعلق لکھا ہے، ان سے پوچھا گیا، جو عورت حیض کو مؤثر کرنے کے لیے کوئی دوا نوش کرے تاکہ وہ اپنے ہم سفر محرم کے ساتھ واپس جا سکے تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ انہوں نے اس کے لیے پیلو کے پتوں کو تجویز کیا، یعنی ان کے پتوں کو رگڑ کر بدرقہ نوش کیا جائے یا انہیں پانی میں جوش دے کر استعمال کیا جائے۔ 1

اسی طرح حنابلہ کے متعلق امام ابن قدامہ a نے لکھا ہے: ''اگر کوئی عورت انقطاع حیض کے لیے دوا نوش کرتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ دوا اس کام کے لیے معروف ہو۔'' 2

ہمارے رجحان کے مطابق زندگی میں دو مقامات پر اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

۱۔ رمضان المبارک میں ایسی ادویات کا استعمال کرنا تاکہ آرام اور سکون سے روزے رکھے جا سکیں لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس کی رخصت دی ہے تو ہمیں خواہ مخواہ ان مضر صحت ادویات کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی خاتون شوق عبادت سے سرشار ہو کر ایسا کرتی ہے تو اس کے روزے صحیح ہیں اور اس پر طہارت کے احکام لاگو ہوں گے۔

۲۔ حج کے دوران مانع حیض گولیوں کا استعمال کرنا تاکہ اطمینان کے ساتھ مناسک حج ادا کیے جائیں تاہم اس کے متعلق بھی ہماری گزارش ہے کہ جب اس عارضہ کی موجودگی میں مناسک حج ادا کیے جا سکتے ہیں، مثلاً منیٰ میں جانا، میدان عرفات میں ذکر و استغفار کرنا، مزدلفہ میں مناسک حج ادا کرنا پھر منی آ کر جمرات کو کنکریاں مارنا وغیرہ تو اس تکلف میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ طواف افاضہ کا معاملہ ہے، اسے بھی انقطاع حیض تک مؤخر کیا جا سکتا ہے، اگر ایسا ممکن نہ ہو تو سعودی علماء کے فتویٰ کے مطابق لنگوٹ باندھ کر طواف افاضہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ صفا مروہ چونکہ مسجد حرام سے باہر ہے اس لیے دوران حیض سعی کرنے میں چنداں حرج نہیں۔ طواف وداع بھی اس عورت سے ساقط ہے، ہم نے دیانتداری کے ساتھ اپنا موقف لکھ دیا ہے اگر کسی کو دلائل کی وجہ سے اتفاق نہ ہو تو مانع حیض ادویات استعمال کر کے فریضہ حج ادا کیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم!

رحم مادر میں جنین کی جنس کا پتہ چلانا

] آج کل یہ دعویٰ سننے میں آ رہا ہے کہ جدید طبی آلات اور الٹرا ساؤنڈ مشینوں کے ذریعے ماں کے پیٹ میں پرورش پانے والے بچے کی جنس کا پتہ چلایا جاتا ہے کہ وہ نر ہے یا مادہ جبکہ قرآن میں ہے کہ اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ اس دعویٰ کا شافی حوالہ درکار ہے۔

[اس میں شک نہیں کہ رحم مادر میں پرورش پانے والے بچے کی شکل وصورت، نیکی و بد، غنی وفقیر اور اس کے مذکر و

! فتح الباری لابن حجر، ج۲، ص۸۱۔ @ مغنی لا بن قدامہ: ج۱، ص۴۵۰۔

مؤنث ہونے کا اصل علم اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ﴾ 1

''بلاشبہ اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے، وہ بارش اتارتا ہے اور وہ رحم مادر میں جو ہے اسے جانتا ہے، نیز کسی نفس کو معلوم نہیں کہ وہ کل کیا کمائے گا اور نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔''

حدیث میں رسول اللہ e نے آیت میں مذکورہ پانچ چیزوں کو غیب کی چابیاں قرار دیا ہے، جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ 2

مذکورہ آیت وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ غیبی امور کا قطعی اور یقینی علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا ان پر قطعی اور یقینی لحاظ سے مطلع نہیں ہوسکتا۔ جو لوگ اس طرح کے دعوے کرتے ہیں، ان کی حقیقت ظن وتخمین کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

بار ہا ایسا ہوا ہے کہ ان کی اطلاعات حقیقت کے خلاف اور غیر معیاری ثابت ہوتی ہیں، البتہ احادیث میں رحم مادر میں بچے کی شکل وصورت اور اس کے نر و مادہ ہونے کے بارے میں کچھ اسباب بیان ہوئے ہیں کہ رحم مادر میں جس کا مادہ پہلے پہنچ جاتا ہے بچہ اس کی اور اس کے خاندان کی شکل وصورت اختیار کرتا ہے اور پھر جس کا مادہ غالب یا زیادہ ہوتا ہے، اس پر بچے کی جنس کا انحصار ہوتا ہے۔ یہ بات بھی مبنی بر حقیقت ہے کہ رحم مادر میں بچے کی بناوٹ کے بھی کئی ایک مراحل ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

نطفة امشاج: ۴۰ دن تک وہ جما ہوا خون (علقة) ۴۰ دن تک پھر گوشت کا لوتھڑا (مضغہ) ۴۰ دن تک، اس کے بعد فرشتے کے ذریعے اس میں روح پھونک دی جاتی ہے اور نر و مادہ، نیک و بد ہونا اور اس کی موت ورزق کو لکھ دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ درج ذیل حدیث میں اس کی وضاحت ہوئی ہے:

حضرت عبد اللہ بن مسعود t بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''ماں کے پیٹ میں تمہاری خلقت چالیس روز تک نطفہ کی صورت میں جمع کی جاتی ہے۔ پھر وہ اتنے ہی دن جما ہوا خون بن جاتا ہے، اس کے بعد وہ اتنے ہی دن ایک لوتھڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرشتے کو اس کے متعلق چار باتوں کا حکم دیتا ہے کہ اس کا عمل وکردار، اس کا رزق، اس کی مقررہ مدت اور نیک و بد ہونا لکھ دے۔ اس کے بعد اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔'' 3

یہ سب واضح رہے کہ عربی قواعد کے لحاظ سے ''یعلم ما فی الارحام'' کا تعلق رحم مادر میں جنین کے متعلق روح

! لقمان: ۳۴.   @ بخاری، التفسیر: ۴۶۲۷.

بخاری، بداء الخلق: ۳۲۰۸.

پھونکے جانے سے قبل کا ہے، کیوں کہ ''ما'' غیر جاندار کے لیے آتا ہے اور جب اس میں روح پھونک دی جاتی ہے تو وہ ''ما'' کی حدود سے نکل جاتا ہے۔ جب تک جنین ''ما'' کی حدود میں رہتا ہے کوئی بھی ڈاکٹر جدید طبی آلات سے اس کے نر یا مادہ ہونے کا سراغ نہیں لگا سکتا، جب اس میں روح پھونک دی جاتی ہے تو اس کے نر یا مادہ ہونے کا علم تعینات شدہ فرشتے کو بھی ہو جاتا ہے۔ اس مرحلے میں ڈاکٹر حضرات بھی قسمت آزمائی شروع کر دیتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ اس کے کالے گورے، اچھے برے، اس کے رزق اور اس کی موت کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کی لیاقت واستعداد اور دماغی قوتوں کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔

یہ چیزیں اور اس کے علاوہ اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

آخر میں ہم اس امر کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ اگر حاملہ عورت کے رحم میں پرورش پانے والا بچہ کسی مرض میں مبتلا ہے یا اس کی افزائش اور پرورش صحیح نہ ہو رہی ہو تو جدید طبی آلات سے مدد لے کر اس پر کنٹرول کرنا جائز اور مشروع ہے۔ کیوں کہ بیماریوں کے علاج کی شریعت نے ترغیب دی ہے لیکن حمل کے متعلق دلچسپی رکھنا کہ وہ لڑکا یا لڑکی، اس قسم کی معلومات لینے کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانا اور فضول شوق کی خاطر پیسے خرچ کرنا حماقت اور بے وقوفی ہے، اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس کا نقصان بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ جب کسی سرپرست کو پتہ چلتا ہے کہ پیٹ میں پرورش پانے والی لڑکی ہے تو یہ ''افسوسناک'' خبر سن کر رحم کی صفائی کروا دیتے ہیں اور پیٹ میں پرورش پانے والے بچہ کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اخبارات میں ایسی خبریں بھی آتی ہیں کہ ضائع کیا جانے والا حمل لڑکی نہیں بلکہ لڑکا تھا پھر اُن کا غم دیدنی ہوتا ہے۔ لیکن اب وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ بہرحال ہم ڈاکٹر حضرات سے بھی گزارش کرتے ہیں کہ وہ دنیاوی مفاد اور چند ٹکے بٹورنے کے لیے اس قسم کے شوق فضول کی حوصلہ افزائی نہ کریں اور حمل کو ضائع کرنے کے جرم میں شریک ہونے سے اجتناب کریں۔ اگر کوئی رحم مادر میں پرورش پانے والا بچہ واقعی کسی مرض میں مبتلا ہے تو جدید آلات کے ذریعے اس مرض کی تشخیص کریں اور اس کے علاج کی طرف توجہ دیں۔ اس قسم کا تعاون تو کیا جا سکتا ہے لیکن استقرار حمل کے بعد باقاعدہ فائل تیار کرنا اور ہر مہینے اس کی رپورٹ تیار کرنا پھر اس کے نر یا مادہ ہونے کے متعلق اہل خانہ کو مطلع کرتے رہنا، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم!

ناجائز حمل کا اسقاط

] ہمارے معاشرہ میں رسوائی اور بدنامی سے بچنے کے لیے ناجائز حمل کو گرا دیا جاتا ہے، کیا ایسا کرنا قتل ناحق ہے، اور کیا ڈاکٹر اور نرسوں کو اس سلسلہ میں تعاون کرنا چاہیے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

[مغربی ممالک میں زنا کے ارتکاب کے بعد حاملہ ہونے کی صورت میں ناجائز حمل کو ساقط کرا دیا جاتا ہے کیوں کہ زانی مرد اور عورت کو جنسی تلذذ سے سروکار ہوتا ہے، انہیں بچے اور حمل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہمارے اسلامی ممالک میں جنسی جرائم بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ روشن خیالی، مخلوط تعلیم اور جنسی آزادی کی آڑ میں عریانی اور

زنا کاری کی کثرت ہے۔ بدکاری کے نتیجہ میں اگر حمل ٹھہر جائے تو اس کی تلافی کے لیے بہت سی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں، ادویات وغیرہ کے استعمال سے فوراً رحم کی صفائی کر دی جاتی ہے، خاندان کو بدنامی سے بچانے کے لیے لوگ دو طریقے عمل میں لاتے ہیں۔

☆ زانی مرد سے دوران حمل حاملہ کا نکاح کر دیا جاتا ہے تاکہ اس فعل بد پر پردہ پڑ جائے اور دنیا کے سامنے رسوائی نہ ہو۔

☆ زانیہ کے حمل کو ضائع کر دیا جاتا ہے خواہ اس میں روح کیوں نہ پڑ چکی ہو، اس کے لیے ہر حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔

یاد رہے کہ دوران حمل زانیہ کا نکاح حرام ہے تاآنکہ وہ بچہ جنم دے لے، وضع حمل کے بعد اس کا نکاح جائز ہے خواہ زانی سے ہی کر دیا جائے۔

اس طرح اگرچہ زنا کا ارتکاب ایک سنگین جرم ہے لیکن اس سے بڑا گناہ اس کے حمل کو ساقط کرنا اور بچے کو ناحق قتل کرنا ہے۔ محض چند ٹکوں کی خاطر ڈاکٹروں، نرسوں اور دائیوں کو ایسے فعل سے اجتناب کرنا چاہیے۔

بعض اوقات جائز حمل کا اسقاط بھی جائز ہے جبکہ کوئی شرعی عذر ہو۔ مثلاً:

☆ عورت کا حمل اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو۔

☆ عورت، وضع حمل کی سکت نہ رکھتی ہو۔

☆ عورت کا حمل اور اس کا وضع بچے کے لیے مہلک ہو۔

شرعی عذر کے بغیر رحم مادر میں جب حمل کا استقرار ہو جائے تو اسے ساقط کرنا جائز نہیں۔ اگرچہ کچھ علماء نے نفخ روح سے قبل اسقاط کو جائز قرار دیا ہے وہ اسے عزل کی طرح قرار دیتے ہیں لیکن صاحب بصیرت فقہاء اس صورت میں بھی اسقاط حمل کی اجازت نہیں دیتے کیوں کہ اس صورت میں بچے کی پیدائش کی بنیاد پڑ چکی ہے، جیسا کہ حرم میں جہاں پرندوں کا شکار کرنا منع ہے، اسی طرح ان کے انڈوں کو تلف کرنا بھی ناجائز ہے۔

بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق حمل کے کسی بھی مرحلہ میں اسقاط یا تلف کی رخصت نہیں اور محتاط پہلو یہی ہے کہ حمل ٹھہرنے کے بعد اسے بلاعذر شرعی ضائع کرنے سے اجتناب کیا جائے۔ البتہ نفخ روح کے بعد تو بالاتفاق اسقاط حمل ناجائز اور حرام ہے کیوں کہ اس حالت میں جنین زندہ نفس کی صورت اختیار کر چکا ہوتا ہے اور کسی بھی زندہ جان کو ناحق قتل کرنا حرام ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اور ایسی جان کو ناحق قتل نہ کرو جسے مارنا اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔“ 1

ایک حدیث سات ہلاکت خیز گناہوں کا ذکر ہے جس میں سے ایک ناحق قتل بھی ہے۔ 2

ایک حدیث میں اس کی مزید وضاحت ہے کہ حضرت ماعز بن مالک t کو جب رجم کیا گیا تو غامدی قبیلہ کی ایک عورت

! الانعام:۱۰۱.   @ بخاری، الحدود:۲۷۶۶.

رسول اللہ e کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا، یا رسول اللہ! میں نے زنا کیا ہے، مجھے پاک کر دیجئے۔ رسول اللہ e نے اسے واپس بھیج دیا پھر وہ اگلے دن آئی اور عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے مجھے واپس کیوں بھیجا ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ مجھے یوں ٹال رہے ہیں جیسے آپ نے ماعز بن مالک t کو ٹالا تھا حالانکہ میں زنا کی وجہ سے حاملہ ہوں، آپ نے فرمایا کہ اب تو چلی جا، جب تو بچہ جنم دے لے تو پھر آنا، جب اس نے بچہ جنم دیا اور وہ روٹی وغیرہ کھانے لگا تو پھر آئی اور آپ سے عرض کیا کہ آپ مجھے پاک کر دیں، پھر آپ نے وہ بچہ ایک مسلمان کے حوالے کر کے اسے رجم کر دینے کا حکم دیا۔ 1

رسول اللہ e نے ناجائز بچے کی وجہ سے اس عورت کو رجم نہیں کیا تا آنکہ اس نے جنم نہیں دے دیا، اس کا مطلب یہ ہے حمل خواہ ناجائز ہی کیوں نہ ہو اسے تلف کرنا کسی صورت میں جائز نہیں۔ ہمیں اس قتل ناحق سے گریز کرنا چاہیے، کل ہم نے اللہ کے حضور پیش ہونا ہے وہاں اس قتل ناحق کے لیے کیا عذر پیش کیا جائے گا، اس حوالے سے ہم ڈاکٹر حضرات سے عرض کرتے ہیں کہ وہ روپے پیسے کی خاطر اس قبیح فعل سے اجتناب کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا و آخرت میں اپنے غضب سے محفوظ رکھے اور ہمارے ساتھ اپنی رافت و رحمت کا معاملہ کرے۔

پراندے کی شرعی حیثیت

] عورتیں عام طور پر بالوں کی حفاظت اور پراگندگی سے بچانے کے لیے پراندہ استعمال کرتی ہیں جبکہ کچھ علماء کا موقف ہے کہ پراندہ کا استعمال شرعی طور پر درست نہیں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

[ہمارے ہاں مشرقی خواتین کے ہاں پراندے کے استعمال کا رواج ہے جو آج کل روشن خیالی کے پیش نظر متروک ہوتا جا رہا ہے، عام طور پر پراندہ استعمال کرنے کے تین مقاصد حسب ذیل ہیں:

☆ بال گھنے اور لمبے نظر آئیں، اسی لیے سیاہ دھاگوں کا پراندہ استعمال کیا جاتا ہے۔ شرعی طور پر اس مقصد کے پیش نظر سیاہ رنگ کا پراندہ ناجائز ہے، رسول اللہ e نے اس عمل کو دھوکہ دہی اور باعث لعنت قرار دیا ہے۔ 2

کچھ اہل علم تو مطلق طور پر پراندے کے استعمال کو ممنوع قرار دیتے ہیں، خواہ وہ کسی رنگ کا ہو، کیوں کہ رسول اللہ e نے کسی بھی چیز کو بالوں کے ساتھ ملانے سے منع فرمایا ہے۔

چنانچہ سیدنا جابر t بیان فرماتے ہیں: ''رسول اللہ e نے اس بات پر ڈانٹا ہے کہ عورت اپنے بالوں کے ساتھ کوئی چیز ملائے۔'' 3

ہمارے رجحان کے مطابق پراندے کو مطلق طور پر ناجائز کہنا خواہ وہ کسی رنگ کا ہو محل نظر ہے، کیوں کہ حدیث کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ e نے بالوں کے ساتھ بال ملانے سے منع فرمایا اور اسے دھوکہ دہی قرار دیا ہے۔ سیاہ

! صحیح مسلم، الحدود:۱۶۹۵۔ @ صحیح مسلم، اللباس:۲۱۲۷۔
مسلم، اللباس:۲۱۲۶۔

پراندہ ہی دھوکہ دہی کا باعث ہوتا ہے اس لیے اس رنگ کا پراندہ منع ہے۔ ہاں اگر عورت کے بال کسی وجہ سے سفید ہو چکے ہیں تو اس کے لیے سفید رنگ کا پراندہ منع ہوگا۔ باقی نیت کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، البتہ دیکھنے والوں کا بھی اعتبار کیا جائے گا۔

☆ بالوں کی حفاظت اور خوبصورتی کے لیے پراندہ استعمال کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ e کا ارشاد گرامی ہے: ''جس نے بال رکھے ہوں تو چاہیے کہ انہیں بنا سنوار کر رکھے۔'' 1

بالوں کی تکریم کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی حفاظت کی جائے، عورتوں کے لیے بالوں کی حفاظت پراندے سے ہوتی ہے، اس لیے اسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ امام ابوداؤد نے حضرت سعید بن جبیر a کے حوالے سے لکھا ہے: ''دھاگوں سے بنی ہوئی چوٹی (پراندہ) کے استعمال میں چنداں حرج نہیں۔'' ...... آگے امام ابوداؤد a خود ہی اس کی وضاحت کرتے ہیں: ''گویا حضرت سعید بن جبیر h کی رائے کے مطابق عورتوں کے لیے بالوں کے ساتھ دوسرے بال جوڑنا ہی منع ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل a کا موقف بھی یہی ہے کہ ''دھاگوں کی چوٹی کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ 2

یہ اقوال اگرچہ ضعیف ہیں تاہم مسئلہ کی تائید کے لیے انہیں پیش کیا جاسکتا ہے۔

☆ بالوں کو قدرتی طور پر لمبا کیا جائے، جیسا کہ کسی بیل کو بڑھنے کے لیے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح بالوں کو قدرتی طور پر لمبا کرنے کے لیے پراندہ ایک سہارے کا کام دیتا ہے۔

چنانچہ خواتین ان بچیوں کے لیے پراندہ استعمال کراتی ہیں جن کے بال چھوٹے ہوتے ہیں اور اس کے استعمال سے بال بڑھ جاتے ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر بھی پراندہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ درج ذیل شرائط کے ساتھ پراندہ استعمال کیا جاسکتا ہے:

☆ جعل سازی اور دھوکہ دہی کے پیش نظر سیاہ پراندہ استعمال نہ کیا جائے۔

☆ اس سے مردوں کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود نہ ہو۔

☆ بالوں کی حفاظت اور خوبصورتی کے لیے اسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

☆ بالوں کو قدرتی طور پر لمبا کرنے کے لیے بھی اس کے استعمال میں چنداں حرج نہیں۔

مسئلہ کی وضاحت کے لیے ہم نے یہ درازنفسی کی ہے وگرنہ آج کل ماڈرن لڑکیاں پراندے کے استعمال کو بار خیال کرتی ہیں، اب تو بالوں کو کاٹ کر چھوٹے کرنا ایک فیشن ہو چکا ہے۔ جن خواتین کے بال لمبے ہوتے ہیں، وہ پراندے کی بجائے ''پونی'' استعمال کرتی ہیں۔ بدقسمتی سے ان کی دیکھا دیکھی کچھ مرد بھی پونی استعمال کرتے ہیں۔ مردوں کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں۔ بہرحال بالوں کو قابو میں رکھنے کے لیے پراندہ لگانا جائز ہے بشرطیکہ وہ بالوں کے رنگ سے مختلف ہو، وہ پراندہ چھوٹا ہو

! ابو داؤد، الترجل: ۴۱۶۳۔ @ ابو داؤد، الترجل: ۴۱۷۱۔

یا بڑا، اس طرح استعمال کرنے میں کوئی جعل سازی یا دھوکہ دہی مقصود نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم!

اثر انگیز اشعار

] میں نے ایک عالم دین سے سنا تھا کہ رسول اللہ e ایک مرتبہ کسی صحابی کے چند شعر سن کر آبدیدہ ہو گئے تھے جو اس نے اپنے بیٹے کے سخت رویے کے پیش نظر کہے تھے۔ وہ کون سے اشعار ہیں اور پورا واقعہ کیا تھا؟

[ایک دفعہ رسول اللہ e کے پاس ایک نوجوان آ کر عرض کرنے لگا، یا رسول اللہ! میرے پاس کچھ مال ہے اور میں خود صاحب اولاد ہوں لیکن میرا باپ میرے تمام مال پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ تو رسول اللہ e نے فرمایا: ''تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہی ہے۔'' 1

سیدنا جابر t سے مروی اس روایت کی کچھ تفصیل بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ e نے نوجوان سے فرمایا: ''جاؤ اپنے والد کو بلا لاؤ۔'' اسی وقت حضرت جبریل u تشریف لائے اور رسول اللہ e سے کہا کہ جب اس کا باپ آجائے تو آپ اس سے وہ اشعار سنیں جو اس نے اپنے دل میں کہے ہیں لیکن خود اس کے کانوں نے بھی ان کو نہیں سنا۔ جب اس کا والد حاضر ہوا تو رسول اللہ e نے فرمایا:

''وہ اشعار سناؤ جنہیں ابھی تک آپ کے کانوں نے بھی نہیں سنا۔''

اس شخص نے حیرت سے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں آپ پر ہمارا یقین اور ایمان بڑھا دیتے ہیں کیوں کہ جو اشعار میں نے اپنے دل میں سوچے ہیں وہ ابھی تک میرے کانوں نے بھی نہیں سنے لیکن آپ کو ان کی اطلاع ہو گئی ہے۔ وہ یہ ہیں:

غَذَوْتُکَ مَوْلُوْدًا وَمُنْتُکَ یَافِعًا
تُعَلُّ بِمَا اَحْنِیْ عَلَیْکَ وَتُنْهَلُ

''میں نے بچپن میں تجھے غذا دی اور جوانی کے بعد بھی تیری ذمہ داری اٹھائی اور تو میری ہی شفقت بھری کمائی سے کھاتا پیتا تھا۔''

اِذَا لَیْلَۃً ضَاقَتْکَ بِالسُّقْمِ لَمْ اَبِتْ
لِسُسْمِکَ اِلَّا سَاهِرًا اَتَمَلْمَلُ

''جب کسی رات تجھے بیماری پیش آتی تو میں تمام رات تیری بیماری کی وجہ سے بیدار اور بے قرار رہتا۔''

کَاَنِّیْ اَنَا الْمَطْرُوْقُ دُوْنَکَ بِالَّذِیْ
طَرَقْتَ بِہٖ دُوْنِیْ فَعَیْنَایَ تُهْمَلُ

! ابن ماجه، التجارات: ۲۲۹۱.

''گویا بیماری تجھے نہیں مجھے لگی ہے، جس کی وجہ سے میری آنکھیں تمام رات بہتی رہتیں۔''

تَخَافُ الرَّدَی نَفْسِیْ عَلَیْکَ وَاِنَّھَا
لَتُعْلَمُ اَنَّ الْمَوْتَ وَقْتٌ مُوَجَّلٌ

''میرا دل تیری ہلاکت سے ڈرتا رہتا، حالانکہ اسے علم ہے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے۔''

فَلَما أَبَلَغْتَ السِنَّ وَالْغَایَۃَ الَّتِیْ
اِلَیْھَا مَدَی مَا فِیْکَ کُنْتُ أُومَّلُ

''پھر جب اس عمر اور حد کو پہنچ گیا جس میں تجھ سے امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔''

جعَلْتَ جَزِائِیْ غِلْظَۃً وَّفظَاظَۃً
کَاَنَّکَ أَنْتَ الْمُنْعِمُ الْمُتَفَضِّلُ

''تو نے ترش روئی اور سخت کلامی سے اس کا بدلہ دیا گویا تو ہی احسان اور انعام کرنے والا ہے۔''

فَلَیْتَکَ اِذْ لَمْ تَرْعَ حَقَّ اَبُوَّتِیْ
فَعَلْتَ کَمَا الْجَارُ الْمُجَاوِرُ یَفْعَلُ

''کاش! اگر تجھ سے باپ ہونے کا حق ادا نہیں ہو سکتا تھا تو کم از کم ایک شریف پڑوسی جیسا ہی سلوک کرتا۔''

رسول اللہ e یہ اشعار سن کر آبدیدہ ہو گئے اور بیٹے کا گریبان پکڑ کر فرمایا: ''جا، تو اور تیرا مال سب تیرے باپ کا ہے۔''1

اشعار پر مشتمل اس واقعہ کے متعلق علامہ ہیثمی a لکھتے ہیں: ''یہ حدیث اس قصے کے ساتھ منکر ہے کیوں کہ اس میں منکدر بن محمد راوی ضعیف ہے۔''2

روایت کا پہلا حصہ جو ہم نے آغاز میں ابن ماجہ کے حوالے سے بیان کیا ہے، وہ صحیح سند سے ثابت ہے اور یہ الفاظ متعدد صحابہ کرام y سے مروی ہے۔

روایت کی صحت سے ہٹ کر ایک غمزدہ باپ کے یہ اشعار واقعی بڑے درد بھرے اور رقت آمیز ہیں۔ ہماری نسل نو اور روشن خیال نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ والدین کے متعلق اپنے رویے پر نظر ثانی کریں۔

سانپوں کے متعلق ہدایات

] ہمارے گاؤں میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا کہ ایک نوجوان گھر میں نمودار ہونے والے سانپ کو مار رہا تھا کہ اچانک بے ہوش ہو گیا اور اس کی پشت اور چہرے پر سیاہ نشانات پڑ گئے، نیز سانپ بھی بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ وہ سانپ ایک جن تھا اور اس کی وجہ سے نوجوان بے ہوش ہوا، سانپوں کے متعلق ہمیں شرعی ہدایات سے آگاہ کریں۔

! دلائل النبوۃ للبیہقی، ج۶، ص۳۰۵۔ @ مجمع الزوائد: ج۴، ص۱۵۵۔

[سانپوں کی دو اقسام ہیں:

ایک تو وہ سانپ ہیں جو گھروں میں رہتے ہیں، انہیں عوامر اور ذوات البیوت کہتے ہیں۔

دوسرے وہ سانپ جو آبادی سے باہر رہتے ہیں۔

آبادی سے باہر رہنے والوں کو مار دینے کا حکم ہے خواہ انسان احرام کی حالت میں ہی کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ e نے ایک محرم کو منیٰ میں برآمد ہونے والے سانپ کو مارنے کا حکم دیا تھا جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود t بیان کرتے ہیں۔ 1

جو سانپ آبادی یا گھروں میں رہتے ہیں، ان میں سے دو اقسام ایسی ہیں جنہیں فوراً مار دینے کا حکم ہے:

☆ دم بریدہ سانپ جسے ''الابتر'' کہا جاتا ہے۔

☆ دو دھاریوں والا سانپ جسے حدیث میں ذوطفتین کہا گیا ہے۔

ان کو مارنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ یہ دونوں سانپ انتہائی زہریلے اور نقصان دہ ہوتے ہیں، ان کی غیر مرئی پھوار سے بینائی ختم ہو جاتی ہے اور عورتوں کے حمل ضائع ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے۔ 2

ان دو قسم کے سانپوں کے علاوہ اگر گھر سے سانپ برآمد ہو تو اس کے متعلق شرعی ہدایات یہ ہیں کہ انہیں تین دن تک وہ گھر چھوڑ دینے کی وارننگ دی جائے اور ان کے رہنے کی جگہ کو تنگ کر کے انہیں گھر سے نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر تین دن تک گھر نہ چھوڑیں تو انہیں مار دیا جائے۔ اس سے قبل انہیں مارنے سے نقصان کا اندیشہ ہے۔ کیوں کہ بعض اوقات جن بھی سانپ کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ گھر میں رہنے والا حقیقی سانپ نہ ہو بلکہ کسی جن نے سانپ کی شکل اختیار کر رکھی ہو۔ اگر تین دن کے دوران نکل جاتے ہیں تو وہ مسلمان جن ہے اور اس نے بات مان کر گھر چھوڑ دیا ہے۔ اگر تین دن وارننگ کے باوجود گھر سے نہیں جاتا تو وہ شیطان اور کافر جن ہے جسے مار دینے کا رسول اللہ e نے حکم دیا ہے۔ 3

اس امر کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ جن، انتہائی لطیف جسم کے مالک ہوتے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت دے رکھی ہے کہ وہ ظاہری اجسام میں سے کسی بھی شکل کو اختیار کر سکتے ہیں، جب وہ نظر آنے والی صورت اختیار کرتے ہیں تو ان کے لیے مناسب ترین شکل وہی ہو سکتی ہے جو نظر آ سکنے کے باوجود پوشیدہ رہتی ہو، سانپ کا جسم اس مقصد کے لیے سب سے مناسب ہے کیوں کہ یہ مخلوق بھی اپنے بلوں میں چھپ کر رہتی ہے۔

سوال میں ذکر کردہ واقعہ سے ملتا جلتا ایک واقعہ دور نبوی e میں رونما ہوا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

''سیدنا ابو سعید خدری t کا بیان ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک نوجوان رہتا تھا جس کی تازہ تازہ شادی ہوئی تھی، جب ہم غزوہ خندق کے موقع پر رسول اللہ e کے ہمراہ خندق کی طرف گئے تو وہ نوجوان دوپہر کے وقت رسول اللہ e سے اجازت

! مسلم، السلام:۵۸۳۷.

@ مسلم، السلام:۵۹۲۶.

مسلم، السلام:۵۸۳۹.

لیتا اور اپنے گھر لوٹ آتا تھا۔ ایک دن اس نے اجازت لی تو آپ e نے فرمایا: ''اپنے ہتھیار لگا کر جاؤ، مجھے تم پر قریظہ کے حملے کا خطرہ ہے۔ اس نوجوان نے اپنے ہتھیار لیے اور گھر روانہ ہوا، جب گھر آیا تو اس کی بیوی دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے نیزے سے اپنے بیوی کو مارنے کی کوشش کی، کیوں کہ اسے غیرت نے آلیا تھا۔ بیوی نے کہا پہلے گھر میں داخل ہو کر تو دیکھو کہ مجھے کس چیز نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے کمرے میں گیا تو وہاں ایک بہت بڑا سانپ تھا جو بستر پر کنڈلی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نیزہ لے کر سانپ کی طرف بڑھا اور سانپ کو اس میں پرو دیا، پھر اس نے گھر کے صحن میں نیزے کو سانپ کے سمیت گاڑ دیا، اس دوران سانپ تڑپ کر اس کے اوپر آ گرا پھر پتہ نہ چلا کہ دونوں میں سے پہلے کون مرا، سانپ یا وہ نوجوان۔'' سیدنا ابوسعید خدری t کہتے ہیں کہ ہم نے جب رسول اللہ e سے اس کا ذکر کیا تو آپ e نے فرمایا: ''مدینہ میں کچھ جن تھے جو اسلام لے آئے تھے جب تم ان کی طرف سے کوئی بات دیکھو تو تین دن تک انہیں خبردار کرو، اگر اس کے بعد بھی وہ نظر آئیں تو انہیں مار دو کیوں کہ وہ اسلام نہ لانے والا شیطان ہے۔'' 1

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نوجوان نے گھر سے نکلنے والے سانپ کو وارننگ دیئے بغیر نشانہ بنایا تھا، اس لیے نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ ممکن ہے کہ سوال میں ذکر کردہ نوجوان کے بے ہوش ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اسے جنوں نے زدوکوب کیا ہو اور ایسی ضربیں لگائی ہوں جن سے اس کے چہرے اور پشت پر سیاہ نشان پڑ گئے ہوں۔ ہمیں چاہیے کہ ایسے موقع پر جلدی کرنے کی بجائے شرعی ہدایات کو مدنظر رکھا کریں جو پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ واللہ اعلم!

لفظ ''مولوی'' یا ''مولانا'' کا استعمال

] ہمارے ہاں عالم دین کو ''مولوی'' یا ''مولانا'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے جبکہ کچھ اہل علم اسے شرک سے تعبیر کرتے ہیں اور وہ صحیح مسلم کی ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہیں، پھر قرون اولیٰ کے علماء سے یہ لقب منسوب نہیں اور نہ ہی اہل عرب علماء کے لیے یہ لقب استعمال ہوتا ہے، اس کے استعمال کی شرعی حیثیت بیان کریں۔

[عزت واحترام کے پیش نظر علماء حضرات کے لیے لفظ ''مولوی'' یا ''مولانا'' استعمال کیا جاتا ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ رسول اللہ e کی طرف منسوب کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے، سیدنا جبریل u اور نیک مسلمانوں کے لیے اسے استعمال کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ 2

''یقیناً اللہ تعالیٰ سیدنا جبریل اور تمام صالح اہل ایمان آپ کے مولیٰ ہیں۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے، سیدنا جبریل u اور خواص اہل ایمان کے لیے یہ لفظ استعمال کیا ہے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کے لیے لفظ مولیٰ کا استعمال شرک نہیں۔

! مسلم، السلام: ۵۸۳۹۔ @ تحریم: ۴۔

رسول اللہ e نے بھی لفظ مولیٰ کو غیر اللہ کے لیے استعمال فرمایا ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ سیدنا زید بن حارثہ t سے فرمایا تھا: ''تو ہمارا بھائی اور ہمارا مولیٰ ہے۔'' 1

بلکہ رسول اللہ e نے اس لفظ کے استعمال کی تلقین فرمائی ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے: ''تم میں سے کوئی یوں نہ کہے کہ اپنے رب کو کھانا دو، اپنے رب کو وضو کراؤ، بلکہ اپنے آقا کو سید اور مولیٰ کہا جائے۔'' 2

بہرحال قرآن مجید اور احادیث سے یہ تو معلوم ہوا کہ لفظ مولیٰ غیر اللہ کے لیے استعمال ہوسکتا ہے۔ نیز نیک اور خاص اہل ایمان کے لیے یہ لفظ بطور اعزاز کے ہے، اسی لیے اہل حق نے اصحاب علم کے لیے بطور احترام یہ لفظ منتخب کیا ہے۔ اب یہ لفظ یعنی مولانا ایک خاص اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو ہر درس نظامی سے فارغ التحصیل کے لیے ہے اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

آخر میں ہم اس حدیث کا بھی جائزہ لینا چاہتے ہیں جو صحیح مسلم کے حوالے سے سوال میں ذکر کی گئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: ''کوئی غلام اپنے آقا کے لیے لفظ مولیٰ استعمال نہ کرے کیوں کہ تمہارا مولیٰ تو صرف اللہ ہے۔'' 3

دراصل یہ الفاظ سیدنا ابوہریرہ t سے مروی ایک طویل حدیث کا حصہ ہیں، بلکہ اصل حدیث میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ متن حدیث کچھ اس طرح ہے: ''تم میں سے کوئی اپنے غلام کو 'عبدی' نہ کہے کیوں کہ تم سب اللہ کے بندے ہو، چاہیے کہ میرا نوکر یا میرا خدمت گزار کے الفاظ کہے جائیں۔ اسی طرح اپنے آقا کو 'ربی' نہ کہے بلکہ اسے سیدی کہنا چاہیے۔'' 4

مذکورہ اضافہ کو بیان کرنے والے حضرت اعمش کے دو شاگرد ہیں، اس کے متعلق حافظ ابن حجر a لکھتے ہیں: ''امام مسلم نے حضرت اعمش کے منقول اس روایت کے متعلق اختلاف نقل فرمایا ہے۔ چند راوی اس اضافہ کو نقل کرتے ہیں جبکہ بیشتر راوی صرف حدیث کے اصل الفاظ ذکر کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ اس اضافہ کو روایت سے حذف کر دینا زیادہ صحیح ہے اور علامہ قرطبی کا بھی یہی موقف ہے۔'' 5

ہم نے شروع میں ایک حدیث کے حوالے سے لکھا ہے کہ اپنے آقا کو مولیٰ کہا جا سکتا ہے جبکہ مذکورہ اضافہ میں اس کی صریح ممانعت ہے، اس صورت حال کے پیش نظر ان میں ایک روایت کو مرجوح قرار دیئے بغیر تطبیق کی کوئی صورت سامنے نہیں آتی۔ محدثین کرام نے اضافہ کے بغیر اصل روایت کو راجح قرار دیا ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر a کہتے ہیں: ''ہم نے اضافہ کو کالعدم قرار دے کر ترجیح کی ایک صورت پیدا کی ہے کیوں کہ دونوں روایات بایں طور متعارض ہیں کہ جمع و تطبیق ناممکن ہے اور تاریخ کا بھی علم نہیں تا کہ ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دیا جائے۔ 6

! بخاری، الصلح:۲۶۹۹۔
@ فتح الباری، ج۲۲،۵۔
# مسلم، الادب:۲۲۴۹۔
$ مسلم، الالفاظ من الادب:۲۲۴۹۔
% فتح الباری،ج۲۲،۵۔
^ فتح الباری، ج۵،ص۲۲۲۔

اسی طرح امام نووی a لکھتے ہیں راویان حدیث نے حضرت اعمش سے لفظ ''مولی'' کونقل میں اختلاف کیا ہے، کچھ ذکر کرتے ہیں جبکہ کچھ دوسرے ذکر نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک اس اضافے کا حذف کر دینا زیادہ صحیح ہے۔'' 1

مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں ہم کہتے ہیں کہ مذکورہ اضافہ شاذ اور غیر محفوظ معلوم ہوتا ہے اور اس اضافے پر ممانعت کی بنیاد ہے، اس کی تفصیل ہم نے کسی دوسرے مقام پر بیان کی ہے۔ 2

مختصر یہ کہ علماء کرام کے لیے لفظ ''مولانا'' استعمال کیا جا سکتا ہے اور جس روایت کی بناء پر کراہت کشید کی گئی ہے وہ شاذ اور غیر محفوظ ہے۔ واللہ اعلم!

بھینس اور خنزیر کا ملاپ

] ہمارے ہاں ایک بھینس نے ایسا بچہ جنم دیا ہے جس کا پچھلا حصہ تو بھینس جیسا ہے لیکن اس کا منہ اور سر بالکل خنزیر جیسا ہے، اس بچے کو پیدا ہوتے ہی گولی سے مار دیا گیا ہے، اب اس بھینس کے دودھ کے متعلق شرعی حکم کیا ہے، وضاحت کریں۔

[واضح رہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ آم کے درخت کو آم لگتے ہیں اور بیری کو بیر، لیکن اس کی قدرت یہ ہے کہ وہ آم کے درخت کو بیر لگا دے اور بیری کو آموں سے بھر دے۔ دنیا میں تمام کام اس کے قانون کے تحت سرانجام پاتے ہیں البتہ بعض اوقات نشانی کے طور پر اپنی قدرت کا اظہار کرتا ہے، اس تمہیدی گفتگو کے بعد ہم مسئولہ صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝﴾ 3

''ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کر دیئے ہیں تاکہ تم سبق حاصل کرو۔''

اس آیت کریمہ میں جوڑے سے مراد نر اور مادہ ہیں، ہر نر مادہ کا زوج ہے، اور ہر مادہ، نر کا زوج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سلسلہ اس لیے چلایا ہے تاکہ نر اور مادہ کے ملاپ سے ایک تیسری چیز وجود میں آتی رہے، اس بات کو سائنسی اصطلاح میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر جاندار کی نسل باقی رکھنے اور اس سلسلہ کو آگے بڑھانے کا ایک نظام بنا رکھا ہے کہ اس نے جاندار میں جرثومے پیدا کیے ہیں، جنہیں کروموسوم کہا جاتا ہے پھر ہر جنس میں کروموسوم کی تعداد، شکل و صورت اور ان کی ترتیب، نیز ان کی خصوصیات و اوصاف کو مختلف رکھا ہے تاکہ مختلف اجناس کے درمیان امتیاز باقی رہے، مثلاً انسان کی نسل کو باقی رکھنے کے لیے اس میں چھیالیس کروموسوم ہیں، جن کے تیئس (۲۳) جوڑے بنتے ہیں، یہ جوڑے نر اور مادہ دونوں میں ہوتے ہیں، جنسی ملاپ کی صورت میں بائیس جوڑے جسم کی نشوونما کے لیے اور تیئسواں جوڑا افزائش نسل کے لیے ہوتا ہے، قرآن کریم میں ہے:

! شرح نووی، ج۲، ص۲۳۸، طبع ہند۔ @ فتاویٰ الحدیث: ج۱، ص۳۰.
الذاریات: ۴۹.

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ﴾ 1

''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا ہے۔''

یعنی مرد اور عورت کا مادہ تولید جب ملتا ہے تو اس سے ایک تیسری مخلوق (بچہ) نر یا مادہ وجود میں آتا ہے۔ایک دوسرے مقام پر ان کروموسوم کے محل افزائش کا تعیین کرتے ہوئے فرمایا:

﴿یَّخْرُجُ مِنْۢ بَیْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَآئِبِ﴾ 2

''وہ (مادہ تولید) پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے برآمد ہوتا ہے۔''

یعنی عورت اور مرد کا مادہ تولید اس دھڑ سے خارج ہوتا ہے جو پیٹھ اور سینے کے درمیان واقع ہے۔اگر دو مختلف اجناس کے کروموسوم کی تعداد،شکل وصورت،خصوصیات و اوصاف اور ترتیب میں فرق ہو جائے تو ان کے ملاپ سے کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی،اگر ان میں معمولی فرق ہو تو کوئی تیسری چیز وجود میں تو آجاتی ہے لیکن وہ افزائش نسل کے قابل نہیں ہوتی مثلاً

گھوڑی اور گدھے کے ملاپ سے خچر پیدا ہوتا ہے، اگرچہ شریعت نے اس سے منع کیا ہے تاہم فوجی حضرات اپنی ضروریات کے لیے مصنوعی بار آوری کے ذریعے خچر پیدا کرتے ہیں لیکن یہ خچر نر ہو یا مادہ آگے افزائش نسل کے قابل نہیں ہوتا۔ یہ صرف اپنی ذات کی حد تک محدود رہتا ہے،آگے نسل نہیں چلتی۔

زیبرا، مادہ (جنگلی گدھی) اور گدھے کا ملاپ بھی ممکن ہے کیوں کہ یہ دونوں جنس کے اعتبار سے قریب قریب ہیں،لیکن اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا بچہ بھی افزائش نسل کے قابل نہیں ہوتا لیکن عقلی اور سائنسی اعتبار سے خنزیر اور بھینس کا ملاپ ممکن نہیں کیوں کہ عقلی اعتبار سے بھینس گھریلو جانور ہے اور خنزیر جنگلی درندہ ہے،ان دونوں کا ملاپ کیسے ہوسکتا ہے،مصنوعی طور پر بھی ایسا نہیں ہوسکتا کیوں کہ خنزیر کا مادہ ہمارے ہاں بسہولت دستیاب نہیں ہے، سائنسی اعتبار سے اس لیے ممکن نہیں کہ بھینس کے کروموسوم ساٹھ جس کے تیس (۳۰) جوڑے بنتے ہیں جبکہ خنزیر کے اڑتیس ہیں جن کے انیس (۱۹) جوڑے ہیں، پھر ان دونوں جانوروں کی خصوصیات و امتیازات بھی الگ الگ ہیں، اگر ایسا ممکن ہوتا تو اللہ تعالیٰ حضرت نوح u کو یہ حکم نہ دیتا کہ

﴿احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ﴾ 3

''اس کشتی میں ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا (نر اور مادہ) سوار کرلو۔''

بلکہ کشتی میں تمام جانوروں کی مادہ بٹھا لیتے اور نر ایک ہی کافی تھا، ان کے ملاپ سے آگے جانوروں کی نسل چلائی جاسکتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس غیر فطرتی کام کا حضرت نوح کو حکم نہیں دیا۔

بہر حال خنزیر ایک الگ جنس ہے اور بھینس ایک دوسری جنس، ان کا باہمی ملاپ ناممکن تو نہیں البتہ اس سے کسی جنس کا پیدا

! الدھر:۲.
@ الطارق:۷.
# ھود:۴۰.

ہونا ناممکن ہے، یورپ میں فرنگی تہذیب سے وابستہ خواتین کتوں سے بدکاری کرتی ہیں لیکن کبھی اس کے نتیجہ میں کوئی نسل پیدا نہیں ہوئی، مجھے اس حوالہ سے اپنے فقہاء کرام سے یہی شکوہ ہے کہ انہوں نے بکری اور کتے کے ملاپ سے ایسا بچہ پیدا ہونے کا مفروضہ قائم کیا جس کا سر کتے جیسا اور باقی دھڑ بکرے جیسا پھر اس کے حلال وحرام ہونے کے متعلق وضاحتیں کی ہیں۔ 1

یہ اس لیے ممکن نہیں کہ کتے کے کروموسوم اُٹھہتر (۷۸) جبکہ بکری کے ساٹھ (۶۰) ہیں ان کی تعداد اور خصوصیات میں واضح فرق ہے، البتہ خنزیر اور بھینس کے بچے میں بہت گہری مماثلت ہوتی ہے، اہل لغت خنزیر کی شکل وصورت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

''اس کا سر بھینس کے سر جیسا کہ ہوتا ہے۔'' 2

بیالوجی کے ماہرین نے جب رحم مادر میں ٹھہرے ہوئے بھینس کے بچے کی تصویر لی ہے تو وہ خنزیر کے بچے سے بہت حد تک مماثلت رکھتی ہے، اس لحاظ سے بھینس کے مالک کو شبہ ہوسکتا ہے، پھر جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے گولی مار دی ہو لیکن وہ خنزیر کا بچہ قطعاً نہیں تھا اور نہ ہی اس قسم کی بھینس کا دودھ حرام ہے۔ واللہ اعلم!

انسانی اعمال میں جنات کی مداخلت

] ہمارے معاشرہ میں کچھ خواتین کسی مرد کو دیکھے بغیر خود کو جنسی عمل میں مبتلا دیکھتی ہیں، اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ جنات ایسا کام کرتے ہیں، کیا ایسا ممکن ہے کہ جنات کے عورتوں کے ساتھ اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کریں؟ قرآن وحدیث کے مطابق اس کی وضاحت کریں۔

[حقیقت یہ ہے کہ ہم اس قسم کے حساس معاملہ میں لکھنے کے لیے قطعاً تیار نہیں لیکن جب بکثرت اس طرح کی شکایات موصول ہوئیں تو مجبوراً اس نازک موضوع پر قلم اٹھانا پڑا ہے۔

ہماری تحقیق کے مطابق انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا ہے اور جن ایک لطیف اور نظر نہ آنے والا جسم رکھتے ہیں، ان دونوں کا جنسی ملاپ ناممکن ہے، لیکن کچھ عاملین اپنا کاروبار چمکانے کے لیے خود ساختہ واقعات بیان کرتے ہیں پھر وہ آیات واحادیث سے اس کا جواز بھی کشید کرتے ہیں اس لیے ضروری ہے اس موضوع پر ذرا تفصیل سے لکھا جائے۔

محدث العصر علامہ البانی a نے ابو بکر کلاباذی کے حوالے سے ایک روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا:

''اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی تا آنکہ تم میں تمہاری عورتوں سے جنات کی اولاد پیدا ہوگی اور ان کا نسب تم میں عام ہو جائے گا۔'' 3

! فتاویٰ قاضی خاں بر حاشیہ فتاویٰ عالمگیر، ص۳۷،۵۳۷.

@ عجائب المخلوقات،ص۴۱۱.

سلسلہ الاحادیث الضعیفہ،ص۶۰۱،ج۱۲.

اس روایت میں خلف بن سلیمان اور عمران راوی دونوں مجہول ہیں۔

چنانچہ علامہ البانی h نے اس قسم کے راویوں کے پیش نظر اس روایت کے متعلق ''منکرا جدا'' کہا ہے۔ 1

اس سلسلہ میں محی الدین محمد بن علی اندلسی کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک جنیہ سے نکاح کیا تھا، جس کے بطن سے تین بچے ہی پیدا ہوسکتے تھے۔ علامہ ذہبی نے امام صوفی ابن عربی کی تضاد بیانی واضح کرنے کے لیے یہ واقعہ بیان کیا ہے، چنانچہ وہ امام تقی الدین ابن دقیق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''میں نے اپنے شیخ امام عز الدین ابو محمد بن عبد السلام السلمی سے سنا، انہوں نے فرمایا کہ ابن عربی سے انسانوں کا جنات سے نکاح کے متعلق سوال ہوا تو کہا کہ ایسا ہونا محال ہے کیوں کہ وہ انسانوں کا کثیف جسم مادی ہے اور جنات ایک روحانی لطیف جسم رکھتے ہیں۔

اس کے فوراً بعد اس نے کہا کہ میں نے ایک جنیہ سے نکاح کیا تھا، اس سے تین بچے ہی پیدا ہوئے پھر ایک دن وہ مجھ سے ناراض ہوگئی اور میرے سر کو ایک ہڈی مار کر زخمی کر دیا اور گھر چھوڑ کر چلی گئی۔'' 2

یہ واقعہ ابن عربی کے جھوٹ اور تضاد بیانی کو واضح کرنے کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی صداقت نہیں ہے اور نہ ہی یہ روایات کے متعلق قابل اعتماد ہے۔

امام ابن جریر طبری نے حضرت مجاہد کے حوالے سے ایک روایت بیان کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

جب کوئی انسان مسنون دعا پڑھے بغیر اپنی بیوی سے جماع کرتا ہے تو سانپ کی شکل میں شیطان اس کی شرمگاہ سے لپٹ جاتا ہے اور اس کے ساتھ جماع میں شریک ہوجاتا ہے۔ 3

شیطان جماع میں شریک نہیں ہوسکے گا جیسا کہ امام مجاہد سے مروی ہے۔ 4

مفسرین حضرات بھی امام مجاہد کے قول کو درج ذیل ارشاد باری تعالیٰ کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں:

﴿وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ﴾ 5

''اور ان کے مال اور اولاد میں شریک ہوجا۔''

چنانچہ علامہ شوکانی نے اپنی تفسیر میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ 6

علامہ البانی a نے اس اثر کے متعلق لکھا ہے ''منکر مقطوع'' 7

! الاحادیث الضعیفہ، حدیث رقم:۵۷۷۶.
@ میزان الاعتدال،ص۶۵۹،ج۳.
# تفسیر طبری ص۱۵۱،ج۱۱.
$ فتح الباری، ص۲۸۵،ج۹.
% بنی اسرائیل:۶۴.
^ فتح القدیر،ص۲۳۳،ج۳.
& سلسلہ الاحادیث الضعیفہ،ص۶۰۳،ج۱۲.

اس کی تفصیل حوالہ مذکورہ میں دیکھی جاسکتی ہے، علامہ موصوف لکھتے ہیں:

''اگرچہ یہ بات ضعیف الاعتقاد خواتین میں مشہور ہے کہ جنات ایسی حرکات کرتے ہیں اور ان سے اولاد بھی پیدا ہوتی ہے لیکن قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کوئی دلیل نہیں ملتی کہ ایسا شرعی نکاح ہوا ہو پھر اس کے نتیجہ میں اولاد پیدا ہوئی ہو۔'' 1

اس سلسلہ میں ملکہ بلقیس کے متعلق ایک روایت نقل کی ہے:

''بلقیس کے والدین میں سے ایک جن بھی تھا۔'' 2

مفسرین کرام نے درج ذیل ارشاد باری تعالیٰ کی تشریح میں ملکہ سبا (بلقیس) کے متعلق بہت سی بے سروپا باتیں نقل کی ہیں۔

﴿قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا﴾ 3

''اس سے کہا گیا کہ محل میں چلی جاؤ، جب اس نے دیکھا تو خیال کیا کہ یہ پانی کا ایک حوض ہے، چنانچہ اس نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھالیا۔''

بہرحال مذکورہ روایت کے متعلق علامہ البانی a فرماتے ہیں: ''یہ روایت منکر ہے۔'' 4

ہمارے رجحان کے مطابق اس قسم کی جتنی روایات ہیں وہ خود ساختہ اور ناقابل اعتبار ہیں، جنات کا انسانی خواتین کے ساتھ ملاپ ناممکن ہے، اس کے متعلق جو واقعات مشہور ہیں، ان کے متعلق ہمارا تجزیہ حسب ذیل ہے:

۱۔ بدکار قسم کی عورتیں، اپنے آشناؤں کی حرکات پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ ڈھونگ رچاتی ہیں کہ میرے ساتھ کوئی جن جنسی ملاپ کرتا ہے تاکہ حمل کی شکل میں ان کی عزت وآبرو پر داغ نہ لگے۔

۲۔ ایک نفسیاتی بیماری ہے جو مخرب اخلاق لٹریچر اور حیا سوز مناظر دیکھنے سے لاحق ہوتی ہے، اس کے دوران عورت یہ محسوس کرتی ہے کہ میرے ساتھ کوئی جنسی عمل ہو رہا ہے، کسی جن میں یہ قدرت نہیں کہ وہ انسانی خواتین کے ساتھ اس قسم کی حرکات کر سکے۔ واللہ اعلم!

خچر کی پیدائش

] خچر کی پیدائش کے متعلق فقہائے کرام کیا موقف رکھتے ہیں، نیز اس کی حلت وحرمت کے متعلق کیا حکم ہے؟ اس سے کس حد تک فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کے متعلق تفصیل سے لکھیں۔

[گدھے اور گھوڑی کے ملاپ سے خچر پیدا ہوتا ہے، گھوڑا نسل کے اعتبار سے اعلیٰ اور خیر وبرکت کا حامل جانور ہے، اس لیے گھوڑی سے گدھے کے ذریعے خچر حاصل کرنا اعلیٰ کو ادنیٰ پر ترجیح دینا ہے، اس بنا پر شریعت نے اس عمل کو ناپسند کیا ہے۔

! الاحادیث الضعیفہ، ص۶۰۸، ج۱۲۔ @ تفسیر طبری، ص۱۶۹، ج۹۔

النمل:۴۴۔ $ الاحادیث الضعیفہ، ص۶۰۸، ج۱۲۔

چنانچہ حضرت ابن عباس w کا بیان ہے کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ e نے تین چیزوں کے سوا ہمیں لوگوں سے الگ کوئی خصوصی حکم نہیں دیا، آپ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم وضو مکمل اور اچھی طرح کریں، صدقہ نہ کھائیں، اور گدھوں کی گھوڑیوں سے جفتی نہ کرائیں۔ 1

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ e نے فرمایا: ''یہ کام بے علم لوگ کرتے ہیں۔'' 2

اس میں رسول اللہ e کی طرف سے سرزنش ہے کہ باشعور اور اچھے لوگ یہ کام نہیں کرتے، ہاں اگر از خود یہ عمل ہو جائے یا کوئی جاہل لوگ ایسا کریں تو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خچر سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، رسول اللہ e کو خچر کا تحفہ ملا تو آپ نے اسے قبول فرما لیا اور متعدد مرتبہ اس پر سواری بھی کی نیز قرآن کریم نے خچروں کی سواری اور ان کے باعث زینت ہونے کو بیان کیا ہے۔ 3

گدھے اور گھوڑے کی جنس آپس میں ملتی جلتی ہے۔ اس لیے سائنسی اعتبار سے ان کا ملاپ اور اس کے نتیجے میں خچر کی پیدائش ممکن ہے، لیکن یہ خود افزائش نسل کے قابل نہیں ہے، گدھا چونکہ حرام ہے لہٰذا اس سے پیدا ہونے والی نسل بھی حرام ہے، اس سلسلہ میں شریعت کا ایک ضابطہ ہے:

> ''حلال واضح ہے اور حرام بھی ظاہر ہے، ان کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں جس شخص نے اس چیز کو ترک کر دیا جس میں گناہ کا شبہ ہو تو وہ اس چیز کو بدرجہ اولیٰ چھوڑ دے گا جس کا گناہ ہونا واضح ہو اور جس نے شبہ کی چیز پر جرأت کی تو وہ جلد ہی ایسی بات میں مبتلا ہو سکتا ہے جس کا گناہ ہونا ظاہر ہے۔'' 4

بہرحال خچر حرام ہے۔ اس سے سواری اور بار برداری کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جیسا کہ فوجی حضرات پہاڑی علاقوں میں خچر سے کام لیتے ہیں۔ واللہ اعلم!

! نسائی، الطہارۃ: ۱۴۱۔ @ مسند امام احمد، ص۹۸، ج۱۔
النحل: ۸ $ بخاری، البیوع: ۲۰۵۱۔